تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار

مقالات سمینار

مُرتبہ

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی
مولانا محمد جرجیس کریمی

ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی
نبی نگر، جمال پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار

(مقالات سمینار)

مرتبہ

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی
مولانا محمد جرجیس کریمی

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی
نبی نگر، جمال پور، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

نام کتاب	:	تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار
مرتبین	:	ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی و مولانا محمد جرجیس کریمی
اشاعت	:	۲۰۱۵ء
صفحات	:	۸۳۶
تعداد	:	۶۰۰
قیمت	:	600/-
ناشر	:	ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، نبی نگر، جمال پور، علی گڑھ
کمپوزنگ	:	ڈاکٹر محمد عرفان قاسمی

Tahzeeb-wa-Siyasat Ki Tameer Mein Islam Ka Kirdar

Compiled by:
Dr. Safdar Sultan Islahi
&
Maulana Mohammad Jarjees Karimi

Idarah Tahqeeq Wa Tasneef-e-Islami, Aligarh
tahqeeqat_islami@yahoo.com tahqeeqateislami@gmail.com
Price: 600/-

ISBN : 978-93-84354-60-2

ملنے کے پتے:

۱- ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، نبی نگر، جمال پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

فہرست مقالات

ابتدائی کلمات

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کے زیر اہتمام اس کے قیام کے بعد پہلی دفعہ ''تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار'' کے موضوع پر ۲۳-۲۴ فروری ۲۰۱۴ء کو ایک قومی سمینار کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ اس میں پورے ملک سے تقریباً پچاس اہل علم و دانش وران ملت نے تحقیقی مقالات پیش کیے تھے۔ چار انگریزی میں، دو عربی میں باقی مقالات اردو میں پیش کیے گئے تھے، سمینار کے انعقاد کے وقت ہی سے ادارے کا منصوبہ تھا کہ مجموعۂ مقالات شائع کیا جائے گا۔ اگرچہ اس میں کافی تاخیر ہوگئی مگر توقع ہے کہ دیر آید درست آید کے مصداق یہ مجموعہ اپنے موضوع پر ایک دستاویزی حیثیت کا حامل ہوگا اور ایک اہم موضوع سے متعلق قوم وملت کی علمی وفکری رہ نمائی اور موجودہ پیچیدہ حالات کے تقاضوں کے فہم وادراک اور اس کی روشنی میں اپنے لائحہ عمل کے تعین میں مدد اور معاون ثابت ہوگا، انشاء اللہ۔ ان مقالات میں تہذیب اور سیاست کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن میں مغربی واسلامی تہذیبوں کے اجزاء ترکیبی، ان کے درمیان موجودہ فرق و امتیازات، تہذیبوں کے تصادم کا موجودہ نظریہ، امت مسلمہ کی تہذیبی و سیاسی پیش قدمی، قرآن مجید اور احادیث شریفہ میں حکومت وسیاست کے تصورات، موجودہ طریقۂ انتخاب، پارلیمانی نظام حکومت، تکثیری معاشرہ کے مسائل اور ہماری ذمہ داریاں، تہذیب اور سیاست سے متعلق دیگر جدید موضوعات مثلاً خواتین کے سیاسی حقوق، دنیا کی مسلم اقلیتیں اور ان کے مسائل وغیرہ جیسے اہم مباحث کے علاوہ معروف علمائے سلف اور جدید مفکرین کی وقیع کتب کے تجزیاتی مطالعے پیش کیے گئے ہیں۔ ادارہ کی طرف سے پوری کوشش کی گئی ہے کہ مقالات معروف علمی معیارات پر پورے اتریں اس لیے جن

مقالات کے حوالے مکمل نہیں تھے مقالہ نگاران سے درخواست کر کے یا ادارہ کے محققین کے ذریعے انھیں مکمل کیا گیا ہے اور اشاعت سے پہلے کئی اصحاب علم وفن سے ان کے بارے میں رائے حاصل کی گئی ہے۔

سمینار میں تینتالیس ۴۳ اردو مقالات پیش کیے گئے تھے۔ بعض مقالہ نگاران نے بروقت اپنے مقالے جمع نہیں کیے اور بعد میں تقاضا کرنے پر بھی انھوں نے اس طرف توجہ نہیں کی بنا بریں اس طرح کے دو تین مقالات شامل مجموعہ نہیں ہو سکے ہیں۔ بعض مقالات، مقالہ نگاران کی خواہش پر مجموعہ میں شامل نہیں کیے گئے ہیں، اس میں چھتیس ۳۶ اردو مقالات شریک اشاعت ہیں۔ انگریزی اور عربی کے مقالات اس مجموعہ میں شامل نہیں ہیں۔

ادارہ مقالہ نگاران کا خصوصی طور پر شکر گذار ہے کہ انھوں نے ہماری درخواست پر سمینار میں شرکت کی اور اپنے علمی اور قیمتی مقالات پیش کیے اور سمینار کو کامیاب بنایا۔ سمینار کے انعقاد میں منتظمین سمینار کو ادارہ کی مجلس منتظمہ کے اراکین، ادارے کے اراکین، شعبہ انتظام سے وابستہ افراد اور علی گڑھ کے بعض اہلِ علم کا گراں قدر تعاون، مشورے اور رہنمائی حاصل رہی ہے۔ ہم اس پر ان کے تہہ دل سے ممنون ومشکور ہیں۔ مقالات کی ترتیب وتدوین میں ادارہ کی مجلس انتظامی وعلمی کے رکن پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی (سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، اے ایم یو، علی گڑھ) کی مدد اور رہنمائی خاص طور سے شامل رہی۔ ان کے علاوہ رکن ادارہ مولانا کمال اختر قاسمی صاحب کا بھی اس کی تیاری میں سرگرم اور قیمتی حصہ ہے، مرتبین مجموعہ مقالات کے پاس ان سب کے لیے شکریہ کے الفاظ نہیں ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو قبول فرمائے اور ان کے علم میں بیش از بیش اضافہ فرمائے۔ آمین

(ڈاکٹر) صفدر سلطان اصلاحی
محمد جرجیس کریمی

۱۱ر صفر المظفر ۱۴۳۷ھ
مطابق ۵ر دسمبر ۲۰۱۵ء

افتتاحی کلمات

الحمد لله رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسوله الامین وعلی آله واصحابه اجمعین.

قال الله تعالیٰ فی کتابه المجید فاعوذ بالله من الشیطٰن الرجیم، بسم الله الرحمن الرحیم.

"إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيماً" (النساء:۱۰۵)

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْراً أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالاً مُّبِيناً" (الاحزاب:۳۶)

"وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ" (المائدۃ:۴۷)

"وقال رسول الله ﷺ: علیکم بکتاب الله احلوا حلاله وحرموا حرامه"

"وقال رسول الله ﷺ: ترکت فیکم امرین لن تضلوا ماتمسکتم بهما، کتاب الله وسنة رسوله"

محترم ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں صاحب (ایڈیٹر ملی گزٹ نئی دہلی)، محترم مولانا جلال الدین عمری صاحب (امیر جماعت اسلامی ہند وصدر ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ)، محترم جناب نصرت علی صاحب جنرل سکریٹری جماعت اسلامی ہند، ادارہ تحقیق کے پہلے قومی سیمنار میں شریک دانشوران اور علماء کرام، دیگر سامعین اور حاضرین اجلاس (مرد، خواتین اور عزیز ساتھیو!)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کا بے انتہا شکر و احسان ہے کہ اس نے ہمیں وقت کے ایک اہم موضوع پر اس علمی محفل کے انعقاد کی توفیق عنایت کی۔ یقیناً یہ موضوع دور حاضر کے انسانوں اور امت مسلمہ دونوں کی ضروریات اور مطالبات سے ہم آہنگ اور مطابق حال ہے۔ اس سمینار کا انعقاد، جس کی تیاری گزشتہ آٹھ دس ماہ سے جاری تھی، میرے لیے اور ادارہ کے تمام ذمہ داران اور وابستگان کے لیے بہت بڑی سعادت اور بے انتہا مسرت کا باعث امر ہے۔ ہم خداوند حی و قیوم کی بارگاہ میں سجدہ شکر بجالاتے ہیں اور دل کی گہرائیوں سے اس کے حضور کلمات امتنان وتشکر پیش کرتے ہیں: **رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علی وعلی والدی وان اعمل صالحا ترضاہ وادخلنی برحمتک فی عبادک الصالحین۔**

میں اس سمینار کے شرکاء اور مساہمین کا تہ دل سے ممنون و مشکور ہوں جو دور دراز سے ہماری حقیر دعوت کو قبول کر کے، اسلام، تحریک اسلامی اور علم و دانش کی خدمت کے جذبہ سے تشریف لائے ہیں۔ میں آپ سب کو خوش آمدید کہتا ہوں اور آپ کی جناب ہدیہ تبریک وتہنیت پیش کرتا ہوں۔

محترم حضرات! اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، یہ انسانی زندگی کے ہر شعبے اور گوشے میں کامل اور وافر رہنمائی پیش کرتا ہے۔ ان گوشوں میں تہذیب اور سیاست کے گوشے بھی ہیں، قرآن و حدیث کے صفحات اور علماء، ائمہ کرام اور فقہاء عظام کی تصریحات اس حقیقت پر شاہد عدل ہیں۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ اس کی گواہ ہے کہ انھوں نے دنیا کو تہذیب وتمدن کا گہوارہ بنا دیا تھا اور اپنے عروج کے بہت قلیل عرصہ کے بعد ہی انسانوں کو نہ صرف سیاست اور حکومت کے انمول اصول و آداب سے آگاہ کیا بلکہ ان اصولوں کو انسانی معاشروں میں نافذ کیا اور ان کے انتہائی گنجلک اور پیچیدہ سیاسی اور معاشرتی مسائل کو حل کر دیا تھا۔ دنیا تقریباً ایک ہزار سال تک براہ راست ان اصولوں کی برکات اور فیوض سے اور آج تک بالواسطہ طور سے مستفید ہو رہی ہے۔ آج کے

انسانوں کے پاس جو کچھ بھی تہذیبی اور تمدنی اصول وضوابط نظام حکومت و سیاست اور قوانین عدل وانصاف وغیرہ موجود ہیں ان پر اسلام کا گہرا اثر ہے۔ فی الواقع وہ اسلام اور مسلمانوں سے استفادہ ان کی عظیم علمی خدمات کے نقوش تابندہ اور ان کے جملہ دورہائے خلافت وسیادت کے ثمرات طیبہ اور برکات حسنہ ہیں۔

ایک طرف یہ ایک روشن اور ناقابل تردید حقیقت ہے، دوسری طرف آج کی تکلیف دہ صورت حال یہ ہے کہ آج پورا دین اسلام، امت مسلمہ اور ملت کا پورا تہذیبی سرمایہ اور اس کے افکار وعقائد کے جملہ اصول ومبادی (اخلاقیات، معاشرت، معیشت، نظام عدل وانصاف اور نظام سیاست وتمدن) الغرض سب کچھ عیار اور شاطر اغیار اور خودغرض اور مفاد پرست اپنوں کی طرف سے اعتراضات اور تنقیدات کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ اس سے متعلق کچھ غلط فہمیاں تو پہلے سے چلی آرہی تھیں اب قصداً مزید پیدا کی جارہی ہیں۔ آج اعداء اسلام نے اسلام کی ایسی بھیانک تصویر کشی کی ہے اور اسے مسلسل پیش کرتے چلے آرہے ہیں کہ اس کی طرف نظر اٹھاتے ہوئے بھی امت کا سنجیدہ فرد گھبراہٹ اور اختلاج واضطراب کا شکار ہو جاتا ہے، یہ سب کچھ ریسرچ اور علمی تحقیق کے نام پر ہو رہا ہے۔ باطل نے اپنے نظریات وافکار کی نشر واشاعت کے لیے ہر ممکن ذریعہ اور وسیلہ اختیار کیا ہے، ظہور اسلام کے تین چار صدیوں بعد عیسائی اور یہودی طاقتوں کی مشترکہ عسکری یلغار کا امت کے جیالوں نے کامیاب مقابلہ کیا لیکن اس سے پہلے اور اس کے بعد سے آج تک جو فکری یلغار ہے اس سے جسم امت کا ہر حصہ زخم خوردہ ہے اور اس کی یلغار آج تک جاری ہے۔ گرچہ یوری طاقتوں کے غلبہ کے آخری دور میں عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں دینی احیائی تحریکات کی بنا وتشکیل اور ان کے عمل وتحرک کا آغاز ہو چکا تھا اور رفتہ رفتہ وہ مختلف علاقوں میں موثر بھی ہوتی گئیں۔ باشعور مسلم مفکرین نے مغربی افکار ونظریات کا انتہائی معروضی اور سائنٹفک انداز میں مطالعہ کیا اور ان کی تردید و تنقید پر مشتمل انتہائی جاندار لٹریچر فراہم کیا، اس کے نتیجہ میں ایک طرف امت کی نسل نو کے اذہان وقلوب میں باطل افکار کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کا ازالہ ہوا اور اسلامی

عقائد و عبادات اور پورے نظام زندگی پر ان کے تیقن اور اعتماد کی بحالی ہوئی۔ دوسری طرف خود مغرب کے فکری مراکز اور ان کے پالیسی ساز اداروں پر گھبراہٹ اور لرزہ طاری ہو گیا اور مغرب سے ایسے صالح نفوس سامنے آئے جنھوں نے علانیہ اسلام پر اپنے اعتماد و یقین کا اظہار کیا اور اس کی وکالت اور ترجمانی کو اپنا فریضہ حیات بنالیا۔ تیسری طرف ان اسلامی تحریکات کی اپنے معاشروں میں رسائی اور نفوذ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ ہر محاذ پر پیش قدمی کر رہے ہیں۔ ایران، ترکی، افغانستان، سوڈان، فلسطین اور اب مصر، شام، عراق، تیونس اور یمن میں ان کے بڑھتے قدم اور جاری پیش رفت سے اہل کفر و اصحاب باطل حیران و پریشان ہیں۔ آج علامہ اقبال اگر موجود ہوتے تو یہ شعر شاید نہ کہتے:

بت صنم خانے میں کہتے ہیں مسلمان گئے ہے خوشی ان کو کہ کعبہ کے نگہبان گئے
خندہ زن کفر ہے احساس تمہیں ہے کہ نہیں اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

اس پیش رفت کو اور تیز کرنے اور باطل کی ان ملمع کاریوں کی اصل حقیقت کو سامنے لانے اور اسلام کی صاف ستھری تصویر کو پیش کرنے کے لیے سعی و کوشش کو بڑھاوا دینے کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے۔ بلاشبہ آج اسلام کو سمجھنے اور اس کی طرف مراجعت کا جذبہ اور حوصلہ اور اس تعلق سے بے شمار محیر العقول واقعات کا صدور ایک مفروضہ اور واہمہ نہیں بلکہ روز روشن کی طرح عیاں حقیقت ہے۔ یقیناً باطل افکار و نظریات نے انسانوں کے مسائل کو حل کرنے کے بجائے انھیں اور الجھا دیا ہے اس لیے مثبت اور عقلی انداز میں دین حنیف اور شریعت مطہرہ کی تعلیمات اور ان کا تعارف دور حاضر کے انسانوں کی باوقار خدمت اور عظیم الشان شرف ہے۔ اس سے پوری امید ہے کہ امت کی عظمت رفتہ بحال ہوگی اور باطل کے ایوانوں میں حق کی آواز کا بول بالا ہوگا اور اس کی وادیوں میں ہمارے موذنوں کی صدائیں بلند ہوں گی۔ انشاء اللہ

اسی ضرورت کے احساس اور ادراک اور اس کی عملی صورت گری کے طور پر ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ کا قیام عمل میں آیا۔ یہ اب سے کوئی ۶۵ سال پہلے کی

بات ہے جب کہ ہندوستان کی تحریک اسلامی کے ذمہ داروں نے اپنے قلیل وسائل کے باوجود وقت کی ضرورت اور ملک کی صورت حال کے مطابق جدید لٹریچر کی تیاری اور فراہمی کا فیصلہ کیا اور اس ضمن میں ضروری اقدامات کیے۔ اس علمی جہاد کی ذمہ داری متکلم تحریک اسلامی اور موضح و شارح افکار مودودی، مولانا صدرالدین اصلاحی مرحوم و مغفور کے حوالہ کی گئی۔ انھوں نے اور ان کے ساتھ ایک پوری جماعت نے جس میں دوسرا نام مولانا سید جلال الدین عمری صاحب مدظلہ العالی کا ہے، جنھوں نے عنفوان شباب (۱۹۵۵ء) میں رامپور میں قائم شعبہ تصنیف میں شمولیت اختیار کی تھی اور ادارہ سے وابستہ دیگر مفکرین نے تقریباً سو (۱۰۰) کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے عصر حاضر کے بہت سے موضوعات کا احاطہ کیا اور ہزاروں جویان علم، طالبین رشد و ہدایت کی تشنگی رفع کرنے کا سامان بہم پہنچایا۔ **فجزاھم اللہ احسن الجزا۔**

ادارہ رامپور سے علی گڑھ اور علی گڑھ میں بھی ۱۹۸۱ء سے اپنے موجودہ نام کے ساتھ انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں مکمل سکوت کے ساتھ اپنی خدمات جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہاں منتخب علماء اور محققین کی ایک مشہور جماعت ہی نہیں بلکہ نسل نو کی تیاری کا ایک جامع پروگرام ہے، تاکہ وہ آئندہ امت اور تحریک کی علمی وراثت کے حامل اور امین ہوسکیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۲ء سے سہ ماہی مجلہ تحقیقات کا اجراء اور اس وقت سے آج تک بلا انقطاع اس کے سفر کا تسلسل بھی محض اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائی کا نتیجہ ہے۔ اسے اردو علمی دنیا میں جو وقار اور اعتماد حاصل ہے وہ وابستگان ادارہ کے شوق خدمت، علم و دانش کو مہمیز کرنے کا بہت بڑا سبب ہے۔ **اللھم زد فزد۔**

اللہ کا شکر ہے کہ ادارہ نے اپنے قیام کے وقت جن موضوعات اور اہداف کا تعین کیا تھا، ان میں سے بیشتر موضوعات کو اس نے کسی نہ کسی طور سے حاصل کرلیا ہے۔ چنانچہ مختلف جدید موضوعات پر وابستگان ادارہ نے کم از کم آٹھ درجن کتابیں تیار کی ہیں جو ادارہ کے مکتبہ، (مرکزی مکتبہ اسلامی) اور بعض دوسرے مکتبات سے شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کو انتہائی مقبولیت بھی حاصل ہوئی اور ان کا ترجمہ دنیا کی مختلف

زبانوں میں شائع ہوا۔ خاص طور سے مولانا صدرالدین اصلاحی اور مولانا سید جلال الدین عمری کی تصانیف نے برصغیر کے علمی اور تحریکی حلقوں میں کافی اعتبار حاصل کیا ہے۔اور وہ مراجعت اور استناد کا درجہ رکھتی ہیں۔

ادارہ کی اپنی ایک لائبریری ہے جس میں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کتابوں کا قیمتی ذخیرہ موجود ہے اور پورے عالم اسلام سے شائع ہونے والے علمی وفکری جرائد اور رسائل کی مسلسل آمد ہوتی رہتی ہے۔اس سمینار میں تشریف لائے مہمانان گرامی سے درخواست ہے کہ وہ لائبریری کی زیارت ضرورت کریں اور مفید مشوروں سے نوازیں۔

ادارہ کی طرف سے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ موضوعات پر توسیعی خطبات (Extention Lecture) کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں معروف اسکالرس اور محققین اپنے خطبات پیش کرتے ہیں اور ان پر مذاکرہ ہوتا ہے۔

ادارہ جب ۱۹۷۰ء میں علی گڑھ منتقل ہوا تھا تو اپنے طے شدہ منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لیے ظاہری طور سے اس کے پاس کرایے کی چند کوٹھریاں تھیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آج ادارہ کے پاس اپنا کیمپس بھی ہے اس میں اس کی مرکزی عمارت کی تعمیر بھی مکمل ہو چکی ہے۔مزید شکر و احسان کا مقام ہے کہ اس کیمپس میں مسجد کی تعمیر بھی مکمل ہونے کے قریب ہے جو انشاء اللہ ایک دینی مرکز کی حیثیت سے کام کرے گی۔ انشاء اللہ

ادارہ کے منصوبوں اور سرگرمیوں کا یہ انتہائی مختصر تعارف تھا جو اس لیے پیش کیا گیا تا کہ آپ جان لیں کہ ہمارے اہداف کیا ہیں؟ اور ہماری پیش رفت کی صورت کیا ہے؟ اور آپ سے جو ممکن ہو تعاون کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔الحمد للہ آپ کا تعاون دامے درمے سخنے ہمیں حاصل ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ دعا کریں کہ اللہ ادارے کو اس کے اہداف حاصل کرنے کی صلاحیت اور توفیق عطا فرمائے اور اس کے کارکنان کی خدمات کو قبول فرمائے ۔ میں ایک بار پھر آپ سب کا عمیق قلب سے استقبال کرتا ہوں، اہلا وسہلا ومرحبا بکم۔اور آپ کی آمد پر آپ سب کا شکریہ ادا کرتا اور

امید کرتا ہوں کہ یہاں دودن کے قیام میں آپ کی شرکت اور مباحث میں مساہمت سے تمام شرکاء کو فائدہ حاصل ہوگا۔ یوں تو ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کی حتی الوسع خدمت اور ضیافت کی جائے لیکن اس دوران اگر آپ کو کوئی پریشانی یا دقت پیش آئے تو میں پیشگی معذرت خواہ ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین سے متعلق تمام کاموں کی انجام دہی میں ہمارے دلوں میں خلوص اور للّٰہیت پیدا کرے اور اسے ہمارے اجر وانعام میں اضافہ کا ذریعہ بنادے۔ اللھم آمین ثم آمین. وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

والسلام

صفدر سلطان اصلاحی

اعزازی سکریٹری ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ/ کنوینر سمینار

۲۳ر فروری ۲۰۱۴ء

کلیدی خطبہ

تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار

سید جلال الدین عمری*

الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام علی رسوله الکریم وعلی آله وصحبه اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین.

صدر محترم! جناب ظفر الاسلام خاں صاحب، صدر مسلم مجلس مشاورت وایڈیٹر ملی گزٹ، جناب نصرت علی صاحب، قیم جماعت اسلامی ہند، ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی صاحب، سکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی وکنویز سمینار، مولانا محمد جرجیس کریمی صاحب، معاون کنویز ورکن ادارہ، بزرگو، دوستو اور محترم خواتین!

موضوع کی عصری اہمیت

میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ادارۂ تحقیق کو عصری اہمیت کے حامل ایک اہم موضوع پر سمینار منعقد کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ تہذیب اور سیاست کا بڑا گہرا رشتہ ہے۔تہذیب سیاست پر اور سیاست تہذیب پر اثر انداز ہوتی ہے۔اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ان دونوں کا تعلق فرد سے بھی ہے اور سماج سے بھی۔آج یہ عالمی سطح پر ایک اہم اور زندہ موضوع ہے، جس پر مختلف پہلوؤں سے بحث ہورہی ہے۔

---

* امیر جماعت اسلامی ہند وصدر ادارہ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

تہذیبوں کا تنوع

کسی قوم کی تہذیب سے اس کے مذہبی خیالات، روایات، رسم و رواج، لباس، وضع قطع، تقریبات، شادی بیاہ کے اصول وضوابط، مسرت و شادمانی اور رنج وغم کے اظہار کے طریقے، کھیل کود اور تفریحات مراد ہوتی ہیں۔ علم و ادب، آرٹ اور فنون لطیفہ بھی تہذیب کے مظاہر ہیں۔ ہر قوم کو اپنی تہذیب عزیز ہوتی ہے، اس لیے کہ اس سے اس کی پہچان ہوتی ہے اور دوسروں سے اس کا امتیاز قائم ہوتا اور انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ تہذیب کے بعض اصول وضوابط مستقل ہوتے ہیں اور مختلف عوامل کے زیر اثر وہ تبدیلی بھی قبول کرتی ہے۔ تہذیبوں کے درمیان کئی پہلوؤں سے فرق و امتیاز واقع ہوتا ہے۔ جو قبائل جنگلات یا پہاڑوں میں رہتے ہیں ان کی تہذیب میدانی علاقوں کے باشندوں سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح شہری اور دیہاتی تہذیبوں میں فرق ہوتا ہے۔ شہر کے باشندوں کے بہت سے طور طریقے دیہات کے رہنے والوں سے جدا ہوتے ہیں۔ تہذیب پر تعلیم اور تمدن کا بھی اثر پڑتا ہے۔ جو قومیں تعلیم اور تمدن کے میدان میں آگے ہوتی ہیں ان کی تہذیب ان قوموں کی تہذیب سے بڑی حد تک جدا ہوتی ہے جو جہالت کا شکار ہوتی ہیں یا جن میں تعلیمی پس ماندگی پائی جاتی ہے۔ تمدنی ترقی اور عدم ترقی سے بھی تہذیبوں میں نمایاں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ تہذیب کا معیشت سے بھی گہرا تعلق ہے۔ تاریخ کے ابتدائی دور میں انسان کی بود و باش اور معاشی تگ و دو محدود علاقہ میں ہوتی تھی، اس کی معیشت کا دار ومدار زیادہ تر زراعت، مویشی پالنے اور چھوٹی موٹی دست کاری پر تھا۔ لیکن جب صنعتی انقلاب آیا، بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے، تجارت نے ترقی کی اور قوموں کے درمیان آمد ورفت بڑھی تو تہذیب اور کلچر میں بھی فرق واقع ہوا۔

تہذیبوں کے اختلاط کے اثرات

تہذیبوں کا اختلاط بھی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے اور وہ شعوری یا

غیر شعوری طور پر ایک دوسرے کے طور طریقے اور رسم و رواج اختیار کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح مغلوب قوموں میں غالب اقوام کی تہذیب کو نقل کرنے کی نفسیات پائی جاتی ہے اور وہ ان کی تہذیب کو آہستہ آہستہ قبول کرتی چلی جاتی ہیں، بلکہ بعض اوقات اس میں فخر محسوس کرنے لگتی ہیں۔ اس سب کے باوجود ہر قوم کی تہذیب میں انفرادیت بھی پائی جاتی ہے۔ اس کا تعلق اس کے مذہبی خیالات اور ان روایات سے ہوتا ہے، جن کی وہ ہر حال میں پابند رہتی ہے یا رہنا چاہتی ہے۔

تہذیب کے سلسلے میں اسلامی اصول

اسلام کی اساس توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد پر ہے۔ وہ اسی پر زندگی کے تمام شعبوں کی تعمیر کرتا ہے۔ اس کی تہذیب بھی اسی اساس پر استوار ہوتی ہے۔ یہ اصولی طور پر ان تہذیبوں سے مختلف ہے جن میں نہ تو خدا کا کوئی واضح تصور ہے اور نہ وحی و رسالت اور آخرت ہی کو وہ تسلیم کرتی ہیں۔

اسلام اپنے عقیدے اور فکر کے لحاظ سے ایک عالم گیر دین ہے۔ اس کا تعلق کسی خاص قوم یا علاقہ سے نہیں ہے، اس لیے اس نے کسی خاص قوم کی تہذیب کو اختیار نہیں کیا، بلکہ تہذیب کے سلسلے میں بعض اصول فراہم کیے ہیں۔ ان کی پابندی اور نگہ داشت کے ساتھ ہر قوم اپنی اپنی تہذیب پر عمل کر سکتی ہے۔ ان میں سے بعض اصولوں کی یہاں وضاحت کی جارہی ہے:

۱۔ تہذیب شرک سے پاک ہو:

پہلی بات یہ کہ یہ تہذیب شرک سے پاک ہے۔ اسلام عقیدۂ توحید کا قائل ہے۔ وہ کسی ایسی تہذیب کو صحیح نہیں سمجھتا جس میں خدا کا انکار یا شرک کی آمیزش ہو، وحی و رسالت کو فریب سمجھا جائے یا آخرت سے بے نیازی اختیار کی جائے اور دنیا ہی کو مقصد بنا دیا جائے، اس لیے کہ یہ اس کے بنیادی فکر کے متصادم ہے۔ اس پہلو سے وہ مشرکانہ تہذیب کے خلاف ہے، جس میں دیوی دیوتاؤں یا اصنام پرستی یا مظاہر کائنات کی پرستش

ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ کسی ایسے کلچر کی بھی اجازت نہیں دیتا جس میں مذاہب اور ان کی محترم شخصیتوں کا عدم احترام پایا جاتا ہو۔

۲- اخلاق کی پابندی:

اسلامی تہذیب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلام تہذیب اور کلچر کے نام پر عریانی اور بے حیائی کی اجازت نہیں دیتا۔ اس طرح کے ادب، آرٹ یا منظر کشی کو صحیح نہیں سمجھتا جو بداخلاقی پر مبنی ہو، یا جس سے حیا اور شرم کا فطری جذبہ مجروح ہو۔ اسی طرح وہ اس تہذیب کی بھی ہمت شکنی کرتا اور اسے غلط قرار دیتا ہے جو 'لہو الحدیث' میں شامل ہو، جس سے سفلی جذبات ابھریں اور اعلیٰ مقاصدِ حیات کو نقصان پہنچے۔

اسلام اس کلچر کو بھی صحیح نہیں سمجھتا جس میں دنیا مقصودِ حیات ہو اور انسان اسی زندگی کو اول و آخر سمجھنے لگے۔ عیش و عشرت کا مظاہرہ ہو، رنگ رلیاں ہوں، شباب و کباب ہو، 'بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست' کے تصور کے ساتھ آدمی یہ حیاتِ چند روزہ گزارے۔ وہ اسے خدا پرستوں کا نہیں، بلکہ منکرینِ خدا و آخرت کا ذہن قرار دیتا ہے: يَعْلَمُونَ ظَاهِراً مِّنَ الحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ (الروم:۷) ''یہ لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے بالکل غافل ہیں۔''

اسلامی تہذیب کے بعض مظاہر

اسلام نے تہذیب کے سلسلے میں اس طرح کے جو اصول فراہم کیے ہیں، ان کی پابندی کے ساتھ ہر قوم اپنی تہذیب پر عمل کرسکتی ہے۔ اسے دو ایک مثالوں سے بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے:

تہذیب اور کلچر میں تقریبات، دعوت و ضیافت، خورد و نوش کے طریقے بھی آتے ہیں۔ بعض چیزیں پسند کی جاتی ہیں، بعض ناپسند۔ افراد کے ساتھ بھی یہ معاملہ ہوتا ہے اور قوموں کے ساتھ بھی۔ قوموں کی روایات اور معمولات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسلام نے اس سلسلے میں صرف اصولی ہدایات دی ہیں اور ہر قوم کے لیے اپنے کلچر کی

گنجائش رکھی ہے۔اس نے کہا کہ اللہ نے کھانے پینے کی چیزوں میں چند ایک کو حرام کیا ہے، ان کی تفصیل اس نے بتادی ہے: وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ. (الانعام:۱۱۹) ''جن چیزوں کا استعمال اللہ نے حرام کردیا ہے، ان کی تفصیل وہ تمھیں بتا چکا ہے۔'' اس کے علاوہ سب ہی چیزیں حلال ہیں، ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔اس نے گوشت کو انسانی غذا کا حصہ قرار دیا اور گوشت خوری کو جائز قرار دیا، البتہ ہدایت کی کہ مباح جانور بھی ذبح ہو تو اللہ کے نام پر ہو: فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِآيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ۔ (الانعام:۱۱۸) ''پھر اگر تم لوگ اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کا گوشت کھاؤ۔'' غیر اللہ کے نام پر کیا گیا ذبیحہ جائز نہیں ہے: وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ. (الانعام:۱۲۱) ''اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو اس کا گوشت نہ کھاؤ۔ ایسا کرنا فسق ہے۔'' کھانے پینے کا طریقہ کیا ہو؟ گھر کے سب لوگ ایک ساتھ کھائیں یا الگ الگ کھاسکتے ہیں؟ قرآن نے کہا: جس میں سہولت ہو یا جس کا رواج ہو، اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا. (النور:۶۱) ''اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم لوگ مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔''

اس کی ایک اور مثال لباس کی ہے۔ گرم ملکوں کا لباس ٹھنڈے ملکوں کے لباس سے الگ ہوتا ہے۔اس میں قوموں اور ملکوں کے حالات اور سماجی روایات کا عمل دخل بھی دیکھا جاتا ہے۔اس پہلو سے ہر قوم کی تہذیب کی نمائندگی ہوتی ہے۔اسلام نے اپنے ماننے والوں کو کسی خاص لباس کا پابند نہیں بنایا، بلکہ اصولی ہدایات دیں۔اس نے عریانی کو ختم کیا، مرد اور عورت کے ستر کے حدود مقرر کیے کہ دونوں کے لباس اس سے کم نہ ہوں۔اس کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ مرد اور عورت کے لباس میں فرق ہونا چاہیے۔اس نے کہا کہ لباس وجہ زینت بھی ہے، اس کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔اس کے ساتھ اس نے تشبہ سے منع کیا، یعنی ایسے لباس سے احتراز کیا جائے جو کسی دوسری قوم کی تہذیبی شناخت ہو اور اس کے استعمال سے ایک مسلمان کی شناخت ختم ہو جائے: من تشبہ بقوم فھو منھم ۔ (ابوداؤد:۴۰۳۱) ''جس شخص نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے

ہے۔'' اسی طرح بعض اور اصولی ہدایات بھی دیں، مثلاً یہ کہ مردوں کو ریشم اور سونے کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح شادی بیاہ کے ذیل میں بھی بعض اصولی ہدایات دی گئیں، مثلاً بیوی کی رضامندی ہو، مہر کا تعین ہو، اعلانِ نکاح ہو اور سادگی ہو۔ باقی چیزیں، جو خوشی کے موقع پر اختیار کی جاتی ہیں، انھیں رسم و رواج پر چھوڑ دیا گیا۔

اسلامی تہذیب پر اغیار کے حملے

مغرب نے اپنے سیاسی غلبہ اور استحکام کے لیے جو تدابیر اختیار کیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس نے اسلام کے سیاسی تصورات کو ہدفِ تنقید بنایا اور انھیں دورِ حاضر کے لیے ناقابلِ عمل ثابت کرنے کی سعی کی۔ مغرب کے سیاسی غلبہ کے ساتھ اس کی تہذیبی یلغار بھی جاری رہی۔ اسلامی تہذیب کو دورِ جاہلیت کی یادگار قرار دیا گیا، بلکہ ایک طرح سے اسے تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ کام علمی سطح پر اور منظم طریقہ سے اب بھی جاری ہے۔ مسلمان مفکرین، جو مغربی طرزِ حیات سے متاثر و مرعوب تھے، انھوں نے اس کی تائید بھی کی، یا زیادہ سے زیادہ اسلام کو مغربی افکار سے ہم آہنگ ثابت کرنے کی سعی کی، لیکن جن اصحابِ علم کی اسلامی تعلیمات پر گہری نظر تھی، انھوں نے اس مرعوبیت کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے اسلام کے سیاسی اور تہذیبی تصورات کی معقولیت اور برتری ثابت کی اور مغرب کی فکری و عملی کمزوریوں کی نشان دہی کی۔ یہ کاوشیں پہلے بھی ہو رہی تھیں، اب بھی جاری ہیں۔ حال میں مغرب کے ایک سیاسی مفکر Samuel P. Huntington نے ۱۹۹۲ء میں اپنی کتاب Clash of Civilizations میں اس بحث کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی۔ اس نے اسے تہذیبوں کا ٹکراؤ قرار دیا ہے۔ اس نے بتایا کہ سرد جنگ کے خاتمہ کے ساتھ نظریاتی جنگ ختم ہو گئی۔ اب دنیا میں جنگ معیشت اور سیاست کی بنیاد پر نہیں، بلکہ تہذیب و کلچر کی بنیاد پر ہو گی۔ اپنی بحث میں اس نے خاص طور پر اسلام اور مغرب کو ایک دوسرے کے حریف کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اس کے اسباب بھی بیان کیے ہیں۔

Huntington نے یہ بات تو صحیح کہی ہے کہ اسلام ایک نظریہ ہے جو اپنی حقانیت پر اصرار کرتا اور دنیا پر اپنا غلبہ چاہتا ہے اور مغرب بھی یہی چاہتا ہے، اس لیے تصادم جاری رہے گا، لیکن اس بحث میں اس نے عقیدہ اور کلچر کے فرق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اسلام جس عقیدہ وفکر کا حامل ہے اس کو قبول کرنے سے انسان کے ذہن وفکر میں جو تبدیلی رونما ہوتی ہے اس کا اثر اقدارِ حیات کے تعین اور زندگی کے مختلف امور میں حسن و قبح، پسند و ناپسند اور رد وقبول پر پڑتا ہے، لیکن جہاں تک کلچر اور رسوم و روایات کا تعلق ہے، اس کے جو اجزاء عقیدہ وفکر اور اس کے تصورِ حیات سے متصادم ہوں، ان کی وہ اصلاح کرتا ہے۔ باقی امور میں قومی وملکی روایات سے تعرض نہیں کرتا۔ چناں چہ اسلام جن علاقوں اور ملکوں میں پہنچا، وہاں کھانے پینے، لباس، زیب و زینت، نکاح اور معاشرت کے طریقے، خرید وفروخت کے معروفات میں کوئی تبدیلی نہیں کی، بلکہ کوئی خرابی تھی تو اس کی اصلاح کی۔ اس وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ اسلام کے ساتھ مختلف مذاہب اور مختلف ملکوں کی تہذیبیں موجود ہیں۔ اسی طرح اس نے رہبانیت کے رجحان کو ختم کیا اور اس عیش وعشرت پر پابندی لگائی جو دولت کے ضیاع اور چند افراد کی نمود ونمائش اور فخر ومباہات کا ذریعہ بن جائے اور جس سے حق داروں کا حق تلف ہو۔ خود اہلِ عرب کا ایک کلچر تھا، اسلام نے اسے اصلاحات کے ساتھ باقی رکھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بڑی لمبی بحثیں کی ہیں۔ ان کا خلاصہ یہی ہے۔

اسلام کا سیاسی فکر

دوسرا موضوع ہے سیاست۔ سیاست کا اطلاق عموماً دو امور پر ہوتا ہے: ایک سیاسی عقیدہ اور فکر اور دوسرا نظامِ سیاست۔ دونوں کو عام طور پر Politics کہا جاتا ہے۔ اسلام کا اپنا سیاسی فکر بھی ہے اور اس کا اپنا نظامِ سیاست بھی ہے۔ دونوں چیزوں کا تعلق انسان کے مجموعی تصورِ حیات سے ہے، جسے اسلام 'الدین' سے تعبیر کرتا ہے، اس کے نزدیک اسلام ہی اللہ کا دین ہے۔ یہی اللہ کے تمام رسولوں کا دین رہا ہے: اِنَّ الدِّیْنَ

عِنْدَ اللّٰهِ الاِسْلَامُ. (آل عمران:۱۹) ''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے''۔

اسلام کے معنیٰ ہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکا دینا اور اس کے حکم کی تابع داری کرنا۔ یہ پوری زندگی اور اس کے تمام شعبوں میں لازم ہے۔ سیاست اسی کا ایک حصہ ہے۔ اس کی دلیل میں قرآن کہتا ہے کہ پوری کائنات اسلام ہی پر قائم ہے، آسمان و زمین اور ان میں پائی جانے والی تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تابع ہیں۔ وہ اس سے سرمو روگردانی، انحراف یا مخالفت نہیں کرتی ہیں۔ انسان اسی کائنات کا جز ہے۔ اسے بھی اسی کی اطاعت و فرماں برداری کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ اس سے انحراف اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ چنانچہ جو لوگ اسلام سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرتے ہیں، ان کے بارے میں وہ کہتا ہے: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا (آل عمران:۸۳) ''کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں، حالاں کہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی تابعِ فرمان ہیں۔'' اسی سیاق میں آگے کہا گیا ہے: وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (آل عمران:۸۵) ''اسلام (اللہ کی اس فرماں برداری) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد ہوگا۔'' سیاست میں بنیادی سوال اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) کا ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ سے مراد یہ ہے کہ اس کا حکم آخری اور حتمی ہو، اس کے فرمان کو کہیں چیلنج نہ کیا جا سکے، اس سے سرتابی کا کسی کو حق نہ ہو۔ اسلام کے نزدیک یہ مقام صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے، اس لیے کہ وہی اپنی مخلوق کا مالک ہے اور وہی امر و نہی کا حق رکھتا ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (الانعام:۵۷) ''فیصلے کا سارا اختیار اللہ کو ہے۔'' اس کا مطالبہ ہے: اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف:۳۰) ''(اے لوگو!) جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔''

اسلام نے عقیدہ کے ساتھ اس پر مبنی نظامِ حیات بھی دیا ہے، جسے وہ شریعت یا

شاہ راہِ حیات کہتا ہے۔اس نے اس شریعت کی مکمل اتباع کا حکم دیا ہے:

"ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْھَا وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَاءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ" (الجاثیۃ: ۱۸)

(اس کے بعد اب (اے نبی) ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک صاف شاہ راہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔)

شریعت بعض امور میں تفصیلی ہدایت دیتی ہے، بعض میں اصول وکلیات فراہم کرتی ہے اور اولی الامر اور اصحاب الرائی کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ ان کی روشنی میں تفصیلات مرتب کریں۔اس کے سلسلے میں اس نے یہ ہدایت کی ہے اسلام کے ماننے والے باہم مشورہ سے کوئی راستہ اختیار کریں۔چنانچہ قرآن نے مسلمان کے متعلق کہا ہے: وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (الشوریٰ: ۳۸) "ان کے معاملات باہم مشورے سے طے ہوتے ہیں۔" اسلام نے اس کی شکل متعین نہیں کی، البتہ یہ ہدایت کی کہ جو بات طے ہو اس میں 'اولوالامر' کی اطاعت کی جائے۔ اطیعو اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم ۔'اولوالامر' سے مراد حکام ہیں جن کے ہاتھ میں امر اور اختیار ہوتا ہے۔اس سے علماء بھی مراد لیے گئے ہیں۔اس لیے کہ اسلامی ریاست میں شریعت کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی ترجمانی ماہرین شریعت ہی کر سکتے ہیں۔اس پہلو سے ارباب اقتدار بھی علماء کے تابع ہوں گے۔اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ما بہ النزاع امور یا ایسے معاملات جن میں اختلاف ہوسکتا ہے، ان میں اللہ اور رسول کی تعلیمات کی طرف رجوع کیا جائے۔ فیصلہ اس کے مطابق ہو۔یہ اسلامی ریاست میں شریعت کی بالا دستی کا اعلان ہے۔اس کی پوری تفصیل سورۂ نساء کی اس آیت میں ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۔ (النساء: ۵۹) یہ بھی کہا کہ مشورہ چند مخصوص افراد کے ساتھ نہ ہو، بلکہ 'اولوالامر' کے درمیان ہو۔اولوالامر سے مراد وہ

لوگ ہیں جو سیاست میں حصہ لے رہے ہیں، ذمہ دار لوگ بھی ہیں۔امام بخاریؒ نے باب باندھا ہے کہ اولوالامر سے مراد علماء ہیں، جو دینی بصیرت بھی رکھتے ہو اور دنیوی معاملات سے بھی دل چسپی رکھتے ہوں۔

اسلامی سیاست کی بنیادیں

اسلامی سیاست جن بنیادوں پر قائم ہے اور اس سلسلے میں جو مقاصد اسلام کے پیش نظر ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱- انسان کے بنیادی حقوق کی حفاظت: اس میں جان، مال، عزت و آبرو، رہائش اور دوا و علاج جیسے بہت سے حقوق آتے ہیں۔

۲- آزادیٔ فکر و نظر: اس میں مذہب کی آزادی بھی شامل ہے: لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ. (البقرۃ:۲۵۶) ''دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے''۔

۳- معاشرہ سے فساد کا خاتمہ: یہ انبیاء کرام کی تعلیمات کا لازمی جز رہا ہے: وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف:۵۶) ''زمین میں فساد برپا نہ کرو، جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے''۔

۴- امر بالمعروف و نہی عن المنکر: قرآن اسے اسلامی ریاست کا بنیادی مقصد قرار دیتا ہے۔معروفات کو عام کرنے اور منکرات کو ختم کرنے کی جدوجہد، ترغیب و ترہیب اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ ہوگی۔ضرورت پڑنے پر اس کے لیے طاقت بھی استعمال کی جا سکے گی: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج:۴۱) ''یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین پر اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے''۔

۵- عدل و قسط کا قیام: قرآن نے بتایا کہ عدل و قسط کا قیام انبیاء کرام کی تعلیم کا اہم مقصد رہا ہے: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ

لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید:۲۵) ''ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی، تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔'' اس آیت میں ایک بات جو یہ کہی گئی کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کے جو انبیاء آتے رہے، وہ بے بنیاد بات نہیں کرتے تھے، بلکہ دلائل کی روشنی میں اپنا نقطہ نظر پیش کرتے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے قانون بھی دیا اور میزان بھی۔ میزان کا مطلب یہ ہے کہ انھیں عدل وانصاف قائم کرنے کا طریقہ بھی بتایا۔ آگے فرمایا: وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید: ۲۵) ''اور ہم نے لوہا اتارا، جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے لوہا پیدا کیا، جس سے جنگی سامان تیار ہوتا ہے اور انسانوں کے درمیان کشت وخون ہوتا ہے۔ لیکن جنگ ظلم و ناانصافی کو مٹانے اور عدل وانصاف کو قائم کرنے کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور اسی کے لیے ہونی ہی چاہیے۔ اس طرح اسلام نے جنگ کا مقصد متعین کر دیا۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لیے جنگ کا کوئی جواز نہیں ہے۔

۶- مساوات: اس کا مطلب ہے معاشرے کے تمام افراد کو برابر سمجھنا، معاشرتی سلوک اور انسانی حقوق میں ان کے درمیان فرق نہ کرنا۔ قومی اور قبائلی تعصّبات کو ختم کرنا اور صرف تقویٰ اور خدا ترسی کو وجہ فضیلت سمجھنا۔ اللہ تعاریٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات:۱۳) ''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں، تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔'' مساوات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ سبھی انسانوں کو وسائلِ حیات اور ذرائعِ معیشت سے فائدہ اٹھانے کے برابر مواقع حاصل ہوں: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا، (البقرۃ:۲۹)

’’وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں‘‘۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ زمین میں اللہ نے انسان کے فائدے اور ضروریات کی تکمیل کے لیے جو بے شمار چیزیں پیدا کی ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کا ہر ایک کو حق حاصل ہے۔ کچھ لوگوں کا اس پر اس طرح قبضہ کہ دوسروں کو ان سے استفادہ کے مواقع نہ ہوں اور وہ اپنا حصہ نہ پاسکیں، صحیح نہیں ہے۔

اسلامی سیاست کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اس نے تمدنی ضروریات اور تقاضوں کے لیے بھی کوئی متعین نظام دیا ہے، جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ امن وامان کا قیام، بیرونی ممالک سے تعلقات، فوجی طاقت کا حصول، ریاست کی حفاظت، شہری اور انتظامی قوانین یا انتظامِ مملکت جیسے امور سے اسلامی سیاست بہ راہ راست بحث نہیں کرتی، البتہ عدل وانصاف اور عوامی فلاح وبہبود جیسے اصول اور دفع ضرر وجلب منفعت کی وہ پابند ہوگی۔

اسلامی سیاست پر جب گفتگو کی جاتی ہے تو اس کے اجتماعی نظم پر ہمارا زور صرف ہوتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس کا سیاسی ڈھانچہ کیا تھا؟ معیشت کے کیا اصول کارفرما تھے؟ حدود وقصاص کا نفاذ کن شرائط کے ساتھ تھا؟ لیکن یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اسلامی سیاست صحیح معنیٰ میں اسی وقت برگ وبار لائے گی اور اس کے نتائج سامنے آئیں گے جب اس کے پیچھے خدا ترسی اور آخرت کی باز پرس کا یقین کارفرما ہو۔ جہاں سیاست مادی مفادات کے حصول کا ذریعہ نہ ہو، بلکہ احساس ذمہ داری سے آدمی لرزتا ہو، جہاں ابوبکرؓ وعمرؓ اور عثمانؓ وعلیؓ کا کردار ہو، جہاں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ خوف دامن گیر ہو کہ ابھی حق ادا نہیں ہوا اور قیامت میں برابر سرابر چھوٹ جاؤں تو اسی میں میری کامیابی ہے۔ اس پہلو کو نظر انداز کرنے کے بعد اسلامی سیاست ایک ڈھانچہ ہے، جس میں کچھ بہتر اعمال کا ظہور تو ہوسکتا ہے، لیکن کل نتائج سامنے نہیں آسکتے۔

اسلام میدانِ سیاست میں ایک متبادل پیش کرتا ہے

اس وقت دنیا میں جو سیاسی بے چینی اور اضطراب ہے، طاقت ور قومیں کم زور

قوموں کا جس طرح استحصال کر رہی ہیں، امنِ عالم کو جو خطرات لاحق ہیں، اخلاقی قدریں جس طرح پامال ہو رہی ہیں، اِن کی وجہ سے یہ احساس بہ ہر حال ابھر رہا ہے کہ ہمارے پولٹیکل سسٹم میں کوئی خرابی ہے، اسے بدلنا چاہیے۔ کوئی ایسا نظام تلاش کرنا چاہیے جس میں ان مسائل کا حل ہو، لیکن کوئی متبادل حل ان کے پاس نہیں ہے۔ یہ بتایا نہیں جا رہا ہے کہ جب تک خدا کا خوف نہ ہو، احساسِ ذمہ داری نہ ہو، کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی۔ اسلام اس میدان میں ایک متبادل پیش کرتا ہے۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس پر ہمیں اصرار کرنا چاہیے۔ کہیے کہ ہمارے پاس ایک آئیڈیل ہے، ہماری گفتگو سے یہ پہلو ابھرنا چاہیے کہ ہمارے پاس متبادل ہے۔ اس پر دنیا کو غور کرنا چاہیے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

☆☆☆

خصوصی خطاب

نصرت علی*

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ نے اپنے سمینار کے لیے 'تہذیب و سیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار' کے موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ یہ موضوع میرے نزدیک کئی وجوہ سے اس وقت خاص اہمیت رکھتا ہے:

موضوع کی اہمیت کے وجوہ

پہلی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں تو پہلے بھی رہی ہیں، مگر اب اس کو خطرے کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اسلاموفوبیا کی مہم جاری ہے۔ کوئی اسے فسطائیت کہتا ہے، کوئی اسے دہشت گردی کو بڑھانے والا قرار دیتا ہے، کوئی اسے بنیاد پرست قرار دیتا ہے، کوئی تھیوکریسی کہتا ہے، کسی کے نزدیک وہ ماضی پرست اور دقیانوسی ہے، جس کی جدید تشکیل (Modernization) کی ضرورت ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں مسلک کی بنیاد پر اختلاف کو ہوا دی جا رہی ہے، ان میں انتشار پسند قوتوں کو ابھارا جا رہا ہے اور اسلامی تحریکات کے خلاف ہر طرح کا ظلم و تشدد برتا جا رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہماری طرف سے اس کی وضاحت ہو کہ اسلامی تہذیب اور اس کی سیاست فی الواقع کیا ہے؟

تیسری وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو موجودہ تہذیب کے علم بردار اسلام پر حملے کر رہے ہیں، تحریکاتِ اسلامی کو 'پولیٹکل اسلام' قرار دے کر ان کے خلاف تحریکیں چلا

---

* قیم جماعت اسلامی ہند و رکن مجلس منتظمہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ

رہے ہیں اور انھیں ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں، دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ کمیونزم کی ناکامی کے بعد اب سرمایہ دارانہ نظام کو بھی ہدفِ تنقید بنایا جا رہا ہے، بلکہ بعض حضرات تو اس کے خلاف تحریکیں چلا رہے ہیں۔ وال اسٹریٹ کی تحریک ہمارے سامنے ہے۔ رینڈر کی کتاب "World 2025" ابھی آئی ہے، جو آپ حضرات کے مطالعہ سے ضرور گزری ہوگی۔ اس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ۲۰۲۵ء تک موجودہ نظام اور نظریات ناکام ہو چکے ہوں گے اور دنیا کو ایک نئے نظام اور نئے نظریہ کی تلاش ہوگی۔ 'دی سیکولرائزیشن آف ورلڈ' نامی کتاب بھی سامنے آ چکی ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ دنیا نے مذہب کو چھوڑ کر کتنے دھوکے کھائے ہیں۔ اب اسے ایک ایسے مذہب کی تلاش ہے جو انسان کی صحیح راہ نمائی کر سکے۔

چوتھی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہ ایک تکثیری سماج ہے۔ اس سماج میں ہمیں اسلام پر عمل کرنا ہے، اسے دوسرے انسانوں تک پہنچانا ہے اور اپنی دینی شناخت کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ ہمارے لیے دیکھنے کی بات یہ ہوگی کہ اسلام کو ہم ہندوستان جیسے تکثیری معاشرہ میں کیسے پیش کریں؟ ہماری حکمت عملی کیا ہو؟ ملک کی موجودہ سیاست میں ہم اپنے بنیادی اصولوں سے سمجھوتہ کیے بغیر کیسے اپنا رول ادا کریں؟ اسلامی تہذیب اور دوسری تہذیبوں میں جو فرق ہے اسے کیسے ہم آہنگ کریں؟ اور ملک میں امن و انصاف کے قیام کے لیے معاشرہ کے دوسرے طبقات کے ساتھ مل کر کس طرح جدوجہد کریں؟

تہذیب کی بنیادیں

جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے تو ظاہر ہے، میں کوئی ایسی علمی شخصیت نہیں ہوں کہ اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کر سکوں۔ اس موضوع پر جو چند کتابیں میری نظر سے گزری ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب کسی فن، آرٹ، آرکیٹیکچر، ادب یا فنون لطیفہ کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ سب تہذیب کے مظاہر ہیں۔ حقیقت میں تہذیب کی

پانچ بنیادیں ہوتی ہیں۔ کسی بھی معاشرہ کی تہذیب کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان بنیادوں کو دیکھنا ہوگا اور یہیں سے تہذیبوں کا فرق نمایاں ہوتا ہے:

پہلی بات یہ کہ خدا کے وجود کے بارے میں اس کا نظریہ اور فکر کیا ہے؟ دنیا کی کوئی فکر یا کوئی نظریہ ہو، خدا کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اگر کوئی دہریہ ہے یا الحاد کا قائل ہے تبھی وہ خدا کا انکار کرتا ہے۔ دنیا میں کئی طرح کے افراد پائے جاتے ہیں: بہت سے خداؤں کو ماننے والا، ایک خدا کو ماننے والا، دو خداؤں پر یقین رکھنے والا، تین خداؤں کو ماننے والا، خدا کا انکار کرنے والا، بہر حال خدا کے بارے میں اس کا ایک نظریہ اور فکر ہوتا ہے اور اس پر اس کی تہذیب کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

دوسری بات، جو بہت بنیادی ہے، وہ یہ کہ کسی قوم کا تصورِ علم کیا ہے؟ اس کی ہدایت اور راہ نمائی کا ذریعہ کیا ہوسکتا ہے جسے Epistemology کہتے ہیں؟ ہم تو مانتے ہیں کہ خدا کی ہدایت ہمارے لیے کافی ہے۔ علم کا سرچشمہ وحی ہے۔ مگر دنیا نے عقل کو معیار بنایا ہے۔ عقلیت پسندی (Rationalism) کی تحریکیں اٹھیں۔ انھوں نے کہا کہ انسان بالغ ہوگیا ہے۔ اب اسے کسی خارجی علم اور خدائی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے حواس اس کے لیے کافی ہیں۔ دونوں کے بنیادی فرق کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

تیسری چیز یہ کہ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی ہے؟ ڈارون نے کہا کہ اس کا تدریجاً ارتقا ہوا ہے۔ اس میں خدا یا کسی اور ہستی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے 'کن' کہا اور کائنات وجود میں آ گئی۔ ظاہر ہے، دونوں نظریات سے جو تہذیبیں وجود میں آئیں گی وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوں گی۔

چوتھی چیز یہ کہ خود انسان کیا ہے؟ اسے لوگوں نے صرف ایک جسمانی وجود قرار دیا۔ اس کے پیچھے کوئی نفس ہے، احساسات و جذبات ہیں، عقائد ہیں، نظریات ہیں، اس کا کوئی منطقی انجام ہے؟ اس کے بارے میں جدید تہذیب خاموش ہے۔ جب کہ اسلام کے نزدیک انسان اشرف المخلوقات، اس کائنات کا خلاصہ اور اللہ کا خلیفہ ہے۔

پانچویں چیز بھی بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ وہ یہ کہ انسان کا نصب العین کیا ہے؟ وہ کسی چیز کے حصول کو کام یابی اور کس کو ناکامی قرار دے؟ ظاہر ہے، دنیا کے پاس انسانی زندگی کا کوئی اعلیٰ تصور نہیں ہے۔ لوگوں نے سمجھا کہ دنیا میں جو کیریر بنالے، دولت وشہرت حاصل کرلے، اونچے عہدے پالے، جس کے نام کے نعرے لگنے لگیں، وہ دنیا میں کام یاب ہے، ورنہ ناکام ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ اصل کام یابی یہ ہے کہ اللہ کے یہاں انسان نجات پاجائے اور اسے جنت حاصل ہوجائے۔ یہ ہے وہ حقیقی نجات (Salvation) جسے اسلام نے انسان کا اصل مقصود قرار دیا ہے۔

یہ پانچ چیزیں ہیں، جو تہذیب کی بحث میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

اسلام اور مغرب کے درمیان فرق

مغربی دنیا میں تو مسئلہ یہ تھا کہ ان کے پاس انسانی زندگی کے لیے کوئی راہ نمائی نہیں تھی۔ انھوں نے زندگی کے الگ الگ پہلوؤں پر مختلف بحثیں کیں، مذہب کو اجتماعی زندگی سے الگ کیا، سیاست کے لیے ایک نظریات قائم کیے اور تہذیب کو الگ قرار دیا۔ لیکن اسلام میں مذہب اور تہذیب الگ الگ نہیں ہیں۔ یہاں مذہب اور سیاست بھی جدا جدا نہیں ہوسکتے، اس لیے کہ جب ہم خدا کو حاکم مطلق، قادر مطلق اور خالق مطلق قرار دیتے ہیں تو پھر انسانی زندگی کے ہر میدان کے لیے راہ نمائی اسی کے پاس ہونی چاہیے۔ عقل اور شعور یہی کہتا ہے۔ یہیں سے یہ سوال نکل کر آتا ہے کہ اسلامی تہذیب کیا ہے؟

اسلامی تہذیب کی خصوصیات

اسلام سے پہلے جو مذاہب رائج تھے ان کا فکر وعمل اور تہذیب وتمدن سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن اسلام میں حقوق وفرائض کا حسین امتزاج ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے دوسرے انسانوں پر کیا حقوق ہیں اور دوسرے انسانوں کے تعلق سے اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ اس میں ممنوعات (Prohibitions)

کی تفصیلات بھی موجود ہیں۔ چنانچہ اسلامی تہذیب میں ممنوعات کا جو باب ہے، وہ عام طور پر دیگر تہذیبوں اور نظاموں میں موجود نہیں ہے، یا کم از کم ان میں اتنی تفصیل اور خاطر خواہ اہمیت کے ساتھ انھیں نہیں بیان کیا گیا ہے۔ وہاں بس کچھ چیزوں کا تذکرہ ہے کہ یہ کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا ہے۔ یہ بات انسان کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ اسے تفصیلی رہ نمائی اور اس کا عملی نمونہ درکار ہے۔ اسلام میں حقوق انسانی کا پورا منشور موجود ہے جو قرآن کی سورہ بنی اسرائیل وغیرہ اور رسول اللہ ﷺ کے خطبۂ حجۃ الوداع میں تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا پورا اسوہ موجود ہے۔ اسلامی خلافت کا پورا نظام موجود ہے، جسے غیر مسلموں نے بھی سراہا ہے۔ اس میں قانونِ الٰہی کی بالاتری پر زور دیا گیا ہے۔

اسلامی تہذیب کا زوال

مسلمانوں کی تہذیب وہ ہے جو انھیں اسلام سے حاصل ہوئی ہے۔ لیکن، جیسا کہ عرض کیا گیا، فکر و عمل کی قوت پہلے فنا ہوتی ہے، اس کے بعد کسی قوم پر زوال آتا ہے۔ چنانچہ جب مسلمانوں میں فکر و عمل کا زوال شروع ہوا تو ان کے اندر مجتہدانہ صلاحیت رکھنے والے علماء و محققین پیدا نہ ہو سکے اور سیاسی اقتدار بھی ان کے ہاتھ سے جاتا رہا، جب کہ دوسری طرف جدید تہذیب یا مغربی تہذیب دنیا پر غالب ہوتی چلی گئی۔ یہ بات ہم سب کے ذہن میں رہنی چاہیے کہ دنیا میں جب کوئی قوم سیاسی لحاظ سے غالب ہوتی ہے تو ساتھ ہی اس کی تہذیب کا غلبہ بھی ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ عیسائیت نے غلبہ حاصل کیا اور مسلمان پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں کتنے علوم و فنون ایجاد کیے، کتنے انکشافات کیے اور کس طرح سے دنیا کی راہ نمائی کی، یہ سمجھنے کے لیے آپ چاہے فلسفہ میں دیکھیں، سائنس میں دیکھیں یا طب میں دیکھیں، کسی بھی میدان میں مسلمانوں کے کارناموں کو پڑھ سکتے ہیں، مگر عجیب بات ہے کہ اب نہ صرف یہ کہ دوسروں نے ہماری خدمات کو فراموش کر دیا، بلکہ ہمارے تصور سے بھی ایک ایک چیز محو

ہوتی چلی گئی۔ ہم محکوم ہو گئے اور حاکم قوم کی تہذیب ہم پر مسلط ہونے لگی۔ عیسائیت کے پاس تو پہلے سے ہی انسانوں کی راہ نمائی کے لیے کوئی نظام اور طریقۂ حیات نہیں تھا، اس کے باوجود انھوں نے تہذیب کو کلیسا سے جوڑا۔ دھیرے دھیرے کلیسا اور حکومت کے درمیان کش مکش شروع ہوئی تو انھوں نے کلیسا کا انکار کیا، اس کے بعد عیسائیت کا انکار کیا اور بعد میں خدا ہی کا انکار کر بیٹھے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان کی زندگی سے خدا کا وجود نکلتا چلا گیا۔ اب اگر ان کے تصور میں کہیں خدا کا وجود پایا بھی جاتا ہے تو یہ بس کچھ روحانی یا اخلاقی نوعیت کا تصور ہے، جس میں انسانی زندگی یا انسانی تہذیب و سیاست سے خدا کا کوئی سروکار نہیں ہے۔

مغربی تہذیب کے مظاہر

ان دنوں جو ماڈرن تہذیب دنیا پر غالب ہے، وہ مغربی تہذیب ہے، جو یورپ، امریکہ، روس، اسرائیل، سب کی تہذیب ہے۔ یہ تہذیب صرف مغرب تک محدود نہیں ہے، بلکہ مغرب چوں کہ ساری دنیا میں گیا، اس لیے اس کی تعلیم وتمدن اور تہذیب و سیاست ساری دنیا میں پھیلی اور ہندوستان میں بھی وہی تہذیب غالب ہے۔

وہ تہذیب کیا ہے؟

فرائڈ نے کہا کہ انسانی زندگی میں جنس (Sex) ہی اصل چیز ہے۔ کارل مارکس نے کہا کہ اصل مادہ ہے، لہٰذا اس نے مادیت (Materialism) کو پیش کیا۔ اس نے کہا کہ مادہ کبھی ختم نہیں ہوتا، بلکہ شکل بدلتا ہے۔ وہ ابدی ہے، اس کو فنا نہیں کیا جا سکتا۔ ڈارون نے کہا کہ کوئی طاقت اس کائنات کو پیدا کرنے والی نہیں ہے۔ یہ خود بخود دھیرے دھیرے وجود میں آ گئی اور اس کی شکل بدلتی چلی گئی۔ کسی نے کہا کہ انسانی زندگی کے لیے کسی خارجی رہ نمائی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے انسانوں کی اجتماعی عقل کافی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ مجتمع ہو کر جو بات کہنے لگیں وہی ٹھیک ہے۔ ان نظریات سے جس تہذیب کی تشکیل ہوئی وہی مغربی تہذیب ہے اور اس کے بطن سے ایک سیاسی

نظام وجود میں آیا، سیاست بے خدا ہوگئی، علوم وفنون خدائی تصور کے بغیر مدون کیے جانے لگے۔ چنانچہ اب مختلف علوم وفنون کی جتنی کتابیں ہمیں پڑھنے کے لیے ملتی ہیں اور جو ہمارے نصابات میں پڑھائی جاتی ہیں وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی علم میں خدا کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ انسان کی زندگی میں مادہ پرستی اور نمائش پسندی آئی، دولت وشہرت اور اقتدار ہی مقصودِ زندگی قرار پائے، کوئی اعلیٰ نصب العین اس کے سامنے نہیں رہا۔ اس نے اس نکتہ پر غور کرنا ہی چھوڑ دیا کہ میں آخر کشاں کشاں کہاں جارہا ہوں اور وہاں میرے ساتھ کیا ہونا ہے؟ فحاشی، عریانیت، بغیر نکاح کے جنسی تعلق (Live in Relationship) اور ہم جنسیت (Homosexuality) عام ہورہی ہے۔ کل تک ایک دوسرے کے سامنے جن الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے شرم آتی تھی اب اس پر مباحثے ہورہے ہیں۔ بے حیائی، فحاشی اور گندگی پھیلی جارہی ہے۔ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا یا سوشل میڈیا، ان سب چیزوں سے انسانوں کے ذہنوں کو مسموم کیا جارہا ہے۔ خودغرضی عام ہوگئی ہے۔ ایک صاحب نے صحیح کہا کہ آج انسان یہ تو بتا سکتا ہے کہ اس وقت کناڈا میں کیا ہورہا ہے؟ آسٹریلیا میں کیا سرگرمیاں چل رہی ہیں؟ برازیل میں شیئر کے دام گھٹ رہے ہیں یا بڑھ رہے ہیں؟ مگر وہ اپنے پڑوسی کی کراہ نہیں سن پاتا۔ زمینی دوریاں کم ہورہی ہیں، مگر دلوں کے فاصلے بڑھ رہے ہیں۔ مکمل آزادی کے تصور کی وجہ سے خاندانی اور اخلاقی قدریں زوال پذیر ہیں۔ مادہ پرستی اس قدر حاوی ہے کہ ہر فرد اور ہر ملک کو صرف یہ فکر ہے کہ کسی بھی طرح ہمارا پروڈکٹ فروخت ہونا چاہیے۔ کسی نے بہت اچھی بات کہی ہے کہ Homosexuality اور Live in Relationship کی جو تحریکیں چل رہی ہیں ان کے پیچھے بھی معاشی مفادات کام کررہے ہیں۔ یہ اس تہذیب کے شاخسانے ہیں جو اب پوری دنیا پر حاوی ہے۔

ہماری ذمہ داریاں

اب گفتگو کا یہ حصہ باقی ہے کہ ہمیں اس صورت حال میں کیا کرنا چاہیے؟

اسلامی تہذیب کے علم برداروں کے لیے پہلی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے فرق کو گہرائی کے ساتھ سمجھیں۔ یہ بات اس لیے ضروری ہے کہ بعض پڑھے لکھے لوگ بھی معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام کی فلاں تعلیم کے بارے میں ہمیں پھر غور کرنا چاہیے، تاکہ سماج کے ساتھ ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ حالاں کہ Adjustment کے معنی مداہنت نہیں ہیں، بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر کیسے چل سکتے ہیں؟ ہمارا لائحہ عمل کیا ہو کہ ہم اپنے تہذیبی عناصر کو برقرار رکھتے ہوئے سماج میں اپنا حقیقی اور تعمیری رول ادا کر سکیں؟

ہمارے اور ان کے درمیان صرف یہ فرق نہیں ہے کہ وہ عورتوں کے بارے میں کچھ الگ کہتے ہیں، یا منشیات کا استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ ہمارے اور ان کے درمیان Worldlview اور Cosmology کا فرق ہے۔ کائنات اور انسان کے بارے میں بنیادی تصور کا اختلاف ہے۔ ہم ان سے بات کریں گے کہ آیئے، ہم مل کر حق کو تلاش کریں، نہ یہ کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ ایسا خیال اپنے عقائد و افکار کو صحیح طریقے سے نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا نقصان یہ ہے کہ ہمارے درمیان ترسیل و ابلاغ کا خلا پیدا ہو جاتا ہے، جس سے غلط فہمیوں کا دروازہ کھلتا ہے اور بالآخر غالب تہذیب کے علم بردار ہمیں اپنی تہذیب میں ضم کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

موجودہ تہذیب کے پاس اخلاقی اور روحانی لحاظ سے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک جگہ بڑی اچھی بات کہی ہے کہ مغربی تہذیب اخلاقی اور روحانی بنیادوں سے محروم ہے، چنانچہ جب وہ سرمایہ داری پر تیشہ چلاتے ہیں تو اشتراکیت آجاتی ہے، جمہوریت کی اصلاح کے لیے اٹھتے ہیں تو ڈکٹیٹرشپ اس کی جگہ لے لیتی ہے، جب وہ اپنی اجتماعی مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو نسائیت (Feminism) اور برتھ کنٹرول کے تصورات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ گویا یہ تہذیب بھٹک رہی ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ مولانا مودودیؒ،

سید قطب شہیدؒ، علامہ اقبالؒ اور دیگر بہت سے اسلامی مفکرین نے اس موضوع پر کام کیا ہے، جس کا خلاصہ بقول شاعر یہ ہے۔

محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش

ہم دنیا کے مسائل کا حل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پیش کریں، اسی طرح برادران وطن کو فلاح ونجات کا راستہ دکھائیں۔ ایک ایک شخص کو آخرت کی کامیابی، جنت کے حصول اور دنیا میں سکون واطمینان پانے کا صحیح راستہ پیش کریں۔ اس کے علاوہ اس ملک کو اسلام کے نظام عدل سے واقف کرائیں۔ یہاں غربت کیسے دور ہوسکتی ہے؟ ماحولیات کو کیسے درست کیا جاسکتا ہے؟ مزید جو مسائل ملک اور سماج کو در پیش ہوسکتے ہیں، یا اب پیدا ہورہے ہیں، ان کو حل کرنے کے سلسلے میں اسلام کیا راہ نمائی کرتا ہے؟ اسے تفصیل کے ساتھ بتایا جائے۔ اس کے لیے ہمیں علمی تیاری کرنی ہوگی، اپنے موقف میں مضبوطی کا ثبوت دینا ہوگا اور آگے بڑھ کر حوصلے کے ساتھ مسائل زندگی کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

ہندوستان میں مطلوبہ لائحہ عمل

ہندوستان کے تکثیری معاشرہ میں ہمیں ایک بڑا رول ادا کرنا ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کرام نے جہاں انسانوں کو عقائد کی دعوت دی ہے، وہیں اپنے زمانہ کے عام انسانی مسائل پر بھی آواز اٹھائی ہے۔ ہمارا مسئلہ صرف مسلمانوں کا ہی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ عام انسانوں کا مسئلہ بھی ہے۔ جس طرح امن وامان کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اسی طرح دوسرے انسان بھی اس کے ضرورت مند ہیں، عدل وانصاف اور صفائی ستھرائی سب کی ضرورت ہے، غربت و جہالت سب کا مسئلہ ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ مسلمان بعض مسائل میں دوسروں سے زیادہ متاثر ہوں، لہٰذا ان مشترکہ مسائل میں متحدہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ہمیں دیگر مذاہب اور سوشل گروپس کو ساتھ لے کر میدان عمل

میں آنا ہوگا۔

مادہ پرست تہذیب کے یہ اثرات، جن کا ابھی ذکر کیا گیا، ہندوستانی سماج میں ہر سطح پر پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف ہم ملک کو بتائیں کہ یہ اسلام کی تہذیب اور اس کا سیاسی نظام ہے، جو یہاں کے تمام مسائل کو حل کرسکتا ہے، دوسری طرف ہم یہ کوشش کریں کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور تمام شہریوں کو جو آزادی حاصل ہے وہ برقرار رہے، اسے کوئی ختم نہ کرے پائے۔ ایسی طاقتیں یہاں برسر اقتدار نہ آنے پائیں جو ہمارے نظریہ، ہماری فکر اور ہماری تہذیب کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور پورے ملک کو کسی خاص تہذیبی رنگ میں رنگنے کا ایجنڈا رکھتی ہیں۔ ہماری یہ بھی کوشش ہونی چاہیے کہ یہاں کی سیاست اخلاق وکردار پر مبنی ہو، سیاست کو جرام پیشہ افراد اور بدعنوانیوں سے پاک کیا جائے۔ ظاہر ہے، یہ تمام کام یہاں دوسری مذہبی، تہذیبی اور سماجی اکائیوں کو ساتھ لے کر ہی انجام دیے جاسکتے ہیں۔

توقع ہے کہ اس سمینار میں ان موضوعات پر تفصیل کے ساتھ بحث وگفتگو ہوگی، جس سے فکر کے نئے گوشے اور عمل کی نئی راہیں سامنے آئیں گی۔ اللہ تعالیٰ اس سمینار کو اپنے مقاصد میں کام یابی عطا فرمائے۔ آمین!

☆☆☆

صدارتی خطاب

تہذیب اور سیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار

ظفر الاسلام خان*

یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ ایک سنجیدہ اور گہرے موضوع کو آپ نے اس سیمینار کا موضوع بنایا ہے۔ کسی تہذیب کی تشکیل یا اس کی حفاظت کرنا تو بہت بڑی بات ہے، کوئی معاشرہ اور کوئی قوم صرف اسی وقت اپنے علاقے اور اس دنیا میں اپنی جگہ بنا پاتی ہے جب وہ علم میں متفوق ہو۔ سماجی، سیاسی، تعلیمی، طبی، علمی اور عسکری میادین میں یہ تفوق کسی قوم کو قائدانہ جگہ دیتا ہے۔ جیسے ہی یہ علمی تفوق کمزور پڑتا ہے یا ختم ہو جاتا ہے، دوسری طاقتیں اس خلا کو پر کرنے کے لیے آ جاتی ہیں۔

ماضی قریب کی تاریخ دکھا رہی ہے کہ کس طرح دوسری جنگ عظیم سے پہلے برطانیہ، فرانس اور جرمنی متفوق تھے لیکن علم اور ٹکنالوجی کی بدولت امریکہ ان سب سے آگے بڑھ گیا اور آج بھی یہ تفوق برقرار رکھے ہوئے ہے۔ آج امریکہ میں ۱۸۰ تھنک ٹینک یعنی اعلیٰ ریسرچ، مستقبل کی پیش گوئی کرنے، مستقبل میں ممکنہ خطرات کی نشان دہی اور نئے متبادل تجویز کرنے والے ادارے ہیں جب کہ ہمارے اپنے ملک ہندوستان میں ایسے صرف ۱۸ ادارے ہیں۔ اور جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا سوال ہے تو ان کا اپنا کوئی تھنک ٹینک نہیں ہے۔ اگرچہ ایک ادارہ اس کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اس نے مسخرہ پن اور کروڑوں روپوں کے ضائع کرنے کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں دیا۔ اب بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک سنجیدہ تھنک ٹینک وجود میں آئے جو نہ صرف

---

* صدر مسلم مجلس مشاورت و ایڈیٹر ملی گزٹ، نئی دہلی

ماضی اور حال پر گہری نظر رکھے بلکہ مستقبل کے لیے بھی پلاننگ کرے اور ملت مسلمہ کو پوری ایمان داری کے ساتھ راستہ دکھائے۔

مسلمانوں کا زوال تقریباً سولہویں صدی میں اس وقت شروع ہوا جب ہم ہر میدان میں پیچھے جا رہے تھے اور یورپ نت نئے انکشافات کر کے ایک نئے صناعتی عصر کی بنیاد رکھ رہا تھا جس میں ایک طویل مدت لگا کر ہاتھ سے ایک ایک سامان نہیں بنتا تھا بلکہ مشینوں کے ذریعہ آناً فاناً بہت عمدگی کے ساتھ سامانوں کا ماس پروڈکشن ہونے لگا۔ چھاپہ خانہ جرمنی میں ۱۴۵۰ء میں ایجاد ہو چکا تھا لیکن ہندوستان اور مصر تک پہنچنے میں اسے کئی سو سال لگے۔

ہمارا یہ زوال جو پے در پے تاتاری اور صلیبی حملوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تھکن اور پژمردگی سے شروع ہوا تھا مغربی سامراج کے ہاتھوں مکمل شکست پر منتج ہوا۔ علمی اور عسکری زوال کے ساتھ ہمارا سیاسی، سماجی اور انسانی زوال بھی بڑی تیزی سے عمل میں آ رہا تھا۔ ہر مسلم ملک میں آمریت اور سیاسی استبداد کا غلبہ تھا۔ حقوق انسانی اور قانون کی حاکمیت کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ جس وقت برطانیہ میں میکنا کارٹا (۱۲۱۵ء) کے ذریعہ ہر شہری کے حقوق متعین ہو رہے تھے اور حاکم وقت کے اختیارات محدود ہو رہے تھے، عالمِ اسلام کا ہر شخص حاکمِ وقت کا غلام تھا۔ لاقانونیت کی یہ حالت تھی کہ اس زمانے میں تقریباً ڈیڑھ سو سال تک عثمانی خلافت میں یہ ظالم روایت برقرار رہی کہ بادشاہ کے تمام اعزہ و اقرباء کو، جو بادشاہت کا دعویٰ کر سکتے تھے، چن چن کر قتل کر دیا جاتا تھا۔ حکومت کے ادنیٰ سے ادنیٰ مخالف کو برسر عام ذبح کر کے اس کی لاش شہر کے چوک پر ٹانگ دی جاتی تھی۔ ایک ایسے غلام عالم اسلام کے لیے ایک غلامی سے دوسری غلامی بدلنا مشکل نہیں تھا۔

بیسویں صدی میں بھی جب ساری دنیا میں حقوق انسانی اور حکومت کے اختیارات کا تعین ہو رہا تھا اور عوام منتخب اور بااختیار پارلیمنٹوں کے ذریعہ اپنے حاکم خود ہی چن رہے تھے، عبدالرحمٰن الکواکبی کو طبائع الاستبداد و مصارع الاستعباد (۱۹۰۲ء) لکھنی

پڑی۔ وہ صورت حال آج بھی بڑی حد تک نہیں بدلی ہے۔ عرب ممالک کو لے لیں جہاں حاکم تقریباً ہر جگہ مطلق اختیارات کا مالک ہے اور پارلیمنٹ اگر ہے بھی تو اس کی حیثیت اب بھی صرف ربراسٹیمپ کی ہے۔ ایسی حالت میں غلام رعایا کیسے بڑے خواب دیکھ سکتے ہیں اور سائنس اور ٹکنالوجی میں کیسے امتیاز پیدا کر سکتے ہیں؟

اگرچہ عالم اسلام نے ۵۰-۶۰ سال قبل مغربی سامراج سے آزادی حاصل کر لی تھی لیکن غلامی کا طوق ہماری گردنوں میں بدستور پڑا رہا اور مغربی قوموں کے ہاتھوں ہمارا استحصال بھی ہوتا رہا۔ جب بھی ہمارے کسی ملک نے اس غلامی کے طوق کو نکال پھینکنے کی کوشش کی، اسے بری طرح کچل دیا گیا۔ اس کھیل میں ہمارے ہی کچھ لوگوں نے مغرب کے ایجنٹ کے طور سے کام کیا۔

تقریباً چار دہوں سے ہمارے متعدد ممالک میں سیال یا کالا سونا یعنی پٹرول اور گیس کی بدولت بے پناہ دولت آئی لیکن طبقۂ حکام اور خواص کے بے پناہ تعیّش کے علاوہ اس دولت کا کوئی خاص استعمال نہیں ہوا۔ آج بھی ان ممالک سمیت ۵۸ مسلم ممالک کی صرف ۵ یونیورسٹیاں دنیا کی عظیم ۵۰۰ یونیورسٹیوں کی لسٹ میں ہیں۔ (تین سعودی عرب، ایک ایران اور ایک ترکی میں)۔ آج بھی ان ملکوں کے بیماروں کو لندن، پیرس اور نیویارک علاج کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ آج بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے لاکھوں طلبہ ان ملکوں سے مغربی ممالک جاتے ہیں۔ کوئی قابل قدر تھنک ٹینک ان ممالک میں نہیں قائم ہوا ہے۔ ننھے منّے اسرائیل کے سامنے یہ سب ممالک بے بس ہی۔ لیکن اس میں کسی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ وہی اسرائیل ہے جس میں ۶ تھنک ٹینک ہیں اور جس کی ۶ یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیمی ادارے دنیا کی بہترین ۵۰۰ یونیورسٹیوں میں جگہ پائے ہوئے ہیں اور جس کی صحافت پوری طرح آزاد ہے جب کہ ہر مسلم ملک میں ذرائع ابلاغ کسی نہ کسی حد تک حکومت کے غلام ہیں۔

آپ کے سیمینار کا موضوع ''تہذیب و سیاست میں اسلام کا کردار'' ہے۔ یہاں میں کہنا چاہوں گا کہ تہذیب کا سیاست سے گہرا تعلق ہے۔ سیاسی غلبہ کی وجہ سے ہی

کوئی تہذیب پروان چڑھتی ہے، چاہے وہ اچھی ہو یا بری۔ تہذیب بالعموم ایک طرزِ زندگی و معاشرہ، سماجی و سیاسی نظام، زبان وادب وغیرہ کے مجموعی منظومہ کا نام ہے۔ تہذیب کو بالعموم وہ طبقۂ خواص تشکیل دیتا جو سیاسی طور پر غالب ہوتا ہے اور جیسے یہ طبقۂ خواص مغلوب ہوتا ہے، اس کی تہذیب بھی دھیرے دھیرے بکھرتی چلی جاتی ہے۔ خود ہندوستان میں دیکھئے کہ انگریزوں کے آنے کے بعد کس طرح ایک طرزِ حیات کا خاتمہ ہوا جس میں فارسی زبان کا خاتمہ بھی شامل تھا۔ اور اب آزادی کے بعد ایک مخصوص طبقہ کے تسلط کی وجہ سے باقی ماندہ کسر بھی پوری ہوئی۔ اور اب اردو زبان، جس کو مسلمانوں نے فارسی کے بعد حرزِ جان بنا کر رکھا ہوا تھا، وہ بھی عملی طور سے ذبح کر دی گئی ہے اور یہ سب صرف ایک فرقہ پرست گروپ کے سیاسی طور پر غالب ہونے اور دوسرے گروپ کے مغلوب ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ عمل اس سے پہلے ہم نے صقلیہ، اندلس، الجزائر اور وسطی ایشیا وغیرہ میں دیکھا ہے۔

آج آزاد ہندوستان کے تناظر میں ہمیں دیکھنا ہے کہ ہم کس طرح اپنے باقی ماندہ تہذیبی تشخص کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ہمیں یہاں کے تعددی (لفظ ''تکثیری'' غلط ہے) معاشرہ میں اپنی جگہ بنانی ہے۔ ہم اس چیلنج میں بھی اپنی بے بصیرتی، آپسی جھگڑوں اور سیاسی بے وزنی کی وجہ سے اب تک ناکام رہے ہیں۔ لیکن کیا ہندوستان کی باقی ماندہ اسلامی تہذیب وثقافت کا یہی مقدر ہے کہ وہ پوری طرح ''خبر کان'' یا صدائے ماضی میں تبدیل ہوجائے؟

اپنی باقی ماندہ تہذیب اور ثقافت کی حفاظت کے لیے ہم کو موجودہ حالات کی مناسبت سے ایک حد تک سیاسی طاقت حاصل کرنی ہوگی جب کہ حالت یہ ہے کہ ہم محض دوسری پارٹیوں کے لیے ووٹ بینک بنے ہوئے ہیں۔ جھوٹے وعدوں کی بنیاد پر وہ ہمارا ووٹ لینے کے بعد ہمیں صرف اگلے الیکشن کے وقت ہی یاد کرتی ہیں۔ کیا یہ صورت حال ہم کو جھنجھوڑتی نہیں ہے؟

ہمارے دانشوروں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ایسے طریقے نکالیں جس کی

وجہ سے ہمارا باقی ماندہ تمدن اور ہماری شناخت بچ سکے۔ اس مہم میں علماء اور ریسرچ اسکالرز کی بڑی ذمہ داری ہے۔ ایک شکست خوردہ قوم کی طرح سے ہم نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ ہر جدید بدعت ہے۔ ایک گھسے پٹے روایتی انداز میں سوچنا اور لکھنا ہم نے وطیرہ بنالیا ہے۔ ریسرچ اور علمی تحقیق کے جدید اصول سے ہم نابلد ہیں اور سیکھنا بھی نہیں چاہتے ہیں۔ بدلتے ہوئے زمانہ کے لحاظ سے سوچنا اور خود کو بدلنا ہم نے بند کر دیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ عملی طور پر اس ملک میں ہم پوری طرح حاشیہ پر ہیں۔ ہم صرف سیاسی حاشیہ پر ہی نہیں بلکہ اقتصادی، معاشی، علمی، سماجی جیسے سارے میادین میں دوسری قوموں کے بہت پیچھے کھڑے نظر آتے ہیں۔

یہ صورت حال ہمیں ایک چیلنج دیتی ہے اور چیلنج قبول کرنے والی قوموں کو ہی زندگی ملتی ہے۔ دوسری عالم گیر جنگ میں پوری طرح تباہ ہونے والے جرمن اور جاپانیوں نے اپنے عمل اور جانفشانی سے دکھایا ہے کہ اس عالم الاسباب میں کوئی بھی چیز ناممکن نہیں ہے۔ لیکن اسی عالم الاسباب میں ہم ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر صرف دوسروں پر الزام دیتے آئے ہیں کہ ہمارے سارے مسائل کے ذمہ دار دوسرے ہیں جب کہ اللہ پاک نے واضح طور سے کلام پاک میں ہمیں پندرہ صدی قبل بتادیا تھا: "**ان الله لايغير مابقوم حتى يغيروا ما بأنفسهم**" ۔ یعنی تبدیلی ہمیں لانی ہے اور اپنے اندر لانی ہے اور اس کے نتیجہ میں ہی ہمیں خداوندی مدد اور توفیق ملے گی۔ ورنہ "**سنة الله في الأرض – ولن تجد لسنة الله تبديلاً**"— کے مطابق ہمیں وہی ملے گا جس کے ہم اپنے اعمال کی وجہ سے مستحق ہیں۔

ہمارے طبقۂ خواص، علماء اور دانشوروں کو اپنے گوشۂ عافیت سے نکلنا ہوگا۔ اپنی چھوٹی مصلحتوں کو قربان کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے علم اور عمل سے اپنی باقی ماندہ تہذیب وتمدن کو بچانا ہوگا اور وہ ماحول پیدا کرنا ہوگا جس میں مسلم قوم اس ملک میں دوبارہ سر اٹھا کر جی سکے اور معاشرے کے غالب حصے کا احترام پا سکے۔



اسلامی تہذیب اور مغربی چیلنج

محمد سعود عالم قاسمی*

اسلام ایک پاکیزہ عقیدہ، درخشاں تہذیب اور مکمل نظامِ زندگی ہے۔ یہ انسان کو یقین و اعتماد کی دولت بخشتا ہے۔ سماجی وحدت اور سیاسی قوت عطا کرتا ہے۔ اسلام کا کلمۂ توحید وہ کلمہ ہے جو اللہ وحدہ لاشریک کی ذات والا صفات میں انسانی اعتقاد کو مرتکز کر کے جوہر ایمان عطا کر دیتا ہے۔ یہ کلمۂ توحید جب انسان کے دل و دماغ میں داخل ہوتا ہے تو اس کے وجود کی تھرتھراہٹ کو یقین کی حرارت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ایمان کی کشتی کو اوہام وخرافات کے طوفانوں سے بچا کر ساحل مراد سے لگا دیتا ہے اور انسان کو توحید کی بنیاد پر مساف زندگی میں سرگرم عمل بنا دیتا ہے۔ یہ سرگرمی عملِ صالح کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس سے ایسی تہذیب وجود میں آتی ہے جو صلاحیت اور صالحیت کے لحاظ سے خدا پرست، انسانیت نواز اور تعمیری مزاج کی حامل ہوتی ہے۔ یہی سرگرمی اجتماعی، معاشی اور سیاسی قوت میں ڈھل کر نظام کلی بن جاتی ہے اور انسانوں کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک اجتماعی وحدت میں جوڑ دیتی ہے جس کا وسیلہ انسانی قوت ہے اور جس کا مقصد اللہ کی خلافت کو اس کے پورے اثرات اور تقاضوں کے ساتھ زمین میں نافذ کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کلمۂ توحید اور اس کے تہذیبی ثمرات کو تمثیلی پیرایہ میں بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا
ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ. تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا

---

* سابق ناظم دینیات (سنی) وڈین فیکلٹی شعبۂ دینیات، اے ایم یو، علی گڑھ

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ'' (ابراہیم: ۲۴-۲۵)

(کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے۔ وہ اس پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان کی بلندی کو چھو رہی ہیں۔ وہ درخت برابر اپنے رب کے حکم سے پھل دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ مثال اس لیے دے رہا ہے کہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔)

یہ عقیدہ توحید جب انسانی قلوب میں جاگزیں ہوتا ہے تو اپنی جڑیں اس طرح مضبوط کر لیتا ہے کہ شبہات اور تشکیک کا کوئی جھونکا اسے متزلزل نہیں کر پاتا اور شرک و الحاد کی کوئی آندھی اسے اکھاڑ نہیں پاتی۔ یہ عقیدۂ توحید اپنے برگ و بار اس طرح لاتا ہے کہ اس کی بلندی کو حیوانی پستی چھو نہیں سکتی اور اس کی پاکیزگی کو زمین کی کثافت آلودہ نہیں کر پاتی۔ اس عقیدہ کی خصوصیت ایمان کی گہرائی اور اعمال کی بلندی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس عقیدہ کی قوت اور اس کی اثر انگیزی کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ ایسا بار آور اور نتیجہ خیز کلمہ ہے کہ جو شخص یا قوم اسے بنیاد بنا کر اپنی زندگی کا نظام اس پر تعمیر کرے، اس کو ہر آن اس کے مفید نتائج حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ وہ فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامت، مزاج میں اعتدال، سیرت میں مضبوطی، اخلاق میں پاکیزگی، روح میں لطافت، جسم میں طہارت و نظافت، برتاؤ میں خوشگواری، معاملات میں راست بازی، کلام میں صداقت شعاری، قول و قرار میں پختگی، معاشرت میں حسنِ سلوک، تہذیب میں فضیلت، تمدن میں توازن، معیشت میں عدل و مواساۃ، سیاست میں دیانت، جنگ میں شرافت، صلح میں خلوص

اور عہد و پیمان میں وثوق پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا پارس ہے جس کی
تاثیر اگر کوئی ٹھیک ٹھیک قبول کر لے تو کندن بن جائے“۔[1]

سید قطب شہید نے اس پاکیزہ عقیدہ کے امتیازات اور خصوصیات کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

”اسلام ایک شعوری عقیدہ ہے جس سے ایک قانون شریعت کا وجود ہوتا ہے اور جس پر ایک معاشرتی نظام قائم ہوتا ہے، ایسا نظام جو دوسرے تمام معاشرتی نظاموں سے جن کا انسانیت نے مشاہدہ کیا ہے، یکسر مختلف اور ان کے مقابلہ میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے اور ایسے بنیادی اجزا سے مرکب ہے جو اس کے ساتھ خاص ہیں ...... ان خصوصیات میں سے ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک عالمی نظام ہے جو ہر طرح کی نسلی عصبیت اور مذہبی تعصب سے پاک ہے۔ اسی لیے وہ ہر انسان کو اجازت دیتا ہے کہ بآسانی اس کے قافلہ میں شامل ہو جائے اور شامل ہوتے ہی وہ تمام حقوق حاصل کر لے جو ہر مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں خواہ وہ کسی نسل اور کسی قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو“۔[2]

اس عقیدہ نے ایک درخشاں تہذیب کو برپا کیا ہے۔ تاریخ میں ایک ایسے روشن باب کا اضافہ کیا ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اس نے انسانی دلوں کی تطہیر اور انسانی دنیا کی تعمیر میں زبردست کردار ادا کیا ہے اور انسانوں کو ایک ایسے مثالی نظام زندگی سے روشناس کرایا ہے جو لوگوں کے لیے رحمت و نعمت ثابت ہوا ہے، مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بقول:

”جس طرح موسم بہار میں نباتات اور انسانوں کے مزاج موسم سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح محسوس اور غیر محسوس طریقہ پر اسلامی اقتدار و تمدن کے زمانہ میں لوگوں کی طبیعتیں اور ذہنیتیں متغیر اور اسلام سے متاثر ہونے لگیں۔ دلوں میں گداز و نرمی پیدا ہونے لگی، اسلام کے

اصول وحقائق دل ودماغ میں پیوست ہونے لگے، اشیاء کی قدر وقیمت کے بارے میں لوگوں کا نقطۂ نظر بدلنے لگا، کل تک جن چیزوں اور جن صفات کی لوگوں کی نگاہ میں بڑی وقعت واہمیت تھی اب وہ جاتی رہیں اور جو چیزیں بے وقعت تھیں اب وہ وقیع بن گئیں، پرانے معیاروں کی جگہ نئے معیاروں نے لی۔ جاہلیت، رجعت پسندی اور جمود کی علامت بن گئی اور اس کے متبعین میں احساس کمتری پیدا ہوگیا۔ اسلام کی طرف انتساب اس کے شعائر اور خصوصیات کو اختیار کرنا ایک فخر اور تعریف کی چیز بن گئی، دنیا اسلام سے آہستہ آہستہ قریب ہورہی تھی جس طرح اس کرۂ ارضی کے رہنے والوں کو آفتاب کے گرد گردش کا احساس نہیں ہوتا، اسی طرح ان قوموں کو اور ان کے افراد کو اپنے اسلامی رجحانات اور اسلام کے اندرونی اثرات کا احساس نہیں ہوتا تھا، ان اثرات سے نہ علم وفلسفہ خالی تھا نہ مذاہب وتمدن، لوگوں کے ضمیر اور ان کے باطن ان اثرات کی شہادت دیتے تھے اور ان کے اصلاحی میلانات اس کی غمازی کرتے تھے، مسلمانوں کے تنزل کے بعد بھی جو اصلاحی تحریکات ان قوموں میں پیدا ہوئیں وہ اسلامی اثرات اور اسلامی خیالات کا نتیجہ ہیں''۔[1]

اسلام کے اثرات جن علاقوں میں پھیلے اور حاملین اسلام کے قدم جن ممالک میں پہونچے وہاں تہذیب وتمدن کے نئے باب روشن ہوئے۔ روحانی اقدار اور سماجی مساوات کی آبیاری ہوئی، انسانی معاشرہ میں عدل واحسان، برداشت اور حریت وآزادی کی لہر پیدا ہوئی۔ اسلامی نظام نے زندگی کے ہر گوشے میں نئی روشنی عطا کی۔ تعمیر وترقی کی نئی جہت دکھائی۔ دوسری تہذیبیں جن کا سابقہ اسلام سے پیش آیا وہ اسلام کے انقلاب آفریں پیغام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اسلامی تہذیب نے بھی دنیا کی دوسری تہذیبوں کو حرف غلط کی طرح نہیں مٹایا۔ صالح عناصر کو قبول کرنے اور ان کو

وسعت دینے میں کسی تحفظ اور تذبذب سے کام نہیں لیا بلکہ پوری فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی سے کام لیا۔ رواداری اور باہمی تعاون کی فضا کو فروغ دیا۔ اس کا معاملہ انسان دوستی اور حسن عمل کا تھا۔ قرآن پاک نے حکم دیا:

”وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ“ (العنکبوت:۴۶)

(اور یہود و نصاریٰ سے صرف اچھے ڈھنگ سے مباحثہ کرو۔)

جزیرۂ عرب کے بعد اسلام کا سابقہ عیسائی ممالک اور عیسائی تہذیب و تمدن سے ہوا۔ اسلام کے پھیلاؤ کو عیسائی دنیا نے اپنے لیے ایک چیلنج سمجھا۔ عیسائی ممالک بہت تیزی سے اسلام کے زیر نگیں آنے لگے اور عیسائیت کے تاریخی قلعوں پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ عیسائیت کے وہ مراکز جو اپنا مذہبی مقام اور تہذیبی نشان رکھتے تھے، وہ سب اسلام نے فتح کر لیے۔ خواہ وہ فلسطین ہو، شام ہو، قسطنطنیہ یعنی ترکی ہو یا مصر، ہر جگہ عیسائی قلعہ پر اسلام نے اپنے علم نصب کر دیے۔ عیسائی دنیا میں اس کا ردعمل ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ عیسائی حکمرانوں اور ان کے مذہبی پیشواؤں نے پہلے تو شکست خوردہ نفسیات کے ساتھ اسلام کے خلاف نفرت و عداوت کا اظہار کیا۔ بعد میں اس عداوت کو اپنی قومی تہذیب کا حصہ بنالیا۔ ادب، فلسفہ، تاریخ، مذہب، سیاست اور تمدن میں اس زہر کے اثرات نمایاں ہونے لگے اور اس کی تلخی سے عیسائی دنیا بھر گئی۔ اسلام کے خلاف صلیبی جنگ برپا کی گئی اور یورپ سے اسلام کو نکالنے کے لیے خون کی ندی بہائی گئی۔

مغرب نے جب چرچ یعنی عیسائی مذہب کی سیاسی بالادستی سے بغاوت کی اور مذہب کو عیسائیوں کے نجی معاملات میں محدود و محصور کر دیا تب بھی اسلام دشمنی کا خمیر اس کے شعور میں جڑ پکڑے رہا۔ کیونکہ وہ اسلام جو عیسائیت کے منحرف مذہبی اعتقادات پر ضرب لگاتا تھا، مغرب کی لادین تہذیب پر ضرب کاری لگا سکتا تھا۔ یہ اسلام ہی کی قوت تھی جو مغرب کے سیاسی پھیلاؤ اور استعماری عزائم میں مزاحم تھی۔ مغرب کے لیے ضروری تھا کہ وہ مسلم دنیا میں اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کو حاصل کرنے کے لیے اس طاقت کو کمزور کر دے جو مسلم امت کو مغرب کے خلاف کھڑا کرنے میں کلیدی رول ادا کرتی

ہے۔ مغربی قوتوں نے سب سے پہلے اسلامی خلافت کا خاتمہ کیا، اسلام کے آفاقی نظریہ کو ختم کرنے کے لیے مسلم ممالک کو جغرافیہ اور وطن کی بنیاد پر تقسیم کیا اور امت مسلمہ کو عرب قومیت، ترک قومیت اور ایرانی قومیت کے نام پر تقسیم کیا تاکہ یہ امت عملی طور پر اسلامی وحدت سے محروم ہو جائے۔ پھر ان کے ٹکڑے کر کے نرم نوالہ بنا لیا جائے۔ اقبال نے اسی لیے کہا تھا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

سید قطب شہید نے لکھا ہے:

''استعمار کے خلاف اسلامی عقیدہ میں پوشیدہ قوت کا خطرہ تین باتوں پر مبنی ہے۔ پہلی یہ کہ اسلام آزادی کی زبردست قوت ہے، اس کی روح آزادی کے خلاف ہر قسم کی جارحیت اور سرکشی کا انکار کرتی ہے اور سختی سے اس کا مقابلہ کرتی ہے اور اس سلسلہ میں جان و مال کی قربانی سے دریغ نہیں کرتی۔ چنانچہ اگر کسی قوم میں اسلام کی یہ روح بیدار ہو جائے تو اس کا اپنی آزادی سے دست بردار ہو جانا اور استعمار کی بنیادوں کو لرزہ براندام کر دینے والی کشمکش سے راہ فرار اختیار کر لینا ناممکن ہے۔

دوسری یہ کہ اسلامی عقیدہ عظمت و سربلندی کا عقیدہ ہے چنانچہ جب مسلمان کے اندرون میں اسلامی روح بیدا ہوتی ہے تو اس پر کوئی اپنی بڑائی نہیں جتا سکتا۔ وہ کسی کے سامنے پست ہو کر نہیں رہ سکتا۔ وہ بیرونی استعمار کو اس نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے کسی برائی کو دیکھتا ہے۔ وہ اس کا ازالہ ضروری سمجھتا ہے اور اس کا مقابلہ اپنے اوپر لازم گردانتا ہے۔ تاکہ اسلام کو سربلندی حاصل ہو۔ مسلمانوں کی عزت و ناموس کا تحفظ ہو اور وہ اللہ کی خوشنودی سے بہرہ ور ہو۔

تیسری یہ کہ اسلامی عقیدہ وطن اسلامی کو ایک اکائی بنا دیتا ہے چنانچہ اگر

کوئی اسلامی سرزمین کے ایک بالشت حصہ پر بھی حملہ کرتا ہے تو گویا اس
نے پوری سرزمین پر حملہ کیا اور اس وقت دنیا کے ہر مسلمان پر لازم
ہو جاتا ہے کہ وہ اس حصہ زمین سے خطرہ کو ہٹانے کے لیے جہاد کا
اعلان کردے''۔[۴۹]

اسلام کی مرکزیت کو کمزور کرنے کے لیے اور مسلم دنیا میں اپنے پنجے گاڑنے کے لیے مغرب نے اسلامی عقیدہ وتہذیب اور نظام پر براہ راست حملے کیے اور اس کی جڑوں پر تیشہ چلایا۔ اسلامی عقیدہ کو غیر موثر بنانے کے لیے مغرب نے یہ مہم چھیڑی کہ عقیدہ توحید کو مسلمانوں کے نجی اور داخلی اعتقاد تک محدود و مختصر کردیا جائے تاکہ وہ فرد کا قلبی رجحان بن کر رہ جائے۔ سماجی اور سیاسی معاملات میں اثر انداز نہ ہو سکے۔ اس عقیدہ کے حاملین جہاں بینی و جہاں داری کے اصول سے نگاہ نیچی کرلیں اور وہیں تک سمٹ کر رہ جائیں جہاں کسی زمانہ میں عیسائیت کے حاملین تھے۔ توحید پر مبنی روحانیت رہبانیت کے ہم معنی ہو جائے۔ وہ مسلمان جس کی پہچان یہ بتائی گئی تھی کہ ''**رھبان باللیل فرسان بالنھار**'' وہ دن کا مجاہد اور رات کا راہب رہے، اس کے منور دن کو رات کی تاریکی میں گم کردیا جائے۔ مغرب نے اپنی تمام قوت اس پر صرف کردی کہ:

مست رکھو ذکر وفکر صبح گاہی میں اسے — پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے
تم اسے بے گانہ رکھو عالم کردار سے — تابساط زندگی میں اس کے ہر مہرے ہوں مات

یہی وجہ ہے کہ مغرب نے اسلامی نظام حیات کے مقابلہ میں اس کے صرف ایک پہلو تصوف اور وہ بھی خانقاہی تصوف کی پذیرائی میں اپنے قلم اور قدم تیز کردے۔ کیونکہ اسلامی عقیدہ کو محدود اور محصور دیکھنے کی یہ ایک معروف شکل تھی۔ اس تصوف میں ان صوفیاء کرام کا کوئی مقام نہ تھا جنھوں نے خانقاہوں سے نکل کر رسم شبیری ادا کی تھی۔

اسلام کو عالمی تہذیب بننے سے روکنے کے لیے بلکہ اس کے تہذیبی اثرات کو ختم کرنے کے لیے، مغرب نے مسلم نوجوانوں کو اپنا شکار بنایا۔ خاص طور پر ان نوجوانوں کو جو مغربی تعلیم کے جویا تھے۔ مغرب نے ان کے قلب وذہن کی آبیاری اس طرح کی کہ وہ

مغربی ثقافت کو قابل تقلید اور اسلامی وراثت کو باعث تحقیر سمجھنے لگے۔ ان نوجوانوں کے اخلاق و عادات کو مغربی سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش ہوئی تاکہ وہ اسلامی نام رکھنے اور اسلام سے وابستگی کا دم بھرنے کے باوجود اسلامی تہذیب کے نہ تو حامل بن سکیں اور نہ اس کی نمائندگی کر سکیں۔ علامہ اقبال نے مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے بارے میں کہا تھا:

> ''موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے، جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے، حالانکہ میری رائے میں اسلامی تہذیب کے بغیر وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی دنیوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو، اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولان گاہ بنا ہوا ہے۔ میں علی رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اپنی قومی روایات کے پیرایہ سے عاری ہوکر اور مغربی لٹریچر کے نشہ میں ہر وقت سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے''۔[۵]

ایشیا اور افریقہ کے حکمرانوں، مال دار اور خوش حال مسلمانوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنی اولاد اور اپنے ہونہار نسل کو یورپ کی تعلیم گاہوں میں بھیجا، مگر ان تعلیم گاہوں میں تعلیم کے ساتھ جو تہذیب ان نوجوانوں کو حاصل ہوئی وہ اسلامی تہذیب اور مسلم سماج کے لیے سم قاتل تھی۔ مارک فیلڈ آف ہائر ایجوکیشن، لیسٹر، انگلینڈ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر مناظر احسن صاحب نے لندن یونیورسٹی کی تعلیم و تہذیب کے حوالہ سے مسلم طلبا اور اسکالرس کے بارے میں بہت سے واقعات راقم سے بیان فرمائے۔ انھوں نے بتایا کہ مسلم ممالک سے جو طلباء اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں آتے ہیں ان کے اخلاق و عادات کو مغربی سانچہ میں ڈھالنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ ان کو شراب نوشی اور مغربی لڑکیوں سے اختلاط کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ میرے استاذ برنارڈ لیوس جو اپنی کتاب What went wrong کے حوالہ سے دنیا میں معروف ہوئے،

تقاریب میں اپنے شاگردوں خاص طور پر مسلمان شاگردوں کو بلاتے اور ان کے لیے شراب کا اہتمام کرتے۔ عرب، افریقہ اور برصغیر کے مسلمان طلباء، ان کی ضیافت سے لطف اندوز ہوتے۔ صرف میں اور ایک افریقی ریسرچ اسکالر ان سب سے دور رہتے۔ استاذ نے ہم دونوں سے شراب نوشی میں حصہ نہ لینے کی وجہ پوچھی تو ہم نے حرمت وحلت کا اسلامی جواب دینے کے بجائے یہ کہہ دیا کہ ہم دونوں غریب ممالک کے طلباء ہیں۔ اگر ہم اس مہنگی شراب کے عادی ہوگئے تو واپس جاکر اپنے ملکوں میں ایسی شراب نہ پاسکیں گے اور پیاسے مرجائیں گے۔ استاذ خاموش تو ہوگئے مگر بات کی تہہ تک پہونچ گئے۔ ڈاکٹر مناظر صاحب نے مزید بتایا کہ مسلم طلبا کو اس لیے شراب وشباب کی راہ پر لگایا جاتا ہے کہ وہ واپس اپنے ملکوں میں جائیں گے تو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں گے اور اس مغربی تربیت کی بدولت مغربی تہذیب کو اپنے ملکوں میں پھیلائیں گے اور عوام ان کی نقالی کریں گے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ:

> ''جس طبقہ کے ہاتھ میں اس وقت ان ممالک کی زمام کار ہے اس کی ذہنی ساخت، اس کی تعلیم و تربیت اور اس کی ذاتی و سیاسی مصالح کا تقاضا ہے کہ ان ممالک میں مغربی افکار واقتدار کو فروغ دیا جائے اور ان ممالک کو مغربی ممالک کے نقش قدم پر چلایا جائے اور جو دینی تصورات، قومی عادات، ضوابط حیات اور قوانین و روایات اس مقصد میں مزاحم ہوں ان میں ترمیم و تنسیخ کی جائے اور بالاختصار یہ ملک و معاشرے کو تدریجی طور پر (لیکن عزم و فیصلہ کے ساتھ) مغربیت کے سانچے میں ڈھال لیا جائے''۔[6]

مغرب نے مسلم دنیا میں اپنے خفیہ ایجنڈے کو پورا کرنے کے لیے ذہنی اور مالی سرمایہ صرف کیا۔ مغرب کا مقصد ہمیشہ یہی رہا کہ مسلم نوجوانوں کو عیاشی اور فحاشی کی راہ پر لگادیا جائے، نفس پرستی اور شہوت رانی عام ہوجائے تاکہ ان کا اخلاقی وجود کھوکھلا ہوکر رہ جائے۔ ان کی اسلامی حمیت اور تہذیبی غیرت فنا ہوجائے۔ وہ رسمی طور پر اسلام کے نام

لیوا ہوں مگر عملی زندگی میں مغربی تہذیب کے حامل اور ناقل ہوں۔ چنانچہ مسلم دنیا میں عریانیت، عیاشی اور فحاشی کو مختلف طریقوں سے پھیلایا گیا۔ تعلیم، کلچر، ادب، فنون لطیفہ، ذرائع ابلاغ، سب کا سہارا لیا گیا۔ الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ برائیوں کا سیلاب مسلم دنیا میں امنڈ آیا۔ جنسی غلاظت اور اخلاقی گراوٹ پر تہذیب و ترقی کا لیبل لگا کر خوش نما بنایا گیا اور چادر و چہار دیواری کے تقدس پر دقیانوسی کا ٹھپہ لگایا گیا۔ عریانیت ترقی قرار پائی اور پاکیزگی قدامت ٹھہری۔ مغرب کی ہر بے ہودہ شے پر نوجوان فریفتہ ہونے لگے اور مغرب کی اخلاق باختگی کی بازگشت مسلم دنیا میں سنی جانے لگی۔ اقبال جیسے غیرت مندوں کو یہ کہنا پڑا۔

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں   نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

اسلامی تہذیب برگ و بار لانے کے لیے اور پوری طرح اپنے فیضان کا مظاہرہ کرنے کے لیے نظام حکومت کا تقاضا کرتی ہے وہ صرف اخلاقی سفارشات پر قناعت نہیں کرتی بلکہ قوت نافذہ کا مطالبہ کرتی ہے جس کی معروف شکل خلافت ہے اور اس کا آئیڈیل خلافت راشدہ ہے۔

اسلام کے تصورِ خلافت اور نظریہ حکومت کے عملی نفاذ کو روکنے کے لیے مغرب نے مسلم دنیا میں ملوکیت و بادشاہت اور فوجی آمریت کی حمایت کی۔ اس نے شاطرانہ چالوں اور سازشوں کے ذریعہ اسلامی خلافت کا خاتمہ کیا اور مسلم دنیا پر ایسے حکمراں اور ملوک مسلط کیے جو مغرب کے غلام تھے۔ وہ مسلمانوں کے درمیان ان مقاصد کی تکمیل اور ان پالیسیوں کا نفاذ کرنے لگے جو مغرب نے بنائے تھے۔ یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ تقریباً پوری دنیا میں بادشاہت دم توڑ چکی ہے اور اس کی جگہ جمہوریت اور عوامی حکومت نے لے لی ہے مگر یہ مسلم ممالک ہیں جہاں آج بھی بادشاہت اپنے سارے مکروہ عزائم کے ساتھ قائم ہے اور اسے مغربی دنیا کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ پوری دنیا میں انسانی حقوق کی جنگ لڑنے والے مغرب نے مسلم دنیا میں انسانی حقوق کی پامالی کا نہ صرف ساتھ دیا بلکہ مجرمانہ ارتکاب کیا۔ بوسنیا ہرزے گوینا اور

عراق وافغانستان اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

دنیا میں جمہوریت کا نعرہ لگانے والے مغرب نے مسلم ممالک میں عوامی پسند کی جمہوریت کو کبھی گوارا نہیں کیا، بلکہ اس نے ملکی قیادت اور اقتدار سے پختہ عقیدہ کے حامل، خداترس، دور اندیش اور ذمہ دار مسلمانوں کو دور رکھنے کے لیے ہر طرح کی سازشیں کیں۔ بادشاہوں، مطلق العنان آمروں اور فوجی جرنیلوں کو مسلم دنیا پر اس لیے مسلط رکھا تاکہ وہ مغرب کے معاشی اور سیاسی مفادات کی تکمیل کر سکیں۔ مغربی حکمرانوں نے پوری قوت کے ساتھ مسلم ملکوں کی فوجی اور اقتصادی نکیل اپنے ہاتھ میں رکھنے کی سعی کی۔ مسلم ممالک کے قدرتی وسائل پر قبضہ جمانے کے لیے مسلم حکمرانوں کو خوف اور لالچ کی نفسیات میں بھی مبتلا کیا گیا۔ اگر کسی مسلم حکمراں نے مغرب کی اس پالیسی سے انحراف کیا تو اس کو انجام بد تک پہونچایا گیا۔ اگر ان کے غلام حکمرانوں کے خلاف عوام میں بے چینی اور بغاوت ہوئی تو اسے کچلنے میں ہر ممکن مدد کی اور اگر کہیں براہ راست مداخلت کی ضرورت ہوئی تو وہ بھی کی گئی۔

عالم اسلام کے ممتاز دانشور پروفیسر خورشید احمد نے اسلامی تہذیب پر مغرب کے حملوں اور اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مغربی اقوام سے مشترک مقاصد اور مفادات کی بنیاد پر باعزت دوستی اور اچھے معاشی تعلقات سب کے لیے مفید اور تقویت کا باعث ہو سکتے ہیں۔ لیکن موجودہ محکومی کا جو نقشہ آج نظر آتا ہے وہ دنیوی اور دینی ہر دو اعتبار سے بڑے خسارے کا سودا ہے۔ انسانی اور مادی وسائل کے باب میں امت مسلمہ کسی سے پیچھے نہیں ہے لیکن آج ہمارے وسائل دوسروں کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ اور مسلمان عوام ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں اور حکمراں ذاتی عیش وعشرت اور مغربی اقوام کی خوشنودی کے حصول میں مصروف ہیں، بلکہ اپنی بقا اور اپنے اقتدار کے لیے ان کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور امت کے مفادات کا سودا کرتے ہیں''۔ ۷؎

قرآن پاک نے مسلمانوں کو دوستی اور دشمنی کی تمیز سکھاتے ہوئے کہا تھا:

"لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ" (المائدہ:۵۱)

(یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔)

اگر مسلم حکمرانوں میں اسلامی بصیرت اور دینی غیرت کی رمق ہوتی تو خداوند قدوس کے اس حکیمانہ اصول کو یاد رکھتے اور اشداء علی الکفار ورحماء بینہم (کفار پر سخت اور مومنوں پر رحیم) کا مظاہرہ کرتے۔ مگر مغرب کے شاطر حکمرانوں نے اپنے غلام حکمرانوں کی عقل پر مفادات کے پردے ڈال دیے۔ ان کو یہ باور کرایا کہ یہود و نصاریٰ تو تمہارے دوست ہیں اور تمہاری حکمرانی کے محافظ ہیں۔ تمہارے دشمن تو وہ مسلمان ہیں جو حریت کا علم برپا کیے ہوئے ہیں۔ جو احیاء اسلام کے داعی اور اسلامی حکومت کے حامی ہیں۔ کیونکہ وہی تمہارے اقتدار کے لیے حقیقی خطرہ ہیں۔ ان حکمرانوں کو اپنے ہی مسلم عوام پر ظلم وستم ڈھانے کے لیے درپردہ اکسایا گیا اور ان مغرب گزیدہ حکمرانوں نے اپنے ملکوں میں اسلام پسند عناصر کو کچلنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ عرب، مصر، تیونس، لیبیا، بنگلہ دیش اور پاکستان میں اسلامی عناصر کے خلاف خود مسلم حکمرانوں نے جو مظالم ڈھائے اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ یہودیوں نے فلسطین میں مسلمانوں بالخصوص حماس کے نوجوانوں پر جو انسانیت سوز مظالم کیے ان سے کسی بھی طرح کم وہ مظالم نہ تھے جو مسلمان حکمرانوں نے خود مسلمانوں پر ڈھائے۔ اسلام پسند عناصر پر جھوٹے الزامات لگائے گئے، فرضی مقدمات قائم کیے گئے اور خود ساختہ منصفوں کے ذریعہ ان کو قید و بند کی سزائیں دی گئیں اور ان کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ عرب اور افریقہ کے حکمرانوں اور یہودیوں میں اس معاملہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بعض مسلم ممالک میں عوامی انقلاب آیا اور جمہوری حکومت کا قیام ہوا تو اسے بھی سازشوں اور فوجی قوت کے ذریعہ ختم کیا گیا۔ لیکن ظلم کی طویل اور سیاہ رات کے بعد صبح درخشاں ضرور آتی ہے۔ قدرت کا اعلان ہے: اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (ہر سختی کے بعد آسانی ہے) ظلم وستم کی سیاہی ضرور چھٹے گی۔ اقبال نے اسی لیے کہا تھا:

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک — سلطنت اقوام غالب کی ہے ایک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
خون اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں — توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری

حواشی ومراجع

۱۔ تفہیم القرآن، جلد۲، ص۴۸۴، مکتبہ اسلامی، دہلی
۲۔ سید قطب شہید، دراسات اسلامیہ، ترجمہ اسلام اور مغرب کی کشمش، از: رضی الاسلام ندوی، ص۴۵، دہلی ۲۰۰۳ء
۳۔ ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، ص ۱۸۱-۱۸۲، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۷۴ء
۴۔ اسلام اور مغرب کی کشمکش، ص ۱۸۷-۱۸۶
۵۔ محمد اقبال، ملت بیضاء پر ایک عمرانی نظر، ترجمہ ظفر علی خان، اقبال اکیڈمی، لاہور
۶۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربی کی کشمکش، ص۱۱، مجلس تحلیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ
۷۔ سہ ماہی دعوت جدید، ص۱۵۵، نئی دہلی، اکتوبر-دسمبر۲۰۱۲ء

☆☆☆

علوم کی تعمیر میں تہذیب اِسلامی کا کردار

(فؤاد سیزگین کے افکار کا مطالعہ)

ابو متین *

عموماً کسی قوم کی تہذیب سے مُراد اس قوم کے علوم و آداب، فنونِ لطیفہ، رہن سہن کا مخصوص انداز اور طرزِ سیاست وغیرہ کو سمجھا جاتا ہے، حتّٰی کہ لباس کی تراش خراش اور عبادات کے طریقوں تک میں تہذیبی جھلکیاں مِل جاتی ہیں۔ یہ سب تہذیب کی علامات، نتائج اور اسباب ہیں یعنی اِن سے تہذیب کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔ تہذیب کی شناخت ہوتی ہے، ان امور کی وجہ سے تہذیبوں کے فرق کو معلوم کیا جا سکتا ہے، ہر قوم کی ایک منفرد تہذیب ہوتی ہے اور دوسروں سے ممتاز ہوتی ہے۔ اِس طرح کی تہذیبی اِنفرادیت یوں ہی وجود میں نہیں آتی بلکہ اِس کے منظر میں کئی عوامل ہوتے ہیں، اور اِس کو دانِستہ وشعوری انداز سے اختیار نہ کرنے کے باوجود بھی لوگ اِسے رواجوں اور عقیدت کے بل بوتے پر عمل پیرا رہتے ہیں اور اس کی جڑیں ماضی کے عرصہ دراز سے مستقبل بعید تک کی انسانی زندگیوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ بلکہ جنازہ بھی ان کی مخصوص رسومات کے تحت اٹھایا اور ٹھکانے لگایا جاتا ہے اور لوگ اپنے فرقے کی قدیم روایتوں پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ رسومات اور رواج تہذیبوں کی علامات ہیں۔ تہذیب کے بے شمار مظاہر ہیں۔ ان میں رسومات کی مخصوص علامتیں بڑی متنوع اور دِل چسپ ہوا کرتی ہیں۔

---

* صاحب قلم مفکر، گورنمنٹ وظیفہ یاب، حیدر آباد

تہذیب کیا ہے؟

تہذیب کی اساس اور بنیاد میں چند لازمی اصول ہوا کرتے ہیں جن پر اُس مخصوص تہذیب کا دارومدار ہوتا ہے۔جن قوموں کی تہذیب کو جانچنا اور پرکھنا مقصود ہو تو ان کے بنیادی اُصولوں کو معقولیت کی کسوٹی پر رکھ کر دیکھا جاسکتا ہے۔اس کی صحیح حیثیت کو معلوم کرنے کا یہی واحد ذریعہ ہے۔تہذیب ایک گہرا سمندر ہے اِس پر اُٹھنے والی موجیں اور نیلے رنگ کے پانیوں کو سمندر نہیں کہا جاسکتا۔یہ تو گہرے سمندر کی وجہ سے نظر آنے والی علامات ہیں۔قوموں کی تہذیبیں بظاہر اُن کے افراد کی منفرد خصوصیات کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ منفرد خصوصیات یوں ہی وجود میں نہیں آتیں اِن کے اندر ایک خاص نظامِ فکر یا دُنیا اور زندگی کے بارے میں علیٰحدہ آئیڈیالوجی ہوا کرتی ہے۔اِس کے پس منظر میں زندگی کا نصب العین اور دنیا کے بارے میں تصوّرات اور سماجی اُصول وضوابط وغیرہ ہوتے ہیں۔تہذیبوں کی علامات کو معلوم کرنا اور ان کے مختلف انواع واقسام کی کھوج کرنا بھی عِلم اور تحقیق سے تعلق رکھتا ہے اور ہمارے دانشوروں نے یقیناً اس کے لیے بھی بڑی عرق ریزی کی ہے لیکن اُن تہذیبوں کی اصل تک پہنچنا اور اُس کے اندر چھپے فلسفے کی جستجو کرنا اُس سے زیادہ اہم کام ہے۔جس آئیڈیالوجی پر تہذیب وتمدّن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اُس کی تحقیق کرنا اہل علم کی ذِمہ داری ہوا کرتی ہے ۔تہذیب کی ظاہری شکلوں کی طرف تو لوگ آسانی سے متوجہ ہو جاتے ہیں لیکن اس کے نظامِ فکر کی کھوج کرنا قدرے مشکل ہے اور یہ علم دوست حضرات سے ہی ممکن ہے۔ہر چیز جو ظاہر میں نظر آتی ہے اور جیسی کچھ دکھائی دیتی ہے۔اس کے وجود میں آنے کی وجوہات اور مُحرکات کا پتہ لگانا دراصل حقیقی علم ہے۔تجزیہ اور تحقیق کے ذریعہ تہذیب کے ضرررساں پہلوؤں کی نشان دہی کی جاسکتی ہے اور تہذیب کے مفید اور کارآمد مظاہر کو معلوم کرنے کے لئے اُس تہذیب کے بنیادی تصوّرات کی جستجو کرنا ضروری ہوتا ہے اِس کے بغیر علم کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

تہذیب وتمدّن اور ثقافت یہ تین الفاظ عربی زبان کے ہیں۔تہذیب کا مادہ ''ہ ذ ب'' ہے، جس کے معنی صاف کرنے اور درست کرنے کے ہیں۔ ھذب الشعر یعنی شعر کی اصلاح کرنا اسی طرح تمدن، مدن سے نکلا ہے جس کے معنی شہر ہے اسی وجہ سے تمدّن کو انگریزی میں Civilization کہا جاتا ہے اور تہذیب وثقافت کو Culture کہا جاتا ہے۔اِن دو الفاظ میں بالکل معمولی فرق ہے۔ثقافت میں عقلی سوجھ بوجھ اور ذہنی اور فکری عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔اس طرح تہذیب سے مُراد انسان کا نظام فکر ہے۔ انسان کے وہ عقائد ونظریات اور افکار ہیں، جن سے اس کی شخصیت بنتی اور سنورتی ہے۔ اس کے خیالات جتنے زیادہ پاکیزہ، روشن اور سلجھے ہوئے ہوں گے وہ معاشرے کا اتنا ہی مہذب شخص متصور ہوگا۔تہذیب کی کیفیت نظریاتی ،فکری ،روحانی اور غیر مادّی ہوتی ہے۔تمدن سے مُراد مِل کر رہنے کا طریقہ ہے۔طرز معاشرت یا انسان کا بڑے بڑے گروہوں میں مِل کر ایک نظام کے تحت زندگی بسر کرنا ہے۔تمدن انسانی زندگی کا وہ نظامِ عمل ہے جو انسان کے نظام فکر (تہذیب) کا تابع ہوتا ہے۔تمدّن کا تعلق چونکہ انسانی افکار وخیال کے تحت سرزد ہونے والے ظاہری اعمال سے ہے لہٰذا اِس کی حیثیت عملی، مظاہری اور مادّی ہوتی ہے۔تہذیب کو مغربی دانشور B.B. Tylor نے جن الفاظ میں سجا کر پیش کیا ہے اس کو عمومًا قبولِ عام حاصل ہے اس کا کہنا ہے کہ ''علم، عقیدہ، فن، اخلاق، قانون، رسم ورواج اور دوسری ہر قسم کی صلاحتیں اور عادتیں جن کا اکتساب اِنسان، معاشرے کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے کرتا ہے۔یہ تہذیب ہے۔

تہذیب کی حقیقت

مسلم مفکروں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ۱۹۵۵ء میں ''اسلامی تہذیب اور اُس کے اُصول ومُبادی'' کے عنوان سے اپنی اسیری کے زمانے میں ایک کتاب لکھی تھی اُس میں انہوں نے اِسلامی ثقافت کو اِسلامی تہذیب قرار دینے کی غلط فہمی پر گرفت کی ہے اور انسانی تہذیب کے بُنیادی اُصول مرتب کر کے بتایا ہے کہ یہی وہ واحد کسوٹی ہے

جس پر ہر تہذیب کو جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ یہ ان کی خداداد صلاحیت ہی تھی کہ انہوں نے دنیا کے سارے دانشوروں کو صحیح نقطۂ نظر پیش کر کے غور وفکر کے چراغ روشن کر دیے ہیں۔ اِسی طرح قریب قریب یہی مفہوم قطب شہیدؒ نے بھی تہذیب کی تعریف کرتے ہوئے اپنی کتاب ''الاسلام ومشکلات الحضارۃ'' یعنی تہذیب جدید کے مسائل اوران کا اسلامی حل میں پیش فرمایا ہے۔اس سلسلے کی دل چسپ صورت حال تو یہ ہے کہ ترکی کے دانشور''فؤاد سیزگین'' جنھوں نے جرمن میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہیں مقیم ہیں اور H.Ritter جیسے مُستشرق کی نگرانی میں کتاب'' تاریخ التراث العربی'' کی تالیف میں مصروف ہیں اس کا اُردو نام'' تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام ہے'' جس کو ڈاکٹر خورشید رضوی نے ترجمہ کیا ہے ۔اس کتاب کا ایک مضمون ''اِسلامی ثقافت میں جمود کے اسباب''میں تہذیب اِنسانی کے ایک سیمنار کی روداد پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہاں بھی اسلامی تہذیب کے اَساسی افکار پیش کرنے کے بجائے اس کی ظاہری علامتوں پر اکتفا کیا گیا تھا اس کے بعد کسی بھی تہذیب کو جانچنے کے لیے جو معیار ہوسکتا ہے اس کی تفصیل پیش کی ہے ۔جس طرح مولانا مودودیؒ نے ''تہذیب کی تکوین پانچ عناصر سے ہوتی ہے'' بتایا تھا۔فؤاد سیزگین نے بھی تقریباً یہی معیار پیش کیا ہے ۔وہ پانچ عناصر اِس طرح ہیں (۱) دنیا میں اِنسانی زندگی کی حیثیت کا تعیّن (۲) اِنسان کا مقصد وجود (۳) اساسی عقائد وافکار (۴) آدمی کی عادات واطوار (۵) نظامِ اجتماعی (معاشرتی و سیاسی اور بین الاقوامی حیثیت) دنیا کی ہر تہذیب ان ہی پانچ عناصر سے بنی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے ان موضوعات پر مختلف کتابیں تصنیف کر کے وضاحت کی ہے۔ اسلامی تہذیب کی مذکورہ کتاب میں آپ نے پہلے تین عناصر کا جائزہ لیا ہے ۔اس کے بعد باقی دو عناصر کے لیے اپنی دو کتابوں کا حوالہ دیا ہے ۔تہذیب کا اِسلامی رکردار ایک مبسوط اور مکمل نظامِ زندگی کی رہنمائی کرتا ہے۔

اِس وقت دنیا میں جتنے بھی نظامِ حیات رائج ہیں انھوں نے انسان کی صحیح حیثیت متعیّن کرنے میں غلطیاں کی ہیں اور تہذیب وتمدّن کی رہنمائی کرتے ہوئے اس

کو برباد کر دیا ہے۔ دُنیا میں انسان کی حیثیت کو یا تو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے یا حیاتِ اِنسانی کو فقط انسانی رہنمائی کے سپرد کر کے ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے ورنہ اِنسان کو گھٹا کر پتھر لکڑی سانپ اور بلّی جیسی بے شمار حقیر مخلوقات سے خوف کھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ باوجود اشرف المخلوقات کی حیثیت دینے کہ، اِس کی اصل حقیقت کو گم کر دیا گیا ہے۔ وہ اِس دنیا میں کیا ہے؟ اور کِس مقصد کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے؟ دنیا بھر کے محققین اور دانشوروں نے بڑی جدو جہد کی ہے اور مغز پاشی کی ہے لیکن بے سود۔

دنیا کی تہذیبیں

اِنسان دنیا میں کیوں آیا ہے؟ جیسے سوال کے لیے اِس کے اشرف ہونے کی حیثیت کو فراموش نہ کیا جائے تو اِس سوال کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے ورنہ جیو اور جینے دو یا سیر سپاٹے اور موج مستی جیسی باتیں بتا کر خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے۔ جب دنیا چرند و پرند جیسے حیوانوں کے لیے چراگاہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اور اگر حضرتِ انسان بھی یہی سب کچھ کرتا رہ جائے تو اشرف کہاں رہ جاتا ہے؟ وہی ارذل کا ارذل ہی رہ جاتا ہے۔ موجودہ دنیا کے ایک بہت بڑے سائنس داں جن کو مغربی دنیا کی فلسفیانہ رہنمائی کا باوا آدم کہا جاتا ہے وہ الکسیس کاریل ہے (A.Correl) (1873-1912) اس نے نوبل پرائز بھی پایا تھا۔ یہ فرانس کے شہر لیون میں پیدا ہوا اور نیویارک کے (راکفیلر انسٹی ٹیوٹ میں علمی تحقیقات کے اِدارے سے منسلک ہو گیا تھا تیں (۳۰) سال کے طویل عرصے تک اس نے غور و فکر کرنے اور تحقیق و تجسس کرنے کے بعد جس نتیجے پر پہنچا تھا وہ عبرت کے قابل ہے۔ اِس نے مغربی دنیا کو جو پیام دیا اُس کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے افکار کی روشنی میں مغربی تہذیب جس طرح کی بے سمتی کا شکار ہو کر بے لگام آزادی کی خوگر ہوگئی ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ اِس نے اپنے خیالات کا عنوان ''اِنسان نامعلوم'' رکھا ہے۔ یہی وہ افکار تازہ ہیں جن کو مغرب سر آنکھوں پر بٹھائے رکھتا ہے کاریل

کو اِس دُنیا کے ایک خالق و مالک اور نگہبان ہونے کا اِنکار تھا۔اس کے بعد وہ جو بھی غور کرتا گیا وہ سراسر گمراہی ہی کی نئی تصویر کے سِواء اور کیا پیش کر سکتا تھا؟ وہ اِنسانی تہذیب کو خود انسانی سعی و جہد کا حاصل بتاتا تھا۔آفاقیت کا منکر تھا۔انسان کو راہِ نجات کا نسخہ تجویز کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ انسان اپنے علوم میں اس قدر ترقی کرتا چلا جائے کہ وہ تہذیب نو کا خالق بن جائے۔جہاں تک مذہب کا سوال ہے اس کو صوفی ازم اور رہبانیت ہی میں انسان کو قرار واقعی حاصل ہونے کی خبر دیتا ہے۔انسانی ترقی کی معراج یہی ہے کہ آدمی صوفیانہ تصوّرات میں کھو کر رہ جائے وہ صنعتی انقلاب کو سخت ناپسند کرتا ہے۔وہ مزدوروں کا استحصال کرنے والی تہذیب کا سخت مخالف ہے بلکہ مزدوروں کو اِس کے لیے بغاوت کرنے کو بھی جائز خیال کرتا ہے۔اِس کے مطابق اِس تہذیب سے انسانیت کی روح ختم ہو جاتی ہے اور انسان کا شعورِ جمال اس تہذیب سے دم توڑ دیتا ہے۔اس کے خیال میں انسانی وجود کو اس تہذیب نے جو تباہی مچائی ہے اس کے روکنے کا وسیلہ نہیں ہے۔وہ مذہب کو انسانی زندگی کے معاملات سے بے دخل رکھنا چاہتا ہے۔روحانی نشاط،اخلاق اور عالم بالا سے ربط وضبط کو ضروری قرار دیتا ہے۔وہ ذہنی سکون کی تلاش میں اِن ذرائع کو اِستعمال کرنا چاہتا ہے۔لیکن مذہب سے فرار اس کے نظریات کی جان ہے۔یہ ایک معروف دانشور کے منتشر خیالات کا نمونہ ہے۔کارل رہبانیت کا قائل ہے۔یہی وہ رہبانیت تھی جو عیسائی دنیا کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔سائنسی دریافتوں کو صحیح ماننے والوں کو کافر قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا کیونکہ عیسائی رہبانیت میں جن اوہام اور من گھڑت خیالات کا چرچہ تھا یہ سائنٹفک دلائل ان کی جڑیں کاٹ رہے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ تین لاکھ سائنس داں اور عقلی علوم کے پرستاروں نے ان کی اِس رہبانیت پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا ان میں بتیس (۳۲) ہزار کو زندہ جلا دیا گیا تھا۔ اِسی رہبانیت نے انسانیت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ان میں برونو اور گلیلو جیسے سائنس دانوں کو تک بھی نہیں بخشا گیا تھا۔یہ اِسی کا انتقام تھا کہ جدید دُنیا جس نے نشاۃ ثانیہ کے نام سے کروٹ لی تھی اور عیسائی مذہب کو چرچ کی چار دیواری میں قید کر کے شکھ

کا سانس لیا تھا اب یہ عیسائی مذہب پھر کبھی دنیوی معاملات میں مداخلت کی جرأت نہیں کر سکتا۔ خدا پرستی اور مذہبی معاملہ کو کسی بھی شخص کا ذاتی اور نجی مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔ کار ریل ہو یا کوئی اور دنیا میں انسان کی صحیح حیثیت معلوم کیے بغیر خیالی گھوڑوں کے ذریعہ انسانی تہذیب کو حل کرنا اندھے کو ٹرافک سے بھری سڑک پر دھکا دینے کے مماثل غلطی ہوگی۔

عقل کی گواہی

آج ہماری دنیا ایک گلوبل ویلیج بن گئی ہے۔ سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی نے دنیا کے سارے گوشے نہ صرف روشن کر دیے ہیں بلکہ ایک دوسرے سے مِلا دیے ہیں عیسائی چرچ کے کیے کی سزا دوسرے لوگوں کو بھگتنی پڑ رہی ہے۔ مغربیت میں امریکہ آسٹریلیا اور یورپین ملکوں کی عیسائی دنیا شامل ہے اِس مغربی دنیا کی جدید تہذیب نے جارحانہ رویّہ اپناتے ہوئے دنیا کی ساری تہذیبوں کو مغلوب کر کے چھوڑا ہے اور پھر دنیا کی ساری اقوام خود اِس قابل نہیں تھیں کہ مغرب کے اس سیلاب کے مقابل اپنا کوئی ٹھوس وجود ثابت کر سکتیں نتیجے میں اِلحاد اور مادّہ پرستی کی اساس پر تعمیر ہونے والا معاشرہ اپنے سنگین اثرات سے دنیا کو آلودہ کر ڈالا ہے۔ مغربی تہذیب کی اَساسی فکر دوسری تہذیبوں میں اس طرح سرایت کر گئی جیسے یہ ان کی اپنی تہذیب میں داخل ہو۔ مغرب نے اپنی تہذیب کے بنیادی اُصول وضوابط میں دنیا کے معاملات کو مذہبی اثرات سے دوُر رکھنے کی جو جدوجہد انتقامًا روا رکھی تھی اب وہ انسانی نظامِ فکر کا لازمی جز بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب کے تصوّر میں خدا پرستی اور سیاست کو ایک دوسرے کا ضِد سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ تہذیب کے وسیع کینوِس میں سیاست اس کا ایک اہم حِصّہ ہے۔ حیاتِ انسانی کے سرسبز و شاداب درخت کی شاخوں میں سیاست بھی ایک نمایاں اور تناور شاخ ہے۔ اِس کو الگ کر کے حیات انسانی کو ایک بے دست و پا مریض کی حیثیت دی گئی ہے۔ اِس سے اہلِ حق کی دشواریوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ تہذیب کی علمی حیثیت کو لوگ سمجھنے پر مائل نہیں رہے ہیں۔ زندگی کی تفریحی مصروفیات نے اِنسان کو سطحیت کے جال میں جکڑ لیا ہے۔

گہرائی اور سنجیدگی سے بہت کم واسطہ رہا ہے۔ انسان اپنے اشرف ہونے کے معیار کو فراموش کر رہا ہے۔ دنیا میں اس کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ اور کیوں آیا ہے کیا کر کے جانا ہے اور کس ذمہ داری پر مامور ہے وغیرہ پر غور کرنے کی صلاحیت زنگ آلود ہوگئی ہے حالانکہ یہ فطرت اِنسانی کی لازمی سوچ ہے۔ اِس فلسفیانہ غور وفکر کی وجہ سے ہی اس کو اشرف المخلوقات کی عظمت حاصل ہے۔ ورنہ محض وقت گزاری (Time Pass) کے مقصد کو پورا کرنا ہوتا تو چوپایوں کا وجود کافی تھا اِن ''دوپایوں'' کی ضرورت ہی کیا تھی؟

عقلِ انسانی کے غور وفکر کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ اِس مُنظّم کائنات کے ایک خالق و مالک اور نگہبان کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے کرّہ ارض پر انسان کی قائدانہ حیثیت سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو بس یوں ہی دوسری مخلوقات کی طرح تخلیق نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کو خلافت و نیابت کے عظیم منصب سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اِس کو یہاں خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ذِمّہ داری سونپی گئی ہے۔ فکر وعمل کی آزادی محض آزمائش کے لیے بخشی گئی ہے۔ اختیار اور آزادی کی نعمت پانے کے بعد اگر آدمی اپنے رب کو پہچان کر اُس کی رہنمائی میں زندگی گزارتا ہے تو اس خوش بخت کی دُنیوی زندگی، امن وچین کا گہوارہ رہے گی اور مرنے کے بعد کی دوسری زندگی میں بھی اس کو جنّت کی ابدی نعمت میسّر ہوگی۔ اِس کے برعکس اگر آدمی خدا کی رہنمائی سے مُنہ موڑ کر نفس کا غلام بن کر من مانی کرتا چلا جائے تو شیطان کا نوالہ تر ثابت ہوگا پھر اِس بدنصیب شخص کی دنیوی زندگی بھی اضطراب اور انتشار میں بسر ہوگی اور آخرت کی زندگی میں ابدی جہنّم اس کا ٹھکانہ ہوگا۔ رہ جاتا ہے مسئلہ رَب کی مرضی اور رہنمائی معلوم کرنے کا تو یہ سب جانتے ہیں کہ خدا ابتدائے آفرینش سے ہی پیغمبروں کے ذریعہ یہ کام پورا کرتا رہا ہے۔ بے شمار پیغمبر مختلف قوموں میں مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ لوگوں کو گمراہی اور غفلت سے نکال کر صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ دنیا کے آثار قدیمہ گواہ ہیں کہ آدمی ابتداء ہی سے خدا کے وجود کا قائل رہا ہے لیکن اپنی فکر وفہم کی آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے خدائے واحد کی ذات وصفات میں شرک کے ذریعہ غفلت اور گمراہی میں مبتلا ہوتا رہا ہے۔ بُت پرستی گاؤ

پرستی وغیرہ بے شمار پرستشوں کی بیماریوں کو گلے سے لگا کر بھٹکتا رہا ہے۔ان ادوار کی عبادت گاہوں سے اس کے آثار ملتے رہے ہیں۔دنیا کی سیر کرنے والوں سے یہ سب چیزیں چھپی نہیں رہیں۔کھنڈرات اِس بات کے گواہ ہیں کہ خدا کے باغی قوموں کو موجودہ دنیا میں بھی تباہی اور بربادی سے ودچار ہونا پڑتا ہے۔پیغمبر خدا کی طرف سے رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں لیکن نیکی پر مائل اور خیر پسند لوگ ہی ان کی دعوت کو قبول کرتے رہے ہیں باقی لوگ ضِد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انکار کرتے رہے جو اپنے کفرو شرک کا خمیازہ اِس دنیا میں بھگتیں گے اور آخرت کا عذاب تو یقینی ہے۔

اسلامی تہذیب

موجودہ دور میں انسان اپنی ہر قسم کی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے ہوئے ترقی کے آخری مرحلے طے کر رہا ہے۔اِس قدر عروج کے دور میں انسان کو اپنے مقصدِ وجود کی یاددہانی ضروری تھی تاکہ یہ اپنے اشرف ہونے کی فضیلت سے بے بہرہ نہ رہ جائے۔ چنانچہ چودہ سو سال پہلے اِس آخری دور کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مبعوث کیا گیا۔آپؐ نے اپنی ترسٹھ سالہ حیات میں مکّہ معظّمہ کی سنگلاخ زمین میں دین حق کی آبیاری کی تیرہ (۱۳) سالہ سخت جدوجہد اور کئی ایک مصیبتوں کے بعد ایک مختصر سے تعداد کو ہمنوا بنایا پھر آپؐ مدینہ منوّرہ ہجرت کر گئے۔وہاں آپؐ نے دس (۱۰) سال تک حق کو غالب کرنے کی جدوجہد کی اور دُنیا کے ایک اہم اور بڑے علاقے پر حق کا بول بالا کر کے اِس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔اِس کے بعد قیامت تک نبی کریم ﷺ کی عملی زندگی کا نمونہ اور احادیث کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا کلام جو وقتاً فوقتاً تیئیس (۲۳) سال تک آپؐ پر نازل ہوتا رہا ہے وہ ہمارے پاس قرآن مجید کی شکل میں موجود ہے یہی دنیا کے سارے لوگوں کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔یہ ماخذ تہذیبِ اِنسانی کے لیے اَساس کا درجہ رکھتے ہیں۔یہی دستورِ حیات کے بنیادی اصول ہیں۔انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے لیے مکمل رہنمائی کا واحد ذریعہ یہی دینِ حق ہے۔عبادت سے لے کر سیاست تک اِنسانی زندگی کی جتنی

ضرورتیں ہوسکتی ہیں۔اُن سب کی مکمل رہنمائی اِسی اسلام میں ہے۔دُنیا کے ہر خطّے، قبیلے اور زبان ونسل ورنگ کے اِنسانوں کے لیے یکساں مفید یہی دستورِ حیات ہے اِس سے روگردانی کر کے جو بھی راہ اختیار کی جائے گی وہ یقیناً دنیا وآخرت کے خسارے کا موجب ہوگی۔ یہ بظاہر اسلامی تہذیب کہلاتی ہے لیکن حقیقت میں یہ انسانی تہذیب ہے۔اِنسانی راہ نجات کا واحد ذریعہ ہے۔اِس کو عقل کی کسوٹی پر جانچ کر دیکھا جاسکتا ہے۔تاریخ کے جھروکوں سے اِس تہذیب کی عملی تفسیر کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے یہ ایک صلائے عام ہے۔یہ فطری سادہ اور مکمل وہمہ گیر پیام ہے۔

(۱) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ الانعام۔یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیاوالوں کے لیے۔

(۲) وہی ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہارا اِمتحان لے کہ کون تم میں سے بہتر عمل کرنے والا ہے (الملک ۶۷:۲)

(۳) جو شخص میری ہدایت کی اتباع کرے گا وہ نہ دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ آخرت میں ناکام ہوگا اور جو میرے "ذکر" (قرآن) سے مُنہ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اِسے اندھا اٹھائیں گے۔(طٰہٰ:۱۲۳-۱۲۴)

(۴) وہ تمہیں اس وقت سے خوب جانتا ہے، جب اُس نے زمین سے تمہیں پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں بھی جنین ہی تھے (النجم:۳۵)

(۵) ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں (قٓ:۱۶)

(۶) وہ اللّٰہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے پوری جنس دین پر غالب کردے۔خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ (توبہ ۹:۳۳) دُنیا میں انسان کی حیثیت واضح ہونے کے بعد انسان کی فضیلت کو خدا نے اپنے کلام میں واضح کرتے ہوئے بتایا کہ اس کو وہ علم بخشا گیا ہے جو فرشتوں کو بھی میسر نہیں تھا۔جب اللّٰہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کرنے کی اطلاع اپنے فرشتوں کو دی تو وہاں سے

جواب دیا گیا کہ یہ مخلوق دنیا میں فساد برپا کرے گی لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کو علم دیا جائے گا اور وہ اس میں اضافہ کرتا جائے گا۔ یہی اس کی برتری ہے جو اللہ کی کسی اور مخلوق کو میسر نہیں ہے۔

سیّد قطب شہیدؒ نے اپنی کتاب ''تہذیب جدید کے مسائل اور ان کا اسلامی حل'' میں بتایا ہے کہ ''یوروپی تمدن کی چمک دمک کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کی اصل یقینی طور پر اسلامی تہذیب کے اثرات پر مبنی نہ ہو۔ نئی دنیا کی ممتاز ترین قوّت اور موجودہ تمدن کی اصل یعنی طبعی علوم اور علمی بحث کی روح میں بھی یہ اثرات نہایت نمایاں اور واضح نظر آتے ہیں۔''

تہذیبوں کا تقابل

مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ مغربی دنیا نے جن سائنسی ترقیوں کو بامِ عروج تک پہنچایا ہے اس کی اصل اسلامی علوم سے اخذ کردہ ہے۔ مُسلم حُکماء اور سائنس دانوں نے تمام عقلی علوم کی بنیاد رکھی تھی علم ریاضی سے لے کر فلکیات تک کے سارے طبعی علوم کی تحقیق کر کے ایک عظیم ورثہ چھوڑا تھا۔ بعد کے مسلمانوں نے ان کی بنیادوں پر مزید تحقیق کا حق ادا نہیں کیا تھا۔ لیکن دوسری قوموں نے اِن سے فائدہ اُٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور آج ان کی ترقی کے چرچوں سے دنیا گونج رہی ہے۔ اُن مسلم سائنس دانوں کے کارناموں تک سے مسلمان واقف نہیں رہے ہیں۔ البتہ یہی مغربی تہذیب ہے جو مسلم ملکوں کے سربراہوں کے ذہن وفکر پر اس طرح چھا گئی ہے کہ یہ اس کے چنگل سے نکلنے کے قابل بھی نہیں رہے کیونکہ دنیا اور دین کی تقسیم کے ذریعہ عیسائی دنیا نے جونشاۃ ثانیہ حاصل کی تھی اس گمراہی سے باہر نکلنا بھی ان کے بس کے باہر ہے حتّٰی کہ مسلمانوں نے اِسی آئیڈیالوجی کو درآمد کرتے ہوئے اسلامی تہذیب کو نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہ کیا۔ اِسی اندرونی خلفشار نے ہماری حکومتوں کو کمزور سے کمزور تر کر دیا ہے اور ہم آزاد رہتے ہوئے بھی مغرب کا قلادہ گردن میں ڈالے رکھنے پر مجبور ہیں خدا ہماری مدد کرے۔

تہذیب کی تعمیر میں اِسلام کا کردار یہی ہے کہ جب اِنسانی زندگی کو خدا کی رہنمائی میں مکمل سونپ دیا جاتا ہے تو اِس کے شعبوں کے لیے علیحدہ سے کسی اور رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ عبادت سے لے کر سیاست تک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم ﷺ کی ہدایات پر عمل درآمد کرنے کے سِواء کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ چونکہ خود اِنسانی جسم وجان اور اِس کائنات کا ذرّہ ذرّہ تک اسی خدائے واحد کی بخشی ہوئی فطرت کا پابند ہے، اِس لیے اِنسان بھی جب اپنے دیے ہوئے اختیارات کو اِسی خدائی ہدایات کا پابند بنالے تو اس کو ہر طرف سے موافقت اور ہم آہنگی ہی نصیب ہوتی چلی جائے گی۔ نتیجے میں حیات اِنسانی امن چین اور سکون کی راہ پر گامزن رہے گی اس طرح دینِ حق فلاح دنیا و اُخروی نجات کا ضامن ثابت ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر اِنسان اپنی تہذیب کو خدا کی اطاعت سے منہ موڑ کر خود اپنے ہی اُصول وضوابط کی بنیاد پر تعمیر کرنے کا بیڑہ اٹھائے تو فساد فی الارض پیدا ہوگا بگاڑ اور تباہی کی راہ ہموار ہوگی کیونکہ تخلیق خدا کی اور حاکمیت (اَمر) اِنسان کی کا معاملہ قابلِ فہم نہیں رہتا۔ جن قوموں نے خدا کی اِس حیثیت کو ماننے میں غفلت برتی کہ وہ ہمارا حاکم حقیقی ہے اور عبادت کی حد تک اس کو تسلیم کرکے باقی معاملات میں چھوٹ حاصل کی جائے تو تہذیب کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ مذاہب کا موجودہ تصوّر اِن ہی خطوط پر رواں دواں ہے۔ اِس نظریے کی روشنی میں تہذیب کا صحیح تصوّر بگڑ جاتا ہے اور یہی ہو رہا ہے۔ جب دُنیوی مسائل کے حل کے لیے خدا کی رہنمائی قبول نہیں کی جاتی تو لازماً جس قدر بھی اصلاح کی کوششیں کی جائیں گی وہ ناکام ہوں گی۔ اس کو مثال کے ذریعہ بتانے پر بات واضح ہو سکے گی۔

خدا نے مرد کے مقابل عورت کی تخلیق کی ہے۔ وہی ان دونوں کی جسمانی اور نفسانی تفاوت کو پہچان سکتا ہے۔ اور خدا نے دونوں کے میدان کار کو علیحدہ علیحدہ متعین کیا ہے۔ عورتوں کو آزادی کے ساتھ مردوں میں گھل مِل کر رہنے سے منع کر دیا ہے اور اُس کے لباس میں بھی اِس فرق کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت دی گئی ہے اِن احکام کو اسلام نے ''پردہ'' کے عنوان سے تفصیلی ہدایات دیے ہیں۔ مرد کو غالب اور قوّام بنایا ہے اور عورت کو

شادی کے بندھن میں باندھ کر مستقل شریکِ حیات قرار دیا ہے۔مرد کو بیوی اور بچوں کی کفالت کا ذمہ دار بنایا ہے محرم اور غیر محرم کے حدود مقرر کیے ہیں۔اس طرح عورت کی نزاکت اور اس کی شرم وحیا کو محفوظ کر دیا گیا ہے، لیکن آج نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو اِس قدر برہنہ کر کے بازاروں کی زینت بنانے کے بعد یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ لوگ عورت کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور عورت کی شرم وحیا محفوظ رہ پائے گی۔قربانی کے جانوروں پر نظر ڈالنے والے ان کے فربہ اور تروتازہ ہونے سے زیادہ کسی اور حیثیت پر غور نہیں کر سکتے۔قانون کو سخت سے سخت بنا کر بھی اصلاح کی کوشش کی جارہی ہے جو ناکام ہے۔صحیح طریقہ تو یہی ہے کہ عورت کو خدا کے دیے ہوئے حدود میں رکھا جائے۔ یہی اُس کی عزت اور قدر و قیمت محفوظ کرنے کا طریقہ ہوگا۔ورنہ ٹھوکریں کھانا اِس جدید تہذیب کا مقدر ہے۔

موجودہ سیاست کی بے بنیادی

حصولِ اقتدار کی جدوجہد کو سیاست کہا جاتا ہے۔مُلک اور قوم کی سرداری کو آج کے دور کا سب سے بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ قیادت کی چھوٹی سے چھوٹی ذِمہ داری بھی حاصل ہوجائے تو اُس کے وارے نیارے ہوجاتے ہیں ۔لوگ اُس کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں یہ اس لیے ہوتا ہے کہ عوام اور حاکم ایک دوسرے کے سامنے جواب دہ ہیں کسی خالق و مالک اور حاکم کے سامنے جواب دہی کا کوئی تصور نہیں ہوتا تبھی تو دونوں طرف سے ایک دوسرے کو راضی رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔سماج اور پولیس کی نظروں سے بچ کر عوام اور حکمراں جتنا چاہے چوہے اور بلّی کا کھیل کھیل لیں دوسری کسی باز پرس کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ان کو اپنے اعمال کی جواب دہی کا احساس نہیں ہوتا۔پبلک اور لیڈر اپنی بیان بازیوں اور ڈراموں کے ذریعہ ایک دوسرے کا کام نکال لینے کے چکّر میں پڑے رہتے ہیں۔ اطاعت اور حاکمیت ایک دوسرے کو مطمئن کرنے میں لگی رہتی ہے ۔ اِس طرزِ سیاست کو جمہوری حاکمیت کہا جاتا

ہے۔ اِس میں دستور سے لے کر سارے حقوق وفرائض تک کے قانون کو اہلِ سیاست ہی مرتب کرتے ہیں۔ اِن کے قانونی نکات کی تشریح اور عمل آوری کے لیے عوامی منتخب نمائندے، حاکمیت کے فرض ادا کرتے ہیں۔ قانون اور قومی دستور کو بنانے والوں کے بارے میں موجودہ دور کے مشہور دانشوروں کے خیالات ملاحظہ ہوں:۔ ''دنیا میں ایسا کوئی قانون بنانے والا نہیں ہے، جس کے نظریات کی چھاپ قانون پر نہ پڑی ہو، اور نہ ایسا کوئی قانون اب تک بنایا جاسکا ہے جس میں قانون بنانے والے کے نظریات، جذبات، محبت ونفرت کی چھوٹ نہ پڑی ہو ہر قانون بنانے والا چونکہ مخصوص عواطف و نظریات کا حامل ہوتا ہے۔ اس لیے قانون بناتے وقت اپنے نظریات کو ٹھونسنا چاہتا ہے۔ ارسطو نے قانون بناتے وقت کبھی تو اپنے نفرت وکینہ کا اظہار جو اس کو افلاطون سے تھا۔ کیا ہے اور کبھی سکندر سے اپنی محبت ورجحان کا اظہار کرنے پر مجبور ہوا ہے۔ افلاطون چونکہ اتھینز قوم کے استبداد سے متنفر تھا اس لیے اس کے قوانین میں اِس نفرت کا احساس بھی موجود ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قانون میں قانون بنانے والے کے نظریات داخل ہوجاتے ہیں اور کبھی تو صرف پورے کا پورا قانون، قانون بنانے والے کے نظریات کا تابع ہوجایا کرتا ہے۔''

جین جکپیس روسیو لکھتا ہے ''ایسے قوانین جو تمام مِلتوں کے لیے مفید ہوں ان کے بنانے والے کو ''عقلِ کل'' ہونا ضروری ہے۔ جو انسانی شہوتوں کو دیکھتا تو ہو لیکن اِس سے متاثر نہ ہو۔ فطرت سے کسی قسم کا رابطہ نہ رکھتا ہو۔ مگر نباض فطرتِ انسانی ہونا چاہئے۔ سعادت ونیک بختی میں وہ ہمارا محتاج نہ ہو ہم اس کے محتاج ہوں۔''

فی الحال دنیا کے ان دو ماہرین کی رایوں پر اکتفا کیا جاتا ہے اور یہ وہ دانشور ہیں جو اِسلامی نظامِ حیات پر ایمان نہیں رکھتے لیکن بے لاگ خیالات پیش کرنے پر مجبور ہیں۔ انسانوں کے لیے خود انسان قانون بنانے لگیں تو بشری کمزوریوں سے پاک ہونے کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ اس وقت ہر ملک کا اپنا ایک علیحدہ دستور ہے۔ شہریوں کے حقوق وفرائض ہر ملک کے لیے جدا جدا ہیں حالانکہ انسانی فطرت سب کی یکساں ہوتی

ہے۔نسل،زبان،رنگ،علاقوں اور ذاتوں کا اثر ان کی فطرت کو بدل نہیں پاتا۔یہ بہرحال آدمی ہی ہوتے ہیں اللہ کے بندے اشرف المخلوقات اور ان کے اندر خیر اور شر کے جذبات بھی کم و بیش یکساں ہوتے ہیں۔جسم و جان کا رشتہ جوڑے رکھنے کے لیے سب کی ضرورتیں بھی یکساں ہوتی ہیں۔رنج و غم اور غصہ جیسے جذبات ہر ایک کو لاحق ہوتے ہیں۔ مذکورہ اقتباس کی رو سے اِنسان کا قانون بنانے والا اگر انسانی جذبات و احساسات سے اونچا ہو تو غلطیوں سے پاک ہوسکتا ہے اور وہ ہستی بلا شبہ خدائے بزرگ و برتر کے سواء اور کسی کی نہیں ہوسکتی۔اللہ کا کلام قرآن مجید موجود ہے اور اس میں خدا کی حاکمیت کے بنیادی اصول موجود ہیں اور دنیا کے سارے انسانوں کے لیے قابلِ عمل بھی۔ان کے حق اور لازم ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے ان قوانین کی بنیاد پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیّبہ میں خلافت کا حق ادا کیا اور ان کے بعد خلفائے راشدین کی خلافت کے نمونے بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔

خدا کی حاکمیت اور جمہور کی خلافت

مسلم معاشرے تک میں کچھ لوگ دوسرے مذاہب کے عام لوگوں کی طرح کٹر مسلم، اعتدال پسند اور سیکولر مسلم جیسی اصطلاحوں میں متفکر ہیں۔یہی نہیں بلکہ نماز، روزوں کے پابند مسلمان بھی دنیاوی معاملات میں دین اسلام کی مداخلت کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔زندگی کے دوسرے شعبوں بالخصوص سیاست میں تو اسلامی کردار کے ہرگز قائل نہیں اور پھر اس کو کٹر مسلمانوں کی اپنی سوچ سے تعبیر کر کے رہ جاتے اِس قسم کے لوگوں کی ایک آخری ہوشیاری یہ بھی ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت تو سر اور دھڑ جُھلاتے ہوئے بڑے انداز سے کرتے رہتے ہیں لیکن اس میں تدبّر کرنے یا معنی مطلب سے پڑھ کر سمجھنے کے ہرگز روادار نہیں ہوتے۔یہ لوگ در اصل دین اِسلام کو بھی دوسرے عام مذاہب کے دائرے سے باہر نکال کر سوچنا نہیں چاہتے یہ ان کی خواہش اور تمنا والا دین ہے اِس پر عمل پیرا ہو کر مطمئن ہونے ہی میں عافیت نظر آتی ہے۔اس کو عام مسلمانوں کا

مزاج نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ لوگ بیک وقت دو کشتیوں پر سوار ہو کر سفر کرنے کے خواہش مند معلوم ہوتے ہیں۔ مسلم ملکوں میں خدا کی حاکمیت کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے مقابلے میں بہت بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ سیاسی اسلام کی اصطلاح ایجاد کیے ہوئے ہیں تاکہ ناواقفوں کو گمراہ کر سکیں۔ مذہب کے رواجی تصوّر میں خدا کی حیثیت کا کردار مشکوک رہ جاتا ہے اور خود انسان کی دنیا میں کیا حیثیت ہے واضح نہیں ہوتا۔ ان بنیادی امور پر غور و فکر کرنے کی فرصت ہی ہے اور نہ کوئی تڑپ۔

قرآن مجید بلا شبہ اللہ کا کلام ہے۔ یہ ایک زِندہ معجزہ ہے۔ عجیب وغریب کتاب ہے۔ اس کو پڑھ کر سمجھنے پر مائل ہر شخص انگشت بدنداں رہ جاتا ہے اس کے اندر اٹھنے والے ہر سوال کا جواب اُس کو مِل جاتا ہے مدلل اور سائنٹفک انداز سے سمجھانے کا اِس سے زیادہ موثر ذریعہ کوئی نہیں۔ بشرطیکہ نیک نیتی سے رجوع ہو۔ اِسی وجہ سے اِس کو معنوں کے ساتھ پڑھنے سے روکا جاتا ہے۔ پھر دین کی جو محدود حیثیت لوگ پیش کر کے قناعت پر مجبور کرتے ہیں اِس کے پڑھنے سے ذہن کے گوشے کھل جاتے ہیں اور مکمل دین سامنے آجاتا ہے۔ اِسی اللہ کے کلام میں دنیا کی بگڑی قوموں کا حال بیان کیا گیا ہے کہ ان کے علماء کتاب کے ایک حصہ پر عمل کر کے دوسرے کو چھوڑ دیتے تھے عوام سے رقم لے کر کتاب کی باتوں کو بدل کر پیش کرتے تھے۔ ان ساری خرابیوں کو ملّت اسلامیہ سے دور رکھتے ہوئے دین کی مکمل اِتبّاع کا عزم کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

قرآن مجید میں جہاں عبادتوں کا حکم دیا گیا ہے وہیں معاشرتی ہدایتیں بھی مرحمت فرمائی گئی ہیں پھر جرائم پر تعزیری احکام بھی اِسی شد و مد کے ساتھ نازل ہوئے ہیں۔ اور حیرت اِس پر ہے کہ ان احکام کی یکساں اہمیت ظاہر کی گئی ہے کُتبَ فرض اور وصی وغیرہ کے الفاظ سے عبادتوں اور معاشرتی احکام اور تعزیری قانون وغیرہ کے احکام دیے گئے ہیں یعنی مسلمانوں کے لیے اِن ساری ہدایتوں پر عمل پیرا ہونا یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ عبادتوں کی آسانیوں کے لیے ہوں یا معاشرت کی کشمکش کے لیے یا اقتدار حاصل کر کے تعزیری قوانین نافذ کرنے کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو ان سب کے لیے" لازم کر دیا

گیا ہے" فرض کیا جاتا ہے وغیرہ کے یکساں زور دینے والے الفاظ آئے ہیں یہ احکام نازل ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اقتدار کی جدوجہد کرنا ضروری ہے تا کہ تعزیری احکام کے نفاذ کی راہ ہموار ہوسکے۔موجودہ بگاڑ کے ماحول میں قرآن مجید کی یہ ہدایتیں موجب حیرانی ہی ثابت ہوں گی۔تاریکی میں رہتے ہوئے بھی آدمی عادی ہو جاتا ہے۔ جب اس کو دور کہیں سے ٹارچ روشن ہو کر قریب آتی معلوم ہوتو بھی بہت دیر تک یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کیا یہ حقیقت ہے؟ ایسا ہی حال قرآن مجید کی ہدایات معلوم کر کے ہوسکتا ہے۔حالات اجازت نہیں دیتے لیکن عزم اور نیت پر تو کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔ اگر ہمیں معلوم ہو کہ اپنی وراثت میں جو محل آیا ہے وہ حکومت کے قبضے میں ہے اُس کو آسانی سے حاصل کرنا موجودہ مرحلے میں ممکن نہیں ہے تو کیا ہم اس محل سے دستبردار ہو جائیں گے؟ یہ تو کوئی نہیں کرتا بلکہ ہر ایک کو بتایا جاتا ہے کہ فلاں محل میرے دادا کا ہے اور مجھے کاروائی کر کے حاصل کرنا ہے۔ ایسی ہی صورت حال ہم کو قرآن مجید کی اُن ہدایتوں کے بارے میں اختیار کرنا ہے جن پر ہم عمل پیرا ہونے کے قابل نہیں ہیں۔عزم اور نیّت بھی نہ کریں تو خدا کے احکام سے مداہنت کرنے کے مجرم گردانیں جائیں گے۔

غرض کہ اسلام نے خدا کی حاکمیت اور جمہور کی خلافت پر زور دیا ہے۔

مقتدر اعلیٰ کون

خدا کے احکام پر عمل درآمد کرنے والی حکومت کے نمائندے کثرت رائے سے منتخب کیے جائیں گے یہ نمائندے اللہ کی کتاب اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی روشنی میں دستور تشکیل دیں گے۔یہ نمائندے محض خلافت کریں گے حکومت خدا کی اور نگرانی اس کے متقی اور فرماں بردار بندوں کی رہے گی مشوروں کے لیے شوریٰ کی مجلس ہوگی یہ مجلس بھی قرآن اور سنّت کی روشنی میں سارے مسائل حل کرے گی۔اس طرح کی سیاست میں بندگان خدا کو راحت نصیب ہوگی زبان نسل ذات اور علاقے وغیرہ کی عصبیتیں رکاوٹ ثابت نہیں ہوں گی کیونکہ سب ایک خدا کے بندے ہیں سب کے

ساتھ مساوی حقوق وفرائض ادا ہوں گے۔اسلامی حکومت میں دوسرے مذہب والوں کے ساتھ جو رویّہ اختیار کیا جاتا ہے اُن کو ''ذمیوں کے حقوق'' کے نام سے علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔حقوق شہریت دنیا کے سارے انسانوں کو مساوی دیے جائیں گے اور ذمّی کی جان و مال اور آبرو مسلمان کے برابر قابل احترام ہوں گے۔فوج داری اور دیوانی قوانین میں مسلم اور ذمّی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوگا۔ذمّیوں کے پرسنل لا میں اِسلام کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ذمّی اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے اور ضمیر واعتقاد اور مذہبی رسوم وعبادات انجام دینے میں پوری آزادی برت سکیں گے کوئی ان کو روک نہ سکے گا۔

اسلام میں صدر جمہوریہ کی حیثیت امیر المومنین کو حاصل ہوتی ہے۔امیر کے انتخاب کے لیے سارے بالغ مرد اور عورتوں کو رائے دینے کا حق ہوگا یہ لوگ دستور کو تسلیم کرنے والے ہوں گے۔ اُمیر اور اس کی حکومت کو عام آدمی بھی تنقید کا نشانہ بنا سکتا ہے۔مجلس شوریٰ کی سب کمیٹی علماء پر مشتمل ہوگی یہ قانون کی جدید تعبیر میں مدد دے گی۔ یہ چند اُمور محض نمونہ کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔

مذکورہ خیالات درج ذیل آیات سے اخذ کیے گئے ہیں۔

(۱) اے پیغمبرؐ کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور مَیں سب سے پہلے اُسی کے آگے سر جھکانے والا ہوں۔(الانعام: ۲۰)

(۲) اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور اُن کے اموال خرید لیے ہیں جن کے معاوضے میں اُن کے لیے جنّت ہے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں مارتے اور مارے جاتے ہیں۔ پس اس سودے پر جو تم نے (اپنے خدا سے) کیا ہے خوشی مناؤ۔ حقیقت میں یہی بڑی کامیابی ہے (التوبہ:۱۴)

(۳) اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔(الصف:۴)

(۴) تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اِن سے

اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ضرور ان کو زمین میں خلافت عطا کرے گا جس طرح اس نے اِس سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا اور وہ ضرور ان کے اُس دین کو استحکام بخشے گا جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے ان کی حالتِ خوف کے بعد ان کو امن عطا کرے گا۔ (النور۲۰:۵۵)

(۵) حکومت اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہے حکمراں بنادے (الرعد:۳)

(۶) سورہ التین'' کی آخری آیت میں سوال ہے'' کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں کا حاکم نہیں ہے؟'' حدیث میں ہدایت دی گئی ہے جب بھی یہ پڑھے جواب میں ''فبلیٰ'' (جی ہاں) کہا جائے۔

(۷) یہ ایک سورت ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے اور اسے ہم نے فرض کیا ہے اور اس میں ہم نے صاف صاف ہدایات نازل کی ہیں شاید کہ تم سبق لو۔ زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو۔ (النور:۲)

(۸) تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ: مرد کا حِصّہ دو (۲) عورتوں کے برابر ہے۔ (النساء:۱۱)

عبادتوں کے احکام، معاشرتی ہدایتیں اور تعزیری احکام کو اللہ کی کتاب میں یکساں شدومد سے جگہ دی گئی ہے کیونکہ اِسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔

اسلام کا سیاسی نظام

یہ حقیقت ہے کہ اَمر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کے لیے اور حیاتِ انسانی کے اہم مسائل حل کرنے کے لیے۔ صِرف نصیحت اور گزارشات و ہدایات پر انحصار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پولیس عدالت اور قانون کی حکمرانی کے بغیر نیکی پھیلانے اور اصلاح کو نافذ کرنے کا کام نہیں ہو سکتا۔ قانون تو بہت بنائے جاتے ہیں لیکن ان پر عمل آوری کے لیے طاقت کی ضرورت ناگزیر ہوا کرتی ہے۔ فطرت انسانی میں جہاں خیر و صلاح اور

تعمیر کی فطرت پائی جاتی ہیں وہیں شر وفساد اور تخریب بھی اِس کی فطرت میں داخل ہیں اس لیے حکومت کے ذریعہ خیر کو ترقی دینے اور شر کو مٹانے کا کام آسانی سے کر سکتے ہیں۔ اس لیے اسلام میں متقی اور پرہیزگار لوگوں کی جماعت میں سے نمائندوں کو منتخب کر کے یہ کام کیا جاتا ہے۔ لیکن اقتدار کے حصول کے لیے خود اپنا نام پیش کر کے بڑائی حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا ناجائز ہے۔ عوام اسی کی خوبیوں اور انتظامی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اِنتخاب کے لیے پیش کریں گے اکثریت کی رائے پر اس کے منتخب ہونے کا دارومدار ہوگا۔ بندگان خدا کو ظلم و زیادتی سے بچانے اور ان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے پھر امن و آمان برقرار رکھنے کے لیے سیاست اہم ذریعہ ہے۔

نبی کریم ﷺ نے مکّہ معظّمہ میں دینِ حق کی دعوت کا آغاز کیا تھا۔ تدریج کے ساتھ یہ دعوت آگے بڑھتی رہی گھر مُحلّہ اور شہر کے بعد قریب کی آبادیوں کی طرف آپؐ نے کوچ کیا تھا۔ اِس تیرہ سالہ دور میں آپؐ کو بہت زیادہ مُشکلات پیش آئیں اور اِس عرصہ میں آپؐ کی دعوت دینِ اسلام کی بنیادی باتوں پر مشتمل ہوتی تھیں توحید ورسالت اور آخرت کی توضیح اور تشریح پر زیادہ وقت صرف ہوا اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے کلام میں اِس ابتدائی دعوت کے تقاضے کو ملحوظ رکھا اور چھوٹی چھوٹی آیتوں پر مشتمل بنیادی باتیں پیش کی گئیں اِس دور کی سخت جدوجہد اور دُشمنانِ حق کی مسلسل رکاوٹوں کی موجودگی میں اقتدار اور سیاست کی طرف کوئی میلان ظاہر نہ ہونا چاہیے لیکن اِس دور میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی آیتوں کے ذریعہ حکومت واقتدار کے حصول کی نشان دہی کر دی ہے۔ تیرہ سالہ زبردست مخالفتوں کا دور اور پھر اِس مدّت میں بھی سب سے شدید ترین حالات کے دن۔ ان دنوں سورہ عنکبوت نازل ہوئی لیکن سورہ روم بھی ان ہی دنوں نازل ہوئی۔ کوئی عام آدمی تصوّر کر سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور نبی کریم ﷺ کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں ہر طرف مصائب کے طوفان حملہ آور ہیں حد یہ کہ ضرورت سے فارغ ہونے کے لیے آبادی سے باہر جانے کے لیے بھی بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ان حالات میں سورہ روم کی ابتدائی چھ آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے

یہ اطلاع دیتے ہوئے خوش خبری دی کہ اِس وقت رومی ہار گئے ہیں اور ایران جیت گیا ہے لیکن عنقریب اہل روم دوبارہ فتح حاصل کریں گے ۔ دنیا کی دو بڑی طاقتیں ٹکراتی رہتی تھیں لیکن اِن حالات میں رومیوں کے ہار جانے پر صحابہ کرامؓ کو مایوسی لاحق تھی کیونکہ ایک آتش پرست (مجوسی) حکومت نے خدا پرست قوم (رومی) پر جیت حاصل کی تھی۔ بظاہر عام حالات میں یہ مسئلہ ایسا نہیں تھا کہ اللّٰہ تعالیٰ اِس پر توجہ دلاتے لیکن قیامت تک کے سارے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا جا رہا ہے کہ تمہارے اپنے حالات جیسے بھی ہوں لیکن دنیا کے سیاسی حالات سے باخبر رہنا ضروری ہے ۔ کیونکہ تمہیں بھی قوموں کی قیادت کا بیڑہ اٹھانا ہے ۔تمہارے لیے سیاست شجر ممنوعہ نہیں بلکہ لازم ہے ۔

اِسی مکہ کے مصائب کا زمانہ ہے نبی کریم ﷺ اپنے چچا سے فرماتے ہیں کہ اے چچا مَیں ایک کلمہ کا مطالبہ کرتا ہوں اگر یہ لوگ مان لیں تو پورا ملکِ عرب اِس کلمہ کی بدولت ان کے ماتحت آجائے گا اور غیر عرب قومیں ان کو جزیہ دیں گی ۔ابو طالب چونک پڑے اور کہا اے بھتیجے تیرے باپ کی قسم ہم دسیوں کلمے مان لیں گے بتاؤ وہ کیا کلمہ ہے؟ تب آپؐ نے فرمایا لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ. قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ ملک عرب کی حکومت اور دوسرے ملک اپنے کنٹرول میں آجانے کی خبر پر ابو طالب نے چونک کر کس قدر جوش کا مظاہرہ کیا تھا اور نبی کریم ﷺ نے اِس کلمہ توحید پر ایمان لانے کے نتیجے میں سیاسی نظام کا قیام ممکن ہے بتایا۔ سیاسی اقتدار کے بغیر دوسرے ملک جزیہ (ٹکس) کس طرح دے سکتے ہیں ۔اس حدیث کو عبد اللہ ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس ابتدائی دور میں بھی مسلمانوں کے ذہن میں سیاسی اقتدار تک رسائی کا تصوّر چھایا ہوا تھا۔ دوسری حدیث یہ ہے کہ مفروق کو حج کے زمانے میں نبی کریم ﷺ نے دعوت دین پیش کی ۔ اُس نے سوالات کر کے دین حق کو معلوم کرتا گیا ساری باتیں سن کر قبیلہ شیبان کا یہ سردار جوبات کہتا ہے وہ غور طلب ہے ۔ایک غیر مسلم لیکن دانشور ہے اُس نے اسلام کی دعوت سے اندازہ کر لیا ہے اس لیے اس نے آخر یہی کہا کہ ’’تمہاری دعوت اہل اقتدار کو پسند نہیں آئے گی ۔ یہی سیاست کا اسلامی کردار ہے جو برملا ظاہر ہوتا رہا ہے ۔

علم کی حقیقت

خدا کی اِس سرزمین پر بے شمار مخلوقات آباد ہیں۔مویشی ،جنگلی جانور درندے اور پرندے وغیرہ کا بھی یہی مسکن ہے۔اولادِ آدمؑ خدا کی خاص مخلوق ہے اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔اس کا جسم انتہائی نازک اور پائیداری میں بے مثال ہے۔اس کی عقل میں غور و فکر اور سوجھ بوجھ کی صلاحیت ہے۔مرضی اور اختیار کی آزادی عطا ہوئی ہے۔اِس کو زمین اور آسمان کی ساری نعمتوں پر تصرف حاصل ہے۔ان اعلیٰ درجے کی بخششوں کے ساتھ اشرف المخلوقات کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے مقصدِ وجود کے بارے میں سوچے اور حیوان کی صفات سے اونچا ہو کر کچھ کرے۔غذا اور جسمانی ضروریات کا غلام بن کر نہ رہ جائے۔انسان کو اتنی سمجھ تو لازم ہے کہ وہ اپنی شہوتوں اور لذّتوں پر اتنی قدرت رکھے کہ مناسب حدود میں ادا کر سکے ورنہ چوپایوں سے ممیّز نہ سمجھا جا سکے گا۔ایک غذا کے مسئلے پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سارے جانور پیدائش کے بعد ہی سے اپنے کھانے کی چیزوں سے واقف ہوتے ہیں ان کو سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی پتہ پالا کھانے والے گوشت پر مُنہ نہیں مارتے اور گوشت خور پتوں کو منہ نہیں لگاتے لیکن اِنسانی بچہ ڈیڑھ دو سال کی درمیانی عمر میں جو بھی اس کے ہاتھ لگ جائے وہ منہ میں ڈال لیتا ہے کنکر سے لے کر جھینگر تک ،اُس کو والدین کے ذریعہ جاننے یا علم حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی۔یعنی علم انسان کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ابتدائی بچپن میں حروف شناسی کے بعد کتابوں کے ذریعہ علم حاصل کرتا جاتا ہے۔بالغ ہوتے ہوتے اُس کو اچھے اور بُرے کی تمیز ہو جاتی ہے۔وہ مقصدِ حیات جاننے کے قابل ہو جاتا ہے علم کے ذریعہ اپنی فکر کو جِلا بخش کر اپنے آپ کو دُرست کرتا اور سوسائٹی کے لیے کارآمد بنتا جاتا ہے۔علم انسان کی خودی کو پہچاننے کے لیے ضروری ہے۔اپنے مالک اور اُس کی دنیا سے ہمارا تعلق معلوم کرنے کا واحد ذریعہ علم ہی ہوتا ہے۔

عِلم کے معنی جاننا کے ہیں۔علم انسان کا طُرّہ ٔ امتیاز ہے۔حیوان سے انسان کو

جُدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ترقی کی معراج کا یہ دور سائنس وٹکنالوجی کی آخری سرحدیں چھونے لگا ہے۔انسانیت سے محروم ہوکر کوئی ترقی بھی اِنسان کو امن وچَین سے ہمکنار نہیں کرسکتی اس کی تکمیل کے لیے نبی آخر الزماں کو مبعوث ہونا ضروری تھا۔نبی کریم ﷺ انسان کی گمراہی کے اِس گھٹاٹوپ اندھیرے پر بے چین تھے۔چالیس (۴۰) برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔تجارت ذریعہ معاش تھی۔مکّہ معظمہ کی پہاڑوں سے گھری آبادی میں آپؐ مع بیوی رہا کرتے تھے۔آبادی کے باہر چند میل کے فاصلے پر ایک بلند وبالا پہاڑی پر غارِ حرا تھا آپؐ وہاں تنہا قیام کرتے ہوئے غور وفکر کرتے ،کھانے پینے کا سامان لے جاتے پھر کبھی آپؐ کی زوجہ محترمہ خدیجۃ الکبریٰؓ بھی توشہ پہنچاتیں۔غارِ حرا کی اِس تنہائی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محترم فرشتے حضرت جبریلؑ کو پیامِ رسالت دے کر بھیجا اور اپنے کلام کی ابتداء اِن آیات سے کی۔ان پانچ آیات کی اِبتداء پڑھنے اور لکھنے سے شروع کی گئی ہے مُلاحظہ ہو۔''پڑھو(اے نبیؐ) اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے اِنسان کی تخلیق کی۔پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔اِنسان کو وہ عِلم دیا جِسے وہ نہ جانتا تھا۔سورہ علق میں وحی الٰہی کا آغاز پڑھنے اور قلم کے ذریعہ سکھانے کے علاوہ اِنسان کی تخلیق کی حقیقت بیان کرنے سے ہوا ہے۔اسلام میں علم کی اہمیت اِس سے زیادہ کیا ہوگی؟اِسی مکہ معظمہ میں نازل ہونے والی یہ آیت بھی ملاحظہ ہو۔ہم نے دوؤد اور سلیمان کو عِلم دیا اور اُنہوں نے کہا کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی (النمل:۱۵)

عِلم خدا کا دیا ہوا ہے۔انسان کو سب سے ضروری اور لازم علم اپنے خالق اور مالک کی پہچان ہوا کرتی ہے اور جس کو عِلم حاصل ہوجاتا ہے وہ دوسروں پر فضیلت حاصل کرلیتا ہے۔اِنسان کے اشرف ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ عِلم سے بہرہ مند ہو۔

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو وجود بخشنے کا اِرادہ کیا تو فرشتوں سے اس کا ذکر کیا۔تب فرشتوں نے کہا تھا کہ اِنسان جھگڑے اور خون خرابے کرے گا اور ہم (فرشتے) حمد وتسبیح کے لیے کافی ہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو چند چیزوں کے نام بتائے

اوران کودوبارہ اُن کو بتانے کے لیے کہاتو حضرت انسان نے ان چیزوں کے ناموں کے ساتھ سارے خواص بھی بیان کر دیے یہ دیکھ کر فرشتوں نے اقرار کیا تھایا باری تعالیٰ یہ آدمؑ تو واقعی ہم سے افضل ہے ورنہ ہم تو بس اتنا ہی جانتے ہیں جو آپ نے بتایا ہے۔ اِن کی مزید تفصیلات جاننے سے معذور ہیں آخر میں فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ یقیناً آپ ہی اِنسان کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں ہم نہیں جانتے۔ (البقرہ: ۳۰ تا ۳۲) انسان کے خون خرابوں اور جنگوں کے مقابل اِس کے علوم اور سائنس کی دریافتیں غالب ہیں۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کو عِلم کس قدر محبوب ہے۔ تخریبی صلاحیتوں کے باوجود تعمیری کارناموں کو فوقیت دینا حیرت انگیز ہے۔ انسان کو وجود بخشنے کو قرآن مجید میں ''زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں'' کہا گیا ہے ان تین آیتوں کے بعد فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو انھوں نے تعمیل کی، شیطان جو جنوں میں سے تھا اور خدا نے جنوں کو بھی اختیار کی آزادی دے رکھی ہے اور فرشتے نور سے پیدا کیے گئے اور جن آگ سے پیدا کیے گئے ہیں شیطان نے غرور کی وجہ سے اِنسان کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ان باتوں کو قرآن مجید میں دوسرے موقعوں پر بھی بیان کیا گیا ہے۔

سورہ رحمٰن کی ابتدائی تین آیتوں کا ترجمہ بھی علم کی حیثیت کو واضح کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ ''رحمٰن نے اِس قرآ آن کی تعلیم دی ہے۔ اس نے انسان کو پیدا کیا اور اِسے بولنا سکھایا۔'' قرآن کی تعلیم دنیا کے سارے علوم کا منبع ہے تدبّر کرنے والوں کے لیے خزانہ ہے۔ ہدایتوں کا ذریعہ ہے انسان کی خیر وفلاح کا دارومدار خوف خدا پر ہے اس کی ہستی کا استحضار انسان کو بگڑنے سے بچاتا ہے۔ اِس سے نظریں اوجھل ہو جاتی ہیں اور خدا کو فراموش کر دیتا ہے تو شیطان اُس شخص کا شکار کر لیتا ہے۔ اِسی لیے کہا گیا ہے ''حقیقت یہ ہے کہ اللّٰہ کے بندوں میں صِرف عِلم رکھنے والے لوگ ہی اِس سے ڈرتے ہیں۔ (فاطر: ۳۵) ظاہر ہے جو شخص علم سے بے بہرہ ہوگا وہ خدا سے لاپرواہ ہوگا۔ علم کے بغیر خوف خدا بھی نہ ہوگا۔

عِلم نہیں رکھنے والے بھی ہدایت ورہنمائی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں یہ لوگ

نفسانی خواہشات کے غلام ہوتے ہیں اگر کوئی ان کی رہنمائی قبول کر کے عمل کرنے لگے تو یہ راہِ راست سے بھٹکا دیتے ہیں۔ جو علم کی نعمت سے فیضیاب نہیں ہوتے ان کی باتیں گمراہی کی دعوت دینے والی ہوتی ہیں ....ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔(الجاثیہ:۱۸) اس کے بعد اہل علم کا بھی ذکر کیا ہے، دنیا میں علم نہیں رکھنے والوں کا مسئلہ تو بہت گمبھیر ہے۔ان کے شر میں کم ہی لوگ گرفتار ہوتے ہیں کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ یہ علم نہیں رکھتے۔ان کی باتوں کا بودا پن آسانی سے کُھل جاتا ہے اور لوگ ان سے تعرض کرتے ہیں۔لیکن دوسرے لوگ وہ بھی ہوتے ہیں جو عِلم تو خوب رکھتے ہیں لیکن نفسانی خواہشات کے غلام بن کر علم کا استعمال غلط راہوں پر کر کے لوگوں کو بھٹکاتے ہیں۔ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے ملاحظہ ہو۔

کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنالیا اور اللہ نے علم کے باوجود اُسے گمراہی میں پھینک دیا اور اُس کے دل اور کانوں پر مہر لگادی اور اُس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اللّٰـــہ کے بعد اور کون ہے جو اُسے ہدایت دے کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے ؟ (الجاثیہ:۲۲) مذکورہ آیت کی ترجمانی اِس قدر واضح ہے کہ مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

دُنیا میں بے شمار قسم کے نظریات اور ان پر عمل کرنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ خدا کے بارے میں اٹکل پچو سے باتیں گھڑ کر پیش کرتے ہیں۔خدا کیسا ہے کہاں ہے وغیرہ جیسی باتیں پیش کر کے لوگوں کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ان لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے:

’’انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی عِلم ہو یا ہدایت یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب۔ (لقمان:۲۰) آخر میں ان لوگوں کا ذکر بھی دلچپسی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ اپنے علوم کی دُنیا میں اِس طرح کھوئے رہتے تھے کہ ان کو حق اور باطل کا فرق ہی نہیں ہو پاتا تھا۔علم تو انسانی زندگی کے لیے مفید ہوتا ہے لیکن جب علم کسی واضح مقصد کی رہنمائی نہیں کرتا تو وہ

عِلم چیستاں بن کر رہ جاتا ہے۔ خدا نے ایسی قوموں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ کھنڈرات ان کی ترقی کی مُردہ علامات و آثار بن کر آج تک موجود ہیں تا کہ لوگ ان کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ یہ لوگ علم رکھتے تھے لیکن وہ اپنے قیاسی علوم میں اس حد تک مگن رہتے تھے کہ رسولؑ آئے اور بیّنات لے کر آئے لیکن پیغمبروں کی ہدایتوں پر توجہ نہ دی اور ان کی دعوت کو سُنی ان سنی کرتے رہے۔ نتیجے میں تباہی ان کا مقدر ہو گئی۔ دنیا میں آثارِ قدیمہ کی حیثیت سے ان کے تباہ شدہ کھنڈرات موجود ہیں۔ ''جب ان کے رسولؑ اُن کے پاس بیّنات لے کر آئے تو وہ اس علم میں مگن رہے جو ان کے پاس تھا۔'' (المومن ۴۰:۸۳) اِس آیت سے قبل اور اِس کے بعد بھی اسی سلسلے کی تفصیل درج ہے۔ اور علم کی صحیح حیثیت واضح کی گئی ہے۔

فقہ کی ضرورت

اِسلام میں علوم کی قدر و قیمت کے لیے اپنی مثال آپ تھا۔ پہلی صدی ہجری ہی سے ہمارے حکماء نے تحقیق و تجسس کا بیڑہ اٹھایا ہوا تھا اس کے بعد مُسلسل ترقی ہوتی گئی اور کتابوں کے انبار لگتے گئے کتب خانے سرکاری سرپرستی کے ذریعہ پھیلتے چلے گئے۔ آج جب کہ مسلمان صدیوں کی برتری اور غلبے کے بعد شکست خوردہ پست اور مغلوب ہو گئے ہیں۔ سائنسی علوم کی ترقی کے لیے بنیاد فراہم کر کے یوں انجان ہیں جیسے یہ ابتداء ہی سے علوم نا آشنا رہے ہوں۔ لیکن مغربی ملکوں کے کتب خانے گواہ ہیں کیونکہ ہمارے سلفِ صالحین کے کارناموں سے وہ بھرے پڑے ہیں۔ مُستشرقین کی چھوٹی سی تعداد ایسی ضرور رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کی بنیاد فراہم کرنے کے احسان کو برملا اعتراف کرتے رہے ہیں ان ساری باتوں کو مغربی کتب خانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ الغرض موجودہ سائنسی کرشمہ سازیاں مسلم سائنس دانوں کی کوششوں کی مرہونِ مِنت ہیں۔

علم کی تعمیر و ترقی میں اسلام کا کردار آیتوں کی روشنی میں سامنے آ چکا ہے۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ کی احادیث اور عمل کے ذریعہ علم کی حیثیت کو واضح کیا جائے گا۔

حضرت انسؓ نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا ''سب سے اچھا علم کونسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ''معرفت الٰہی'' اِس کے بعد پھر اُسی سوال کو دومرتبہ دہرایا تو آپؐ نے وہی جواب ''معرفت الٰہی'' فرمایا اِس کے بعد حضرت انسؓ نے پوچھا۔ سب سے اچھا عمل کونسا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا علم کے ساتھ تھوڑا عمل بھی نفع دیتا ہے لیکن جہل کے ساتھ بہت عمل بھی نفع نہیں دیتا'' عِلم کی توقیر اِس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے؟ اس کی زیادتی عمل کے معیار کو بڑھا دیتی ہے۔ یہ ترمذی سے لی گئی ہے۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:۔ ''موت کے ساتھ عمل منقطع ہوجاتا ہے لیکن تین چیزیں باقی رہتی ہیں (۱) صدقہ جاریہ (۲) فیض رساں عِلم (۳) صالح اولاد (ترمذی) علم کا فیض مرنے کے بعد بھی عالم کے اعمالِ صالحہ میں اضافہ کرتا رہتا ہے اِس سے بڑھ کر مومن کی خوش بختی کیا ہوگی کہ وہ علم حاصل کرے اور اس کی اِشاعت میں حِصّہ لے۔ بخاری و مسلم کی حدیث۔ مالک بن حویرثؓ نے فرمایا کہ ہم چند ہم عمر نوجوان دین کا عِلم حاصل کرنے کے لیے حضور ﷺ کے پاس آئے یہاں ہم نے بیس (۲۰) دن قیام کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت رحیم اور نرمی کا معاملہ کرنے والے تھے۔ آپؐ نے محسوس کیا کہ ہم اپنے گھر جانا چاہتے ہیں تو آپؐ نے ہم سے پوچھا کہ تمہارے پیچھے کون لوگ ہیں؟ ہم نے بتایا، تو آپؐ نے فرمایا کہ اپنے بیوی بچوں میں واپس جاؤ اور جو کچھ تم نے سیکھا ہے انہیں سکھاؤ اور بھلی باتیں بتاؤ ___ اور نماز وقت پر پڑھو ___ اور جو تم میں علم اور سیرت کے لحاظ سے بڑھا ہوا ہو وہ امامت کرے۔'' ___ مذکورہ حدیث میں عِلم کی فضیلت کے علاوہ آپؐ کے حسنِ عمل کا نمونہ بھی سامنے آ گیا ہے۔ سب سے آخر میں امامت کا معیار بھی بتایا دیا گیا کہ علم اور سیرت میں بہتر شخص ہی اہل ہوسکتا ہے۔ حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن کا عِلم حاصل کرے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے (بخاری) قرآن مجید رب العالمین کا کلام ہے اس لیے وہ علم اور حِکمت کا سرچشمہ ہے وہ کائنات کے حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے اور زندگی کے اسرار کو بے نقاب کرتا ہے اس کو پڑھنے سے آدمی کے اندر اپنے مالک کی پہچان پیدا ہوتی ہے اور اس کا تعلق قائم ہوجاتا

ہے یہ علم حقیقی کا مرکز ہے اس کے بغیر کسی رہنمائی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ خود اِس سے فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو اِس سے بہرہ مند کرے یہی نجات اُخروی کا ذریعہ ہے۔ اِسلامی علوم کے مأخذ قرآن اور سنّت کے علاوہ فقہ بھی ہے۔ وُہ بنیادی اُصول جو اللہ کے کلام اور نبی کریم ﷺ کی سنّت کے ذریعہ بھی حل نہیں ہوتے ان کو ہمارے فقہاء نے حل کرتے ہوئے راہیں متعین کردی ہیں ان میں اِمام مالک کی موطا کا مقام بہت بلند ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے ''موطا'' کو سب سے صحیح فقہ قرار دیا ہے یہ امام مالکؒ کی زِندگی ہی میں بہت مقبول ہوئی تھی۔ ابوجعفر منصور کے بعد مہدی اور پھر اس کے بعد ہارون تک نے بھی بزورِ حکم آپ کی کتاب کو تمام بلادِ اسلامیہ میں نافذ کرنے کے لیے اِجازت طلب کی تھی لیکن امام مالِکؒ نے ان تین بادشاہوں کو بھی نفی میں جواب دیا تھا۔ یہ ہمارے اَسلاف کی خدا ترسی اور تقویٰ کا عالم تھا۔ ان کے بعد حضرت نعمان بن ثابت جو امام ابوحنیفہؒ کے نام سے شہرت پائے آپ ۸۰ھ میں تولد ہوئے اور ریشم کے کپڑے کے تاجر رہے کاروبار کو ترقی دینے کے علاوہ اَپنے دور کے سیاسی اور دینی مسائل میں دلچسپی لی بلکہ خلافت کا معاملہ اُلجھ کرنا قابلِ تسخیر ثابت ہوا تو آپ نے زید بن علیؓ کو صِرف ایک بڑی رقم دے کر اخلاقی تعاون کا ثبوت دیا تھا۔ حالانکہ آپ کا دور تابعین کا تھا اور چار صحابہ کرام رِضوان اللّٰہ علیہم اجمعین بقیدِ حیات تھے دو صحابہؓ خود آپ کے شہر کوفہ میں موجود تھے باقی دو مکّہ اور مدینہ میں تھے۔ آپ عِلم کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے سب سے پہلے اِسلام کے گمراہ فرقوں کے علماء سے مناظرہ کرتے تھے خوارج، باطنیہ وغیرہ کو علمِ کلام کے ذریعہ راہِ حق پر لانے کی ذِمّہ داری نبھاتے رہے بصرہ میں ان کا بہت زور تھا آپ بیس بیس سال تک اِس دشت ناگوار کی سیر کی اس کے بعد کوفہ شہر میں اور اِن ہی محلّے میں حماد بن ابی سلیمان مولیٰ اشعری جنہوں نے ۱۲۰ھ میں وفات پائی تھی۔ رہا کرتے تھے لوگوں کا ہجوم ان کے گھر کا طواف کرتا نظر آتا۔ امام ابوحنیفہؒ چھوٹے چھوٹے مسائل تک سے واقف نہ تھے آپ کو ایک مسئلے پر شدید ذہنی پسپائی محسوس ہوئی اس کے بعد حضرت حماد کی شاگردی اختیار کی تیس سال تک ان کی خدمت سے استفادہ کرنے کے بعد جب حماد کا انتقال ہوا تو امام

ابوحنیفہؒ سب سے ذہین اور قابل شاگرد ہونے کی وجہ سے استاد کی جگہ بیٹھ گئے اور لوگوں کے مسائل حل کرتے کرتے آپ نے باضابطہ ایک مجلس ترتیب دی اور ہزاروں امکانی مسائل پر بحث ومباحثہ کر کے تدوین قانون (System of Law) کا کام انجام دیا۔ دینِ اسلام دو حصّوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ علماء اور فقہاء کے مقابل خلیفہ امیر المومنین کے روایتی منصب پر فائز تھے ان کے درباری جی حضوری میں آٹھوں پہر حاضر محفل ہوتے اور عیش کرتے۔ خلق قرآن کا فتنہ اِن ہی درباری علماء کا پیش کردہ تھا۔ امام ابوحنیفہؒ نے چند حق پسند علماء کی طرح ان سے ٹکرا کر جام شہادت پینے کے بجائے دیرپا حکمت عملی اختیار کی اور سب سے پہلے ان عباسی خلفاء کے لیے چند نئے ناموں سے لوگوں کو روشناس کرایا جیسا فقہ میں ان کو سُلطان کہا جانے لگا۔ سلطانوں میں بھی۔ عادل، ظالم اور فاسق کے درجے مقرر کر دیے۔ بادشاہ کا بیٹا بادشاہ مقرر کرنے کے غیر اسلامی طرزِ سیاست کی بنیاد پڑ چکی تھی خلافت کا سقوط ہو چکا تھا۔ ان حالات میں راست قرآن مجید اور سنّت نبوی سے مسائل نکلنا محال تھا۔ چناچہ آپ نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو کام میں لا کر حکومتوں کے جبر و اکراہ کے حالات میں عام لوگوں کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ اُن کے حل نکالنے کا بیڑہ اٹھایا۔ فقہ حنفی کی باضابطہ تدوین ہوئی ایک ایک مسئلے پر شاگردوں میں قرآن اور سنّت کی روشنی میں بحثیں ہوتیں۔ برسوں کی محنت شاقہ کے بعد تدوین فقہ کی تکمیل ہوئی عقائد وعبادات اور معاملات وغیرہ کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ ابواب قائم کیے گئے۔ اِس طرح اجتہاد کے ذریعہ ہزاروں مسائل کے فقہی حل دریافت کیے گئے۔

اموی دور جو بانوے (۹۲) سال تک جاری رہا۔ یہ بادشاہت بہ نام خلافت چلی اس کے بعد عباسی بادشاہ چھ سو سال تک بلاد اسلامیہ پر قابض رہے اور اِس دور میں نہ صِرف حدود سلطنت میں وسعت ہوئی بلکہ استحکام بھی نصیب ہوا۔ خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ خزانے بھرے ہوئے تھے لیکن اسلامی حکمت وتہذیب کے اعتبار سے ملّت کو بہت نقصان ہوا۔ اعتقادی فنون نے خوب پر پھیلائے فسق وفجور کی سرپرستی ہوتی رہی۔ اسلامی پس منظر کی وجہ سے یہ بادشاہ تضادات کے گرفتار رہے اخلاق و کردار کے اعلیٰ نمونے بھی ان

کے واقعات میں خوب ملتے ہیں اس کے علاوہ علوم وفنون کوخوب ترقی ہوئی فلسفہ وادب، طب،مساحت، ہیئت، ریاضی اور سائنس کے ماہرین نے دنیائے انسانیت کو مالا مال کردیا تھا۔

حکماء دانشوراور ماہرین علوم نے جو خدمات انجام دیں وہ عظیم کارنامے تھے ان علوم کی ابتداء یونان کی کتابوں کے ترجموں سے ہوئی ۔جب تک اُموی خلیفہ برسر اقتدار رہے۔عربی اثرات سے تہذیب وتمدّن متاثر رہےاور جب عباسی دور خلافت آیا تو ان کے پاس فارس اورایران کی تہذیبوں کا بول بالا شروع ہوگیا تھا۔اِس دور میں خالص اسلامی روایات کو محفوظ نہ رکھا جاسکا۔ غیر ملکی قوموں کا نفوذ بڑھتا چلا گیا۔ معاشرے کا رنگ ڈھنگ بدل گیا۔یونانیوں ،ترکوں، مجوسیوں،عیسائیوں اور یہودیوں کے فکری وثقافتی اثرات کے قافلے پے در پے داخل ہونے شروع ہوگئے ۔اگر چہ خود اموی دور سے ہی بادشاہت کا آغاز ہوگیا تھالیکن عباسی دور میں یہی بادشاہت ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔دُنیااوردین کے دوعلیٰحدہ راستے اختیار کرنے کی وجہ سے بھی اقتدار کوآزادفضاء میں پرواز کرنے کا موقع مِل گیا۔اِس قسم کی فکری تقسیم پراُس دور کے فلاسفروں نے بھرپور تنقید کی تھی جیسے اِبن تیمیہؒ نے ''السیاسۃ الشرعیۃ''میں کھل کر اظہار کیا ہے۔انہوں نے ناکارہ دینی گروہ اوروالیانِ ریاست کے بے لگام گروہ دونوں کوبھی ناکارہ قرار دیا ہے۔خلیفہ معتصم سے پہلے تک حکومت میں ایرانی سپہ سالاروں اور فوج کے اہم عہدیداروں کا زور رہا۔خلیفہ معتصم کی والدہ ترکی النسل تھیں اِن کے مشورے کی بنیاد پر ہزاروں ترکی غلاموں کودرآمد کیا گیا۔فوج کی طاقت ایرانیوں کے ہاتھ سے نکل ترکوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی اورتہذیب کے اثرات کو روکا نہ جاسکا۔ مامون کا دار الترجمہ ایک سو سال تک مسلسل کام کیا۔ ہر ترجمہ شدہ کتاب کے عوض سونا یا چاندی تول کردیا جاتا تھا۔حکیم لیو یونانی کی خدمات حاصل کرنے کے لیے مامون نے شاہ یونان کو۵ٹن سونا دینا منظور کیا تھا۔

علوم کی دنیا میں تہذیب اسلامی کا کردار

اِسلام کو پوری طرح اپنی حکومتوں میں نافذ نہ کرنے اور تبلیغ واشاعتِ دین کی جدوجہد سے غفلت برتنے کے باوجود مسلم حکمرانوں کے دور میں اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم کو فروغ حاصل ہوا کیونکہ عوام اپنے عُلماء سے رہنمائی حاصل کرتے تھے یہ بات اور ہے کہ حکومتوں میں سازشی اور بداعتقاد لوگوں کی ہمت افزائی سے اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔علماء بھی اپنی اپنی دکان علیحدہ چلانے کے لیے عوام کا استحصال کرتے تھے۔توسیع سلطنت کے نتیجے میں جو قومیں مسلم حکمرانوں کے زیرِ تسلط آتی گئیں وہاں کے لوگ اپنے مذاہب سے کنارہ کش ہوکر اسلام کے دامن میں پناہ لیتے گئے۔وہ اپنے ساتھ کئی ایک روایات اور رسومات لاتے رہے۔حتّٰی کہ افکار ونظریات کی دنیا میں بھی انقلاب برپا ہوتا چلا گیا رہبانیت اور صوفی ازم اور پیری مریدی وغیرہ کو مسلمانوں نے اپنی تہذیب میں داخل کرلیا۔ان تمام بداعتدالیوں اور خرابیوں کے نتیجے میں اسلام کی صاف اور واضح تعلیمات کو گھن لگتا چلا گیا قرآن مجید میں تدبّر کرنے اور استفادہ کرنے سے غفلت برتی گئی کیونکہ اگر اللہ کے کلام سے ہدایات حاصل کرنے کی جستجو کی جاتی تو دین میں نئی نئی باتوں کو شامل کرنے کے مواقع بند ہوجاتے۔اس لیے کچھ چالاک مولویوں نے اس کو پس پشت کردیا اور کمزور احادیث کے ذریعہ دین کی تصویر بگاڑتے رہے۔دین کا سادہ اور فطری نظام مذکورہ صورت حال کی وجہ سے بگڑتا چلا گیا اور آج تک ان کے اثرات بھگتنے پڑ رہے ہیں۔البتہ دوسرے علوم یونانی اور لاطینی زبانوں سے ترجمہ ہوکر منتقل ہوتے رہے تو اِس جدوجہد میں مسلم حکمرانوں نے بھرپور مدد کی۔پیسہ پانی کی طرح بہایا جاتا رہا علماء اور حکماء کی سرپرستی کی جاتی رہی۔مسلم دانشوروں نے پوری یکسوئی سے تحقیق ودریافت کے عمل کو جاری رکھا اور علمی کارناموں سے دنیا کو روشن کرنے کے جتن کرتے رہے۔

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے کہ جن لوگوں کے درمیان انسان، خدا اور دنیا کے درمیان صحیح تعلق کا کوئی واضح تصور نہیں ہوتا وہ کسی بھی علم کی تحقیق میں یکسوئی اور توازن

سے محروم رہتے ہیں ان گمراہ ماہرین سے صرف فنی گتھیاں سلجھانے کا کام تو لیا جا سکتا ہے لیکن کچھ تعمیری تحقیقات کی توقع نہیں کی جاسکتی ۔یونانیوں کے نجوم اور ریاضی مسلم دانشوروں کے نزدیک اجنبی علوم تھے۔اور خود یونانیوں نے بھی ان کو دوسری قوموں سے حاصل کیا تھا۔ یہ علوم خود یونانی سماج میں بھی کوئی اثر ورسوخ پیدا نہ کر سکے۔ یونانیوں نے مذاہب کی بھی تخلیق کی یونانی نظریے قائم کرنے کے لیے تجزیہ اور بحث کو کام میں لاتے تھے لیکن ٹھوس اور سنجیدہ انداز اختیار کرنے سے معذور رہے۔علم کی تفصیل مناہج اور کسی مسئلے پر مسلسل دقیق مطالعہ اور تجربی بحث وغیرہ جیسی باتیں یونانی مزاج سے دور تھیں۔ یونانیوں نے مسلم سائنس دانوں کے علم میں اِضافہ نہیں کیا اور نہ ان موضوعات پر کوئی رہنمائی کی البتہ تحقیق وتجسّس کی دنیا سے تعارف کروایا اس راہ پر آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ ورنہ یونانی علوم عملاً کوئی مثبت رول ادا کرنے کے قابل نہ تھے۔

آج ہم جس چیز کو سائنس کہتے ہیں ،وہ بحث کی نئی روح اور تلاش وجستجو کے جدید طریقوں کا نتیجہ ہے۔اِبتداء میں کلیسا نے اندلس اور مشرق کی اسلامی ثقافت سے پھوٹنے والی اِس نئی رَو کے بالمقابل نہایت سخت موقف اختیار کیا اور یورپ کے سائنس داں اِس چشمے سے فیضیاب ہوئے ان کی تحقیقات کا کلیسا نے نہایت سختی سے مقابلہ کیا۔جس کے نتیجے میں کلیسا اور کلیسا کے خدا سے بیزاری پیدا ہوگئی۔جس خدا کے نام پر خوب خوب جھوٹ بولا جاتا اور بہتان تراشی کی جاتی تھی وہ ساری باتیں سائنس کی نئی تشریحات کی روشنی میں جھوٹ ثابت ہوتی گئیں اور لوگ مذہب کے سائے سے بھی بیزار ہوتے گئے۔ کیونکہ مذہب کا اعتراف اور اس کے سامنے جھکنے کے معنی کلیسا کے ظالمانہ اور جابرانہ اقتدار کو تسلیم کرنے اور اِس کے سامنے جھکنے کے مماثل ہوگیا تھا۔بیسویں صدی کے شروع تک مذہب وسائنس میں سخت ترین تفریق قائم ہوگئی ۔کلیسا کے تحت اوہام۔ دیو مالا اور خرافات کے برعکس علمی تحقیق سے نئے نئے فلکی جغرافیائی اور طبعی حقائق مسلمانوں نے پیش کیے۔ان خرافات کا عیسائی مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔

روجر بیکن (۱۲۱۴-۱۲۹۴) یہ ایک انگریز مفکر وسائنس داں جس نے بارود۔ مشینی

کشتیوں اور ہوائی جہاز کے امکانات کی خبر دی تھی ۱۲۶۷ء میں پوپ کلمنٹ کے کہنے پر Open Majus لکھنی شروع کی جو جملہ علوم وفنون کی مبادیات پر مشتمل ہے اس کے ایک سال بعد کیتھولک کلیسا نے مجرم قرار دے کر جیل بھیج دیا اور وہ وہیں انتقال کر گیا۔اس کے تین سو سال بعد فرانس بیکن ہوا۔ یہ ملکہ الزبتھ کا اٹارنی جنرل اور جیمس اوّل کا لارڈ چانسلر ہوا۔ جدید سائنس میں استقرائی طریقوں کے اصول منضبط کئے انجیل کا مروجہ ترجمہ اسی کا ہے۔ اِس کی بہ نسبت روجر بیکن چونکہ آکسفورڈ ہی میں لیکن عربی زبان اور علوم اندلس کے عرب اساتذہ سے پڑھے تھے۔اس نے اسلامی دریافتوں کو مسلمانوں سے مسیحی یورپ تک پہنچایا ہے۔اور اچھی بات یہ ہے کہ اِس نے کبھی اس کے اقرار سے گریز نہ کیا۔ اپنے معاصرین سے سیکھے ہوئے علوم کو برملا ظاہر کیا تھا۔ تجربی اِسکول کے موجدین کے بارے میں بحث دراصل تہذیب کے اصولوں میں زبردست تحریف ہے۔ حالانکہ عربوں کا تجربی طریقہ بیکن کے زمانے میں خوب اچھی طرح اشاعت پاچکا تھا اور یورپ کے لوگ اِس کے حصول کے لیے ٹوٹ پڑ رہے تھے، عربی تہذیب نے موجودہ دنیا کو جو میراث سپرد کی ہے۔ اگرچہ اس کے ثمرات کافی تاخیر سے ظاہر ہوئے تاہم ہسپانوی عربوں کی ثقافت نے جس عبقریت کو جنم دیا تھا وہ اپنے عنفوان شباب کو اس وقت پہنچی ہے۔ صِرف علم ہی یورپ کو حیات نو بخشنے والا نہیں ہے بلکہ اسلامی تہذیب کے بہت سارے اثرات ہیں۔ جنہوں نے ابتدائی کرنیں یورپ پر ڈال دیں۔ یورپی تمدن کی چمک دمک کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کی اصل یقینی طور پر اسلامی تہذیب سے نہ حاصل کی گئی ہو۔ نئی دنیا کی ممتاز ترین قوت اور موجودہ تمدن کی اصل یعنی طبعی علوم اور علمی بحث کی روح میں بھی یہ اثرات نہایت نمایاں اور واضح نظر آتے ہیں، ہمارا علم عربوں کا صرف اس قدر ہی مقروض نہیں ہے کہ انہوں نے ہمیں جدید ترین نظریات اور حیرت انگیز انکشافات عطا کئے ہیں بلکہ ہمارا علم سارا کا سارا عربوں کا بخشا ہوا ہے کیونکہ قدیم دنیا میں سرے سے علم کا وجود ہی نہیں تھا۔

(مذکورہ تحریر کو جزوی ردوبدل کے ساتھ سیّد قطب شہیدؒ کی کتاب الاسلام ومشکلات الحضارہ کے اُردو ترجمے سے نقل کیا گیا ہے۔)

فوّاد سیزگین کے افکار کا مطالعہ

ڈاکٹر فواد سیزگین دورِ حاضر کے نامور مسلمان محقق ہیں ۔اصلاً ترک ہیں اور جرمن میں قیام ہے ۔ H ellmuT Ritter جرمن مستشرق کے شاگرد ہیں۔ آج کل گوئٹے یونیورسٹی فرینکرٹ کے ادارہ تاریخ علوم عربیہ واسلامیہ کے سربراہ ہیں اوراپنی شہرہ آفاق کتاب Sescich ledes arabi schen shrif ttums یعنی عربی ورثے کی تکمیل میں مصروف ہیں ۔ان کو شاہ فیصل کا عالمی انعام بھی دیا گیا ہے۔

آپ نے علوم وفنون کی تاریخ مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔عموماً زیادہ تر مستشرق سائنسی علوم کوراست یونان سے منتقل ہونے کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ڈھائی ہزار سال قبل ان علوم کی ترقی کا دور تھا اس کے بعد ''تحریک احیائے علوم'' کے زمانے میں یورپ نے ان کتابوں کے ترجمے کر کے استفادہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ بظاہر موہوم خیال ہے اور دانستہ غلط فہمی پیدا کرنے اور مسلم دشمنی کے اظہار کا ذریعہ ہے ۔تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ یونانی علوم کے ترجمے مسلم سائنس دانوں نے کیا تھا اور اُن کتابوں کو یورپ کے لوگوں نے حاصل کیا تھا۔ اِس حقیقت سے چشم پوشی مسلمانوں سے تعصب کی وجہ سے ہے۔ ارتقائے علمی کا نقطہ آغاز ''بیت الحکمۃ''' کے قیام سے ہوا ۔ ڈاکٹر فواد کا کہنا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں ہی علوم کی تحقیق شروع ہو چکی تھی اور علم کے بارے میں مسلمانوں کا رویّہ فراخ دِلانہ تھا۔ اِنہوں نے کبھی اپنے محسن کو چھپایا نہیں پیش رووں کے علوم کو قبول کیا اور اس کا اظہار کرنے میں بخالت نہیں کی یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب مختلف قوموں کی ثقافتوں، زبانوں اور میراث علمی کا نقطہ اتصال ثابت ہوئی اور اِس نے اِس تسلسل میں ایک موثر رابطے کے رکردار کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ مسلمان اپنے ان علمی رہنماؤں کے علمی مقلّد نہ تھے بلکہ جانچ پرکھ اور تنقید صحت کے معیاروں کے بعد نئی شکل دیتے رہے۔ وہ محض نقل کرنے کے قائل نہ تھے۔ اِس چمن میں انکار رویّہ احترام آمیز رہا، جس کو ڈاکٹر سیزگین تنقید کا اخلاقی اسلوب ،کا عنوان دیا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں پر کمزور تنقیدی صلاحیت

کا الزام لگانا درست نہیں ہے۔البیرونی اور ابن ہثیم کے نہایت جامع اقوال موجود ہیں، ان کے اقتباس کی جانچ بھی کی جائے تو پتہ چلتا ہے وہ مسلمانوں کے اعلیٰ تنقیدی معیار کے آئینہ دار ہیں۔تیسری صدی ہجری کے وسط میں تازہ کاری کے مرحلے میں یہ کوشش داخل ہوگئیں۔جس کی مثالیں بنوموسیٰ۔ الماھان۔ ابوبکررازی۔ الکندی اور ابن سنان جیسے لوگوں کی صورت میں دستیاب ہیں۔ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں سائنسی علوم کا نقطہ عروج پر تھا۔لاطینی دنیا پر مسلمانوں کا اثر صرف عربی کتب کے ترجموں سے ہی نہیں ہوا بلکہ صلیبی جنگوں کے ذریعہ بھی علوم کی منتقلی شروع ہوئی۔علوم کی منتقلی کا سلسلہ دسویں صدی عیسوی سے ہو چکا تھا۔ یہ عمل کئی صدیوں تک جاری رہا۔ ہسپانیہ،اٹلی اور بیزنطہ کی راہ سے اِس کی تکمیل ہوئی۔ ڈاکٹر فواد نے اِس نکتے پر بھی توجہ دلائی کہ مسلمانوں میں اجنبی اقوام سے عملی اکتساب کا آغاز ان لوگوں کے وسیلے سے ہوا جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ چنانچہ ان کے پاس استفادے میں تعصب کا عنصر شامل نہ تھا۔اس کے برعکس لاطینیوں نے عربوں کو اپنا حریف اور دشمن سمجھتے تھے۔ یہ لوگ فائدہ تو اٹھاتے تھے لیکن نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہتے تھے۔مسلمانوں کے پاس وضاحت اور صراحت کا چلن رہا جب کہ لاطینیوں کے ہاں سرقہ نے رواج پایا۔مسلمانوں کے علماء کی بہت سی دریافتوں کا سہرا بعد میں آنے والے مغربی سائنس دانوں کے سر باندھ دیا گیا۔جس کی بنیاد محض توارد علمی نہ تھی بلکہ جدید تحقیقات سے ایک باقاعدہ علمی سرقے کی ایک روایت کا سُراغ ملتا ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں البتہ بعض مستشرقین کی کاوشوں سے عربوں کا علمی مقام کسی قدر اُبھر کر سامنے آیا۔ مستقبل میں اِس علمی اعتراف کی گنجائش اور بھی زیادہ نظر آتی ہے جس کے لیے خود مسلمانوں پر لازم آتا ہے کہ تحقیق پر بھرپور توجہ دیں۔

ڈاکٹر سیزگین نے عِلم حدیث میں اسناد کے طریقے کار پر بھی توجہ دی ہے ان کی تحقیق میں سب سے اہم بات یہ سامنے آئی کہ یہ تحقیق کا انداز ایسا ہے کہ اِس سے انگریز محققین نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔مغرب کے علمی حلقوں میں بھی حدیثوں کی جانچ کے طریقوں پر تنقید کی گئی ہے۔ گولڈ زیہر اور دوسرے مغربی محققین کے تصوّرات پر سنجیدگی

سے غور کرنا چاہئے ۔تحریری دستاویزات کے شواہد فراہم کرنا ضروری ہے۔لفظ کتاب بطورِ اصطلاح مکاتبت کے معنوں میں اِستعمال ہوا ہے۔جس سے مراد روایت حدیث کو زبانی سنے سنائے بغیر استاد کی طرف سے محض تحریری صورت میں منتقل کر دینا ہے۔جب کہ سماع میں اگر چہ تحریر بھی موجود ہوتی تھی ۔لیکن اس کو زبانی سنانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اور یہی صورت افضل ہوتی تھی ۔ جہاں انحصار محض تحریر پر رہا ہو وہاں اس امر کا اظہار کرنے کے لئے اسناد میں کتب الی یا من کتاب'' کے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے ۔اِس غلط فہمی کو کہ صِرف زبانی روایات پر دارومدار ہے کے تصوّر کو جھٹلایا ہے اور اِس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے ٹھوس ثبوت پیش کئے ہیں ۔

انہوں نے ۱۹۵۴ء میں ایک کتاب لکھ کر اِس علم پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اِس کتاب کا نام ''عربی اور اسلامی علوم میں اسناد کی اہمیت'' ہے اس کے علاوہ ''کتاب الاغانی کے ماخذ'' میں بھی اِس مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔ان کا ایک خُطبہ (مقالہ) ''قدیم عربی شاعری حقیقت یا افسانہ'' بھی دراصل علمی بنیادوں پر قدیم طرز روایت کی جانچ کو ظاہر کرتا ہے۔اُس اِبتدائی دور کی شاعری میں تدوین شعر'' کی چھان پھٹک پر بحث کی گئی ہے۔ اِسی کتاب کے دوسرے خطبے (مقالے) میں تاریخ علوم میں مسلمانوں اور عربوں کے مقام کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے ۔ طب، کیمیا، ریاضت ،علم الفلک اور آثارِ علویہ Meteorolog پر الگ الگ مقالوں میں اِس کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ایک اور مقالہ ''عربی و اسلامی علوم کا یورپ کی تحریک احیا پر اثر'' اِس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ آخری خطبہ (مقالہ) میں اسلامی ثقافت میں جمود کے اسباب'' کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔اس کے لئے ڈاکٹر فؤاد کو اختلاف ہے کہ ان تجزیوں میں اسباب اور علامات کے مابین امتیاز نہیں کیا گیا ہے۔نویں صدی ہجری کے اوائل میں نمودار ہونے والے اِس جمود کے بعض داخلی اسباب گنائے ہیں۔مثلاً مسلکی اختلافات ۔منگولوں اور بربروں کی پیدا کی ہوئی بے چینی ۔صلیبی جنگوں اور علم کی سرپرستی میں اضمحلال۔ کتابوں کی بربادی ۔اعلیٰ درس گاہوں سے معیاری علماء کی وابستگی کے تسلسل کا برقرار نہ رہ سکنا ہے اس کے علاوہ

مغربی دنیا کی جانب اہم علمی انکشافات کا منتقل ہونا بھی ایک اہم وجہ ہے ایک اور خاص وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ دنیائے اسلام میں داخلی طور پر ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف منتقلی کا رک جانا ہے۔ حالات کی ستم ظریفی سے منتقلی ممکن نہ ہو سکی تھی۔

مستشرقین کی مجبوری

عثمانی ترکوں نے تجدد کی کوشش کی تھی وہ بھی کوئی انقلابی تبدیلی نہ لا سکے تھے۔ یہ سطحی تبدیلی تھی جس کا کوئی دیرپا اثر نہیں ہو سکا تھا۔ بالآخر اِس صدی کے نصف اوّل میں ترکی نے مغربی اقدار کو اپنانے کے لیے جو بھرپور قدم اٹھایا وہ بھی تجزیے کی بنیادی غلطی تھی۔ معاشرے کی علمی سطح کو بلند کرنے کے لیے جدوجہد کو لازم گردانتے ہیں۔ جمود ایک ایسا تاریخی عمل ہے جو ہر تہذیب پر وارِد ہوتا ہے۔ اس کے حقیقی اسباب تلاش کر کے تدارک کرنا چاہیئے۔ اِس میں قوموں کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ ترجمہ کی دشواری:۔ تمثل جدید عربی میں حیاتیات کی اصطلاح ہے اور Assimilation کے معنی ادا کرتی ہے اُردو میں اس کے لیے ''استحالہ'' کی اصطلاح موجود ہے۔ اِس قسم کی دشواریوں سے بھی علمی کوششوں میں کمی واقع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر فؤاد نے اِس مضمون کے ابتداء میں مساجد میں اِماموں کی مخاطبت پر بھی انہوں نے اعتراض کیا اور بتایا کہ صدیوں کا گھِسا پٹا انداز اور مواد میں بھی کوئی ندرت نہیں اور نہ بولنے میں کشش اس طرح مسلم ثقافت میں جمود واقع ہوا ہے۔

ڈاکٹر فؤاد سیزگین کے چند افکار کو اُوپر پیش کر دیا گیا ہے۔ اِنہوں نے جس علمی کاوش کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے اِس کا ایک ہلکا تعارف تو ہو چکا ہے لیکن ڈاکٹر فؤاد کو یہ ضرورت کیوں پیش آئی اور اُن کا اصل کام کیا ہے وغیرہ کا ذکر کیے بغیر مسئلہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ سب سے پہلے مستشرقین کا تعارف ہونا ضروری ہے۔ دراصل عیسائی دنیا کی نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ کے مغربی ملکوں میں بیداری کا ایک سیلاب آیا۔ ان کا علمی طبقہ بہت زیادہ حرکی ہو گیا۔ سائنس و ٹکنالوجی وغیرہ علوم پر پرانی

کتابوں سے فائدہ اٹھا کر تجربات کی دنیا آباد کی گئی تھی وہ کام زور وشور سے جاری تھے۔ دوسری طرف تحقیق وجستجو کرنے والوں کا ایک طبقہ پچھلی قوموں کے کلچر وثقافت اوران کے علمی کارناموں کی تفصیلات جمع کرنے کی طرف راغب ہوا۔ ان علمی احمقوں کی نظر میں اِسلام کا صحیح تعارف ہی تھا اورنہ ان کو مسلمانوں کے موجودہ زوال کی حقیقت سے ہی واقفیت تھی ۔اِن لوگوں نے مسلمانوں کے موجودہ زوال کوایک مستقل حیثیت دے کر یہ تصور کرلیا تھا کہ اب ان کو دوسری قدیم تہذیبوں کے زمرے میں رکھ کر پچھلی جدوجہد کا جائزہ لیں تاکہ عبرت کے لئے قارئین میں پیش کیا جاسکے اسی ذہنی پستی کی وجہ سے یہ قلم کار طبقہ اپنی حکومتوں کی مالی امداد اور اقوام متحدہ کے یونیسکو ادارے کے تعاون سے کتابیں لکھنی شروع کردیں ان کی ساری کوشش یہ ہوتی تھی کہ جس طرح قدیم دفینوں اور خزانوں کی تلاش میں قافلے نکلا کرتے تھے اُسی طرح ان مشرقی علوم اور کلچر وثقافت کی کھوج کرتے ہوئے ان لوگوں نے کتابیں لکھیں ایک ایک مصنف نے کئی کئی جلدیں (Volums) لکھیں ان لکھنے والوں کو مستشرقین کہا جاتا ہے۔ان کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اصل اسلام کی تعلیمات کیا ہیں اور مسلمانوں میں رائج اسلام کی کیا حقیقت ہے ۔یہ دنیا کے سارے مذاہب اور خود عیسائی مذہب کے بارے میں بھی یہی جانتے تھے کہ تمام مذاہب کی عبادات کا اپنا ایک خاص نظام ہوتا ہے۔ اور دُنیوی معاملات سے مذہب کا تعلق نہیں ہوتا اور ہوتا بھی ہے تو برائے نام ۔مسلمان حکومتوں میں بھی کم وبیش اسی مذہب کی نمائندگی ہوتی تھی ۔اِسی سے اِن لوگوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں کوئی فرق نہیں ہے ۔اِسی بنیادی غلطی سے اِن کی کتابوں میں اسلام کی غلط ترجمانی ہوتی رہی ہے۔ حسنِ ظن نہ رکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان مستشرقین نے جان بوجھ کر اِسلام کو ایک جامد مذہب بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ مغرب پسند طبقہ ان کتابوں کے ذریعہ اسلام کی اِنقلابی طاقت سے بے بہرہ رہے اور اِس کوشش میں کامیاب بھی رہے۔ ہمارا اُونچا طبقہ جو اپنے بچّوں کو باہر کی اعلیٰ یونیورسٹیوں میں تعلیم دلواتا ہے اُن نوجوانوں کو ان ہی مستشرقین کی کتابوں سے تعلیم مِلتی رہتی ہے اور ان کی فکر میں یہی اِسلام کا بگڑا تصوّر

رچ بس جاتا ہے۔اس کے بعد یہ نوجوان اپنے مُسلم ملکوں کے فوجی سربراہ اور اِنتظامی قیادت کی ذِمہ داری سنبھالتے ہیں تو اِسی اسلام کی بنیاد پر دوسرے مسلمانوں کو مُلاّ کٹر مسلمان وغیرہ تصور کر کے بُرا سلوک کرتے ہیں کیونکہ اِن کو اصل دین کی ہوا تک نہیں لگتی ایسا فرد مغرب کا غلام بن کر اُسی تہذیب کا دِل دادہ بن جاتا ہے۔مسلم مُلکوں کے جنرل اور کرنل جو ڈکٹیٹر بن کر برسوں مسلمانوں پر ظلم ڈھاتے رہے ان ہی مستشرقین کی کتابوں سے اسلام پڑھے ہوتے تھے۔

ڈاکٹر فؤاد سیزگین جرمن کے ایک مستشرق کی شاگردی کررہے تھے انہوں نے ایک دوسرے مستشرق بروکلمان کی معروف کتاب کے تتمّے کے طور پر مقالہ لکھتے ہوئے ۴۳۰ھ تک کے تاریخی واقعات دیکھ چکے تھے تو خیال تبدیل ہوگیا اور خود اپنے طور پر اِس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا اِرادہ کرلیا۔انہوں نے لکھا ہے کہ لاطینی دانشوروں نے مسلم دشمنی کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہے۔اِس کا جواب لکھنا ضروری تھا۔

مسلم دانشوروں کے کام

ڈاکٹر فواد سیزگین نے تاریخ التراث العربی (علوم کی تاریخ میں تہذیب اسلامی کا مقام) کے لیے یونیسکو کی طرف سے مالی امداد حاصل کی ۱۹۶۵ء تک دو جلدیں لکھ چکے تھے اِس کتاب کا عربی ترجمہ بھی ساتھ ساتھ ہو رہا تھا اس طرح نو جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔ عربی میں وزارت تعلیم سعودی عرب کے زیر اہتمام شائع ہوئے ہیں۔فؤاد نے شہر ریاض میں اسلامی یونیورسٹی کی تحت سات (۷) خطبات دیے جنہیں جامعہ نے ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء میں ''محاضرات فی تاریخ العلوم'' (تاریخ علوم پر خطبات) کے نام سے شائع کیا ہے بعدازاں ۱۴۰۴ھ میں دوسرا اڈیشن چھ خطبات کے اضافے کے ساتھ محاضرات فی تاریخ العلوم والاسلامیہ (عربی واسلامی علوم کی تاریخ پر خطبات) کے عنوان سے شائع کیا گیا۔یہ خطبات ڈاکٹر صاحب کی مدت العمر کی تحقیقات کا نچوڑ ہے۔جو ادارہ تحقیقات اسلامی کے اُردو مجلّہ ''فکرونظر'' میں شائع ہوتے رہے ہیں زیرِ نظر کتاب پورے تیرہ (۱۳)

خطبات کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ احادیث کے اسناد کے طریقِ کار کی تفصیل کے علاوہ عربی اور اسلامی علوم میں اَسناد کی اہمیت اور کتاب الاغانی کے ماخذ میں دیکھی جاسکتی ہیں ''کتاب الاغانی'' چوبیس جلدوں پر مشتمل کتاب ہے اس کو ابو الفرج اصفہانی نے لکھا تھا۔ (۲۸۴-۳۵۴ھ) اِس میں مصنف نے علم کے ماخذ آٹھ بتائے ہیں (۱) سماع (۲) قرأت (۳) اجازت (۴) منادلہ (۵) کتاب (۶) مکاتبت (۷) وصیت (۸) وجادہ ___ اِس کتاب میں ۱۳۰ شیوخ کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ جتنے بھی علوم لکھے جاتے ہیں ان کا ماخذ ''الاغانی'' ہوتا ہے اور اسی کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر فواد سیزگین نے تاریخ طب کی تحقیق کرتے ہوئے کئی اہم رازوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ بقراط نے چار (۴) اخلاط پر قائم پیتھالوجی کے اصول کو برقرار رکھا ہے۔ (۱) سودا، صفرا، بلغم اور خون کی ہم آہنگی واستخراج۔

ابوالحسن الطبری نے چوتھی صدی ہجری میں جراثیم کی وجہ سے بیماری آنے کا نظریہ پیش کیا تھا مثال کے لیے خارش کو ذکر کیا ہے۔ امام رازی نے چھوت (Infection) سے ایرانی بخار آنے کا خیال پیش کیا تھا۔

ابن سینا کا خیال تھا کہ مقامی سرطان (کینسر) جملہ اعضاء پر مسلط ہونے والے عام سرطان کا پتہ دیتا ہے۔

اسلام سے قبل لاطینیوں کے پاس اساطیری طب کا چلن تھا۔ یعنی جادوٹونا کے ذریعہ بیماریوں کو دور کیا جاتا تھا۔

جابر بن حیان کے پاس طب کا جو نظریہ ہے وہ اس کی رو سے جالینوس کے نظریے کو خلافِ عقل قرار دیتا ہے۔ رازی کو طب ایک دوسری ہی حیثیت کا لگتا ہے۔ رازی ارسطو کے مقابل حقیقت کو فوقیت دیتا ہے۔ علی بن العباس المجوسی بقراط اور جالینوس دونوں کو ناموزوں کتابوں کے مصنف قرار دیتا ہے کیونکہ بقراط کی کتابیں ابہام کی حد تک مختصر ہیں اور جالینوس کی کتابوں میں تکرار اور طوالت زیادہ ہے۔ الرازی کی کتاب ''الحاوی'' کو بھی مجوسی پسند نہیں کرتا۔ ابوبکر رازی وفات ۳۰۰ھ یہ پہلا طبیب تھا جس نے آنکھ کی پتلی

میں داخل ہونے والی روشنی کی نسبت سکڑتی اور پھیلتی ہے بتایا ہے۔ چیزوں کی طرف سے شعائیں آنکھوں کی طرف آنے کا پہلا نظریہ انہوں نے پیش کیا تھا۔ ''تاریخ التراث العربی'' میں کُل تیرہ (۱۳) خطبات ہیں ان کے عنوات یہ ہیں۔

(۱) اس کتاب کی تالیف کے مقاصد اور طریقِ کار

(۲) تاریخ علوم میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام

(۳) تاریخ طب میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام

(۴) علم کیمیا کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام

(۵) ریاضیات کی تاریخ میں.........

(۶) فلکیات کی تاریخ میں...........

(۷) عربوں کے علم الفلک کا یورپ پر اثر

(۸) آثار علویہ (Meteorology) کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام

(۹) عصری و اسلامی علوم کا یورپ کی تحریک احیا پر اثر

(۱۰) عربی و اسلامی علوم میں اسناد کی اہمیت

(۱۱) کتاب الاغانی کے ماخذ

(۱۲) قدیم شاعری حقیقت یا افسانہ

(۱۳) اسلامی ثقافت میں جمود کے اسباب۔

ہلمٹ ریٹر (Hallmutt Ritter) مستشرق جو ڈاکٹر فواد سیزگین کے استاد ہیں اُن کے ایک قول پر مقالے کا اختتام کیا جاتا ہے۔

مغرب میں مسلسل ایک ذہنی غلغلہ برپا رہتا ہے جب کہ مشرق پر وہی جانی بوجھی اور پہچانی آسودگی چھائی رہتی ہے جو اِس کا امتیاز ہے اور جس کا اشتیاق گاہے گاہے ''گوئٹے'' نے ظاہر کیا ہے۔''



اُمّتِ مسلمہ کی تہذیبی و سیاسی پیش قدمی
(چند قابل غور پہلو)

عبدالمجید خان*

امت مسلمہ کی منصبی ذمہ داریوں کا تقاضہ ہے کہ وہ ہمیشہ جائزہ لیتی رہے کہ وہ اپنے اہداف کی حصولیابی کے لیے کس منزل پر ہے اور کون سی مثبت اور منفی سوچ، فکر اور قوتیں موجود ہیں اور ان کے ساتھ وہ کس طرح کا برتاؤ کرے۔ امت بیک وقت ماضی سے بھی جڑی رہتی ہے تاکہ وہ اپنے پیش رؤں سے اپنے لیے حوصلہ اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں۔ حال اُس کی جولانگاہ ہے جس میں اُس سے اپنے اہداف کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا ہے۔ مستقبل بینی اس کا شیوہ ہے وہ انتہائی سخت حالات میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتی ہے اور پوری جانفشانی اور مستقل مزاجی سے مستقبل کے خاکوں میں رنگ بھرتی ہے۔

عصری عہد میں مغربی افکار اور اس کے تہذیبی اور تمدنی اداروں نے ساری انسانیت کو بہت متاثر کیا ہے بلکہ عملاً اس کے ادارے سارے عالم کو اپنے رنگ میں رنگنے اور اپنے کنٹرول میں کرنے اور رکھنے کے لیے پروپگنڈا، اقتصادی، سیاسی اور عسکری دہشت گردی اور ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے میں مصروف ہے۔ امت مسلمہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ انسانیت کو ان مظالم سے نجات دلائے۔ عصری عہد کے مصلحین امت نے بجا طور پر مغربی افکار اور اسلام کی دائمی تعلیمات اور تہذیب وتمدن پر ان کے اثرات وارتباط پر خامہ فرسائی کی۔ مغرب اور اسلام کی ماہیت کے خاص ادراک پر ہی مبنی ہے وہ نقطۂ نظر

---

* پروفیسر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ

جوان مصلحین امت کا امتیاز رہا ہے۔۲ اور جس سے امت مسلمہ نے اپنے لائحہ عمل ترتیب دیے ہیں، ضرورت ہے امت اپنی موجودہ حالت کا دوبارہ جائزہ لے، اپنی طاقت اور اپنی کمزوریوں کے احساس کو تازہ کرے اور اپنے حلیفوں، رقیبوں اور معاندین کے افکار، ارادوں اور پالیسیوں کا بھی احساس کرے۔۳

اکیسویں صدی کے آغاز میں جہاں مغرب اپنی پوری طاقت اور قوت کے ساتھ پورے عالم پر اپنے غلبہ کو برقرار رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہے، وہیں اس کے زوال کا سفر کافی تیزی سے جاری ہے۔ امت مسلمہ کے لیے یہ صورت حال کافی اہم ہے۔ مغرب نے اپنے خدا بیزار نظریہ کے ساتھ پچھلی چند صدیوں میں پورے دنیا میں جو تحفے اور کڑوے کسیلے پھل دیے اس کا خمیازہ پوری دنیا اٹھا رہی ہے۔ اسی وجہ سے مغربی تہذیب و تمدن کا ماڈل ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا ہے۔ اس بحران کا شکار سارا عالم انسانیت ہے۔۴ مغربی سائنس کی افادیت پر سوالات پہلے سے قائم تھے البتہ ماحولیاتی بحران (Environmental Crisis) نیوکلیائی ٹکنالوجی کے بحران (Nuclear Technological Crisis) جس کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ محدود پیمانے پر صرف ان بحرانوں کو حل کرنے کے بارے میں نہ سوچیں، جب کہ وہ حل بھی کہیں موجود نہیں ہیں، بلکہ مغربی سائنسی فکر اور پوری مغربی مادی نقطۂ نگاہ کا احتساب کریں۔ عالمی انسانی بحران صرف دو عالمی جنگوں تک محدود نہیں رہی، بلکہ انسداد دہشت گردی کے نام پر اسلام، مسلمان، ان کے ملک، ان کے مادی اور انسانی وسائل اور ان کے افکار، نظریات اور ادارے مغرب کے تازہ جنگ کے شکار ہیں۔ مغرب نے دو عالمی جنگوں کے بعد اسلامی دنیا کو جو حصے بخرے کر دیے تھے اور انہیں نام نہاد آزاد ملک قرار دیا تھا، ان پر دوبارہ قبضہ کر کے، ان کے وسائل کو لوٹنا اور ان کے حال اور مستقبل کو اپنے مقاصد کی آبیاری کے لیے ہموار کرنے کا کام وہ پوری درندگی اور ڈھٹائی کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔ عراق، لیبیا، افغانستان اور پاکستان اس کی کھلی مثالیں ہیں۔۵

عالمی اقتصادی کساد بازاری اور مغرب کے اقتصادی بحران نے پورے عالم

انسانیت کومغربی اقتصادی افکاراور اقتصادی ترقی کے لامتناہی تصورات اور خوابوں کو چکنا چور کردیا ہے۔انسان مغربی ترقی کے اباطیل پر سوالات پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔[٦] معاشی اور معاشرتی بحرانوں نے ایک ایسی فضا قائم کی ہے جو ایک متبادل نظریہ،فکر اور عملی ماڈل کو پیش کرنے کے لیے موزوں ہے۔ایسے میں امت مسلمہ کے ہراول دستہ تحریکات اسلامی کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ امت مسلمہ کے مجوزہ رول کو بہتر سے بہتر انداز سے پورا کرنے میں اپنا حصہ ادا کرے۔

اسلام حق پر قائم وہ دین ہے جو بنی نوع انسان کو وہ ایمان، یقین، وجدان اور دانائی فراہم کرتا ہے جو تہذیب وتمدن کو ایسے آراستہ کرتا ہے کہ انسان کی ساری تگ و دو اور اس کی زیست کی ساری جہتیں حق نوا اور حق پرور بنتی ہیں اس لیے اسلامی ثقافت، تہذیب اور تمدن توحید کا بول بولا بھی کرتی ہیں اور توحیدی مزاج کی عکاسی بھی۔اسلامی سیاست طاقت وقوت کو حق کی بالادستی، عدل و انصاف کے قیام اور حق نوا اور حق پرور تہذیب وتمدن کو قائم کرنے اور قائم رکھنے سے عبارت ہے۔اسلام جہاں اپنی فطرت میں توحید کی معرفت اور اس کے مثبت تقاضوں کو پورا کرنے کا علم وشعور ادا کرتا ہے اور عملی اقدامات کو پورا کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے وہیں وہ شرک، بت پرستی، مادہ پرستی، خدا فراموشی، دہریت، طاغوت، ظلم و جفا، افتراق و انتشار کی قوتوں کو متعارف بھی کراتا ہے اور ان کے خلاف مناسب کاروائی کرنے کا علم وشعور اور حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری مقبول دین ہے جو انسانیت کی صلاح و فلاح کا ضامن ہے۔یہ دین اپنے ماننے والوں کو عقیدہ بھی عطا کرتا ہے اور ان کی فکر کی جولان گاہ کو بھی اُس عقیدہ کا پرتو بناتا ہے۔اسلام فکر سازی کے ساتھ ساتھ انسان سازی بھی کرتا ہے۔آخری رسول ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کے ساتھ اسلام کے اس کارنامے نے پورے عالم کو متاثر کیا ہے کہ نہ صرف توحید پر مبنی افکار ونظریات پیش ہوئے بلکہ صالح اور مدبر انسانوں کا ایسا سیل رواں جاری ہوا جس نے پورے عالم میں اسلامی تہذیب وتمدن کو اپنی صالحیت اور صلاحیت سے حق نوا اور حق پرور بنالیا۔[٧]

فکری محاذ

امت مسلمہ کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ فی زمانہ مغربی افکار ونظریات اور اس نظریہ سے تشکیل پائے عالمی نظام کا عمیق و وسیع تحقیق و تجزیہ پیش کرے جس میں امت مسلمہ کے عوام الناس اور خواص کے موافق ایسے فکری مواد کی فراہمی شامل ہے جو ان کے قلب واذہان کو مغربی افکار ونظریات اور ان کے مضر اور مہلک اثرات وعواقب کی شدت کا شعور اور احساس عطا کرے۔ مزید وہ عالم انسانیت کے عوام وخواص کو ان کی مخصوص تہذیبی اور ثقافتی اقدار کے سیاق میں مغربی افکار ونظریات اور پالیسیوں کے انسان اور انسانیت کُش اثرات کا احساس کروادے۔ اگرچہ یہ فریضہ امت مسلمہ کے مصلحین بڑی شدومد سے بیسویں صدی کی ابتداء سے خاص طور پر انجام دیتے رہے ہیں۔ لیکن وہ دور ابھی مغربی تہذیب وتمدن کو مکمل طور پر عالمی انسانی اقدار اور عالم انسانیت پر اپنے مضر اثرات کو ثبت کرانے میں اتنا مکمل نہیں تھا جتنا کہ موجودہ زمانہ نے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اس طرح سابق متکلمین وداعیان اسلام کے ایک طبقہ پر اسلام کی ...... مغرب کے تنقیدی جائزے میں معذرت خواہانہ لب ولہجہ اختیار کرنے کا الزام لگا۔ اور کہیں نادانستہ مغربی افکار ونظریات کو اسلامی بنانے کی سعئ لاحاصل کی گئی۔ ترقی جمہوریت، انسانی حقوق جیسے تصورات کی مغربی تعبیرات کو جیسے عالم انسانیت کے مسلمہ کی حیثیت سے اختیار کیا گیا اور یہ بھی فرض کرلیا گیا کہ مغربی دنیا ان نام نہاد مسلمات سے مکمل طور پر وابستہ ہے۔ گرچہ اس دور میں بھی ایسے اہل ایمان و دانش وفراست موجود رہے جنھوں نے مغربی افکار ونظریات اور اقدار واداروں کی حقیقی ماہیت اور مضرت رسانی پر اعلیٰ درجہ کی تحقیق وتفتیش کو اختیار کرکے امت اور عالم انسانیت کے تئیں اپنی ذمہ داری کو کماحقہٗ بحسن و خوبی انجام دیا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ مغربی افکار ونظریات اور اس کی روا رکھی پالیسیوں اور عملی انطباقات کے ناقدانہ تجزیہ کا جدید ایڈیشن تیار کیا جائے جو عقل وقلب کے انسانی

داعیات کو اپیل کرے اور فکر انسانی کے عمیق اور وسیع دائرے کو متاثر کر سکے۔ یہاں اس امر کی وضاحت لازمی ہے کہ اس ناقدانہ جائزے میں ان تجربات کو بھی شامل ہونا چاہیے جو مغربی افکار ونظریات کو برتنے کے نتیجہ میں انسانیت کو حاصل ہوئے ہیں۔ مزید حق اور عدل نوازی کے اسلامی اقدار کی روشنی میں ان عناصر کی نشان دہی بھی لازمی ہے جو صالح اور انسانیت نواز ہوں اور جو اسلامی فکر اور اس کی تہذیب وتمدن کے حق نوا اور حق پرور مزاج سے ہم آہنگ ہوں۔ اس لیے یہ معاملہ مغربی افکار ونظریات کے مکمل استرداد کے مقابلہ میں زیادہ مشکل البتہ عدل وتوازن کے اسلامی اقدار کے عین مطابق ہے۔ اس لیے یہ کام زیادہ عمیق و وسیع علمی صلاحیتوں کے حامل افراد ہی انجام دے سکتے ہیں۔

انسان سازی

امت مسلمہ کو اپنے تہذیبی اور سیاسی سفر میں مضبوط علمی اور فکری سرمایہ کے ساتھ ساتھ انسان سازی کے گراں مایہ سرمایہ کی اشد ضرورت ہے جو صرف فکر ساز ہی نہ ہوں بلکہ وہ اسلامی تعلیمات واقدار اور اس کی مخصوص اخلاقی اور روحانی تعلیمات کا حرکی مجسمہ ہوں اور قیادت وامارت کی صفات وصلاحیت سے لیس ہوں۔ جو بالفعل امت کو اس کے مفوضہ وظیفۂ حیات کو بحسن وخوبی انجام دینے میں قیادت کرے۔ امت کے اندر کامل ایمان ویقین کی دولت سے سرشار، اعلیٰ علمی وعملی صلاحیتوں اور قوتوں سے لیس اصحاب تقویٰ وطہارت اور دانائی وفراست کے حامل افراد ہی عالم انسانیت کے لیے اسلام کی عملی تفسیر کے لیے معتبر حوالہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ تحریکات اسلامی کے لیے یہ کام سب سے زیادہ توجہ کا طالب ہے کہ وہ اس جہت میں امت کی قیادت فراہم کرتی ہیں جو امت کے اندر ایمان ویقین کے سوتوں کو نئی توانائی عطا کرے اور انھیں علم وعمل کے میدانوں میں نئی بلندیوں کو چھونے کا حوصلہ دے۔

اعلیٰ قیادت اور عملی نمونے

امت مسلمہ کو موجودہ زمانے میں اپنے معاند قوتوں نے انتشار وافتراق اور

سخت مصیبتوں کا شکار بنا دیا ہے، اس کو مثبت فکری اور عملی پروگراموں کے ساتھ جادۂ حق و اعتدال پر قائم رکھتے ہوئے انسانیت کے لیے خیر امت کا ثبوت بھی دینا ہے اور اپنی مصیبتوں سے نجات بھی۔ یہ کام تقاضہ کرتا ہے کہ امت کو اعلیٰ درجہ کی قیادت نصیب ہو۔ یہ کام صرف امت کے وہ افراد ہی انجام دے سکتے ہیں، جو نبی ﷺ کی صحیح نیابت کے اہل اور حق دار ہوں۔ امت کی جملہ روحانی، اخلاقی اور علمی وراثت کے امین ہوں۔ تقویٰ اور خلوص میں فائق تر ہوں۔ امت کی تہذیبی اور ثقافتی میراث کے قدر شناس بھی ہوں اور اس کے مستقبل میں پوری آب و تاب سے ترقی دینے کا ویژن (Vision) اور اس کو عملانے کی حکمتِ عملی بھی حاصل ہوں۔ حکمت و دانائی اور صحیح ترجیحات کا تعین امت کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے اعلیٰ منزلوں تک پہنچائے، اعلیٰ قیادت کی ضروری صفات اور ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

موجودہ چیلنجیز کا موثر جواب

موجودہ زمانہ کے خاص چیلنجز جو امت کو درپیش ہیں اس کا موثر جواب امت کو اپنی دینی فراست اور بالغ نظری سے دینا لازمی ہے۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ چند ایک معاملات کو پیش کیا جاتا ہے:

۱- امت کے اندر ''احساسِ امت'' کے جذبہ کو ہر دوسرے جذبہ پر غالب کرنا۔ مسلکی، گروہی، علاقائی، ملکی اور دوسرے جذبوں کو زیر کر کے امت کو ''امتی احساس'' کے ساتھ مثبت اور منفی اہداف کے حصولیابی کے لیے مشترکہ وژن اور عملی اقدامات کو ممکن بنانا۔

۲- امتی مسائل کو حل کرتے ہوئے اس کے خیر امت اور آفاقی نصب العین سے صرفِ نظر نہ کرنا۔

۳- مخلص، باصلاحیت اور اعلیٰ علمی و عملی قیادت فراہم کرنا۔

۴- عام انسانی مسائل کا استحضار کرتے ہوئے ان کے ممکنہ اسلامی حل پیش

کرنا، تاکہ عامۃ الناس کو خیر اور حق کی طرف ہدایت کی جائے۔

۵- شدت پسندی اور انتہا پسندی سے احتراز کر کے اسلامی طرزِ حیات پر مبنی اعتدال اور صداقت کو پروان چڑھانا۔

۶- اعتدال اور صداقت کے اسلامی طرز حیات کو گمراہ کن مغربی تراشیدہ اعتدال (Moderation) سے ممیّز کرنا۔ نیز حقیقی انتہا پسندی اور شدت پسندی (Extrremition) سے ممیّز کرنا۔

۷- امت مسلمہ اور اس کے ہراول دستوں کو غیر تعمیری اور منفی رویوں کا شکار بنا کر حاشیہ پر دھکیل دینے کی معاند قوتوں کی کوششوں کو ناکام کرنا۔

۸- امت کے مسلمات کو شک وریب کا شکار بنانے کی معاند قوتوں کو شکست دینا۔

۹- امت کے تہذیبی اور ثقافتی ورثہ کو نئے حالات میں مزید آب وتاب کے ساتھ قائم ودائم رکھنا۔

۱۰- طاقت وقوت کی فراہمی کو یقین بنانا جو امت کو اس کے معاندوں کے چنگل سے خلاصی بھی عطا کرے اور امت کو عامۃ الناس کے لیے اسلامی اہدافِ حق وعدل کے قیام کو ممکن بنائے۔

۱۱- دنیا کے دیگر مذاہب کے پیروؤں سے اسلامی بنیادوں پر ربط وتعلق کو قائم کرنا اور انھیں اسلام کے آفاقی اہداف کے موافق بنانا۔

۱۲- دنیا کے دیگر مذاہب کو اُن کے انتہا پسند گروہوں کی حمایت نہ کرنے پر آمادہ کرنا جیسے یہودیوں کو صہیونیت سے، عیسائیوں کو انتہا پسندوں سے جیسے (Neo Conservation) سے، ہندوؤں کو ہندتوا (Hindutva) قوتوں سے، بودھوں کو بودھ شدت پسندوں سے۔

۱۳- تحریکات اسلامی کو امت مسلمہ کے جملہ طبقوں اور گروہوں سے مکمل عملی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے جوڑنا۔

مندرجہ بالا نکات چند اشارات پر قناعت کر کے امت کو موجودہ سنگین چیلنجز کا کچھ پتہ دیتی ہیں، جس سے نبرد آزما ہو کر امت کی قیادت اسلامی تہذیب و سیاست کے تعلق سے اپنی خدمات کو بامعنی بنا سکتی ہے۔

حواشی و مراجع

۱۔ مغربی دنیا عالم انسانیت کو کس طرح اپنے پنجوں میں دبوچتی ہے اس کا اندازہ حال ہی میں شائع شدہ دنیا کے مشہور مصنفین Noam Chomsky, Andre Vitohele کی کتاب On Westem Terrosism form Hiroshima tio Drome Warfare, 2013 سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔نوم چومسکی کی ایک اور کتاب مغربی جارحیت کے عصری روپ کو بے نقاب کرتی ہے۔ ملاحظہ کریں: Pirater and Emperaors, old and new International Terrorism in the real world, New York. Clermont Research and Publications, 2002.

۲۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں مصلحین امت کی بڑی تعداد نے اپنی اپنی فکر، زاویۂ نگاہ اور ترجیحات میں اسلام اور مغربی افکار ونظریات سے تعرض کیا ہے اور امت کے سامنے اپنے خیالات وافکار کو پورے شرح وبسط سے پیش کیا۔ نمونے کے طور پر چند حضرات کے نام لیے جاتے ہیں: جمال الدین افغانی (م۱۸۹۷ء)، سرسید احمد خان (م۱۸۹۸ء)، محمد عبدہٗ مصری (م۱۹۰۵ء)، رشید رضا (م۱۹۳۵ء)، علامہ محمد اقبال (م۱۹۳۸ء)، مولانا اشرف علی تھانوی (م۱۹۴۳ء)، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (م۱۹۷۹ء)، آیت اللہ روح اللہ موسوی الخمینی (م۱۹۸۹ء)، ڈاکٹر علی شریعتی (ش ۱۹۷۷ء)، حسن البناء شہید (ش ۱۹۴۹ء)، سید قطب شہید (ش۱۹۶۶ء)، مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی (م۱۹۹۹ء)، مالک بن نبی (م۱۹۷۳ء)، رینی گوینو

(م ۱۹۵۱ء)، شوؤن (م ۱۹۸۸ء)، سید حسین نصر (پ ۱۹۳۳ء)۔

ذیل میں چند ممتاز مصنفین کی کچھ کتابوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو اسلام اور مغربیت کے پس منظر میں تحریر کی گئی ہیں اور اس موضوع کی تفہیم کے لیے کافی مددگار ہیں:

سید ابوالاعلیٰ مودودی: تنقیحات، مسئلہ قومیت، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ۱۹۵۵ء

سید ابوالحسن علی ندوی، عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب، طلبائے دارالعلوم دیوبند سے خطاب، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، بار چہارم، ۱۹۸۱ء

سید ابوالحسن علی ندوی، لسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، بار چہارم، ۱۹۸۵ء

سید ابوالحسن علی ندوی، نیا طوفان اور اس کا مقابلہ، تنویر پریس، بدون تاریخ

سید ابوالحسن علی ندوی، مذہب وتمدن، جید برقی پریس، دہلی، ۱۹۴۳ء

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۷۴ء

علامہ محمد اقبال: The Reconstruction of Religions Thought in Islam, Kitab Bhawan 2000

سید قطب شہید: دراسات اسلامیہ، ترجمہ: اسلام اور مغرب کی کشمکش، از رضی الاسلام ندوی، دہلی، ۲۰۰۳ء

مالک بن نبی: The Question of Culture (1954) The Problem of Ideas in the Muslim World 1994, Darul Ehsan, The Crisis of the Modern Wordl (1946), London

امام خمینی: کشف الاسرار (۱۹۴۲ء)

مولانا اشرف علی تھانوی، الانتباہات المفیدہ للاشتبہات الجدیدہ

رینی گوینو East and West (1924) The Reign of Quantity and Signs of the Times (1953).

سید حسین نصر: Western Science and Asian Culture 1986, Iqbal Academy, Laore.

ڈاکٹر علی شریعتی Marscism and Other Western Fallacies: An Islamic Critique.

۳۔ ۹/۱۱ کے بعد سے عالمی طاغوت نے عالم اسلام کے خلاف جو نئی صف بندی کی ہے اور جو چوطرفہ حملہ اسلام، اہلِ اسلام کے خلاف جاری رکھا ہے، تقاضہ کرتا ہے، کہ اس کا امت بھرپور جائزہ لے۔ نئی جتھ بندی میں شامل ہے: صہیونیت جس کی پشت پناہی امریکہ اور مقبوضہ فلسطینی ریاست ''اسرائیل (Neo-Conservation) اور عیسائی صہیونی (Christion Zionists)، امریکی ریاست ان کی پشت پناہ ہے۔ اور ہندوتوا (Hindutva) طاقتیں جو بھارت میں حکومتی سرپرستی میں کھلم کھلا اپنے اسلام اور مسلم دشمن ایجنڈا کو عملانے میں مشغول ہے۔

۴۔ یہ بحران ہمہ پہلو اور ہمہ جہت ہے۔ یہ انسانی زندگی کے تمام ابعاد پر محیط ہے۔ پروفیسر کنور محمد یوسف امین صاحب کا مضمون بعنوان ''مادہ پرست مغرب کا جاری سقول اور امت مسلمہ پر نیا عالمی خاکہ پیش کرنے کی ذمہ داری'' اس عالمی بحران اور اس کے حل کے ضمن میں ایک اہم تحریر ہے۔ مندرجہ ذیل کتب اس بحران کے چند پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ملاحظہ کریں:

Michel Chossudiovsky and Andrew Gavin Marshall (Eds) The Global Economic Crisis: The Great Depression of the xxi Contury 2010. Global Research.

Michel Chessudovsky Globalization of Poverly and the New World Order, centre for Research on Globalisation, 2003

M. Chossudovsky and AG Marshall

The Global Economic Crisis

۵ نوم چومسکی کی تحریرات اس ضمن میں کافی فائدہ مند ہیں۔ ملاحظہ ہو نوم چومسکی کی نمبرا پر محولہ کتابیں۔

۶ محولہ بالا کتابیں عکاس ہیں اس بے چینی اور اضطراب کا جو روز بروز زیادہ قوت کے ساتھ پورے عالم میں پیش ہو رہا ہے۔

۷ اس موضوع پر چند ایک کتابیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں جو اس مسئلہ کی توضیح کے لیے کافی ہیں۔

سید ابوالحسن علی ندوی، اسلام ایک مکمل دین- مستقل تہذیب، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، بار چہارم، ۱۹۸۶ء

سید ابوالحسن علی ندوی، مذہب یا تہذیب، مکتبہ اسلام، کوئن روڈ، لکھنؤ، اپریل ۱۹۷۸ء

سید ابوالحسن علی ندوی، تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، بار چہارم، ۱۹۶۱ء

سید ابوالحسن علی ندوی، مسلمانان ہند کے صحیح راہ علم، ان کے منصب و مقام، اسلام تعلیمات اور واقعات و حقائق کی روشنی میں، طبع اول ۱۹۸۷ء

سید ابوالحسن علی ندوی، انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، بار چہارم، ۱۹۸۷ء

☆☆☆

Clash of Civilizations کا تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر محمد ارشد*

ہم آج جس دنیا میں رہ رہے ہیں وہ شاید اس دنیا سے بہت زیادہ مختلف ہے جو اب سے پچاس یا سو برس پہلے کی تھی۔ پچھلی چند دہائیوں کے دوران ہونے والی ترقیات نے فاصلوں کو ہی بے معنیٰ نہیں کیا ہے بلکہ سرحدوں کے مستقبل پر بھی سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ سماجی علوم کے طالب علم کے طور پر ہی نہیں بلکہ سماج کے ایک ذمہ دار فرد کے طور پر بھی ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے آس پاس اور پوری دنیا میں وقوع پزیر ہونے والی سماجی تبدیلیوں اور ان کے اسباب کا جائزہ لیتے رہیں تاکہ ہمیں سماج کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کی ادائی میں نہ صرف یہ کہ مدد ملتی رہے بلکہ اس حوالے سے سماج میں ہمارا جو کردار ہوسکتا ہے اس کا تعین بھی ہوتا رہے۔ مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ موجودات عالم کی تخلیق باری تعالیٰ نے انسان کی بھلائی اور بہبود کے لیے کی ہے لیکن یہ انسان ہی ہے جو اپنے اعمال سے نظام عالم کی تخریب کا باعث بنتا ہے۔ یہاں تک کہ بحر و بر کو بھی فساد اور بگاڑ سے بھر دیتا ہے۔

اس ذمہ دارانہ حیثیت کے سبب (جس کے حامل ہم ایک داعی امت کے فرد کے طور پر ہیں) ہمارا یہ فریضۂ منصبی بن جاتا ہے کہ ہم دنیا کو فساد اور بگاڑ کی آماجگاہ نہ بننے دیں بلکہ اسے امن وسکون کا گہوارہ بنانے میں جو تعاون بھی ہم سے ہوسکتا ہو اس سے گریز نہ کریں۔ اس ناطے سے جب ہم غور کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ماضی قریب کی دنیا کو جہاں اور بہت سی چیزوں نے متاثر کیا ہے وہاں اس دوران بعض تحریریں یا کتابیں بھی

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ایسی منظر عام پر آئی ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ عالمی سطح پر بحث و مباحثے کے نئے دروازے کھولے ہیں بلکہ اپنے اندر موجود فکر اور نظریے کے سبب عالمی سیاست اور نظام عالم کو بھی متاثر کیا ہے۔ سموئل فلپس ہنٹنگٹن کی مشہور زمانہ کتاب[1] The Clash of Civilization and the Remaking of World Order ایک ایسی ہی کتاب ہے جس نے مستقبل کی دنیا کے منظرنامے کے حوالے سے عالمی سیاسی و سماجی دانش وری کے حلقوں میں تو ہل چل مچائی ہی، سیاست کے گلیاروں میں بھی ایک طوفان برپا کرنے میں کامیاب رہی۔ اس مقالے میں کتاب کے ان مباحث کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی جو متنازع بھی رہے اور عالمی دانش وری اور سیاست کو متاثر بھی کرتے رہے ہیں۔

ہنٹنگٹن (18 اپریل 1927 تا 24 دسمبر 2008) کا پورا نام سموئل فلپس ہنٹنگٹن ہے۔ ان کی والدہ ڈورتھی سن بورن فلپس کہانی کار اور والد رچرڈ تھامس ہنٹنگٹن ہوٹلوں کے تجارتی جرائد کے پبلیشر تھے۔ 18 سال کی عمر میں ایل (Yale) یونی ورسٹی سے گریجویشن کیا، کچھ دنوں امریکی فوج میں خدمات انجام دیں، بعد ازاں شکاگو یونی ورسٹی سے ماسٹر ڈگری حاصل کی اور آخر میں ہارورڈ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اور وہیں 23 برس کی عمر سے پڑھانا شروع کر دیا۔ ایک مختصر عرصے کو چھوڑ کر جب وہ 1952 سے لے کر 1962 تک کولمبیا یونی ورسٹی سے وابستہ رہے، انھوں نے اپنی پوری عمر ہارورڈ میں تدریس و تحقیق میں گزاری۔ ہارورڈ میں وہ John M. Olin Institute for Strategic Studies کے ڈائرکٹر اور Harvard Academy for International and Area Studies کے چیئرمین رہے۔ ایک عرصے تک وہ امریکی وزارت خارجہ کے مشیر رہے اور صدر جمی کارٹر کی انتظامیہ میں انھوں نے قومی سلامتی کونسل (National Security Council) کے لیے سلامتی سے متعلق منصوبہ بندی کے کوآرڈی نیٹر (رابطہ کار) کے فرائض انجام دیے۔ ان کی شہرت کا آغاز 1957 میں The Soldier and the State: The Theory and Politics of

Civil Military Relations کی اشاعت سے ہوئی، بعد ازاں انھوں نے متعدد موضوعات پر کتابیں اور مضامین لکھے، مثلاً Political Order in Changing Societies (1968) اور The Third Ware: Democratization in the Late Twenteeth Century (1991)۔ لیکن ان کی اصل شہرت کا آغاز 1993 میں امریکی جریدے فارن افیئرس میں ان کے مضمون The Clash of Civilizations کی اشاعت[۲] سے ہوا جس میں انھوں نے سرد جنگ کے بعد کی دنیا کے منظرنامے پر اس طور پر نظر ڈالی تھی کہ ان کے بقول آیندہ کے تنازعات کی بنیاد نظریاتی اختلافات نہ ہو کر ثقافتی اور تہذیبی اختلافات ہوں گے۔ حالاں کہ اس سے قبل انھیں کے ہم وطن فرانسس فوکویاما نے اپنی متنازع کتاب[۳] The End of History میں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد نظریاتی تنازعات کے خاتمے کا اعلان کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اب دنیا اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جہاں امریکی نظام عالم کو نہ صرف یہ کہ پوری دنیا پر بالادستی حاصل ہو چکی ہے بلکہ اب اسے کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہنٹنگٹن نے اپنے مضمون میں نئے عالمی منظرنامے پر مختلف ثقافتی و تہذیبی واقعات کو لے کر صرف سوالات قائم کیے تھے بعد میں ۱۹۹۶ء میں انھوں نے اپنے مضمون کو وسعت دے کر کتابی شکل میں شائع کیا اور اس میں ان سوالات کے جوابات واقعات و حالات کی روشنی میں دینے کی کوشش کی جو مضمون میں تشنہ چھوڑ دیے گئے تھے۔

ہنٹنگٹن کی کتاب The Clash of Civilization and the Remaking of World Order کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس میں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد کی دنیا میں ایک نئی سیاسی صف بندی کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ یہ نئی سیاسی صف بندی نظریاتی، جغرافیائی، علاقائی یا اقتصادی بنیادوں پر نہ ہو کر ثقافتی اور تہذیبی بنیادوں پر ہوگی۔ اس طرح ہنٹنگٹن نے تہذیبی تصادم کا وہ نظریہ پیش کیا جس میں آیندہ کے سیاسی تنازعات میں تہذیبی و ثقافتی وابستگیاں زیادہ اہم اور نمایاں رول ادا کریں گی۔ ہنٹنگٹن کے مطابق مستقبل میں تہذیبی شناخت کی بنیاد نسل، زبان، رنگ یا

علاقہ (جغرافیہ) نہ ہو کر مذہب ہوگا، انھوں نے تہذیب کی ایک ایسی تعریف کی جس میں مذہب کو کلیدی عامل کی حیثیت حاصل ہے۔[۴] ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب میں تہذیبوں کی ایک نئی تقسیم پیش کی جس میں مذہب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور دنیا کو آٹھ تہذیبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔[۵]

۱۹۹۳ء میں ہنٹنگٹن نے اپنے مضمون میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ ''کیا تہذیبوں کے درمیان تنازعے مستقبل کی عالمی سیاست پر حاوی رہیں گے؟''[۶] بعد میں جب انھوں نے اپنے مضمون کی توسیع کتابی صورت میں کی تو دنیا میں وقوع پزیر ہونے والے مختلف واقعات کو پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مختلف تہذیبوں کے درمیان جو تنازعے ہیں وہ کسی بھی وقت امن عالم کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔[۷] چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب کے آخری باب میں امریکہ — جو دنیا میں واحد سپر پاور ہے — کے ارباب حل وعقد کو یہ مشورہ دیا ہے کہ ''ایک کثیر ثقافتی دنیا ناگزیر ہے کیونکہ کسی عالمی سلطنت کا قیام ناممکن ہے۔ امریکہ اور مغرب کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ مغربی شناخت کی تجدید کی جائے۔ دنیا کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ عالمی ثقافتی تکثیریت (Global Multiculturality) کو تسلیم کیا جائے۔''[۸] امریکہ کے حوالے سے اپنا مشاہدہ انھوں نے یوں بیان کیا ہے: ''کچھ امریکیوں نے ملک میں (ثقافتی تکثیریت) (Multi culturalism) کو فروغ دیا ہے، کچھ نے بیرونی دنیا میں یونی ورسل ازم (آفاقیت) کو فروغ دیا ہے اور کچھ نے دونوں کام کیے ہیں۔ ملک میں ملٹی کلچرل ازم سے امریکہ (ولایات متحدہ) اور مغرب دونوں کو خطرہ ہے اور بیرونی دنیا میں یونی ورسل ازم کے فروغ سے مغرب اور دنیا کو خطرہ ہے دونوں مغربی کلچر کی انفرادیت کے انکاری ہیں۔ عالمی ملٹی کلچرل ازم کے حامی پوری دنیا کو امریکہ بنا دینا چاہتے ہیں اور ملٹی کلچرل ازم کے مقامی حامی امریکہ کو دنیا جیسا بنا دینا چاہتے ہیں۔ ایک ملٹی کلچرل امریکہ ناممکن ہے کیونکہ غیر مغربی امریکہ امریکہ ہی نہیں رہے گا۔''[۹] ہنٹنگٹن کا مشورہ یہ بھی ہے کہ ''ایک تہذیب کی (مزعومہ) مفروضہ آفاقی خصوصیات کو فروغ دینے کے بجائے ثقافتی بقائے باہم کا تقاضا

ہے کہ بیشتر تہذیبوں میں جو چیزیں مشترک ہیں انھیں تلاش کیا جائے۔ایک کثیر تہذیبی دنیا میں تعمیری عمل یہی ہے کہ یونی ورسل ازم (آفاقیت) کا اعلان (Renounce) کیا جائے،اختلاف (Diversity) کو قبول کیا جائے اور یکسانیتوں کو تلاش کیا جائے۔"[10]

سموئیل ہننگٹن نے تہذیبی تصادم کا جو مفروضہ ۱۹۹۳ء میں پیش کیا تھا اس کی جزوی تائید بعد کے سالوں میں عالمی سیاست میں رونما ہونے والے بعض واقعات سے بھی ہوئی چنانچہ انھوں نے بوسنیا، چیچنیا، ماورائے قفقاز، وسطی ایشیا، کشمیر، مشرق وسطیٰ، تبت، سری لنکا اور سوڈان وغیرہ ملکوں میں اس دوران جو کچھ پیش آیا ان وقوعوں سے شواہد پیش کیے۔ ہننگٹن نے نہ صرف یہ کہ یہاں وقوع پزیر ہونے والے واقعات کو تہذیبی کشمکش (تصادم) کا حصہ قرار دیا بلکہ انھیں مستقبل کی Fault Lines سے بھی تعبیر کیا۔ ہننگٹن کے مطابق مسلم دنیا کی شرح آبادی میں تیز رفتار نمو اور مشرقی ایشیا کی سبک رفتار اقتصادی ترقی دنیا میں مغرب کی اجارہ داری کے لیے بڑا چیلنج ہیں۔اور یہ دونوں چیزیں عالمی سیاسی منظرنامے کو بدل رہی ہیں۔انھوں نے چین، جاپان اور عالم اسلام کے ممکنہ اتحاد کا مفروضہ قائم کر کے ہندوستان کو امریکہ کے اتحادی کے طور پر پیش کیا ہے۔[11]

احیاء اسلام اور اس سے متعلق تحریکات اور افراد کا ہننگٹن نے اپنی کتاب میں خاص طور پر مطالعہ کیا ہے اور اسلامی بنیاد پرستی (یہ اصطلاح مسلمانوں کی احیائی تحریکات کے لیے استعمال کرنا درست نہیں ہے) کو مغرب اور اس کی منفرد تہذیب کے لیے عظیم خطرے کے طور پر پیش کیا ہے ان کے خیال میں اسلامی بنیاد پرستی کی جڑیں موجودہ دور کی ان اسلامی تحریکات میں ہیں جو اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کے طور پر پیش کرتی ہیں اور سیاسی اسلام کی وکالت کرتی ہیں۔انھوں نے آیندہ کے عالمی منظرنامے پر گفتگو کرتے ہوئے یہ پیش گوئی کی ہے کہ عالم اسلام کی سرحدیں خون آلود ہیں اور مستقبل میں اس کی سرحدوں پر خونیں واقعات رونما ہوں گے۔ ہننگٹن کے مطابق اسلامی بیداری کے اثرات یوں تو حکمراں طبقے سے لے کر عوام تک سبھی نے قبول کیے ہیں لیکن اس کا سب سے زیادہ اثر دانش وروں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں پر ہے۔[12]

سموئیل ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب The Clash of Civilizations کا مرکزی موضوع ثقافت اور ثقافتی شناختوں کو قرار دیا ہے جنھیں وسیع تناظر میں تہذیبی شناختوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور سرد جنگ کے بعد پیدا ہونے والے تنازعے میں اتصال و انتشار (اتحاد و اختلاف) کے نئے طور طریقے انھیں کے ذریعہ تشکیل پارہے ہیں۔[۱۳] پوری کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں A World of Civilization کے عنوان کے تحت یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ عالمی سیاست کثیر محوری بھی ہے اور کثیر ثقافتی بھی۔ اس باب میں ہنٹنگٹن نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ جدیدیت کا تصور مغربیت سے الگ اور مختلف ہے۔ اس کے تحت نہ تو کوئی آفاقی یا عالمی تہذیب تشکیل پانے جارہی ہے اور نہ ہی جدیدیت کا مطلب غیر مغربی معاشروں کو مغربی بنانا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان The Shifting Balance of Civilizations ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ تہذیبوں کے درمیان طاقت کے توازن میں تبدیلی آرہی ہے۔ دنیا پر مغرب کے اثرات میں کمی آرہی ہے اور غیر مغربی خاص طور پر ایشیائی تہذیبیں اپنی اقتصادی، فوجی اور سیاسی قوت میں روز بروز اضافہ کررہی ہیں۔ اسلام کو عالمی سطح پر تیزی سے فروغ حاصل ہورہا ہے اور یہ مسلم ممالک کے تعلقات کو پڑوسیوں اور غیر مغربی تہذیبوں کے ساتھ غیر مستحکم کررہا ہے۔ اسی طرح اسلام مسلم ملکوں کو خود اپنی ثقافتی اقدار سے وابستہ ہونے پر آمادہ کررہا ہے۔

کتاب کا تیسرا باب The Emerging Order of Civilizations ہے۔ اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تہذیبی بنیادوں پر ایک نیا ورلڈ آرڈر (نظام عالم) وجود میں آرہا ہے۔ دنیا کے وہ معاشرے جن میں ثقافتی ہم آہنگی اور یکسانیت پائی جاتی ہے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے لیے آگے آرہے ہیں۔ ایسی تمام کوششیں جو ایک تہذیب کو دوسرے تہذیبی معاشرے پر تھوپنے کے لیے ہورہی ہیں، انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دنیا کے تمام ملک تنظیم کے ایک نئے دور سے گزر رہے ہیں اور

خود کو ان ملکوں کے ارد گرد منظم کر رہے ہیں جنھیں اپنی تہذیب میں رہنمائی کا مقام حاصل ہے یا جو مرکزی حیثیت کے حامل ہیں۔

چوتھے باب کا عنوان Clash of Civilizations ہے اور یہی باب اس کتاب کی روح ہے۔ اس باب میں ہننگٹن نے یہ بتایا ہے کہ مغرب کا یہ تاثر دینا کہ دنیا اب ایک آفاقی نظام کے تحت آگئی ہے (جیسا کہ فوکویاما نے The End of History میں ثابت کیا ہے) اسے دوسری (غیر مغربی) تہذیبوں کے ساتھ ایک (ممکنہ) تصادم کی طرف لیے جا رہا ہے۔ خاص طور پر اسلامی اور چینی تہذیبوں کو مغرب کے اس تاثر اور رویے سے بہت زیادہ پریشانی ہے۔ مقامی سطح پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جو لڑائیاں جاری ہیں ان کی وجہ سے ایک دوسرے سے تہذیبی و ثقافتی رشتے رکھنے والے ممالک قریب آ رہے ہیں۔ یکساں تہذیبی ورثہ رکھنے والے یہ ملک اور ان کی یہ باہمی قربت کسی بھی وقت بڑے خطرے کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ کیونکہ ان میں Core State (کلیدی/ بنیادی ریاست) کی حیثیت رکھنے والے ملکوں کا کردار بڑھتا جا رہا ہے اور جب مقامی طور پر ان کے کردار میں اضافہ ہوگا تو لازمی طور پر وہ عالمی امور میں بھی اپنا رول ادا کرنا چاہیں گے۔

کتاب کا پانچواں باب The Future of Civilizations ہے۔ اس باب میں کتاب کے فاضل مصنف نے مغرب خاص طور پر امریکہ کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ فی الواقع ایک عالمی جنگ (Global War) کے خطرے سے بچنا چاہتے ہیں تو ضروری کہ مغرب کے ارباب سیاست نہ صرف یہ کہ ایک کثیر ثقافتی کردار کی حامل عالمی سیاست کو تسلیم کریں بلکہ ایسے اقدامات بھی کریں جن سے دنیا میں سیاسی تکثیریت باقی اور فروغ پزیر رہے۔ ہننگٹن نے مغرب کے ارباب حل وعقد کو اس باب میں یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ وہ اپنی تہذیب و ثقافت کو آفاقی ثابت کرنے اور اسے پوری دنیا پر مسلط کرنے کے رجحان اور خواہش سے باز آ جائیں۔ اگر وہ اپنی بقا چاہتے ہیں تو انھیں چاہیے کہ دنیا کی سبھی تہذیبوں کو اپنی علیحدہ شناخت کا حق دیں۔ اپنی تہذیب اور نظام کو دنیا پر مسلط کرنے کے مقصد

سے وہ اگر خود کو متحد کرتے ہیں تو غیر مغربی معاشرے بھی ان کے مقابل ایک اتحاد بنانے کی کوشش کریں گے۔

پروفیسر ہنٹنگٹن موجودہ دور کے شاید پہلے مفکر ہیں جنھوں نے دنیا کو تہذیبی بنیادوں پر تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس تقسیم میں مذہب کو ایک بنیادی عامل قرار دیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ مستقبل کی دنیا میں جو بھی ٹکراؤ اور تصادم کے واقعات ہوں گے وہ تہذیبوں کی بنیاد پر ہوں گے۔[۱۴] ہنٹنگٹن نے یہ پیش گوئی بھی کی ہے کہ مستقبل کا ممکنہ تہذیبی تصادم موجودہ غالب نظام، جو مغربی تہذیب کا حامل ہے، اور ان تہذیبی اکائیوں کے درمیان ہوگا جو Assertive ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف اور طاقت ور ہیں۔ حالانکہ پروفیسر ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کی جو تقسیم کی ہے اس کی رو سے موجودہ دنیا میں سات یا آٹھ تہذیبیں اپنا وجود رکھتی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے (1) مغربی تہذیب (2) اسلامی تہذیب (3) چینی تہذیب (4) جاپانی تہذیب (5) افریقی تہذیب (6) لاطینی امریکی تہذیب (7) آرتھوڈکس عیسائی تہذیب اور (8) ہندو تہذیب۔ لیکن ان کے فارمولے کے تحت جن تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ اور تصادم کے امکانات پیدا ہوتے ہیں، فی الاصل ان کی تعداد تین ہے:

(1) مغربی تہذیب، جو غالب تہذیب ہے۔

(2) اسلامی تہذیب، جس میں تہذیبی اور ثقافتی طور پر مغربی تہذیب کو چیلنج کرنے کی صلاحیت ہے اور جو Assertive بھی ہے۔

(3) چینی تہذیب، جو ثقافتی طور پر مالدار ہے، Assertive بھی ہے اور طاقت ور بھی ہے۔

ہنٹنگٹن نے حالات و واقعات سے نتائج اخذ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مستقبل کا متوقع تہذیبی تصادم بنیادی طور پر مغرب اور اسلام۔ چین اتحاد کے درمیان ہوگا۔ اس تصادم میں عالم اسلام اور چین تہذیبی اور ثقافتی طور پر ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہونے کے باوجود بھی مغرب کے مقابلے میں ایک دوسرے کا

ساتھ دیں گے۔ ان کے خیال میں بقیہ پانچ تہذیبیں جزوی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ یا مغرب اور دو دیگر تہذیبوں چین اور اسلام کے ساتھ ٹکرا تو سکتی ہیں البتہ ان کے درمیان یہ تصادم زیادہ شدید نہیں ہوگا۔ بلکہ گمان غالب یہ ہے کہ مذکورہ متوقع تصادم میں یہ مغرب کی ہم نوا اور اس کے ساتھ ہوں گی۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بیان کی ہے کہ ان پانچ تہذیبوں کا مغرب کے ساتھ براہِ راست تصادم یا تو نہیں ہے یا اگر ہے تو بہت کم ہے، جب کہ اس کے مقابلے یہ اسلام یا چین کے ساتھ زیادہ متصادم ہیں۔ مثال کے طور پر لاطینی امریکی تہذیب مغرب سے زیادہ قربت اور مناسبت رکھتی ہے، آرتھوڈکس عیسائی تہذیب مغرب سے کسی حد تک متصادم ہونے کے باوجود اس کے ساتھ زیادہ قربت رکھتی ہے اور بلقان اور وسطی ایشیا کے علاقوں میں اسلام اور چین کے ساتھ اس کا تصادم نسبتاً زیادہ شدید ہے، خاص طور پر اسلام کے ساتھ۔ ہندو تہذیب کا تصادم چونکہ راست طور پر اسلام (پاکستان ایک مسلم ملک) کے ساتھ ہے لہٰذا اس کا وزن مغرب کے پلڑے میں رہے گا۔ جاپانی تہذیب کا چین کے ساتھ براہِ راست تصادم ہے گو اقتصادی طور پر اور کسی حد تک ثقافتی طور پر بھی جاپان مغرب کے لیے بھی چیلنج ہے۔ افریقی تہذیب کا بھی تصادم بنیادی طور پر اسلام کے ساتھ ہے۔

اس طرح ہنٹنگٹن کے مطابق مستقبل میں اصل تصادم مغرب اور چین اسلام اتحاد کے درمیان ہوگا، ان کے خیال میں چین اور عالم اسلام کے درمیان اس طرح کے اتحاد کا عمل شروع بھی ہو چکا ہے، چین عالم اسلام کے کئی ملکوں کی نہ صرف عسکری اور اقتصادی میدانوں میں مدد کرتا رہا ہے بلکہ سفارتی سطح پر بھی کئی معاملات میں ان کی حمایت کی ہے، خاص طور پر پاکستان کے حوالے سے، اس نے اس کا بہت زیادہ ساتھ دیا ہے۔ [۱۵]

اس مختصر سے مقالے میں زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فلسطین کے مسئلے پر مغربی دنیا نے جو موقف اختیار کیا ہوا ہے، اسی طرح خلیج کی جنگ کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی، اس میں مغربی دنیا کا جو رویہ رہا اور پھر 9/11 (گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء) کے بعد جس طرح کے حالات بنے، ان سب کا ظاہری مطالعہ اور

مشاہدہ جزوی طور پر بعض مقامات پر ہنٹنگٹن کے پیش کردہ مفروضے کی تصدیق کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن موجودہ دنیا کے سیاسی حالات اور واقعات کا گہرائی کے ساتھ اگر جائزہ لیا جائے تو جن خدشات خاص طور پر تہذیبی تصادم کا تذکرہ ہنٹنگٹن نے بڑے ہی پرزور اور بظاہر مدلل انداز میں کیا ہے۔ حقیقتِ واقعہ سے ان کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ مفروضات کے طور پر وہ پرکشش ضرورت نظر آتے ہیں لیکن واقعات کی دنیا میں ان میں سے زیادہ تر کا کہیں دور دور تک بھی وجود نہیں ہے۔

مثال کے طور پر پروفیسر ہنٹنگٹن نے چین اور عالم اسلام کے مابین متوقع سیاسی اتحاد کی نہ صرف پیش گوئی کی ہے بلکہ پاکستان کے ساتھ چین کے تعلقات کو لے کر اور ۱۹۹۲ء میں ویانا عالمی کانفرنس — جو انسانی حقوق کے مسئلے پر اقوام متحدہ کے بینر تلے منعقد ہوئی تھی اور جس میں کیوبا (لاطینی امریکی ملک) میانمار (بدھسٹ ملک)، سنگاپور، ویتنام، شمالی کوریا اور چین (چاروں Confuision ممالک)، ملائشیا، انڈونیشیا، پاکستان، ایران، عراق، شام، سوڈان اور جنوبی وشمالی یمن (نومسلم ممالک) نے مغرب مخالف ایک مضبوط محاذ تشکیل دیا تھا اور کانفرنس میں زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی اور وہ اس طرح کہ جب کانفرنس کا اعلامیہ تیار ہوا تو اس میں تقریر، پریس، مظاہرے اور مذہب کی آزادی کے حق پر کوئی خاص زور نہیں دیا گیا تھا — کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلم دنیا اور چین کے درمیان اتحاد کے عمل کا آغاز ہو چکا ہے لیکن زمینی حقائق کا اگر جائزہ لیا جائے تو جس اتحاد کو پروفیسر ہنٹنگٹن نے مغرب اور اس کی منفرد تہذیب کے خلاف چینی اور اسلامی تہذیبوں کے اتحاد کا نقطۂ آغاز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے،، وہ وقتی یا علاقائی ضرورت سے زیادہ کچھ اور نہیں ہے۔ پاکستان کے ساتھ چین کا اتحاد اسلامی، چینی تہذیبوں کا اتحاد نہ ہو کر زیادہ علاقائی ضرورت کے تحت ہے، خطے میں چین کا مقابلہ ہندوستان سے ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تعلقات اچھے نہیں ہیں اس لیے خطے میں چین کو خود کو مضبوط رکھنے کے لیے پاکستان کے ساتھ تعلقات رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ خود ہنٹنگٹن کے الفاظ میں

In politics a common enemy creats a common interest
(سیاست میں مشترک دشمن مشترک مفادات کو جنم دیتا ہے)[۱۶] ویسے بھی صرف چین پاکستان یا چین کے بعض دوسرے مسلم ممالک کے ساتھ تجارتی وسفارتی تعلقات کو لے کر کسی نئے سیاسی اتحاد کی تشکیل کی پیش گوئی بہت دور کی کوڑی معلوم ہوتی ہے۔ مسلم دنیا میں پچھلی دو دہائیوں کے دوران جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جس طرح امریکہ کی قیادت میں مغربی یورپی ممالک کے اتحاد نے مسلم دنیا کے معاملات میں بے جا مداخلتوں کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ اگر چین اور مسلم دنیا کے مابین کوئی نیا سیاسی اتحاد تشکیل پار ہا ہوتا تو چین نے مسلم دنیا میں مغرب کی ان مداخلتوں کی نہ صرف مخالفت کی ہوتی بلکہ ان کے خلاف محاذ بھی بنایا ہوتا۔ پاکستان کے ساتھ جیسے مراسم چین کے ہیں اس سے کہیں زیادہ گہرے مراسم پاکستان کے امریکہ کے ساتھ ہیں اور پاکستان آج بھی خطے میں امریکہ کے اہم اتحادیوں میں شامل ہے۔ اسی طرح ویانا کانفرنس میں مغربی ممالک کے خلاف جو محاذ بنا تھا اس میں وہ ممالک ایک دوسرے سے وقتی طور پر قریب آگئے تھے جو انسانی حقوق کے حوالے سے مغربی دنیا کے بہت سے اصولوں کو تسلیم نہیں کرتے بصورت دیگر ان میں خود بہت سارے آپسی اختلافات تھے اور ہیں مثال کے طور پر ایران اور عراق، دونوں مسلم ملک ہونے کے باوجود آپس میں شدید اختلافات رکھتے تھے۔

پروفیسر ہنٹنگٹن نے اپنے مفروضے میں سب سے زیادہ زور چین اور عالم اسلام کے ممکنہ اتحاد پر دیا ہے اور اس کی بنیاد پر ہی تہذیبی تصادم کو ناگزیر قرار دیا ہے لیکن غور کیا جائے تو چین اور عالم اسلام کے درمیان کسی ممکنہ اتحاد کی بات تو بہت دور رہی خود عالم اسلام کے درمیان کسی اتحاد کا امکان مستقبل قریب میں نہیں کے برابر ہے۔ خود انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عالم اسلام میں کسی بھی ملک کو اسلام کے تہذیبی مرکز (Core State) کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔[۱۷] اور مسلم دنیا نہ صرف یہ کہ عدم اتحاد کا شکار ہے بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں مسلم ممالک باہم برسرپیکار بھی ہیں۔ ایران-عراق تنازعہ گزرے دنوں کی بات کہی جاسکتی ہے لیکن شام کے خلاف عرب لیگ اور خلیجی

ریاستوں کا اتحاد، ایران کے اور خلیجی ریاستوں کے تنازعات، وغیرہ ایسے تنازعات ہیں جو مسلم دنیا کے کسی بھی ممکنہ اتحاد کو خارج از امکان قرار دیتے ہیں۔ مغربی دنیا کے ساتھ تعلقات کو لے کر کے بھی مسلم ممالک خاصے انتشار کا شکار ہیں۔ حالات اور تقاضوں کے تحت مسلم دنیا کے حکمرانوں کا ایک بڑا طبقہ مغرب کے ساتھ خوش گوار تعلقات کا حامی ہے لیکن وہ مغرب کے ساتھ تعلقات کی قیمت پر اپنے علاقائی و مقامی مفادات کی قربانی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایران میں اقتدار کی حالیہ تبدیلی کے ساتھ مغرب-ایران تعلقات میں جو نئی پیش رفت ہوئی ہے اور جس میں مزید بہتری کے امکانات بھی تلاش کیے جارہے ہیں، اس سے سعودی عرب اور خلیج کی ایران مخالف ریاستیں بہت زیادہ خوش نہیں ہیں اور اگر مستقبل میں ایران- امریکہ تعلقات اچھے ہوتے ہیں تو امریکہ اور خلیجی ریاستوں کے درمیان تعلقات پر اس کا اثر ضرور پڑے گا۔ ویسے بھی پروفیسر ہنٹنگٹن کی تمام تر تجزیاتی پیش گوئی کے باوجود مسلم دنیا کا انتشار پوری طرح مبرہن ہے۔ یہاں تک کہ مسلم دنیا میں اگر کوئی ایسی تبدیلی آتی ہے جس کے تحت ان ملکوں میں موجودہ حکمرانوں کی جگہ مغرب کے نام نہاد ناپسندیدہ افراد بھی لے لیتے ہیں تو بھی مسلم دنیا یا چین اور عالم اسلام کے کسی اتحاد کے امکانات بہت کم ہیں۔ عرب دنیا کی حالیہ سیاسی تبدیلی کے نتیجے میں تیونس اور مصر میں دو ایسی حکومتیں برسر اقتدار آئی تھیں جو مغرب کے لیے ناپسندیدہ ہوسکتی تھیں لیکن اقتدار میں آنے کے بعد ان کی جانب سے ایسے اقدامات سامنے نہیں آئے جو مغرب کے خلاف عالم اسلام یا عالم اسلام اور چین کی کسی نئی محاذ آرائی کا اشارہ دیتے۔ یہ حالات اور واقعات ثابت کرتے ہیں کہ مستقبل قریب میں مذہب کی بنیاد پر تہذیبوں کی تشکیل اور پھر ان کے درمیان اتحاد اور تصادم کے امکانات مفروضے کی دنیا میں تو وقوع پزیر ہو سکتے ہیں، ان کا حقیقت واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے ابھی تک جب کہ ہنٹنگٹن کے نظریے کو سامنے آئے ہوئے دو دہائی کا عرصہ گزر چکا ہے، تہذیبی تصادم کے نام پر دانشورانہ جنگ ہی ہوتی رہی ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ Viking by Penguin Books India (P) Ltd. 1997

۲۔ Foreign Affairs, Summer, 1993

۳۔ Free Press. New York, Ist Edition, 1992

۴۔ The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order, P.102

۵۔ ایضاً، 47

۶۔ ایضاً، 45

۷۔ ایضاً، 92-93

۸۔ ایضاً، 318

۹۔ ایضاً، 318

۱۰۔ ایضاً، 318

۱۱۔ The Indian Express January, 20, 1998

۱۲۔ The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order, P.113

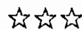
۱۳۔ ایضاً، 20

۱۴۔ ایضاً، 245-46

۱۵۔ ایضاً، 246

۱۶۔ ایضاً، 185

۱۷۔ ایضاً، 185



اسلامی تہذیب وسیاست اور ہندوستانی مسلمان
چند قابل غور پہلو

محمد احمد فلاحی*

اسلام دین فطرت ہے، اس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ نوع انسانی کی تاریخ قدیم ہے۔ ابوالبشر حضرت آدمؑ کی پیدائش سے ہی اس دین فطرت کا بھی وجود ہوگیا تھا۔ اسلام کے معنی دراصل مکمل خودسپردگی اور حوالہ کردینے کے ہیں اور اصطلاح میں یہ حوالگی خدائے واحد کے لیے ہوتو یہی اسلام ہے۔ اس کائنات کی تمام مخلوقات کی طرح (چاہے وہ نظر میں آتی ہوں یا نہیں) انسان بھی ایک مخلوق ہے۔ البتہ انسان کا امتیاز یہ ہے کہ اسے کچھ اختیارات بھی دیے گئے ہیں۔ لیکن دوسری مخلوقات کی طرح کچھ چیزوں میں وہ مجبور بھی ہے۔ بعض مخلوقات بھی بعض چیزوں میں مختار ہوتی ہیں، لیکن ان کا یہ اختیار غیر شعوری ہوتا ہے اور انسان کا ارادہ و اختیار شعوری ہوتا ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کا ارشاد ہے:

"إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعاً بَصِيراً" (الدہر:۲)

انسان اپنے اسی شعوری ارادہ و اختیار کی بنا پر بسا اوقات فطرت سے بغاوت کرتا ہے۔ اس بغاوت کی متعدد شکلیں ہوتی ہیں اور متعدد مراحل بھی ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا تعلق عقائد سے ہوتا ہے اور بعض کا اعمال سے۔ ہر ایک میں بگاڑ رفتہ رفتہ آتا ہے اور یہی بگاڑ بسا اوقات خطرناک صورت اختیار کرلیتا ہے جس کے نتیجہ میں سارا انسانی

* سابق ایڈمنسٹر، ادارۂ تحقیق واسسٹنٹ پی آر او (برج کورس)، اے-ایم-یو، علی گڑھ

معاشرہ ظلم و عدوان اور ناانصافی کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور خود انسانیت کراہ اٹھتی ہے۔ تاریخ انسانی گواہ ہے کہ جب جب انسانی معاشرہ کو یہ مہیب صورت حال درپیش ہوئی خالق کائنات نے انسان کو دین فطرت سے جوڑنے کے لیے اپنا رسول بھیجا۔ تمام ہی رسول اپنے اپنے زمانہ میں اپنی قوم کے لوگوں کو اسی دین فطرت کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ شرع لکم من الدین .... میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ دین فطرت ایک ہی ہے اور وہ اسلام ہے "**ان الدین عند اللہ الاسلام**" اور "**ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ**" اسی دین فطرت اور دین اسلام کی طرف اللہ کے رسولوں نے اپنی قوم کے لوگوں کو بلایا۔ دین اسلام کی بنیادی تعلیمات ان رسولوں کی یہی تھی کہ اللہ ہی کی عبادت کرو میں اس کی عبادت کے طریقے بتاؤں گا گویا مجھے رسول جانو اور اس دن سے ڈرو جس دن تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے اور تمہارا حساب کتاب ہوگا۔ انہی بنیادی تعلیمات کی طرف تمام انبیائے کرام نے دعوت دی۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ جب رسولوں کی تعلیمات خلط ملط ہو جاتیں اور معاشرہ پھر سے بدامنی کا شکار ہوتا تو اللہ تعالیٰ پھر سے نبی بھیج کر اپنی تعلیمات تازہ کراتا۔ یہ سلسلہ حضرت محمد ﷺ پر ختم ہو گیا۔ قرآن کی صراحت کے مطابق اب کوئی نبی نہیں آنے والا۔ نبی کے غیاب میں اس کی جو تعلیمات خلط ملط ہو جایا کرتی تھیں یا محو ہو جاتی تھیں اب اس آخری نبی کے بعد ایسا نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ ابدی سرچشمۂ اصول حیات انسانی ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی شکل میں ساری انسانیت کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

گزشتہ انبیاء کے پیروکار بھی دین اسلام ہی کے ماننے والے تھے کیوں کہ ان کے انبیاء نے اسی اسلام کی تعلیم دی تھی ان کے بعد کے پیروکاروں نے یہودیت و نصرانیت وغیرہ کے خانوں میں منقسم اور مختص کر دیا۔ اس حقیقت کی طرف قرآن نے جابجا اشارے کیے ہیں۔ قرآن مجید جب نازل ہو رہا تھا اس وقت اس کے مخاطبین خود کو حقیقی دین اسلام اور دین براہیمی کا پیروکار کہا کرتے تھے۔ یہود و نصاری اور مشرکین سبھی اس زعم باطل میں تھے کہ دین اسلام اور دین براہیم کے سچے پیروکار وہی ہیں۔

قرآن نے ان کے اس زعم باطل کی تردید کی کہ تم سب اس دین کو بھلا بیٹھے ہو، خلط ملط کر بیٹھے ہو حتی کہ تحریف صحف کے بھی مرتکب ہوئے ہو۔ دین اسلام اور دین براہیمی کی تعلیمات جس میں تم نے شعوری یا غیر شعوری تحریف کی ہے یہ آخری نبی اس کی اصلاح کرنے کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔ تم نماز، روزہ، حج، زکوۃ، قربانی، تجہیز و تکفین اور ختنہ ہر اصطلاح سے واقف تو ہو لیکن یہ تمام مراسم عبودیت ایک تو یہ کہ شرک سے آلودہ ہیں، روح خالص سے خالی ہیں اور دوسرے طریقہ انجام دہی بھی بھلا بیٹھے ہو۔ صحیح طریقہ وہ نہیں جس پر تم عامل ہو بلکہ اس نبی کی تعلیمات کے ذریعہ ان کی اصلاح ہوگی اگر تم اس کی اتباع کرو۔

آخری نبی حضرت محمد ﷺ جب تک اس دنیا میں رہے اپنی مختصر مدت حیات میں ایک صالح اور مثالی انسانی معاشرہ کی تکمیل فرما گئے۔ آپ ﷺ کا اسوہ قیامت تک کے لیے ساری انسانیت کے لیے مشعل راہ ہے۔ آپ کا اسوۂ حسنہ قرآن کی چلتی پھرتی تصویر تھا اور پھر آپ کے ...... صالح معاشرے کا متواتر عمل۔ جس نے صدیوں تک اسلام کو اپنے صحیح اور معتدل قالب میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ دور اول کے مسلمان اسلام کی حقیقی روح سے آشنا تھے۔ گروہی، جماعتی، مسلکی، لسانی، وطنی تعصب سے عاری تھے۔ حالات زمان و مکاں کے تقاضوں اور اسلامی تعلیمات کے مزاج اور اس کی روح کے شناور تھے۔ اسلامی تعلیمات کی تعبیر و تشریح اور ان کا انطباق زمان و مکان کی رعایت کرتے ہوئے ایسے کرتے تھے کہ اس کی روح متاثر نہ ہو۔ قحط کے زمانہ میں حد سرقہ کا سقوط ہو یا فدک کی زمینوں کا قضیہ، ذمیوں کا مسئلہ ہو یا اہل کتاب اور شبہ اہل کتاب کی خواتین سے شادی سب میں زمان و مکاں کی رعایت ملحوظ خاطر رہی۔

لیکن یہ المیہ ہے کہ گزشتہ اہل کتاب کی مانند بعد کی صدیوں میں دین اسلام میں زمان و مکاں کی رعایت کو ملحوظ رکھنے کی روایت ختم ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ دین اسلام بھی چند مراسم عبودیت کی انجام دہی کا نام رہ گیا، تفاسیر، احادیث اور فقہی موشگافیوں کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ اور بالآخر گروہی، جماعتی، مسلکی، لسانی اور وطنی عصبیتوں میں سمٹ کر رہ گیا،

جب کہ اسلام تو قیامت تک کے لیے آیا تھا، قرآن، اسوۂ رسول اور آپ ﷺ کے تشکیل کردہ معاشرہ کا متواتر عمل اس امر پر شاہد تھا کہ اسلام اور اس کی تعلیمات کوئی جامد چیز نہیں۔ اس میں حرکیت پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید نے زندگی گزارنے کے چند بنیادی طریقوں کی نشاندہی کی تھی اور آپ ﷺ نے خود اپنی حیات میں ضرورت اور مصلحت کے تقاضوں کے تحت اس امت کو اس بات کی تعلیم دی تھی کہ حالات کے تقاضوں کے تحت ان الٰہی احکام پر کیسے عمل آوری کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ جب آپ کی ضرورت متقاضی ہوئی تو آپ ﷺ نے قصر بھی کیا، جمع بین الصلوٰتین بھی کیا، صلوٰۃ الخوف بھی پڑھی، صلح حدیبیہ بھی کیا، حلف الفضول کی بھی تصویب فرمائی، مسح بھی فرمایا، خندق بھی کھودی، جنگی حکمت عملی بھی تبدیل کی، عفو و درگذر سے بھی کام لیا، ماعز اسلمی سے اعراض بھی فرمایا، "ان الحسنات یذھبن السیئات" کی تعلیم بھی دی، حج کے موقع پر کسی نے پوچھا میں نے یہ کرلیا اور یہ نہ کیا آپ نے فرمایا اب کرلو کوئی حرج نہیں۔ تحریض و تشویق بھی فرمائی اور اس کی عدم بجا آوری پر آپ ﷺ نے نکیر نہیں کی، آپ نے "استفتِ قلبک" کہہ کر قلب سلیم کو مفتی بنایا، یہ اور اس طرح کی مثالیں ایسی ہیں جو اہل اسلام کے اندر وسعت ذہنی پیدا کرنے اور انھیں اس خول سے باہر نکالنے کے لیے کافی ہیں جو اسلام کو ایک جامد دین اور اپنے فقیہ اور مسلک کے تقدس کا علم بلند کرنے کو عین اسلام سمجھتے ہیں۔

مذکورہ بالا معروضات کی روشنی میں یہ کہنا بجا طور پر درست ہے کہ دین اسلام ایک حرکی دین ہے، ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لیے موزوں ترین۔ چاہے اس کے مخاطب عرب کے تپتے ریگستانوں کے افراد ہوں یا یوروپ و امریکہ کے سرد ترین علاقوں کے لوگ یا ان جگہوں کے افراد جہاں چھ ماہ متواتر دن اور اتنے ہی ماہ رات ہوتی ہو۔ اسلام کی حقیقی روح یہ ہے کہ خدا و رسول کی تعلیم پر ایمان و عمل اور آخرت پر یقین، یہی وہ بنیاد ہے جن کے اردگرد اخلاق و معاملات اور حقوق گردش کرتے ہیں۔ بقیہ تمام چیزیں فروعی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کسی نہ کسی طور پر اور کسی نہ کسی شکل میں، گرچہ وہ شرک سے آلودہ ہو، ساری انسانیت کا ان امور پر اتفاق ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآنی ارشاد

ہے:"قل یا اھل الکتاب تعالو إلیٰ کلمة سوآءٍ"۔

موجودہ اہل اسلام کی اکثریت جس اسلام پر عامل ہے اگر حقیقی نظر سے دیکھا جائے تو گزشتہ اہل کتاب جو اصلاً مسلم تھے، ان کی گمراہی اور موجودہ اہل اسلام کی گمراہی میں زیادہ فرق نظر نہیں آئے گا، یعنی موجودہ اہل اسلام کے گمراہ فرقے اسلام ہی کے فرقے شمار کیے جاتے ہیں اسی طرح اہل کتاب جن کی اصل مسلم ہے، وہ بھی اسلام کا گمراہ فرقہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اور جس طرح اسلام کی حقیقی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کی ضرورت اہلِ اسلام کے گمراہ فرقوں کو ہے ویسے ہی ان اہلِ کتاب اور شبہ اہل کتاب کو بھی اپنا ہی حصہ سمجھ کر اپنے سے قریب لانے اور اسلام کی حقیقی تعلیمات سے متعارف کرانے کی ہے۔ بالفاظ دیگر ساری انسانیت اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے "الخلق کلہ عیال اللہ" اور اس حیثیت سے ساری انسانیت جو کسی نہ کسی نبی سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے مسلم تھی جو اب گمراہ ہوگئی ہے جس طرح ہمارے بھائی بند شرک و گمرہی کے کسی نہ کسی گڑھے میں گرے ہوئے ہیں، ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی سے رشتہ درای نہیں، جب یہود کے اس دعویٰ "نحن ابناء اللہ و احباؤہ" اور نصاریٰ کے اس یقین کہ عزیر ابن اللہ اور لن تمسنا النار...کی کوئی اہمیت نہیں تو امت محمدیہ بھی اگر ایمان خالص و عمل صالح سے متصف نہ ہو تو اس کے لیے نجات نہیں ہے۔

اسلامی تہذیب

تہذیب نام ہے حسن معاشرت کا۔ حسن معاشرت کا انحصار انسان کے عقیدے اور عمل پر ہے۔ انسان جیسا عقیدہ رکھتا ہوگا اور جیسے اس کے اعمال ہوں گے اسی کے اعتبار سے اس کی معاشرت بھی تشکیل پائے گی۔ گزشتہ انبیاء کی تعلیمات کے بھلا دینے کی نتیجہ میں جو عقائد رواج پائے انہی کے مطابق انکی معاشرت کی بھی تشکیل ہوئی۔ اور اس معاشرہ کی تہذیب اسی رنگ میں ڈھل کر...... ۔ اسلامی تہذیب کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود اسلام اور انسان کی تاریخ قدیم ہے۔ اس کا آغاز حضرت آدم سے ہی ہوا اور

قیامت تک اس کے خدو خال ویسے ہی رہیں گے۔ بسا اوقات اسلام اور اسلامی تہذیب کو آخری نبی حضرت محمد ﷺ سے جوڑا جاتا ہے اور عربی روایات کو اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے جو سراسر غلط ہے۔

اسلام کے کچھ بنیادی عقائد ہیں، ان بنیادی عقائد کی روشنی میں زمان ومکاں کی رعایت کیساتھ حسن معاشرت کی جیسی بھی تشکیل کی جائے گی، وہ اسلامی تہذیب ہوگی۔ اسلامی تہذیب کا تعلق جبہ و دستار سے نہیں، لمبی داڑھیوں سے نہیں، ٹخنہ سے اوپر پائجامہ پہننے سے نہیں، بلکہ اسلامی تہذیب عبارت ہے "**کل ماشئت والبس ماشئت مالم تخالطک خیلاء**"۔ اگر کسی انسانی معاشرہ کا عقیدہ درست ہے، اس کے افراد ایک خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان کے بنیادی تقاضوں پر عمل پیرا ہیں تو اس بنیادی عقیدے کے نتیجہ میں جو تہذیب پروان چڑھے گی وہ اسلامی تہذیب ہوگی۔ یہ اسلامی تہذیب مغرب ومشرق ہر جگہ اپنی بنیاد کے اعتبار سے ایک ہوگی البتہ زمان ومکاں کے تقاضوں کے تحت اس کی فروع مختلف ہوسکتی ہیں۔

انسانی معاشرہ پر عمومی نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ فی زمانہ اسلامی تہذیب اپنی خالص شکل میں کہیں نظر نہیں آتی جب سے فقہی اسلام نے اپنی جڑیں مضبوط کی ہیں اسلامی تہذیب اسلامی روح سے خالی ہوکر ایک روایتی مجسمہ نظر آتی ہے۔ گویا بالفاظ دیگر اسلامی تہذیب دوسری تہذیبوں کے بالمقابل نام کی اسلامی تہذیب ہے۔ فکر وعمل کی یکسانیت سے عاری بلکہ فکری پختگی سے بھی محروم ہوگئی ہے۔ جب کہ اسلامی تہذیب کا امتیاز یہ تھا کہ اس کے افراد کے اندر خود شناسی، خدا شناسی اور اس کے نتیجہ کے طور پر اپنی زندگی کے نصب العین پر عمل آوری کا فطری داعیہ موجزن ہوتا۔ اس کے برعکس فی زمانہ صورت حال یہ ہے کہ اسلام کا اسلامی تہذیب سے رشتہ مضبوط نہیں رہ گیا، یا تو اسے انفرادی اور پرائیویٹ لائف کا حصہ گردانا جاتا ہے اور اسے مساجد اور خانقاہوں تک محدود کردیا جاتا ہے یا گروہوں، جماعتوں اور فرقوں میں تقسیم ہوکر بے جا تعصب کو تقدس کا مقام عطا کیا جاتا ہے۔ اسلامی تہذیب کی تشکیل میں موجودہ زمانہ میں

یہی دوانتہائیں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

تہذیب کی تشکیل میں انسان کی سوچ ،فکراور عقیدے کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔ انسانی تہذیب کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جتنی بھی تہذیبیں خدا بے زاری وخدا ناشناسی اور آخرت فراموشی یا انبیاء کے ذریعہ لائی گئیں الٰہی تعلیمات کو فراموش کر کے پروان چڑھیں وہ انسانیت کے لیے سودمند ثابت نہیں ہوئیں۔ان کے مضر اثرات کے بیان سے تاریخ کے صفحات بھرے ہیں اور جن کے ثمرات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔انسان جب اپنی حقیقت سے واقف نہیں ہوگا،اس پراس کی زندگی اور اس کے وجود کا مقصد غیر واضح ہوگا، اپنے پیدا کرنے والے سے غافل ہوگا، اپنی زندگی کے کسی واضح نصب العین سے ناواقف ہوگا، اور آخرت کی جواب دہی کے یقین سے عاری ہوگا تو لامحالہ اس میں اور بہائم میں معنوی اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوگا، سرکشی ،ظلم وعدوان اس کی فطرت کا حصہ ہوگا اور ساری انسانیت اس کے کریہہ نتائج سے دوچار ہوگی،جس کا نظارہ تاریخ ماضی میں کوئی رہی ہے اور جسے آج بھی دیکھا جاسکتا ہے۔دنیا کی وہ تمام تہذیبیں جو مذکورہ بالا صفات سے متصف تھیں وہ اپنے انجام کوپہنچ چکی ہیں اور آج پہنچ رہی ہیں اور آئندہ بھی پہنچیں گی،یونان ومصر وروما کی تہذیبوں کا حشر معلوم ہے، ہندوستانی، ایرانی،مغربی ویوروپی تہذیبیں چاہے قدیم کی ہوں یا جدید کی سبھی کے مضر اثرات سے کون واقف نہیں۔

اسلامی تہذیب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک فطری تہذیب ہے اس تہذیب کی تشکیل میں انسان کواپنی حقیقت معلوم ہوتی ہے،وہ یہ جانتا ہے کہ اس کی حقیقت ناپاک پانی کے نہ نظر آنے والے جرثومہ سے زیادہ نہیں،اس کو حیات بخشنے والی کوئی ہستی ہے، وہی خالق ہے، مالک ہے، رب ہے اور حاکم بھی ہے،اس کے احکام اس کے برگزیدہ بندوں کے ذریعہ اس تک پہنچے اور اپنی اس پوری زندگی کا ایک دن اسے اس کے حضور جاکر حساب بھی دینا ہے،جو قوم یا افراد اس طرح کے نظریات رکھتے ہوں اور اس پر عامل بھی ہوں تو اس فکر،عقیدے اور عمل کے نتیجہ میں جو معاشرہ پروان چڑھے گا اور جو تہذیب

تشکیل پائے گی وہ حسن معاشرت سے پر ہوگی اور انسانیت امن و سکون اور عدل و مساوات کی زندگی سے ہم کنار ہوگی، چنانچہ اسلامی تہذیب کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ از آدم تا ایں دم اس کے حاملین اور ان صفات سے متصف افراد جہاں کہیں رہے اور جب جب وجود پذیر ہوئے اس تہذیب اور حسن معاشرت کے ثمرات سے ساری انسانیت مستفید ہوتی رہی۔

اسلامی تہذیب کے برگ و بار اور اس کے اثرات کن چیزوں پر اور کس طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں چند الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان جب اس حقیقت سے آشنا ہوگا کہ اس کا وجود نہایت حقیر پانی سے ہوا ہے تو اس پر اپنی حقیقت منکشف ہوگی، اس کے اندر ''انا و لا غیری'' کا زعم باطل در نہیں آئے گا۔ وہ اپنے خالق، مالک، حاکم اور رب پر ایمان لائے گا اور اس کے حضور اپنی جواب دہی کے خوف سے لرزاں ہوگا۔ اس کے نتیجہ میں اس کے اعمال بھی اس کے بتائے ہوئے احکام کے تابع ہوں گے، وہ خود کو حاکم اعلیٰ سمجھنے کے بجائے اس کے سامنے جوابدہی کے احساس سے معمور ہوگا۔ خالق اور مخلوق کے حقوق کی ادائیگی کرنے والا ہوگا۔ اس کے برعکس جو تہذیب اس بنیادی اور فطری عقیدے کی منکر ہوگی یا غفلت برتنے والی ہوگی وہ تہذیب عدل و انصاف سے خالی ہوگی۔ فتنہ و فساد، حرص و طمع، خیرہ اندوزی، ظلم و عدوان اور عدم مساوات اس کے برگ و بار ہوں گے۔

اسلام کے بنیادی عقائد اسلامی تہذیب کی تشکیل میں ہمہ گیر اور وسیع الاطراف کردار ادا کرتے ہیں، وہ قوموں کے غبار آلود ڈھب کو جن پر وہ عامل ہوتی ہیں صحیح رخ عطا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ؐ کے مخاطب تین طرح کے افراد تھے۔ مشرکین، یہود اور نصاریٰ ان کے عقائد اور اعمال مشرکانہ تھے آپ ﷺ نے ان کے عقائد کو درست کیا اور اعمال جن کا تعلق تعبدی امور سے تھا اور جن سے وہ ...... واقف تھے ان کی اصلاح کی بقیہ چیزیں جن کا تعلق عقیدہ سے نہیں تھا ان کو جوں کا توں برقرار رہنے دیا یا حسب موقع اور حسب پسند اصلاح فرمایا، یا اپنی ذاتی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ آپ ﷺ

کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں دنیا میں کہیں بھی اسلامی تہذیب کی تشکیل کی بات ہوگی وہاں انہی بنیادی عقیدوں کی تبلیغ و اشاعت کی جائے گی اور بقیہ اس خطے اور زمانے کے مروجات کو اسلامی تہذیب اور عربی تہذیب سے خلط ملط کر کے اسلامی تہذیب کا ہمہ گیر دائرہ تنگ نہیں کیا جانا چاہیے۔ چاہے وہ لباس، وضع قطع، رہن سہن، مشروبات، تعمیرات، وقتی تقاضے اور ضروریات وغیرہ کے مسائل ہیں۔ اس طرح کے تمام امور میں آپ ﷺ کا ارشاد گرامی "کل ماشئت والبس ماشئت مالم تخالفک خیلاء" مدنظر ہونا چاہیے۔ یہ اسلامی تہذیب کی فروع ہیں جو زمان و مکان کے تقاضوں کے تحت تبدیل ہو سکتے ہیں۔

اسلامی سیاست

اسلامی سیاست بھی اسلام کے بنیادی عقائد کے گرد گردش کرتی ہے۔ اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ جس طرح خالق ہے وہی مالک بھی ہے اور حاکم بھی۔ یہ ملک اسی کا ہے، اس کا فرمان قرآن مجید کی شکل میں اور اس کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں موجود ہے۔ انسان ایک باشعور معاشرتی مخلوق ہے، اس کے اجتماعی معاملات خدا کے بتائے ہوئے زندگی گزارنے کے طریقہ کے مطابق حل کیے جانے چاہیے۔ انسان کا جب بنیادی عقیدہ درست ہوگا اور اس عقیدے کی بنیاد پر اس کے اعمال ہوں گے تو اس کی سیاست بھی اسی کے مطابق ہوگی، ہر ایک کے حقوق کی پاس درای کی جائے گی۔ کسی پر کسی طرح کا ظلم روا نہ رکھا جائیگا۔ اس کا مثالی نمونہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے بعد آپ کے پاکباز صحابہ نے پیش کر کے دکھادیا۔ "الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ" (الحج:۴۱)

اہل کتاب کے بارے میں کہا گیا کہ: "وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم مِّنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ

وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ'' (المائدہ:٦٦)

اسلامی سیاست اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ مختلف مواقع پر مختلف حکم رکھتی ہے۔ سیاست دراصل ریاست کی تشکیل اور حسن انتظام سے عبارت ہے۔ وہ سیاست جو خدائی احکام کے تابع ہو اور جس کا مثالی نمونہ آپؐ اور خلفائے راشدین کے ذریعہ برتی گئی سیاست ہے۔ مختلف مرحلوں کی سیاست کا یہ نمونہ ہر دور کی اسلامی سیاست کے لیے مشعل راہ ہے۔ گزشتہ انبیاء اور صالحین امم سابقہ کی اسلامی سیاست جن کا ذکر قرآن میں ہے یہ سب آئندہ کے اپنے پیروکاروں کے لیے نمونۂ ہدایت ہیں۔ خود آپؐ مکہ میں اپنی نبوت کی ابتداء، مکہ تیرہ سالہ زندگی، ہجرت، مدینہ میں اسلامی ریاست کی تشکیل، حبشہ کی پناہ، غزوات، معاہدے، وفود کی روانگی، صلح حدیبیہ، فتح مکہ اور پھر خلفائے راشدین کی سیاسی بصیرت اور تدابیر مختلف مراحل میں مختلف ...... مثالی نمونے ہیں۔ فتوحات کے سلسلے اور معاہدے، مخلوط معاشرے، مسلم اکثریتی معاشرے، ہر طرح کے حالات اور زمانے کے اختلافات میں اجتماعی و انفرادی سطح پر اسلامی سیاست اپنے بنیادی عقائد کے ساتھ بڑی وسعت رکھتی ہے اور اس وسعت کے نمونے اسوۂ نبوی ﷺ اور سلف صالحین کی اسلامی سیاست میں بآسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس کرۂ ارضی پر جہاں کہیں بھی مسلمان اقتدار میں رہے وہاں کے حالات کے پیش نظر اسلام کی بنیادی تعلیمات اور عقائد کی روشنی میں انھوں نے عدیم المثال حکومتیں قائم کیں۔ قطع نظر اس کے کہ یہ مسلم حکومتیں ملوکیت کی شکل میں تھیں یا کسی اور شکل میں، دنیا کے ہر کونے میں پائے جاتے رہے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں۔ کہیں انھیں اقتدار حاصل ہے اور کہیں اقلیت میں ہیں۔ حکمرانوں سے اس کا سرا پھسلتا رہا اور آج بھی وہ شعوری یا غیر شعوری غفلت کے شکار ہیں۔ رہیں مسلم اقلیتیں تو وہ اپنے ممالک میں نت نئے چیلنجز سے دوچار ہیں، کہیں وہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہیں اور کہیں انھوں نے ہوا کے رخ پر خود کو ڈھال رکھا ہے اور کچھ نے اسلام کو سیاست کے دائرہ سے باہر کر رکھا ہے۔

اسلامی سیاست کے رہنما اصول یہ ہیں کہ یہ کائنات خدا کی پیدا کردہ ہے اور

اس میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے۔ انسان کو جو کچھ اختیار ملا ہوا ہے اس میں اسے اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کرنے ہی میں انسانیت کی بھلائی ہے۔ وہ اگر با اختیار رہے تو اسے یہ اختیار اس کی آزمائش اور امتحان کے لیے دیا گیا ہے، جس کی اسے ایک دن جو اب دہی کرنی ہے، یہی وہ احساس اور یقین ہے جو ایک خدا پرست انسان کو سرکشی اور شتر بے مہار ہونے سے روکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جب اقتدار نصیب ہوتا ہے تو عدل و قسط کے علم بردار ہوتے ہیں۔ معاشرہ کے ہر طبقہ کے یکساں طور پر سرپرست ہوتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا تعصب نہیں ہوتا ہے، جبر و اکراہ ظلم و عدوان سے دور ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانیت کے دشمنوں اور فتنہ و فساد پھیلانے والوں سے سختی سے نمٹنے والے بھی ہوتے ہیں۔ وہ ایسے نرم چارہ بھی نہیں ہوتے کہ جو چاہے انھیں ہضم کر لے۔ وہ عہد و پیمان کے پاسبان، عوامی خزانوں کے امین، ضعفاء، مساکین، عورتوں، بچوں اور اقلیتوں کے محافظ و نگہبان ہوتے ہیں۔ ساری انسانیت کو ترقی کے مواقع فراہم کرنے میں معاونت کرنے والے ہوتے ہیں۔ آزدیٔ رائے، ترقی کے مواقع، حصول تعلیم کے ذرائع اور تمام ہی بنیادی حقوق کے حصول کے یکساں مواقع کی فراہمی اسلامی سیاست کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ کاروبار، معاشرت، معیشت سبھی کچھ اسلامی مملکت کے اندر متوازن اصولوں کے تحت جاری و ساری رہتی ہیں۔ یہ ایک ہلکا سا نقشہ تھا ان ممالک کا جن میں اسلامی مملکت اسلامی سیاست کے اصولوں پر کاربند ہو جیسا کہ عہد نبوی و عہد خلفائے راشدین میں اس کے کامل نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ رہے وہ ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں ان کے لیے اسلامی سیاست کے کچھ اصول ہیں جو قرآن اور تعامل صحابہ اور سلف صالحین کی روشوں سے مستنبط کیے جا سکتے ہیں۔ اس کا نمونہ ہجرت حبشہ، ہجرت مدینہ قبل از ہجرت نبوی یا اسلامی اسٹیٹ کے قیام سے قبل، خود مکہ کی تیرہ سالہ نبوی زندگی میں ہمیں مل سکتا ہے۔ بعد کے ادوار میں انحائے عالم میں سیاسی، تجارتی و تبلیغی وفود اور ممالک کی فتوحات کی صورتوں میں مسلم اقلیتوں کو کن سیاسی گزرگاہوں سے گزرنا پڑا اور ان حالات میں انھوں نے کیا رویے اختیار کیے یہ سب کچھ اس بات پر دال ہیں کہ زمان و

مکاں، حالات وضروریات کے تقاضوں کے تحت اپنے ملک کے سیاسی رویوں سے کس حد تک ہم آہنگ ہوا جاسکتا ہے اوراس کے ساتھ ساتھ وہ کون سے ذرائع اختیار کیے جاسکتے ہیں کہ اسلامی سیاست سے اس ملک کی اکثریت متعارف ہوسکے اوراسے بھی ایک نہ ایک دن آزمانے کے لیے آمادہ ہو۔ ان حالات میں سلف صالحین کے رویوں سے اتنا یقیناً مستنبط ہوتا ہے کہ بحیثیت اقلیت پناہ گزیں، سیاح یا تاجر انھوں نے نظام وقت یا اکثریت سے ٹکر لینے کی جرأت نہیں کی بلکہ کمال حکمت کے ساتھ ان کے غیر مشرکانہ اعمال میں شریک وسہیم رہے اور دلوں پر فتح پائی۔

اسلام اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ ایک ایسا طرز زندگی ہے اور نظام ہائے حیات ہے جو اپنے چند بنیادی عقائد کے ساتھ ہر ملک، ہر انسان، ہر طبقہ، ہر مذہب، ہر رنگ و نسل اور ہر زمانہ میں فٹ آسکتا ہے، لیکن بدقسمتی سے اسے ازکاررفتہ فقہی دین بنادیا گیا اوراسے ایک خاص طبقہ کے لیے ہی مخصوص کردیا گیا۔ اسی سوچ وفکر کا نتیجہ ہے کہ بنیادی عقائد کے ساتھ ایک مخصوص رہن سہن، لباس اور جامد فقہی موشگافیوں کو اسلامی بتا کر تقدس کا لبادہ اوڑھا دیا گیا۔ فروع کو اس قدر اہمیت دی گئی کہ اسلامی تہذیب وسیاست اصل میں وہی فروع ہوگئیں اوراسلام کی اصل روح اپنے قالب سے نکل گئی۔ ''الدین یسر'' اور ''یسّروا ولاتعسّروا'' کا فرمان نبوی پس پشت چلا گیا۔

ہندوستانی سماج

شاعر مشرق علامہ اقبال نے جب یہ کہا تھا کہ ''میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے - میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے'' تو یہ بلا وجہ نہیں کہا تھا۔ یقیناً ہندوستان کی سرزمین بڑی زرخیز ہے اوراس میں بڑی وسعت بھی پائی جاتی ہے۔ ہندوستان ایک قدیم مذہبی ملک ہے۔ یہاں کی تہذیب وسیاست مختلف النوع ہوتے ہوئے بھی ایک وحدت کا رنگ بھی لیے ہوئے ہیں اوراسے ایک لڑی میں پرونے کے لیے قدیم زمانہ سے ہی مختلف اور متعدد اقوام آتی رہیں اور انھوں نے اسے اپنا مسکن بنایا۔ لیکن بدقسمتی سے یہاں کے

اصل باشندوں کے پاس تہذیب وسیاست کی تعمیر کا وہ نسخۂ کیمیا نہیں تھا جو انھیں انسانیت کی زندگی بلا امتیاز عطا کرتا۔ قومیں جو آئیں وہ بھی اس سے عاری تھیں۔ لوٹ مار اور غارت گری ان کا شیوہ تھا۔ ان کی نظر محض اپنی فتوحات کو وسیع کرنے پر تھی اور یہاں کے باسیوں کو غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کرنا ان کا مقصد حیات تھا، چنانچہ کبھی ایک قوم کسی علاقہ پر غالب آتی اور کبھی دوسری قوم۔ یہاں کے باشندوں کے مذہبی تصورات اور عقائد الٰہی تعلیمات کی روح سے خالی تھے۔ انسانوں کے طبقات کی تقسیم نے ان کی اکثر آبادی کو غلام بنا کر رکھا تھا۔ کہنے کو تو یہ الٰہی مذہب کے پیروکار تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ الٰہی تعلیمات کے نام پر ان کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ الٰہی ہونے کے بجائے خود ساختہ تھا اور ایسی آمیزش تھی جو انسان کو خدا کا بندہ بنانے کے بجائے اپنے ہی جیسے انسانوں کی بندگی کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ مذہب کے نام پر ان خود ساختہ تعلیمات کی بنا پر انسانیت ظلم و جبر اور ناانصافیوں کی آہنی زنجیروں کے نیچے کراہ رہی تھی۔ اور کسی ایسے نظام کی منتظر تھی جو انھیں اس کرب ناک صورت حال سے نکال سکے۔ جس کے واضح اشارات ان کی محرف مزعومہ کتاب الٰہی میں بھی ملتے تھے۔

خوش قسمتی سے آخری صحیفہ ہدایت الٰہی کی حامل کے افراد کے قدم اس سرزمین پر جب پڑے تو پیاس سے تڑپتی اس سرزمین کو آب حیات میسر آ گیا۔ یہاں کے باسیوں نے بالعموم ان کا خیر مقدم کیا۔ یہ افراد مختلف حیثیتوں میں اور مختلف علاقوں میں اسلام کا ابدی پیغام اپنے ساتھ لے کر آئے۔ یہ پیغام جہاں صحیفہ میں محفوظ تھا، وہیں عملی زندگی میں چلتا پھرتا بھی نظر آتا تھا۔ "یضع عنهم اسرهم والأغلال التی کانت علیهم" کا مژدہ جب انھوں نے سنا، دیکھا اور پرکھا تو انھیں ایک نئی توانائی ملی، زندگی جینے کا نیا حوصلہ حاصل ہوا اور دھیرے دھیرے ان کے قلوب نے اس پیغام ربانی کو گلے لگایا اور جن لوگوں نے اسے قبول نہیں کیا ان کا رویہ بھی ان کے ساتھ خیر خواہانہ رہا۔ اس آخری پیغام ربانی کے حاملین مختلف حیثیتوں میں یہاں آئے۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی وفود کی شکل میں بھی، تاجر اور سیاح کی حیثیت سے بھی اور بسا اوقات فاتح کی

حیثیت سے بھی۔ اپنی ہر حیثیت میں یہاں کے باسیوں کو چلتا پھرتا قرآن نظر آیا۔ یہ لوگ یہاں رعایا کی حیثیت سے بھی رہے اور حکمرانی کے مرتبہ پر بھی فائز ہوئے۔ ہر حال میں یہاں کی اصل عوام کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی اور یہاں کے لوگوں نے بھی کشادہ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھیں اپنایا۔ رعایا کی حیثیت سے امت مسلمہ کے یہ افراد حکومت وقت کے لیے مسئلہ نہیں بنے بلکہ ان کے معاون و مددگار ثابت ہوئے اور فاتح اور حاکم کی حیثیت سے یہی لوگ یہاں کی رعایا کے محافظ و نگہبان بنے اور عدل و قسط اور امن و شانتی کی ایسی بنا ڈالی جو ان کے قبل کے کسی حکمراں کے تصور میں بھی نہیں تھا۔ بعد کے مسلم فاتحین گرچہ اسلامی تہذیب و سیاست کی پاس داری میں قرون اولیٰ کے مسلم حکمرانوں جیسے ثابت نہیں ہوئے۔ اس کی جو بھی وجوہات رہی ہوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ بنیادی عقائد کی کمزوری کے باوجود عملی اعتبار سے فروع میں اسلامی رنگ و آہنگ کی خوبو موجود تھی اور محمود و ایاز کا امتیاز کسی بھی مسلم دور حکومت میں نہیں پایا جاتا تھا۔ بلا فرق و امتیاز ہر مذہب و ملت کے افراد شریک حکومت ہوا کرتے تھے۔ کہ کار جہاں بانی شاید اس وقت اسی کا متقاضی تھا۔

فی زمانہ اگر ہندوستانی سماج پر نظر ڈالی جائے تو ابھی بھی یہاں کی سرزمین ویسی ہی زرخیز ہے۔ دستوری اعتبار سے یہاں کی حکومت لادینی جمہوریت کے اصولوں پر قائم ہے۔ کسی قدر عملاً بھی ایسا ہی ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں کا نظام حکومت امت مسلمہ کے افراد کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ یہ نظریہ اس بنا پر قائم ہوا کہ اسلام کے نام پر جو مملکتیں قائم ہیں اور جہاں مسلم حکمراں نظم حکومت سنبھالے ہوئے ہیں وہاں کی مسلم رعایا ہندوستان کی مسلم رعایا کے بالمقابل نہ زیادہ محفوظ ہے اور نہ بنیادی انسانی حقوق ہی اسے حاصل ہیں۔ کہیں تو شخصی حکومتوں نے اپنی ہی مسلم رعایا سے بنیادی انسانی حقوق سلب کر رکھے ہیں اور ان کی ذرا سی جنبش انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا جواز فراہم کر لیتی ہے۔ اس طور سے دیکھا جائے تو ہندوستان کا سیکولر جمہوری نظام مسلمانوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ہندوستانی سماج کے اس مخصوص پس منظر کا فائدہ اٹھاتے

ہوئے اور سلف صالحین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مسلمانان ہند کو اپنی خدا داد بصیرت کے ساتھ اس سماج میں ضم ہونا ہوگا۔ ہندوستانی سماج سے ان کا یہ انضمام اپنی شناخت کو باقی رکھتے ہوئے مشترکہ اقدار میں شراکت پر مبنی ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانان ہند اپنے ایمان کا جائزہ لیں اور اپنے کردار وعلم میں غیر متعصّبانہ وسعت پیدا کریں۔ اسلام اور اسلامی تہذیب وسیاست کے حرکی تصور کو فقہی موشگافیوں اور خود ساختہ روایتی تقدس کے ذریعہ داغ دار نہ کریں۔ وہ قرآن کی چلتی پھرتی تصویر بنیں جو گروہی، مسلکی اور جماعتی شناخت سے بلند ہو۔ اپنے اس غیر متعصب کردار کے ذریعہ وہ اہل وطن کے دلوں میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوں گے۔ ایک جانب جہاں وہ اپنے ایمان اور اس کے بنیادی تقاضوں کی ادائیگی میں مستحکم ہوں گے وہیں دوسری جانب اکرام انسانیت کے ذریعہ قلوب کو فتح کریں گے۔ حق وانصاف اور عدل وقسط کے علم بردار ہوں گے، بلا امتیاز ایک دوسرے کے خوشی اور غم میں شریک ہوں گے اور اہل ملک سے وفاداری اور افادہ اور استفادہ کریں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ اہل وطن اس محبت وانسانیت کا جواب اسی جذبے سے نہ دیں۔ یہ طریقہ ایک خاموش تبلیغ کا طریقہ بھی ہے اور اپنے ایمان کے ساتھ اپنے وجود وبقا کا ضامن بھی۔ اس کے برعکس اگر ہم صرف نام کے مسلمان ہوں، ایمان کے تقاضوں سے نابلد یا غفلت کے شکار، گروہی، مسلکی وجماعتی عصبیتوں کے شکار اور خوساختہ روایات کو تقدس کا مقام دینے پر اصرار کرنے والے تو یقیناً ایسی صورت میں ہم اسلام، اس کی تہذیب اور سیاست کی غلط تصویر پیش کرنے والے ہوں گے۔

قرآنی تعلیمات کا امتیاز یہ ہے کہ بنیادی عقیدہ کو چھوڑ کر موقع ومحل اور زمانہ کی رعایت کے ساتھ اس کے احکام میں خاص گنجائش نظر آتی ہے قحط کے زمانہ میں حد سرقہ کا سقوط حضرت عمر سے ثابت ہے، فدک کی زمین کی تقسیم سے متعلق حضرت عمر کا فیصلہ عہد نبوی سے مختلف تھا۔ ماعز اسلمی کے اعتراف جرم کے باوجود اغماض واعراض آنحضورؐ سے ثابت ہے، غامدیہ سے بھی اعراض اور انہیں مہلت آپؐ سے ثابت ہے۔ معاہدے، ان

کی پاس داری اور ایک خاص وقت تک اعراض بھی آپ ﷺ کی پالیسی کا حصہ رہے ہیں۔ گویا بنیادی ایمانیات کے علاوہ فروعات دین میں آسانیاں اسلام کا مزاج رہا ہے۔ اس مزاج سے فائدہ اٹھا کر ہندوستانی سماج میں اپنے نفوذ اور استحکام کو ممکن اور وسیع بنایا جا سکتا ہے۔

تحریک اسلامی اپنے مزاج کے اعتبار سے الحمد للہ جمود و تعطل کی شکار نہیں ہے۔ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ یہ اپنی پالیسی و پروگرام اور ترجیحات میں ترمیم کرتی رہتی ہے۔ بقول علامہ اقبال ''الٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا۔ لہو گرم رکھنے کا ہے ایک بہانہ'' اس کے مزاج کا حصہ ہے۔ تحریک اسلامی اپنے بنیادی عقیدے اور نصب العین میں تبدیلی کیے بغیر ہندوستانی سماج میں نفوذ اور استحکام کی ضرورت ہے اور وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اپنی کوششوں کو بار آور کرنا چاہتے ہیں تو اپنے قول و عمل، کردار اور مشترکہ اقدار میں شراکت اور سیاسی گلیاروں میں اسلامی سیاست کا پاکیزہ نمونہ پیش کر کے وہ اسے حاصل کر سکتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں ایشوز کی بڑی اہمیت ہے۔ حساس ایشوز کو بنیاد بنا کر تحریک اسلامی سیاست میں استحکام پیدا کر سکتی ہے۔ جیسا کہ ماضی قریب میں دیکھا گیا۔ قرآن ہمیں جو ایشو دیتا ہے وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے جس میں قتال کا ذکر تو ہے لیکن ہم اسے بتقاضائے وقت پہلے مرحلہ میں جدوجہد اور کوشش کے مفہوم میں لے سکتے ہیں قرآن کا ارشاد ہے: ''مالکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء...'' ۔ بلا امتیاز کمزور طبقات کی بنیادی ضروریات اور ان کے حقوق کا دفاع تحریک اسلام کا اہم اور حساس ایشو بن سکتا ہے۔

☆☆☆

تہذیب اسلامی کی فکری و عملی تطبیق

(مولانا علی میاںؒ کے سیاسی افکار کا تجزیاتی مطالعہ)

ضیاءالدین ملک *

تہذیب و سیاست میں اسلام کی رہنمائی کے تعلق سے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (م ۱۹۹۹ء) نے ہزاروں صفحات کے اندر پُر مغز آراء کا اظہار کیا ہے، آپ کے یہ خیالات فکر اسلامی کا اہم ورثہ ہیں۔ اس مقالے میں ان افکار کو ان کی مبسوط کتابوں رسائل اور تقاریر کی مدد سے یکجا کرنے کی کوشش کی گئی جن میں بتکرار تہذیب و سیاست کے اقبال و ادبار پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ تحریر و تقریر کے ذریعہ آپ نے بطور خاص تاریخ، سیاست، تہذیب اور تمدن کی حرکی کیفیات پر عالمانہ بحث کی ہے اور مسلمانوں کی فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ عالمی صورت حال سے لے کر قومی و ملکی سطح پر مسلم اقلیت و اکثریت کے مسائل کو تفہیم و تشریح اور تدبر و اجتہاد کا موضوع آپ نے بنایا۔ ان تحریروں/تقریروں میں اصلاحی و تذکیری اور دعوتی و ترسیلی انداز کا غلبہ ہے۔ ان میں اخذ و استفادہ کے سلسلہ میں عقیدہ و تہذیب کی قید سے بالاتر ہو کر مستند علماء، فضلاء اور دانشوروں کو جگہ دی گئی ہے۔ مادہ پرست محققین اور ناقدین اسلام کی آراء کا تعاقب کیا گیا ہے۔ اسلام کا واضح، حیات بخش اور بین الاقوامی تصور پیش کیا گیا ہے۔ فکر اسلامی کی شارحانہ تعبیر کرتے ہوئے مولانا ندوی معاصر مسائل کو اپنی گفتگو کا عنوان بناتے ہیں۔

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ

تہذیب اسلامی پر تحریریں

آپ کی ہر تحریر یا تقریر تہذیب اسلامی کے کسی خاص قضیے سے بحث کرتی ہے۔ ذیل کی کتابوں میں اسلامی تہذیب کو بطور خاص محسوس کیا جاسکتا ہے:

۱- ارکان اربعہ- اسلامی عبادات کتاب وسنت کی روشنی میں، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۳۶۲/۱۹۶۹

۲- تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۴۲/۱۹۸۶

۳- اسلام مکمل دین- مکمل تہذیب، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ، لکھنؤ، ۳۹/۱۹۹۲

۴- مذہب یا تہذیب، مکتبہ اسلام، لکھنؤ، ۱۶/۱۹۷۸

۵- مذہب وتمدن، جید برقی پریس، دہلی، ۸۶/۱۹۴۳

۶- ہندوستانی مسلمان: ہندوستان کی تہذیب وتمدن کی تشکیل، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۲۳/۱۹۶۱

۷- لسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۳۲/۱۹۷۲

۸- مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۵۷/۱۹۶۴

۹- مسلم پرسنل لا کی صحیح نوعیت و اہمیت، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، مونگیر، ۲۴/۱۹۸۵

۱۰- اسلام میں عورت کا درجہ اور اس کے حقوق وفرائض، جامعۃ المومنات الاسلامیہ، لکھنؤ، ۳۲۸/۲۰۰۱

۱۱- اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل وحفاظت میں حدیث کا کردار، مجلس تحقیقات و

نشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۱/ ۴۸

۱۲- انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۷/ ۷۸

۱۳- انسانیت کے محسن اعظم اور شریف و متمدن دنیا کا اخلاقی فرض، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۹/ ۳۲

۱۴- تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۷۹/ ۱۷۴

۱۵- دستور حیات، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۳/ ۲۴۰

اسلامی سیاست پر تحریریں

سیاسیات پر آپ نے بہت محتاط رویہ اختیار کیا ہے، کہتے ہیں کہ میں میدان سیاست کا کوئی شہسوار نہیں، مذہب و تاریخ، اور اخلاقیات و لٹریچر کا آدمی ہوں۔[1] تاہم اسلامی سیاسیات کا مطالعہ آپ نے مورخانہ طور پر کرنے کی کوشش کی۔ اسلامی تاریخ میں بیمار سیاست کے نقصانات و انحرافات کا عالمانہ جائزہ آپ نے اپنی رجحان ساز کتاب 'ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین' اور اس کا ترجمہ بقلم خود ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر'' میں لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ حکومت الٰہیہ یا اقامت دین کے موضوع پر آپ نے اپنی تحقیقی کتاب سیرت سید احمد شہید میں بھرپور کلام کیا ہے، البتہ یہ سیاسی و دینی بحث تاریخی تجزیے سے آگے نہیں بڑھ سکی، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا ندوی نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز تحریک جہاد کے بانی کی سوانح نگاری ہی سے کیا تھا۔ اس کتاب کے مقدمہ میں آپ نے سید احمد شہیدؒ سے اپنے روحانی اور نسبی رشتے کے ثبوت پر بے انتہا فخر و مسرت کا اظہار کیا ہے۔ حکومت الٰہیہ کے قیام کی جدو جہد کی ضرورت کی حمایت آپ نے جس شدومد کے ساتھ کی، بعد کی تحریروں میں اس عنوان سے اعراض اور اغماض کا اشارہ ملتا ہے۔

اگر چہ سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریریں اسلامی تہذیب وتمدن کی مُعرِّف اور مُفسِّر ہیں۔ تاہم ان کے اندر اسلامی سیاسیات کے عناصر، مبادیات و امتیازات، مسلم سیاست کی تاریخ، عروج وزوال، اثرات ونتائج پر محققانہ بحثیں ملتی ہیں، کہیں کہیں یہ موضوعات تہذیب وتمدن کے جلو میں فروکش نظر آتے ہیں۔ خالص سیاسی مباحث کو ذیل کی کتابوں میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

۱- انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مکتبہ اسلام گوئن روڈ، لکھنؤ، بدون تاریخ / ۴۳۱

۲- سیرت سید احمد شہید، (۲ جلدیں) جلد اول، طبع سوم، ۱۹۴۸، ص ۲۸۸، جلد دوم، طبع سوم ۱۹۷۷/ ۵۸۸

۳- عرب قوم پرستی اسلامی نقطۂ نظر سے خطرناک کیوں؟ ۱۹۶۴/ ۴۸

۴- عالم عربی کا المیہ، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۳۹۰ھ/ ۲۰۸

۵- نیا طوفان اور اس کا مقابلہ، بدون تاریخ و مطبع، / ۴۰

۶- ملک و معاشرہ انتہائی خطرناک موڑ پر، تحریک پیام انسانیت، لکھنؤ، ۱۹۸۶/ ۳۲

۷- ملک کی نازک صورت حال اور محبان وطن کی ذمہ داری، حلقہ پیام انسانیت، لکھنؤ، ۱۹۸۸/ ۲۴

۸- حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب امیدوں اور اندیشوں کے درمیان، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۷۷/ ۱۱۱

۹- مسلمان اور ہندوستانی یوراج ایک اصولی بحث، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۶۱/ ۱۵

۱۰- ملک کی آزادی کا صحیح مطلب اور فائدہ، تحریک پیام انسانیت، لکھنؤ، ۱۹۹۳/ ۱۶

۱۱- مسلمانان ہند کے لیے صحیح لائحہ عمل، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۷/ ۳۲

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تحریروں کا ایک معتد بہ حصہ وہ ہے جس میں تہذیب

اور سیاست دونوں کو یکجا طور پر پیش کیا گیا ہے۔اس ضمن کی نمائندہ تحریریں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

۱- مسلمانان ہند سے صاف صاف باتیں، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۹۱/۵۶

۲- مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۷۳/۱۸۷

۳- حالات کا نیا رخ اور علماء کی ذمہ داری، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۲/۱۶

۴- فسادات اور ہندوستانی مسلمان، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۹۱/۱۶

۵- دریائے کابل سے دریائے یرموک تک، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، باراول ۱۹۷۴/۳۰۴

۶- دو ہفتے مغرب اقصیٰ (مراکش) میں، مکتبہ فردوس، لکھنؤ، ۱۹۷۶/ ۱۲۷

۷- مشرق اوسط کی ڈائری، مکتبہ فردوس، لکھنؤ، ۱۹۷۷/۴۶۰

۸- دو ہفتے ترکی میں، مکتبہ اسلام، لکھنؤ، ۱۹۵۶/ ۱۱۶

۹- پرانے چراغ، مکتبہ فردوس، لکھنؤ، ۱۹۷۵/۴۶۴

۱۰- دینی عربی مدارس کا تعلیمی، تربیتی اور وطنی کردار، شعبہ نشر واشاعت ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۱۹۹۵/۲۰

۱۱- تحفہ دکن، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۳/۸۴

۱۲- تحفہ کشمیر، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۴/۱۵۴

سیاسی وتہذیبی افکار پر مبنی ندوی تحریروں کی درجہ بندی میں اختلاف کی پوری گنجائش ہے تاہم تقریب فہم کے لیے مقالہ نگار نے انہیں مذکورہ تین درجوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کتب ورسائل کے علاوہ بعض تحریریں خالص تاریخیت کے

لیے وقف ہیں جن میں نمایاں طور پر تاریخ دعوت وعزیمت کی پانچ جلدوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہ کتاب بھی تاریخ وتمدن کی بے شمار لطافتوں سے بھی قاری کو لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ یا بعض تحریریں فکر اسلامی کے کسی مخصوص جزیے سے بحث کرتی ہیں مثلاً قادیانیت: ایک مطالعہ (۱۹۵۹/ ۲۲۸) یا ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح بعض معاصر تحریکوں اور تحریروں کے آئینہ میں : ایک جائزہ اور تبصرہ (۱۹۷۸/۱۱۲) وغیرہ۔ موخرالذکر کے ذریعہ تہذیب وسیاست کے مخصوص نظریے اور تعبیر کی عکاسی ہوتی ہے، اس کتاب نے شیخ ندوی کی تصنیفی عروج کا تعارف کرانے والی پہلی کتاب: سیرت سید احمد شہید کے ساتھ نہ صرف یہ کہ انصاف نہیں کیا بلکہ شیخ ندوی نے اپنی مجاہدانہ زندگی میں پیام انسانیت کے جن تطبیقی اعمال کا اظہار کیا، اس سے کسی طرح بھی اس کتابچے کی مناسبت ظاہر نہیں کی جاسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا ندوی اپنی تحریروں میں مادیت، جاہلیت اور رسم ورواج کی اندھی تقلید کے خلاف نبرد آزمار ہے اور انتہائی موزونیت کے ساتھ اپنے اختلاف کو درج کراتے رہے، لیکن مذکورہ کتابچے میں، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (م۱۹۷۹ء) کی شاہکار تصنیف: قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں (جو ان کی فکری اساس کی ترجمان ہے) پر جو کلامی نقطہ نظر مولانا ندویؒ نے اپنایا ہے، وہ ان کی تحریروں سے مغائر اور مزاج سے غیر ہم آہنگ بھی ہے۔ مولانا نے اس کتاب پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ حکومت کا قیام اور سیاست میں شمولیت کا ر دین نہیں ہے۔ راقم سطور کو اس کی علمیت کے باوصف یہ اختلاف خواہ مخواہ کی کج بحثی اور حرف ومعنی کا متکلمانہ انداز معلوم ہوتا ہے۔[۲]

تہذیب وتمدن کا تعارف

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تہذیبی وسیاسی تعبیرات قرآن وسنت اور اسوۂ صحابہ سے پوری طرح ماخوذ ومربوط ہیں۔ آپ کی اسلامی تعبیرات کی تشکیل میں والدین ماجدین، خاندانی اشراف وفضلاء کے علاوہ ان کے اساتذہ کی تربیت کا خصوصی حصہ ہے۔

مولانا نے درجنوں کتابوں کو اپنی علمی شناخت کا اتالیق قرار دیا ہے جو مختلف صوبوں کے اکابرین علم وفضل کا تعاریف پیش کرتے ہیں۔[۳۳] دوسری طرف انھیں عالم اسلام کو بار بار بہت قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع نصیب ہوا، خود ہندوستان کے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ علمی نشستوں کا غالباً فیض تھا کہ ان کی تعبیرات میں بالعموم غیر جانب دارانہ، منصفانہ، داعیانہ اور ناصحانہ انداز تکلم نظر آتا ہے۔ ان اسالیب سے کام لے کر مولانا نے تہذیب وسیاست کی شارحانہ خدمت انجام دی ہے۔

اسلامی تہذیب وتمدن پر لکھنے اور سیاسی صورت حال پر غور وفکر کا داعیہ مولانا کے اندر ۱۹۳۷ ہی سے موجزن ہو چکا تھا اور ۱۹۳۹ میں اپنی رجحان ساز تصنیف سیرت سید احمد شہید کو دنیا کے سامنے پیش کر کے اسلامی تہذیب کے انقلابی پہلو کو آپ نے اپنا اختصاص قرار دیا۔ جس کا اظہار انھوں نے ایک موقع پر ان الفاظ میں کیا:

> میری تمام تحریریں، میری حقیر کاوشیں اور کوششیں سب اسی ورثے کی حفاظت، اس کی تبلیغ واشاعت اور اس کی بازیافت میں صرف ہوتی ہیں۔[۳۴]

اس کے بعد اگست ۱۹۴۳ء میں انھوں نے ۸۶ صفحات کے اندر ''مذہب و تمدن'' نامی کتاب جید پریس دہلی سے شائع کی جو دراصل اپنے موضوع پر جدید علم کلام کی شاہکار ہے۔ اس کتاب کے اندر مذہب، فلسفہ اور تمدن کے مشترک سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں۔ مثلاً کائنات کی حقیقت اور دوسری دنیا کے وقوع کا امکان، اس کائنات کا محکم نظم ونسق، عظیم ہستی اور اس سے انسانوں کے تعلق کی نوعیت، طبعی قوانین، اخلاقی قانون کی ضرورت، انسان خود مختار یا ماتحت، انسانی کمال کا مفہوم، جیسے مسائل کے حل میں عقلی تمدن، حسّی تمدن اور اشراقی تمدن کی نااہلی ثابت کرتے ہوئے انبیاء کی تعلیمات کو تہذیب وتمدن کی اصلاح کے لیے شاہ کلید قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف لـه الخلق والامر، سلطنت کو اللہ کی امانت اور احساس ذمہ داری جیسے نگینوں کو الہامی تمدن کے عناصر ترکیبی قرار دیتے ہیں۔ تحریر کرتے ہیں:

> ''اشراقی فلسفہ اور نظام کے برخلاف اسلامی تہذیب میں ترک دنیا،

ترک علائق، صحرا نشینی، اور رہبانیت کے عناصر نہیں ہیں۔ خودکشی حرام، خودآزادی، جسمانی تعذیب ناجائز، تجردو ترک ازدواج غیر مستحسن فعل، دائمی خلوت گزینی ناپسندیدہ عمل، غیر فطری ریاضتیں اور نفس کشی، عبادت وزہد میں بے اعتدالی سب خلاف تعلیمات ہیں۔ عقلی تمدن کے برخلاف اس میں (اسلامی تہذیب) اخلاق واجتماع کے بارہ میں چند ثابت شدہ اور مسلم حقائق کی چند غیر متزلزل بنیادیں ہیں اور خیر وشر کے کچھ دائمی معیار ہیں جس میں کسی عقلی ترقی یا تنزل سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ جو چیز بری ہے وہ قیامت تک بری رہے گی۔ جو چیز اچھی ہے وہ ہر زمانہ میں اچھی ہے۔ ...... یہاں خیر وشر کا معیار خود ان اشیاء کی فطرت ہے جس کی وضاحت اور حفاظت کرنے والی چیز وحی و رسالت ہے۔ عقلی تمدن وفلسفہ کے دوران اگر قوم اور سوسائٹی پر سوفسطائیت طاری ہو جاتی ہے۔ حقائق اشیاء کا اور اخلاق وصفات کے باہمی فرق کا انکار کیا جانے لگتا ہے۔'' ۵

تہذیب وتمدن کے بارے میں اپنی عربی تصنیف الاسلام و اثرہ فی الحضارۃ وفضلہ علی الانسانیۃ میں رقم طراز ہیں:

''اس کی معنوی وسعت عقائد سے اخلاق و اعمال تک اور انفرادی و اجتماعی زندگی سے سیاست وقانون تک اور بین الاقوامی تک اور فکری و عملی و اخلاقی اصلاحات وترقیات سے لے کر فن تعمیر، شعر وادب اور ذوق لطیف تک محیط و بسیط ہے۔ اس کے ساتھ یہ وسعت و مسافت بہت پہلو دار واقع ہوئی ہے۔ ......تہذیب کی سب سے اعلیٰ قدر توحید ہے، اسلامی تہذیب وتمدن میں مساوات نے اسلام کی اشاعت میں تاریخی کردار ادا کیا۔ ٦

پرانی تہذیب کی نارسائیوں کی بابت فرماتے ہیں کہ یہ ہمیں سلا ہوا لباس دیتی

ہیں۔ دو ہزار برس قبل مسیح یا چار سو برس بعد مسیح کا لباس بیسویں صدی عیسوی کے جسم پر کس طرح راس آ سکتا ہے۔ مذہب ہمیں لباس کے اصول و حدود عطا کرتا ہے اور زندگی کے اشیاء خام سے ہمیں سامان تیار کرنے کے اخلاقی ضوابط بخشتا ہے ...... قدیم تہذیبیں انسانوں کو چھوٹے چھوٹے دائروں میں تقسیم کرتی ہیں۔ ملکوں، قوموں، صوبوں کے درمیان رسوم و رواج کی دیواریں ہیں ...... قدیم تہذیبیں قومی عروج کے لیے ناانصافی، تنگ نظری اور ظلم سکھاتی ہیں جب کہ تہذیب اسلامی کی تعلیم یہ ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاء بِالْقِسْطِ" (المائدہ:۸)

(اے لوگوں جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔) [۷]

تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات کی بابت مولانا کہتے ہیں کہ اسلامی تہذیب ناامیدی و بدفالی کے مقابلہ میں حوصلہ مندی اور خوداعتمادی عطا کرتی ہے۔ گناہ کو عارضی و خارجی بتاتی ہے۔ خیر پسندی اور سلامت روی کو فطری و داخلی کہتی ہے۔ تمام علمی اکائیوں کے درمیان ایک وحدت اور اتصال کی فضا پیدا کرتی ہے جو تمدن و سیاست کی عملی خدمت کا ذریعہ بنتی ہے۔ [۸]

مسلم تہذیب کا دفاع اور ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے احیا کی خواہش و کوشش

اس میں شک نہیں کہ اپنے مورخانہ تجزیوں میں مولانا ندوی نے عہد وسطی کی مسلم تہذیب کی بعض کمزوریوں کا انکشاف کیا ہے جو ان کے زوال کا سبب بنیں تاہم کسی بھی لمحہ اسلامی تہذیب کو ناقابل التفات قرار نہیں دیتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلم اقلیت کو فعال کردار ادا کرنے کی بار بار نصیحت کرتے ہیں۔ متعدد مشترک اجتماعات میں اشتراکیت اور نیشنلزم کی ناکامیوں اور ہندوستانی تہذیب کی نارسائیوں پر مدلل گفتگو کرنے کے بعد اسلامی تہذیب کو آزمانے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس ضمن میں آپ کے

مشہور رسالہ: ''مسلمان اور ہندوستانی پوروج'' میں ایک اصولی بحث اور علمی معروضیت دیکھنے کو ملتی ہے، اس کتابچے میں سمپورنانند جی کی زہر افشانیوں کا جواب انتہائی ٹھہرے ہوئے انداز میں، عالمانہ متانت، مورخانہ شان اور ایک فکر مند داعی کے اسلوب میں دینے کی کوشش کی ہے۔ سمپورنانند جی کے اس مفروضے کہ ۹۹ فیصدی ہندوستانی مسلمان اپنے ہندو اجداد کی اولاد ہیں، پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تاریخ کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ ہندی الاصل مسلمانوں کی زیادہ بڑی تعداد ہندوستان کی ان قدیم اقوام سے نسلی تعلق رکھتی ہے جو آریوں کے ورود ہندوستان سے پہلے اس ملک کے اصل باشندہ اور یہاں کے حکمراں تھے ...... درحقیقت ہندوستان کی تہذیب اس آرین نسل اور اس کے گنے چنے بااثر افراد کے ساتھ جو مخصوص دور و تہذیب کے نمائندہ تھے اور جن سے ہندوستان کے قدیم باشندوں کو سخت شکایات ہیں، محدود کر لینا تاریخ کے ساتھ سخت ناانصافی اور بڑی کوتاہ نظری ہے ...... جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے کسی قدیم نسل پر فخر کرنا اور اس کی طرف انتساب کی عملاً کوئی ضرورت نہیں اور موجودہ مسلمانوں کو ہندوستان کی خدمت اور تعمیر و ترقی کا فرض انجام دینا۔[9]

ہندوستان پر اسلامی تہذیب و تمدن کے اثرات و احسانات کے ضمن میں نہ صرف مولانا متعدد تحریروں میں اپنے احساسات کا ذکر فرماتے ہیں بلکہ جواہر لال نہرو، پانیکر، ڈاکٹر تاراچند اور سروجنی نائیڈو کے اعترافات کو بھی نقل کرتے ہیں۔ دوسری طرف عالم انسانیت پر اسلامی تہذیب کے اثرات کے اعتراف میں پروفیسر گب اور فلسفی مورخ گائن بی کے طویل اقتباسات کا ترجمہ پیش کرتے ہیں، جو معروضی مطالعہ کے لیے قیمتی مواد اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں انسانی وحدت و عظمت، عورت کی عرفی حیثیت کی بحالی اور اس کے حقوق کی بازیافت جیسے مسائل میں اسلامی تہذیب کی عظمت کا اعتراف اور بدھ دھرم، چینی تہذیب، اور ہندو دھرم میں عورت کی حالت زار پر نوحہ کرتے ہیں۔[10]

ہندوستان میں وحدت ادیان کے پروپیگنڈہ کی حقیقت سے مسلمانوں کو آگاہ کرتے ہیں اور اسلام مکمل دین ۔ مستقل تہذیب، نامی کتاب میں جو دراصل دارالعلوم دیوبند کے طلبہ و اساتذہ کے سامنے کی گئی تقریر ہے، میں ہندوستان کی زرخیز مٹی: مسلمانوں کی ذہانت، اولوالعزمی اور حوصلہ مندی کے گیت گاتے ہیں، جوان مسلمانوں نے اپنی بے نظیر عالمی شاہ کار تحریروں کے ذریعہ یہاں کے کتب خانوں کو زینت بخشنے میں ظاہر کی ہیں۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا اتنی آسانی کے ساتھ اس وسیع ملک کو مغربی تحویل اور اس کے علم برداروں کے چارج میں دے دیا جائے۔ یہی سوال تھا جو مولانا محمد قاسمؒ کے سامنے ایک مسئلہ بن کر کھڑا ہو گیا اور انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے اس جملے اینقص الدین وانا حی (کیا میرے جیتے جی اسلام مردہ ہو جائے گا) کے مصداق حقیقی ترجمانی کی۔[11]

ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے احیاء کا اظہار مولانا نے ہر موقع پر کیا ہے۔ ۱۸؍ مارچ ۱۹۸۷ء میں جامعہ اسلامیہ، حیدرآباد میں اپنے خواب کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجدد الف ثانی اورنگ زیب عالمگیر کی دینی و سیاسی خدمات، حکیم الامت شاہ ولی اللہ کی مجتہدانہ قابلیت اور مجددانہ عزیمت اور شہیدین جلیلین کی حمیت و عزیمت نے مسلمانوں کو نئے خطرات، اندیشوں اور چیلنجوں کا سامنا کرنا سکھایا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ”ہم یہاں (ہندوستان) میں اقلیت میں ضرور ہیں لیکن وہ اقلیت اتنی بڑی ہے کہ اکثریت کے بعد اس کا دوسرا نمبر ہے اور اس کو اقلیت کہنا بھی صحیح نہیں ہے بلکہ اس کو ملت کہنا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ یہ ملک جمہوری ہے اس ملک کی سیاست میں ہمارا حصہ ہے اس کی قانون سازی میں ہمارا حصہ ہے ہمارے لیے پورا موقع ہے کہ اس ملک کی انتظامیہ کو نہ صرف یہ کہ متاثر کریں بلکہ اس کو نئی شکل دینے اور ملک کو بہتر سے بہتر انتظامیہ مہیا کرنے میں مدد و معاون بلکہ بعض اوقات فیصلہ

کن ثابت ہوں۔ ہم پاسنگ کا بھی کام کر سکتے ہیں اور اس ملک میں قانون سازی کو ہم نظر انداز کر کے رہ نہیں سکتے ...... یہاں کی پارٹی مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی ...... یہ بڑی اقلیت ملک کا رخ تبدیل کر سکتی ہے ... یہ اقلیت صاحب اقتدار جماعت کو اپنی ضرورت و افادیت تسلیم کرنے پر مجبور کر سکتی ہے ... ہندوستان کی اس بڑی اقلیت (پندرہ کروڑ، ۱۹۷۸ء میں) نے ماضی میں آٹھ سو برس کامیاب حکومت کی، اسے بنایا سنوارا، سیاسی وحدت پیدا کی، صحت مند انتظامیہ اور وسیع مرکزی حکومت عطا کی''۔[۱۲]

ہندوستان میں بہتر تبدیلی کے لیے اسلامی تہذیب کو اپنا کردار ادا کرنے کے لیے ہمیشہ مسلمانوں کو ماضی سے سبق لینے اور مستقبل میں کردار ادا کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، ہندوستان کے نازک ترین دور میں طلبہ کے اندر تیزی سے پھیلنے والے الحاد و تشکیک کا حقیقت پسندانہ جائزہ اور وسیع تیاری کے لیے فضا ہموار کرتے ہیں، اخلاق باختہ قیادت کی جگہ اور مغربی فلسفہ سے واقف کرانے کے لیے نئی قیادت کی ضرورت پر ان الفاظ میں تشویق فرماتے ہیں:

اس وقت زمانہ کو ان مردان کار کی ضرورت ہے جو اس نئے دور کو ایک نئی فکری قیادت، ایک نیا دینی اعتماد اور ایک نئی روحانی و اخلاقی قوت عطا کر سکیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بڑا خطرہ ہے اور اس ملک کے لیے بھی۔ آج زمین ہمارے پاؤں سے نکلتی جا رہی ہے۔[۱۳]

ہندوستان کو ''ایک پیام کی ضرورت'' کے زیر عنوان کہتے ہیں:

''آج ہندوستان کو ایک پیام کی ضرورت ہے۔ ہندوستان دنیا کو کیا دے؟ اشتراکیت! کمیونزم! یا ماضی کی کوئی تہذیب! اشتراکیت کا پورا تجربہ ہندوستان سے باہر ہو چکا ہے۔ ہندوستان اس معاشی فلسفے میں دوسروں کا شاگرد بن سکتا ہے استاد نہیں۔ رہا ہندوستان کا کوئی فلسفہ یا

اس کی قدیم تہذیب تو اس میں دنیا کے لیے کوئی کشش (Charm)
نہیں ہے''۔[۱۴]

''لسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق'' کے عنوان سے ۲۳/مئی ۱۹۷۲ء میں امجدیہ ہال زکریا اسٹریٹ کلکتہ کے مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے تحت خطاب میں عربوں اور ترکوں کی لسانی عصبیت، ہندوستان میں ترکوں، ایرانیوں اور مغلوں کے ذریعہ سیکنڈ ہینڈ اسلام کے ابلاغ کے نقصانات کی وضاحت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

> ''کسی زبان کا اسلامی روح سے محروم رہنا اور جاہلی تصورات کا غلام ہونا خطرہ ہے ... عربوں کی فریب خوردگی عربی زبان کا جنون ہے ...... زبانیں باعث زحمت ہوسکتی ہیں اگر یہ اسلامی روح سے خالی ہوجائیں''۔[۱۵]

پیام انسانیت کے ذریعہ تہذیب اسلامی کے احیاء کی کوششیں

وحدت بنی آدم کا قیام اور احترام انسانیت کی تفہیم مولانا کی وہ جدو جہد تھی جس نے انہیں مقبول قائدین کی صف میں لا کھڑا کردیا۔ مولانا نے اپنی شعوری زندگی کے ہر لمحہ میں اسلامی شعار و تعلیمات کو ملک ہندوستان کے لیے نعمت غیر مترقبہ قرار دیا ہے۔ ملک کی حفاظت کو مسلمانوں پر لازم و واجب قرار دیتے ہیں۔ تاریخ کے حوالہ سے تحریک شہیدین کو ملک عزیز کی سالمیت اور انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے نکالنے کا سب سے بڑا مشن قرار دیتے ہیں۔[۱۶]

حلقہ پیام انسانیت کے تحت ایک مشترک اجتماع منعقدہ ۲۹/دسمبر ۱۹۸۸ء میں تقریر کے دوران ملک کی حفاظت کے لیے ہر انسان کے دو گھر (ذاتی اور ملکی) کی بدیہی حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں۔ اور صرف اپنے گھر کی فکر اور ملک سے اغماض برتنے کی تباہیوں کو سورہ الانفال کی آیت ۲۵ سے دلیل فراہم کرتے ہوئے۔ فرماتے ہیں:

جب فساد کی یہ آندھی چلی تو رومن امپائر بھی جو اپنے رومن لاء، اپنے نظم ونسق، اپنی وسیع فتوحات، شاندار نو آبادیوں، ترقی یافتہ تہذیب اور بلند معیار زندگی کی بنا پر دنیا میں ضرب المثل تھا، اس سب کے باوجود خالق کائنات کے مقرر کردہ ترقی و زوال اور موت و حیات کے ازلی و ابدی قانون سے نہیں بچ سکا۔ (سورۃ القصص، آیت ۵۸ کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں)۔ ۱۷

ایک جگہ فرماتے ہیں:

آخر میں صفائی سے کہتا ہوں کہ ملک سو گیا ہے مرا نہیں ہے، سویا ہوا شخص جگایا جاسکتا ہے، مرا ہوا ایک بار بھی زندہ نہیں ہوسکتا...... ہماری پیام انسانیت کی یہ تحریک نقار خانہ میں طوطی کی آواز کہی جاسکتی ہے لیکن اگر طوطی کو کسی نے بھی نہیں سنا جب بھی وہ کم از کم خدا کے سامنے گواہی دے گا کہ...... آواز لگائی لیکن طوطی کی آواز سنی جاتی ہے...... طوطی کی نحیف آواز سے تاریخ بھری ہوئی ہے...... طوطی کی آواز کو کبھی بہروں نے بھی سنا ہے اور نقار خانوں نے بھی اس کی رسید دی ہے اور وہ آواز کلیتاً صدا بصحرا نہیں ثابت ہوئی۔ ۱۸

ایک مشترکہ اجلاس میں اسلام کی دعوت کی پیشکش کا خوبصورت انداز ملاحظہ کریں:

ہندوستان کی قدیم تہذیب اور فلسفہ پر ہم کتنا ہی ناز کریں لیکن دنیا کو اس فلسفہ کی گہرائی پر قائل نہیں کر سکتے ...... اس طرح ہندوستانی قومیت یا نیشنلزم میں بھی دنیا کے لیے کوئی کشش نہیں، دنیا میں سینکڑوں ہزاروں قومیں ہیں، سب کو اپنی قومیت عزیز ہے، یہ دعوت کی چیز نہیں بن سکتی، ہاں اگر ہمارے پاس ایسا پیام ہو جو انسان کو انسان کی غلامی سے نکالے، نفس و شیطان، دولت و قوت سب کی بندگی سے آزاد کرے، جو نسل انسانی کی شرف اور عزت کو زندہ کرے اور انسان کی معیت اور خدمت کو عبادت قرار دے، جس کی نظر میں تمام انسان برابر ہوں اور ایک ہی ذات (خدا کی ذات) طاقت کا سرچشمہ اور حقیقی حکمرانی کے مقام پر ہو۔ یہ دعوت الا للہ الدین الخالص، ہندوستان اپنا سکتا ہے اور دنیا کی قوموں میں ایک باوقار اور امتیازی مقام حاصل کرسکتا ہے"۔ ۱۹

پیام انسانیت کے پلیٹ فارم سے کی گئی تقریریں بعد میں مولانا کے ذریعہ حذف واضافہ کے بعد شائع ہوچکی ہیں۔ان کے عنوانات کی ایک جھلکی یہاں قارئین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے:

۱- اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔
۲- ملک کا خطرناک رخ اور دانشور طبقہ کی ذمہ داریاں۔
۳- دنیا میں آنے والے انسان چمن کے پھول یا کانٹے۔
۴- لسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق۔
۵- مسلمانان ہند سے صاف صاف باتیں۔
۶- دو انسانی چہرے قرآنی مرقع میں۔
۷- مسلمانوں کے مسائل و جذبات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔
۸- ملک و معاشرہ انتہائی خطرناک موڑ پر ہے اور اس کی جلد خبر لینے اور فکر کرنے کی ضرورت ہے۔
۹- جب پڑھے لکھے لوگوں پر ہسٹیریا کا دورہ پڑتا ہے۔
۱۰- مسلمانان ہند کے لیے صحیح راہ عمل۔

اسلام کی رہنمائی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سیاسی بصیرت

اگر چہ مولانا موصوف سیاست کے میدان کے شہسوار نہ تھے جیسا کہ خود انھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔تاہم ہندوستانی تاریخ کی گواہی ہے کہ انھوں نے یہاں کے جمہوری نظام میں خوشگوار تبدیلی کا بار بار اظہار کیا،مسلم اقلیت کو جمہوری نظام میں شراکت داری کا مشورہ دیا،سیاست میں مسلمانوں کی حصہ داری پر گفتگو کی،اپنے ووٹوں کے ذریعہ یہاں کی انتظامیہ میں تبدیلی اور جمہوری پارٹیوں کے فطری میلان سے فائدہ اٹھانے پر زور دیا۔[۲۰]

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں اپنے بارے میں صراحت کے ساتھ بتا دینا چاہتا ہوں کہ زندگی کے کسی لمحہ اور کسی وقفے میں بھی ان لوگوں میں نہیں رہا ہوں جو دین و سیاست کی تفریق کے قائل ہیں، نہ ہی ان لوگوں میں ہوں جو دین کی ایسی تعبیر کرتے ہیں جس سے وہ زندگی کے ہر نظام اور حالات کے ہر سانچے میں (خواہ وہ اسلام سے کتنا ہی ہٹا ہوا ہو) فٹ ہو جائے اور ہر رنگ کی سوسائٹی میں جڑ جائے اور نہ میرا تعلق کبھی اس گروہ سے رہا ہے جو سیاست کو قرآن کے شجرہ ملعونہ الشجرة الملعونة في القرآن۔ کے مصداق سمجھتا ہے۔ میں ان لوگوں کی اگلی صف میں ہوں جو مسلمان قوموں میں صحیح سیاسی شعور کے داعی ہیں اور ہر اسلامی ملک میں صالح قیادت کو بروئے کار دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں ان لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ دینی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا جب تک دین کو اقتدار حاصل نہ ہو، اور حکومت کا نظام اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہو، میں اس کا داعی ہوں اور زندگی کے آخری سانس تک رہوں گا''۔[۲۱]

شاہ بانو کیس (۱۹۸۶ء) کے بعد مسلمانوں کے اندر ملی اتحاد کے ابھرنے کو نیک فال تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مسلمان اگر مسلم پرسنل لا (شرعی عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کریں تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے۔ کیوں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت و تہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر و محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان رہیں گے گھر میں نہیں۔ اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اپنے عائلی و خاندانی روابط و تعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں۔ اس لیے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت، نظام تمدن، عائلی قانون مسلط کیا جائے۔ ہم اس کو دعوت ارتداد سمجھتے

ہیں، ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔ یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے اور ہندوستان کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی اہمیت کا اقرار کرتا ہے۔[۲۲]

مولانا ندوی کی سیاسی بصیرت کا اندازہ ان کی کتاب 'نیا طوفان اور اس کا مقابلہ' کو پڑھ کر قاری کو بخوبی ہوتا ہے۔ وہ پوری امت مسلمہ کو ذہنی وفکری اور عملی ارتداد سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہاں پر اس کے چند ذیلی عناوین قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں: مثلاً نیا ارتداد، جاہلی عصبیت اور مذہب وقوم پرستی، اسلام اس عصبیت سے کیوں برسرِ جنگ ہے؟، ممالک اسلامیہ میں قوم پرستی کی معنویت، ممالک اسلامیہ میں دور جاہلیت کا ازالہ، بے غرض داعیوں کی ضرورت وغیرہ۔

مولانا نے ہندوستان کی آزادی کے دورخے پن کو واضح کیا کہ ایک فرقہ لسانی، تہذیبی اور معاشی ہر سطح پر فائدہ اٹھا رہا ہے جب کہ دوسرا فرقہ جنھوں نے ملک کی آزادی میں قائدانہ وسرفروشانہ حصہ لیا، اپنے دین و مذہب، تہذیب وثقافت، زبان ورسم الخط اور عائلی قانون میں دشواریوں اور ثقافتی نسل کشی (Cultural genocide) کا سامنا کررہی ہو، ملک کی آزادی کے مفہوم ومعنی اور مطالب کے خلاف ہے اور اس پر فخر واعتماد نہیں کیا جاسکتا۔[۲۳] اپنے اس مقالے میں مومنانہ جرأت کے ساتھ ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد کے حالات پر سیاسی بصیرت اور جرأت مندی سے آپ نے چبھتے ہوئے سوالات قائم کیے۔ اس طرح ایمرجنسی کے زمانہ (۱۹۷۷ء) میں اندرا گاندھی سے ملاقات کرکے حکومت کے ڈبل اسٹینڈرڈ رویے کا برملا اظہار کیا جس کا جواب اندرا گاندھی کے پاس نہیں تھا۔ ہندوستان کے نظام کو ہندو دیومالائی تصورات سے بوجھل کرنے، ثقافتی اور تعلیمی طور پر ایک مخصوص نقطۂ نظر کا سب کو پابند بنانے کو انھوں نے ہندوستان کی سالمیت کے لیے خطرہ قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس طریقے سے اس ملک کا اپنے ماضی سے رابطہ بالکل ختم ہوجائے گا۔[۲۴]

ہندوستانی سماج کی بہتر تشکیل میں مانع تین خطرات کا ذکر اس طرح کرتے

ہیں: اس ملک کے لیے اولین اور اہم ترین خطرہ یہ ہے کہ یہاں انسان کی صحیح قدر و قیمت اور انسانی شرافت و عزت کا پورا احساس نہیں ہے ...... انسانی جان کا بے قیمت ہو جانا تہذیب و تمدن اور انسانیت کے مستقبل کے لیے پیام موت ہے۔ غارت گر اقوام ہے بہ صورت چنگیز ...... ملک کے لیے دوسرا اعظیم خطرہ جو اس کے سر منڈلا رہا ہے تنگ نظری اور تہذیبی و لسانی اور علاقائی عصبیت ہے۔ یہ عفریت ماضی کی طرح اب بھی موجود ہے...... یہ راکشش الف لیلہ کے افسانوی دیو کی طرح کسی بھی وقت بوتل سے باہر آ سکتا ہے۔... ملک کے لیے تیسرا اہم خطرہ یہ ہے کہ ہمارے ملک پر دولت پیدا کرنے کا ایک ایسا بھوت سوار ہو گیا ہے جس نے ملک کے اقتصادی نظام کو درہم برہم کر دیا ہے ...... اس مرض کا شکار شہر، قصبات اور دیہات ہیں۔ ان خطرات کا علاج صرف خدا کا خوف ہے، آخرت کی باز پرس کا خطرہ، ایک ایسی ذات کا تصور جو دانا و بینا ہے اور ہر چیز کو دیکھ رہی ہے۔[۲۵]

سیاسی و فکری بصیرت کا ایک اور نمونہ دیکھیے:

۸ر فروری ۱۹۹۳ء میں دس اور پندرہ ہزار افراد کے مشترکہ اجلاس میں فرماتے ہیں کہ رائے بریلی کو ہندوستان کی آزادی میں کلیدی مقام حاصل ہے کیونکہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں بقول سر ولیم ہنٹر تحریک جہاد (سید احمد شہید) کی بجھی ہوئی چنگاریاں کام کر رہی تھیں۔[۲۶]

مولانا نے پوری شعوری زندگی میں اتحاد و اتفاق کی فضا کو پروان چڑھانے کی دانستہ کوششیں کی ہیں۔ مدارس، جامعات، یونیورسٹیز کے علاوہ مختلف دینی، سیاسی، علمی و فکری اکادمیوں میں جا کر کلیدی خطبات پیش کیے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ، مجلس مشاورت، امارت شرعیہ، دینی تعلیمی کونسل، پیغام انسانیت وغیرہ میں کلیدی عہدوں پر فائز رہ کر آپ نے جو خطبات پیش کیے وہ سیاسی دلچسپی کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ عرب و عجم کے متعدد اسفار میں بین الاقوامی سطح پر امت مسلمہ کے اتحاد کی نہ صرف خواہش کا اظہار کرتے ہیں بلکہ اختلافات، زوال اور ذلت و نکبت کے اسباب کو عالمانہ شان اور مؤرخانہ تجزیوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں، آپ نے شیخ احمد سرہندی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شہیدین

اور اقبال کے افکار کے ذریعہ مسلمانوں کے فکری شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔

خلاصہ بحث

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی تحریروں اور عملی جدوجہد کے ذریعہ امت کے اندر جذبہ، امنگ، حرکت اور اجتہاد کی جوت جگانے کی انفرادی و اجتماعی سطح پر کوشش کی۔ آپ نے انبیائی اوصاف سے متصف ہونے اور تہذیبی ارتداد سے خبردار کیا، امت کو جُبن، ناامیدی اور کاہلی کے مقابلہ میں خود کفیل ہونے کی دعوت دی۔ تاہم ایک محقق کو اس کا جواب نہیں ملتا کہ ملت سازی، شیرازہ بندی نیز اجتماعی تربیت کے اسباق وتمرینات کے لیے داعی ندوی نے کونسے واضح خاکے پیش کیے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ محترم نے اسلامی تہذیب وتمدن کا بھرپور تعارف کرایا، لیکن اس تہذیب کو عملاً نافذ کرنے، دنیا کو اس کا نمونہ دکھانے، تہذیب کو مختلف علوم وفنون میں اتارنے کے تعلق سے جن اقدامات کی ضرورت ہے اس کا مکمل خاکہ (Blue Print) یہاں نظر نہیں آتا۔

دوسری طرف ہندوستان اور عالمی سیاست پر آپ نے کلام کیا لیکن سیاست کی نارسائیوں، اسلام کو اس میں نافذ کرنے اور ہندوستان میں مسلم اقلیت کا سیاست میں داخلہ اور اس کے عواقب پر آپ نے برائے نام گفتگو کی ہے۔ امت مسلمہ کے لیے آج کے دور میں سیاسی حصہ داری ایک اہم اور سنجیدہ علمی موضوع ہے جس کے عواقب سے پردہ کشائی ہمیں یہاں نظر نہیں آتی۔ تاہم تہذیب وتمدن اور سیاست وتدبیر پر آپ کے تبصرے اور تجزیے محققین کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم مولانا نے تہذیب وسیاست کی تفہیم وتعبیر کے لیے جو داعیانہ اور مصلحانہ طریقۂ کار اختیار کیا اسے مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ اس موضوع کے تشنہ ابواب کو پایہ تکمیل تک پہنچایا جاسکے اور ہندوستان کے مخصوص سیاسی وتہذیبی پس منظر میں امت مسلمہ کی دنیوی و اخروی نجات وسرخروئی کے لیے مثبت رویہ اختیار کیا جاسکے اور سب سے اہم یہ کہ سیاست میں شرکت اور عدم شرکت کے مسئلہ کی بامعنیٰ تفہیم ہوسکے۔

حواشی ومراجع

۱۔ ابوالحسن علی ندوی، ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، بار چہارم، ۱۹۸۱، ص ۱۹

۲۔ سید ابوالحسن علی ندوی کی تنقید کا تنقیدی جائزہ ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی نے لیا ہے، دیکھیے ان کی کتاب: احیائے دین اور ہندوستانی علماء: نظریاتی تفسیر اور عملی جدو جہد، القلم پبلی کیشنز، اشاعت دوم، دسمبر ۲۰۱۱ء، صفحات ۱۲۹-۱۸۶

۳۔ ان کی شخصی تشکیل کے لیے رجوع فرمائیں، ان کا مقالہ بعنوان: میری علمی اور مطالعاتی زندگی، الندوہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، ۱۹۴۵ء، یہ مضمون بعد میں مولانا محمد عمران خان نے: مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، مطبع معارف، بدون تاریخ، میں طبع کرایا ہے۔

۴۔ سید ابوالحسن علی ندوی، اسلام ایک مکمل دین- مستقل تہذیب، مجلس تحقیقات و نشریات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۱۵ر فروری ۱۹۷۲ء، ص ۲۱

۵۔ سید ابوالحسن علی ندوی، مذہب وتمدن، جید برقی پریس، دہلی، اگست، ۱۹۴۳، ص ص ۱۰۵-۱۰۸

۶۔ سید ابوالحسن علی ندوی، تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۶ء، ص ص ۹-۱۰۔ اس کتاب کو اردو کا قالب شمس تبریز نے عطا کیا۔ مترجم کہتے ہیں کہ مولانا ندوی کی اس کتاب نے عصر حاضر کے مشکلات و مسائل کا حل پیش کیا ہے۔ اسلامی تہذیب کے اثرات واحسانات کے اعتراف کے لیے مترجم نے گستاولی، رابرٹ، ٹائن بی اور سارٹن کے حوالے پیش کیے ہیں۔

۷۔ سید ابوالحسن علی ندوی، مذہب یا تہذیب، مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ص ۶،۱۲

۸۔ سید ابوالحسن علی ندوی، تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات، مجلس تحقیقات

ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۶ء، ص ص ۱۱۵-۱۲۳۔ اس مقام پر مولانا ندوی نے جرمن اسکالرز مثلاً ہیرالڈ ہوفڈ نگ اور مارگولیتھ کے خیالات کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ اسلامی تہذیب نے دنیا کو غور وفکر کی دعوت دی ہے۔

۹۔ سید ابوالحسن علی ندوی، مسلمان اور ہندوستانی پوروج، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، نومبر ۱۹۶۱ء، ص ص ۹، ۱۲، ۱۴

۱۰۔ سید ابوالحسن علی ندوی، تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات، محولہ بالا، ص ص ۳۷-۴۹، ۷۵

۱۱۔ سید ابوالحسن علی ندوی، اسلام مکمل دین- مستقل تہذیب، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۹۲، ص ۱۴

مولانا کی یہی تقریر اس سے قبل عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب کے نام سے جولائی ۱۹۷۷ء میں تیسری بار شائع ہوئی۔ جس کے پیش لفظ بقلم مصنف پر، ۱۰/ دسمبر ۱۹۷۲ء کی تاریخ رقم ہے۔ جس میں بعض ذیلی عناوین کا اضافہ ہے مثلاً زمانہ کے ابوالفضل وفیضی، موجودہ عہد کی عام ضمیر فروشی، نئی قیادت کی ضرورت۔

۱۲۔ سید ابوالحسن علی ندوی، مسلمانان ہند کے لیے صحیح راہ عمل، ان کے منصب و مقام، اسلامی تعلیمات اور واقعات و حقائق کی روشنی میں، طبع اول، ۱۹۸۷ء، ص ص ۹، ۱۰، ۱۷، ۱۹

۱۳۔ سید ابوالحسن علی ندوی، عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب، طلبائے دارالعلوم دیوبند سے خطاب، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، (بار سوم، جولائی ۱۹۷۷ء، ص ۳۸

۱۴۔ سید ابوالحسن علی ندوی، ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، بار چہارم، ۱۹۸۱ء، ص ۳۹، اس مسئلے پر انھوں نے بھرپور تاریخی تجزیہ کر کے جذباتی ہم آہنگی کمیٹی کے چیرمین شری سمپورنا نند کے ایک لکچر جو ۱۰/ دسمبر ۱۹۶۱ء کے نیشنل ہیرالڈ میں شائع ہوا تھا، کا بے باک تجزیہ کیا اور مسلمان اور ہندوستانی پوروج نامی کتابچہ شائع کیا۔ محولہ بالا، کل صفحات ۱۴۔

۱۵۔ سید ابوالحسن علی ندوی، لسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء، ص ص ۹، ۳۰، ۴۱

۱۶۔ ایک مشترکہ اجلاس میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نے تحریک مجاہدین کا یہ کردار ان خطوط کے حوالے سے پیش کیا جو سید احمد شہید نے راجہ ہندو راؤ وزیر گوالیار اور یاست گوالیار کے ایک معتمد اور اعلیٰ عہدے دار غلام حیدر خان کو لکھا تھا اور سر ولیم ہنٹر کا یہ جملہ نوٹ کرتے ہیں: ۱۸۵۷ء کے غدر میں سید صاحب کی تحریک جہاد کی بچی کھچی چنگاریاں کام کر رہی تھیں، دیکھیے سید ابوالحسن علی ندوی، ملک کی آزادی کا صحیح مطلب اور فائدہ، مرکزی دفتر تحریک پیام انسانیت، لکھنؤ و بار اول، ۱۹۹۳ء، ص ص ۸، ۹

۱۷۔ سید ابوالحسن علی ندوی، ملک کی نازک صورت حال اور محبان وطن کی ذمہ داریاں، خطبۂ صدارت برائے اجلاس پیام انسانیت، حیدرآباد، منعقدہ ۲۹ ردسمبر ۱۹۸۸ء، ص۹۔ بعض محفلوں میں حدیث رسول ﷺ کے ذریعہ محبان وطن کو متوجہ کرتے ہیں کہ اگر کشتی کی نچلی منزل والوں کو پانی فراہم کرنے میں اوپری منزل والے تعاون نہیں کریں گے تو نچلی منزل میں پانی کے لیے سوراخ کرنے سے دونوں منزل والے تباہی سے نہیں بچ سکتے۔

۱۸۔ سید ابوالحسن علی ندوی، ملک کی نازک صورت حال اور محبان وطن کی ذمہ داری، حلقہ پیام انسانیت، لکھنؤ، بار اول، دسمبر ۱۹۸۸ء، ص۲۲

۱۹۔ سید ابوالحسن علی ندوی، ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے؟ محولہ بالا، ص۴۰

۲۰۔ ان موضوعات پر تفصیلی نگاہ کے لیے رجوع کریں، وہی مصنف، مسلمانان ہند کے لیے صحیح راہ عمل ان کے منصب و مقام، اسلامی تعلیمات اور واقعات وحقائق کی روشنی میں، محولہ بالا

۲۱۔ سید ابوالحسن علی ندوی، نیا طوفان اور اس کا مقابلہ، تنویر پریس، لکھنؤ و بدون تاریخ،

ص ۳۰۔ یہ مقالہ ردّۃ جدیدۃ (نیا ارتداد) اور دعوۃ جدیدہ (نئی دعوت) کے عنوان سے دمشق کے بین الاقوامی رسالہ المسلمون میں سلسلہ وار دوقسطوں میں چھپا تھا، یہی مضمون ردۃ ولا ابا بکر لہا کے عنوان سے بھی شائع ہوا۔ مولوی عتیق الرحمان سنبھلی، مدیر الفرقان نے اس کا اردو ترجمہ کر کے الفرقان کی فروری اور مارچ ۱۹۵۹ء کی دو اشاعت میں شائع کیا۔

۲۲۔ سید ابوالحسن علی ندوی، خطبہ صدارت، اجلاس ہشتم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، منعقدہ ۱۵-۱۶ دسمبر ۱۹۸۶ء، ص ص ۲۳-۲۴

۲۳۔ سید ابوالحسن علی ندوی، ملک کی آزادی کا صحیح مطلب اور فائدہ، تحریک پیام انسانیت، لکھنؤ، بار اول، ۱۹۹۳ء، ص ص ۸،۹

۲۴۔ سید ابوالحسن علی ندوی، ملک کی آزادی کا صحیح مطلب اور فائدہ، محولہ بالا، ص ۱۶

۲۵۔ سید ابوالحسن علی ندوی، ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے؟ محولہ بالا، ص ص ۱۹، ۲۶، ۳۱، ۳۳

۲۶۔ سید ابوالحسن علی ندوی، ملک کی آزادی کا صحیح مطلب اور فائدہ، تحریک پیام انسانیت، لکھنؤ، بار اول، ۱۹۹۳ء، ص ص ۸-۹

☆☆☆

مادہ پرست مغرب کا جاری سقوط اور امت مسلمہ پر نیا عالمی خاکہ پیش کرنے کی ذمہ داری

کنور محمد یوسف امین*

مادہ پرست مغربی تہذیب کا لازمی سقوط اب شروع ہو چکا ہے۔ اقتصادی کساد بازاری مغرب پر مسلط ہو چکی ہے۔ شخصی، اخلاقی اور خاندانی پستی بہت آگے بڑھ چکی ہے، جس کو مولانا مودودیؒ نے اسلامی اخلاق سے موسوم کیا ہے۔ یعنی خدا پرستی وغیرہ۔ اس سے تہی دامنی تو مغرب کا اصل الاصول ہے۔ چنانچہ جدید مغرب کی شروعات یعنی یورپی نشاۃ ثانیہ کی حقیقت ہی یہ ہے کہ کائنات و حیات کی توجیہ خدا کے حوالے کے بغیر کرنا، لیکن جس کو ''انسانی اخلاق'' کہا گیا یعنی معروضیت، اصول پرستی، بلند نگاہی، ضوابط کی پابندی، خلاّقیت وغیرہ جو کہ دوسری جنگ عظیم تک موجود تھے، بری طرح شکستہ ہو چکے ہیں، مثلاً براک اوباما، ڈیوڈ کیمرون، اولاند وغیرہ کی معمولی استعداد، ایورون (Enron) جیسی دیوہیکل کمپنیوں کا منظم فراڈ، نوبل انعام حاصل کرنے والی تحقیقات اور ادبی نگارشات کی معمولی حیثیت، نئی دواؤں کی ایجاد میں ناکامی، ہالی ووڈ فلموں کی بے کیفی وغیرہ۔

اس مسلمہ کے پیش نظر کہ حقیقت خلاء کو برداشت نہیں کرتی ہے، مادہ پرست مغرب کی پسپائی ایک نئے عالمی نظام کو ضرور وجود میں لائے گی۔ چین کے اساسی لحاظ سے جداگانہ ماڈل کے فوقیت حاصل کرنے کی شکل میں یہ عمل شروع بھی ہو چکا ہے۔ لیکن کنفیوشین (Confucian) جزء رکھنے کے باوجود اس ماڈل کا بڑا حصہ بھی مغربی مادہ

---

* پروفیسر، شعبۂ علم الادویہ، اجمل خاں طبیہ کالج، اے-ایم-یو، علی گڑھ

پرستی ہی سے عبارت ہے اور ناکام ہونے والا ہے۔ چنانچہ علماء اسلام کی ذمہ داری اب امت مسلمہ کو عصری رہنمائی فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ نیا عالمی ماڈل وضع کرنے کی بھی ہے۔

اس ماڈل کو بنانے میں دو اصول اساسی اہمیت کے حامل ہوں گے۔ اولاً یہ کہ اس ماڈل کی آخری غایت وہی ہونا چاہیے جو کہ اسلام اور انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ یعنی اخروی نجات اور تقرب الٰہی۔ انسان کے عقائد اور ذاتی اخلاق کے ساتھ اس کی تہذیب، جہاں بینی، علوم، فنون (Technology)، فنون لطیفہ وغیرہ کے بیش تر حصوں کو بھی اخروی نجات اور تقرب کا ذریعہ ہونا چاہیے اور باقی ماندہ کو اس مقصد کے حصول میں کم از کم مزاحم نہیں ہونا چاہیے۔

ثانیاً، چونکہ مقصد صرف اعلیٰ استعداد رکھنے والوں کا حصول تقرب ہی نہیں بلکہ عام انسانوں کی نجات بھی ہے، چنانچہ ماڈل وضع کرنے کا دوسرا اصول عدم مشقت ہونا چاہیے۔ یعنی باطل تہذیب کے آفریدہ غیر اولیٰ عناصر مثلاً انتہائی جسمانی آسائش کے انتظامات، فلمیں، ٹی-وی، انٹرنیٹ وغیرہ کے لیے ممکنہ حد تک اور مناسب ترمیمات کے ساتھ جگہ بنائی جانی چاہیے۔ ورنہ خدشہ یہ ہے کہ عالم انسانیت کا عظیم حصہ، جو ابھی تک رضاء رب اور اخروی نجات کا طالب تو ہے لیکن موجودہ تن آسانی اور حظوظ ولذائذ نہیں چھوڑ سکتا، خدا بیزاری سے نہیں بلکہ غلبہ نفسانی کی وجہ سے خدا پرست ماڈل کو رد نہ کر دے۔ جس طرح کہ گاندھی جس کے Village Republic کے روحانیت پرور ماڈل کو محض عصری آسائش اور لذائذ سے عاری ہونے کی وجہ سے ٹھکرا دیا گیا۔

واضح رہے کہ عدم مشقت کا اصول نازک ہے، جس میں افراط وتفریط کے امکانات ہیں۔ چنانچہ اسے برتنے کی تمام احتیاطوں کو ملحوظ رکھنا از حد ضروری ہوگا۔ مثلاً غیر اولیٰ کو بحیثیت رخصت ہی اختیار کرنا اور ایسی تدابیر کے ساتھ نافذ کرنا کہ معاشرے میں ان کو اختیاری طور پر ترک کرنے کا میلان پیدا ہو اور مستقبل میں بہتر متبادل ان کی جگہ لے سکیں۔ یعنی غیر اولیٰ عناصر کو حتمی نہیں بلکہ حرکی (Dynamic) طور پر جگہ دی جائے۔

ایک انتہائی اہم امر یہ سمجھنا ہے کہ ماڈل تیار/تعمیر کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس

کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ موجودہ تہذیب و سیاست کے مقابلے میں ایک کامل تہذیب کی تمام تفصیلات مرتب کر کے پیش کی جائیں، بلکہ ماڈل بنانے کے بنیادی معنی ان پالیسیوں کو وضع کرنا ہے جن پر عمل درآمد سے مطلوبہ تہذیب درجہ بدرجہ وجود میں آتی چلی جائے۔ ظاہر ہے پالیسی سازی میں بعض کلیدی عملی اقدامات (Interventions) بھی شامل ہوتے ہیں۔

متبادل عالمی ماڈل یا خاکہ وضع کرنے کے مندرجہ بالا بنیادی اصولوں یعنی (۱) نجات اور تقرب الٰہ اور (۲) عدم مشقت کے بعد تیسرا اصول نفاذِ شریعت۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس آخری دور میں تقرب ونجات کے حصول کے لیے بنیادی اور قطعی اہمیت شریعت، یعنی قانونی طور پر واجب یا حرام، مذہبی اور دنیوی امور کو دی ہے، جب کہ سابقہ مناہج میں بنیادی اہمیت مراسم (Rites & Rituals) اور طرز زندگی کو حاصل تھی۔

لیکن اس آخری دور میں اعلانیہ کلمہ شہادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، حرمتِ خمر و ربا، وغیرہ کو بنیادی وسیلہ بنایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اسلام اعلیٰ اخلاقی اصول بھی فراہم کرتا ہے جو اختیاری طور پر برتے جائیں اور انسان، کائنات، غیب اور ماورائیت کے خدوخال بھی بیان کرتا ہے جو کہ زیادہ تر قرآن وحدیث میں ایمائی طور پر موجود ہیں، یہ دونوں دائرے یعنی اخلاق وحقیقت، شریعت کے ساتھ مل کر انسان کے اندرون و بیرون یعنی تہذیب کو ایک خاص شکل فراہم کرتے ہیں، لیکن بنیادی اہمیت نفاذِ شریعت ہی کو ہے چند مذہبی اور دنیوی امور کو قانونی طور پر نافذ یا دفع کرنا، چنانچہ عالمی خاکے میں تہذیب اور علوم کے تعلق سے ہدایات کے ساتھ نفاذِ شریعت کو بنیادی اہمیت دی جانی چاہیے۔ براہِ راست تہذیبی اور علمی اقدامات کے ساتھ نفاذِ شریعت نئی تہذیب کو وجود میں لانے کا کام کرے گی، البتہ نفاذِ شریعت کو بھی مندرجہ بالا بنیادی اصولوں کی روشنی میں انجام دیا جانا چاہیے اس طرح کہ آج کا انسان راغب ہونے کے تنفر اور ناقابلِ برداشت مشقت میں مبتلا نہ ہو۔

گو اسلام، طرزِ زندگی یا تہذیب کو لازمی اور قانونی طور پر استعمال نہیں کرتا لیکن اجماع یعنی صالح علماء کے فکر وعمل کی اقتداء کا اصول دیگر امتِ مسلمہ کی وضع کردہ تہذیب کو بھی ایک ثانوی لیکن انتہائی اہم مقام دیتا ہے، لیکن بدقسمتی سے مذہبی مسلمان بھی اپنی روایتی تہذیب کو تبدیل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، یہ عجیب وغریب اور خطرناک رجحان مغربی جاہلیت کے نظریۂ ارتقاء سے پیدا ہوا ہے، یعنی انسان اور کائنات ہردم بدل رہے ہیں اور ہرنئی حالت بہتر بھی ہے اور لازمی و جبری طور پر لاحق ہوکر بھی رہتی ہے، مذہبی مسلمانوں نے بس اس باطل نظریۂ ارتقاء کو کلمہ پڑھوادیا ہے، یعنی اس دور میں ہمیں اپنی تمام روایتی تہذیب کو دریابرد کرکے قرآن وسنت کی بنیاد پر ایک نئی اسلامی تہذیب تعمیر کرنا چاہیے۔ یہ تو صحیح ہے کہ زندگی میں جزوی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور اسی لحاظ سے تہذیب میں بھی جزوی تبدیلیاں کی جانی چاہیے، لیکن نہ ہی زندگی کی اساس اور بڑا حصہ لازمی طور پر بدلا ہے اور نہ ہی مسلمانوں کی تہذیب کو بڑے پیمانے پر بدلنے کی ضرورت ہے۔ مزید برآں، اسلامی تہذیب یا کسی بھی صالح تہذیب کی کامل یا اساسی تعمیرِ نو، تازہ وحی اور نئے رسول کے بغیر تہذیب میں بڑی تبدیلی صرف شر اور شیطنت کو ہی پیدا کرسکتی ہے، بلکہ عقل ومنطق کا تقاضا تو یہ ہے کہ جب ہمیں مجبوراً کئی ایسی چیزیں اختیار کرنا پڑرہی ہیں جو کہ شر اور بطلان کی طرف مائل ہیں، مثلاً نیوکلیائی توانائی، انٹرنیٹ وغیرہ تو اپنی مجموعی انفرادی اور ملّی شخصیت میں حق اور خیر کا وزن بڑھانے کی خاطر اپنی صالح، روایتی تہذیب کا زیادہ سے زیادہ حصہ برقرار رکھنا چاہیے۔ اس تعلق سے یہ اشکال بھی غلط ہے کہ روایتی تہذیب نئے سائنس اور معاشی نظام کو مزاحم ہوگی۔ چین جس نے کہ مغربی جمہوریت کی جگہ آمریت کو اختیار کیا، نئے سائنس میں امریکہ سے آگے نکل رہا ہے۔ اسی طرح انفرادی سطح پر ہزاروں لاکھوں مسلمان جو کہ خالص روایتی تہذیب پر کاربند ہیں، سائنس اور تجارت میں انتہائی کامیاب ہیں۔ الحاصل، شریعت کے بعد روایتی تہذیب، مثلاً: لباس، زبان، فنِ تعمیر، ماکول ومشروب، بود وباش، وغیرہ کو بھی ممکنہ حد تک برقرار رکھا جانا چاہیے۔

چوتھا اہم معاملہ جدید مغربی سائنس کا ہے۔ یہ سائنس چونکہ ایشیا کا مطالعہ عالم لطیف اور عالم روحانی نیز ماورائی الٰہی اساس سے منقطع کرکے اور محض مادّی فرض کرکے کرتا ہے اس لیے اس سے بننے والی کائناتی تصویر مادہ پرستانہ ہوتی ہے۔ نیز اس کے اطلاق (Application) سے فوری اور جزوی فائدوں کے ساتھ خوف ناک مضر اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ نظری نقصان سے بچنے کے لیے مادی مغربی سائنس کے بیانات کے اوپر قرآنی جہاں بینی کا تناظر عائد کیا جانا چاہیے۔ مثلاً متعدد وقوعات (Facts) کا ارتباط نظر آئے تو اس کو توحید کا عکاس قرار دیا جائے یا غیر معمولی صناعی کو قدرت الٰہی سے منسوب کیا جائے وغیرہ۔ ظاہر ہے اس سے اس انداز کا حسن معرفت تو پیدا نہیں ہوسکتا جیسا کہ کائنات کے لطیف پہلو کو شامل مطالعہ رکھنے والے روایتی سائنسوں کے بیانات سے پیدا ہوتا ہے، مثلاً طب یونانی، لیکن کم از کم سوءِ معرفت پر قدغن لگ سکتا ہے۔ مادّی مغربی سائنس کے عملی نقصانات، مثلاً عالمی تسخین (Globel Warming)، شعاعی سمیت (Kabiational Toxicity) وغیرہ سے بچنے کے لیے سائنس کے اطلاق (Application) اور مناسب انداز میں تحقیق کو بھی سختی کے ساتھ اخلاقی اصولوں سے پابند کیا جانا چاہیے۔ مادّی مغربی سائنس کے نظری اور عملی نقصانات سے بچنے کا دوسرا اہم ذریعہ یہ ہونا چاہیے کہ روایتی علوم مثلاً 'طب یونانی' روایتی نفسیات وغیرہ کو ممکنہ حد تک اختیار کیا جائے۔ نیز روایتی فنون، مثلاً کشید عطریات، نقاشی وغیرہ کو فروغ دیا جائے۔

آخری نکتہ یہ کہ رفاہیت اور اقتصادی سرگرمی کا ایک معتدل اور منصفانہ خاکہ تیار کیا جائے جو ذاتی اور اجتماعی مفاسد سے پاک ہو لیکن موجودہ معیار زندگی کو برقرار رکھنے پر قادر ہو۔

☆☆☆

اسلامی نظام حکومت-قرآن کی روشنی میں

محمد عمر اسلم اصلاحی*

اجتماعیت ہر ذی روح کی زندگی اور بقا کے لیے ناگزیر ہے، کیوں کہ بغیر اس کے نہ وہ سکون پاسکتا ہے نہ تحفظ، نہ اس کی نسل بڑھ سکتی ہے اور نہ وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کرسکتا ہے۔ جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے تو ان کے لیے اس کی اہمیت اور ضرورت اس قدر زیادہ ہے کہ وہ بغیر اس کے زندگی کا کوئی مرحلہ طے نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ انھیں ان تمام چیزوں کی ضرورت تو ہے ہی جن کی ہر ذی روح کو ضرورت ہے علاوہ ازیں انھیں مزید سہاروں کی ضرورت ہے۔ مثلاً تن پوشی کے لیے دھاگہ بنانے والے، سوت کاتنے والے، بنکر اور درزی کی، زراعت کے لیے لوہار اور بڑھئی کی یا پھر ٹریکٹر اور ٹرالی تیار کرنے والی کمپنیوں کی۔ علیٰ ہٰذا القیاس مختلف ضروریات کے لیے مختلف سہاروں کی ضرورت ہے۔ الغرض زندگی کے تمام شعبوں اور مرحلوں میں انسان دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں ایک دوسرے کے زیادہ محتاج ہیں۔ اس لیے اجتماعیت کے بغیر انسانی زندگی کا تصور ہی محال ہے۔ اسی لیے جو اجتماعیت انسانوں میں نظر آتی ہے وہ کسی اور مخلوق میں نظر نہیں آتی۔

اجتماعی زندگی کے اصول

جب اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اجتماعیت انسانی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے تو اس اجتماعیت کی بقا اور برکت کے لیے کچھ اصول بھی ناگزیر ہوں گے،

---

* سینئر استاذ تفسیر، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ

ورنہ یہ اجتماعیت اپنی بے پناہ اہمیت کے باوجود باقی نہیں رہ سکتی اور اگر باقی رہ بھی جائے تو مفید اور بابرکت ثابت نہیں ہوسکتی۔

اجتماعیت چھوٹی بھی ہوتی ہے اور بڑی بھی۔ اور ہر اجتماعیت کی کچھ اکائیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان تمام اکائیوں کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا چاہیے ورنہ ان اکائیوں کی کوئی اہمیت باقی رہے گی اور نہ ان سے ترکیب پانے والی اجتماعیت کی۔ مثلاً خاندان ایک اجتماعیت ہے۔ اولاد، ازواج اور والدین اس کی اکائیاں ہیں۔ اس سے اوپر اٹھیے تو گاؤں اور بستی بھی ایک اجتماعیت ہے اور اس کی تمام برادریاں اور خاندان اپنی اپنی جگہ اکائیاں ہیں۔ اس سے اوپر اٹھیے تو تحصیل، ضلع، صوبہ، ملک اور دنیا مختلف سطح کی اجتماعیتیں ہیں اور ان تمام اجتماعیتوں کی اپنی اپنی اکائیاں ہیں۔ جب تک یہ اکائیاں اپنا انفرادی اور اجتماعی شعور بیدار نہ کرلیں ان کے انفرادی یا اجتماعی وجود کی کوئی اہمیت نہیں رہ جائے گی۔

اجتماعی اصول مبنی بر عدل ہوں

تمام اجتماعیتوں نے اپنے اپنے اصول بنائے ہیں اور وہ انھی اصولوں پر قائم ہیں، لیکن مشاہدہ اور تجربہ بتاتا ہے کہ یہ تمام اجتماعیتیں کچھ ہی وقت گزرنے پر اضطراب کا شکار ہوجاتی ہیں۔ کیوں کہ جو اصول ان کی بقا کے لیے بنائے گئے ہیں وہ زیادہ دور تک ساتھ نہیں دیتے۔ کوئی نہ کوئی ایسا نیا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے جس کے باب میں کوئی رہنمائی موجود نہیں ہوتی تو لوگ اپنے اپنے طور پر ذاتی اجتہاد کی بنیاد پر کوئی فیصلہ لے لیتے ہیں جس میں کبھی افادیت ہوتی ہے تو کبھی مضرت۔ اور جوں ہی مضرت سامنے آتی ہے اضطراب سر اٹھاتا ہے اور سماج میں ہیجان برپا کردیتا ہے۔ پھر جب کوئی قانون نہ ہو تو لوگ اپنی اپنی پسند اور ترجیح کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں اور کسی ایک کی پسند و ترجیح ضروری نہیں کہ دوسروں کی پسند و ترجیح بھی ہو۔

اسی طرح جو اجتماعی قوانین بنتے ہیں وہ بھی واضعین کی فکر اور پسند و ترجیح کی بنیاد پر ہی بنتے ہیں۔ اسی لیے ان قوانین سے جن کے مفادات مجروح ہوتے ہیں وہ چیخ

اٹھتے ہیں۔اور انسان خواہ طبعی اعتبار سے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو یہ ممکن نہیں کہ اس کے وضع کردہ قوانین میں اس کی فکر اور پسند و ترجیح کو کوئی دخل نہ ہو اور جب دخل ہوگا تو وہ اپنے خاندان، ادارہ، جماعت، مسلک و مذہب اور دین کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔اس لیے ناگزیر ہے کہ انسانی اجتماعیت کے اصول و قوانین وہ بنائے جس کا تعلق تمام انسانوں سے یکساں ہو۔ اور یہ مقام صرف اللہ رب العالمین کو حاصل ہے کیوں کہ وہ سب کا خالق اور سب اس کی مخلوق ہیں۔اسی لیے جس زمانہ میں جو قوانین اس کی طرف سے آئے اس میں نہ صرف انسانوں کی بلکہ دیگر مخلوقات کی بقا و تحفظ اور احترام کا عنصر پورے طور سے موجود ہے۔

خالق کی نظر میں انسان

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں انسانوں کو جس شرف سے نوازا ہے اس میں دوسری کوئی مخلوق اس کی شریک و سہیم نہیں۔خود اسی کا فرمان ہے:

”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلاً“ (بنی اسرائیل:۷۰)

(اور بے شک ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور خشکی و تری میں ہم نے انھیں سواری دی اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق عطا کیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انھیں واضح فضیلت دی۔)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اللہ کی نظر میں انتہائی مکرم اور بے پناہ اہمیت کا حامل ہے۔اس کی فضیلت بعض مخلوقات پر تو بالکل نمایاں ہے اور بعض مخلوقات پر ہر چند کہ نمایاں نہیں لیکن اس کی قدر و اہمیت ان سے بھی کم نہیں۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے وہ ساخت عطا فرمائی جسے بہترین ساخت قرار دیا جاتا ہے۔خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ“ (التین:۴)

(اور یقیناً ہم نے انسان کو سب سے عمدہ ساخت عطا کی۔)

اسے نطق و بیان کی صلاحیت سے بھی نوازا۔ فرمایا:

"الرَّحْمٰنُ. عَلَّمَ الْقُرْآنَ. خَلَقَ الْإِنسَانَ. عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" (الرحمٰن:۱-۴)

(رحمان نے قرآن سکھایا، اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے نطق و بیان بھی سکھایا۔)

"عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" (العلق:۵)

(انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔)

پھر جب انسان اپنا سبق بھولا اور اپنے رب کے اِس خاص کرم کو فراموش کر بیٹھا تو اللہ تعالیٰ نے بڑی محبت سے اسے اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ فرمایا:

"يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ. الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ. فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ" (الانفطار:٦-٨)

(اے انسان! تجھے تیرے رب کریم سے کس چیز نے دھوکے میں ڈالے رکھا جس نے تیرا خاکہ بنایا پھر تیرے نوک پلک سنوارے اور تجھے متوازن کیا اور تیرے لیے جو شکل پسند کی بنائی۔)

یہ ہے خالق کی نظر میں انسان کا مرتبہ و مقام۔

حیاتِ انسانی کی بقا کے لیے خدائی انتظام

چونکہ اللہ کی نظر میں انسان کی خصوصی اہمیت ہے اس لیے اس نے اس کی بقا و حیات کے لیے وسیع تر انتظامات کیے۔ اس کے لیے آسمان بنائے، زمین بچھائی، آفتاب و ماہتاب بنائے، شب و روز کا نظام قائم کیا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا:

"اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ. وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنَ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ. وَآتَاكُم مِّن كُلِّ

مَاسَأَلْتُمُوهُ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لاَ تُحْصُوهَا'' (ابراہیم:۳۲-۳۴)

(اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی اتارا پھر اس سے پھل پیدا کیے تمہارے رزق کے لیے، کشتیوں اور جہازوں کو تمھارا تابع بنایا تا کہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں، اس نے دریاؤں کو تمھارے لیے مسخر کیا اور شمس وقمر کو بھی تمھاری خدمت میں لگا دیا اس حال میں کہ وہ مستقل تمہاری خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور تمھارے ہی فائدے کے لیے شب و روز کا نظام قائم کیا اور تم کو وہ ساری چیزیں عطا کیں جن کی تمھیں طلب تھی۔ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔)

''هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِىْ الْأَرْضِ جَمِيْعاً'' (البقرہ:۲۹)

(وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔)

یہ تو بیان ہے ان نعمتوں کا جن سے انسان وجود میں آنے کے بعد متمتع ہوتا ہے۔ خود اسے وجود میں لانے کے لیے بھی اس نے بے پناہ انتظامات کیے اور جتنے مراحل سے گزار کر ایک نطفۂ حقیر کو حضرت انسان کا قالب عطا کیا اس کا بھی ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

''وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِيْنٍ. ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِىْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ. ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ '' (المومنون:۱۲-۱۴)

(اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا پھر ہم نے اسے نطفہ کی شکل میں ایک محفوظ مستقر میں رکھا۔ پھر ہم نے نطفہ کو جنین کی شکل دی۔ پھر جنین کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا پھر گوشت کے لوتھڑے کو سخت کر کے ہڈی بنا دیا پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھائے پھر اسے ایک دوسری ہی

خلقت کا روپ دے دیا، تو کس قدر بابرکت ہے اللہ بہترین پیدا کرنے والا۔)

یہ ہیں انسانی حیات و بقا کے لیے خدائی انتظامات۔

بقائے انسانی کے لیے وسیع تر انتظامات کے بعد بندگی کا مطالبہ

چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی حیات و بقا کے لیے انتہائی وسیع اور مکمل انتظامات کیے ہیں اس لیے اسے حق ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی بندگی کا مطالبہ کرے۔ اسی وجہ سے اس نے حکم دیا کہ اے انسانو! میری بندگی کرو۔ فرمایا:

"يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُواْ رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ. الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الأَرْضَ فِرَاشاً وَالسَّمَاءِ بِنَاء وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَّكُمْ فَلاَ تَجْعَلُواْ لِلّهِ أَندَاداً وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ" (البقرہ:۲۱-۲۲)

(اے انسانو! اپنے رب کی بندگی کرو جس نے تمھیں اور تم سے پہلے کے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم اس کی گرفت سے بچ سکو، جس نے تمھارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی نازل کیا پھر اس کے ذریعہ تمھارے رزق کے لیے پھلوں کو پیدا کیا تو تم جانتے بوجھتے اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ۔)

اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے بندگی کا مطالبہ کر کے ان پر کوئی بے جا دباؤ نہیں ڈالا ہے بلکہ یہ بندگی ان کی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفاً فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا" (الروم:۳۰)

(تو اپنا رخ دین الٰہی کے لیے سیدھا کرلو بالکل یکسو ہو کر یہ اطاعت اس فطرت کا عین تقاضا ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔)

بندگیٔ رب سے اعراض کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے غیرت دلاتے ہوئے فرمایا کہ آخر انھیں کیا ہو گیا ہے کہ اپنے خالق کی بندگی و اطاعت سے منہ موڑ رہے ہیں جب کہ کائنات کی دیگر مخلوقات اس کی بندگی و اطاعت کر رہی ہیں۔ فرمایا:

"أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِيْ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ طَوْعاً وَكَرْهاً وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ" (آل عمران:۸۳)

(کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ آسمانوں اور زمین کی دیگر مخلوقات چاروناچار اسی کی اطاعت کر رہی ہیں اور ان سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔)

بندگیٔ رب ہی میں دنیا و آخرت کی فلاح مضمر ہے

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو یہ قطعی حکم دے دیا ہے کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور کی بندگی ہرگز نہ کریں، چنانچہ فرمایا:

"وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُواْ إِلَّا إِيَّاهُ" (بنی اسرائیل:۲۳)

(اور تیرے رب کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ تم لوگ اس کے علاوہ کسی اور کی بندگی نہ کرو۔)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

"وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاء" (البینۃ:۵)

(اور انھیں اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی بندگی کریں، اپنی اطاعت کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے بالکل یکسو ہو کر۔)

اور بعض مقامات پر تو یہ صراحت بھی ہے کہ تمھاری کامیابی کا انحصار بندگیٔ رب پر ہی ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" (الحج:۷۷)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو رکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو اور خیر کے کام کرو تب یہ توقع رکھو کہ تم کامیاب ہو گے۔)

بندگئ رب کیا ہے؟

زندگی کے تمام شعبوں میں اللہ کی اطاعت، اس کے حضور اپنے عجز و تذلل کا اظہار اور بلا مقابلہ اس کی بڑائی اور بزرگی کا اقرار بندگئ رب ہے۔ مثلاً اپنے جان و مال کو اللہ کے حوالہ کر دینا۔

"إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" (التوبۃ:۱۱۱)

(بے شک اللہ نے اہل ایمان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے اس بدلے میں کہ ان کے لیے جنت ہے۔)

عبادت بھی اللہ کی ہو، قربانی بھی اسی کے لیے ہو اور موت و حیات کا محور بھی اللہ ہی کی ذات ہو، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

"قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ" (الانعام:۱۶۲)

(اے نبی کہہ دو کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔)

فرمان الٰہی کی اتباع ہو، اس کے مقابلہ میں کسی اور کی اتباع نہ کی جائے، جیسا کہ حکم ہے:

"اتَّبِعُواْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلاَ تَتَّبِعُواْ مِن دُونِهِ أَوْلِيَاء" (الاعراف:۳)

(تم اتباع کرو اس کی جو تمھارے رب کی طرف سے تمھاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ اس کے سوا دوسرے اولیا کی اتباع نہ کرو۔)

سماج میں عدل وانصاف کو یقینی بنایا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا کُونُوا قَوَّامِینَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ" (النساء:۱۳۵)

(اے ایمان والو! عدل و انصاف قائم کرنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو۔)

الغرض اوامر الٰہی کی اتباع اور منہیات خداوندی سے اجتناب کا نام بندگیٔ رب ہے۔

بندگیٔ رب انفرادی زندگی میں بھی مطلوب ہے اور اجتماعی زندگی میں بھی۔ اور اجتماعی زندگی میں بندگیٔ رب کا تصور اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک اجتماعی شعور پوری طرح بیدار نہ ہو اور انسان کو اس حقیقت کا ادراک نہ ہو کہ وہ دنیا میں کس لیے بھیجا گیا ہے؟ اس کی اس میں حیثیت کیا ہے؟ اس کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ اور ان ساری حقیقتوں کا پتہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کی واحد محفوظ کتاب قرآن مجید کی طرف رجوع کیا جائے۔ تو آیئے دیکھیں کہ قرآن انسان کی کیا حیثیت متعین کرتا ہے؟ اور اسے کون سی ذمہ داری سونپتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کی اشرفیت کا تقاضا ہے کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی کے آگے نہ جھکے۔ ملاحظہ ہو:

"وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِی آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّیِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى کَثِیرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیلاً" (بنی اسرائیل:۷۰)

(اور (اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ) ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور خشکی و تری میں ہم نے انھیں سواری عطا کی۔ اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر اسے نمایاں فضیلت دی۔)

انسان ایک ذمہ دار مخلوق ہے، اس کے کچھ فرائض ہیں، جن کی ادائیگی اس پر

لازم ہے۔ اسے یہ مطلق آزادی نہیں ہے کہ جیسے چاہے رہے اور جو چاہے کرے، اس پر کبھی اور کہیں کوئی جواب دہی نہیں۔ قرآن کہتا ہے:

"أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى" (القیامۃ:۳٦)

(کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟)

"أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ" (المومنون:۱۱۵)

(کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟)

انسان کی فطرت میں نیکی اور بدی کا شعور بھی موجود ہے اس لیے وہ اچھی طرح جان سکتا ہے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ اور جب وہ خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت رکھتا ہے تو اسے بتقاضائے منصب خیر کو اپنانا چاہیے اور شر سے یکسر اجتناب کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا. فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا. قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكّٰهَا. وَقَدْ خَابَ مَن دَسّٰهَا" (الشمس:۷-۱۰)

(اور شاید ہے نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا پھر اس پر اس بدی اور اس کی نیکی الہام کی، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے آلودہ کیا۔)

"وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ" (البلد:۱۰)

(اور ہم نے اسے (نیکی اور بدی کے) دونوں راستے دکھا دیے۔)

"إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً" (الدھر:۳)

(اور ہم نے اسے راستہ دکھا دیا۔ اب وہ شکر کرنے والا بنے یا ناشکری کرنے والا۔)

خلافت کا تصور

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اس کائنات میں اللہ کے بعد

سب سے برتر ہے۔اس کے اسی منصب کے تقاضا کے تحت اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور خلافت دے کر اسے شتر بے مہار نہیں چھوڑ دیا بلکہ کچھ اصولوں اور ضابطوں کا پابند بنایا ہے۔ گویا یہ خلافت اس کے لیے ایک امتحان بھی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

”هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلاَئِفَ الأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَکُمْ فِیْ مَا آتَاکُمْ إِنَّ رَبَّکَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ“ (الانعام: ۱۶۵)

(وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کا درجہ بعض سے اونچا رکھا تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمھارا امتحان لے۔ بے شک تمھارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت زیادہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔)

خلافت کے بنیادی تقاضے

یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ خلافت حاکمیت نہیں ہے بلکہ حاکم اعلیٰ کی نیابت ہے۔ اس لیے خلافت کا سب سے اہم اور بنیادی تقاضا تو یہ ہے کہ حاکم اعلیٰ کی مرضی کا اعلان کیا جائے اور اس کے اوامر و منہیات کی تفصیل بتائی جائے لیکن یہ کام اس قدر حکمت کے ساتھ کیا جائے کہ کسی کو اس سے وحشت و تنفر نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کی ذمہ داری ہی یہ بتائی کہ:

”يَتْلُوْ عَلَيْکُمْ آيَاتِنَا وَيُزَکِّيْکُمْ وَيُعَلِّمُکُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَيُعَلِّمُکُم مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ“ (البقرہ: ۱۵۱)

(وہ تمھیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے، تمھارا تزکیہ کرتا ہے، تمھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔)

خلافت کا دوسرا اہم تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی صحیح رہنمائی کی جائے، غلط رہنمائی بالکل نہ کی جائے، اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جتنے پیغمبر آئے سب نے قوم کی صحیح رہنمائی فرمائی۔ ان کے مقابلہ میں باطل پرست رہنماؤں نے ہمیشہ قوم کی غلط رہنمائی کی ہے، مثلاً فرعون کے بارے میں خود قرآن کا تبصرہ ہے:

”وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدَى“ (طٰہٰ:۷۹)

(اور فرعون نے اپنی قوم کی غلط رہنمائی، صحیح رہنمائی نہیں کی۔)

خلافت کا تیسرا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ عوام سے ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھیں قعرِ ضلالت سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لایا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ“ (ابراہیم:۱)

(اے نبی! یہ ایک اہم کتاب ہے جس کو ہم نے تمھاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کو گمرہی کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاؤ اپنے رب کے اذن سے، یعنی خدائے عزیز وحمید کے راستے کی طرف۔)

خلافت کا چوتھا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کے معاملات اللہ کے قوانین کے مطابق طے کیے جائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا:

”إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا“ (النساء:۱۰۵)

(اے نبی! یقیناً ہم نے یہ کتاب تمھاری طرف ایک خاص مقصد سے بھیجی ہے کہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ اس قانون کے مطابق کرو جو اللہ نے تمھیں دکھایا ہے اور تم خائنوں کی وکالت کرنے والے نہ بن جانا۔)

خلافت کا پانچواں اہم تقاضا یہ ہے کہ دینِ الٰہی کے قیام اور پوری دنیا میں اس

کے غلبہ کے لیے جدوجہد کی جائے۔ دنیا کو اس کے حال پر نہ چھوڑ دیا جائے اور اگر اس کے لیے جوکھم بھی اٹھانی پڑے تو بے تکلف اٹھائی جائے، کسی کی خوشی اور ناراضگی کی پرواہ نہ کی جائے۔ قرآن کہتا ہے:

"هُوَ الَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهُ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ" (التوبۃ: ۳۳)

(وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اسے سارے ادیان پر غالب کر دے، خواہ یہ کوشش مشرکوں کے لیے ناگوار خاطر ہی کیوں نہ ہو۔)

یہ ہیں خلافت کے وہ اہم اور بنیادی تقاضے جن کی تکمیل کے بغیر ہم خلافت کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ دنیا میں جتنے نبی اور رسول آئے انھوں نے انہی تقاضوں کی تکمیل کی اور حق خلافت ادا کر دیا۔

اسلامی نظام حکومت

یوں تو حق خلافت کی ادائیگی یا بالفاظ دیگر اسلامی نظام حکومت کا قیام سارے انسانوں کی ذمہ داری ہے۔ جو لوگ جس حیثیت میں بھی ہیں اس کے مطابق انھیں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ لیکن چونکہ شیطان ان کے ساتھ لگا ہوا ہے اور ان کا ازلی دشمن ہے اس لیے وہ ہرگز یہ نہیں چاہے گا کہ لوگ اپنے فرائض منصبی ادا کریں۔ اس کی تو ہمیشہ سے یہی کوشش رہی ہے کہ لوگوں کو گمراہ کرے اور وہ اپنے اس کام کو جس محنت، لگن اور یکسوئی کے ساتھ کر رہا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا میں الٰہی نظام کے بجائے ابلیسی نظام رائج ہے۔ طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ اب وہی ابلیسی نظام، حکومت و سیاست کا معیار بن گیا ہے۔ بایں صورت اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ الٰہی نظام حکومت یا بالفاظ دیگر اسلامی نظامِ حکومت کا وسیع پیمانہ پر تعارف کرایا جائے اور دنیا کو یہ بتایا جائے کہ امن عالم اسی نظام کے قیام پر موقوف ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"إِنَّ الدِّيْنَ عِندَ اللّٰهِ الإِسْلَامُ" (آل عمران:۱۹)

(اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔)

یہ حقیقت واضح رہے کہ دین نہ دنیا کی ضد ہے نہ آخرت کی، نہ معیشت کی ضد ہے نہ معاشرت کی، نہ معاملات کی ضد ہے نہ سیاست کی، بلکہ دین ان تمام شعبوں کا جامع ہے۔ ان میں سے کسی ایک شعبہ کو بھی دین سے خارج کر دیا جائے تو دین نامکمل رہ جائے گا۔ اللہ سے بندوں کے تعلق کا نام بھی دین ہے، بندوں سے بندوں کے تعلق کا نام بھی دین ہے اور بندوں سے کائنات کے تعلق کا نام بھی دین ہے۔ اس لیے جب تک ان سب کو ایک دوسرے سے مربوط نہیں کیا جاتا دین کا صحیح تصور سامنے نہیں آ سکتا اور جب تک دین کا صحیح تصور سامنے نہ آئے، اسلامی نظام حکومت کی اہمیت وافادیت بھی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ دین کا صحیح اور واضح تصور دنیا کے سامنے لایا جائے تاکہ اسلامی نظام حکومت کا قیام ممکن ہو سکے۔

اسلامی نظام حکومت کیوں؟

ہر چند کہ سطور بالا ہی سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیا میں اسلامی نظام حکومت کیوں؟ لیکن اس کی تھوڑی سی مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

مسلمانوں کی خواہش اور کوشش یہ ہے یا ہونی چاہیے کہ پوری دنیا میں اسلامی نظام حکومت قائم ہو جائے، اس لیے یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیوں؟ کیوں نہ پوری دنیا پر یہودی، نصرانی یا ہندو حکومت قائم ہو؟

اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ دوسرے نظامہائے حکومت کے مقابلہ میں اسلامی نظام حکومت زیادہ بہتر اور سماج کے لیے زیادہ مفید ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں۔

۱- یہ نظام حکومت انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔

۲- جس نے یہ دنیا بنائی ہے جب اس نے خود اس کے نظام کو چلانے کے اصول وضوابط مقرر کر دیے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے بنائے ہوئے اصولوں کو نظر

انداز کر کے اپنے اصول وقوانین کی روشنی میں دنیا کا نظام چلایا جائے، چونکہ یہودی، نصرانی یا ہندو نظامہائے حکومت انسانوں کے وضع کردہ ہیں اور اسلامی نظام حکومت خالق کائنات کا وضع کردہ ہے اس لیے انصاف پسند کو یہی کہنا چاہیے کہ دنیا میں اسلامی نظام حکومت ہی قائم ہونا چاہیے۔ خود غور کیجیے کہ کیا دنیا میں کوئی چیز ایسی بھی ہے جس کا استعمال اس کے موجد یا خالق کے وضع کردہ اصولوں کے خلاف ہوتا ہو؟ اور اگر نہیں تو دنیا کا نظام ہی کیوں اس کے خالق کے اصولوں کے خلاف ہو؟

اسلامی نظام حکومت کی اہم دفعات

اب آیئے یہ دیکھا جائے کہ اسلامی نظام حکومت کی دفعات کیا ہیں؟

پہلی دفعہ: اس کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ سارے عالم کا اصل مالک اور حاکم اللہ تعالیٰ ہے، انسان اس کا نائب اور خلیفہ ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ" (الفاطر:۱۳)

(وہ ہے اللہ، تمھارا رب، ملک اسی کا ہے)

"وَلَمْ يَكُن لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ" (بنی اسرائیل:۱۱۱)

(اور ملک میں اس کا کوئی شریک نہیں)

جب ملک اللہ کا ہے اور دوسرا کوئی اس میں اس کا شریک نہیں تو یہاں حکم بھی اسی کا چلنا چاہیے، کسی اور کا نہیں۔ قرآن کہتا ہے:

"يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ"

(آل عمران:۱۵۴)

(لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا ہمارا بھی کچھ حکم چل سکتا ہے، اے نبی! کہہ دو کہ سارا حکم اللہ کا ہی چلے گا۔)

جہاں تک انسان کی نیابت و خلافت کا تعلق ہے تو قرآن نے اس بات کا نہایت واضح اعلان کر دیا ہے:

"هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلائِفَ الْأَرْضِ" (الانعام:۱۶۵)

(وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا۔)

جب زمین کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور انسان اس پر اس کا خلیفہ ہے تو قانون بھی اللہ کا ہی ہونا چاہیے البتہ اس کے نفاذ کا ذمہ دار انسان کو ہونا چاہیے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کے انکار کی گنجائش نہیں۔

دوسری دفعہ: اس کی دوسری دفعہ یہ ہے کہ زمین میں عادلانہ نظام قائم ہوتا کہ اللہ کے بعض بندوں کو اس کے بعد بندوں کی حق تلفی کا موقع نہ ملے۔ فرمان الٰہی ہے:

"یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ کُونُواْ قَوَّامِیْنَ لِلّهِ شُهَدَاء بِالْقِسْطِ وَلاَ یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلاَّ تَعْدِلُواْ اعْدِلُواْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُواْ اللّهَ إِنَّ اللّهَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ" (المائدہ:۸)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اللہ کے لیے راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو، کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اتنا مشتعل نہ کردے کہ تم انصاف نہ کرسکو۔ انصاف سے کام لو، یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو، وہ اچھی طرح باخبر ہے اس سے جو تم کرتے ہو۔)

یہ عدل ہر چیز میں ہونا چاہیے، معاملات میں بھی اور لین دین میں بھی، قول میں بھی اور عمل میں بھی، معاہدوں میں بھی اور وصیتوں میں بھی، حقوق اللہ میں بھی اور حقوق العباد میں بھی۔ الغرض زندگی کے تمام شعبوں میں عدل مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَلاَ تَقْرَبُواْ مَالَ الْیَتِیْمِ إِلاَّ بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ حَتَّى یَبْلُغَ أَشُدَّهُ وَأَوْفُواْ الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ لاَ نُکَلِّفُ نَفْساً إِلاَّ وُسْعَهَا وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُواْ وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبَى وَبِعَهْدِ اللّهِ أَوْفُواْ ذَلِکُمْ وَصَّاکُم بِهِ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُونَ. وَأَنَّ هَـذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْماً

فَاتَّبِعُوهُ وَلاَ تَتَّبِعُواْ السُّبُلَ" (الانعام:۱۵۲-۱۵۳)

(اورتم یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو خواہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو اللہ نے تمھیں ان باتوں کی ہدایت اس لیے کی ہے کہ تم یاد دہانی حاصل کرو اور اسی کی ہدایت ہے کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو، دوسرے راستوں پر نہ چلو۔)

تیسری دفعہ: اس کی تیسری اہم دفعہ روئے زمین سے فتنہ وفساد کا مکمل خاتمہ ہے۔ خواہ یہ فتنہ وفساد عقیدہ کا ہو یا عمل کا، انفرادی ہو یا اجتماعی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"لاَ تُفْسِدُواْ فِي الأَرْضِ بَعْدَ إِصْلاَحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفاً وَطَمَعاً إِنَّ رَحْمَتَ اللّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ" (الاعراف:۵۶)

(اورتم زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد برپا نہ کرو، اللہ ہی کو پکارو خوف میں بھی اور طمع میں بھی۔ بے شک اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے قریب ہے۔)

اسی لیے دنیائے انسانیت کے عظیم مصلحین نے اس جانب خصوصی توجہ مبذول فرمائی ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا:

"فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ. وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ. الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ" (الشعراء:۱۵۰-۱۵۲)

(تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو، حد سے تجاوز کرنے والوں کی بات پر کان نہ دھرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اصلاح کا کوئی کام نہیں کرتے۔)

جب کہ غیر اسلامی نظام حکومت کے علم برداروں کا کردار قرآن نے ان لفظوں

میں بیان کیا ہے:

''وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ''(البقرہ:۲۰۵)

(اور جب اسے اقتدار مل جاتا ہے تو زمین میں اس کی ساری تگ و دو اس غرض کے لیے ہوتی ہے کہ اس میں فساد پھیلائے، کھیتوں کو برباد کرے اور نسلوں کو تباہ کرے۔ حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔)

قرآن بار بار یہ ہدایت کرتا ہے کہ:

''لَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ''(العنکبوت:۳۶)

(تم زمین میں فساد برپا نہ کرو۔)

چوتھی دفعہ: اس کی چوتھی اہم دفعہ یہ ہے کہ سماج میں خیر کو پروان چڑھایا جائے اور شر کا قلع قمع کیا جائے۔ دنیا کے سارے مصلحین نے اس دفعہ پر بھی خاصی توجہ دی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا تعارف کراتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ''(الاعراف:۱۵۷)

(وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، انھیں بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے، ان کے اوپر سے اس بوجھ کو اتارتا ہے جو انھوں نے خود اپنے اوپر لاد لیے ہیں اور ان بندشوں کو کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے ہیں۔)

اہل ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ''(التوبہ:۷۱)

(یہ لوگ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔)

اسلامی نظام حکومت کے خدوخال [1]

اسلامی نظام حکومت کی بنیاد یہ آیت فراہم کرتی ہے:

”یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَطِیعُوا اللَّهَ وَأَطِیعُوا الرَّسُولَ وَأُولِی الْأَمْرِ مِنكُمْ“ (النساء:۵۹)

(اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ اور اپنے اوپر اولوالامر کی۔)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور رسول کے علاوہ اولوالامر کی اطاعت بھی ناگزیر ہے۔ ان کی اطاعت سے گریز خود اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے گریز کے ہم معنیٰ ہے۔

اولوالامر ان افراد کو کہتے ہیں جو اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق لوگوں میں حکمرانی کے فرائض انجام دیتے ہوں۔ خواہ وہ کسی بھی حیثیت کے مالک ہوں۔ وہ مقامی امیر ہوں، ضلعی امیر ہوں، صوبائی امیر ہوں، ملکی امیر ہوں یا بین الاقوامی امیر۔ یہ سب اولوالامر سماج کے لیے مفید اس وقت ہو سکیں گے جب یہ ایک وفاق سے مربوط ہوں۔ مقامی امراء ضلعی امیر کے سامنے، ضلعی امراء صوبائی امراء کے سامنے، صوبائی امراء ملکی امراء کے سامنے اور ملکی امراء امیر عالم کے سامنے جوابدہ ہوں۔

اسی طرح ہر امیر کی اپنی شوریٰ ہو جو وہاں کے سچے، ایماندار، دیانت دار، ذی فہم اور ذی علم افراد پر مشتمل ہو۔ اسلامی نظام اجتماعی کی ہیئت کو سامنے رکھیے تو اسلامی نظام حکومت کے تین بنیادی ستون نظر آتے ہیں۔

۱- امیر ۲-شوریٰ ۳-عوام

خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کی وجہ سے امیر کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ کتاب اللہ کی تعلیمات اور ہادی اعظم ﷺ کی سنت کی روشنی میں شوریٰ کے مشورے سے اپنے

---

[1] یہ اور اس کے بعد والی بحث میری کتاب ”اصلاح معاشرہ قرآن کی روشنی میں“ سے ماخوذ ہے۔

ماتحت افراد کے حقوق کو یقینی بنائے۔ اللہ تعالیٰ نے امیر کو حکم دیتے ہوئے فرمایا:

"وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" (آل عمران:۱۵۹)

(تم معاملات میں ان (ارکان شوریٰ) سے مشورہ کرلیا کرو۔)

"وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ" (الشوریٰ:۳۸)

(اور ان کا کام باہمی مشورہ سے ہوتا ہے۔)

اس آخری آیت میں "ھم" سے مراد شوریٰ بشمول امیر ہے۔ یہ آیات ہر چند کہ خاص سیاق میں وارد ہوئی ہیں لیکن قرآنی تعلیمات کی آفاقیت اور ان آیات کی حکمت کا تقاضا ہے کہ ان کو وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے۔

اور مجلس شوریٰ کی ذمہ داری ہے کہ وہ امیر کو مناسب مشورے دے، اسے عدل پر قائم رکھے اور جادۂ اعتدال سے ہٹنے نہ دے۔ یوں وہ نصح کے تقاضے کو پورا کرے۔ یہی مجلس شوریٰ بشمول امیر مجلس قیادت وحکمرانی یا بالفاظ دیگر اولوالامر کی جماعت ہے۔

اولوالامر کے فرائض

اس طرح امیر گویا مجلس شوریٰ کا صدر ہے اور مجلس شوریٰ امیر کی معاون جماعت۔ یہی اولوالامر ہیں۔ ان کی ذمہ داریاں مندرجہ ذیل ہیں:

۱- عوام کی جان کے تحفظ کو یقینی بنائیں، نہ خود دوسروں کی ناحق جان لیں اور نہ کسی دوسرے کو قتل ناحق کی اجازت دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ" (بنی اسرائیل:۳۳)

(تم اس جان کو نہ مار ڈالو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔)

۲- ان کے مال کا تحفظ کریں۔ نہ خود دوسروں کا مال ناجائز طریقے سے ہڑپیں اور نہ کسی اور کو اس کی اجازت دیں۔ قرآن کہتا ہے:

"لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ" (البقرہ:۱۸۸)

(تم اپنے مال باہم باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔)

۳- کسی کی عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچائیں اور دوسروں کو بھی کسی کی عزت نفس سے کھلواڑ کی اجازت نہ دیں۔ اور اگر کوئی ایسا کرے تو سختی کے ساتھ اس سے نمٹیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَومٌ مِّن قَوْمٍ عَسَى أَن يَكُونُوا خَيْراً مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاء مِّن نِّسَاء عَسَى أَن يَكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الاِسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيْمَانِ" (الحجرات:۱۱)

(اے ایمان والو! تم میں سے کوئی قوم کسی دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے، عین ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتوں کی کوئی جماعت عورتوں کی کسی دوسری جماعت کا مذاق اڑائے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور تم آپس میں ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو (یہ فسق ہے) اور ایمان کے بعد فسق کا نام ہی برا ہے۔)

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيراً مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضاً" (الحجرات:۱۲)

(اے ایمان والو! بہت زیادہ گمان سے بچو، یقیناً بعض گمان گناہ ہوتے ہیں، تم تجسس نہ کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔)

۴- بھلائیوں کو فروغ دیں اور برائیوں سے روکیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ" (آل عمران:۱۱۰)

(تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔)

۵- مفسد عناصر کو پر مشقت کاموں میں مصروف رکھیں تا کہ ان کی مفسدانہ

ذہنیت اور سرگرمیوں سے لوگ محفوظ رہیں جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے عہد کے مفسد عناصر کو مختلف کاموں میں مصروف رکھا۔ان سے سمندروں میں غوطہ خوری اور پر مشقت تعمیری کام کرواتے رہے تاکہ وہ مصروف بھی رہیں اور زیادہ محنت کی وجہ سے ان کا دماغ بھی ٹھکانے رہے۔قرآن نے اس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

"وَمِنَ الشَّيَاطِينِ مَن يَغُوصُونَ لَهُ وَيَعْمَلُونَ عَمَلاً دُونَ ذَلِكَ"(الانبیاء:۸۲)

(اور شیاطین میں سے بھی کچھ کو ہم نے اس کا تابع فرمان بنادیا تھا جو اس کے لیے غوطہ لگاتے تھے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے۔)

۶- جبراً کسی کو اپنے مذہب میں داخل نہ کریں۔اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا:

"أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ"(یونس:۹۹)

(تو کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مومن ہو جائیں؟)

۷- کسی کی مذہبی دل آزاری سے خود بھی اجتناب کریں اور مملکت کے کسی فرد یا جماعت کو بھی اس کی اجازت نہ دیں۔قرآن کہتا ہے:

"وَلاَ تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ"(الانعام:۱۰۸)

(اور تم ان لوگوں کو برا بھلا مت کہو جو غیر اللہ کو پکارتے ہیں۔)

۸- حاجت مندوں اور محروموں کی ضروریات زندگی کی تکمیل کا سامان کریں اور اہل ثروت کو یہ احساس دلائیں کہ ان کے مال میں دوسروں کا بھی حق ہے۔اور انفاق کا اجتماعی نظام قائم کریں۔قرآن کہتا ہے:

"وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ"(الذاریات:۱۹)

(اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا بھی حق ہے۔)

۹- پوری رعایا کے ساتھ عادلانہ برتاؤ کریں۔امیر اور غریب سب کے لیے ایک ہی پیمانہ ہو۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اعْدِلُواْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى" (المائدہ:۸)

(عدل کرو یہ تقویٰ کے زیادہ قرین ہے۔)

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيّاً أَوْ فَقَيراً فَاللّهُ أَوْلَى بِهِمَا فَلاَ تَتَّبِعُواْ الْهَوَى أَن تَعْدِلُواْ" (النساء:۱۳۵)

(اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے بنو، اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہو جاؤ، چاہے وہ تمھارے خلاف ہو یا والدین اور قرابت داروں کے خلاف، خواہ کوئی مالدار ہو یا فقیر، اللہ تم سے زیادہ دونوں کا خیر خواہ ہے۔ پس تم خواہش کی پیروی نہ کرو کہ عدل سے ہٹ جاؤ۔)

۱۰- قوانین کی پابندی سے خود کو آزاد نہ رکھیں ورنہ دوسروں کو دل کی آمادگی کے ساتھ ان کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی لیے اللہ کے رسول نے خود قوانین کی پابندی کی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ" (البقرہ:۲۸۵)

(رسول بھی ایمان لایا اس پر جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل کیا گیا اور مومنین بھی ایمان لائے۔)

۱۱- حدود و تعزیرات کا نفاذ بے دریغ کریں۔ قرآن کہتا ہے:

"الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِئَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ" (النور:۲)

(زانی اور زانیہ میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگاؤ اور ان کے باب میں کسی قسم کی ہمدردی نہ جتاؤ۔)

"وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُواْ أَيْدِيَهُمَا جَزَاء بِمَا كَسَبَا" (المائدہ:۳۸)

(اور چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے

ہاتھ کاٹ دو اس چوری کی پاداش میں جو انھوں نے کی۔)

۱۲- بلا تحقیق محض الزام کی بنیاد پر کسی کو سزا نہ دی جائے۔ قرآن کہتا ہے:

"إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ" (الحجرات:٦)

(اگر تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لو مبادا کہ تم کسی قوم پر جہالت میں ٹوٹ پڑو اور بعد میں اپنے کیے پر پچھتاؤ۔)

اس آیت میں اگرچہ تحقیق کو فاسق کی خبر کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے لیکن مخبر کے فسق کا پتہ لگانا آسان نہیں ہوتا۔ اچھے خاصے فرشتہ صورت افراد بھی خبث اور فسق کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں جن کے بارے میں ان کے ظاہر کو دیکھ کر شبہ بھی نہیں ہوتا لیکن وقت بتاتا ہے کہ ان پر اعتماد ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس لیے ہر اہم خبر کی تحقیق لازماً ہونی چاہیے۔

۱۳- اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی بے تکلف اس سے رجوع کر لینا چاہیے اور بے تأمل اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ مورال گرنے کا بہانہ کر کے اپنی غلطی پر اڑے نہیں رہنا چاہیے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے عہد حکومت میں ایک آدمی کے کھیت میں دوسرے کچھ لوگوں کی بکریاں چلی گئیں اور اس کی فصل کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ کھیت والے نے اپنے نقصان کے معاوضہ کا مقدمہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عدالت میں پیش کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے جو فیصلہ دیا وہ کچھ زیادہ صائب نہ تھا، ان کے کم سن بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام نے باپ کو اس فیصلہ کے برعکس سجھاؤ دیا اور بتایا کہ آپ کے اس فیصلہ سے اگر ایک کے نقصان کی بھرپائی ہو رہی ہے تو دوسرے کا استحصال ہو رہا ہے اور ایسا کوئی فیصلہ جس میں کسی کا استحصال ہو مناسب نہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو بیٹے کا سجھاؤ قریب صواب نظر آیا تو انھوں نے بلا تامل اپنے فیصلہ سے رجوع کر لیا۔

قرآن کا بیان ہے۔

"وَدَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ. فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْماً وَعِلْماً" (الانبیاء:۷۸-۷۹)

(اور داؤد و سلیمان کو دیکھو جب وہ دونوں کھیت کے بارے میں فیصلہ کرر ہے تھے جب کہ اس میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کے وقت جا پڑیں اور ہم ان کے فیصلہ پر نظر رکھے ہوئے تھے پس ہم نے سلیمان کو اس کی سمجھ دے دی، حالانکہ ہم نے دونوں کو حکمت اور علم عطا کیا تھا۔)

۱۴- کسی کے جرم کی سزا دوسرے کو نہ دی جائے۔قرآن کہتا ہے:

"وَلاَ تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلاَّ عَلَيْهَا وَلاَ تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى"

(الانعام:۱۶۴)

(اور ہر شخص کی کمائی کا پھل اسی کو ملتا ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔)

اسلام حکومت کا یہ نظام پیش کرتا ہے۔کیا اس سے بہتر کسی نظام حکمرانی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اسی نظام حکمرانی کی بدولت عہد نبوی تو عہد نبوی ہے۔عہد صدیقی اور عہد فاروقی بھی آج تک لوگوں کے لیے بے بدل نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔لیکن اس نظام حکمرانی کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ عوام بھی اپنا وہ کردار پیش کریں جس کی اسلام رہنمائی کرتا ہے۔

عوام کے لیے اسلام کی رہنمائی

اسلام نے عوام پر بھی کچھ ذمہ داریاں ڈالی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱- حکمراں کی اطاعت دل کی پوری آمادگی کے ساتھ اپنا فریضہ سمجھتے ہوئے رکیں۔جیسا کہ یہ آیت بتاتی ہے:

"أَطِيْعُواْ اللّٰهَ وَأَطِيْعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِيْ الأَمْرِ مِنكُمْ" (النساء:۵۹)

(اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولوالامر کی۔)

۲- ملک میں بدامنی پھیلانے سے گریز کریں۔ اگر حکومت بدامنی پھیلانے والوں کے خلاف سخت کاروائی کرے تو اس کو مخالفت نہ کریں۔ خواہ یہ بدامنی پھیلانے والے اپنی پارٹی ہی کے کیوں نہ ہوں۔ اور اللہ کے اس فیصلہ کو سامنے رکھیں:

"إِنَّمَا جَزَاء الَّذِيْنَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِيْ الأَرْضِ فَسَاداً أَن يُقَتَّلُواْ أَوْ يُصَلَّبُواْ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيْهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلافٍ أَوْ يُنفَوْاْ مِنَ الأَرْضِ" (المائدہ:۳۳)

(جو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف لڑتے ہیں اور زمین میں فساد کرنے کی سعی کرتی ہے ہیں ان کی سزا یہی ہے کہ انھیں قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیے جائیں یا ان کو ملک سے باہر کر دیا جائے۔)

۳- نیکی اور بھلائی کے کاموں میں حکومت کا تعاون کریں اور برائی کے کاموں میں حکومت کے تعاون سے ہاتھ کھینچ لیں۔ قرآن کہتا ہے:

"تَعَاوَنُواْ عَلَى الْبرِّ وَالتَّقْوَى وَلاَ تَعَاوَنُواْ عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (المائدہ:۲)

(نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو، حق تلفی اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔)

۴- ضرورت پڑنے پر حکومت کی فوجی اور اقتصادی مدد کریں۔ قرآن کا حکم ہے:

"انفِرُواْ خِفَافاً وَثِقَالاً وَجَاهِدُواْ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" (التوبۃ:۴۱)

(ہلکے اور بوجھل نکلو اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرو۔)

اسلامی قوانین کی ہمہ گیری

اسلام جس قسم کی حکومت کا داعی اور علم بردار ہے اس کا دائرہ کار محدود نہیں ہے بلکہ اس قدر وسیع ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرلیا ہے۔ عبادت کس کی اور کیسے ہو؟ سماجی زندگی کس طرح گذاری جائے؟ باہمی امور و معاملات کیسے طے ہوں؟ معاش کا مسئلہ کیسے حل ہو؟ آمدنی کے کیا ذرائع ہو سکتے ہیں؟ خرچ کرنے کے کیا اصول و آداب ہوں گے؟ حکمراں کا انتخاب کس بنیاد پر ہونا چاہیے؟ مجلس شوریٰ کیسے تشکیل پائے؟ اور عوام کو حکومتی قوانین کا پابند کیسے بنایا جائے؟ یہ سارے امور اس کے دائرے میں آتے ہیں۔ اسی لیے اسلام کے نزدیک مذہب اور سیاست دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، ان دونوں میں مغائرت نہیں ہے بلکہ تلازم ہے۔

اسی طرح اسلامی حکومت جہاں مسلم شہریوں کو ان کے حقوق دیتی ہے وہیں غیر مسلم شہریوں کو بھی ان کے حقوق دیتی ہے۔ اب تک دنیا میں جتنی اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں ان سب میں غیر مسلم رعایا کے حقوق کا جتنا خیال رکھا گیا دوسرا کوئی نظام حکومت اس کی مثال نہیں پیش کرسکتا۔

مسلم شہریوں کے حقوق کا ذکر قرآن ان لفظوں میں کرتا ہے:

”إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجَاهَدُواْ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَالَّذِينَ آوَواْ وَّنَصَرُواْ أُوْلَـئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ“ (الانفال:۷۲)

(بے شک جولوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو پناہ دی اور ان کی مدد کی وہ ایک دوسرے کے ولی ہیں۔)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت میں رہنے والے سارے مسلمان ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ گویا حکمراں مسلم عوام کے اور مسلم عوام حکمراں کے

تمام اصول وقوانین کے پابند ہوں۔ مسلم عوام پر اسلامی حکومت کے سارے قوانین کا نفاذ ہوگا۔ کیوں کہ وہ ملی بھی ہیں اور ملکی بھی۔ ان کے برخلاف جو غیر مسلم عوام ہیں چونکہ وہ ملی نہیں ہیں اس لیے ان پر ملی قوانین کا نفاذ نہیں ہوگا البتہ چوں کہ کہ وہ بھی ملکی ہیں اس لیے ملکی قوانین کا نفاذ ان پر بھی ہوگا۔ اسلامی حکومت مسلم رعایا کو نماز، روزہ، زکاۃ، حج اور ملکی تحفظ کا بار اٹھانے کا پابند بناتی ہے جب کہ غیر مسلم رعایا ان پابندیوں سے آزاد ہے۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جن کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں ان کو حقوق بھی زیادہ ملتے ہیں اور ملنے بھی چاہئیں۔ چنانچہ حکمراں اور شوریٰ کے انتخاب کا حق بھی صرف مسلمانوں کو حاصل ہوتا ہے، غیر مسلموں کو نہیں، لیکن شہری حقوق میں مسلم اور غیر مسلم رعایا دونوں برابر ہیں، جس طرح مسلم رعایا کو ان کی تہذیب، پرسنل لاء، جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت ملتی ہے اسی طرح غیر مسلم رعایا کو بھی ان کی تہذیب، پرسنل لا، جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت ملتی ہے۔ قرآن کے مندرجہ ذیل بیانات سب کے حقوق سے متعلق ہیں:

”إِنَّ اللّـهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّواْ الأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُواْ بِالْعَدْلِ“ (النساء:۵۸)

(بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے اہل کے سپرد کردو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔)

”وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلاَّ تَعْدِلُواْ اعْدِلُواْ“ (المائدہ:۸)

(اے ایمان لانے والو! انصاف پر قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو۔)

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ“ (النساء:۱۳۵)

(اے ایمان لانے والو! انصاف پر قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو۔)

”يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوا قَوْلاً سَدِيْداً“ (الاحزاب: ٧٠)

(اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔)

”مَن قَتَلَ نَفساً بِغَيرِ نَفسٍ أَوْ فَسَادٍ فِيْ الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ أَحيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحيَا النَّاسَ جَمِيْعاً“

(المائدہ: ۳۲)

(جس نے کسی کو قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد برپا کیا ہو تو اس نے گویا سارے انسانوں کا قتل کر ڈالا اور جس نے ایک شخص کو بچایا تو گویا اس نے سارے انسانوں کو بچایا۔)

”لاَ تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ“ (البقرہ: ۱۸۸)

(تم باطل طریقے سے ایک دوسرے کے مال نہ کھاؤ۔)

یہ اور اس طرح کی متعدد آیات ہیں جن سے تمام لوگوں کے حقوق کی ضمانت کا پتہ چلتا ہے۔

یہ ہے اسلام کا وہ نظام حکومت جس کی طرف قرآن رہنمائی کرتا ہے۔ آج کی بے چین دنیا کو اسی نظام حکومت کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ یہ نظام خدائی بھی ہے اور فطرت سے بالکل ہم آہنگ بھی۔ اس نظام حکومت کے بغیر امن و شانتی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

قوانینِ اسلام کی زمانہ سے ہم آہنگی

جن لوگوں نے قرآن وحدیث کا یا اسلامی عہدِ حکومت کا مطالعہ نہیں کیا ہے یا مطالعہ کیا تو ہے لیکن تعصب کی عینک لگا کر۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی قوانین عہد حاضر سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان قوانین کے غیر جانب دارانہ نفاذ کا کوئی تجربہ عہد حاضر میں کیا گیا؟ یا کم از کم کرنے دیا گیا؟ اور اگر نہیں تو پہلے ہی یہ فیصلہ کیوں کرلیا گیا کہ یہ قوانین عہد حاضر سے ہم آہنگ نہیں ہیں؟ یوں بھی محض نظری طور

سے جائزہ لیا جائے تب بھی صاف محسوس ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام حکومت ایسے فطری اصولوں پر مبنی ہے جس کے کسی بھی زمانہ سے ہم آہنگ نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

عام انسانی قدریں آج بھی وہی ہیں جو کل تھیں۔ مسائل آج بھی اسی نوعیت کے ہیں جیسے کل تھے۔ البتہ وسائل میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اور اسلام وسائل کے استعمال کا مخالف نہیں ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ کیوں کر کیا جاسکتا ہے کہ اسلام عہد حاضر کا ساتھ نہیں دیتا؟۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے جو اصول فراہم کیے ہیں ان کی روشنی میں فروع کا تعین ہر عہد کے تقاضوں کے لحاظ سے بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ آج کے وہ بڑے بڑے مسائل جن کا کوئی حل نکلتا نظر نہیں آرہا ہے، خواہ وہ اقتصادی بدحالی کا مسئلہ ہو یا تعلقات میں تلخی کا، خواہ چوری اور ڈکیتی کا مسئلہ ہو یا گھپلوں اور گھوٹالوں کا، خوں ریزی اور فساد کا مسئلہ ہو یا جنسی استحصال کا، ان تمام مسائل کا حل اسلام کے پاس ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے مضطرب دنیا ان مسائل سے چھٹکارا پانے کے لیے جو تجاویز پیش کررہی ہے وہ وہی ہے جو اسلام نے پیش کی ہیں خواہ اسے نام کچھ بھی دیا جارہا ہو۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ سر جوڑ کر بیٹھیں، مسائل کا تعین کریں اور ان کے جتنے حل دنیا کی مختلف تہذیبوں میں ملتے ہیں ان کا تجزیہ کریں اور ان کا جو واقعی حل ہے اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ ان سارے مسائل کا سب سے زیادہ موثر اور قوی حل اسلام ہی کا نظر آئے گا۔ کاش آج کی دنیا کے انسانوں کو اس کی توفیق مل پاتی۔

☆☆☆

اسلام کا نظامِ حکومت-قرآن مجید کی روشنی میں

محمد راشد اصلاحی*

انسانی اجتماعیت کی ضرورت

انسان فطرتاً اجتماعیت پسند ہے اپنے ہم جنس کے ساتھ مل کر زندگی گزارنا اس کی فطرت کا حصہ ہے، نیز اس کی ضرورت او رمجبوری بھی ہے، کوئی شخص اپنی تمام ضروریاتِ زندگی جس پر اس کی زندگی کا انحصار ہے تنہا پوری نہیں کرسکتا، وہ اپنی بقاوسلامتی اور خوشحال زندگی کے لیے قدم قدم پر اپنے ہم جنس کے تعاون، اس کی مدد اور حمایت کا محتاج ہے۔ان کا حصول اس کے لیے تبھی ممکن ہے جب وہ اپنی زندگی بنی نوع انسان کے ساتھ مل کر گزار رہا ہو۔ چنانچہ یکجا قیام کرنا، ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کرنا اور مل کر زندگی گزارنا انسان کی مجبوری بھی ہے اور اس کی فطرت کا حصہ بھی ہے۔ بالفرض اگر کوئی شخص اپنی پوری زندگی بلا کسی غیر کے تعاون کے انسانی آبادی اور معاشرے سے الگ ہوکر کسی جنگل، بیابان یا کسی غار میں تنہا گزارنا چاہتا ہے تو اول تو یہ ممکن نہیں ہے، دوسرے اپنی فطرت سے انحراف اور بغاوت بھی ہے۔جس کی کسی ذہنی اور جسمانی لحاظ سے صحت مند انسان سے توقع نہیں کی جاسکتی، مادّی اشیاء میں باہمی تعاون کے ساتھ ساتھ معاشرے میں انسان کو ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کرتے ہوئے جو سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے وہ تنہا رہنے کی صورت میں ممکن نہیں اور یہ ذہنی سکون انسان کی صحت کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ غذا کسی صحت مند جسم کے لیے، انسانی اجتماعیت

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ دینیات (سنّی)، اے-ایم-یو، علی گڑھ

اور معاشرے کی اسی اہمیت کے موضوع پر مشہور مفکر اور مؤرخ، سماجی علوم کے بانی ابن خلدون نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف مقدمہ ابن خلدون میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"الاجتماع الانسانی ضروری ویعبر الحکماء عن ھذا بقولھم الانسان مدنی بالطبع أی لا بد له من الاجتماع الذی ھو المدنیة فی اصطلاحھم"۔[1]

(انسانی اجتماعیت ضروری ہے اور حکما اسی کو یوں کہتے ہیں کہ انسان فطرتاً اجتماعیت پسند ہے یعنی اجتماعیت اس کے لیے ضروری ہے۔)

امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اعلم ان الانسان خلق مدنیاً بالطبع لان الانسان الواحد لاینتظم مصالحه الا عند وجود مدینة تامة."[2]

(جان لو کہ انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے مدنی الطبع ہے کیونکہ کوئی فرد واحد اپنے مفادات اور مصالح کی رعایت اور ان کی نگرانی تبھی کر سکتا ہے جب پوری اجتماعیت موجود ہو۔)

مذکورہ بالا باتوں سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ انسان کے لیے اجتماعیت ایک لازمی شئ ہے۔ اس کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔

قانون کی ضرورت

جہاں ایک طرف اجتماعی زندگی گذارنا انسانی فطرت اور اس کی ضرورت ہے وہیں مختلف لوگوں کے یکجا رہنے کی صورت میں آپس میں اختلاف، مخاصمت اور نزاع پیدا ہونے کا بھی قوی امکان ہے نیز جور و ستم، کمزوروں کو ستانا، ان پر ظلم و زیادتی کرنا، جبر و اکراہ سے ان کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنانا اور اپنا خوف اور رعب و دبدبہ کمزوروں پر قائم کرنا بھی اسی انسان میں موجود حیوانی جبلت کا خاصہ ہے جس سے اس کی حیوانی جبلت

خوش ہوتی ہے اور جس کا مشاہدہ ہر آن ہوتا رہتا ہے۔ اس سے وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں جو تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پابندی کرتے ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

"وَإِنَّ كَثِيراً مِّنْ الْخُلَطَاء لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيْلٌ مَّاهُمْ" (ص:۲۴)

(واقعہ یہ ہے کہ مل جل کر ساتھ رہنے والے لوگ اکثر ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے رہتے ہیں بس وہی لوگ اس سے بچے ہوتے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں۔)

اس لیے معاشرے میں امن وامان قائم کرنے کے لیے کچھ اصول وضوابط کی ضرورت پیش آتی ہے جن کی پابندی کرنے سے معاشرے میں امن وامان باقی رہتا ہے۔ انہی اصول وضوابط کو قانون کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ملک میں کوئی قانون اور اصول وضابطہ نہیں ہوگا تو پھر فساد پیدا ہوگا۔

قرآن کے نقطہ نظر سے قانون کا اصلی مصدر وماٴخذ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے جس نے پیدا کیا ہے، قانون بنانے اور بتانے کا اختیار بھی اسی کو حاصل ہے۔ دنیا میں ہر حکم اللہ کا نافذ ہوگا، خلیفہ یا حکمراں کی ذمہ داری ان کا نفاذ ہے۔ ارشاد باری ہے: ألا له الخلق والأمر ۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: إن الحكم إلا لله ۔ اس کے علاوہ اور بھی آیات ہیں جو اس کی وضاحت کرتی ہیں کہ قانون سازی کا حق اللہ تعالیٰ کا ہی ہے۔

حاکم کی ضرورت

انسان اور معاشرے کی فلاح و بہبود ہی قانون کا اصلی مقصد ہوتا ہے، لیکن صرف قانون کا موجود ہونا ہی مقصد کے حصول کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ عوام کی فلاح اور بہبود کی خاطر بنائے گئے ان قوانین کے مفید نتائج اسی وقت ظاہر ہوں گے جب سبھی لوگ لازماً ان کی پابندی کریں۔ اس لیے کسی ایسے شخص کا ہونا بھی ناگزیر ہے جو قوت و

اقتدار رکھتا ہو اور جو لوگوں کو ان قوانین کی پابندی پر مجبور کر سکتا ہو۔ نیز قانون توڑنے والوں اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دینے کی طاقت اور اختیار بھی رکھتا ہو، چنانچہ جس طرح معاشرے کے اندر نظم ونسق، امن و امان قائم کرنے کے لیے قوانین ضروری ہیں اسی طرح لوگوں سے ان قوانین کی پابندی کروانے کے لیے ایک سربراہ اور حاکم کا ہونا بھی ناگزیر ہے جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ امام رازی نے اس کی ضرورت ان الفاظ میں ذکر کی ہے:

> ”وعند اجتماعهم فی الموضع الواحد يحصل بينهم منازعات ومخاصمات ولابد من انسان قاهر يقطع تلك الخصومات وذلك هو السلطان الذی ينفذ حكمه علی الكل فثبت، انه لا ينتظم مصالح الخلق الا بسلطان قاهر.“[3]
>
> (مختلف لوگوں کے ایک ساتھ رہنے سہنے سے ان کے بیچ نزاع اور مخاصمت بھی پیدا ہوتی ہے اس لیے کسی طاقت اور غلبے والے شخص کا ہونا بھی ضروری ہے جو ان کے بیچ پیدا ہونے والے خصومات کا خاتمہ کر سکے اور معاشرے کا ہر فرد جس کے حکم کا پابند ہو، اور یہی سلطان کہلاتا ہے یہیں سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ خلق خدا کے مصالح و مفادات کی رعایت اور نگہداشت بغیر سلطان یا حاکم کے ممکن نہیں۔)

اس کرۂ ارض پر جہاں کہیں بھی کوئی چھوٹی سے چھوٹی انسانی آبادی پائی جائے گی ان کے بیچ نظم وامن و امان قائم رکھنے کے لیے کسی سربراہ کا ہونا ناگزیر ہے اور جس معاشرے میں کوئی سربراہ نہ ہو اس کی مثال ان بھیڑیوں کی سی ہے جس کا کوئی چرواہا نہ ہو۔ کسی امیر کے بغیر کوئی مختصر سے مختصر انسانی جماعت اختلاف وانتشار اور فتنہ وفساد سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

سربراہ اور امیر کا جہاں ایک فائدہ یہ ہے کہ تمام لوگ آپس میں ایک دوسرے سے مربوط رہتے ہیں وہیں یہ لوگ مختلف طرح کے بیرونی خطرات سے بھی محفوظ رہتے

ہیں۔حدیث پاک میں امیر کو ڈھال سے تشبیہ دی گئی ہے،فرمایا-الأمیر جُنّة ہے جس طرح آدمی ڈھال کے ذریعہ اپنے دشمن کے وار کو روکتا اور اپنا دفاع کرتا ہے اسی طرح امیر اور حاکم کسی ممکنہ بیرونی حملے اور خطرے سے اپنے لوگوں کا دفاع کرتا ہے اور ان کو ہر طرح کے نقصانات وحوادث سے بچاتا ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو اس بات کی بہت تاکید کرتا ہے کہ ان کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی جماعت بھی کسی حال میں بغیر امیر کے نہ رہے۔حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ جب تین لوگ کسی سفر پر نکلو تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنالو۔

"عن أبی سعید الخدری ان رسول الله ﷺ قال اذا خرج ثلاثة فی سفر فلیؤمروا احدهم"۔[۵]

امارت طلبی کی ممانعت

جہاں ایک طرف مسلمانوں کو یہ ترغیب اور تاکید کی جارہی ہے کہ وہ بغیر سربراہ اور امیر کے زندگی نہ گزاریں وہیں انھیں یہ بھی حکم دیا جارہا ہے کہ وہ ازخود کسی امارت کے خواہش مند نہ ہوں،ہاں بغیر طلب اور بغیر کسی خواہش کے اگر لوگوں کی طرف سے باصرار یہ ذمہ داری تفویض کی جاتی ہے تو اس کو لے لینے میں کوئی حرج نہیں۔اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اعانت اس کو حاصل ہوگی۔اسی سے متعلق امام بخاریؒ نے اپنی الجامع الصحیح میں خاص یہ باب باندھا ہے:

باب من لم یسأل الله الأمارة أعانه الله۔

(جو شخص اللہ تعالیٰ سے امارت طلب نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتا ہے۔)

پھر آگے یہ حدیث پاک بیان کی ہے:

"عن عبدالرحمن بن سمرة قال قال النبی ﷺ یا عبدالرحمن لا تسأل الإمارة فانک إن أدیتها عن مسألة وکلت علیها وإن أدیتها عن غیر مسألة اعنت علیها۔"[۶]

(عبدالرحمٰن بن سمرہؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے عبدالرحمٰن تم امارت طلب نہ کرو اس لیے کہ اگر یہ تم کو طلب کرنے سے ملی ہے تو تم اسی کے ہو رہو گے اور اگر یہ تمھیں بغیر طلب اور بغیر درخواست کے ملی ہے تو تمھیں اس پر مدد ملے گی۔)

ایک دوسری روایت میں جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"عن أبی هريرةؓ عن النبی قال انكم ستحرصون على الامارة وستكون ندامة يوم القيٰمة فنعم المرضعة وبئس الفاطمة"۷

(تم لوگ امارت کی حرص کرتے ہو اور قیامت میں عنقریب افسوس ہوگا پس آغاز تو اچھا ہے لیکن انجام برا ہے۔)

ایک اور حدیث جو حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے:

"عن أبی ذر قال قلت يا رسول الله ألا لتستعملنی قال فضرب بيده على منكبی ثم قال يا اباذر إنک ضعيف وأنها أمانة وانها يوم القيٰمة خزی وندامة الا من أخذها بحقها وادى الذی عليه فيها"۸

(حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا آپ مجھے عامل کیوں نہیں بناتے۔ ابوذر کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا ابوذر تم کمزور آدمی ہو اور یہ ایک امانت ہے اور یہی چیز قیامت میں رسوائی اور ندامت کا سبب ہوگی ہاں مگر جس نے اسکو اس کے استحقاق کی بنیاد پر لیا اور اس کا حق ادا کیا۔)

حضرت ابوموسیٰؓ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے دو برادر عم زاد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں سے ایک نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے

جن علاقوں کا والی بنایا ہے ان میں سے کسی علاقہ کا ہمیں امیر مقرر فرما دیجیے، دوسرے نے بھی ایسی ہی خواہش ظاہر کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بخدا میں اس عمل پر (یعنی امارت پر) کسی ایسے شخص کو مامور نہیں کروں گا جو اس کی درخواست کرے اور نہ کسی ایسے شخص کو جو اس کا حریص ہو۔[9]

بلاشبہ وہ لوگ جن کے اندر اس کی صلاحیت نہ ہو انھیں اس کی طلب اور خواہش نہیں رکھنی چاہیے۔ لیکن عوام اگر کسی کو موزوں اور اہل سمجھ کر امارت تفویض کر رہے ہیں تو اسے ذمہ داری قبول کرنے سے فرار بھی نہیں اختیار کرنا چاہیے کیونکہ سبھی حضرات اگر اس کو قبول کرنے سے پیچھے رہیں گے تو ایسا ہوگا کہ لوگوں کا کوئی امیر ہی نہیں ہوگا جو کہ کسی بھی حال میں متصور نہیں۔ بلکہ جہاں ایک طرف حدیث میں مَناصب کی خواہش اور درخواست کرنے سے روکا گیا ہے وہیں قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے سے یہ صاف اشارہ ملتا ہے کہ بعض خاص موقعوں پر جب آدمی کو یہ یقین ہو کہ اس وقت اگر اس نے یہ منصب نہیں لیا تو ایک ایسا شخص اس پر فائز ہو جائے گا جو اس کا اہل نہیں ہے۔ وہ اپنے عہدے اور عوام کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گا نیز عوام کو اس کی وجہ سے پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تو وہ خود حاکم وقت یا عہدہ دینے والے شخص سے اس کی درخواست کر سکتا ہے۔ اور اس وقت یہی عین ثواب ہوگا۔ ارشاد باری ہے۔

"قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْأَرْضِ إِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ"۔ (سورۂ یوسف:۵۵)

(کہا آپ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے، میں حفاظت کرنے والا باخبر ہوں۔)

امیر کی اطاعت

قرآن اور احادیث میں متعدد مقامات پر امیر کی اطاعت کا حکم اور اس سے اختلاف اور دوری اختیار کرنے کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے

کہ جب تک امیر کی اطاعت میں خالق کی معصیت نہ ہو رہی ہو، اس کی اطاعت فرض ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''مرد مسلم پر امیر کی اطاعت جب تک کہ وہ کسی معصیت کا حکم نہ دے رہا ہو فرض ہے چاہے اس کی بات اسے پسند ہو یا ناپسند ہو اور جب وہ خالق کی معصیت کا حکم دے تو وہاں اس کی اطاعت نہیں''۔[۱۰]

ایک دوسری حدیث جو حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اسمعوا و أطیعوا وإن استعمل علیکم عبد حبشی''[۱۱]

(امیر کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو اگرچہ کوئی بدشکل حبشی غلام ہی تمہارا حاکم کیوں نہ ہو۔)

صدر اول میں اسلام اور مسلمانوں کو جو طاقت اور سربلندی نصیب ہوئی اس کا اصل راز اور ان کی قوت کا اصل سرچشمہ ان کا ایسا اتحاد و اتفاق تھا اور آپسی اتحاد و اتفاق کی بدولت اپنی قلت تعداد کے باوجود انہیں وہ طاقت نصیب ہوئی کہ جس کے آگے اپنے وقت کے قیصر و کسریٰ کی بڑی بڑی حکومتیں بھی پارہ پارہ ہوگئیں۔ اتحاد و یکجہتی میں جو طاقت ہے اس سے کیسے انکار ہوسکتا ہے اسی لیے اسلام میں اس کو دین سے مربوط کردیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَاعْتَصِمُواْ بِحَبْلِ اللّهِ جَمِيعاً وَلاَ تَفَرَّقُواْ'' (سورہ آل عمران:۱۰۳)

(اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھام لو اور پھوٹ نہ ڈالو۔)

چنانچہ صحابہ کرامؓ اپنی قلت تعداد کے باوجود اپنے آپسی اتحاد و اتفاق کی بدولت ہی قیصر و کسریٰ نامی دنیا کی دو عظیم سلطنتوں پر غالب آگئے تھے چنانچہ قادسیہ کے معرکے میں مسلم افواج کی تعداد تیس ہزار یا اس سے کچھ زیادہ تھی جب کہ ایرانی افواج کی تعداد اس سے چار گنا زیادہ ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ اسی طرح یرموک کے میدان میں ہرقل کی افواج کی تعداد چار لاکھ تھی جب کہ مسلم فوج کی تعداد وہی تیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔

ظاہر ہے مسلمانوں کو ان معرکوں میں جو فتح اور کامیابی نصیب ہوئی وہ امیر کی اطاعت اور آپسی اتحاد و اتفاق ہی کی وجہ سے ممکن ہوئی۔ چنانچہ اتحاد و یکجہتی میں جو طاقت ہے اس سے دنیا میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ امیر نقطۂ اتحاد ہوتا ہے جس کے بغیر اتحاد مشکل ہے اسی لیے اسلام نے اپنے ماننے والوں کو امیر کی اتباع کا حکم دے کر اسے دین کا جز بنا دیا، قرآن میں ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ“ (سورۃ النساء: ۵۹)

(اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں صاحب امر ہیں۔)

مسلم قوم کے اندر ہر حال میں اتحاد و اتفاق باقی رہے۔ ان کی وحدت کا شیرازہ منتشر نہ ہو اس کے لیے انھیں سربراہ اور امیر کی کسی بات سے اختلاف اور ناپسندیدگی کے باوجود جماعت سے دوری و علیحدگی اختیار کرنے پر حدیث شریف میں مذمت کی گئی ہے۔

”عن ابن عباس رضی الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ من رأى من أمير شيئا فكرهه فليصبر بأنه ليس أحد يفارق الجماعة شبرا فيموت الامات ميتة جاهلية“[۱۲]

(حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اپنے امیر میں کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے ناپسند ہو تو اس پر اسے صبر کرنا چاہیے کیونکہ جو کوئی جماعت سے ایک بالشت بھی علیحدگی اختیار کرے گا اور اسی حال میں اس کی موت ہوگی تو وہ جاہلیت کی موت ہوگی۔)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جماعت سے علیحدگی اختیار کرنا ایمان کے منافی ہے۔ آج پوری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کی کثرت کے باوجود جو حالت اور جو بے وقعتی ہے اس کا اصل سبب بلاشبہ ان کی آپسی نااتفاقی ہے۔ قرآن کریم

میں مؤمنین کو آپس میں تنازع سے منع کرتے ہوئے اس کی وجہ بیان کی گئی کہ اس سے تمہارے اندر بزدلی آجائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔قرآن کریم میں ہے:

''وَأَطِيعُواْ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَلاَ تَنَازَعُواْ فَتَفْشَلُواْ وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُواْ إِنَّ اللّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ'' (الانفال:۴۶)

(اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتے رہو، آپس میں اختلاف نہ کرو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور صبر کرو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

جب تک امیر یا سربراہ اپنے فرائض منصبی پورا کر رہا ہے اور اپنی رعایا کے حقوق ادا کر رہا ہے عوام کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے حاکم یا سربراہ کی اطاعت کریں یہ اطاعت امیر کا حق ہے جو اس کو ہر حال میں ملنا چاہیے۔لیکن آج مسلم قوم، مسلم معاشرے کی سب سے بنیادی خرابی یہی ہے کہ یہ کسی کو اپنا امیر اور سربراہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حکمرانوں کی تنقید اور تنقیص کرنا ہر کس و ناکس کا ذاتی حق ہو گیا ہے اگر حسن اتفاق سے دنیا کے کسی مسلم ملک میں کچھ امن و سکون نظر آ رہا ہے تو ان کے اس امن و سکون سے دوسرے تکلیف میں مبتلا ہیں۔ ہر امیر اور سربراہ دوسروں کی نگاہ میں بالکل نا اہل و ناکارہ ہے۔ جب کہ ہر شخص کو دوسروں کے عیوب پر نظر رکھنے سے پہلے خود اپنے عیوب پر نگاہ ڈالنی چاہیے۔قرآن کریم میں بنی اسرائیل کا حال مسلمان اہل ایمان کے سامنے ان سے عبرت کے لیے بیان کیا گیا ہے جب وہ اپنے نبی سے ایک بادشاہ کی درخواست کرتے ہیں اور جب کسی کو بادشاہ بنا دیا جاتا ہے تو وہی لوگ خود کو ان سے زیادہ اہل اور حق دار سمجھتے ہوئے ان کے حکم کی نافرمانی کرتے ہیں اور اس نافرمانی کے نتیجے میں ان کے دلوں میں بزدلی پیدا ہو گئی تھی۔ارشاد پاک ہے:

''أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلإِ مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ مِن بَعْدِ مُوسَى إِذْ قَالُواْ لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكاً نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلاَّ تُقَاتِلُواْ قَالُواْ وَمَا لَنَا أَلاَّ نُقَاتِلَ فِي

سَبِیلِ اللّٰہِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِیَارِنَا وَأَبْنَآئِنَا فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْاْ إِلاَّ قَلِیلاً مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِیمٌ بِالظَّالِمِینَ. وَقَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكاً قَالُوَاْ أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ'' (سورہ بقرہ:۲۴۶-۲۴۷)

(کیا آپ نے موسیٰ کے بعد والی بنی اسرائیل کی جماعت کو نہیں دیکھا جب کہ انھوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ کسی کو ہمارا بادشاہ بنا دیجیے تا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ پیغمبر نے کہا کہ ممکن ہے جہاد فرض ہو جانے کے بعد تم جہاد نہ کرو، انھوں نے کہا بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے ہم تو اپنے گھر سے اجاڑ دیے گئے ہیں۔ پھر جب ان پر جہاد فرض ہوا تو سوائے تھوڑے سے لوگوں کے سب پھر گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اور انھیں ان کے نبی نے فرمایا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ بنا دیا ہے تو کہنے لگے بھلا اس کی ہم پر حکومت کیسے ہو سکتی ہے؟ اس سے تو بہت زیادہ حق دار بادشاہت کے ہم ہیں۔ اس کو تو مالی کشادگی بھی نہیں دی گئی۔ نبی نے فرمایا سنو اللہ تعالیٰ نے اسی کو تم پر برگزیدہ کیا ہے اور اسے علمی و جسمانی برتری بھی عطا فرمائی ہے بات یہ ہے کہ اللہ جسے چاہے اپنا ملک دے۔ اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے۔)

آج مسلمان قوم بھی اپنا ایک امیر تو چاہتی ہے لیکن کسی کی امامت اور سربراہی پر راضی نہیں، ہر شخص خود کو اس کا زیادہ اہل اور مستحق سمجھتا ہے۔ جب کہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ منصب اور عہدہ کی خواہش کرنا ممنوع ہے۔ آج کسی کو سوائے خامی اور عیوب کے

کسی امیر میں کوئی خوبی اور اہلیت نظر ہی نہیں آتی۔

اسلامی نظام سیاست

اسلام کے نظام حکومت پر کچھ کہنے سے پہلے لفظ خلیفہ کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ تاریخی لحاظ سے اسلام کی تاریخ میں حاکم اعلیٰ کے لیے خلیفہ کی اصطلاح معروف رہی ہے، اگرچہ ان میں سے بعض خلفاء نے ذاتی طور پر اپنے لیے خلیفہ کے بجائے امیر المومنین کا لقب کہلوانا پسند فرمایا لیکن مجموعی طور پر اسلامی تاریخ میں حکمرانوں کے لیے یہی اصطلاح کتابوں میں ملتی ہے۔ یہ لفظ **خلف یخلف** سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی کسی کے پیچھے آنا، کسی کا جانشین اور قائم مقام ہونا ہے۔ لسان العرب میں ہے: **خلفه یخلفه خلفاً صار مکانه** ۔[۱۳] لغوی لحاظ سے خلیفہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اپنے ماقبل کا قائم مقام ہو۔ **الخلیفة الذی یستخلف ممن قبله** ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ مختلف مشتقات کی شکل میں متعدد آیات میں آیا ہے۔

"وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ" (الاعراف:٦٩)

(اور تم یہ حالت یاد کرو کہ اللہ نے تم کو قوم نوح کے بعد جانشین بنایا۔)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِينَ فِيهِ" (الحدید:۷)

(اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے (مالک بنایا ہے)۔)

یہ لفظ اپنے اصل معنی یعنی قائم مقامی اور جانشینی کے ساتھ ساتھ اقتدار اور اختیار کا مفہوم بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

"وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ" (النور:۵۵)

(تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کیے ہیں

اللہ وعدہ فرما چکا ہے کہ انھیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسے کہ ان لوگوں کو بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے۔)

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام فرمانروائے وقت کے لیے ان کے اقتدار اور سلطنت کا اظہار کرنے کے لیے لفظ خلیفہ کا استعمال فرمایا:

”یَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَةً فِیْ الْأَرْضِ فَاحْکُم بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ“ (ص:۲۶)

(اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو۔)

امام فخر الدین رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”انا جعلناک مالکا للناس ونافذ الحکم فیھم. وحاصله ان خلیفة الرجل یکون نافذا لحکم فی رعیته“ [۱]

(ہم نے تمھیں لوگوں کا بادشاہ اور حکمراں بنایا مختصر یہ کہ خلیفہ اپنی رعایا میں حکم نافذ کرنے والا ہوتا ہے۔)

خلیفہ کا لفظ یہاں سلطان اور ملک کا ہم معنیٰ ہے، لوگوں کے بیچ حکم وہی ہوتا ہے جس کو قوت اور اقتدار حاصل ہو۔ لسان العرب میں ہے، الخلیفة السلطان الاعظم ۔ یہ لفظ اپنے اصل معنیٰ نیابت اور جانشینی وقائم مقامی کے ساتھ ساتھ اقتدار اور اختیار کا معنی بھی رکھتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں حاکم اعلیٰ کے لیے اگر چہ خلیفہ کی اصطلاح معروف ومقبول رہی ہے لیکن قرآن کریم میں ملک اور ملوک کے الفاظ بھی عزت واکرام کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں۔ ارشاد پاک ہے:

”وَإِذْ قَالَ مُوسَی لِقَوْمِهِ یَا قَوْمِ اذْکُرُواْ نِعْمَةَ اللّهِ عَلَیْکُمْ إِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ أَنبِیَاء وَجَعَلَکُم مُّلُوکاً وَآتَاکُم مَّا لَمْ یُؤْتِ أَحَداً مِّنَ الْعَالَمِیْنَ“ (المائدۃ:۲۰)

(اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں سے پیغمبر بنائے اور تمھیں بادشاہ بنایا اور تمھیں وہ دیا جو تمام عالم میں کسی کو نہیں دیا۔)

دوسری جگہ آیا ہے:

"إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ" (النمل:۲۳)

(میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اس قوم کی حکمراں ہے اور اس کو ہر طرح کا سروسامان بخشا گیا ہے اور اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے۔)

اس کے علاوہ دوسری جگہ ارشاد ہے:

"وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكاً" (البقرہ:۲۴۷)

(اور ان کے نبی نے ان سے کہا اللہ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے۔)

خلیفہ کا انتخاب

قرآن کریم نے اولوالامر کی اطاعت کا حکم دے کر یہ واضح کر دیا کہ حاکم اعلیٰ اور اولوالامر کا ہونا ناگزیر ہے۔ یہ بات عقلاً اور شرعاً ہر لحاظ سے ثابت ہے۔ لیکن اولوالامر کی تعیین اور طریقۂ انتخاب کی کوئی واضح رہنمائی نہیں کی۔ حکمراں کا انتخاب کس طرح سے عمل میں آئے گا اس تعلق سے کوئی وضاحت نہیں کی، بلکہ عوام پر چھوڑ دیا اور جن چیزوں کی وضاحت شریعت نے نہیں کی ہے ان کا حل اہل زمانہ حالات اور ضرورت کے مطابق ڈھونڈ سکتے ہیں۔ چنانچہ حکمراں کے انتخاب کا بھی کوئی طریقہ اہل زمانہ اپنے حالات اور ضرورت کے مطابق اختیار کر سکتے ہیں۔ معروف عالم دین مولانا تقی امینی صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

"قرآن نے یہ نہیں بتایا کہ حکمراں کا انتخاب کس طرح عمل میں لایا جائے،

حکومت موجودہ طرز کی جمہوری ہوگی یا شاہی، آمرانہ ہوگی کہ فوجی ڈکٹیٹر شپ، رائے عامہ معلوم کرنے کی کیا صورت ہوگی، اصولی طور پر جو بھی حکومت ہو اس کا بنیادی مقصد زیادہ سے زیادہ الٰہی صفتوں کو اپنے اندر جذب کر کے عدل و مساوات کے اصول پر مخلوق کے لیے مادی اور روحانی فوائد کا بندوبست کرنا ہونا چاہیے۔''[16]

حکومت شخصی یا جمہوری جیسی بھی ہو خلیفہ کے انتخاب کا جو طریقہ بھی عمل میں لایا جائے جو شخص خلیفہ منتخب ہو جائے وہ اللہ کے احکامات کو دنیا میں نافذ کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ اسلام میں قانون کا مرکز اور سرچشمہ اللہ اور اس کے رسول کی ذات ہے حاکم وقت کا کام ان احکامات کو دنیا میں نافذ کرنا ہے۔ قرآن کریم کی مختلف آیات میں خلیفہ کی ذمہ داریوں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ ارشاد پاک ہے:

''الَّذِيْنَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ'' (الحج:41)

(یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں تو یہ پوری پابندی سے نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھے کاموں کا حکم کریں گے اور برے کاموں سے منع کریں گے۔)

اس آیت میں اسلامی حکومت کے بنیادی اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ہیں جنھیں جب بروئے کار لایا گیا تو امن وسکون، خوش حالی اور سر بلندی نصیب ہوئی اس کے علاوہ قرآن کریم کی یہ آیت اسلامی نظام پر روشنی ڈالتی ہے:

''إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا'' (نساء:58)

(اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انہیں پہنچاؤ۔)

مولانا ابوالکلام آزاد اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اجتماعی زندگی کے نظم وفلاح کے لیے اصول یہ ہے کہ جو جس بات کا حق دار ہو اس کے حق کا اعتراف کرو اور جو چیز جسے ملنی چاہیے وہ اس کے حوالے کرو۔ وارث کا حق ہو، یتیم کا مال ہو، امانت رکھنے والے کی

امانت ہو، اہلیت رکھنے والے کے لیے منصب اور عہدہ ہو، جو جس کا اہل ہے وہ اسے ملنا چاہیے۔"[۱۸]

مذکورہ آیت میں امانت اپنے محدود مفہوم میں نہیں کہ کوئی چیز کسی غیر کے پاس حفاظت کی غرض سے رکھ دی جائے تو یہ امانت ہوگئی بلکہ اس سے مراد حکومت کے عہدے اور مناصب میں جو قوم کی امانت ہیں کسی سربراہ کو یہ حق حاصل نہیں وہ کوئی عہدہ یا منصب ایسے شخص کو دے دے جو اپنی علمی و عملی صلاحیت اور قابلیت کے لحاظ سے اس کا اہل نہیں۔ حکومتی عہدے اور مناصب صرف انہیں لوگوں کو دیے جائیں جو صلاحیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ بہتر اور مستحق ہوں، تعلقات اور شفارشات ہرگز حائل نہ ہونی چاہیے۔ جس طرح سے امانت صرف اس کے اصل مالک ہی کو لوٹائی جاتی ہے کسی پر رحم و کرم یا ترس کھا کر یا تعلقات کے پیش نظر کسی کی امانت کسی اور کو نہیں لوٹائی جاسکتی۔

اسی طرح حکومت کے عہدے جو قوم کی امانت ہے کسی ایسے شخص کو تفویض نہیں کیے جاسکتے جو اس کا اہل ہی نہیں۔ احادیث میں بھی اس بابت بہت وعید آئی ہے ایک حدیث میں ہے: "جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی اور تعلق کی بنیاد پر بغیر اہلیت کے دے دیا اس پر اللہ کی لعنت ہے"۔

دوسری روایت میں ہے: جس شخص نے کوئی عہدہ کسی شخص کے سپرد کیا حالانکہ اس کے علم میں تھا کہ دوسرا آدمی اس عہدے کے لیے اس سے زیادہ قابل اور اہل ہے تو اس نے اللہ سے خیانت کی۔ ایک اور حدیث میں مناصب کی تقسیم میں خیانت اور نا اہل کی تقرری کو قرب قیامت کی علامات کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جب امانتیں ضائع ہونے لگیں تو قیامت کا انتظار کرو۔ سائل نے پوچھا امانتیں کیسے ضائع ہوں گی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: جب ذمہ داری نا اہل کو تفویض کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو"۔[۱۹]

حضرت علیؓ بن ابی طالب سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: "امام پر واجب

ہے کہ وہ عدل سے کام لے اور رعایا کے حقوق ادا کرے، اگر وہ ایسا کرتا ہے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پہلے حکام کو عدل اور امانت کا حکم دیا ہے پھر مومنین کو ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے"۔[۲۱] بنیادی طور پر یہ دین امر اور طاعت کا دین ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ علامہ ابن خلدون، مقدمہ ابن خلدون، الفصل الاول، ص ۱۴۱، مکتبہ المثنیٰ، بغداد

۲۔ رازی امام فخر الدین، التفسیر الکبیر، جلد ۲۶، ص ۱۹۹، الطبعۃ الثالثۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت

۳۔ ایضاً، ص ۲۰۰

۴۔ امام مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الامارۃ، باب الامیر جنۃ

۵۔ موسوعۃ الحدیث الشریف، الکتب الستۃ، باشراف ومراجعۃ، صالح بن عبد العزیز بن محمد بن ابراہیم، دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، اپریل ۲۰۰۰ء، سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی القوم یسافرون یؤمرون احدہم

۶۔ امام مسلم، الجامع الصحیح، باب النہی عن طلب الامارۃ والحرص علیہا، جلد دوم، ص ۱۲۰، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، حدیث نمبر ۴۷۱۵

۷۔ محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الاحکام، باب ما یکرہ من الحرص علی الامارۃ، ۱۰۵۸، جلد دوم، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، حدیث نمبر ۱۴۸۷

۸۔ امام مسلم، الجامع الصحیح، باب النہی عن کراہیۃ الامارۃ بغیر ضرورۃ، ۴۷۱۹، ۱۲۰، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی

۹۔ ایضاً، ۴۷۱۸

۱۰۔ ایضاً، باب وجوب الطاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ وتحریمہا فی المعصیۃ، جلد دوم، ص ۱۲۵، حدیث نمبر ۴۷۶۳

۱۱۔ محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الاحکام، باب السمع والطاعۃ للامام مالم تکن معصیۃ، جلد دوم، ص ۱۰۵۷، حدیث نمبر ۷۱۴۲

۱۲۔ محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الاحکام، باب السمع والطاعۃ للامام مالم تکن معصیۃ، جلد دوم، ص ۱۰۵۸

۱۳۔ علامہ ابن المنظور، لسان العرب، جلد ۱۰، ص ۴۳۲، دار صادر بیروت، ۱۹۵۶

۱۴۔ امام فخر الدین، التفسیر الکبیر، جلد ۲۶، ص ۱۹۹

۱۵۔ علامہ ابن المنظور، لسان العرب، جلد ۱۰، ص ۴۳۲، دار صادر بیروت، ۱۹۵۶

۱۶۔ امینی، مولانا محمد تقی، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، ص ۶۲، ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی، ۱۹۷۲ء

۱۷۔ آزاد، مولانا ابوالکلام، ترجمان القرآن، جلد دوم، ۴۸۹، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۶۶ء

۱۸۔ محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب من سئل علما وہو مشتغل فی حدیثہ، حدیث نمبر ۵۹

۱۹۔ رازی امام فخر الدین، التفسیر الکبیر، جلد ۱۰، ص ۱۴۳، الطبعۃ الثالثہ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، بدون سنہ

☆☆☆

خلافت اور حکومت کے مباحث
قرآن کریم کی روشنی میں

صفدر سلطان اصلاحی*

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک اجتماعیت پسند مخلوق ہے۔ وہ ایک دوسرے کے تعاون کے بغیر زندگی نہیں گذار سکتا۔ پورے روئے زمین پر پھیلی انسانوں کی آبادیاں، ممالک، وہاں موجود نظامہائے حکم وقضا اور نافذ دساتیر اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ حکومت واجتماعیت کے بغیر اِن کے مادی اور تمدنی مطالبات ومقتضیات کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ خالق نے روز اول سے بنی نوع انسان کو تمام طرح کی ہدایات سے نوازا جن میں ان کی انفرادی اصلاح کے لیے روحانی اور اخلاقی ہدایات بھی ہیں اور معاشرتی واجتماعی ارتقا کے لیے سیاسی اور تمدنی ہدایات بھی۔ انہی ہدایات کے مجموعہ کا نام ''دین'' ہے۔

''دین'' ایک طرف انسانوں کی روحانی اور اخلاقی زندگی میں رہ نمائی فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف سیاسی اور اجتماعی زندگی میں بھی۔ چنانچہ قرآن مجید میں انسانوں سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ کائنات کی دیگر موجودات کی طرح اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود، حاکم اور مقتدر اعلیٰ تسلیم کریں، اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کے احکام وفرامین کو نافذ کریں۔ حاکمیت اور اقتدار کا یہ حق اس کے لیے مخصوص ہے۔ اور اس میں کوئی اس کا شریک وسہیم نہیں کیوں کہ کوئی نہ تو اس کا اہل ہے اور نہ کسی کو اس کا حق حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنی عظیم تر صفات اور کمالات اور اپنے بے پایاں احسانات کی وجہ سے اس

---

* ایسوسی ایٹ پروفیسر (عربی)، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ وسکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

کی حق دار ہے کہ وہ انسانوں کے لیے مناسب اور بہترین نظام زندگی تجویز کرے اور ان کے لیے آئین اور احکام وقوانین کا مجموعہ پیش کرے۔ اللہ تعالیٰ کی اس تشریعی اور قانونی حیثیت کا اعتراف دراصل عقیدۂ توحید کا لازمی تقاضا ہے۔ اس پر ایمان لائے بغیر نہ تو کوئی فرد مومن ہوسکتا ہے اور نہ ہی کوئی گروہ، معاشرہ اور جماعت ''امت مسلمہ'' کے لقب کی مستحق ہوسکتی ہے۔

مذکورہ بالا حقائق اور مطالبات کا تذکرہ قرآن مجید کی درج ذیل آیات میں آیا ہے:

''إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلَّهِ'' (الانعام:۵۷)

(حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے۔)

''قُلْ إِنَّ الأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ'' (آل عمران:۱۵۴)

(آپ کہہ دیجیے کہ فیصلہ کل کا کل اللہ کے اختیار میں ہے۔)

''وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ'' (القصص:۷۰)

(اسی کے لیے فرماں روائی ہے اور اسی کی طرف تم سب پھیرے جاؤ گے۔)

''أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ'' (المائدہ:۵۰)

(کیا یہ لوگ پھر سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ یقین رکھنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلے اور حکم کرنے والا کون ہوسکتا ہے۔)

''يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُواْ إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُواْ أَن يَكْفُرُواْ بِهِ'' (النساء:۶۰)

(وہ اپنے فیصلے غیر اللہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں حالاں کہ انھیں اس کا انکار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔)

''وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللَّهَ وَاجْتَنِبُواْ

الطَّاغُوتَ" (النحل:۳۶)

(ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ (لوگو) صرف اللہ کی عبادت کرو اوراس کے سوا تمام معبودوں سے بچو۔)

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْراً أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالاً مُّبِيناً" (الاحزاب:۳۶)

(اور کسی مومن مرد و عورت کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کے بعد اپنے کسی امر کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ اللہ اور اس کے رسول کی جو بھی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں پڑے گا۔)

خلافت انسان

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار یہ حقیقت بیان کی ہے کہ اس نے اس کائنات اور اس میں موجود بہت سی چیزوں کی تخلیق کے بعد حضرت آدم کی تخلیق کا فیصلہ کیا پھر ان کو ان کی ذریت اور نسل کو بڑھنے اور پھیلنے کا ذریعہ بنایا۔ اس نسل انسانی کو اپنے گراں قدر احسانات اور عنایات سے نوازتے ہوئے اس کو اپنی بہت سی مخلوقات پر برتری عطا کی اور اسے خلیفہ بنایا، تاکہ وہ اس دنیا میں اس کے احکام و فرامین کو نافذ کریں۔

"وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" (البقرہ:۳۰)

(اور یاد کرو جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔)

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلاً" (الاسراء:۷۰)

(یقیناً ہم نے اولاد آدم کو بڑی عزت دی اور انھیں خشکی اور تری کی سواریاں دیں اور انھیں پاکیزہ چیزوں کا رزق عطا کیا اور انھیں اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔)

''وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلاَئِفَ الأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِیْ مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ''(الانعام:۱۶۵)

(اور وہی ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا اور تم میں سے ایک کا دوسرے پر درجہ بڑھایا تا کہ تم کو آزمائے۔ بے شک تیرا پروردگار بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بہت بخشنے والا مہربان ہے۔)

''وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِن قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُواْ وَجَاءتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُواْ لِيُؤْمِنُواْ كَذَلِكَ نَجْزِیْ الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ. ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلاَئِفَ فِیْ الأَرْضِ مِن بَعْدِهِم لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ''(یونس:۱۳،۱۴)

(اور تم سے پہلے کئی امتوں کو جب انھوں نے ظلم کیا ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے۔ ہم گنہ گار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تا کہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔)

مذکورہ بالا آیات میں اور ان کے علاوہ قرآن مجید میں دیگر مقامات پر لفظ خلیفہ یا اس کی جمع خلائف اور ''خ ل ف'' مادہ سے مشتق دوسرے الفاظ مثلاً 'استخلاف'، 'خَلَفَ'، 'خُلفاءُ'، 'خلفٌ'، 'اُخلُفنِي' اور 'یَخلفون' وغیرہ کا استعمال ہوا ہے۔ ان تمام الفاظ کے مفاہیم میں جانشینی اور نیابت کا معنیٰ شامل ہے۔ البتہ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ انسانوں کو کس کا خلیفہ بنایا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا یا زمین میں آباد کسی مخلوق کا۔ علامہ

عبدالحمید فراہیؒ نے مذکورہ بالا دونوں مفاہیم اوران کے دلائل کے تذکرہ کے بعد لکھا ہے:

''اگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان اللہ کا خلیفہ بنایا گیا، تو کیا ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین کے معاملات دیکھنے کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ اسی طرح جیسے کسی بڑے بادشاہ کے ماتحت چھوٹے چھوٹے بادشاہ ہوا کرتے ہیں۔ وہ ان کے اچھے کاموں سے خوش ہوتے ہیں اور برے کاموں سے ناراض ہوتے ہیں۔ قرآن مجید نے نہ تو حضرت آدم، نہ کسی نبی اور نہ کسی انسان کے لیے ''خلیفۃ اللہ'' کی ترکیب استعمال کی ہے، اس لیے ہمیں بھی معتدل موقف اختیار کرنا چاہیے''۔[1]

مذکورہ آیات میں حضرت آدمؑ کے لیے ''خلیفہ'' اوران کی ذریت کے لیے ''خلائف'' کا استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے خلافت کے شرف سے سب سے پہلے حضرت آدمؑ ممتاز ہوئے پھر بعد میں ان کی قائم مقام ہوکران کی اولاد اور ذریت اس شرف سے مفتخر اور مکرم ہوئے۔ بیسویں صدی کے ممتاز ماہرِ اسلامیات، صاحب قلم، مؤرخ و سیرت نگار علامہ سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:

''ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدم کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ ان کی وراثت سے تمام بنی آدم کے حصے میں آئی اس لیے حضرت آدم کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی وہ بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی۔''[2]

علامہ موصوف نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''لیکن قرآن پاک کی ان آیتوں سے جو ابھی اوپر گزری ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے بنی آدم کو خلفاء فرمایا ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے توسط سے اس خلافت الٰہی کی سند ان کے متبوعین کو عطا ہوئی ہے اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔''[3]

خلافت-ایک امانت

قرآن مجید کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی بہت سی چیزوں کو انسانوں کے فائدہ کے لیے بنایا ہے اور انھیں ان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ وہ انھیں استعمال کرنے اور ان میں تصرف کرنے کا ایک محدود اور متعین وقت کے لیے اختیار رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ تصرف اور اختیار مطلق نہیں بلکہ مقید ہے۔ ان کی اصل حیثیت خلیفہ اور امین کی ہے۔ اس لیے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں کی قدر کریں ان پر اس کا شکر ادا کریں اور خلافت اور امانت کے جملہ تقاضوں کا پاس ولحاظ رکھیں۔ وہ اپنی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق گزاریں۔ زمین میں بدامنی کے بجائے اصلاح اور درستگی کو فروغ دین اور اپنے حاصل شدہ محدود اختیار کا غلط استعمال نہ کریں۔ قرآن مجید میں انسانوں سے مذکورہ بالا مطالبات متعدد مقامات پر کیے گئے ہیں۔ مثلاً:

''وَاذكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاء مِن بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً فَاذْكُرُوا آلاء اللّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ''

(الاعراف:٦٩)

(اور یاد کرو اللہ تعالیٰ نے تم کو قوم نوح کے بعد جانشین بنایا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاؤ زیادہ دیا۔ سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تا کہ تم کو فلاح ہو۔)

''هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ فَمَن كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ إِلَّا مَقْتاً وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَاراً'' (فاطر:٣٩)

(وہی ہے جس نے تم کو زمین میں آباد کیا۔ سو جو شخص کفر کرے گا اس کے کفر کا وبال اسی پر پڑے گا اور کافروں کے لیے ان کا کفران کے پروردگار کے نزدیک ناراضی بڑھنے کا باعث ہوتا ہے اور کافروں کے لیے ان کا کفر خسارہ ہی بڑھنے کا باعث ہوتا ہے۔)

''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِيْ ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِيْ لَا يُشْرِكُونَ بِيْ شَيْئاً وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ'' (نور:۵۵)

(تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا ہے کہ انھیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسے کہ ان لوگوں کو خلیفہ بنا دیا تھا جو ان سے پہلے تھے اور یقیناً ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوطی کے ساتھ محکم کر کے جما دے گا جیسے ان کے لیے وہ پسند فرما چکا ہے اور ان کے خوف وخطر کو وہ امن وامان سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو بھی شریک نہیں ٹھہرائیں گے، اس کے بعد بھی جو لوگ ناشکری اور کفر کریں وہ یقیناً فاسق ہیں۔)

''عَسٰى رَبُّكُمْ أَن يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ'' (الاعراف:۱۲۹)

(بہت جلد تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور اس کے بجائے تم کو اس سرزمین کا خلیفہ بنا دے گا، پھر تمہارا طرز عمل دیکھے گا۔)

سورہ الاحزاب (آیت ۷۲) میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے حوالہ سے یہ ارشاد فرمایا کہ وہ اس امانت کا بار اٹھانے کے لیے آمادہ ہو گیا جسے اٹھانے سے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے انکار کر دیا تھا۔ آیت کریمہ ہے:

''إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً''

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں امانت سے مراد خلافت ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اس آیت میں امانت سے مراد وہی خلافت ہے جو قرآن مجید کی رو سے انسان کو عطا کی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو طاعت و معصیت کی جو آزادی بخشی ہے اور اس آزادی کو استعمال کرنے کے لیے اسے بے شمار مخلوقات پر تصرف کے جو اختیارات عطا کیے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے اختیاری اعمال کا ذمہ دار قرار پائے اور اپنے صحیح طرزِ عمل پر اجر اور غلط طرزِ عمل پر سزا کا مستحق بنے۔ یہ اختیارات چونکہ انسان نے خود حاصل نہیں کیے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُسے دیے ہیں اور ان کے غلط و صحیح استعمال پر وہ اللہ کے سامنے جوابدہ ہے اس لیے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان کو خلافت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہاں ان کے لیے امانت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔''[۴]

علامہ سید سلیمان ندویؒ اس آیت کا مفہوم واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابت الٰہی کے بار کا اٹھانے والا انسان ہی ہے۔ یہ امانت الٰہی کیا ہے؟ یہ اسی نیابت و خلافت کا دوسرا پیرایہ ہے۔ نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا ہے بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے جو اس کو ملی ہے تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے۔اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات و محاسن و اوصاف سب اللہ کی طرف راجع ہیں اور اسی کے خزانے سے اُسے چند روز کے لیے عاریۃً ملے ہیں۔''[۵]

خلافت کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے مطلوبہ اوصاف

مذکورہ آیات میں نہ صرف یہ کہ انسانوں کے خلیفہ بنائے جانے کا تذکرہ ہے

بلکہ ان کی ذمہ داریوں، فرائض اور مطلوبہ طرز ہائے عمل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جسے مختصر الفاظ میں اس طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے اپنی عبادت، اپنی نعمتوں اور احسانات پر شکر اور ہر لمحہ اور ہر آن اپنی یاد (ذکر) کا مطالبہ کیا ہے اور اس کے منافی اعمال مثلاً شرک، کفر اور فسق وغیرہ سے اجتناب کا حکم دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنی عبادت، شکر اور ذکر کے طریقوں اور شکلوں کی بھی نشان دہی کی ہے اور کفر و شرک کے عواقب سے ڈرایا اور خبردار کیا ہے۔ اس کے لیے اس نے پہلا اہتمام یہ کیا کہ انسانوں کے اندرون میں اپنی معرفت اور خیر و شر کی تمیز کا داعیہ اور صلاحیت رکھی ہے۔

''وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا. فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا'' (الشمس:۷-۸)

(قسم ہے نفس کی اور اسے درست بنانے کی، پھر سمجھ دی اس کو غلط اور صحیح کی۔)

''إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً'' (الانسان:۳)

(ہم نے اسے راہ دکھادی، خواہ وہ شکر گزار بنے اور خواہ وہ ناشکرا۔)

دوسرا اہتمام یہ کیا کہ اس نے ہر دور میں انسانوں کی اصلاح اور رہنمائی کے لیے (خاص طور سے جب دین کے بارے میں ان میں اختلاف پیدا ہوا) نبیوں اور رسولوں کو مبعوث فرمایا اور انھیں اپنی ہدایات و فرامین پر مبنی کتابیں اور صحیفے عطا کیے۔ اس طرح سے لوگوں کو انبیاء کے اسوہ اور اللہ کی کتاب کے ذریعہ ہدایت ملتی رہی۔ لیکن ایک وقت گزرنے کے ساتھ لوگوں میں پھر انحراف آتا گیا اور وہ خدا کے دین اور کتاب کے بارے میں اختلاف کے شکار ہوتے گئے۔ یہ اختلاف، سرکشی اور انحراف بہت نمایاں طور سے بنی اسرائیل کے اندر پایا گیا۔ جس کی وجہ سے انھیں دینی سیادت کے منصب سے معزول کر دیا گیا اور اس کے لیے بنی اسرائیل کا انتخاب کرتے ہوئے ان میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مبعوث کیا گیا۔ قرآن مجید میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِناً عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ وَلاَ تَتَّبِعْ أَهْوَاءهُمْ عَمَّا جَاءكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً

وَمِنْهَاجاً وَلَوْ شَاء اللّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَـكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُم فَاسْتَبِقُوا الخَيْرَاتِ إِلَى الله مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعاً فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ. وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ وَلاَ تَتَّبِعْ أَهْوَاءهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللّهُ إِلَيْكَ'' (المائدۃ:۴۸-۴۹)

(اور ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ یہ کتاب نازل فرمائی جو اپنے سے اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان کی محافظ ہے اس لیے آپ ان کے آپس کے معاملات میں اسی اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کے ساتھ حکم کیجیے اس حق سے ہٹ کر ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ جایئے، تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک دستور اور راہ مقرر کردی ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ جو تمھیں دیا ہے اس میں تمھیں آزمائے۔ تم نیکیوں کی طرف جلدی کرو، تم سب کا رجوع اللہ ہی کی طرف ہے پھر وہ تمھیں ہر وہ چیز بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو۔ آپ ان کے معاملات میں خدا کی نازل کردہ وحی کے مطابق ہی فیصلہ کیجیے۔ ان کی خواہشوں کی تابعداری نہ کیجیے اور ان سے ہوشیار رہیے کہ کہیں یہ آپ کو اللہ کے اتارے ہوئے کسی حکم سے ادھر اُدھر نہ کریں۔)

تیسرا اہتمام یہ کیا کہ ان حضرات انبیاء میں سے بعض کو نبوت کے ساتھ مملکت اور بادشاہت سے بھی نوازا تھا۔ حضرت داؤد اور سلیمان کی سلطنت کی وسعت اور ان پر اپنی گراں قدر نوازشوں وانعامات کا ذکر اللہ تعالیٰ نے بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ ان کے علاوہ حضرت یوسف کی حیات مبارکہ کے کئی ادوار کے ساتھ ان کا مصر کے امور مملکت کی زمام ہاتھ میں لینے اور بحسن وخوبی انجام دینے کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ ان تین جلیل القدر پیغمبروں کے علاوہ بعض ایسے ملوک کا بھی ذکر ہے جو خدا ترس، ذمہ دار، اپنے

فرائض سے آگاہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے تھے ان میں طالوت، ذوالقرنین اور ملکہ سبا (حضرت سلیمان کے ذریعہ ایمان کی دولت پر سرفراز ہونے کے بعد) بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان سب تذکروں کے مطالعہ سے جہاں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ امور مملکت وفرائض سلطنت اگر ذمہ داری اور خدا ترسی کے ساتھ انجام دیے جائیں تو یہ اللہ کی رضا مندی اور خوشنودی کے حصول کا ذریعہ بن سکتے ہیں اور ایسا کرنا بعض جلیل القدر انبیاء کی سنت کے مطابق ہوگا۔ دوسری طرف ان میں ان حضرات کے مختلف واقعات کے تحت رویوں، طرز ہائے عمل اور ان کے ارشادات وغیرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولت، طاقت اور جاہ ومنصب کے باوجود آدمی کو صبر وشکر کا پیکر، عجز وانکسار کا نمونہ، عدل وانصاف کا علمبردار، جود وسخا کا عادی اور بعث بعد الموت پر غیر متزلزل یقین رکھنے والا ہونا چاہیے اور اپنے اقتدار، غلبہ اور کنٹرول کو خداوند حی وقیوم کا عطیہ اور اس کی امانت تصور کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان دونوں کو اَوّاب (بہت زیادہ رجوع ہونے والا) قرار دیا ہے اور دونوں کی زبان سے یہ اعلان عام کیا گیا ہے:

''وَقَالَا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ'' (النمل:۱۵)

سورہ الکہف میں ذوالقرنین کے واقعہ کے اخیر میں ان کے ذریعہ یہ اعتراف موجود ہے:

''قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهُ دَكَّاءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا'' (الکہف:۹۸)

(انھوں نے کہا کہ یہ میرے رب کا فضل وکرم ہے۔ مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوند خاک کردے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے۔)

محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی، حضرات انبیاء کرام کے سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر اپنی ہدایات اور تعلیمات کی تکمیل کردی۔ یہ ہدایات

زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہیں جن میں حکومت اور سیاست کا شعبہ بھی ہے۔ قرآن مجید کے مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے متبعین (امت مسلمہ) سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کی نصرت اور امداد کریں گے اور دنیا میں ان کو عزت، سربلندی، وقار اور اقتدار عطا فرمائیں گے البتہ یہ وعدہ ان کی دین اسلام سے فکری و عملی وابستگی، والہانہ تعلق، دین کے لیے ایثار و قربانی وغیرہ سے مشروط کر دیا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں ان شرائط کی تفصیلات ہیں وہیں یہ صراحت بھی ہے کہ اہل ایمان ان شرائط اور اوصاف حمیدہ پر پورے اتریں گے۔ ان کے ذریعہ عدل و انصاف کا قیام، صلوٰۃ و زکوٰۃ کا اہتمام، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا التزام اور من حیث المجموع پورے دین کا قیام عمل میں آئے گا۔ قرآن مجید کی ان آیات پر نظر ڈالنے سے ایک طرف اہل ایمان کی صفات اور خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے، دوسری طرف ان کی ذمہ داریوں اور فرائض کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئاً وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ'' (نور:۵۵)

(تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا ہے کہ انھیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسے کہ ان لوگوں کو خلیفہ بنا دیا تھا جو ان سے پہلے تھے اور یقیناً ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوطی کے ساتھ محکم کر کے جما دے گا جسے ان کے لیے وہ پسند فرما چکا ہے اور ان کے خوف و خطر کو وہ امن و امان سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو بھی شریک نہیں ٹھہرائیں گے، اس کے بعد بھی جو لوگ ناشکری اور کفر کریں وہ یقیناً

فاسق ہیں۔)؎٦

''اَلَّذِيْنَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ''(الحج:۴۱)

(یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جمادیں تو یہ پوری پابندی سے نمازیں قرائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھے کاموں کا حکم کریں گے اور برے کاموں سے روکیں گے، تمام کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔)؎٧

خلافت کے سب سے بہترین نمائندہ انبیاء کرام

قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء کرام کی موجودگی میں خلافت کا حق اور ذمہ داری (جو ان کی غیر موجودگی میں عامۃ الناس سے متعلق ہوتی ہے) ان کے ساتھ مخصوص ہوجاتی ہے اور وہ نبوت کے ساتھ کتاب کے حامل اور حکم (فیصلہ) دینے کے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ سورہ المائدہ کی مذکورہ آیت میں بھی نبی اکرمؐ کی یہی ذمہ داری بیان کی گئی ہے اور اس کی ادائیگی میں کسی طرح کی مداہنت یا تساہل سے منع کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر اس کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے:

''أُولَـٰئِكَ الَّذِيْنَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَإِن يَكْفُرْ بِهَا هَـٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْماً لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِيْنَ''(الانعام:۸۹)

(یہ لوگ ایسے تھے ان کو ہم نے کتاب، حکمت اور نبوت عطا کی تھی، سو اگر یہ لوگ اس کا انکار کریں تو ہم نے اس کے لیے ایسے بہت سے لوگ مقرر کردیے ہیں جو اس کے منکر نہیں ہیں۔)

''وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنَاهُم

مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ'' (الجاثیۃ:۱۶)
(یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب، حکومت اور نبوت دی تھی اور ہم نے
انھیں پاکیزہ اور نفیس روزیاں دی تھیں۔)

قرآن مجید میں چونکہ سابقہ اقوام وملل میں سے بنی اسرائیل کا سب سے تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے اس لیے دیگر امور ومعاملات کی طرح اس امر کا بھی جگہ جگہ تذکرہ ہے کہ انھیں ان کی مذہبی کتابوں (تورات وانجیل) کے مطابق اپنے مختلف فیہ مسائل میں رہنمائی حاصل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ان کے انبیاء کرام کے بارے میں خاص طور سے یہ صراحت ہے کہ وہ ان کے درمیان خدائی ہدایات کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے (''يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ أَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا...... ''المائدۃ:۴۴) (''وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الإِنْجِيْلِ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ......''المائدۃ:۴۷) بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ان کے علماء (احبار اور رہبان) کی یہ ذمہ داری بیان کی گئی ہے کہ انھیں عامۃ الناس کو برائیوں کے ارتکاب سے منع کرنا چاہیے تھا (''لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّوْنَ وَالأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ......''المائدۃ:۶۳) نیز اس پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے وہ خود حرام مال حاصل کرتے ہیں اور برائیوں میں غرق ہیں (''إِنَّ كَثِيْراً مِّنَ الأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ......'' التوبۃ:۳۴)

خلافت کا اطلاق جملہ امور حیات پر

مذکورہ بالا آیات میں انبیاء کرام اور ان کے متبعین کو جس ''حکم'' کو دیے جانے اور جو فیصلے کرنے ''اَنِ احْكُمْ'' یا ''وَلْيَحْكُمْ'' کی بات کی گئی ہے وہ عام ہے اور زندگی کے ہر معاملہ پر محیط ہے۔ اسے مذہبی اور دینی معاملات تک محدود کرنے کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بھی قرآن مجید میں بار بار ''اُحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ'' (ان کے درمیان اللہ کی نازل کردہ کتاب اور تعلیمات کے مطابق فیصلہ کرو) کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے قرآن مجید کی آیات (وحی متلو) اور اپنی رائے اور

صواب دید (وحی غیر متلو/ جس کے بارے میں قرآن میں آیا ہے ''وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ. إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ '') کی روشنی میں لوگوں کے دینی، اجتماعی، معاشی اور سیاسی معاملات میں ان کی رہنمائی کی، قرآن مجید اور آپؐ کی تیئیس (۲۳) سالہ نبوی زندگی کے دوران آپ کے صادر شدہ فیصلے اور احکام اور آپ کے معمولات اور فرمودات وغیرہ کے مجموعی مطالعہ سے ایک مکمل نظام زندگی کے تمام تفصیلات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہیں جن میں حکومت اور سیاست کی تفصیلات بھی شامل ہیں۔

رسول اللہ ﷺ اللہ کی نازل کردہ کتاب اور اپنی رائے اور فہم کے علاوہ معاشرت، تجارت، حکومت اور سیاست کے مختلف معاملات میں اپنے ساتھیوں سے بھی مشورے کرتے تھے۔ اس کا قرآن مجید میں آپ کو باضابطہ حکم دیا گیا تھا:

''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ '' (آل عمران:۱۵۹)

(اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو۔)

''وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ '' (الشوریٰ:۳۸)

(ان کا ہر معاملہ آپس میں مشورہ سے ہوتا ہے۔)۸

سیرت کے مطالعہ سے ہمیں یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ آپ نے بعض اہم معاملات میں اپنے صحابہ کی رائے کو قبول فرمایا اور اس پر عمل کیا۔ آپؐ کا یہ اسوہ امت مسلمہ کے لیے اس ہدایت کی فراہمی کے لیے کافی تھا کہ کتاب وسنت کے ساتھ افراد ملت کے باہمی تبادلہ خیالات اور مشاورت کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔۹ اس کے علاوہ دین اسلام میں پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے ایک مستقل باب تفقہ وتدبر اور فکر واجتہاد کا کھلا رکھا گیا ہے۔ کتاب اللہ کی بہت سی آیات میں اس کی تاکید کی گئی ہے اور '' حدیث معاذ'' سے اس کی بھرپور تائید ہوتی ہے۔

اس طرح قرآن مجید، سنت رسول اللہ، مشاورت اور اجتہاد کے ذریعہ ماضی میں تقریباً ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے اپنے سیاسی مسائل کو حل کیا اور علماء اسلام نے مسلم حکمرانوں اور عوام کی رہنمائی کے مقصد سے کتابیں تالیف کیں اور عملاً بھی اپنی

استطاعت کے مطابق تعلیم، تدریس، قضا اور تذکیر و خطاب سے اس فرض کو انجام دیا۔ اس طرح اسلام کا سیاسی نظام علمی و فکری اور عملی و تجرباتی دونوں اعتبار سے اپنے تمام تر اوصاف و محاسن کے ساتھ موجود ہے اور اس نظام میں حاکمیت الٰہ اور خلافت بنی آدم کے بنیادی تصورات کی موجودگی اور کارفرمائی، ہر جگہ اور ہر موڑ پر بہت نمایاں طور سے نظر آتی ہے۔ وہ نظام جس نے ایک عرصہ تک پریشان حال اور مظلوم و مقہور انسانوں کی کامیاب رہنمائی کی ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ آج کے انسانوں کے سیاسی مسائل کے حل کے لیے کافی نہیں ہے ایک بڑی زیادتی اور ظلم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فی زمانہ حکومت اور ریاست کی شکل وصورت خواہ کتنی ہی ترقی یافتہ ہوگئی ہو اور جدید مسائل و معاملات خواہ کتنے ہی پیچیدہ ہوگئے ہوں سب سے متعلق اصولی رہنمائی کتاب وسنت میں موجود ہے اور ان پر تدبر و تفکر، اجتہاد و استنباط اور باہمی مشاورت کے ذریعہ ہر مشکل کا بآسانی حل نکالا جاسکتا ہے، مثلاً جمہوری نظام حکومت جو آج کی ترقی یافتہ دنیا کا سب سے پسندیدہ نظام ہے اگر فکر و اجتہاد کی صلاحیتوں کو کام میں لایا جائے تو اس کے عمدہ پہلوؤں سے استفادہ کرنے کی راہ میں دین اسلام حائل نہیں ہے بلکہ وہ ان کی تائید وحمایت کرتا نظر آتا ہے۔ ریاست کے امور کی انجام دہی منتخب نمائندوں کے ذریعہ ہو اور وہ نمائندے معاملات کو نمٹانے میں مشاورت کو فروغ دیں، حکومت عدل وانصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھے اور سب کی فلاح و بہبود کی پالیسی پر عمل پیرا ہو، یہ اور اس طرح کے بہت سے اوصاف جو آج کے جمہوری نظام کے امتیازات میں سے ہیں ان کی بنیادیں بہت پہلے دین اسلام نے فراہم کردی ہیں۔ البتہ دونوں نظاموں میں بنیادی اور جوہری فرق یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں عوام کے منتخب نمائندے خدائی ہدایات سے بے نیاز نہیں ہوسکتے ہیں۔ وہ قانون سازی اور آئین سازی کا اصل مرجع اللہ وحدہ لاشریک لہ کی ذات گرامی کو قرار دینے کے پابند ہیں، جب کہ جدید جمہوری نظام کے مطابق منتخب نمائندے قانون سازی کا پورا حق رکھتے ہیں اور اپنے فرائض کے انجام دینے میں پوری طرح آزاد اور خود مختار ہیں۔

یہاں دور جدید کے عظیم مفکر اور اسلامی نظام حیات کے انتہائی کامیاب شارح اور ترجمان مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں سے ایک اقتباس پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت کا فرق بالکل واضح ہوجاتا ہے:

> ''البتہ جو چیز اسلامی جمہوریت کو مغربی جمہوریت سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کا نقطۂ نظر سیاسی جمہوری حاکمیت کا قائل ہے اور اسلام ''جمہوری خلافت'' کا۔ وہاں جمہور خود بادشاہ ہیں اور یہاں بادشاہی خدا کی ہے اور جمہور اس کے خلیفہ ہیں۔ وہاں اپنی شریعت جمہور آپ بناتے ہیں یہاں ان کو اس شریعت کی پابندی کرنی ہوتی ہے جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ دی ہے۔ وہاں حکومت کا کام جمہور کا منشا پورا کرنا ہوتا ہے یہاں حکومت اور اس کو بنانے والے جمہور سب کا کام خدا کا منشا پورا کرنا ہوتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ مغربی جمہوریت ایک مطلق العنان خدائی ہے جو اپنے اختیارات کا آزادانہ استعمال کرتی ہے اس کے برعکس اسلامی جمہوریت ایک پابند آئین بندگی ہے جو اپنے اختیارات کو خدا کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرتی ہے''۔[۱۰]

علامہ عبدالحمید فراہیؒ نے اپنی کتاب ''فی ملکوت اللہ'' میں لکھا ہے: ''علوم و معارف میں سب سے بڑا اور اہم علم اور معرفت جس کے بغیر توحید مکمل نہیں ہوسکتی اور دین حق کا تصور واضح نہیں ہوسکتا اور انسانی قلب و دماغ کو اطمینان نصیب نہیں ہوسکتا ہے وہ ہے جس کی طرف قرآن مجید نے ہماری رہنمائی کی ہے اور جسے توحید کی علامت قرار دیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور بادشاہت کا اعتراف اور اس کے عدل و قسط کی معرفت ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کا حاکم ہے اور کوئی چیز اس کے دائرہ اختیار سے خارج نہیں ہے''۔[۱۱]

حواشی ومراجع

۱۔ عبدالحمید فراہیؒ، تفسیر نظام القرآن، سورۃ البقرہ، دائرہ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڑھ، طبع اول، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۶-۲۰۷

۲۔ سید سلیمان ندویؒ، سیرت النبی، ج ہفتم، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء، ص ۹۶

۳۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۴۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن، جلد چہارم، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، جنوری ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۶

۵۔ سیرت النبی، ج ہفتم، حوالہ مذکور، ص ۱۰۴

۶۔ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم نے اس آیت کے جزء "**ولیمکنَّ لھم دینھم ارتضیٰ لھم**" کی تفسیر اس طرح کی ہے:

''یعنی اسلام جس کو ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے...... اس کو اس سرزمین پر متمکن کرے گا یعنی اس دین کا قانون اس ملک میں چلے گا اور اسی کی اساسات پر اس ملک کا نظام اجتماعی وسیاسی استوار ہوگا۔ اس دین کے سوا کسی اور دین کا اقتدار اس ملک میں باقی نہیں رہے گا۔'' (تدبر قرآن، جلد پنجم، تاج کمپنی دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۴۲۷)

۷۔ مولانا محمد جوناگڑھی کے ترجمہ قرآن میں اس آیت کے تحت مولانا صلاح الدین یوسف نے تفسیری حاشیہ میں یہ لکھا ہے کہ ''اس میں اسلامی حکومت کے بنیادی اہداف اور اغراض ومقاصد بیان کیے گئے ہیں جنھیں خلافت راشدہ اور قرن اول کی دیگر اسلامی حکومتوں میں بروئے کار لایا گیا اور انھوں نے اپنی ترجیحات میں ان کو سرفہرست رکھا تو ان کی بدولت ان حکومتوں میں امن وسکون بھی رہا، رفاہیت وخوش حالی بھی رہی اور مسلمان سربلند اور سرفراز بھی رہے۔'' (ترجمہ قرآن، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، سعودی عرب، ص ۹۲۷-۹۲۶)

۸۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم لکھتے ہیں:

''مشورہ سے کام کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ دین کا ہو یا دنیا کا ہو۔ نبی کریم ﷺ مہمات امور میں برابر صحابۂ کرام سے مشورہ فرماتے تھے اور صحابہؓ آپس میں مشورہ کرتے تھے۔

حروب وغیرہ کے متعلق بھی اور بعض احکام و مسائل کی نسبت بھی۔ بلکہ خلافت راشدہ کی بنیاد بھی شوریٰ پر قائم تھی۔'' (حاشیہ برترجمہ شیخ الہند محمود الحسن، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، سعودی عرب، ص:۶۴۸)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ آزادی رائے کو نشو و نما دینے کی کئی مثالوں کے تذکرہ کے بعد لکھا ہے:

''اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب قرینہ سے یا خود حضور ﷺ کی تصریح سے لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ آپ کوئی بات اپنی رائے سے فرما رہے ہیں تو وہ آزادی کے ساتھ اس میں اظہار کرتے تھے اور آپ خود اس آزادانہ اظہار رائے میں ان کی ہمت افزائی فرماتے تھے۔ ایسے موقعہ پر اختلاف کرنا نہ صرف جائز تھا بلکہ آپ کے نزدیک پسندیدہ تھا اور آپ ﷺ بسا اوقات اپنی رائے سے خود رجوع فرمالیتے تھے۔''

(سیرت سرور عالم، جلد اول، ص ۲۵۴، ۲۵۵، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، اگست ۱۹۸۱ء)

ڈاکٹر حمید اللہؒ نے ایک غزوہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مال غنیمت کی تقسیم کے تعلق سے صحابہ کرام کی آراء منقسم تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے چند افراد کو یہ کام سونپا کہ وہ باہم مشورہ اور سوچ وچار کے بعد اس مسئلہ پر ہر سپاہی کی رائے معلوم کریں۔ پھر بڑی اکثریت کی رایوں کے مطابق آپ نے فیصلہ کیا۔ (محمد رسول اللہ، ص ۱۷۱-۱۷۲، فرید بکڈپو دہلی، طبع اول، ستمبر ۲۰۰۳ء)

۹۔ رسول اللہ ﷺ کے بحیثیت حاکم اور فرماں روا اور ان کے عہد میں قائم نظام حکومت و سیاست سے متعلق معلومات کے لیے اردو زبان کی درج ذیل کتابیں ملاحظہ ہوں:

(الف) سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، اسلامی ریاست، فرید بکڈپو، دہلی، مارچ ۲۰۰۴ء، ص ۲۷۳ تا ۲۸۹۔

(ب) ڈاکٹر حمید اللہؒ، محمد رسول اللہ، فرید بکڈپو، دہلی، طبع اول، ستمبر ۲۰۰۳، ص ۱۷۰ تا ۱۷۳

(ج) ڈاکٹر حمید اللہؒ، رسول اکرم کی سیاسی زندگی، تاج کمپنی، دہلی، ۲۰۱۰ء، (مکمل کتاب)

(د) ڈاکٹر محمد احمد غازیؒ، محاضرات سیرت، اریب پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۳۱۷ تا ۳۶۲

۱۰۔ اسلام کا نظامِ حیات، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۲

۱۱۔ عبدالحمید فراہی، فی ملکوت اللہ، الدائرۃ الحمیدیہ، سرائے میر، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۳۹۱ھ، ص ۶

☆☆☆

اسلامی نظامِ حکومت-قرآن مجید کی روشنی میں

مرزا اسجان بیگ*

تمہید

ابتدا ہی میں یہ واضح کر دینا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اسلام اور اس کی جملہ تعلیمات کو جاننے اور سمجھنے کا واحد ذریعہ قرآن اور صاحب قرآن و شارحِ قرآن حضرت محمد ﷺ کی سنت و احادیث ہیں۔ اور آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرامؓ بالخصوص خلفاء راشدین کے اقوال واعمال ہیں۔ مؤخرالذکر نفوس قدسیہ اس لیے کہ آپ ﷺ نے قرآن ووحی والہام من جانب اللہ کی روشنی میں ان کی براہ راست تعلیم وتربیت فرمائی تھی۔ ان سے بہتر فہم قرآن، مزاج قرآن، روح قرآن اور مزاج نبوت کے حامل نہ اس دور میں کوئی تھا، نہ بعد میں کوئی ہوا اور نہ آئندہ کوئی ہوگا۔ اس لیے قرآن مجید کے علاوہ احادیث رسول ﷺ اور صحابہ کرام بالخصوص خلفاء راشدین کے آثار سے استشہاد کرتے ہوئے جو بات کہی جائے گی وہ بھی قرآن کی تشریح وتبیین ہی شمار ہوگی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: إِنَّ الدِّيْنَ عِندَ اللّٰهِ الإِسْلاَمُ (آل عمران:۱۹) یعنی اللہ کے نزدیک انسان کے لیے اسلام ہی ایک حقیقی اور صحیح طریق زندگی یا طرز فکر وعمل ہے۔ بالفاظ دیگر انسان کے لیے اللہ کے نزدیک صرف یہی ایک صحیح طریق زندگی ہے کہ وہ اللہ کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے فکر وعمل کی اس راہ پر چلے جس کی طرف اللہ نے رہنمائی فرمائی ہے۔

---

* سکریٹری شعبۂ دعوت، جماعت اسلامی ہند، مدھیہ پردیش، بھوپال

اسلام ایسے ہمہ گیر اور ازلی و ابدی اصول انسان کو دیتا ہے جو ہر طرح کے حالات میں اس کی رہنمائی کر سکیں۔ اسلام بجا طور پر انسانی زندگی کو بہ حیثیت مجموعی ایک کل قرار دیتا ہے جس کا ہر شعبہ دوسرے سے گہرا ربط رکھتا ہے اور ایک دوسرے پر اثر انداز اور اس سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ اسلام انسان کو فکر، علم، ادب، آرٹ، تعلیم، مذہب، اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون وغیرہ کے لیے الگ الگ نظامات نہیں، بلکہ ایک جامع نظام، جیسا کہ فطرۃً اسے درکار ہے، فراہم کرتا ہے، جس کی پیروی کر کے وہ کامیاب زندگی گزارتے ہوئے اپنی اصل منزل (آخرت) پر پہنچ کر کامیاب ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، انسانی زندگی کے بحیثیت مجموعی ایک کل ہونے کے سبب، اسلام زندگی کے تمام شعبوں و پہلوؤں کے لیے ایک جامع نظام دیتا ہے اور اس نظام کا لازماً پابند رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس نظام کا ایک جز، زندگی کا ایک ناگزیر پہلو ہونے کے سبب، تہذیب و سیاست بھی اس میں شامل ہے۔ زندگی کے اس پہلو کے لیے بھی اسلام دائمی اصول دیتا ہے اور ان کی لازمی پابندی کی ہدایت کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک تہذیب میں سیاست و طرز حکومت بھی شامل ہے، اس لیے کہ تہذیب کے جو عناصر ترکیبی (دنیوی زندگی کا تصور، زندگی کا مقصد یا نصب العین، اساسی عقائد و افکار، افراد کی اخلاقی تربیت اور نظام اجتماعی) بتائے جاتے ہیں، ان میں مؤخر الذکر عنصر ''نظام اجتماعی'' (یعنی خاندان، سوسائٹی اور حکومت کی تنظیم کس طرز پر ہو) میں سیاست و طرز حکومت شامل ہے۔ یہاں ہم صرف زندگی کے مؤخر الذکر پہلو کے سلسلے میں گفتگو کریں گے کہ نظام حکومت کے سلسلے میں اسلام کیا رہنمائی کرتا ہے یا یہ کہ اسلامی نظام حکومت کیا ہے۔

کسی نظام حکومت کو جاننے کا پیمانہ

کسی نظامِ حکومت کو جاننے کے لیے اس سے متعلق درج ذیل نکات کو جاننا ضروری ہے:

(۱) اس کے بنیادی اصول (۲) بنیادی اصولوں پر وجود میں آنے والی اس

ریاست یا حکومت کے اہم اجزاء: (الف) سربراہِ ریاست کے تقرر سے لے کر مملکت تک کے جملہ امور کس طرح طے پاتے ہیں۔ (ب) اصحابِ امر کے لیے ضروری اوصاف۔ (ج) عدل وانصاف کا نظام (د) ریاست کے مقاصد وفرائض (ہ) رعایا کے حقوق۔ (و) رعایا پر حکومت کے حقوق (ز) جنگ وصلح سے متعلق خارجہ پالیسی۔ (ح) حکومت کی جوابدہی (ط) ریاست کی حیثیت۔ (ی) عوام اور حکومت دونوں میں سے ہر ایک کی مطلق العنانی روکنے کا انتظام۔

ان ہی نکات پر اسلامی نظامِ حکومت کے سلسلے میں بھی یہاں گفتگو کی جائے گی۔

اسلامی نظامِ حکومت کے بنیادی اصول

۱- حاکمیت الٰہ یا اللہ کی حاکمیت: یعنی اللہ تعالیٰ پوری کائنات بشمول انسان کا تنہا خالق، رازق اور پروردگار ہی نہیں، مالک وحاکم بھی ہے۔ نیز اس نے انسان کو عقل و شعور، اخلاقی حس، ارادہ وانتخاب کی آزادی اور کائنات کی بے شمار چیزوں پر تصرف کے اختیارات اور قوتیں بھی عطا کی ہیں۔ علاوہ بریں، اللہ تعالیٰ نے اسے زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجا۔ اور اس کی پیدائش کا مقصد، عبادت وخلافت کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اللہ کی رضا و فلاح آخرت کا حصول قرار دیا۔ چنانچہ جس طرح انسانی زندگی کے غیر اختیاری حصہ میں اللہ تعالیٰ اس کا حاکم تکوینی ہے، اسی طرح زندگی کے اختیاری پہلو میں بھی وہی حاکم تشریعی ہے۔ یعنی انسان اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں شعور اور ارادے کے ساتھ اس کی تشریعی حاکمیت تسلیم کرتے ہوئے اس کی مکمل اطاعت میں اپنے آپ کو دے دے۔ نہ خود اور نہ کسی اور کو اس کے سوا حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کا مستحق، حقیقی و مستقل بالذات قانون ساز اور حکم دینے کا مجاز سمجھے۔ عقیدۂ توحید کا یہ لازمی تقاضا ہے:

"أَلاَ لَهُ الْخَلْقُ وَالأَمْرُ"۔ (الاعراف:۵۴)

(خبردار! اسی کی خلق ہے اور اسی کا حکم۔)

"إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّهِ"۔ (الانعام:۵۷)

(فیصلہ کا اختیار کسی کو نہیں ہے، سوائے اللہ کے۔)

"مَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَداً" (کہف:۲۶)

(بندوں کے لیے اس کے سوا کوئی ولی و سرپرست نہیں اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔)

"يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ"

(آل عمران:۱۵۴)

(وہ کہتے ہیں کہ اختیارات میں بھی ہمارا کچھ ہے۔ کہو، اختیار سارے کا سارا اللہ ہی کا ہے۔)

"وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ" (الانعام:۱۸)

(وہی اپنے بندوں پر غلبہ رکھنے والا ہے اور وہی دانا اور ہر چیز سے باخبر ہے۔)

"لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ" (الانبیاء:۲۳)

(جو کچھ وہ کرتا ہے، اس پر کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے، اور دوسرے سب جواب دہ ہیں۔)

"وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ" (الرعد:۴۱)

(اللہ فیصلہ کرتا ہے اور کوئی اس کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے۔)

"أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ" (التین:۸)

(کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے؟)

"قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" (آل عمران:۲۶)

(کہہ دو، خدایا، ملک کے مالک، تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے،

ساری بھلائی تیرے اختیار میں ہے، تو ہر چیز پر قادر ہے۔)

''وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا .... أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ'' (المائدہ/۳۸-۴۰)

(چور مرد اور چور عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو...... کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔)

''وَعَسَى أَن تَكْرَهُوا شَيْئاً وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَن تُحِبُّوا شَيْئاً وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ'' (البقرہ:۲۱۶)

(ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناپسند ہو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو، اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو اور وہ تمھارے لیے بری ہے۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔)

''تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ'' (البقرہ:۲۲۹)

(یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔)

''وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ'' (مجادلہ:۴)

(یہ اللہ کی حدیں ہیں اور پابندی سے انکار کرنے والوں کے لیے دردناک سزا ہے۔)

''وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ، هُمُ الظَّالِمُونَ، هُمُ الْفَاسِقُونَ'' (المائدہ:۴۴، ۴۵، ۴۷)

(اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں، ظالم ہیں، فاسق ہیں۔)

''وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ'' (الشوریٰ:۱۰)

(تمھارے درمیان جو اختلاف بھی ہو، اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔)

۲- انسان کی خلافت: انسان کی حیثیت اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ یا نائب کی ہے۔ انسان یہاں خود مالک نہیں بلکہ اصل مالک یعنی اللہ کا خلیفہ ہے۔ نیز اللہ نے اسے سامان زندگی کے ساتھ اختیارات اور قوتیں بھی عطا کی ہیں۔ اس کی یہ حیثیت تقاضا کرتی ہے کہ اپنے مالک کی منشا کو پورا کرتے ہوئے اس کے احکام اور ہدایات کو اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں اس طرح جاری وساری کرے کہ فرد کا ارتقاء، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل، سب کچھ اللہ کے بھیجے ہوئے طریق زندگی یعنی دین حق کے مطابق ہو۔

"وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّيْ جَاعِلٌ فِيْ الْأَرْضِ خَلِيْفَةً"
(البقرۃ:۳۰)

(اور یاد کرو جب کہ تمھارے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔)

"هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِيْ الْأَرْضِ" (فاطر:۳۹)

(وہی ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا۔)

"وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِيْ الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ" (الاعراف:۱۰)

(ہم نے تمھیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمھارے لیے اس میں سامان زیست فراہم کیے۔)

"أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِيْ الْأَرْضِ" (الحج:۶۵)

(کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ اللہ نے تمھارے لیے وہ سب کچھ مسخر کر دیا جو زمین میں ہے۔)

"خلیفہ" کی تفسیر

ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ نے خلیفہ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میں پیدا کر رہا ہوں زمین میں اپنا خلیفہ جو میری مخلوق کے درمیان فیصلہ کرنے میں میرا نائب ہوگا، اور یہ

خلیفہ آدمؑ اور ہر وہ شخص ہے جو خدا کی اطاعت اور اس کی مخلوق کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ حکم دینے میں اس کا (آدمؑ کا) قائم مقام ہوگا۔''[1]

یہ خلافت اسی وقت صحیح اور جائز قرار پائے گی جب وہ اصل مالک یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع ہو۔ خلافت کے نام پر خود مختارانہ نظام حکومت کی تشکیل خلافت نہیں بلکہ اللہ سے بغاوت قرار پائے گی۔

''هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰئِفَ فِي الْأَرْضِ فَمَن كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ وَلَا يَزِيْدُ الْكَافِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ إِلَّا مَقْتاً وَلَا يَزِيْدُ الْكَافِرِيْنَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَاراً'' (فاطر:۳۹)

(وہی ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا، پھر جو کفر کرے (یعنی خلافت کی بجائے خود مختارانہ نظام حکومت، خواہ ایک فرد یا پارٹی بنائے یا بہت سے افراد یا پارٹیاں مل کر بنائیں) تو اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے اور کافروں کے حق میں ان کا کفران کے رب کے یہاں کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا مگر اس کے غضب میں۔ اور کافروں کے لیے ان کا کفر کوئی چیز نہیں بڑھاتا مگر خسارہ۔)

''ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِم لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ'' (یونس:۱۴)

(پھر ہم نے تمھیں زمین میں خلیفہ بنایا تاکہ ان کے بعد دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔)

''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ ...... يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئاً'' (النور:۵۵)

(تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں خلیفہ بنائے گا،

جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا ...... وہ میری بندگی کریں گے۔ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گے۔)

اس خلافت پر کسی ایک فرد یا خاندان یا گروہ کا اجارہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں تمام اہل ایمان برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ پھر وہ اپنے صاحب الرائے و صاحب کردار معتمد نمائندوں کے ذریعہ اپنا اختیار اور حقِ خلافت کسی شخص کو سپرد کر دیتے ہیں بالفاظ دیگر وہی شخص خلیفہ یا سربراہ مملکت کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے، جس کو بغیر کسی جبر و تحریص کے صاحب الرائے و صاحب کردار معتمد نمائندوں کے ذریعے حق خلافت سپرد کیا گیا۔

۳- قانونِ خداوندی یا شریعت: انسانی زندگی کے لیے جو آئین و قانون درکار ہے، وہ حاکم حقیقی، اللہ تعالیٰ، نے اصولی حد تک اپنے رسول ﷺ کے ذریعے عطا فرما دیا ہے۔ اسے بنانے کی کسی فرد یا مجموعہ افراد یا مجلس قانون ساز کو قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ قانون قرآن مجید میں اور اس کے شارح حضرت محمد ﷺ کی سنت میں پوری طرح موجود اور دستیاب ہے۔ اس قانون خداوندی کی بلاچوں و چرا اطاعت ہر انسان کو کرنی ہے اور بے کم و کاست اس پورے مجموعہ قوانین کو اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی میں نافذ کرنا ہے۔ وہ اس کے بجائے کوئی قانون بنا سکتا ہے نہ اس کی پیروی کر سکتا ہے۔ اس شریعت سے اگر وہ انحراف کرے گا تو اپنی حقیقی حیثیت (خلیفۃ اللہ) سے منحرف اور اپنے مالک (اللہ) سے بغاوت کا مجرم ٹھہرے گا۔ البتہ جن مسائل یا معاملات میں شریعت خاموش ہو یا نئے مسائل کے پیش نظر کوئی فروعی قانون بنانے کی ضرورت پیدا ہو جائے تو ان کے حل کے لیے، اصولِ دین اور اسلام کی روح اور مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے باہمی مشورے سے قوانین بنائے جا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ“

(المائدۃ:۴۴)

(اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔)

”اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ“ (الاعراف:۳)

(پیروی کرو اس چیز کی جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے تمھارے رب کی طرف سے اور اسے چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔)

''إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ'' (یوسف:۴۰)

(حکم اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔)

''مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ'' (النساء:۸۰)

(جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔)

''وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيراً'' (النساء:۱۱۵)

(اور جو کوئی رسول سے اختلاف کرے، جب کہ ہدایت اس پر واضح ہو چکی ہو اور ایمان لانے والوں کی روش چھوڑ کر دوسری راہ چلے، اسے ہم اس طرف پھیر دیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اس کو جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔)

''وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ'' (الحشر:۷)

(جو کچھ رسول تمھیں دے اسے لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے باز رہو۔ اللہ سے ڈرو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔)

''فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيماً'' (النساء:۶۵)

(پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ (اے نبی) وہ تجھے اپنے باہمی اختلافات میں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور پھر جو فیصلہ تو کرے اس پر اپنے دل میں بھی تنگی محسوس نہ کریں

بلکہ سرتسلیم خم کرلیں۔)

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا" (الاحزاب:۳۶)

(کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کردیں تو اس معاملے میں ان کے لیے کوئی اختیار رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"علیکم بکتاب اللہ، احلوا حلالہ و حرموا حرامہ"۔[۲]

(تم پر لازم ہے کتاب اللہ کی پیروی، جس چیز کو اس نے حلال کیا ہے، اسے حلال کرو، اور جسے اس نے حرام کیا اسے حرام کرو۔)

"ان اللہ فرض فرائض فلا تضیّعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا، وحدّ حدوداً فلا تعتدوھا. وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثو عنھا."[۳]

(اللہ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں، انھیں ضائع نہ کرو، وہ کچھ حرمتیں مقرر کی ہیں انھیں نہ توڑو، کچھ حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے بارے میں سکوت فرمایا بغیر اس کے کہ اسے نسیان لاحق ہوا ہو، ان کی کھوج میں نہ پڑو۔)

"ما امرتکم بہ فخذوہ وما نھیتکم عنہ فانتھوا."[۴]

(جس چیز کا میں نے تم کو حکم دیا اسے اختیار کرلو اور جس چیز سے روکا ہے اس سے رک جاؤ۔)

خلاصہ یہ کہ اسلامی حکومت یا ریاست اللہ کی حاکمیت کے تحت انسانی خلافت

ہے جو خدا کے ملک میں اس کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق اس کی مقرر کردہ حدود (یعنی شریعت) کے اندر کام کر کے اس کے منشا کو پورا کرتی ہے۔

۲ (الف) شورائیت

مذکورہ بالا بنیادوں پر قائم ہونے والی حکومت ایک شورائی حکومت ہوتی ہے، جس کے جملہ امور عوام (اہل ایمان) کے باہمی مشورے سے چلتے ہیں، خواہ سربراہ حکومت کے انتخاب کا معاملہ ہو یا ریاست کی داخلہ و خارجہ پالیسی اختیار کرنے کا یا تعلیمی، معاشی و اقتصادی نظام بنانے کا معاملہ ہو۔ یہ مشاورت عوام کے صاحب الرائے و صاحب کردار معتمد نمائندوں سے کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ" (الشوریٰ:۳۸)

(اور مسلمانوں کا کام آپس کے مشورہ سے چلتا ہے۔)

"وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ"

(آل عمران:۱۵۹)

(اور ان سے ہر معاملے میں مشورہ کرتے رہو، پھر مشورے کے بعد جب تم نے عزم و ارادہ کر لیا تو اللہ پر بھروسہ کرو۔)

ارشادات رسول ﷺ

"عن علی قال قلت یا رسول الله ﷺ ان نزل بنا امر لیس فیه بیان امر ولا نهی فما تأمرنی؟ قال شاوروا فیه الفقهاء والعابدین، ولا تمضوا فیه رأیی خاصة."[۵]

(حضرت علیؓ نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ کے بعد کوئی ایسا معاملہ ہمارے درمیان پیش آ جائے جس کے بارے میں نہ کوئی امر ہو اور نہ نہی، تو ایسی صورت میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ فرمایا: "اس بارے میں عبادت گزار اور دیانت دار ماہرین شریعت سے مشورہ کر لیا کرو اور

انفرادی رائے اختیار نہ کرو۔")

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"جس سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ معتمد ہوتا ہے۔"[6]

"جس شخص سے اس کے مسلمان بھائی نے مشورہ طلب کیا اور اس نے حق کے خلاف مشورہ دیا تو اس نے اپنے بھائی کے ساتھ خیانت کی اور جس مفتی نے تحقیق کے بغیر فتویٰ دیا تو گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا۔"[7]

یعنی مشورہ ایک امانت ہے اس لیے جس سے مشورہ طلب کیا گیا اسے مشورہ دینا چاہیے، اس میں خیانت نہیں کرنا چاہیے نیز دیانت کے ساتھ اور غور و فکر کے بعد ہی مشورہ دینا چاہیے۔

"اگر میں کسی کو مشورے کے بغیر اپنا جانشین بناتا تو ابن ام عبد یعنی ابن مسعودؓ کو مقرر کر لیتا"۔[8]

"عن عائشة رضى الله تعالىٰ عنها قالت قال رسول الله ﷺ: ستة لعنتهم ولعنهم الله ...... والمتسلط بالجبروت."[9]

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(چھ قسم کے لوگوں پر میں بھی لعنت بھیجتا ہوں اور اللہ تعالیٰ بھی لعنت بھیجتا ہے۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو زبردستی حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے۔)

"عن عائشةؓ قالت ما رأيت رجلاً اكثر استشارة للرجال من رسول الله ﷺ."[10]

(میں نے ایسا شخص نہیں دیکھا جو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ مشورہ کرنے والا ہو۔)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

"لاخلافة الا عن مشورة."[۱۱]

(مشورے کے بغیر کوئی خلافت نہیں۔)

ارشاد نبویؐ ہے:

"من دعا الی امارة نفسه او غیره من غیر مشورة من المسلمین فلا یحل لکم ان لا تقتلوه."[۱۲]

(جو شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر اپنی یا کسی اور شخص کی امارت کے لیے دعوت دے تو تمھارے لیے حلال نہیں ہے کہ اسے قتل نہ کرو۔)

مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کا اسلامی حکومت پر زبردستی مسلط ہونا ایک سنگین جرم ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں:

''امارت (اسلامی حکومت) وہ ہے جو مشورے سے بنائی گئی ہو اور بادشاہت وہ ہے جو تلوار کے زور سے حاصل کی گئی ہو۔''[۱۳]

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں:

''خلافت مسلمانوں کے اجتماع اور مشورے سے ہوتی ہے۔''[۱۴]

اولی الامر یا اصحاب امر کے لیے ضروری اوصاف

علماء اور فقہاءِ اسلام کے نزدیک اولی الامر میں انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ، تینوں شعبے شامل ہیں۔ نیز تمام قسم کے اصحاب امر ہیں، خواہ وہ علمی و فقہی رہنمائی کرنے والے ہوں یا سیاسی قائد ہوں، یا ملک کا نظم ونسق چلانے والے حکام ہوں یا فوجی نظم ونسق کی قیادت کرنے والے افسر ہوں، یا عدالتوں کے جج ہوں یا معاشرتی و سماجی امور میں بستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے نمائندے اور سماجی کارکن ہوں۔ بہرحال جو جس حیثیت میں اور جس سطح کا بھی صاحب امر یا ذمہ دار مقرر کیا جائے وہ اس کا اہل اور مستحق ہونا چاہیے، جس کی تشریح یہ ہے کہ:

(۱) وہ کسی بھی منصب یا پوزیشن کا حریص یا طالب نہ ہو۔

"تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا" (القصص:۸۳)

(وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ اپنی بڑائی کے طالب ہوتے ہیں اور نہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔)

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں:

"انا واللہ لا نولّی علی عملنا ھذا احداً سألہ او حرص علیہ"۔[۱۵]

(بخدا ہم اپنی اس حکومت کا منصب کسی ایسے شخص کو نہیں دیتے جو اس کا طالب ہو یا اس کا حریص ہو۔)

"ان اخونکم عندنا من طلبہ"[۱۶]

(تم میں سب سے بڑھ کر خائن ہمارے نزدیک وہ ہے جو اسے خود بڑھ کر طلب کرے۔)

"انا لا نستعمل علی عملنا من ارادہ"[۱۷]

(ہم اپنی حکومت میں کسی ایسے شخص کو عامل نہیں بناتے جو اس کی خواہش کرے۔)

(۲) وہ ایمان دار، خدا ترس، نیکوکار اور امانت دار ہوں اور حد سے گزرنے والے اور فسادی نہ ہوں۔

أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ۔ (ص:۲۸)

(کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، ان لوگوں کی طرح کردیں جو زمین میں فساد کرتے ہیں؟ کیا ہم پرہیزگاروں کو فاجروں کی طرح کردیں۔)

"وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطاً" (الکہف:۲۸)

(اور تو اطاعت نہ کر کسی ایسے شخص کی جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کی ہے اور جس کا کام حد سے گزرا ہوا ہے۔)

(۳) وہ ذی علم، دانا اور معاملہ فہم ہوں اور کاروبار حکومت کی انجام دہی یا متعلقہ کام کے لیے مطلوبہ ذہنی اور جسمانی اہلیت رکھتے ہوں۔

"وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَاماً" (النساء:۵)

(اپنے اموال جنھیں اللہ نے تمھارے لیے ذریعہ قیام بنایا ہے، نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو۔)

"قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ" (البقرۃ:۲۴۷)

(بنی اسرائیل نے کہا: اس کو (یعنی طالوت کو) ہم پر حکومت کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا حالانکہ ہم اس کی بہ نسبت بادشاہی کے زیادہ حق دار ہیں اور اسے مال میں کوئی کشادگی نہیں دی گئی ہے۔ نبی نے کہا اللہ نے اسے تمھارے مقابلے میں برگزیدہ کیا ہے اور اسے علم اور جسم میں کشادگی دی ہے۔)

"وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ" (ص:۲۰)

(اور داؤد کی بادشاہی کو ہم نے مضبوط کیا اور اسے حکومت اور فیصلہ کن بات کرنے کی صلاحیت دی۔)

"وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُوْلِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ" (النساء:۸۳)

(اور یہ لوگ (افواہیں اڑانے کے بجائے) اس خبر کو رسول تک اوران لوگوں تک پہنچاتے جوان میں سے اولی الامر ہیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آ جاتی جوان کے درمیان بات کی تہ تک پہنچ جاتے۔)

"إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّواْ الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا" (النساء: ۵۸)

(اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے حوالے کرو۔)

"امانتیں اہل امانت کے حوالے کرو" میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ ذمہ داریوں کے مناصب پران افراد کو فائز کیا جانا چاہیے جو مفوضہ ذمہ داریاں وفرائض انجام دینے کے لیے مطلوبہ صالحیت اور صلاحیت کے حامل ہوں۔ خلافت وحکومت ایک امانت ہے، جسے نااہلوں کے سپرد کرنا تباہی کا موجب ہے۔

ارشاد رسول اللہ ہے:

"اذا ضیعت الامانة فانتظر الساعة، قال کیف اضاعتها یا رسول الله ﷺ؟ قال اذا اسندالامر الیٰ غیر اهله فانتظر الساعة"۔ ۱۸

(جب امانت ضائع کردی جائے تو پھر قیامت کا انتظار کرنا۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ، وہ کیسے ضائع کردی جائے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب حکومت کی زمام نااہلوں کے سپرد کردی جائے تو پھر قیامت کا انتظار کرنا۔)

عدل وانصاف کا نظم

فقہاء اسلام کے نزدیک عدلیہ کے قیام اور قاضیوں یا ججوں کے تقرر کے فرض کفایہ ہونے پرامت کا اجماع ہے۔ عہد رسالت میں مدینہ واطراف سے باہر کے علاقوں میں آپ ﷺ امیر، عامل اور قاضی مقرر فرماتے تھے۔ اسی طرح خلفائے راشدین کے عہد میں بھی ہر علاقے میں قاضی مقرر کیے جاتے تھے۔ بہرحال، اسلامی ریاست میں

عدلیہ بے لاگ اور ہر قسم کی مداخلت اور دباؤ سے آزاد ہوتی ہے جو عوام اور حکام اور حکومت کی باہمی نزاعات میں خدا و رسول ﷺ کے بالاتر قانون کے مطابق ٹھیک فیصلے دیتی ہے۔

"یَا أَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا أَطِیعُوا اللّٰہَ وَأَطِیعُوا الرَّسُولَ وَأُولِی الْأَمْرِ مِنکُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوہُ إِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُولِ إِن کُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الآخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِیلاً" (النساء:۵۹)

(اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک اچھا طریقۂ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔)

اس آیت میں رفع نزاعات کے لیے قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ سے رجوع ہونے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ظاہر ہے جب نزاع کے فریقین عوام میں سے کوئی فرد یا گروہ اور حکام اور حکومت ہوں تو فیصلہ کرنے والے فریقین خود نہیں ہو سکتے، ان کے سوا تیسرا آزاد اور غیر جانب دار شخص یا ادارہ یعنی جج اور عدالت ہونا چاہیے، جو ان کے درمیان کتاب وسنت کی بنیاد پر فیصلہ کرے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ رسول کریم ﷺ مدینہ اور اطراف کے باہر کے علاقوں میں قاضی مقرر فرماتے تھے اور آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا اور باقاعدہ عدالتی نظام قائم کر دیا تھا۔ ان کے دور میں عدلیہ نہ صرف عوام کے باہمی نزاعات کا فیصلہ کرنے کی مجاز تھی بلکہ انتظامیہ کے خلاف بھی وہ لوگوں کے مقدمات کے فیصلے کرتی تھی۔ اس عدالت میں پیش ہونے سے کوئی بھی مستثنیٰ نہ تھا حتیٰ کہ خلیفۂ وقت بھی۔ اسی طرح خلیفۂ وقت اور خود حکومت کو بھی اگر کسی کے خلاف کوئی ذاتی یا سرکاری دعویٰ کرنا ہوتا تھا تو اسے عدالت میں جانا ہوتا تھا اور عدالت ہی خدا اور رسول ﷺ کے قانون کے مطابق اس کا فیصلہ کرتی تھی۔

ریاست کے مقاصد و فرائض

اسلامی ریاست ایک مقصدی ریاست ہوتی ہے۔ اس ریاست کے دو بڑے مقاصد ہیں:

۱- عدل کا قیام اور ظلم و جور کا خاتمہ:

"لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ" (الحدید: ۲۵)

(ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب و میزان نازل کی تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں، اور ہم نے لوہا نازل کیا جس میں سخت قوت اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔)

اس آیت میں انسانی معاشرے میں قیام عدل کو انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد اور ان کا مشن بتایا گیا ہے۔ قیام عدل کے لیے سیاسی و جنگی قوت درکار ہے، جیسا کہ مولانا مودودیؒ بجا طور پر اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"انبیاء علیہم السلام کے مشن کو بیان کرنے کے معاً بعد یہ فرمانا کہ ہم نے لوہا نازل کیا جس میں بڑا زور ہے" خود یہ خود اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہاں لوہے سے مراد سیاسی اور جنگی طاقت ہے، اور کلام کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو قیام عدل کی محض ایک اسکیم پیش کر دینے کے لیے مبعوث نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ بات بھی ان کے مشن میں شامل تھی کہ اس کو عملاً نافذ کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ قوت فراہم کی جائے جس سے فی الواقع عدل قائم ہو سکے، اسے درہم برہم کرنے والوں کو سزا دی جا سکے اور اس کی مزاحمت کرنے والوں کا زور توڑا جا سکے۔"[۱۹]

۲- اقامت صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کے نظام کا قیام نیز بھلائیوں ونیکیوں کا فروغ اور برائیوں کا خاتمہ:

"الَّذِيْنَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِيْ الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ" (الحج:۴۱)

(یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں گے، ایتاءِ زکوٰۃ کریں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔)

یعنی حکام خود کو بھی اور عوام کو بھی اقامت صلوٰۃ کا پابند کریں گے تاکہ ان کے اندر احساس بندگی اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا نیز فسق و فجور اور کبر و غرور سے محفوظ رہنے کا احساس اور داعیہ ہمیشہ زندہ رہے۔ اسی طرح ایتائے زکوٰۃ کے ذریعے مال کی محبت اور مادہ پرستی، بخل وفضول خرچی سے وہ محفوظ رہیں۔ مزید یہ کہ وہ بھلائیوں کو فروغ دینے اور برائیوں کو مٹانے کی طرف سے کبھی غافل نہ رہیں۔ ان مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ اسلام کے عبادتی نظام، روحانی واخلاقی نظام، معاشی واقتصادی نظام، خاندانی ومعاشرتی نظام اور عدالتی نظام کو قائم کرے ساتھ ہی بین الاقوامی امور اور جنگ وصلح نیز سیر وتفریح اور کھیل کود وغیرہ سے متعلق اسلام کے اصول وضوابط کو قائم کرنے اور انھیں مستحکم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے۔

رعایا کے حقوق

اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ریاست کے عوام مسلم وغیر مسلم، مرد وعورت تمام کے درج ذیل بنیادی حقوق کے تحفظ کو یقینی بنائے:

۱- جان و مال کا تحفظ

"وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ" (بنی اسرائیل:۳۳)

(کسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے، حق کے بغیر قتل نہ کرو۔)

"لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" (البقرۃ:۱۸۸)

(اپنے مال آپس میں ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ۔)

۳-عزت و آبرو کا تحفظ

"لَا يَسْخَرُ قَومٌ مِّن قَوْمٍ ...... وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ...... وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضاً" (الحجرات:۱۱-۱۲)

(کوئی گروہ دوسرے کا مذاق نہ اڑائے ......اور نہ تم ایک دوسرے کو عیب لگاؤ، نہ ایک دوسرے کو برے لقب دو...... نہ تم میں سے کوئی کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرے۔)

"وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَاناً وَإِثْماً مُّبِيناً" (الاحزاب:۵۸)

(اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بے قصور اذیت دیتے ہیں انھوں نے ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا۔)

اس آیت کی رو سے بہتان ایک اخلاقی گناہ ہی نہیں ہے جس کی سزا آخرت میں ملنی ہے بلکہ اس آیت کا تقاضا ہے کہ اسلامی ریاست کے قانون میں بھی جھوٹے الزامات لگانے کو (خواہ یہ فعل عوام کرے یا حکمراں) جرم مستلزم سزا قرار دیا جائے۔

۴-نجی زندگی یعنی Privacy کا تحفظ

"لَا تَدْخُلُوا بُيُوتاً غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا" (النور:۲۷)

(اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو۔)

"وَلَا تَجَسَّسُوا" (الحجرات:۱۲)

(اور لوگوں کے بھید نہ ٹٹولو، ان کی جاسوسی نہ کرو۔)

۵-ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق

"لَّا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَن ظُلِمَ" (النساء:۱۴۸)

(اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔)

واضح رہے کہ اسلام کا عام قانون اور اخلاقی ضابطہ تو یہی ہے کہ کسی کے خلاف بدگوئی یا بدزبانی ناجائز ہے، لیکن مظلوم کو یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اوپر کیے گئے ظلم کے خلاف آواز اٹھائے اور ایک حد تک ظالم کی بدگوئی بھی کرے۔ یہ ایک استثنا ہے جو صرف مظلوم کے سلسلے میں ہے۔ وہ صرف اس قدر برے الفاظ استعمال کر سکتا ہے جن سے ظالم کے حقیقی ظلم کا اظہار ہو رہا ہو۔

٦- امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حق: جس میں تنقید اور اظہار خیال کی آزادی کا حق بھی شامل ہے۔

''وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ'' (التوبۃ:۷۱)

(اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔)

رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''میرے بعد کچھ لوگ حکمراں ہونے والے ہیں، جو ان کے جھوٹ میں ان کی تائید کرے اور ان کے ظلم میں ان کی مدد کرے وہ مجھ سے نہیں اور میں اس سے نہیں۔'' [20]

''عن قریب تم پر ایسے لوگ حاکم ہوں گے جن کے ہاتھ میں تمھاری روزی ہوگی، وہ تم سے بات کریں گے تو جھوٹ بولیں گے اور کام کریں گے تو برے کام کریں گے۔ وہ تم سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کی برائیوں کی تعریف اور ان کے جھوٹ کی تصدیق نہ کرو۔ پس تم ان کے سامنے حق پیش کرو جب تک وہ اسے گوارا کریں، پھر اگر وہ اس سے تجاوز کریں تو جو شخص اس پر قتل کیا جائے وہ شہید ہے۔'' [21]

''جس نے کسی حاکم کو راضی کرنے کے لیے وہ بات کی جو اس کے رب کو ناراض کر دے، وہ اللہ کے دین سے نکل گیا۔''

''سب سے افضل جہاد ظالم حکمراں کے سامنے انصاف (یا حق) کی بات کہنا ہے۔''[۲۲]

واضح رہے کہ تنقید و اظہار خیال کی یہ آزادی بے لگام نہیں ہے بلکہ شرعی حدود کی پابند ہے۔

۷۔ غیر مسلموں کو ضمیر و اعتقاد اور مذہب کی آزادی کا خصوصی حق

''لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ''(البقرۃ:۲۵۶)

(دین میں جبر نہیں ہے۔)

''أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُواْ مُؤْمِنِينَ''(یونس:۹۹)

(کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں۔)

یعنی انھیں بزور مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ اسلام قبول کریں۔ انھیں مذہبی اعتقاد کی اور اپنے مذہبی رسوم کی ادائیگی کی اور اپنے پرسنل لا پر چلنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی اور ان کے تحفظ کا حق حاصل رہے گا۔

عہد رسالت ﷺ اور خلافت راشدہ میں بالخصوص اور بعد کے مسلم حکمرانوں کے دور میں بالعموم ان کے اس حق کو تحفظ حاصل رہا۔

۸۔ ہر شہری اور گروہ کا یہ حق ہوگا کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی ثبوت کے بغیر اور انصاف کے معروف تقاضے پورے کیے بغیر نہ کی جائے۔

''إِن جَاءكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ''(الحجرات:۶)

(اگر کوئی فاسق تمھارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو بے جانے بوجھے نقصان پہنچا دو اور پھر اپنے کیے پر پچھتاؤ۔)

"وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ" (بنی اسرائیل:۳۶)

(کسی ایسی بات کے پیچھے نہ لگ جاؤ جس کا تمھیں علم نہ ہو۔)

"وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ" (النساء:۵۸)

(اور جب لوگوں کے معاملات میں فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔)

۹۔ ہر حاجت مند اور محروم شہری کا یہ حق ہوگا کہ اس کی ناگزیر ضروریات زندگی کی فراہمی کا انتظام ہو۔

"وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ" (الزاریات:۱۹)

(اور ان کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے والے اور محروم کا۔)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"جو شخص مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا ذمہ دار (خلیفہ یا امیر) ہو تو اللہ اس کی حاجت پوری نہیں کرے گا، جب تک وہ لوگوں کی حاجتیں پوری نہ کرے۔"

۱۰۔ انسانی مساوات یعنی یہ حق کہ پیدائشی طور پر تمام انسان یکساں ہیں۔ رنگ و نسل و زبان وصنف و وطن کی بنیاد پر کسی کو حقیر و کم تر نہ سمجھا جائے، اس بنیاد پر کسی فرد، گروہ یا طبقے کو امتیازی حقوق حاصل نہ ہوں اور نہ کسی کی حیثیت دوسرے کے مقابلے میں فروتر سمجھی جائے۔

"يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ" (الحجرات:۱۳)

(لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔)

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

''لوگو! سن لو، تمھارا رب ایک ہے، کسی عربی کو عجمی پر یا کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں، نہ کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت ہے مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔'' ۲۳

''لوگو! تمام انسان بس دو ہی حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیز گار جو اللہ کی نگاہ میں عزت والا ہے اور دوسرا فاجر اور شقی جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ ورنہ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔'' ۲۴

رعایا پر حکومت کے حقوق

۱- اطاعت فی المعروف

''أَطِيعُواْ اللّهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّهِ وَالرَّسُولِ'' (النساء:۵۹)

(اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔ پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔)

''وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ'' (الممتحنۃ:۱۲)

(اور یہ کہ وہ کسی امر معروف میں آپ کی نافرمانی نہ کریں گی۔)

رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''ایک مسلمان پر اپنے امیر کی سمع و اطاعت فرض ہے۔ خواہ اس کا حکم اسے پسند ہو یا ناپسند تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم دیا جائے۔ اور جب معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر کوئی سمع و اطاعت نہیں۔'' ۲۵

''اللہ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں۔ اطاعت صرف معروف میں

ہے۔"(مسلم)

۲-قانون کی پابندی اور نظم میں خلل نہ ڈالنا۔

"لاَ تُفْسِدُواْ فِيْ الأَرْضِ بَعْدَ إِصْلاَحِهَا"(الاعراف:۸۵)

(زمین میں فساد نہ کرو اس کی اصلاح ہو جانے کے بعد۔)

"إِنَّمَا جَزَاء الَّذِيْنَ يُحَارِبُونَ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِيْ الأَرْضِ فَسَاداً أَن يُقَتَّلُواْ أَوْ يُصَلَّبُواْ"(المائدۃ:۳۳)

(جو لوگ اللہ و رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا صلیب دیے جائیں۔)

فقہاء کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد دراصل وہ لوگ ہیں جو رہزنی اور ڈاکہ زنی کریں یا مسلح ہو کر ملک میں بدامنی پھیلائیں۔[۲۶]

۳-تمام بھلے کاموں میں تعاون کرنا۔

"تَعَاوَنُواْ عَلَى الْبرِّ وَالتَّقْوَى وَلاَ تَعَاوَنُواْ عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (المائدۃ:۲)

(نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو اور گناہ و زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔)

۴- دفاع کے کام میں جان اور مال سے پوری مدد کرنا۔

"مَا لَكُمْ إِذَا قِيْلَ لَكُمُ انفِرُواْ فِيْ سَبِيْلِ اللّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الأَرْضِ ...... إِلاَّ تَنفِرُواْ يُعَذِّبْكُمْ عَذَاباً أَلِيْماً وَيَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَيْرَكُمْ وَلاَ تَضُرُّوهُ شَيْئاً......انفِرُواْ خِفَافاً وَثِقَالاً وَجَاهِدُواْ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّهِ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ"(التوبۃ:۳۸-۴۱)

(تمھیں کیا ہو گیا ہے جب تم کو خدا کی راہ میں نکلنے کے لیے کہا جاتا ہے تو تم زمین میں جم کر بیٹھ جاتے ہو ...... اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمھیں

دردناک سزا دے گا اور تمھاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے......نکلو، خواہ تم ہلکے ہو یا بھاری اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔)

"إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنيَانٌ مَّرْصُوصٌ" (الصّف:۴)

(اللہ کو وہ لوگ محبوب ہیں جو اس کی راہ میں صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں۔)

جنگ و صلح سے متعلق خارجہ پالیسی

۱۔ بدعہدی سے اجتناب اور اگر معاہدہ ختم کرنا ضروری ہو جائے تو اس کی اطلاع فریق ثانی کو دے دینا۔

"وَأَوْفُواْ بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُولاً" (بنی اسرائیل:۳۴)

(عہد وفا کرو یقیناً عہد کے متعلق باز پرس ہوگی۔)

"فَمَا اسْتَقَامُواْ لَكُمْ فَاسْتَقِيمُواْ لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ" (التوبۃ:۷)

(جب تک دوسرے فریق کے لوگ تمھارے ساتھ عہد پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو، یقیناً اللہ پرہیز گاروں کو پسند کرتا ہے۔)

"إِلاَّ الَّذِيْنَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئاً وَلَمْ يُظَاهِرُواْ عَلَيْكُمْ أَحَداً فَأَتِمُّواْ إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَى مُدَّتِهِمْ" (التوبۃ:۴)

(مشرکین میں جن لوگوں کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا پھر تمھارے ساتھ وفا کرنے میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کے عہد کو معاہدے کی مدت تک پورا کرو۔)

"وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلاَّ عَلَى قَوْمٍ

بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيْثَاقٌ'' (الانفال:۷۲)

(اور اگر (دشمن کے علاقے میں رہنے والے مسلمان) تم سے مدد مانگیں تو مدد کرنا تمھارا فرض ہے مگر یہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں دی جاسکتی جس سے تمھارا معاہدہ ہو۔)

''وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ إِنَّ اللَّهَ لاَ يُحِبُّ الخَائِنِيْنَ'' (الانفال:۵۸)

(اور اگر تمھیں کسی قوم سے خیانت (بدعہدی) کا اندیشہ ہو جائے تو ان کی طرف پھینک دو (ان کا عہد) برابری ملحوظ رکھ کر۔ یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔)

۲۔ عہد و پیمان میں نیت کی پاکیزگی، مکروفریب سے اجتناب

''وَلاَ تَتَّخِذُواْ أَيْمَانَكُمْ دَخَلاً بَيْنَكُمْ'' (النحل:۹۴)

(اور اپنی قسموں کو اپنے درمیان مکروفریب کا ذریعہ نہ بنالو۔)

یعنی دھوکہ دینے کی نیت سے معاہدہ نہ کرو کہ فریق ثانی تو تمھاری قسموں کی بنا پر تمھاری طرف سے مطمئن ہو جائے اور تمھارا ارادہ یہ ہو کہ موقع پا کر اس سے غدر کرو۔[۲۳]

۳۔ صلح پسندی

''وَإِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا'' (الانفال:۶۱)

(اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ۔)

۴۔ دنیا میں اپنی بالادستی قائم کرنے کی کوششوں سے اور غارت گری اور فساد برپا کرنے سے اجتناب:

''تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لاَ يُرِيْدُونَ عُلُوّاً فِي الْأَرْضِ وَلاَ فَسَاداً وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ'' (القصص:۸۳)

(وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کریں گے جو زمین میں اپنی برتری نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں، نیک انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔)

۵- کسی قوم کی دشمنی میں عدل کا دامن نہ چھوڑنا۔

"وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى" (المائدۃ:۸)

(اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو کہ یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔)

۶- غیر دشمن طاقتوں سے دوستانہ برتاؤ:

"لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ" (الممتحنۃ:۸)

(اللہ تم کو اس بات سے نہیں روکتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے، ان کے ساتھ تم نیک سلوک اور انصاف کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔)

۷- جو ظلم و زیادتی کی گئی اس کے بقدر ہی بدلہ لینا۔

"وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنتَصِرُونَ. وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ. وَلَمَنِ انتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَئِكَ مَا عَلَيْهِم مِّن سَبِيلٍ. إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَئِكَ لَهُم عَذَابٌ أَلِيمٌ" (الشوریٰ:۳۹ تا ۴۲)

(اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں، برائی کا

بدلہ ویسی ہی برائی ہے، پھر جو کوئی معاف کردے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا، اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جاسکتی، ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔)

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ:

(الف) اللہ تعالیٰ نے اسے اہلِ ایمان کی صفات میں شمار کیا ہے کہ وہ ظالموں اور جبّاروں کے لیے نرم چارہ نہیں ہوتے۔ ان کی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کردیں، لیکن جب کوئی طاقت ور اپنی طاقت کے زعم میں ان پر دست درازی کرے تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔

(ب) بدلہ لینے کے سلسلے میں تین اصولی قاعدے ہیں جن کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) بدلہ کی جائز حد یہ ہے کہ جتنی برائی کسی کے ساتھ کی گئی ہو اتنی ہی برائی وہ اس کے ساتھ کرلے۔ اس سے زیادہ برائی کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا۔

(۲) زیادتی کرنے والے سے بدلہ لے لینا اگرچہ جائز ہے، لیکن جہاں معاف کردینا اصلاح کا موجب ہوسکتا ہو وہاں اصلاح کی خاطر بدلہ لینے کے بجائے معاف کردینا زیادہ بہتر ہے۔

(۳) کسی شخص کو دوسرے کے ظلم کا انتقام لیتے وقت خود ظالم نہیں بن جانا چاہیے۔ ایک برای کے بدلہ میں اس سے بڑھ کر برائی کرگزرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً زنا و عصمت دری، چوری وڈاکہ زنی کے بدلے ایسی ہی حرکات، کسی ظالم نے کسی کو قتل کردیا یا مارا پیٹا تو اس کے بجائے اس کے کسی رشتہ دار یا اس کی قوم کے فرد یا افراد کو قتل کردینا یا مارنا پیٹنا وغیرہ۔

"وَقَاتِلُواْ فِي سَبِيلِ اللّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ إِنَّ اللّهَ لاَ يُحِبِّ الْمُعْتَدِينَ" (البقرۃ:۱۹۰)

(اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔)

۸- جنگ کی غایت

جنگ کا بدلہ جنگ اور تلوار کا جواب تلوار سے دیا جائے گا، لیکن اللہ کی راہ میں، نہ کہ مادّی اغراض کے لیے، نیز ان لوگوں پر ہاتھ نہیں اٹھے گا جو دینِ حق کی راہ میں مزاحمت نہیں کرتے، اور نہ لڑائی میں جاہلیت کے طریقے استعمال کیے جائیں گے۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور زخمیوں پر دست دراز کرنا، دشمن کے مقتولوں کا مُثلہ کرنا، کھیتوں اور مویشیوں کو خواہ مخواہ برباد کرنا اور دوسرے تمام وحشیانہ وظالمانہ افعال ''حد سے گزرنے'' کی تعریف میں آتے ہیں اور حدیث میں ان سب کی ممانعت ہے۔

''وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّهِ فَإِنِ انتَهَواْ فَلاَ عُدْوَانَ إِلاَّ عَلَى الظَّالِمِيْنَ. الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُواْ عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُواْ اللّهَ وَاعْلَمُواْ أَنَّ اللّهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ''

(البقرۃ:۱۹۴-۱۹۳)

(تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں ہے۔ ماہ حرام کا بدلہ ماہ حرام ہی ہے اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہوگا۔ لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ ان ہی لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔)

ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰؒ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا

خلاصہ یہ ہے:

(الف) سوسائٹی کی وہ حالت جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی وفرمانروائی قائم ہو اور اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے، فتنے کی حالت ہے، اور اسلامی جنگ کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ اس فتنے کی جگہ ایسی حالت قائم ہو جس میں بندے صرف قوانین الٰہی کے مطیع بن کر رہیں۔

(ب) باز آجانے سے مراد کافروں کا اپنے کفر وشرک سے باز آجانا نہیں، بلکہ فتنے سے باز آجانا ہے۔ کافر، مشرک، دہریے ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنا جو عقیدہ رکھتا ہے رکھے، جس کی چاہے عبادت کرے یا کسی کی نہ کرے۔ لیکن اسے یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کے قانون کے بجائے اپنے باطل قوانین جاری کرے اور خدا کے بندوں کو خدا کے سوا کسی کا بندہ بنائے۔

(ج) اور یہ جو فرمایا کہ اگر وہ باز آجائیں تو "ظالموں کے سوا کسی پر دست درازی روا نہیں" تو اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جب نظامِ حق قائم ہو جائے تو عام لوگوں کو تو معاف کر دیا جائے گا لیکن ایسے لوگوں کو سزا دینے میں اہلِ حق بالکل حق بجانب ہوں گے، جنھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں نظامِ حق کا راستہ روکنے کے لیے ظلم وستم کی حد کر دی ہو۔ چنانچہ جنگِ بدر کے قیدیوں میں سے عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث کا قتل اور فتح مکہ کے بعد نبیؐ کا ۱۷ آدمیوں کو عفوِ عام سے مستثنیٰ فرمانا اور پھر ان میں سے چار کو سزائے موت دینا اسی اجازت پر مبنی ہے۔[۲۷]

حکومت کی جواب دہی

اسلامی نظام میں حکومت اور اس کے اختیارات اور اموال سب خالق (یعنی اللہ تعالیٰ) اور مخلوق (یعنی رعایا) کی امانت ہوتے ہیں جو خدا پرست وخدا ترس، ایماندار و دیانت دار اور عادل افراد کے سپرد کیے جاتے ہیں۔ اس امانت میں کسی کو بھی من مانے طریقے سے تصرف کرنے کا حق نہیں ہے، اور جن افراد کے سپرد یہ امانت ہو وہ اس کے

لیے جواب دہ ہیں، خدا کے حضور آخرت میں اور دنیا میں عوام کے سامنے۔ عوام کو کہیں بھی کسی بھی وقت ان کا احتساب کرنے کا حق ہے۔

"إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعاً بَصِيراً" (النساء:۵۸)

(اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، اللہ تمھیں اچھی نصیحت کرتا ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔)

حواشی و مراجع

1. تفسیر ابن جریر، ج ا، ص ۲۰۰؛ تفسیر کبیر للرازی، ج ۲، ص ۱۶۵
2. کنز العمال، ج ا، ح ۹۰۶، بحوالہ طبرانی عن عوف بن مالک
3. کنز العمال، ج ا، ح: ۹۸۰، بحوالہ دار قطنی عن ابی ثعلبہ الخشنی
4. کنز العمال، ج ا، ح: ۸۸۵، بحوالہ ابن ماجہ عن ابی ہریرہؓ
5. کنز العمال، ج ۳، ح: ۷۱۹۱، بحوالہ طبرانی فی الاوسط
6. ابوداؤد، باب فی المشورۃ) یعنی اس کی امانت و دیانت پر بھروسا کیا جا سکے۔
7. ابوداؤد، کتاب العلم، الادب المفرد، ج ا، ص ۳۵۲
8. مسند احمد عن علیؓ، ح: ۵۶۶، ترمذی، ابواب المناقب
9. مشکوٰۃ، ایمان بالقدر، بحوالہ: بیہقی فی المدخل
10. ترمذی، الجہاد، عن ابی ہریرہؓ
11. کنز العمال، ج ۵، ح: ۱۴۱۳۶، بحوالہ ابن ابی شیبہ فی المصنف وابن الانباری فی المصاحف
12. کنز العمال، ج ۵، ح: ۱۴۳۵۹، بحوالہ عبدالرزاق فی الجامع، نسائی
13. طباقت ابن سعد، ج ۶، ص ۱۱۳، قول ابوموسیٰ اشعری، مسروق ابن الاجدع سے مروی

۱۴۔ الخیرات الحسان فی مناقب الامام اعظم ابی حنیفۃ نعمان از علامہ ابن حجر مکی
۱۵۔ بخاری، کتاب الاحکام، باب ۷۰
۱۶۔ ابوداؤد، کتاب المارۃ، عن ابی موسی اشعریؓ
۱۷۔ کنزالعمال، ج ۶، ح: ۱۴۷۸۵، ایضاً
۱۸۔ بخاری، عن ابی ہریرۃؓ
۱۹۔ تفہیم القرآن، جلد پنجم، مرکزی مکتبہ اسلامی، جنوری ۲۰۰۷ء، ص ۳۲۳
۲۰۔ کنزالعمال، ج ۶، ح: ۱۴۸۹۱، بحوالہ نسائی، کتاب البیعۃ عن کعب بن عجزۃؓ
۲۱۔ کنزالعمال، ج ۶، ح: ۱۴۸۸۸، بحوالہ طبرانی عن ابی سلالۃؓ
۲۲۔ ابوداؤد
۲۳۔ بیہقی، عن جابر بن عبداللہؓ
۲۴۔ ترمذی، عن ابی ہریرۃؓ
۲۵۔ بخاری
۲۶۔ الجصاص، ج ۲، ص ۴۹۳
۲۷۔ ابن جریر: ج ۱۴، ص ۱۱۲

☆☆☆

اسلام کا سیاسی نظام-قرآن پاک کی روشنی میں

محمد عنایت اللہ سبحانی*

اسلام کے سیاسی نظام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں سارے انسانوں کو مکمل عزت اور مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے، وہ عزت اور وہ آزادی جو ہر انسان کا فطری حق ہے۔ یہ اسلام کی ایسی خوبی ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

یوں تو ہر ایک ازم یہ دعوی کرتا ہے، کہ وہ تمام انسانوں کی عزت کا ضامن ہے، اور پوری نوع انسانی کی آزادی کا علم بردار ہے، مگر یہ صرف دعوی ہوتا ہے، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔

کمیونزم ہو، یا سوشلزم، کیپٹل ازم ہو، یا کوئی بھی ازم، کیا یہ سارے ازم انسانوں کو عزت اور آزادی کے سبز باغ نہیں دکھاتے؟ اور کیا دنیا نے ان تمام ازموں کا بار بار تجربہ نہیں کیا؟ اور کیا ہر تجربے نے اسے مزید ذلت ورسوائی سے دوچار نہیں کیا؟ اور کیا ان نظاموں نے غلامی کی زنجیروں میں اسے اور زیادہ نہیں جکڑ دیا؟

یہ صرف دین اسلام ہے جو واقعۃً انسان کو ہر طرح کی غلامی سے آزاد کراتا، اور حقیقی معنوں میں اسے عزت کا تاج پہناتا ہے۔

قرآن پاک میں صاف صاف آیا ہے، کہ اللہ تعالی، جو تمام انسانوں کا خالق ہے، اس نے تمام انسانوں کو عزت کی قبا پہنائی ہے، دنیا کا کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہے، جس کو اس قبا سے محروم رکھا ہو، یا اسے ذلیل اور محکوم پیدا کیا ہو۔

سورہ اسراء میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

---

* عمید کلیۃ القرآن، جامعہ اسلامیہ شانتاپورم، کیرالا

’’وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا‘‘(الاسراء:۷۰)

جس زمانے میں اسلام کی حکمرانی تھی، اور قرآنی نظام کا دبدبہ تھا، کوئی بھی انسان اپنے اس فطری حق سے محروم نہ تھا، اسلامی قلمرو میں رہنے والا ہر انسان آزادی کی کھلی ہوئی فضا میں سانس لیتا تھا، اور عزت کے ایوانوں میں بسیرا کرتا تھا۔ اس وقت ہر شہری کو وہ عزت اور وہ آزادی حاصل تھی، جو نہ اس سے پہلے کبھی حاصل ہوئی، نہ اس کے بعد کبھی حاصل ہوسکی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں یہ خوبی آئی کہاں سے ؟

اسلامی نظام کی اس خوبی کا راز اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے، جو سارے انسانوں کا رب ہے، جو سب پر مہربان، اور سب سے پیار کرنے والا ہے، اور جس نے یہ نظام بھیجا ہی اس لیے ہے تاکہ انسانوں کو فلاح و بہبود سے ہمکنار کرے۔

یہ اس ہستی کا بنایا ہوا نظام ہے جو علم وحکمت کا سرچشمہ ہے، جو انسانی فطرت کے تقاضوں سے واقف ہے، جسے خوب معلوم ہے کہ کیا چیز بندوں کے لیے مفید ہے، اور کیا چیز مہلک ہے، کیا چیز انہیں تباہ کرنے والی ہے، اور کیا چیز انہیں تباہی سے بچا کر آشتی اور سلامتی سے ہمکنار کرنے والی ہے، کیا چیز انہیں پستی کی طرف لے جانے والی ہے، اور کیا چیز انہیں بام عروج تک پہنچانے والی ہے۔

اس کے برعکس دنیا کے جو دوسرے بہت سارے نظام ہیں، وہ ان ذہنوں کی پیداوار ہیں، جن کا علم انتہائی ناقص، اور سوچ نہایت محدود تھی، اور ہے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ جو علم وحکمت سے یکسر بے گانہ، اور خواہشات نفس کے مکمل غلام تھے، اور ہیں، جن کے پیش نظر عام انسانیت کی فلاح و بہبود نہ تھی، بلکہ خاص اپنی قوم اور اپنی نسل کی مصلحت تھی۔

یہ تنہا دین اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ تمام انسانوں کے خالق، اور اس

کائنات کے مالک کا بھیجا ہوا دین ہے، اور وہ تمام ہی انسانوں کی بھلائی اور کامرانی کا ضامن ہے۔

یہاں سوال کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام کن بنیادوں پر قائم ہوگا ؟اور اس کی کیا خصوصیات ہوں گی ؟

پہلی خصوصیت

اسلام کے سیاسی نظام کی پہلی بنیاد، بلکہ اس کی ریڑھ کی ہڈی حاکمیت الٰہ کا اعلان ، اور عملی طور پر اس کا مکمل التزام ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم سلطنت میں اقتدار اعلیٰ اللہ کے لیے ہوگا، اللہ کا قانون ہی سلطنت کا قانون ہوگا، یہ قانون سب پر لاگو ہوگا، کوئی حاکم ہو یا محکوم سب یکساں طور سے اس قانون کے پابند ہوں گے، اور اس کے آگے جواب دہ ہوں گے۔

مسلم سلطنت اپنی پالیسی، اپنے تعلقات، اپنے فیصلوں، اور اپنے جملہ اقدامات میں کبھی بھی خود مختار نہیں ہوگی، وہ اپنی مملکت میں پیش آنے والے تمام معاملات کے فیصلے خالص حکم الٰہی ، یا شریعت الٰہی کے مطابق کرے گی۔ جن معاملات میں شریعت کا واضح حکم موجود ہوگا، ان معاملات میں مکمل طور سے حکم الٰہی کی پابند ہوگی، اور جن معاملات میں واضح حکم موجود نہ ہوگا، ان میں موجود احکام کی روشنی میں اجتہاد کرے گی، اس اجتہاد کی بنیادی شرط یہ ہوگی، کہ وہ شریعت الٰہی کی روح سے مکمل طور سے ہم آہنگ ہو۔

جس حکومت، یا جس سلطنت ، یا جس نظام میں اللہ کے قانون اور اس کی شریعت کو یہ بالا دستی حاصل ہو، وہی اسلامی حکومت، یا اسلامی سلطنت ، یا اسلامی نظام ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کا یہ صاف صاف ارشاد ہے:

''وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ''

(سورہ مائدہ:۴۴)

(جو اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت کے مطابق حکومت نہ کریں، یا معاملات کے فیصلے نہ کریں، وہ کھلے ہوئے کافر ہیں!)

اللہ تعالی اہل کتاب، یعنی یہود ونصاری کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا'' (النساء:٦٠)

(دیکھتے ہو تم ان لوگوں کو جو کہتے ہیں، وہ اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تمہاری طرف نازل کیا گیا، اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم سے پہلے نازل کیا گیا، وہ اپنے معاملات کے فیصلوں کے لیے طاغوت یعنی خدا کے باغیوں کے پاس جانا پسند کرتے ہیں، جب کہ انہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ طاغوت سے کسی طرح کا تعلق نہ رکھیں، شیطان نے طے کر رکھا ہے کہ انہیں گمرہی کی انتہا تک پہنچا کے چھوڑے گا۔)

گویا اللہ کی شریعت اور اللہ کے قانون کو چھوڑ کر طاغوت کی طرف لپکنا، اور نظام باطل کے فیصلوں کو ترجیح دینا، یہ کھلی ہوئی گمرہی ہے، جس کا ایمان کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے جزیرہ عرب میں جو زبردست سلطنت قائم کی تھی، اس سلطنت کا امتیاز یہی تھا، کہ اس کا دستور قرآن پاک تھا، اس کا نظام قرآن پاک تھا، عملا قرآن پاک کی ہی بالا دستی تھی، وہاں کی خارجہ پالیسی ہو، یا داخلہ پالیسی، وہ مکمل طور سے شریعت الٰہی کے تابع تھی۔

آپ کے بعد جو لوگ آپ کے جانشین ہوئے، جنہیں ہم خلفائے راشدین کے نام سے یاد کرتے ہیں، انہوں نے بھی اسی طریقے کو اپنایا، اور اسی طرز پر حکومت کا پورا نظام چلایا۔

دوسری خصوصیت

اسلام کے سیاسی نظام کی دوسری بنیادی خصوصیت یہ ہے، کہ اس میں حکومت کسی ایک شخص، یا کسی ایک فیملی، یا کسی ایک پارٹی کی نہیں ہوتی، بلکہ اس میں عملا ہر ایک کی شرکت ہوتی ہے، اس نظام میں حاکم حاکم نہیں ہوتا، بلکہ وہ ملت کا ایک فرد ہوتا ہے، وہ صرف اور صرف پوری قوم، یا پوری ملت، یا پوری امت کا نمائندہ ہوتا ہے، قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے آیا ہے، کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا:

''یَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ''(سورہ مائدہ:۲۰)

(اے میری قوم! اللہ تعالی کے اس احسان کو کبھی نہ بھولو، کہ اس نے تمہارے اندر نبی پیدا کیے، اور تم سب کو اقتدار، اور سلطنت کا مالک بنایا، اور تمہیں ان نعمتوں سے نوازا، جن سے کسی کو نہیں نوازا)

اس آیت میں قابل غور بات یہ ہے، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی گفتگو میں نبوت اور سلطنت دونوں چیزوں کا ذکر کیا ہے، مگر دونوں کا ذکر الگ الگ انداز سے کیا ہے، نبوت کے بارے میں فرمایا: کہ (تمہارے اندر نبی پیدا کیے) اس لیے کہ نبوت میں کسی کی شرکت نہیں ہوتی ہے، نبی وہی ہوتا ہے جسے اللہ تعالی نبوت کے لیے انتخاب کرتا ہے۔

اس کے برعکس سلطنت کے بارے میں فرمایا: (اور تم سب کو اقتدار اور سلطنت کا مالک بنایا) گویا قرآن پاک کی رو سے سلطنت کسی ایک فرد، یا ایک فیملی، یا ایک پارٹی کی نہیں ہوتی، سب کی ہوتی ہے، سب اس میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، ہر صاحب رائے کو اس میں رائے دینے کا حق ہوتا ہے، اور اس رائے کا احترام کرنا سربراہ سلطنت، یا امیر المومنین کا فرض ہوتا ہے، ضروری ہوتا ہے کہ اس رائے پر وہ سنجیدگی سے غور کرے، اگر وہ رائے صحیح اور مفید ہو، تو اس کی قدر کرے، ورنہ رائے دینے والے کو مطمئن کرے، کہ اس کی رائے میں کمزوری ہے، وہ قابل عمل نہیں ہے۔

اسلام کے سیاسی نظام میں کوئی حاکم ، یا بادشاہ، یا سلطان نہیں ہوتا، بلکہ امیر ہوتا ہے، امیر کا مطلب ہوتا ہے رہنما، سربراہ ، قائد، سرپرست، نگہبان، منتظم، نظم ونسق کا ذمہ دار۔

اسلام میں امارت کا مطلب ہوتا ہے، ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ، اس بھاری بوجھ کو مضبوطی اور دیانت داری کے ساتھ جو اٹھا سکتا ہے، وہی اس لائق ہوتا ہے، کہ اسے امیر بنایا جائے۔

اسلام میں امیر کا کام داد عیش دینا، یا اپنی اور اپنے کنبے کی پرورش کرنا ، یا دوسروں پر اپنی شان جمانا نہیں ہوتا، بلکہ اسلام کی ترقی ، ملک کی سلامتی، اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے خون جگر جلانا، اور ان بلند مقاصد کے لیے ہر بازی کھیل جانا ہوتا ہے۔ظاہری طور پر اس کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا، اس کے آگے پیچھے ہٹو بچو کہنے والوں کا کوئی لشکر نہیں ہوتا، اس کا معیار زندگی ایک ادنی شہری کا ہوتا ہے، وہ اپنی سج دھج، یا اپنی شان و شوکت سے نہیں، بلکہ اپنے کردار کی بلندی، علم وفہم کی گہرائی، چہرے کی نورانیت، اور اپنے جذبہ ناصبور سے پہچانا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی سلطنت کا ہر شہری اس سلطنت کو اپنی سلطنت ، اور اس امیر کو اپنا امیر سمجھتا ہے، اور دامے، درمے، قدمے، سخنے اس کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے، اور وقت آجائے تو اس کے لیے نقد جاں پیش کر دینے سے بھی گریز نہیں کرتا، بلکہ اسے اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہے۔

رسول اللہ کا دور ہو، یا خلفائے راشدین کا عہد ہو، اس وقت امیر و مامور ہر ایک کی یہی کیفیت ہوتی تھی، اس کے بعد بھی جب جب صحیح اسلامی سلطنت قائم ہوئی، تو لوگوں کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔

تیسری خصوصیت

اسلام کے سیاسی نظام کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیاد علم اور تقوی پر

ہوتی ہے، یہ خصوصیت بھی ایسی خصوصیت ہے جو اسے دنیا کے تمام نظاموں سے ممتاز کردیتی ہے، ایک اسلامی سلطنت کا سربراہ وہی ہوسکتا ہے جو سب سے زیادہ متقی اور خدا ترس ہو، اللہ تعالی نے نہایت واضح لفظوں میں اس حقیقت کی نشاندہی فرمادی ہے، ارشاد الٰہی ہے:

''إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ'' (الحجرات:۱۳)

(اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عالی مرتبت اور لائق عزت وہ ہے، جو تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو۔)

اور یہ مسلّم ہے کہ جو تقوی و خداترسی میں سب سے نمایاں ہوگا، وہ اپنے علم و فراست میں بھی سب سے ممتاز ہوگا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء** (اللہ کے بندوں میں اللہ سے ڈرنے والے وہی ہوتے ہیں، جو علم سے مالا مال ہوتے ہیں)

گویا علم وتقوی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔اور اسلامی سلطنت کی سربراہی کے لیے وہی اہل قرار پاسکتا ہے جو علم وتقوی میں سب سے ممتاز ہو۔خلفائے راشدین کی سب سے خاص بات یہی تھی، کہ وہ اپنے اپنے وقت میں علم وتقوی کے امام تھے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ آیت میں علماء سے مراد وہ نفوس قدسیہ ہیں، جو علم قرآن سے مالا مال ہوں، کہ یہی علم ہے جو انسان کے اندر اپنے رب کی بے پناہ محبت، اور اس کی بے انتہا خشیت پیدا کرتا ہے۔اس کے علاوہ جتنے بھی علوم ہیں وہ اگر علم قرآن کی سرپرستی سے محروم ہیں،تو وہ عموما انسان کو علمی پندار میں مبتلا کرکے خدا سے دور کردیتے ہیں۔

اسلامی سلطنت کے سربراہ کے لیے جو صفات مطلوب ہیں، کم وبیش وہی صفات دیگر عہدے داروں کے لیے بھی مطلوب ہیں،اور یہ بالکل واضح سی بات ہے، کہ ان صفات کے انسانوں کو تلاش کرنے، اور انہیں آگے لانے کی توقع عام انسانوں سے نہیں کی جاسکتی،اسی لیے اسلام کا سیاسی نظام کبھی اس طریق انتخاب کی حوصلہ افزائی نہیں

کرتا، جو عام طور سے اس وقت ساری دنیا میں رائج ہے، اس لیے کہ اس طریق انتخاب سے عموماً اسی طرح کے لوگ برسر اقتدار آسکتے ہیں، جس طرح کے لوگ آج ساری حکومتوں پر حاوی، اور ایک بلائے بے درماں بن کر قوموں کی گردنوں پر مسلط ہیں۔

اس طریق انتخاب سے عموماً صالحین کے برسر اقتدار آنے کی امید نہیں کی جا سکتی، الا یہ کہ حالات اتنے زیادہ بگڑ چکے ہوں، کہ لوگوں کے لیے سانس لینا دوبھر ہو رہا ہو، ہر ہر شخص اپنے سر پر مسلط ظالم حکومت کے ظلم وستم اور اس کی بدعنوانیوں سے تنگ آچکا ہو، اور اس سے پناہ مانگ رہا ہو، اور قوم کا ہر ہر فرد کوئی اچھی اور ایمان دار حکومت لانے کے لیے ہر بازی کھیلنے کا فیصلہ کر چکا ہو!

بہر کیف اسلام میں طریق انتخاب عوام کالانعام کی رائے دہندگی پر مبنی نہیں ہوتا، اسلامی نظام میں رائے اہل الرائے سے لی جاتی ہے، جو علم وتقوی کے اس مقام پر ہوں کہ کسی معاملے میں سوچ سمجھ کر دیانت داری کے ساتھ کوئی صحیح رائے قائم کرسکیں، جن کی محبت اور نفرت صرف اللہ کے لیے ہو، جو ذاتی تعلقات، یا ذاتی رنجشوں سے بلند ہو کر کسی کی تائید، یا کسی کی تردید کرنا جانتے ہوں۔

خلفائے راشدین کا انتخاب

حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ رضی اللہ عنہما کی خلافت اسی طرح قائم ہوئی تھی، وہاں کوئی عوامی الیکشن نہیں ہوا تھا، محض کچھ اہل الرائے کے مشوروں سے یہ انتخاب عمل میں آیا تھا۔

اسلام کے سیاسی نظام میں اس کی بھی پوری گنجائش ہوتی ہے، کہ خلیفۂ راشد اگر کسی کو اپنی جانشینی کے لیے اہل تر، اور دین وملت کے لیے بہتر سمجھتا ہے، تو اس کو خود سے نامزد کردے، اس کے لیے دیگر اہل الرائے سے مشورہ بھی ضروری نہیں، حضرت عمرؓ کے ساتھ یہی ہوا تھا، خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات سے پہلے خلافت کے لیے انہیں خود نامزد کردیا، اور لوگوں میں اس کا اعلان بھی کرادیا، شروع میں کچھ لوگوں کو

ان کی سخت گیری کی وجہ سے کچھ تردد ہوا، مگر تھوڑی ہی دیر میں یہ تردد رفع ہو گیا، پھر ساری امت نے اس فیصلے کا احترام کیا، اور بسر وچشم اس نامزدگی کو قبول کیا۔

علماء کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا، رسول پاک ﷺ نے اپنی وفات سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کے سلسلے میں کچھ ایسے احکام جاری کیے، اور کچھ ایسی وصیتیں فرمائیں، جن سے صاف ظاہر تھا، کہ آپ نے انہیں خلافت کے لیے نامزد فرما دیا ہے، اور عام مسلمانوں نے بھی ان احکام اور ان وصیتوں کا مطلب یہی سمجھا تھا، مگر آپ کی وفات ہوئی، تو کچھ منافقین نے محض مسلمانوں کے نظام کو درہم برہم کرنے کے لیے یہ شوشہ چھوڑا، کہ خلافت انصار کا حق ہے، اور اگر مہاجرین اس حق کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، تو مہاجرین کا امیر الگ ہوگا، انصار کا امیر الگ ہوگا !!

یہ صرف منافقین کا اٹھایا ہوا فتنہ تھا، جس سے مخلص اور راست باز انصار کا کوئی تعلق نہ تھا، اسی لیے یہ فتنہ زیادہ دیر نہ ٹک سکا، جیسے ہی اکابر صحابہ کو اس فتنے کی اطلاع ہوئی، انہوں نے موقع پر پہنچ کر بروقت اسے کچل دیا۔

الغرض حضرت ابوبکرؓ صدیق کا انتخاب خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا، ظاہر ہے اس کے بعد کس صحابی رسول کو ان کی خلافت سے اختلاف ہو سکتا تھا؟ اور کون حضرت ابوبکرؓ کے مقابلے میں سر اٹھانے کی جرأت کر سکتا تھا؟

اور کچھ بعید نہیں کہ یہ انتخاب بھی آپ نے خود نہ فرمایا ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو یہ اشارہ ملا ہو، اس لیے کہ آپ کی وفات کے بعد جو سنگین ترین حالات پیش آئے، اور امت مسلمہ جن سخت ترین آزمائشوں سے دوچار ہوئی، ان کے لیے حضرت ابوبکرؓ کی ہی ضرورت تھی، کسی اور کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ ان ناگہانی حالات سے لوہا لے سکتا! اور فتنوں کی یلغار سے اس شان کے ساتھ نبرد آزما ہو سکتا !

اس سلسلے میں حضرت عمرؓ فاروق کا درج ذیل جملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، کچھ دنوں بعد جب مجاہدین کے فوجی دستے ہر طرف سے فتح و کامرانی کی بشارتیں لے کر آنے لگے، تو ایک روز لوگوں نے دیکھا، حضرت عمرؓ نہایت والہانہ انداز میں بار بار حضرت ابوبکر

رضی اللہ عنہ کی پیشانی کو بوسہ دے رہے ہیں، اور فرماتے جاتے ہیں:

''لولا انت یاخلیفة رسول اللہ لھلکنا جمیعا!''

(خلیفہ رسول! اگر آپ نہ ہوتے تو ہم سب ہلاک ہو جاتے !!)[1]

حسن انتخاب نہ کہ طریق انتخاب

قصہ مختصر، اسلام کے سیاسی نظام میں اصل اہمیت اس بات کی نہیں، کہ سربراہ سلطنت یا اس سلطنت کے دیگر عہدے داران لوگوں کے چناؤ، یا لوگوں کے انتخاب سے آئیں، بلکہ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ ان مناصب پر ایسے نفوس جلوہ افروز ہوں، جو اپنے علم و فضل اور تقوی و طہارت کے لحاظ سے اہل تر ہوں، وہ دین و ملت اور ملک و وطن کے حق میں سب سے بہتر ہوں۔ اور کوئی بھی طریق انتخاب جو اس مقصد کو پورا نہ کرتا ہو، اسلام کے سیاسی نظام میں قابل قبول نہیں۔

اللہ تعالی نے قرآن پاک میں اسلامی سلطنت کے فرائض بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''وَلَيَنصُرَنَّ اللّٰهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ. الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ'' (سورة الحج: ۴۰۔۴۱)

(اللہ ضرور مدد کرے گا اس کی جو اللہ کی مدد کرے گا، بے شک اللہ طاقت والا اور غالب رہنے والا ہے، (ہم ضرور مدد کریں گے) ان لوگوں کی، جنہیں زمین میں اگر ہم غلبہ و تمکن عطا کریں، تو وہ نماز کا نظام قائم کریں گے، زکوٰۃ کا اہتمام کریں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے، اور برائیوں کا سدّ باب کریں گے، اللہ کے ہی ہاتھ میں ہے تمام معاملات کا انجام۔)

یہ ہے اسلامی سلطنت کا منشور جو اللہ تعالی نے قرآن پاک میں واضح فرمادیا

ہے، اسلامی سلطنت کا نصب العین ہوتا ہے ایک ایسے سماج کا قیام جو ہر قسم کے کرپشن سے پاک ہو، ہر طرح کی برائی اور بے حیائی سے پاک ہو، جہاں امن وسلامتی ہو، محبت اور غم خواری ہو، پیدا کرنے والے کی اطاعت اور بندگی ہو، اس کے بھیجے ہوئے قانون کی فرمانروائی ہو، ظاہر ہے اس منشور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اسی طرح کے نیک طبیعت، بلند ہمت اور باصلاحیت افراد درکار ہوں گے۔

اسلام کا راستہ اور ہے جمہوریت کا راستہ اور!

یہیں سے اسلامی نظام کا راستہ جمہوری نظام سے بالکل الگ ہوجاتا ہے۔ اس طور سے الگ ہوجاتا ہے کہ ان دونوں کے کہیں ملنے کا کوئی امکان نہیں رہتا، کیونکہ جمہوری نظام میں اخلاقی قدروں، دینی اصولوں، اور علمی صلاحیتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، وہاں اہمیت ہوتی ہے صرف عوامی تائید اور عوامی رجحان کی۔

جو عوامی رجحان کو اپنی طرف موڑ لے، اور جسے عوامی تائید حاصل ہوجائے، وہ اونچے سے اونچے عہدے تک پہنچ سکتا ہے، چاہے وہ کتنا ہی ناکارہ اور بے فیض، بلکہ کتنا ہی خطرناک انسان کیوں نہ ہو، اقبالؒ نے صحیح کہا ہے:

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

اسلام کا سیاسی نظام اس سے بالکل مختلف ہے، وہ کبھی انسانوں کے ساتھ ایسا ظلم نہیں کرتا، وہ انسانوں کو گننے کے بجائے تولتا ہے، وہ ہمیشہ سماج کے صالح عناصر کو سامنے لاتا ہے، اور ان میں بھی جو صالح تر ہو، اسے قوم کی سربراہی کے لیے آگے بڑھاتا ہے، وہ غلط کار اور ناپاک عناصر کو اسی جگہ رکھتا ہے، جہاں انہیں رہنا چاہیے، اسلامی نظام میں ان کے آگے آنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ وہ اپنے آپ کو تبدیل کرلیں، اور سماج کے صالح اور مفید عناصر میں شامل ہوجائیں۔

یہ اسلامی طریق انتخاب، ظاہر ہے، اسی وقت اختیار کیا جاسکتا ہے، جب کوئی اسلامی ریاست ہو، جہاں اسلامی نظام عملاً قائم ہو، اور وہاں کے مسلم عوام کے دلوں میں

اسلامی اصولوں اور اسلامی قدروں کا بھرپور احترام پایا جاتا ہو۔

یا کوئی اسلامی ادارہ یا مسلم تنظیم ہو، جو اسلام کی صحیح مزاج شناس، اور عملاً اسلامی اصولوں کی پابند ہو، اور اسلام کی سچی اور بےلوث پیروی کو ہی اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتی ہو۔

غیر اسلامی ماحول میں ہمارا موقف

لیکن اگر کوئی غیر اسلامی ملک ہو، جہاں اسلام اقتدار سے بے دخل ہو، جہاں کی بھاری اکثریت غیر مسلم ہو، اور جہاں رہنے والی مسلم امت بھی اسلامی اصولوں اور اسلامی قدروں سے بےگانہ ہو چکی ہو، اسلام کی خاطر جینے، اس کے تمام بنیادی تقاضے پورے کرنے، اور اس کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دینے کے بلند جذبات سے عاری ہو چکی ہو، تو ایسی صورت میں ہمارا موقف کیا ہوگا؟

کیا ہم جمہوری طریق انتخاب کو اپنائیں گے، اور جمہوریت کے اندر اپنے دکھوں کا مداوا، یا اپنے مسائل کا حل، یا اپنی ترقی کی راہیں تلاش کریں گے؟

کیا ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ اس طور سے اپنے آپ کو کوئی فائدہ پہنچا سکیں گے، یا اپنے دین و مذہب کی کوئی خدمت انجام دے سکیں گے؟

بظاہر جمہوریت کا نغمہ بہت دل کش معلوم ہوتا ہے، اس کے آئینے میں ہمیں اپنے حسین خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے، مگر اس طریق انتخاب سے کامیابی حاصل کرنی اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک ملک کے ایک ایک فرد تک، یا کم از کم ابنائے وطن کی غالب اکثریت تک اسلام کی دعوت اس طور سے نہ پہنچا دی جائے، کہ وہ اس کی ہم نوا، اور گرویدہ ہو جائے، اور اسی کو اپنے درد کا درماں سمجھنے لگے!

ظاہر ہے یہ کام آسان نہیں۔ بلکہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں! اور اتنا کچھ کر لینے کے بعد بھی سیاسی میدان میں کامیابی یقینی نہیں!

وجہ ظاہر ہے، کسی الیکشن کو جیتنے کے لیے آج کل جتنے غلط ہتھکنڈے استعمال

کیے جاتے ہیں، اس کے لیے جس طرح دین وایمان کے سودے کیے جاتے ہیں، اس کے لیے جتنی ذلیل حرکتیں کی جاتی ہیں، اس کے لیے جس طرح ڈھول کی رسیاں بٹی جاتی ہیں، اسلامی تہذیب میں ان تمام باتوں کی سرے سے گنجائش نہیں۔

لہذا اس کھیل میں ہم کبھی دوسروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ اس کھیل میں ہم اپنے آپ کو بھی کھودیں، اپنا سارا اثاثہ بھی گنوادیں، مگر اس کا کوئی امکان نہیں کہ اس سے ہم کچھ حاصل کرسکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی ترقی کا راستہ ملکی یا صوبائی الیکشن میں شرکت نہیں، ہماری کامیابی کا تمام تر انحصار دین حنیف کی سرگرم دعوت، اور اسلامی اصولوں پر دل ودماغ کی اچھی تربیت پر ہے۔ علمی اور عملی طور پر اسلام کی سچی اور کامل نمایندگی ہی ہماری کامیابی اور سربلندی کی ضامن ہے۔

اس کے علاوہ ہر راستہ ہمارے لیے خطرناک ہے، چاہے وہ بظاہر کتنا ہی آسان اور پرکشش نظر آتا ہو، اور چاہے اس سے منزل کتنی ہی قریب نظر آتی ہو۔ بہت سے راستے ہوتے ہیں، جن سے منزل بہت قریب نظر آتی ہے، مگر جوں جوں آگے بڑھتے جایئے منزل دور سے دور تر ہوتی چلی جاتی ہے!

جمہوریت ایک دھوکا!

جمہوریت کا راستہ بظاہر بہت کشادہ اور کھلا ہوا نظر آتا ہے، مگر اس کی یہ وسعت اور کشادگی صرف ظالموں اور شرپسندوں کے لیے ہوتی ہے۔ جہاں تک بھلے اور خیر پسند لوگوں کا تعلق ہے، تو ان کے لیے تو وہ ایک ایسی بند گلی ہے، جس میں داخل ہوجانے کے بعد پلٹ کے واپس آنا بھی ممکن نہیں رہ جاتا!

آج مصر کی مثال ہمارے سامنے ہے، ملت اسلامیہ کے مرد آہن ڈاکٹر محمد مرسی خالص جمہوری طریقے سے بھاری اکثریت کے ساتھ اقتدار میں آئے، مگر یہ جمہوریت انہیں بالکل راس نہیں آئی!

ان کی صدارت کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا، کہ ان کے خلاف نہایت گھناونی سازش کر کے انہیں حراست میں لے لیا گیا، پھر ان کے اور ان کے بے گناہ اور فرشتہ صفت ساتھیوں کے ساتھ ظلم و بربریت کی انتہا کر دی گئی، ان کے خون ناحق سے کیسی بے دردی کے ساتھ ہولی کھیلی گئی! اور جمہوریت کی کس کس طرح دھجیاں بکھیری گئیں!

جمہوریت کی یہ دھجیاں بکھیرنے والے کون لوگ تھے؟ یہ وہی لوگ تھے، جو جمہوریت کے سب سے بڑے پاسبان تھے!

اس کے برعکس بنگلہ دیش میں سیکولرزم کی علم بردار شیخ حسینہ واجد نے اپنے شہریوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا! ان کے ساتھ وہ وہ حرکتیں کیں کہ شرافت وانسانیت سر پیٹ کر رہ گئی، مگر اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا!

پھر بندوقوں اور ٹینکوں کے سایے میں الیکشن کرایا، جو سر تا سر دھاندلی اور دہشت گردی کا نمونہ تھا، شروع سے آخر تک نہایت ہی شرمناک قسم کی ڈکٹیٹر شپ تھی، جس کا جمہوریت سے کوئی واسطہ نہ تھا، عوام کی بھاری اکثریت نے اس الیکشن کا بائیکاٹ کیا، مشکل سے بیس فیصد آبادی نے اپنے ووٹ ڈالے، اصولی طور پر یہ الیکشن بالکل غلط اور ناقابل تسلیم تھا، مگر جمہوریت کے نام لیواؤں نے اسے بے چون وچرا تسلیم کر لیا! اور شیخ حسینہ کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا!

یہ ہے جمہوریت کا اصل چہرہ! نہایت مکروہ اور بے رونق چہرہ! ضروری ہے کہ جمہوریت کی اس حقیقت کو سمجھا جائے! ضروری ہے کہ اسلام اور جمہوریت میں جو مشرق و مغرب کی دوری ہے، اسے نظر انداز نہ کیا جائے، اور کبھی اس دھوکے میں نہ آیا جائے، کہ اسلام اور جمہوریت دونوں ایک ہی چیز ہیں، یا دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہیں۔

چوتھی خصوصیت

اسلام کے سیاسی نظام کی چوتھی بنیادی خصوصیت یہ کہ وہ اپنے پاکیزہ مقاصد کو پاکیزہ طریقوں سے ہی حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ کبھی غلط طریقوں کا سہارا نہیں لیتا، وہ کبھی

غلط راستوں سے اپنی منزل تک نہیں پہنچتا، وہ کبھی جھوٹے وعدوں کے سبز باغ نہیں دکھاتا، وہ اپنے پروگرام اور پالیسی پر کوئی پردہ نہیں ڈالتا، وہ کبھی غلط لوگوں سے گٹھ جوڑ نہیں کرتا، قرآن پاک کی صاف صاف ہدایت ہے:

''لَّا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ''۔آل عمران:۲۸)

(اہل ایمان اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں، اور جو کوئی ایسا کرے گا، اللہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا)

''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ'' (سورہ مائدہ:۵۱)

(اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، تم میں سے جو کوئی انہیں دوست بنائے گا، وہ انہی میں شمار ہوگا، اللہ ظالموں کو راستہ نہیں دکھاتا۔)

گویا اسلامی نظام کبھی دوسرے دنیوی نظاموں سے ہاتھ نہیں ملا سکتا، چاہے وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے، کیونکہ اس کا راستہ سب سے الگ ہے، وہ کبھی اصولوں کے معاملے میں کسی سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتا، وہ عارضی طور سے بھی کسی سے کوئی سمجھوتہ کر کے دوسروں کو کسی غلط فہمی میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

اس کا پروگرام بالکل واضح ہے، انسانوں کو ہر طرح کی گمراہیوں سے نکالنا، انہیں اپنے ہی جیسے انسانوں کی خدائی سے نجات دلانا، انہیں ظالموں کے جبر واستبداد سے نکال کر آزادی کی کھلی فضاؤں میں پہنچانا، انہیں جہنم کے راستے سے ہٹا کر جنت کے راستے پر لگانا، انہیں شیطان کی غلامی سے نکال کر اپنے مہربان رب کی عطا کی ہوئی عزت سے سرفراز کرنا، انہیں زندگی کے تمام شعبوں میں اپنے خالق و مالک کی اطاعت وعبادت

کا خوگر بنانا۔

یہ اسلامی نظام کی ایک ایسی خصوصیت ہے، جو اسی کے ساتھ خاص ہے، مقصد کی یہ پاکیزگی و بلندی، اور اس مقصد کے حصول کے لیے طریق کار کی یہ پاکیزگی و بلندی اسلامی نظام کے علاوہ دنیا کے کسی نظام میں نہیں پائی جاتی، کہ سیاست کی گلی تو ایسی گلی ہے، جس میں مکر و فریب کی دبیز نقاب اوڑھے بغیر داخل ہونے کا کوئی تصور ہی نہیں!

اس میں شک نہیں کہ امت کے ایک طبقے نے اسلامی نظام کو بھی جمہوریت کی نقاب اوڑھانے کی کوشش کی ہے، اور کچھ لوگوں نے اسے اسلامی جمہوریت کا نام دیا ہے، لیکن یہ ان کی کھلی ہوئی غلطی ہے، جمہوریت اور اسلام میں اتنی ہی دوری ہے، جتنی دوری اس کرہ ارضی اور ساتویں آسمان میں ہے، ان دونوں کا اجتماع کسی بھی صورت میں ممکن نہیں، چہ نسبت خاک را با عالم پاک !

پچھلی سطروں میں اسلامی نظام کی جو خصوصیات بیان ہوئی ہیں، وہ اسلام اور جمہوریت کے اس فرق کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں، جن لوگوں نے اسلام کو جمہوریت سے ملانے کی غلطی کی ہے، اس کی ایک بڑی وجہ شاید شوری کے سلسلے میں ان کی غلط فہمی ہے، وہ شورائیت اور جمہوریت کے باہمی فرق کو نہیں سمجھ سکے، جس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔

پانچویں خصوصیت

اسلامی نظام کی پانچویں خصوصیت ہے اس کا شورائی مزاج ۔ شورائیت اس نظام کے مزاج میں داخل ہے، جو شورائیت اس نظام میں پائی جاتی ہے، دنیا کے کسی نظام میں نہیں پائی جاتی، کسی اور نظام میں اگر شورائیت ہے، تو نہایت محدود پیمانے پر، یہ شورائیت کونسل، یا مہان سبھا، یا ودھان سبھا (پارلیمنٹ)، یا اسی قسم کی دیگر رسمی مجالس تک محدود ہوتی ہے، جب کہ ان مجالس کی کارروائیوں کو شوری کا نام دینا ہی غلط ہے، اس لیے کہ ان مجالس کی وہ روح ہوتی ہی نہیں، جو اسلامی نظام میں شوری کی ہوتی ہے۔

اسلامی نظام کی شورائیت کوئی رسمی چیز نہیں، اس کا کوئی مخصوص یا محدود دائرہ نہیں، اس شوری میں ہر اس شخص کے فہم وتجربے سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، جو اس کی اہلیت رکھتا ہے، اس میں نہ عمر کی کوئی شرط ہے، نہ کسی خاص فنی مہارت یا سماجی پوزیشن کی۔

شورائی نظام کہنا صحیح نہیں!

لیکن ان سب کے باوجود اسلامی نظام کو شورائی نظام کہنا صحیح نہیں، اسلامی نظام، اسلامی نظام ہے، قرآنی نظام ہے، شورائی نظام نہیں، قرآن پاک میں شوری کا بیان اسلام کے سیاسی نظام کی حیثیت سے نہیں ہوا ہے، بلکہ مسلم سماج کے ایک امتیازی وصف کی حیثیت سے ہوا ہے۔

سچے مؤمنین کی جو صفات بیان ہوئی ہیں، ان میں سے ایک صفت یہ بیان ہوئی ہے: (وامرهم شورى بينهم) جس کا ترجمہ ہے: (وہ اپنے معاملات میں باہم مشورے کرتے ہیں) پیش آمدہ معاملات میں باہم مشورے کرنا، یہ سچے مؤمنین کا مزاج ہے، یہ ان کی اجتماعیت کا اتنا نمایاں وصف ہے، جو قدم قدم پر اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔

یہ سورہ شوریٰ کی آیت ہے، جو ہجرت سے پہلے مکے میں نازل ہوئی تھی، جب کہ مسلمان شدید مظالم اور صبر آزما حالات سے گزر رہے تھے، اور حکومت واقتدار سے کوسوں دور تھے، لہذا اس سے نظام حکومت کا بیان مراد لینا دور کی کوڑی لانا ہوگا، اس صفت کے آگے پیچھے اور بھی صفات بیان ہوئی ہیں، جن میں سے کسی بھی صفت کا نظام حکومت سے کوئی تعلق نہیں، وہ سب کی سب نبی ﷺ کے زیر تربیت مخلص مومنین کی ذاتی صفات ہیں۔ وہ پورا سلسلۂ کلام اس طرح ہے:

”فَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَى لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ. وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ. وَالَّذِينَ

اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ. وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنتَصِرُونَ''

(الشوریٰ:۳۶-۳۸)

(تمہیں آج جو نعمتیں بھی دی گئی ہیں، وہ اس زندگی کی چندروزہ متاع ہیں، اور اللہ کے ہاں جو نعمتیں ہیں، وہ زیادہ اچھی اور لافانی ہیں، یہ نعمتیں ان لوگوں کے لیے ہوں گی جو ایمان لائے، اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں، اور جو کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے دور رہتے ہیں، اور جب غصہ کی بات ہوتی ہے، تو درگذر سے کام لیتے ہیں، اور جو ہمیشہ اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتے ہیں، اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں، اور اپنے معاملات میں باہم مشورے کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اور جن کا حال یہ ہے کہ ان پر ظلم ہو تو وہ مضبوط رہتے ہیں، شکست خوردہ نہیں ہوتے۔)

شورائیت کے فائدے

گویا شورائیت مومنین کی بنیادی صفات میں سے ہے، وہ ہر معاملے میں ایک دوسرے سے مشورے کرتے ہیں، باہم مشورے سے ایک دوسرے کے علم وفہم اور تجربات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے، آپس کے تعلقات میں استواری آتی ہے، محبت، اپنائیت اور باہمی اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے، ایک دوسرے کو انتہائی قریب سے دیکھنے سمجھنے، اور ساتھیوں کے خیالات وجذبات کو پڑھنے کا موقع ملتا ہے، پھر ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے، ذہن ودماغ کی مسلسل تربیت ہوتی ہے، اس میں وسعت اور بہتر سے بہتر کی جستجو پیدا ہوتی ہے۔

جس خاندان، یا جس سماج میں شورائیت کا مزاج ہوتا ہے، اس خاندان، یا اس

سماج کی ذہنی اور علمی سطح برابر ترقی پذیر ہوتی ہے، اور اس کے استحکام میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

پھر شورائیت چونکہ مومن کا مزاج بن چکی ہوتی ہے، اس وجہ سے وہ ہر جگہ نظر آتی ہے، اور ہر سطح پر نظر آتی ہے، شخصی معاملات میں بھی نظر آتی ہے، اجتماعی اور سیاسی معاملات میں بھی نظر آتی ہے، قابل لحاظ بات یہ ہے کہ کوئی بھی صورت ہو، شوری شوری ہوتی ہے، وہ فیصلہ نہیں ہوتی، البتہ وہ صحیح فیصلے تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں، کہ شوری فیصلے میں معاون ہوتی ہے، یا صحیح فیصلے تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتی ہے، مگر فیصلے کی بنیاد نہیں ہوتی، کسی مجلس شوری کا کام فیصلے کرنا نہیں، بلکہ فیصلے کی بنیادیں فراہم کرنا ہوتا ہے، اور جب فیصلے کی بنیادیں فراہم ہو جائیں، تو فیصلہ ان بنیادوں، یا ان دلیلوں کی روشنی میں ہوگا، نہ کہ مجلس کے رجحان پر۔

شوریٰ میں رائے شماری نہیں

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کسی شوری کے موقع پر رائے شماری نہیں ہوگی، اور کثرت رائے یا قلت رائے کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں ہوگا، کیونکہ کثرت رائے یا قلت رائے کا لحاظ کرنا، اور اس کی بنیاد پر فیصلے کرنا بنیادی طور سے شوری کی روح کے خلاف ہے، نہ صرف شوری کی روح کے خلاف ہے، بلکہ اس کے لیے جان لیوا ہے، جہاں رائے شماری آئی، وہیں شورائیت کا دم نکلا !

کثرت رائے یا قلت رائے کا لحاظ جمہوریت کا مزاج ہے، شورائیت کا نہیں، شوری کی بنیاد ہمیشہ دلائل پر ہوتی ہے، سروں کی تعداد پر نہیں، جبکہ جمہوریت کی تمام تر بنیاد سروں کی تعداد پر ہوتی ہے، دلائل پر نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا عہد مبارک ہو، یا خلفاء راشدین کا، کسی بھی دینی اور شرعی فیصلے کے موقع پر کبھی رائے شماری نہیں ہوئی، ہمیشہ دلائل کی بنیاد پر

فیصلے ہوئے۔

حضرت ابو بکرؓ نے جب مانعین زکاۃ، اور اہل ارتداد سے جہاد کرنے کا فیصلہ کیا، تو اس وقت کوئی ان کا ہم نوا نہ تھا، رائے عامہ بالکل اس فیصلے سے غیر مطمئن تھی، مگر دلیل کی طاقت ان کے ساتھ تھی، لہذا نہ چاہتے ہوئے بھی سب لوگوں نے ان کا ساتھ دیا، بعد میں جب اس فیصلے کے بہترین نتائج سامنے آئے، تب لوگوں کو اندازہ ہوا کہ وہ فیصلہ کتنا صحیح اور باعث خیر و برکت تھا۔

حضرت ابو بکرؓ کی جانشینی کا مسئلہ آیا، تو خود حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کا انتخاب کیا، حضرت عمرؓ کا نام سن کر عام لوگوں میں بے چینی پیدا ہوئی، حضرت عمرؓ کی سخت مزاجی اور سخت گیری کی وجہ سے رائے عامہ ان کے حق میں نہ تھی، مگر حضرت ابو بکرؓ نے رائے عامہ کا کوئی لحاظ نہیں کیا، کیونکہ اس فیصلے کے حق میں ان کے پاس جو دلائل تھے، وہ رائے عامہ سے زیادہ وزنی تھے، پھر حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے بعد جب ان کے اس فیصلے کی بے پناہ برکتیں سامنے آئیں، تب لوگوں کو اندازہ ہوا کہ حضرت ابو بکرؓ کا وہ فیصلہ کتنا درست تھا۔

رائے شماری کی دلیل

فیصلوں کے وقت کثرت رائے کا لحاظ کرنے کی سب سے بڑی دلیل، جو دی جاتی ہے، وہ غزوہ احد کے موقع پر حضور ﷺ کا وہ فیصلہ ہے، جس کے مطابق صحابہ کرام کو مدینے سے باہر نکل کر کفار کا مقابلہ کرنا تھا۔

کہا جاتا ہے آپ کی اور اکابر صحابہ کی رائے تھی کہ مدینے کے اندر رہ کر قریش کا مقابلہ کیا جائے، مگر اکثریت کی رائے یہ ہوئی کہ مدینے سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے، چنانچہ اکثریت کا رجحان دیکھتے ہوئے آپ اپنی رائے سے دست بردار ہو گئے، اور دشمن سے مقابلے کے لیے مدینے سے باہر نکل کر احد کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہ بات جتنی مشہور ہے، اتنی ہی بے حقیقت ہے، مدینے کے اندر رہ کر جنگ

لڑنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، مدینے کے اندر دشمن کو داخل ہونے کا موقع دینے کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا کہ پورا مدینہ دیکھتے دیکھتے اک کھنڈر بن کر رہ جائے!

منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی نے مدینے کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کرنے کی جو تجویز رکھی تھی، اس سے اس کا مقصد یہی تھا، وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح پورا مدینہ، یعنی مرکز اسلام تاراج ہوکر رہ جائے، اور نبی ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے لیے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ رہ جائے! [۲]

آپ نے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے خیالات جاننے کے لیے ہی یہ بات مجمع عام میں رکھی تھی، اور وہ مقصد پورے طور سے حاصل ہوگیا، جہاں تک آپ کا تعلق ہے، تو آپ نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہی نہیں تھا، اس لیے کہ وہاں اصل مقصد لوگوں کے دلوں کو ٹٹولنا، اور ان کے جذبات کا اندازہ لگانا تھا، نہ کہ محاذ جنگ متعین کرنا، لہٰذا اس بات کی کوئی اصلیت نہیں کہ آپ کی رائے عبداللہ بن ابی کی رائے سے ہم آہنگ تھی!

جہاں تک اکابر صحابہ کا تعلق ہے، تو ان کی بھی وہ رائے نہیں تھی، جس کا بری طرح پروپیگنڈا کیا گیا ہے، بزرگ صحابہ ہوں یا نوجوان صحابہ، جتنے مخلص مومنین تھے، سب کی رائے وہی تھی جس پر عمل ہوا، اور جس کے علاوہ کوئی دوسری رائے ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

مولانا اصلاحیؒ کا تجزیہ

مولانا امین احسن اصلاحیؒ اس واقعہ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاریخ وسیرت کی کتابوں میں یہ بات جو نقل ہوئی ہے کہ خود آنحضرت ﷺ کی رائے بھی یہی تھی کہ مدینے کے اندر محصور رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے، لیکن پر جوش صحابہ نے آپ کو نکلنے پر مجبور کردیا، یہ بالکل بے ثبوت بات ہے، آنحضرت ﷺ نے جس وقت لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا، اس کے بارے میں خود اپنی رائے ظاہر نہیں

فرمائی، تاکہ ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کر سکے،اور مقصود اس سے لوگوں کے حوصلے کا جائزہ لینا تھا،تاکہ جنگ سے پہلے فوج کی صحیح صحیح حالت کا اندازہ ہو جائے۔

عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے شہر کے اندر سے مقابلے پر اصرار کیا،اور جاں نثاروں نے باہر نکل کر۔ آپ نے اس تدبیر سے جب کمزوروں اور حوصلہ مندوں کا اندازہ فرمالیا تو گھر کے اندر داخل ہوئے،اور اسلحہ پہن کر باہر تشریف لائے، یہ اس امر کا اظہار تھا کہ مقابلہ باہر نکل کر کرنا ہے، جاں نثاروں کو بطور خود یہ گمان ہوا کہ مبادا حضور نے یہ رائے ان کے اصرار کی وجہ سے اختیار فرمائی ہو،اس وجہ سے انہوں نے معذرت کے ساتھ اپنی رائے واپس لینی چاہی، اس پر حضور ﷺ نے فرمایا:

نبی ہتھیار پہن کر اتارا نہیں کرتا، یعنی اب جب کہ عزم ہو چکا تو یہ بدل نہیں سکتا۔

یہ واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کسی اہم جنگ کے لیے نکلنے سے پہلے فوج کے حوصلے کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی حکیمانہ تدبیر ضرور اختیار فرماتے تھے، بدر کے موقع پر بھی آپ نے یہ تدبیر اختیار فرمائی تھی، اور اسی موقع پر انصار کے لیڈر نے وہ تقریر کی تھی جو اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی۔)[۳]

ہمارے خیال میں مولانا اصلاحیؒ کی یہ رائے اپنے اندر کافی وزن رکھتی ہے، جب کہ ہمیں مولانا محترم کی یہ بات ماننے میں تامل ہے، کہ جاں نثاروں کو بطور خود یہ گمان ہوا کہ مبادا حضور نے یہ رائے ان کے اصرار کی وجہ سے اختیار فرمائی ہو،اس وجہ سے انہوں نے معذرت کے ساتھ اپنی رائے واپس لینی چاہی۔

جاں نثاروں کو اس طرح کا گمان ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا،اس لیے کہ وہ اپنے نبی کے فہم وفراست اور حربی عبقریت سے بے خبر نہ تھے،جب کہ آپ نے اس طرح کا کوئی اشارہ بھی نہیں کیا تھا، جس سے یہ گمان ہو کہ آپ مدینے کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، لہذا ان کے معذرت کرنے اور اپنی رائے واپس لینے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟

قرائن کی شہادت

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اس موقع پر کوئی رائے شماری نہیں ہوئی تھی، جس سے اکثریت یا اقلیت کا فیصلہ کیا جاسکے، اس وقت بس دو طرح کی رائیں سامنے آئی تھیں، اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگ صحابہ نے مصلحتاً خاموشی اختیار کی، جس طرح نبی ﷺ نے مصلحتاً اپنی رائے محفوظ رکھی، البتہ کچھ نوجوان صحابہ نے جوش وخروش کے ساتھ مدینے سے باہر نکل کر جنگ کرنے کی تجویز رکھی۔

اس سے منافقین کو غلط فہمی ہوئی کہ شاید بزرگ صحابہ مدینے سے باہر نکل کر جنگ کرنے کے حق میں نہیں ہیں، یہ بس انہی نوجوانوں کی رائے ہے، اس سے انہیں حوصلہ ملا کہ وہ اپنی بات کھل کر کہہ دیں۔

چنانچہ انہوں نے بے جھجک اپنی بات کہہ دی، اور مدینے میں رہ کر مقابلہ کرنے پر اصرار کیا، لیکن اگر نبی ﷺ یا بزرگ صحابہ نے پیش قدمی کرتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کردی ہوتی، تو پھر منافقین کی یہ ہمت نہیں ہوسکتی تھی، کہ وہ مدینے میں رہ کر مقابلہ کرنے پر اصرار کریں۔

حیرت ہے کہ ہمارے بزرگوں نے اس پر غور نہیں کیا، کہ رسول خدا اور دشمن خدا کی رائے ایک کیونکر ہوسکتی تھی! انہوں نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ اس غلط پروپیگنڈے کو نہ صرف قبول کرلیا، بلکہ اس پر اتنے بڑے مسئلے کی بنیاد رکھدی، کہ اگر کسی رائے کو اکثریت حاصل ہوجائے، تو اس پر مضبوط سے مضبوط رائے، حتی کہ نبی اور رسول کی رائے بھی قربان کی جاسکتی ہے!!

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات تاریخی لحاظ سے کمزور، اور کتاب وسنت کی روح کے یکسر خلاف ہے، اسلامی نظام میں فیصلوں کی بنیاد ہمیشہ کوئی دلیل ہوا کرتی ہے، نہ کہ لوگوں کی پسند اور طبیعت کا میلان ورجحان، وہ دلیل کتاب وسنت کے واضح نصوص کی شکل میں بھی ہوسکتی ہے، اور واضح نصوص سے صحیح استخراج واستنباط کی شکل میں بھی۔

مجلس شوریٰ کا کام اس کے علاوہ اور کچھ نہیں، کہ وہ پوری بے نفسی اور خدا ترسی کے ساتھ معاملے کے تمام پہلوؤں پر سنجیدہ گفتگو کرے، اور آپس میں سر جوڑ کر اس صحیح دلیل تک پہنچنے کی کوشش کرے، جو اس معاملے میں فیصلے کے لیے صحیح بنیاد بن سکتی ہے، اور جب تک وہ دلیل ہاتھ نہ آئے، وہ غور و فکر اور باہمی تبادلہ خیال کا سلسلہ جاری رکھے، گویا یہاں مسئلہ دلیل و حجت کا ہے، نہ کہ اکثریت یا اقلیت کا۔

مسلمانوں کی حکومتیں ہوں، یا ان کی جماعتیں اور ادارے، ان میں بارہا ایسا ہوتا ہے، کہ نہایت ہی اہم اور بنیادی امور کے سلسلے میں کچھ فیصلے کیے جاتے ہیں، فیصلے کثرت رائے سے کیے جاتے ہیں، اور ان فیصلوں کی بنیاد نامعلوم، یا غیر واضح، یا غیر اطمینان بخش ہوتی ہے۔

فطری طور پر اس سے پڑھے لکھے، اور سوجھ بوجھ رکھنے والے افراد کے اندر بے چینی یا بے اطمینانی پائی جاتی ہے، اس وقت انہیں یہ کہہ کر خاموش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، کہ یہ کسی ایک شخص کا فیصلہ نہیں، یہ شوریٰ کے فیصلے ہیں، اجتماعی فیصلوں کا احترام کرنا چاہیے!

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے، کہ اسلامی نظام میں صحیح فیصلوں کا احترام مطلوب ہے، نہ کہ اجتماعی فیصلوں کا، اجتماعی فیصلے اگر کسی مضبوط اور معقول دلیل پر مبنی نہ ہوں، تو وہ کسی احترام کے مستحق نہیں ہوتے، وہ اس قابل ہوتے ہیں، کہ ان پر پہلی فرصت میں نظر ثانی کی جائے، اور کسی صحیح فیصلے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

اور یہ چیز اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ رایوں کو کثرت یا قلت کی میزان میں نہ تولا جائے، بلکہ خالص دلیل و برہان کی میزان پر اعتماد کیا جائے۔

رائے شماری کے نقصانات

معاملات کے فیصلے جب کثرت رائے سے ہونے لگتے ہیں، تو اس سے اہل علم اور اہل الرائے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، اس لیے کہ اہل علم اور اہل الرائے ہمیشہ اقلیت میں

ہوتے ہیں، اس کے برعکس نا اہلوں اور بے علموں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، اس لیے کہ ہر جگہ، اور ہر زمانے میں ان کی اکثریت ہوتی ہے۔اس طرح جن کو مجلس میں آگے رہنا چاہیے، وہ پیچھے چلے جاتے ہیں، جن کو پیچھے رہنا چاہیے وہ آگے آجاتے ہیں!

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاملات تیزی سے بگڑنے لگتے ہیں، نئے نئے فتنے سر اٹھانے لگتے ہیں، علمی اور فکری اختلافات حل ہونے کے بجائے ذاتی رنجشوں اور نفرتوں میں تبدیل ہونے لگتے ہیں، اور غلط یا ناپختہ عناصر کو ابھرنے ، اور مجلس پر حاوی ہو کر غلط فیصلے کرانے کا موقع مل جاتا ہے۔

اور پھر ادارے اور تنظیمیں مختلف دھڑوں میں تقسیم ہونے لگتی ہیں، اور جمی جمائی سلطنتوں کے ستارے گردش میں آجاتے ہیں، یہ سب دور کے احتمالات نہیں، بلکہ ہماری تاریخ قریب و بعید کے نہایت تلخ حقائق ہیں، جن کی دل دوز داستانیں سب کے سامنے ہیں، یہاں انہیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب فیصلے کثرت رائے سے ہونے لگتے ہیں، تو اس وقت علم و تحقیق ، فہم و تدبر، اخلاص وللّٰہیت ، اور حق کی تلاش و جستجو کا ماحول نہیں ہوتا، اس وقت مکمل طور سے انانیت ، غلط بیانی، حقائق پوشی، غلط کنویسنگ ، سیاسی جوڑ توڑ ، ووٹوں کی خریداری اور ہار جیت کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔

اس وقت شوری شوری نہیں رہ جاتی، بلکہ مکمل طور سے جمہوریت بن جاتی ہے، وہ جمہوریت جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، وہ جمہوریت جس کی تباہ کاریاں محتاج بیان نہیں، اور جس نے آج پوری دنیا کو جہنم کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے!

شورائیت اور جمہوریت کے اسی فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہتوں کو یہ غلط فہمی ہوئی، کہ اسلامی نظام اور جمہوری نظام میں کوئی ٹکراؤ نہیں، بلکہ بہت حد تک دونوں میں ہم آہنگی ہے، چنانچہ وہ تحفظ جمہوریت کے نعرے لگانے لگے، اور اپنی تمام صلاحیتیں اور ساری توانائیاں اس کے لیے وقف کر دیں۔

حالانکہ ان دونوں نظاموں کے راستے بالکل الگ، اور دونوں کی منزلیں بالکل

جدا ہیں، ایک کا قبلہ حاکمیت اللہ ہے، دوسرے کا قبلہ حاکمیت جمہور، ایک کا راستہ مکمل خداپرستی ہے، دوسرے کا راستہ مکمل دنیا پرستی، پھر ان دونوں کا اجتماع کیونکر ممکن ہے؟

ملوکیت اور اسلام

بات تشنہ رہ جائے گی، اگر یہاں ملوکیت کا ذکر نہ کیا جائے، کیونکہ جو معاملہ جمہوریت کا ہے، بعینہ وہی معاملہ ملوکیت کا ہے، جس طرح اسلامی نظام اور جمہوریت کا اجتماع ناممکن ہے، بالکل اسی طرح اسلامی نظام اور ملوکیت کا اجتماع ناممکن ہے۔

جمہوریت میں جمہور کی حاکمیت ہوتی ہے، اور ملوکیت میں کسی ایک فرد یا ایک فیملی کی، جبکہ اسلامی نظام میں کسی بھی صورت میں حاکمیت الہ کے علاوہ کسی اور کی حاکمیت کا کوئی تصور نہیں ہوتا، قرآن پاک ،کا صاف صاف اعلان ہے:

''إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ'' (سورۃ یوسف:۴۰)

(حاکمیّت اللہ ہی کے لیے ہے، اس کا حکم ہے کہ بس اسی کی عبادت کرو، یہی صحیح دین ہے، لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں۔)

حاکمیّت الہ کا مطلب کیا ہے؟ حاکمیّت الہ کا مطلب بالکل واضح ہے، قرآن پاک کی شکل میں اللہ تعالی نے جو قانون اور جو دستور بھیجا ہے، مکمل طور سے اس کا نفاذ ہو، امیر غریب، وزیر فقیر سب پر اس کا یکساں نفاذ ہو، عدالتوں میں خالص شریعت الہی کے مطابق بے لاگ فیصلے ہوں، قانون الہی کے ساتھ کسی دوسرے قانون کی پیوند کاری نہ ہو، نہایت دوٹوک انداز میں اللہ تعالی کا اعلان ہے:

''وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ'' (سورہ مائدہ:۴۴)

(اللہ تعالی نے جو شریعت نازل فرمائی ہے، اس کے مطابق جو فیصلے نہ کریں، یا حکومت نہ چلائیں، وہ مکمل کافر ہیں!)

حاکمیّت الہ کا مطلب ہے، امیر اور مامور، سب کے سب اپنی انفرادی اور

اجتماعی زندگیوں میں اسلامی اصولوں کے پابند ہوں، ہر ایک کی تمنا، اور ہر ایک کی کوشش یہ ہو، کہ وہ مکمل طور سے طاعت الٰہی کے سانچے میں ڈھل جائے۔

اب اگر کوئی ایسا نظام حکومت ہے جو یہ حق حاکمیّت اللہ کے لیے خاص نہیں کرتا، عدالتوں میں فیصلے قانون الٰہی کے مطابق نہیں ہوتے، ملک کے تمام اداروں میں اللہ ورسول کے چرچے نہیں ہوتے، ہر طرف اسلامی تہذیب اور اسلامی کلچر کے جلوے نظر نہیں آتے، سلطان یا آل سلطان کی مرضی ہی ملک کا قانون ہوتی ہے، وہی قانون سب پر لاگو ہوتا ہے، کسی کی اس کے خلاف زبان کھولنے کی مجال نہیں ہوتی، کسی کو حاکم کا احتساب کرنے کا حق نہیں ہوتا، وہ جیسے چاہتا ہے، حکومت کرتا ہے، ملک کے اثاثے کو وہ اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا ہے، اور من مانے طریقے سے اسے اڑاتا ہے، وہ حق داروں کو ان کا حق نہیں دیتا، وہ دولت کی صحیح تقسیم نہیں کرتا، وہ ملک کے مادی وسائل اور قیمتی ذخائر کو غلبہ حق کے لیے نہیں، بلکہ گھٹیا ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے، وہ ہر خردمند کو شک کی نگاہ سے دیکھتا، اور اس کی آزادی پر پہرے بٹھاتا ہے۔

اگر اس طرح کا کوئی نظامِ حکومت ہے، تو یہ نظامِ حکومت کبھی بھی اسلامی نظام نہیں کہا جاسکتا، چاہے اس نظام کے چلانے والے کتنی ہی نمازیں پڑھتے ہوں، کتنی ہی مسجدیں اور مدرسے بنواتے ہوں، خدمت دین کے کتنے ہی مظاہرے کرتے ہوں، اور اللہ ورسولؐ کی کتنی ہی دہائیاں دیتے ہوں۔

ملوکیّت کی روح

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے، عام طور سے موروثی اقتدار کو ملوکیت کا نام دیا جاتا ہے، اور اگر اقتدار موروثی نہ ہو تو اسے کچھ اور کہتے ہیں، ملوکیّت نہیں کہتے، گویا ملوکیت نام ہے موروثی اقتدار کا، یہ بات کسی حد تک تو صحیح ہوسکتی ہے، مگر مکمل طور سے صحیح نہیں۔

ملوکیّت اصلاً موروثی اقتدار کا نام نہیں، بلکہ جبر واستبداد، اور حکومت پر غاصبانہ

قبضے کا نام ہے، قرآن کی رو سے اقتدار کسی ایک شخص، یا ایک خاندان کا نہیں ہوتا، بلکہ پوری قوم کا ہوتا ہے، جس کی وضاحت ہم پیچھے کر آئے ہیں۔

اب اگر کوئی فرد، یا کوئی خاندان غلط طور سے اس اقتدار پر قابض ہو جائے، اور تمام لوگوں کی آزادی، اور حقِ خود اختیاری کو سلب کر کے انہیں اپنی اطاعت پر مجبور کرے، تو اسی کا نام ملوکیت ہے، اگر چہ یہاں وراثت کی شکل نہیں پائی جاتی۔

کوئی چاہے تو اسے آمریت یا ڈکٹیٹرشپ کا نام بھی دے سکتا ہے۔ اس سے ہماری اس بات پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے کہ ملوکیت، آمریت، ڈکٹیٹر شپ، یہ سب ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں۔

جہاں تک موروثیت کا تعلق ہے، تو بسا اوقات اقتدار موروثی ہوتا ہے، مگر وہ ملوکیت نہیں ہوتا، وہ مکمل طور سے خلافت راشدہ کے حکم میں ہوتا ہے، یہ اس وقت ہوتا ہے، جب کہ سابق حاکم کا جانشین اس کا بیٹا یا اس کا بھائی، یا اور کوئی قریبی عزیز ہو، اور وہ بزور قوت قوم کے سروں پر مسلط نہ ہو گیا ہو، بلکہ قوم کے اہل الرائے، یا دیدہ ور علماء نے بغیر کسی دباؤ کے اسے خوش آمدید کہا ہو، اور اسے خوش آمدید کہنے کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہو، کہ وہ نیکی و تقوی، اور فہم و تدبر کے لحاظ سے اس منصب کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہو۔

اس بات کو بہتر طور سے سمجھنے کے لیے ہم حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی مثال سے مدد لے سکتے ہیں، قرآن پاک میں آیا ہے: (وورث سلیمان داود) (اور سلیمان داؤد کے وارث ہوئے)

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے تھے، وہ نبوت میں بھی ان کے وارث ہوئے، اور حکومت واقتدار میں بھی ان کے وارث ہوئے، مگر اس وراثت کا ملوکیت سے کوئی تعلق نہ تھا، اس لیے کہ یہ وراثت نیکی و تقوی کی وراثت تھی، اور قوم کے لیے سرتا سر خیر و رحمت تھی۔

حواشی و مراجع

۱۔ ابن الجوزی، المنتظم فی تاریخ الملوک والأمم، ۱/۴۴۳، دار صادر، بیروت

۲۔ یہ ہمارا قیاس نہیں، عبداللہ بن ابی نے خود اپنی ایک خاص مجلس میں اپنی اس تجویز کی خطرناکی کا ذکر کیا، اس نے صاف صاف یہ اعتراف کیا کہ وہ اپنی اس پلاننگ میں کامیاب نہیں ہوسکا، ورنہ وہ پورے مدینے کو کھنڈر میں تبدیل کر دیتا ! تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو علامہ محمود محمد شاکر کی کتاب: بناۃ دولۃ الإسلام

۳۔ مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، تفسیر سورہ آل عمران۔ جلد دوم: حاشیہ صفحہ ۲۰۹

☆☆☆

عصر حاضر کی جمہوریت اور قرآنی تعلیمات

وسیم احمد*

عصر حاضر کی جمہوریت میں قانون کی رو سے سارے شہری برابر ہیں۔ انھیں اظہار رائے کی آزادی حاصل ہے اور انھیں الیکشن میں ووٹ کے ذریعہ اپنے نمائندے چننے کا حق حاصل ہے۔ ہر ایک شہری کے ووٹ کی اہمیت ایک ہے۔ اسی طرح قانون ساز اسمبلیوں کے لیے نمائندے چنے جاتے ہیں اور اپنی سوچ اور اپنی پسند کے مطابق قانون سازی کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں نمائندوں کی اکثریت کا سربراہ حکومت کا سربراہ بنتا ہے۔ اس طرح بالواسطہ طور پر اقتدار عوام کی اکثریت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

یہ انداز جمہوریت بظاہر اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں بہت سی خرابیاں چھپی ہوئی ہیں جو صرف اس کی عملی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کی واضح مثالیں ان ملکوں میں نظر آتی ہیں جہاں یہ نظام رائج ہے۔ عوام کی سوچ اگر بگڑی ہوئی ہو تو عوامی جمہوریت میں بگاڑ کی خطرناک صورتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ بہت سی سماجی برائیوں کو صرف اس لیے قانونی جواز فراہم ہو جاتا ہے کہ وہ برائی سماج کی اکثریت میں پھیل چکی ہے۔ اور یہ بگاڑ اپنی انتہا کو اس وقت پہنچ جاتا ہے جب کچھ لوگوں میں پھیلی ہوئی نہایت قبیح برائی کو محض ان لوگوں کا ووٹ حاصل کرنے کے لیے خوب صورت انداز میں پیش کر کے قانونی جواز فراہم کر دیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں خاموش اکثریت کی ناپسندیدگی کا کچھ خیال نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ اس خاموش اکثریت کی اکثریت سطحی قسم کے فائدوں کی خاطر خاموش ہو رہتی ہے اور ان برائیوں کے خلاف کوئی خاطر خواہ آواز نہیں اٹھاتی بلکہ ان کا ووٹ اپنے انہیں

* سابق پروفیسر، شعبۂ الیکٹرانکس، اے۔ ایم۔ یو، علی گڑھ

نمائندوں کی جھولی میں پڑتا رہتا ہے جو ان برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کے بجائے انھیں آگے بڑھانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ برائیاں اسی وقت ختم ہو سکتی ہیں جب کہ عوام کی سوچ بدلے اور ان کے اندر احساس ذمہ داری پیدا ہو۔ لیکن آج کل مغربی ممالک، خاص کر امریکہ و یورپ کی سوچ کا انداز اتنا غالب ہے کہ ہر خاص و عام اسی نہج پر سوچتا ہے۔ مسلم ممالک میں بھی جہاں کہیں جمہوریت کا شور اٹھتا ہے اور زور بڑھتا ہے ہر طرح کے لوگوں کے ووٹ کا وزن برابر لیا جاتا ہے اور اگر عوام کی اکثریت بگاڑ کی شکار ہو چکی ہو تو ان کے چنے ہوئے نمائندے بھی انھیں جیسی سوچ کے حامل ہوتے ہیں اور جمہوریت سے اصلاح کے بجائے فساد کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ اگر کہیں کوئی صالح رہنما اصلاح کی کوشش کرتا ہے تو اس کے خلاف کچھ ناسمجھ عوام کی بھیڑ اکٹھا کر کے اسے پریشان کیا جاتا ہے اور اس کے کام میں طرح طرح سے رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں تاکہ کچھ لوگوں کے ذاتی مفادات پر آنچ نہ آئے۔

قرآنِ مبین کی تعلیمات اس سلسلے میں بالکل واضح ہیں۔ ارشاد ہے:

"قُل لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" (المائدہ:۱۰۰)

(کہو: پاک اور ناپاک برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاک کی کثرت تم کو حیرانی میں ڈال دے (یا ناپاک کی کثرت تمھیں فریفتہ کرنے والی ہو) لہٰذا اے عقل والو تم اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔)

لیکن عصر حاضر کی جمہوریت میں اللہ سے ڈر (تقویٰ) کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

"وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ" (المؤمنون:۷۱)

(اور اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو آسمان اور زمین اور جو

ان میں ہیں، ان کا نظام درہم برہم ہو جائے۔)
اور اس کی واضح مثالیں دنیا میں کم نہیں ہیں۔

قرآن جہاں ہمیں بتاتا ہے کہ لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (دین میں کوئی زبردستی نہیں) وہیں یہ بھی بتاتا ہے کہ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لاَ انفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (البقرہ: ۲۵۶) یعنی ''ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے تو جس نے طاغوت (اللہ سے غافل کرنے والے اور اس کی اطاعت و بندگی سے نکل جانے کا باعث اور ذریعہ بننے والے) کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا اس نے مضبوط رسی پکڑی، جو ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔'' معلوم ہوا کہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی حق ہے اور اس کے مقابلے میں اکثریت کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں۔

جو لوگ اپنے دنیاوی معاملات میں بہت تیز ہوتے ہیں لیکن ان کی نظر اپنے فائدے اور اپنی بڑائی سے آگے کچھ نہیں دیکھ پاتی قرآن ایسے لوگوں کے کردار کی وضاحت کرتا ہے کہ:

> ''وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ. وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لاَ يُحِبُّ الفَسَادَ. وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ'' (البقرہ: ۲۰۴-۲۰۶)
>
> (اور (اے نبی!) لوگوں میں کوئی تو ایسا ہے کہ آپ کو اس کی بات دنیا کی زندگی میں بہت بھلی لگتی ہے اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس پر وہ اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے اور جب وہ پلٹتا ہے تو اس کی سعی زمین میں فساد پھیلانے کی اور کھیتی اور نسل کو برباد کرنے کی ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فساد کو ناپسند کرتا ہے۔ اور جب اس سے کہا

جائے کہ اللہ سے ڈرو تو تکبر اور غرور اسے گناہ پر ابھارتا ہے۔ ایسے کے لیے بس جہنم ہے اور یقیناً وہ برا ٹھکانا ہے۔)

یہ کردار منافقین کا ہے اور اس کی وضاحت سورہ منافقون (۱-۶) میں بھی ہوئی ہے۔ اللہ کی نظر میں ایسے لوگوں کی بے وقعتی اس حدیث سے بھی بخوبی واضح ہوتی ہے:

"عن سهل بن سعد الساعدی رضی الله عنه أنه قال: مر رجل علی رسول الله ﷺ فقال لرجل عنده جالس: ما رایک فی هذا؟ فقال: رجل من أشراف الناس، هذا والله حری إن خطب أن ینکح، وإن شفع أن یشفع، قال: فسکت رسول الله ﷺ ثم مر رجل فقال له رسول الله ﷺ: ما رایک فی هذا؟ فقال: یا رسول الله! هذا رجل من فقراء المسلمین، هذا حری إن خطب أن لا ینکح، وإن شفع أن لا یشفع، وإن قال أن لا یسمع لقوله فقال رسول الله ﷺ: هذا خیر من ملء الارض مثل هذا" [۲]

(حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے سامنے سے گزرا تو آپ ﷺ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی سے پوچھا: تمھاری اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے؟ انھوں نے عرض کیا: معزز لوگوں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! اس قابل ہے کہ اگر کہیں نکاح کا پیغام دے تو قبول کیا جائے اور کسی کی سفارش کرے تو سفارش قبول کی جائے۔ آپ ﷺ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد ایک اور صاحب سامنے سے گزرے۔ آپ ﷺ نے اس آدمی سے پوچھا: تمھاری اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے؟ اس آدمی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ایک مسلمان فقیر ہے، اگر کہیں نکاح کا پیغام دے تو قبول نہ کیا جائے، کسی کی سفارش کرے تو قبول نہ کی جائے

اور اگر بات کہے تو اس کی بات نہ سنی جائے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر پہلے شخص جیسوں سے ساری دنیا بھر جائے تو بھی ان سب سے یہ شخص بہتر ہے۔)

اس سے ظاہر ہے کہ اللہ کو اپنے مخلص بندے ہی پسند ہیں۔ دنیاوی مال ومتاع، عزت و وجاہت کے ساتھ اگر تقویٰ نہ ہو تو ایسے لوگوں کی کثرتِ تعداد کوئی معنی نہیں رکھتی۔ قرآن کا ارشاد ہے:

"إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ" (الحجرات:۱۳)

(بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا (وہ ہے جو) تم میں سے زیادہ متقی ہے۔ بلاشبہ اللہ بہت علم والا، خوب باخبر ہے۔)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ" (ص:۲۸)

(کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان لوگوں کے مانند کر دیں گے جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں؟ یا ہم متقین کو بدکاروں کے مانند کر دیں گے؟)

ایمان کی محبت و ہدایت اور تقویٰ کی توفیق اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل وانعام ہے۔ قرآن میں اللہ کا ارشاد ہے:

"وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ. فَضْلاً مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ" (الحجرات:۷،۸)

(اور جان لو! بلاشبہ تم میں اللہ کے رسول ہیں، اگر بہت سے معاملات میں وہ تمھاری بات مان لیا کریں (تو) یقیناً تم مصیبت میں پڑ جاؤ، لیکن

اللہ نے ایمان کو تمھارا محبوب بنادیا ہے اور اس نے اسے تمھارے دلوں میں زینت دے رکھی ہے اور اس نے تمھارے لیے کفر و فسق اور نافرمانی کو ناپسند بنادیا ہے (اور) یہی لوگ رشد و ہدایت والے ہیں اللہ کے فضل و احسان سے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

''وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّ آتَاهُمْ تَقْوٰهُمْ'' (محمد:۱۷)

(اور جن لوگوں نے ہدایت پائی ہے اللہ نے انھیں ہدایت میں زیادہ کیا، اور انھیں ان کا تقویٰ عطا فرمایا۔)

اسلام ایک صاف ستھرا جمہوری نظام پیش کرتا ہے۔ اس میں حاکمیت تو بہر حال اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہے لیکن اسی حاکمیت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے فرماتا ہے:

''فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ'' (آل عمران:۱۵۹)

(پس (اے نبی!) آپ اللہ کی رحمت کے باعث ان کے لیے نرم ہو گئے۔ اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو وہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے۔ چنانچہ آپ ان سے درگزر کریں اور ان کے لیے بخشش مانگیں اور ان سے (اہم) معاملات میں مشورہ کریں۔ پھر جب آپ پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کریں، بے شک اللہ بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کی تعریف میں فرماتا ہے:

''وَمَا عِندَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى لِلَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ.

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُوْنَ. وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُوْرَى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُوْنَ'' (الشوریٰ:۳۶-۳۸)

(اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ ان لوگوں کے لیے بہتر اور باقی رہنے والا ہے جو ایمان لائے اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ کرتے ہیں اور وہ لوگ کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب غصہ آئے تو معاف کردیتے ہیں۔ اور وہ لوگ اپنے رب کا حکم مانتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ان کا (ہر) کام باہمی مشورہ سے ہوتا ہے اور ہم نے انھیں جو کچھ دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔)

ان آیات سے اسلامی جمہوریت کے خدو خال بالکل واضح ہوجاتے ہیں۔ قرآن اس کے لیے ذہن سازی بھی مؤثر انداز میں کرتا ہے۔ اس میں اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کو بہت اہمیت حاصل ہے جیسا کہ اوپر کی آیت (الشوریٰ:۳۸) سے بھی واضح ہے۔ نماز کے اہتمام میں بندہ دن میں کم از کم بتّیس (۳۲) (فرض اور سنتِ مؤکدہ کی) رکعتوں میں سورہ فاتحہ کو دہراتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، اس کی بے پناہ رحمتوں کے ساتھ آخرت کی حاضری کا ذکر بار بار ذہن میں تازہ ہوتا ہے اور اس پر ایمان پختہ ہوتا ہے (وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَى تَنفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ) (الذریات:۵۵) جس سے اللہ کی حاکمیت کو دل و جان سے قبول کرتے ہوئے اس کی بندگی آسان ہوجاتی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی سے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں میں اس کے دوسرے بندوں کے حقوق کا احساس تازہ رہتا ہے اور آپس میں مشورے سے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر سارے لوگوں کا خیال رکھتے ہوئے زندگی گزارنا آسان ہوجاتا ہے۔

سورۃ المؤمنون میں اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں کے لیے ارشاد فرماتا ہے:

'' قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ. الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ.

...... وَالَّـذِيْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلَى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ'' (المومنون:۱-۹)

(مومن یقیناً فلاح پا گئے، وہ جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں اور وہ جو لغو باتوں سے منہ موڑنے والے ہیں۔ اور وہ جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں۔........... اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔)

اپنے اچھے بندوں کی تعریف کے شروع و آخر دونوں حصوں میں نماز کے اہتمام کا ذکر کر کے اس کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ اقتدار بھی ایک امانت ہے اور اسے ادا کرنے میں بھی اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ سے بڑی مدد ملتی ہے۔ جب محمود و ایاز (خاص و عام) ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر اپنے رب (رب العالمین، رحمٰن و رحیم، مالک یوم الدین) سے صراط مستقیم کی ہدایت مانگتے ہیں اور اپنے اوپر رب کریم کے انعامات و احسانات کا احساس کر کے اس کے سامنے رکوع و سجود کرتے ہیں تو پھر ایک دوسرے کے دکھ درد میں بہتر طور پر شریک ہونے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کی رحمتوں کے سائے میں وہ بھائی بھائی بن کر بہتر شہری بن جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

''وَاعْتَصِمُواْ بِحَبْلِ اللّهِ جَمِيعاً وَلاَ تَفَرَّقُواْ وَاذْكُرُواْ نِعْمَتَ اللّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاء فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَاناً......'' (آل عمران:۱۰۳)

(اور سب مل کر اللہ کی رسی (قرآن کریم) کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو، اور تم خود پر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے۔)

ظاہر ہے یہ آیت بھی قرآن کی ہر آیت کی طرح صرف اسلام کے ابتدائی دور ہی کے لیے نہیں بلکہ ہر دور کے لیے ہدایت و رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

اظہار رائے کی آزادی

اظہار رائے کی آزادی جمہوریت کا لازمی جز ہے۔ اسلام نے بھی اس کو بہت اہمیت دی ہے۔ جامع الترمذی میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنا بڑا جہاد ہے۔ ایک دوسری حدیث میں اسے افضل جہاد بتایا گیا ہے۔[2] لیکن اسلام اس اظہار رائے کی آزادی میں اصلاح کے پہلو کو ہر حال میں مقدم رکھتا ہے۔ اور ایسی آزادی کی اجازت نہیں دیتا جس سے دوسروں کے جذبات مجروح ہوتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے اچھے بندوں کی تعریف میں فرماتا ہے کہ جب ان سے جاہل بھی مخاطب ہوتے ہیں تو ان سے سلامتی کی بات کہتے ہیں۔ (وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَاماً) (الفرقان:۶۳)۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ:

"وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ. وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ" (حٰم السجدہ:۳۳-۳۴)

(اور اس شخص سے زیادہ اچھی بات کس کی ہو سکتی ہے جو (لوگوں کو) اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے بے شک میں تو (اللہ کے) فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ اور نیکی اور برائی برابر نہیں ہو سکتیں، تم (برائی کو) ایسی بات سے دفع کرو جو احسن ہو۔ تو تم دیکھو گے یکایک وہ شخص کہ تمھارے اور اس کے درمیان دشمنی ہے (ایسا ہو جائے گا) جیسے جگری دوست ہو۔)

اور اس بھلے کام کے لیے ہدایت دیتا ہے کہ:

"اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" (النحل:۱۲۵)

(اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ کے ساتھ دعوت دو۔ اور ان سے احسن طریقے سے بحث کرو۔)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ذمہ دار شہری بنانا چاہتا ہے۔ یہ نہایت غلط ہے کہ بے سوچے سمجھے جو جی میں آئے منہ سے نکال دیا جائے۔ قرآن تعلیم دیتا ہے کہ:

"مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ" (ق:۱۸)

(انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے اسے لکھنے کو اس کے پاس ایک نگراں (فرشتہ) تیار ہوتا ہے۔)

اس لیے کہ انسان کو اپنے رب کے سامنے آخرت میں اپنے قول و فعل کا حساب دینا ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے: بھلی بات کرنا بھی صدقہ ہے۔...... وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ ......[۳]

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اچھی بات کرے ورنہ خاموش رہے۔[۴]

اس سے ظاہر ہے کہ اسلام اظہار رائے کی آزادی کو ناپسند نہیں کرتا بلکہ ناموافق حالات میں بھی صحیح اور سچی بات کہنے کو افضل جہاد سے تعبیر کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ اپنے ماننے والوں کو ہی کیا سارے انسانوں کو سوچ سمجھ کر بات کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور نامناسب بات کرنے سے روکتا ہے۔ اپنے پسندیدہ بندوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا" (الفرقان:۷۲)

(اور وہ جھوٹی شہادت نہیں دیتے اور جب کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہوتا ہے تو شرافت سے گزر جاتے ہیں۔)

قانون کی بالادستی

عصر حاضر کی جمہوریت میں نظری طور پر عدلیہ کو کافی اہمیت حاصل ہے لیکن عملی طور پر اکثریت کی سوچ قانون ساز اسمبلیوں کے ذریعہ عدل وانصاف پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ کبھی کبھی عدل وانصاف کے پیمانے بھی بدل جاتے ہیں۔ آج کل ہم جنس پرستی وغیرہ جیسے قبیح مسائل میں بھی جیسی باتیں سامنے آرہی ہیں اور ملک وقوم کو اکیسویں صدی کی روشن خیالی کی طرف کھینچ کر لے جانے کی باتیں کرنے والوں سے جس طرح کی سوچ کا مظاہرہ ہورہا ہے وہ خطرناک ہے اور اگر یہ لوگ اس سلسلے میں نئی قانون سازی میں کامیاب ہوجاتے ہیں جیسا کہ بہت سے ملکوں میں ہو چکا ہے تو یہ عصر حاضر کی جمہوریت کا بدنما رخ دکھانے کے لیے کافی ہے۔

اسلام جہاں حکمرانوں کو اپنے ماتحتوں اور رعایا کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنے کی تاکید کرتا ہے جیسا کہ پہلے (آل عمران: ۱۵۹) بیان ہوا وہیں یہ بھی بتاتا ہے کہ پاک و ناپاک برابر نہیں ہوسکتے چاہے ناپاک کی طرف داری کرنے والے کتنی ہی کثیر تعداد میں ہوں۔ (المائدہ: ۱۰۰) اسی کے ساتھ ساتھ اللہ ورسول کے بتائے ہوئے قانون کی روشنی میں بے لاگ انصاف کی تاکید کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيّاً أَوْ فَقَيراً فَاللّهُ أَوْلَى بِهِمَا فَلاَ تَتَّبِعُواْ الْهَوَى أَن تَعْدِلُواْ وَإِن تَلْوُواْ أَوْ تُعْرِضُواْ فَإِنَّ اللّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيراً“ (النساء: ۱۳۵)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم عدل وانصاف کے لیے ڈٹ جانے والے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، خواہ وہ تمھارے اپنے خلاف یا تمھارے والدین اور رشتے داروں کے خلاف ہو، معاملے کا فریق امیر ہو یا غریب، دونوں صورتوں میں تمھاری نسبت

اللہ ان کا زیادہ خیر خواہ ہے۔ پس تم نفسانی خواہش کے پیچھے پڑ کر عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ اور اگر تم نے توڑ مروڑ کر بات کی یا (گواہی دینے سے) منہ موڑا تو بے شک تم جو بھی عمل کرتے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔)

اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ لِلّهِ شُهَدَاء بِالْقِسْطِ وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلاَّ تَعْدِلُواْ اعْدِلُواْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُواْ اللّهَ إِنَّ اللّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ" (المائدہ:۸)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اللہ کے لیے (حق پر) قائم رہنے والے راستی اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو، اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، اور اللہ سے ڈرو، بے شک تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس سے خوب آگاہ ہے۔)

ان آیات سے اسلام میں عدل کو جو بالا دستی اور شفافیت حاصل ہے، بخوبی ظاہر ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ جمہوریت یعنی Democracy مغربی اصطلاح ہے جس کا مفہوم Merriam Webster's Collegiate Dictionary (Tenth Edition) میں اس طرح ہے:

a- government by the people; especially: rule of the majority.

b- a government in which the supreme power is

vested in the people and exercised by them directly or indirectly through a system of representation usually involving periodically held free elections.

۲ـ رواہ البخاری، کتاب الرقاق، باب فضل الفقر، رقم:۶۴۴۷ (منتخب احادیث، ص:۴۷۸، تالیف: مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ)

۳ـ (صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب بیان ان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف)

۴ـ (صحیح البخاری ، کتاب الادب، باب حفظ اللسان)

۲ـ فضائل اعمال، تالیف، ابوعبداللہ علی بن محمد المغربیؒ، ترجمہ حافظ عبدالغفار المدنی، مکتبہ الفہم موناتھ بھنجن، حدیث نمبر:۷۷۶، ۷۷۷، ص:۴۷۶

۳ـ ایضاً؛ ص:۳۲۱، حدیث نمبر: ۴۸۰

۴ـ ایضاً، ص:۴۸۳، حدیث نمبر: ۱۳۴۷

☆☆☆

اسلامی سیاست کی بنیادیں

محمد رفعت*

اُمتِ مسلمہ کے فرضِ منصبی کی روشنی میں مسلمانوں اور انسانیت کے تعلق پر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمانوں کا فطری مقام انسانیت کے قائد اور رہنما گروہ کا ہے۔ اس وقت مسلمان یہ کردار ادا نہیں کر رہے، بلکہ پیرو اور مقتدی کے مقام پر ہیں۔ قائدانہ پوزیشن مغربی تہذیب کی علمبردار اقوام کو حاصل ہے۔ ان اقوام کے افکار اور ان افکار کی بنیاد پر بننے والے سیاسی، سماجی اور معاشی ادارے دنیا پر غالب ہیں اور مسلمان بھی انہی افکار اور اداروں کے نظام کے تحت رہنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ اس صورتحال میں کسی بھی ملک کے سیاق میں مسلمانوں کے سیاسی رویئے پر غور کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مغربی تہذیب کے بنیادی افکار کا جائزہ لیا جائے اور وہ نقطۂ نظر متعین کیا جائے، جو ان افکار کے سلسلے میں اختیار کیا جانا چاہیے۔ مغربی افکار کے جائزے اور ان پر جاندار تنقید کے بغیر مسلمانوں کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنا ممکن نہیں۔ اس خود اعتمادی سے وہ تخلیقی قوت بھی پیدا ہوگی جو نئے افکار کی بنیاد بن سکتی ہے اور وہ جذبہ عمل بھی پیدا ہوگا جو انسانیت کی قیادت اور انسانی زندگی کی تعمیرِ نو کے لیے ضروری ہے۔ علامہ اقبال کے بقول ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

---

* پروفیسر شعبۂ فزکس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی و ایڈیٹر ماہنامہ زندگی نو، نئی دہلی

دین و مذہب کی اہمیت کا انکار

مغربی تہذیب نے انسانی زندگی میں دین، مذہب اور عقیدے کو کوئی اہم مقام دینے سے بہ شدت انکار کیا ہے۔ عام طور پر مغربی تصور کو ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے کہ ''مذہب ایک پرائیویٹ معاملہ ہے۔ اسے فرد کی نجی زندگی تک محدود رہنا چاہیے اور اجتماعی معاملات میں مذہب کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔'' لیکن یہ مغربی مزاج کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مغربی نقطۂ نظر کے مطابق یہ کوئی اہم بات نہیں ہے کہ ایک شخص توحید کا قائل ہے یا شرک کا، ایک خدا کی عبادت کرتا ہے یا متعدد بتوں کو پوجتا ہے، نیز ایک خدا سے دعا مانگتا ہے یا فرضی معبودوں کو پکارتا ہے، بلکہ اس نقطۂ نظر کے مطابق اہم بات یہ ہے کہ ایک شخص پڑھا لکھا ہے یا اَن پڑھ، ٹکنالوجی اور سائنس جانتا ہے یا نہیں جانتا، باصلاحیت اور کارآمد شخص ہے یا بے صلاحیت، ایماندار اور دیانت دار ہے یا بددیانت۔ گویا ایک شخص کا مابعدالطبیعاتی نقطۂ نظر ایک غیر متعلق شے ہے۔ اصل دیکھنے کی چیز اس کی صلاحیت یا زیادہ سے زیادہ اس کا اخلاق و کردار ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق عقائد انسانی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈالتے۔ توحید کے قائل اور شرک کے قائل سے یکساں رویے کی توقع کی جاسکتی ہے، اس لیے کہ مذہبی عقیدہ انسانی زندگی سے غیر متعلق ایک ضمنی شے ہے۔ اسی استدلال کو آگے بڑھایا جائے تو یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ افراد کو جوڑنے والا رشتہ اور ان کو ایک گروہ یا امت بنانے والا عامل عقیدہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کا تو انسانی زندگی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ انسانوں کو جوڑنے والے عوامل دوسرے ہوں گے، مثلاً مفاد کی یکسانیت، کسی سیاسی یا سماجی معاملے میں نقطۂ نظر کی یکسانیت، ایک ہی خطۂ زمین سے تعلق رکھنا، ایک زبان بولنا یا ایک نسل سے متعلق ہونا وغیرہ۔

اس بنا پر اسلامی اور مغربی نقطۂ نظر کا فرق محض عقیدے کا فرق نہیں ہے، بلکہ عقیدے کی اہمیت کے بارے میں نقطۂ نظر کا فرق بھی ہے۔ اسلام عقیدے کو شخصی و اجتماعی زندگی کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ مغرب عقیدے کو انسانی ذہن کے گوشے میں پڑی رہنے والی

ایک ضمنی، بے جان، بے معنی و بے کار شے گردانتا ہے۔ دعوتِ اسلامی صحیح عقیدے کی طرف دعوت ہے لیکن اس سے قبل خود عقیدے کی اہمیت کو اجاگر کرنا ضروری ہے۔ اس صورتحال کی بنا پر سمجھ میں آتا ہے کہ اسلام میں ایمان پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے اور یومنون بالغیب کو فلاح پانے والوں کی ابتدائی صفت کیوں بتایا گیا ہے۔ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مغرب کے اس سیکولر نقطۂ نظر کو پوری قوت کے ساتھ چیلنج کیا جائے۔ انسانی زندگی متفرق خانوں میں بٹی رہے گی جب تک کہ ایمان اور عقیدے کو زندگی میں بنیادی حیثیت نہیں دی جاتی۔ ایمان کی بنیاد پر زندگی کے مختلف پہلو باہم مربوط ہوتے ہیں۔ اگر عقیدہ واقعی زندگی سے بے تعلق ہوتا تو پھر صحیح اور غلط عقیدے کا فرق بھی غیر اہم ہو جاتا۔ صحیح اور غلط کی تمیز تو اہم چیزوں کے اندر کی جاتی ہے نہ کہ غیر اہم امور میں۔

اجتماعی زندگی کے لیے مغرب کی تجویز کردہ بنیاد

عقیدے کو اجتماعی زندگی کی بنیاد تسلیم نہ کرنے سے یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر فرد اور فرد کو جوڑنے والی اور اُن کو ایک گروہ بنانے والی شے یا عامل کیا ہے؟ مغرب نے اس کی متعدد وجوہات کو درست تسلیم کیا ہے اور ان کی بنیاد پر بننے والے گروہوں کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ بنیادیں ہیں نظریے کا اشتراک، نسل و رنگ کا اشتراک، زبان کا اشتراک، مفاد کا اشتراک اور وطن کا اشتراک۔ البتہ سب سے بڑے اجتماعی ادارے یعنی ریاست کے لیے جس عامل کو بنیاد مانا گیا ہے وہ وطن کا اشتراک ہے۔ اس خیال کے مطابق ایک وطن کے رہنے والے ایک گروہ ہیں اور اپنے سیاسی تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اُن کو ایک ریاست کی شکل اختیار کرنی چاہیے۔ اس نقطۂ نظر کو قوم پرستی (Nationalism) اور اس کی بنیاد پر بننے والی ریاست کو قومی ریاست (Nation State) کہا جاتا ہے۔ اصولی طور پر ایک قومی ریاست کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے، نہ نظریہ۔ مذہب اس لیے بنیاد نہیں ہوتا کہ مذہب کو زندگی سے غیر متعلق پہلے ہی قرار دیا جا چکا ہے

اور نظریہ اس لیے بنیاد نہیں ہوتا کہ اس نوع کی ریاست میں افراد کو جوڑنے والا عامل وطن کے اشتراک کو قرار دیا گیا ہے نہ کہ نظریے کو۔ اس طرح قومی ریاست غیر مذہبی ریاست ہوتی ہے۔ جس کو سیکولر ریاست کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ صرف اصولی بات ہے۔ عملاً ہر ریاست کی کوئی نہ کوئی تاریخ ہوتی ہے اور اس تاریخ سے کوئی نہ کوئی مذہب بھی وابستہ ہوتا ہے اور کوئی نظریہ بھی۔ اس لیے قومی ریاست اصولی طور پر سیکولر اور جمہوری ہوتے ہوئے بھی، عملاً کسی مذہب اور نظریے کی طرف میلان رکھتی ہے اور مختلف تدابیر سے دوسرے مذاہب اور نظریات کو دباتی رہتی ہے۔ اس سے اس اسٹیٹ کی منافقت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اہم تربات جو واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قوم پرستی ایک غلط اور غیر حقیقی نقطۂ نظر ہے۔ اشتراکِ وطن کو افراد کو باہم جوڑنے والا عامل قرار دینا اور جو فی الواقع جوڑنے والے عوامل ہیں، اُن کی اس حیثیت کو تسلیم نہ کرنا ایک غیر معقول رویہ ہے۔ اور قومی ریاست اپنے ظلم و ستم کے ذریعے اپنے بنیادی نقطۂ نظر کی غیر معقولیت پر ہر آن گواہی دیتی رہتی ہے۔

اب تک کی گفتگو کا نتیجہ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ مغرب کے بنیادی افکار سیکولرزم اور نیشنلزم ہیں اور ان کی بنیاد پر بننے والے سیاسی ادارے نیشن اسٹیٹ اور اس کے اقتدار کے تحت کام کرنے والی سیکولر سیاسی پارٹیاں ہیں۔ نیشن اسٹیٹ عین اپنی تعریف کے مطابق سیکولر اور جمہوری اسٹیٹ بھی ہوتی ہے۔ یہ سارے افکار اور ادارے اسلام کے نزدیک غلط اور قابلِ رد ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق یہ افکار غیر معقول اور حقیقت کے انکار پر مبنی ہیں۔ ان کی بنیاد پر تشکیل پانے والے سیاسی ادارے انسانیت کے لیے ضرر رساں اور تباہی کا باعث ہیں۔ مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ ان افکار پر تنقید کریں اور دلیل کی روشنی میں ان کا غلط ہونا ثابت کریں۔

مغرب کے مقابلے میں اسلامی اندازِ فکر کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

انسانی زندگی میں عقیدہ اور ایمان بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر محض عمل یا اخلاق یا کردار بے معنی اور بے کار و غیر حقیقی ہے۔ چنانچہ صحیح عقیدے تک پہنچنا

انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ یہ درست عقیدہ توحید کا ہے۔ رسالت اور آخرت توحید کے تقاضے ہیں۔ عقیدے کے اشتراک کی بنا پر انسانوں کا ایک گروہ بننا بالکل فطری اور معقول ہے۔ اللہ کا پسندیدہ گروہ یا امت وہ ہے، جو صحیح عقیدے یعنی توحید کی بنیاد پر تشکیل پائے۔

جن افراد کو عقیدے کے اشتراک نے جوڑ کر ایک گروہ بنا دیا ہو ان کا مل جل کر اجتماعی معاملات کو انجام دینا (جس میں سیاسی معاملات بھی شامل ہیں) بالکل فطری اور معقول ہے۔ ایسے افراد کا اپنی اجتماعی ضروریات کے لیے ریاست کی تشکیل کرنا بالکل درست ہے۔ اگر افراد کو جوڑنے والا عقیدہ عقیدۂ توحید ہو تو یہ ریاست اسلامی ریاست کہلائے گی۔ اسی طرح ان افراد کا مل جل کر سیاسی جدوجہد کرنا اور اس کے لیے اجتماعی ہیئتیں ادارے و تنظیمیں بنانا بالکل فطری اور بجا ہے۔

اسلامی ریاست اور قومی ریاست کا فرق

جس طرح قومی ریاست ایک خطۂ زمین پر قائم ہوتی ہے، اسی طرح اسلامی ریاست بھی ایک خطۂ زمین پر قائم ہوتی ہے۔ اس یکسانیت کے باوجود دونوں میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ نیشن اسٹیٹ اس خطۂ زمین ہی کو اہمیت دیتی ہے، جس پر ریاست قائم ہو اور محض اس خطے سے تعلق کو افراد کو جوڑنے والا عامل قرار دیتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی ریاست کے نزدیک اس خطۂ زمین کی حیثیت اتفاقی ہے۔ وہ تو محض میدانِ عمل کا نام ہے۔ افراد کو جوڑنے والا حقیقی عامل عقیدے کا اشتراک ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست کی حدود میں رہنے والے غیر مسلم اپنے غیر مسلم معاشرے کا اندرونی نظام چلانے میں پوری طرح آزادی رکھتے ہیں، لیکن اسلامی ریاست کا نظام چلانے کی ذمہ داری اُن پر نہیں ڈالی جاتی۔

موجودہ نیشن اسٹیٹ کے بارے میں مغربی فکر کے ماننے والوں کا رویہ یہ ہے کہ وہ افراد سے جذباتی وابستگی کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس کے لیے نیشن نام کا ایک فرضی

معبود تجویز کر لیتے ہیں۔اس کے بالمقابل مسلمان موجود ریاستوں کو محض ایک تاریخی واقعہ سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک نہ سرحدیں مقدس اور ناقابلِ تبدیل ہیں نہ وطن کوئی معبود یا دیوتا ہے نہ خاکِ وطن کا اشتراک افراد کو جوڑنے والا عامل ہے، نہ مشترک وطنی روایات مشترک اجتماعی زندگی کی معقول بنیاد قرار دی جاسکتی ہیں اور نہ اسٹیٹ سے جذباتی وابستگی یا غیر مشروط وفاداری کا مطالبہ درست ہے۔اسی طرح مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ نیشن اسٹیٹ کے اقتدار کے تحت عملاً زندگی بسر کرنے کے باوجود مسلمانوں کا بحیثیت مسلمان ایک دوسرے سے جڑنا، اجتماعی ہیئتیں بنانا، مل جل کر سیاسی جدوجہد کرنا اور غیر مسلموں کے ساتھ مشترکہ سیاسی ہیئتوں میں شامل نہ ہونا اور اُن کے ساتھ سیاسی اشتراکِ عمل نہ کرنا بالکل صحیح وحق بجانب ہے۔نیشن اسٹیٹ کا وجود ایک واقعہ ضرور ہے لیکن یہ واقعہ یہ ثابت نہیں کرتا کہ نیشنلزم کا نظریہ بھی درست ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کا رویہ

آزادیِ ملک کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے مختلف میدانوں میں کام کیا۔ انھوں نے تجربات کیے اور ان سے سیکھا۔اس دوران حالات نے بڑی کروٹیں لیں۔ ملک میں مختلف طاقتیں ابھریں، یہاں تک ۱۹۷۱ء کی جنگ نے برصغیر کی صورتحال کو یکسر بدل دیا۔اُس کے بعد ۱۹۷۵ تا ۱۹۷۷ء کے ایمرجنسی کے دور نے غیر کانگریسی طاقتوں کو ملکی سیاست میں اہم رول ادا کرنے کا پہلی بار موقع دیا۔جنوب کے قبولِ اسلام کے واقعات اور بین الاقوامی تناظر کی وجہ سے جارحانہ قوم پرستی کی تحریک زندہ ہوئی اور اس کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں بابری مسجد کے انہدام کا سانحہ پیش آیا۔۱۹۹۲ء کے بعد مسلمانوں پر مایوسی و بددلی طاری ہوئی لیکن انھوں نے بہت کچھ سوچا بھی۔اپنا احتساب بھی کیا اور نئی راہیں بھی تلاش کیں۔ان تجربات اور تلاش وجستجو کے بعد مسلمانوں کے سرگرم افراد جن کاموں کی طرف متوجہ ہیں، وہ یہ ہیں:

دعوت، تعمیرِ ملت، مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ، مسلمانوں کے جان و مال کی

حفاظت، اصلاحِ امت، سیاست۔

عمل کے میدانوں کی مندرجہ بالا نشاندہی درست ہے اور اس ضمن میں مسلمانوں کے افراد، تنظیموں اور اداروں نے جو غور و فکر اور محنت کی ہے، وہ قابلِ ستائش اور لائقِ شکر ہے لیکن دو امور کی ضرورت ہے:

(الف) اس فہرست میں بعض میدان شامل نہیں ہیں۔ اُن کی شمولیت ضروری ہے، وہ ہیں قیامِ عدل کی کوششیں، خدمتِ خلق، عام انسانوں کے درمیان امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

(ب) ان سب میدانوں میں عملی کاوشوں کی اساس واضح اور روشن اسلامی شعور پر استوار ہونی چاہیے۔ اس وقت ایسا نہیں ہے، اس لیے یہ کام بے جان بھی ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے غیر مربوط بھی۔

دعوت اور سیاست

دعوت کا محرک اللہ کی رضا کا حصول اور انسانوں سے محبت نیز اُن کی خیر خواہی ہے۔ اس وقت دعوت کے بعض غیر درست محرکات بھی بعض ذہنوں میں ہیں۔ مثلاً پست کردہ اقوام اور اہلِ اقتدار طبقات کی کشمکش کو ہوا دینا، دعوت کو اس طرح کے غلط محرکات سے پاک ہونا چاہیے۔

دعوت میں ان نکات پر مزید زور دینے کی ضرورت ہے۔ عقیدے اور ایمان کی مرکزیت اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت، نیز خدا سے انسان کا حقیقی اور مخلصانہ تعلق۔ دعوت کے ذیل میں مغربی افکار کی غیر معقولیت واضح کرنا اور ان کو چیلنج کرنا ناگزیر ہے۔ دعوت کی ذمہ داری کی انجام دہی میں امتِ مسلمہ کے زیادہ سے زیادہ افراد کو شریک کیا جانا چاہیے۔

اگر مغربی نقطۂ نظر اور اسلامی نقطۂ نظر کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ مل کر سیاسی اشتراکِ عمل کرنا

غلط ہے۔اس کے بجائے مسلمانوں کو ایسی سیاسی ہیئتیں (پارٹیاں اور ادارے) تشکیل دینے چاہئیں جو مسلمانوں پر مشتمل ہوں۔ مسلمانوں پر مشتمل ہونے کے باوجود ان تنظیموں اور اداروں کی سرگرمیوں کا مقصد تمام انسانوں کو ظلم سے بچانا اور سب کو انصاف فراہم کرنا ہوگا۔ یہ تنظیمیں اور ادارے انصاف کے قیام، انسانوں کی خدمت اور ظلم کے ازالے کے لیے رائے عامہ کو بیدار کرنے، میڈیا پر اثر ڈالنے اور حکومت سے مطالبہ کرنے کے تمام وہ طریقے اختیار کر سکتے ہیں، جن میں اخلاقی و شرعی حدود پامال نہ ہوتی ہوں۔ تجربات کے بعد مسلمانوں کو یہ سیکھنا چاہیے کہ نہ تو سیاست سے علاحدگی صحیح ہے اور نہ غیر مسلموں کی قیادت کے پیچھے چلتے ہوئے سیاسی حرکت و عمل درست ہے۔ان دونوں رویوں کو چھوڑ کر خود مسلمانوں پر مشتمل سیاسی ہیئتوں کو وہ تمام کام انجام دینے چاہئیں، جن کی ضرورت ہو۔ سیاسی سرگرمیوں کا آغاز غیر الیکشنی سیاست سے ہوسکتا ہے۔ پھر تجربات سے سیکھ کر ایسی راہیں نکالی جاسکتی ہیں، جن میں حدودِ شرع اور حدودِ اخلاق پامال نہ ہوں۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی تنظیموں اور اداروں کو مغربی افکار کی تائید و حمایت سے مکمل پرہیز کرنا چاہیے۔ان کی گفتگو اسلامی اصطلاحات میں ہونی چاہیے، نہ کہ مروّج مغربی اصطلاحات میں۔سیکولرزم یا نیشنلزم کو درست سمجھنے کا یا اُن کو گوارا کرنے کا مفہوم نہیں جھلکنا چاہیے۔موجودہ سیاسی لیڈروں یا جاہلی نظریات کی علمبردار پارٹیوں کی نظریاتی تائید کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

تعمیرِ ملّت

ملت کی ہمہ جہتی تعمیر کی طرف مسلمانوں کے بہت سے مخلص افراد اور تنظیموں نے توجہ شروع کی ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ ہمہ جہتی تعمیر میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی، معاشی ارتقاء، ان کی بستیوں میں صحت وصفائی کا انتظام، مسلم میڈیا کا فروغ، شرعی عدالتوں کا قیام جیسے امور شامل ہیں۔ ہمہ جہتی تعمیر میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مسلمانوں میں ایک زندہ اور پُرکشش مسلم ثقافت کا احیاء ہو، جو مغرب کی دلفریب لیکن مہلک ثقافت

سے مسلمان نوجوانوں کو بے نیاز کردے۔ ہمہ جہتی تعمیر اس کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق تمام ضروری ادارے مسلمان سماج کے اندر وجود میں آئیں اور متحرک ہوں مثلاً تعلیمی، معاشی اور صنعتی معلومات اور گائڈنس کے ادارے، ایمپلائمنٹ ایکسچینج، خدمتِ خلق کے ادارے، غیر مستطیع افراد کی قانونی چارہ جوئی کا نظم، غیر سودی بنک وغیرہ۔

تعمیرِ ملت کے کام کا محرک ملت سے محبت کا جذبہ ہے، جو ایک اچھا اور جائز محرک ہے، لیکن خود ملت سے محبت کا محرک اللہ کی رضا کے حصول کے جذبے کو ہونا چاہیے، ورنہ ملت کی محبت حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی پر بھی آمادہ کردیتی ہے۔

تعمیرِ ملت کے سلسلے میں سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ''تصورِ تعمیر'' کیا ہے؟ کیا ہم ملت کو ایسی ترقی یافتہ ملت بنانا چاہتے ہیں جیسا کہ دوسری اقوام ہیں؟ بعض افراد کے ذہن میں یہی تصور ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ تعمیرِ ملت کے معنی ہیں ملت کی اجتماعی زندگی میں دین کی اقامت اور اس کے لیے تمام ضروری اداروں کا قیام۔ لفظ دین اپنے حقیقی وسیع معنوں میں استعمال کیا جانا چاہیے، جو زندگی اور اس کی تمام متنوع ضرورتوں کا احاطہ کرتا ہے۔

تعمیرِ ملت کے کام کے لیے وسائل درکار ہوتے ہیں اور اہلِ اقتدار سے بھی واسطہ پیش آتا ہے۔ اس لیے تعمیری کام کرنے والے افراد عموماً غلط سیاست کے علمبرداروں اور بے کردار و بدکردار لیکن اہلِ ثروت سرمایہ داروں کو اہمیت دیتے نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کے ذریعے اداروں کا افتتاح کرایا جاتا ہے۔ اداروں کے مناصب پر انھیں رکھا جاتا ہے، ان سے سرپرستی کی درخواست کی جاتی ہے اور ان کی قیادت سماج پر مسلط کی جاتی ہے۔ اس طرح تعمیر کے کام سے جو فائدہ پہنچتا ہے اس سے زیادہ نقصان اس طریقِ کار سے پہنچ جاتا ہے۔ اس طریقِ تعمیر سے اسلامی افکار اور غیر اسلامی افکار کی نیز اسلامی سیاست اور غیر اسلامی سیاست کی تمیز ختم ہوجاتی ہے، پیمانے گڈمڈ ہوجاتے ہیں، عوام کے ذہنی انتشار confusion میں اضافہ ہوجاتا ہے اور اسلامی معیارِ تقویٰ

کے برخلاف دوسرے معیارات سماج میں مقبول ہوجاتے ہیں۔ بالآخر اہلِ تعمیر اور اہلِ انقلاب کی راہیں ایک دوسرے سے جدا ہوجاتی ہیں اور لائحۂ عمل مربوط اجزاء پر مشتمل ہونے کے بجائے متصادم کاموں کا مجموعہ بن جاتا ہے۔

اس لیے ناگزیر ہے کہ تعمیرِ ملت کے لیے سست رفتار اور کم وسائل پر اکتفا کیا جائے، لیکن اسلامی معیارات کو خطرے میں نہ ڈالا جائے۔

مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے یہ تو ضروری ہے کہ رائے عامہ، ذرائعِ ابلاغ اور اہلِ اقتدار کو متاثر کیا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ گفتگو کس زبان میں اور کن اصطلاحات میں ہو؟ اسلامی نقطۂ نظر اور مغربی نقطۂ نظر کے بیّن فرق کا تقاضا یہ ہے کہ گفتگو اسلامی اصطلاحات میں کی جائے، کسی مرحلے میں مغربی افکار کو استدلال کی بنا نہ بنایا جائے اور سارا استدلال اسلامی اصولوں، عقلِ عام اور فطری اصولوں کی بنیاد پر ہو۔

مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ کا مسئلہ بڑا پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ مصالحِ شرع کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ جان و مال کے تحفظ کے کام میں شرعی و اخلاقی حدود نیز قانونی حدود دونوں کا لحاظ کیا جانا چاہیے۔ مسلمانوں کی دوسری ضرورتوں کی طرح اس ضرورت کے لیے بھی ادارے درکار ہیں۔ مستند خبریں فراہم کرنے کا نظم، ہیلتھ کلب اور اسپورٹس کلب، قانونی چارہ جوئی کا انتظام، مسلمان بستیوں کا اجتماعی نظم، علاج معالجے کا انتظام، ریلیف کے ادارے، پبلک ریلیشنز کے ادارے اور ملکی و ریاستی سطح پر اہلِ اقتدار اور میڈیا کو متاثر کرنے کے لیے گروپس کی تشکیل ضروری ہے۔

☆☆☆

اسلام کا سیاسی نظام۔محدثین کا نقطۂ نظر

محمد جرجیس کریمی*

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور وہ ایک سیاسی نظام بھی رکھتا ہے۔ جب یہ بات کہی جاتی ہے تو بعض لوگ اس کو اسلام کی سیاسی تعبیر قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلام کو ایک نظام کی حیثیت سے پیش کرنا خاص طور سے اسلام کے سیاسی نظام کو متعارف کرانا درست نہیں ہے۔ اس سے اس کی روحانیت مجروح ہوگی اور دین محض اقتدار اور کرسی کے حصول کا اکھاڑہ بن کر رہ جائے گا۔ بظاہر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر گہرائی سے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو اسلام کے ایک مکمل نظام حیات ہونے سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ اسلام نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں رہ نمائی فراہم کی ہے۔ ان میں سیاست کا شعبہ بھی ہے۔ قرآن مجید میں سیاسی نظام کے حوالے سے متعدد آیات وارد ہیں جن کی توضیح وتشریح پر اس سیمینار میں متعدد مقالات پیش کیے گئے ہیں۔ حدیث میں بھی اس بارے میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ محدثین نے اپنی کتب میں ان احادیث کو مختلف فقہی ابواب کے تحت جمع کیا ہے۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ محدثین کے یہاں اسلام کے سیاسی نظام کا تصور بہت ابھرا ہوا تھا۔ اور یہ کوئی شجرہ ممنوعہ نہیں تھا۔

محدثین کے عہد کا جب آغاز ہوتا ہے تو اس وقت اسلامی ریاست کی نہ صرف تشکیل ہوچکی ہوتی ہے بلکہ دنیا کے ایک بڑے حصے پر اسلام کا غلبہ ہو چکا ہوتا ہے۔ چنانچہ محدثین کے یہاں ریاست کے قیام وتشکیل کے مسائل پر بحث نہیں ملتی ہے بلکہ

---

* سینئر رکن، ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

ریاست کے استحکام اس کے تحفظ اور اسلامی ریاست کو دشمنوں اور باغیوں کے حملوں سے بچانے کی بحثیں ملتی ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں کتاب الاحکام اور صحیح مسلم میں کتاب الامارۃ کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا گیا ہے جس میں اجتماعیت کی اہمیت اور امیر کی ذمہ داریوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور ریاست کے استحکام اور عوام کے فلاح و بہبود سے متعلق احادیث نبویؐ جمع کی گئی ہیں۔

صحیح بخاری میں کتاب الاحکام کا پہلا باب باب قولہ تعالیٰ ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم'' کے عنوان سے ہے اس کے تحت دو احادیث منقول ہیں جن میں اطاعتِ امیر/حاکم کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ امام بخاری کے نزدیک آیت مذکورہ میں ''اولی الامر'' سے مراد حکام ہیں، اس باب میں امام موصوف نے ۵۳ ابواب قائم کیے ہیں۔ جن میں امیر و مامور کی ذمہ داریاں، ان کے درمیان تعلق کی نوعیّتوں کو واضح کیا گیا ہے۔ چند ابواب ملاحظہ کریں۔ باب السمع والطاعة للامام مالم تكن معصية، من استرعى رعيته فلم ينصح له، باب ماذكر ان النبى ﷺ لم يكن له بوّاب، باب موعظة الامام للخصوم، باب الشهادة عند الحاكم فى ولاية القضاء، باب اذا قضى الحاكم بجور او خلاف اهل العلم فهورد، باب محاسبة الامام عماله، باب كيف يبايع الامام الناس، باب من نكث بيعة، باب من بايع ثم استقال البيعة، تقریباً یہی مباحث صحیح مسلم کے کتاب الامارۃ میں موجود ہیں، جس میں ۵۶ ابواب میں ۱۸۵ روایات میں اسلامی ریاست کے استحکام و بقا سے متعلق مختلف تعلیمات نبوی جمع کی گئی ہیں۔ چند ابواب ملاحظہ کریں۔ باب النهى عن طلب الامارة والحرص عليها، باب فضيلة الامير العادل وعقوبة الجائر، باب غلظ تحريم الغلول، باب تحريم هدايا العمال، باب وجوب طاعة الامراء فى غير معصية، باب وجوب ملازمة جماعة المسلمين عند ظهور الفتن وفى كل حال، باب حكم من فرق امر المسلمين وهو مجتمع، باب خيار الائمة وشرارهم۔

اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہوتی ہے۔ اس میں عوام کو معاشی و

معاشرتی تحفظات حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسلام میں اس تعلق سے واضح تعلیمات موجود ہیں۔ معاشی تحفظات کے حوالے سے فرد کو کسب معاش کی مکمل آزادی کے ساتھ کاروبار کو ریاست کی نگرانی حاصل ہوتی ہے تاکہ کوئی شخص دوسرے کا مالی و معاشی استحصال نہ کرے۔ اسی ضمن میں بیت المال اسلامی ریاست کا ایک اہم شعبہ ہے جس کی تنظیم ریاست کے نگراں اعلیٰ کی نگرانی میں ہوتی ہے۔ بیت المال کا ایک اہم ذریعۂ آمدنی زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کی تنظیم، تحصیل اور تقسیم ریاست کے بغیر نہیں ہوسکتی چنانچہ محدثین نے کتاب الزکوٰۃ کی بحث کے تحت اس تعلق سے مزید تفصیلات پیش کی ہیں۔ جن میں نصاب زکوٰۃ، مدات زکوٰۃ، مصارف زکوٰۃ اور مستحقین زکوٰۃ شامل ہیں۔

انسانوں کے درمیان لین دین اور کاروبار سے متعلق تفصیلات کتاب البیوع اور اس سے متعلق دیگر مباحث میں پیش کی گئی ہیں۔ کاروبار میں بھی ریاست کی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ محدثین نے اس حوالے سے بھی احادیث نبویؐ جمع کی ہیں۔

اسلامی ریاست کا ایک بنیادی مقصد عدل و انصاف کا قیام ہے۔ اس کے بغیر کوئی بھی انسانی اجتماعیت وجود پذیر ہوسکتی ہے نہ دیر تک باقی رہ سکتی ہے۔ چنانچہ شریعت اسلامیہ میں اس کی انتہائی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں عدل و انصاف کے قیام سے متعلق درجنوں آیات وارد ہیں۔ احادیث میں بھی اس بارے میں کثرت سے روایات وارد ہیں۔ محدثین نے کتاب القضا کے تحت ان احادیث کو جمع کیا ہے جن میں عدل و انصاف کی تعلیمات دی گئی ہیں۔ صحیح بخاری میں عدل و انصاف سے متعلق مباحث کتاب الاحکام، کتاب الحدود، کتاب القصاص، کتاب الخصومات، کتاب المظالم اور کتاب الشہادات وغیرہ میں موجود ہیں۔ صحیح مسلم میں کتاب الاقضیۃ کے عنوان سے ایک مستقل بحث ہے اس طرح ابوداؤد ترمذی اور نسائی میں کتاب القضا کے عنوان سے بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں عدالتی اصول و آداب، قاضی و جج کی مطلوبہ صفات اور فیصلوں میں ظلم و ناانصافی کے عواقب سے بحث کی گئی ہے۔ چند ابواب ملاحظہ کریں۔ باب الیمین علی المدعیٰ علیہ، باب وجود الحکم بشاھد ویمین، باب بیان اجر الحاکم اذا

اجتهد، باب كراهة قضاء القاضي وهو غضبان، باب استحباب اصلاح الحاكم بين الخصمين، باب في كراهية الرشوة، باب كيف يجلس الخصمان بين يدي القاضي؟ باب في الشهادات، باب في الصلح، باب في شهادة الزور، باب في الوكالة، باب الرجل يحلف على حقه وغيره۔

عدل وانصاف کے قائم کرنے کا ایک شعبہ حدود کا اجراء اوران کا نفاذ ہے۔اور یہ کام حکومت واقتدار کے بغیر انجام نہیں پاسکتا۔ دنیا میں پیشہ ور مجرمین کی بھی بڑی تعداد موجود ہے۔ جرائم اور مجرموں کے قلع قمع کے لیے ان پر حدود قائم کرنا واجب ہے۔اسی صورت میں جرائم کی بیخ کنی ہوسکتی ہے؟ کس جرم پر کون سی سزا دی جائے؟ جرائم کے اثبات کے کیا طریقے ہیں؟ جرائم سے متاثرین کی دل داری کی کیا شکلیں ہیں۔محدثین نے کتاب الحدود، کتاب القصاص، کتاب الشہادات اور کتاب الدیات میں ان روایات کو جمع کیا ہے جن میں ان مسائل کی توضیح وتشریح کی گئی ہے۔مثال کے طور پر صحیح بخاری میں کتاب الحدود میں یہ مباحث زیر بحث آئے ہیں،''باب ما يحذر من الحدود، باب الزنا وشرب الخمر، باب ما جاء في ضرب شارب الخمر، باب الحدود كفارة، باب اقامة الحدود والانتقام لحرمات الله، باب كراهية الشفاعة في الحد اذا رفع الى السلطان وغيره، صحیح مسلم کے ابواب کچھ اس طرح ہیں،باب حد السرقة، باب قطع السارق الشريف وغيره. باب حد الزنا، باب رجم الثيب في الزنا، باب رجم اليهود اهل الذمة في الزنا، باب تاخير الحد عن النفساء، باب الحدود كفارات لاهلها۔

اسلام کے نظام سیاسی کا ایک مقصد دنیا میں امن وامان کا قیام بھی ہے۔ چنانچہ اس کے لیے حدود کے نفاذ کے ساتھ محاربین، ڈاکوؤں، باغیوں اور مرتدوں کے استیصال کے احکام بیان ہوئے ہیں۔اوران کی سزائیں متعین کی گئی ہیں۔محدثین نے ان مباحث کو کتاب المحاربین من اہل الکفر والردۃ میں بیان کیے ہیں۔

عصر حاضر میں جہاد کو دہشت گردی سے جوڑ کر دیکھنے کی وجہ سے اسلامی

ریاست اور اسلام کے سیاسی نظام پر طرح طرح کے اعتراضات کیے جا رہے ہیں اور یہ باور کرانے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ دنیا میں کہیں بھی اسلامی نظام حکومت قائم ہوجائے تو اس کا بنیادی نصب العین جہاد کو فروغ دینا ہوگا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں جنگ وجدال کا ماحول قائم ہو اور امن وامان کا کہیں نام ونشان نہ رہے۔ خون خرابہ، دہشت گردی اور بدامنی اسلامی جہاد کا بنیادی مقصد ہے۔ چنانچہ معترضین اسلامی ریاست اور جہاد کو لازم وملزوم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے جہاد کا مقصد ملک گیری اور کشور کشائی ہرگز نہیں ہے۔ لیکن اتنی بات طے ہے کہ جہاد کے حکم پر عمل ایک منظّم اسلامی ریاست کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ علماء وفقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ جہاد حکومت کی سرپرستی ہی میں ہوگا۔ علامہ ابن قدامہ مقدسی لکھتے ہیں ''جہاد کا معاملہ امام وقت پر منحصر ہے[1]۔ علامہ سید سابق لکھتے ہیں.. اور کفایۃ فرائض کی تیسری قسم وہ ہے جس میں حکمران کا ہونا شرط ہے مثال کے طور پر جہاد اور اقامت حدود[2]۔

محدثین کرام کتاب الجہاد والسیر اور کتاب المغازی میں جن مباحث کو زیر بحث لائے ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ جہاد کا معاملہ ایک منظّم حکومت کے ذمے ہے۔ اقتدار وحکومت سے عاری کسی گروپ یا تنظیم کو مسلح جدوجہد کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جہاد کا علم اس وقت بلند کیا جب آپ کو مدینے میں اقتدار حاصل ہوگیا۔ چنانچہ مکی دور میں آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کے اصحاب پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے مگر آپؐ نے انھیں صبر ہی کی تلقین کی اور صحابہ کرامؓ نے اس پر اس وقت تک عمل کیا جب تک ہجرت اور جہاد کا حکم نہ آگیا۔ امام بخاری نے کتاب الجہاد میں ایک باب اس طرح قائم کیا ہے۔ **باب یقاتل من وراء الامام ویتقی بہ،** اس کے معنی یہ ہیں کہ قتال وجہاد کا معاملہ امام پر منحصر ہے۔ اسی طرح اس میں چند ابواب اس طرح ہیں۔ **باب السمع والطاعۃ للامام، باب مبادرۃ للامام عند الفزع، باب مایکرہ عن التنازع والاختلاف فی الحرب وعقوبۃ من عصی امامہ، باب کتابۃ الامام الناس** وغیرہ۔ جہاد جنگی امور سے متعلق ریاستی معاملہ ہے جس کا انتظام وانصرام،

اس کی تیاری، فوجیوں کی تربیت، تنظیم، کس ملک سے جہاد ہوگا، جنگ میں مقتول اور زخمیوں کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ فتح کی صورت میں مالِ غنیمت کی تقسیم کیسے ہوگی؟ صلح کا موقع آئے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ یہ سارے معاملات حکومتی پیمانے پر انجام دینے کے ہیں اور حکومت ہی انجام دے گی، انفرادی طور پر ان میں مداخلت قطعی نہیں کی جاسکتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کے حکم پر عمل اس کی اپنی تمام فضیلتوں کے باجود ایک منظّم حکومت کی نگرانی ہی میں ہوگا۔

یہ دنیا اور اس کے معاملات باہمی معاہدوں کی بنیاد پر چل رہے ہیں۔ ملکوں کے درمیان معاہدے نہ ہوں تو ان کے بہت سے معاملات انجام نہیں پاسکتے حتی کہ ان کے درمیان امن و امان کا ماحول بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ضروری ہے کہ وہ آپس میں معاہدے کریں۔ ملکوں کے درمیان معاہدے ملک کے سربراہ ہی کر سکتے ہیں۔ اگر اسلامی ریاست میں کوئی منظّم سیاسی نظام نہ ہوتو یہ معاہدے انجام پذیر نہیں ہوسکتے چنانچہ محدثین نے اس تعلق سے کتاب الشروط، کتاب الوکالۃ، کتاب الصلح وغیرہ میں ان کی تفصیلات جمع کی ہیں، محدثین نے کتاب المغازی میں دنیا کے مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں سے نبی اکرم ﷺ کی مراسلت کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ مختلف وفود کا استقبال کیا ہے اور مختلف قبائل اور سرداروں کے پاس وفود بھیجے ہیں، یہ سب آج کی اصطلاح میں ملکی سفارت کاری کے معاملات کہلاتے ہیں۔ ان کی انجام دہی ایک منظّم سیاسی نظام کے بغیر نہیں ہوسکتی۔

اسلام ایک عملی مذہب ہے اس میں زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق احکام ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اسلام اگر ایک سیاسی نظام رکھتا ہے تو اس کے قیام واستحکام کے لیے جدوجہد نہ کیا جائے تو یہ نظام قائم ہوسکتا ہے نہ باقی رہ سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اسلام ایک نظام بھی ہے اور ایک عقیدہ بھی۔ محدثین نے اپنی کتب کی جو ترتیب قائم کی ہے اس کا کافی لحاظ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے ایمانیات کی بحث لائی گئی ہے پھر عبادات کی، پھر معاشرتی اصول وآداب بیان ہوئے ہیں اور اسی دوران میں

سیاسی نظام کی وضاحت کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں اولیت ایمان و عقیدے اور عبادات کو حاصل ہے ان کے بعد دیگر احکام ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ دوسرے احکام کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ وہ بھی دین کا حصہ ہیں اور ان پر بھی ایسے ہی عمل ہوگا جیسے دوسرے احکام پر عمل ہوتا ہے۔ اس پہلو سے اس کے بعض امتیازات ہیں جو دوسرے مذاہب میں یا دوسرے نظام ہائے زندگی میں نہیں پائے جاتے۔ جیسے اس کا ایک امتیاز یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے کسی انسان کا مرتب کردہ نہیں ہے اس پر عمل کرنے والا عنداللہ اجر کا مستحق ہوگا۔ اسی لیے امام بخاری نے سب سے پہلے وحی آنے کی کیفیت اور ''انما الاعمال بالنیات'' والی روایت بیان کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعلیمات وحی پر مبنی ہیں اور اگر ان پر حسن نیت کے ساتھ عمل کیا جائے تو بندہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یقیناً سرخرو ہوگا اور دنیا میں بھی اسے کامیابی ملے گی۔ اسلام کا ایک نظام ہونے کے پہلو سے اس کو اسی طرح نافذ کیا جائے گا جس طرح دیگر نظام اپنے احکام کو نافذ کرتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کے عمل اور اسوہ سے دونوں باتیں ثابت ہیں۔ محدثین نے اپنی کتب میں جو تفصیلات پیش کی ہیں ان کا خلاصہ یہی ہے۔

حواشی

۱۔ المغنی، ۸/۳۵۱

۲۔ فقہ السنۃ للسابق، ۲/۶۳۱

☆☆☆

اسلامی نظریۂ حکومت اور طریقۂ انتخابات

اختر امام عادل قاسمی *

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، اس میں زندگی کے ہر شعبہ کے لئے پوری رہنمائی موجود ہے، سیاست وحکمرانی بھی دنیاوی زندگی کا اہم ترین باب ہے، یہ انسانی معاشرہ کی بنیادی ضرورت ہے، اس کے بغیر نہ نظم وضبط قائم ہوسکتا ہے، نہ رشتوں اور مرتبوں کا احترام باقی رہ سکتا ہے، نہ صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہوسکتا ہے اور نہ روئے زمین جنت کا نمونہ بن سکتی ہے...... اسی لئے انسانی تاریخ کے ہر دور میں اس کو ایک اجتماعی ضرورت کے طور پر برتا گیا، ہر عہد کے بہترین دماغوں نے اس کے لئے اپنی صلاحیتیں صرف کیں، ہر علاقہ کی چنیدہ شخصیتوں نے اس میں حصہ لیا، اس کی تشکیل وتاسیس سے لیکر اس کی توسیع وترقی تک کے اصول وضوابط بنائے گئے، اور تاریخی ارتقا کے ساتھ اس تصور نے بھی ترقی کی، یہ فکر انسانی کی جولانگاہ رہی، یہی چیز انسانی معاشرہ کو دوسری تمام مخلوقات کے مقابلے میں قابل رشک عظمت عطا کرتی ہے، روئے زمین کا تمام تر حسن اسی اجتماعی نظام کی بدولت ہے اور یہی بات انسانوں کو ساری کائنات سے ممتاز کرتی ہے، رب کائنات نے جس وقت تخلیق انسانی کا فیصلہ فرمایا اسی وقت اس کی حیثیت کا تعین ان الفاظ میں فرمایا:

''وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً'' (البقرة: ۳۰)

(اور جس وقت تیرے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں

---

* مہتمم مدرسہ ربانی، منورما، سمستی پور، بہار

ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔)

یہ قدرت کا بیش قیمت عطیہ ہے، وہ لوگ بڑے صاحب نصیب ہیں جو انسانیت کی اس عظیم اجتماعی ضرورت کے لئے منتخب ہوتے ہیں، قرآن کریم کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس ضرورت کے لئے تیار ہونے والے افراد بہت ہی غیر معمولی ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ اس کو اسی طرح برتیں جس طرح اس کا حق ہے:

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ" (النور:۵۵)

(ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے اللہ پاک کا وعدہ ہے کہ ان کو روئے زمین کی خلافت عطا فرمائیں گے، جس طرح کہ ان سے پہلے لوگوں کو عطا فرمایا تھا۔)

اسلام نے زندگی کے ہر مرحلے کی طرح اس باب میں بھی کافی ہدایات دی ہیں اور اسلامی تاریخ میں اس کے بے شمار عملی نمونے ملتے ہیں، حکومت کی تشکیل وتاسیس اور طریقۂ انتخاب سے لیکر اس کی توسیع واستحکام تک اور آئینی اور اصولی نظریات سے ان کی عملی جزئیات تک ہر مرحلے کے لئے اسلامی تعلیمات میں مکمل ہدایات موجود ہیں، جن کی روشنی میں حقیقی بنیادوں پر پہلے بھی اسلامی حکومتیں قائم ہوئی ہیں اور آئندہ بھی قائم ہوسکتی ہیں۔

اسلامی نظریۂ حکومت

قرآن کریم، احادیث پاک اور سلف صالحین کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام روئے زمین پر ایک ایسی آئینی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، جہاں حکمراں اور رعایا دونوں کسی بالاتر قانون کے پابند ہوں، جہاں قانون حکمراں طبقے کے لئے بازیچۂ اطفال نہ بنے، جہاں انسانوں کی مرضی سے نہیں بلکہ رب العالمین کے مقرر کردہ اصول و کلیات کی روشنی میں نظام العمل مرتب کیا جائے، جس پر کسی خاص طبقہ یا ٹولہ کی جاگیرداری نہ ہو، اور جس کے انتخاب سے لیکر انتظام تک میں ارباب حل وعقد اور اصحاب

دانش کی آراء سے استفادہ کیا جائے۔

دو انتہاؤں کے درمیان

جب کہ دنیا میں حکمرانی کی اب تک کی تاریخ دو الگ الگ انتہاؤں کو چھورہی ہے، یا تو وہ آمریت کے ذہن سے جنم لیتی ہے یا عوامی آزادی کے بطن سے، دوسرے لفظوں میں حکومت یا تو ایک فرد، خاندان یا طبقہ کی اسیر ہوتی ہے یہ نسلی یا خاندانی نظام ہے، یا پھر ہر کس و ناکس کے خیالات کی پابند، جیسا کہ مروجہ جمہوری نظام حکومت میں ہوتا ہے، ...... مگر یہ دونوں صورتیں ایک ناقص و ناتمام نظام حکومت ہے، اس لئے کہ تمام تر اختیارات کسی فرد یا خاندان کو دینا جتنا خطرناک ہے، ہر بوالہوس کو صاحب اختیار بنا دینا اس سے بھی زیادہ خطرناک حماقت ہے، اسلام ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک ایسی آئینی حکومت کا طرفدار ہے جہاں اختیارات افراد کے بجائے قانون کے ہاتھ میں ہو، جہاں انسان کے بجائے رب العالمین کا اختیار چلتا ہو، جس کی تاسیس و تشکیل کو نہ کسی فرد یا خاندان میں محدود کیا جائے اور نہ ریاست کے ہر ہر فرد تک عام کرنے کا لزوم ہو، بلکہ یہ اختیار ہر علاقہ کے ارباب حل و عقد اور اصحاب علم و دانش کو حاصل ہو کہ وہ باہم مشورہ سے امیر کا انتخاب کریں۔ فقہاء نے اہلیت امیر کا ایک معیار مقرر کیا ہے، جو شخص بھی اس معیار مطلوب پر پورا اترے اس کو یہ ذمہ داری دی جاسکتی ہے، یہ شورائی نظام ہے، یہ جمہوری نظام سے قریب تر ہونے کے باوجود اس سے مختلف ہے، مثلاً:

جمہوریت اور شورائیت میں فرق

☆ جمہوری نظام میں ریاست کے ہر شہری کو اس میں شرکت کا قانونی استحقاق ہوتا ہے، اور اس میں کسی ایک شخص کو بھی اس حق کے استعمال سے قصداً بے دخل نہیں کیا جاسکتا، جبکہ شورائی نظام میں ریاست کے ہر فرد کی شرکت ضروری نہیں ہوتی، صرف ارباب حل و عقد کی ایک قابل لحاظ تعداد کی شرکت کافی ہوتی ہے،

☆اسی طرح جمہوری نظام میں امیر کا انتخاب ایک محدود مدت کے لئے ہوتا ہے، اور مدت کے اختتام پر اس کی امارت خود بخود ختم ہو جاتی ہے اگرچہ اس میں ساری صلاحیتیں بدستور موجود ہوں، اور نظام حکومت بہتر انداز میں چل رہا ہو، جبکہ شورائی نظام میں امیر کا انتخاب (عہد صحابہ سے آج تک کی عام روایت کے مطابق) محدود مدت کے لئے نہیں بلکہ تا حیات کے لئے ہوتا ہے، بشرطیکہ اس کی صحت اور عقل وفکر سلامت رہے اور اس سے کسی ایسی بڑی خیانت یا دینی یا قومی گناہ سرزد نہ ہو جس سے اس کو معزول کرنا ضروری ہو جائے۔

☆جمہوری نظام کی بنیاد عددی قوت پر ہوتی ہے، جبکہ شورائی نظام اصولی طور پر معنویت اور معقولیت کو رہنما بناتا ہے، اور کسی بھی رائے کو ترجیح بالعموم اسی اصول پر حاصل ہوتی ہے۔

☆جمہوری نظام میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی جیت کے امکانات بہت محدود ہوتے ہیں اس لئے کہ دنیا میں اکثریت ہمیشہ غیر معیاری لوگوں کی ہوتی ہے، جبکہ شورائی نظام میں یہ خطرہ نسبتاً کم ہوتا ہے، وغیرہ۔

خلافت ارضی

اسلام ایک نظریاتی حکومت کا علمبردار ہے اس کی تشریح کے لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ حکومت کے بارے میں اسلام کا تصور کیا ہے؟ اور وہ حکمراں کو کس آئینے میں دیکھتا ہے؟

قرآن زمینی حکومت کو خلافت کا نام دیتا ہے، اسلامی تصور کے مطابق روئے زمین بلکہ ساری کائنات اور ماورائے کائنات پر حکومت صرف اللہ کی ہے،

''إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّٰهِ'' (یوسف:٦٧) حکومت صرف اللہ پاک کے لئے ہے۔

ساری کائنات میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اسی کی مرضی اور اشارہ سے ہوتا ہے، اس کی اجازت کے بغیر ایک پتہ نہیں ہل سکتا، ساری پیشانیاں اسی کے قبضۂ قدرت میں

ہیں، دل کی دھڑکنیں اور ذہن و دماغ کی کاوشیں بھی اسی کے قبضے میں ہیں، زمین پر جو بھی نظام حکومت قائم ہوتا ہے وہ دراصل حکومت الٰہی کا عکس ہے، یہ حکومت نہیں نیابت اور خلافت ہے، اور یہ خدائی انتخاب ہے، اللہ پاک نے اس زمین کا نظام انسانوں کے حوالہ کیا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ یہاں کے ہر نظام میں اس کی مرضی کا لحاظ رکھا جائے،

حضرت داؤدؑ ان اولوالعزم پیغمبروں میں ہیں جن کو نبوت کے ساتھ ساتھ خلافت ارضی سے بھی سرفراز کیا گیا تھا، ان کو مخاطب کرکے رب العالمین نے ارشاد فرمایا:

"يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ" (ص ۲۶)

(اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین کا خلیفہ بنایا ہے، اس لئے لوگوں کے لئے آپ کے فیصلے کی بنیاد خالص حق پر ہونا چاہئے، لوگوں کی خواہشات اور تقاضوں کے پیچھے نہ چلیں ورنہ وہ راہ حق سے آپ کو دور کردیں گے۔)

ایک جگہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِم لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ" (یونس:۱۴)

(پھر ہم نے خلافت ارضی ان کے بعد تم کو عطا کی تاکہ دیکھیں تم کیا کرتے ہو؟)

ایک جگہ بعض ان بنیادی مقاصد کا ذکر کیا گیا ہے جن کے لئے اسلامی حکومت وجود میں لائی جاتی ہے:

"الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ" (الحج:۴۱)

(یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔)

سورۃ الحدید میں ہے:

"لَـقَـدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَـقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ" (الحدید:۲۵)

(ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت قوت اور لوگوں کے لئے سامان نفع ہے۔)

لوہا سے مراد یہاں سیاسی اور اقتصادی قوت ہے۔[۱]

خلافت کا مفہوم

اسی لئے علماء اسلام نے امامت وخلافت کی جو تعریفات کی ہیں ان میں اس بنیادی تصور کو ملحوظ رکھا گیا ہے، مثلاً:

علامہ ابن خلدونؒ المالکی امامت کی تعریف کرتے ہیں:

"خلافة عن صاحب الشرع فی حراسة الدین وسیاسة الدنیا"[۲]

امامت دراصل دین کی نگرانی اور دنیا کے سیاسی معاملات میں صاحب شرع کی قائم مقامی کا نام ہے۔

علامہ سعدالدین تفتازانی الحنفیؒ رقمطراز ہیں:

" نیابة عن الرسول فی إقامة الدین بحیث یجب علیٰ کافة الامم الاتباع"[۳]

ترجمہ: یہ اقامت دین کے معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی نیابت ہے جس کی اتباع پوری امت پر واجب ہے۔

علامہ ماوردی الشافعیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"خلافة النبوة فی حراسة الدین وسیاسة الدنیا"[۴]

ترجمہ: تحفظ دین اور سیاست دنیا کے مسئلے میں نیابت نبوت۔

اس طرح کی مختلف تعریفات میں یہ بات قدر مشترک کے طور پر ملتی ہے، کہ اسلام کا تصور حکومت آزادانہ خود مختاری یا مطلق العنانی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ بہت سے حدود و قیود کا پابند ہے،

اسلام میں حکمراں کی حیثیت

اسلام کے تصورِ حکومت کو سمجھنے کے لئے حکمراں کی حیثیت عرفی کی بحث بھی قابل ذکر ہے۔ اس ضمن میں تین نقاط نظر ملتے ہیں:

(۱) بعض حضرات کی رائے ہے کہ حکمراں روئے زمین پر اللہ کا نائب اور خلیفہ ہوتا ہے، اس لئے کہ:

☆ حکمراں بندگان پر اللہ ہی کے احکام نافذ کرتا ہے،

☆ قرآن کریم میں ارشاد ہے،

"وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ" (الانعام:۱۶۵)

(اور اللہ پاک ہی نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا، اور بعض کو بعض پر برتری عنایت فرمائی۔)

ایک جگہ ارشاد ہے:

"إِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْأَرْضِ خَلِيْفَةً" (البقرۃ:۳۰)

(میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔)

یہ قول حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے۔[۵]

ان حضرات کے مطابق امام کو خلیفۃ اللہ کہنا جائز ہے،......

لیکن اس رائے کو قبول کرنے میں کئی دشواریاں ہیں:

☆ خلافت و نیابت کا تعلق غائب شخصیت سے ہوتا ہے، اللہ حیّ القیّوم ہے، اس کے لئے خلیفہ و نائب کا کیا تصور؟

☆امام کو تفویض امامت منجانب اللہ نہیں ہوتی، کہ اس کو اللہ کا خلیفہ کہا جائے بلکہ قوم یا ارباب حل وعقد کی طرف سے ہوتی ہے۔

☆اگر کسی کے لئے خلیفۃ اللہ کہلانا درست ہوتا تو وہ نبی ﷺ کی ذات گرامی تھی، کیونکہ نبوت من جانب اللہ ہوتی ہے، لیکن کبھی آپؐ نے اپنے لئے یہ لقب اختیار نہیں فرمایا۔

(۲) دوسری رائے یہ ہے کہ اقامت دین اور سیاست دنیا کے معاملات میں امام رسول اللہ ﷺ کا نائب وخلیفہ ہوتا ہے۔[۶]

اس رائے کا ماٰخذ غالباً حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ایک قول ہے:

"لست خلیفة الله ولكنی خلیفة رسول الله"[۷]

(میں اللہ کا نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ ہوں۔)

نیز یہ رسول اللہ ﷺ کا منصب ہے، اگر آپ دنیا میں تشریف فرما ہوتے تو آپ ہی امام وقت ہوتے، بعد میں آنے والے خلفاء دراصل حضور ﷺ کے اسی مشن کو آگے بڑھانے والے ہیں، اس لئے ان کے لئے خلیفۂ رسول کا خطاب درست ہے۔

مگر اس رائے میں دقت یہ ہے کہ کسی کا خلیفہ وہ ہوتا ہے جس کو وہ خود اپنا خلیفہ بنائے، بعد میں آنے والے ائمہ کا انتخاب من جانب رسول نہیں ہوتا، اس لئے ان کو خلیفہ بھی نہیں کہا جا سکتا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کا معاملہ اس سے مختلف ہے، ایک تو وہ خلیفہ بلا فصل تھے، دوسرے خود رسول کریم ﷺ ان کو اپنا جانشیں بنانا چاہتے تھے لیکن مصلحتاً آپ نے ان کو نامزد نہیں فرمایا، حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لقد هممت -أو أردت -أن أرسل إلىٰ أبی بكر وإبنه، فأعهد أن يقول القائلون أو يتمنى تمنون، ثم قلت يأبی الله ويدفع المؤمنين أو يدفع الله ويأبی المؤمنون"[۸]

(میں نے تو ارادہ کر لیا تھا کہ ابوبکر اور ان کے بیٹے کو بلوا کر عہد نامہ

تیار کرادوں تاکہ کسی بوالہوس کو کچھ کہنے اور سوچنے کی نوبت نہ آئے، لیکن پھر میں نے کہا کہ اللہ پاک اور مسلمان خود اس کو دفع کردیں گے۔)

علامہ ابن تیمیہؒ اس حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"یغنی عن العهد فلایحتاج إلیه فترکهٗ لعدم الحاجة وظهور فضیلة الصدیق وإستحقاقه وهٰذا أبلغ من العهد"۹؎

(عہد نامہ کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا فضل واستحقاق بالکل ظاہر تھا، اور یہ عہد نامہ کے مقابلے میں زیادہ معنیٰ خیز بات تھی۔)

اس لئے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفۂ رسول کہلانے کا حق تھا، بعد کے خلفاء نے اپنے لئے یہ لقب استعمال نہیں کیا، خود حضرت عمرؓ نے اپنے لئے امیر المؤمنین کا لقب اختیار فرمایا، خلیفۂ رسول نہیں۔

(۳) تیسری رائے جس کو متعدد علماء اور مشائخ نے اختیار فرمایا ہے، وہ یہ کہ امام جملہ معاملات ومسائل میں امت کا وکیل اور نائب ہوتا ہے، قوم اسے منتخب کرتی ہے اس لئے وہ قوم کا نمائندہ ہوتا ہے، اس موقف کے حاملین میں درج ذیل علماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں: علامہ باقلانیؒ المالکی (م ۴۰۳ھ، التمہید بحوالہ نصوص الفکر السیاسی الاسلامی منشورات دار الطلیعۃ بیروت)، قرطبیؒ المالکی (م ۶۷۱ھ بحوالہ الامامۃ فی الفقہ الاسلامی لعلی بن ہلال العمری ص ۳۷، ۱۹۹۱ء)، ابن تیمیہ الحنبلیؒ (السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ للخلاف ص ۱۴ط دار القلم الکویت ۱۴۰۸ھ) ابن رجب الحنبلی (بحوالہ القواعد فی الفقہ الاسلامی ص ۱۱۶ط مکتبۃ الکلیات الازہریۃ ۱۳۹۲ھ) علامہ کاسانی الحنفیؒ (بدائع الصنائع ص ۱۶ط دار الکتب العربی بیروت ۱۴۰۲ھ) وغیرہ،

یہ رائے اس اعتبار سے زیادہ قابل لحاظ ہے کہ امت یا اس کے ارباب حل وعقد اس کو منتخب کرتے ہیں، اس کے کاموں کا محاسبہ کرسکتے ہیں اور ناقابل معافی جرائم کی صورت میں اس کو معزول کرسکتے ہیں، وغیرہ ...... یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جماعت

اصل ہے اور امام اس کا نمائندہ ہے، اس لئے اس کے ہر عمل میں جماعت کی نمائندگی ہونی چاہئے۔

اسلامی نظریۂ حکومت کا امتیاز

اسی طرح اسلامی نظریۂ حکومت عام نظریۂ حکمرانی سے مختلف ہے، عام تصور یہ ہے کہ یہ ایک اعزاز ہے، جو خوش نصیب لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، اسی لئے قرون قدیمہ میں اس کے لئے کچھ افراد یا خاندان مخصوص ہوتے تھے، اور اس کو آسمانی خصوصیت باور کرایا جاتا تھا، اسی لئے عام خاندانوں کے لوگ کبھی یہ خیال بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ بھی کبھی مسند اقتدار پر بیٹھ سکتے ہیں، اسلام کے آنے کے بعد جب انسانی رجحانات میں تبدیلی آئی، اور اسلامی فتوحات نے عالمی تصورات میں انقلاب برپا کیا، تو وہ دنیا جو اسلامی تعلیمات کی نورانیت سے محروم ہے وہاں یہ تو نہ ہوا کہ اسلامی نظریۂ حکمرانی کو پذیرائی ملتی، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس مصنوعی امتیاز کا طلسم پارہ پارہ ہوگیا اور ہر طبقہ کے لوگ اس کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، ہر ایک نے اس کو اپنے استحقاق کا مسئلہ بنالیا، عورتیں بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں رہیں، اس لئے کہ حق کے معاملے میں انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ہے، دنیا کی پوری تاریخ حکمرانی انہی حقائق کے گرد گھوم رہی ہے، غیر اسلامی دنیا میں ایسے حکمراں شاید انگلیوں پر گنے جاسکیں جنہوں نے ان سفلی جذبات سے بلند ہو کر حکمرانی کے حقوق ادا کئے ہوں۔

اس کے بالمقابل اسلامی نظریۂ حکومت ہے کہ یہ کوئی پیدائشی اعزاز یا حق نہیں بلکہ بہت بڑی ذمہ داری ہے، یہ مقام عزت نہیں موقع خدمت ہے، یہ قدرت کا محض عطیہ نہیں بلکہ فریضہ بھی ہے، یہ کامیابی نہیں آزمائش ہے، اس کو حاصل کرنے کی نہیں بلکہ اس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے، قرآن وحدیث کی متعدد نصوص میں اس تصور کی ترجمانی کی گئی ہے، قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم

بَیۡنَ النَّاسِ أَن تَحۡکُمُواْ بِالۡعَدۡلِ إِنَّ اللّهَ نِعِمَّا یَعِظُکُم بِهِ إِنَّ اللّهَ کَانَ سَمِیۡعاً بَصِیۡراً" (النساء:۵۸)

(اللہ پاک تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم امانتیں اہل امانت کے حوالے کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلے کی نوبت آئے تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو ،اللہ پاک تمہیں اچھی نصیحت کرتے ہیں اور اللہ پاک سننے اور دیکھنے والے ہیں۔)

ارشادنبوی ہے:

"ألا کلکم راع و کلکم مسؤل عن رعیته فالامیر الذی علی الناس راع وهو مسؤل عن رعیته" [۱۰]

(سنو! تم میں سے ہر شخص جواب دہ ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داریوں کے بارے میں پوچھ ہوگی پس حکمران اعلیٰ بھی اپنی رعایا کے حق میں جوابدہ ہے۔)

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے:

"من ولی لنا عملاً ولم تکن لهٗ زوجة فلیتخذ زوجة أو خادماً فلیتخذ خادماً أو مسکناً فلیتخذ مسکناً أو دابةً فلیتخذ دابة فمن اصاب سویٰ ذٰلک فهو غال أو سارق" [۱۱]

(جو شخص حکومت کے کسی منصب پر فائز ہو،اور اس کے پاس بیوی نہ ہو تو بیوی حاصل کرلے ،خادم نہ ہو تو خادم بنالے ،گھر نہ ہو تو گھر بنالے ،سواری نہ ہو تو سواری کا نظم کرلے اور بس ،اس سے زیادہ کی جو کوشش کرے گا وہ خائن یا چور ہوگا۔)

سرکار دوعالم ﷺ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا:

"یاأبا ذر إنک ضعیف وإنها أمانة وإنها یوم القیامة خزی وندامة إلا من أخذ بحقها وأدی الذی علیه فیها" [۱۲]

(اے ابوذر تم ایک کمزور شخص ہو اور منصب حکومت ایک امانت ہے اور روز قیامت باعث ذلت وندامت، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اس کا حق ادا کیا اور اس کی ذمہ داریاں پوری کیں۔)

امیر میں کیسی احساس ذمہ داری ہونی چاہئے اس کی نمائندگی حضرت عمر بن خطابؓ کے اس قول سے ہوتی ہے:

"لو هلک حمل من ولد الضان ضياعاً بشاطئ الفرات خشيت أن يسألني الله عنه"[13]

(دریائے فرات کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی اگر ہلاک ہو جائے تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ اللہ پاک مجھ سے باز پرس نہ کریں۔)

اعزاز نہیں آزمائش

اسی لئے اسلامی تصور کے مطابق کوئی سمجھدار شخص عام حالات میں جان بوجھ کر اپنی گردن اس میں پھنسانا پسند نہیں کرسکتا، بلکہ جو شخص اس کا خواہش مند ہو یا اس کے لئے تگ ودو کرے اس کو ناپسندیدہ شخص قرار دیا جاتا ہے، اور اصولی طور پر اس کو یہ ذمہ داری نہیں دی جاسکتی، ارشاد نبوی ہے:

"إنا والله لانولي علىٰ هٰذاالعمل أحداً سأله ولاأحداً حرص عليه"[14]

(بہ خدا ہم کسی ایسے شخص کو یہ منصب نہیں دے سکتے جو اس کا خواہشمند یا حریص ہو۔)

"إن أخونكم عندنا من طلبهٗ"[15]

(تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو منصب کا طلبگار ہو۔)

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کو مخاطب فرما کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ياعبدالرحمن بن سمرةؓ لاتسأل الامارة فإنک إذا أوتيتها

عن مسئلة وكلت إليها وإن أوتيتها عن غير مسئلة أعنت عليها"[۱۶]

(اے عبدالرحمٰن بن سمرہؓ! عہدہ مت طلب کرو اس لئے کہ اگر طلب پر تم کو دیا جائے گا تو تم کو اسی کے حوالے کر دیا جائے گا، اور بلا طلب ملے تو نصرت الٰہی شامل حال ہوگی۔)

امیدواری کا تصور نہیں

یہ ہدایات اسلامی تصور حکومت کو سمجھنے کے لئے بہت کافی ہیں اور اسی تصور امارت کی بنا پر اسلامی سوسائٹی میں کسی شخص کا دعویٰ حکومت لیکر اٹھنا بہت مستبعد بات ہے، آج کی طرح امیدواروں کی بڑی تعداد، ترغیب وتحریص کے نت نئے طریقے اور تشہیری مہموں کی گرم بازاری کا اسلامی نظام انتخاب میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، عہد نبوت کے بعد اسلامی عہد حکومت کے لئے خلفاء اربعہ اور خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور آئیڈیل دور ہے، اس پورے عہد میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی خلیفہ یا حکمراں کو ان کی امیدواری یا خواہش کی بنیاد پر حکومت سونپی گئی ہو، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پیش رو خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کا انتقال ہوا تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا کہ اگلے خلیفہ کے طور ان کا نام منتخب ہوگا، یہ تو ان کو اس وقت معلوم ہوا جب مرحوم خلیفہ کی تحریر تولیت (یا وثیقۂ خلافت) برسر مجلس پڑھی گئی، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اپنے نام کا انتخاب دیکھ کر حیران رہ گئے، ان پر سکتہ کی کیفیت طاری ہوگئی، لوگ ان کو منبر پر جانے کی فرمائش کر رہے تھے اور ان میں اٹھنے تک کی سکت نہیں تھی، لوگوں نے بہت اصرار کے ساتھ سہارا دے کر ان کو اٹھایا اور منبر پر بٹھایا، بہت دیر تک سکتہ کی کیفیت میں بیٹھے رہے ایک لفظ نہ بول سکے، جیسے کتنی بڑی مصیبت آن پڑی ہو، جب کچھ ہوش وحواس بحال ہوئے تو ارشاد فرمایا:

"أيها الناس إني والله ما استؤمرت في هذا الامر وانتم

بالخيار ثم نزل ...... وفي رواية اخرىٰ...... إني قد ابتليت بهذا الامر من غير راى كان مني ولا طلبة لهٗ ولا مشورة من المسلمين وإني قد خلعت ما في أعناقكم من بيعتي فاختاروا لانفسكم ،فصاح الناس صيحة واحدة ،قد إخترناك يا امير المؤمنين ورضينا بك"[۷۱]

(لوگو! بخدا اس معاملہ میں مجھ سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا اس لئے آپ تمام لوگوں کو اختیار ہے، ......یہ کہکر اتر گئے ......ایک روایت میں ہے کہ آپ نے کہا ......کہ اس معاملہ میں مجھے میری طلب اور پسند اور مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر مجھے آزمائش میں ڈالا گیا ہے ،اس لئے میں اپنی بیعت سے آپ سب کو آزاد کرتا ہوں ،جس کو چاہیں آپ لوگ خلیفہ منتخب کرلیں...... کہتے ہیں کہ یہ سنکر مسجد میں لوگوں کی چیخیں نکل گئیں ،سب نے بیک آواز کہا ،ہم آپ کو اختیار کرتے ہیں اور آپ سے راضی ہیں ۔)

اسلامی حکمراں کی صفات

وہ کیا خصوصیات ہیں جن کی بنیاد پر کسی کو حکمرانی کے لئے اہل یا نااہل قرار دیا سکتا ہے،فقہ اسلامی کی کتابوں میں مکمل رہنما خطوط موجود ہیں ،ہم اس سلسلے میں کچھ ضروری اشارات پیش کرتے ہیں، ......

فقہاء نے اہلیت امارت کی بحث کے ضمن میں بعض شرائط کا ذکر کیا ہے جن میں کچھ اتفاقی ہیں اور کچھ اختلافی:

اہلیت امارت کی شرطیں:

(۱) مسلمان ہو،اس لئے کہ جواز شہادت کے لئے اسلام شرط ہے،مسلمانوں

کے خلاف کافروں کی شہادت درست نہیں، جبکہ ولایت کا درجہ شہادت سے بلند ہے، اس شرط کا ماٰخذ یہ آیت کریمہ ہے:

''وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا'' (النساء:۱۴۱)

(اور اللہ پاک کافروں کو اہل ایمان پر ہرگز کوئی سبیل نہیں دے گا۔)

ظاہر ہے کہ حکومت سے بڑھکر سبیل کیا ہو سکتی ہے؟

(۲) عاقل و بالغ ہو، کسی بچے یا پاگل کی امامت درست نہیں، اسلئے کہ وہ خود اپنے معاملات میں دوسروں کے محتاج ہیں تو پوری ریاست اور قوم کے معاملات و مسائل کا بوجھ وہ کیا اٹھا سکتے ہیں؟ یہ تو بہت بنیادی بات ہے بلکہ کم از کم اتنا صاحب فہم ہونا چاہئے کہ ریاست کے معاملات و مسائل اور قومی و ملکی امور میں دشمن کے مکر و فریب کو سمجھ سکے، (فضائح الباطنیۃ للغزالیؒ ص ۸۰، شرح العقائد للتفتازانیؒ ص ۱۴۵ ط دار احیاء الکتب العربیۃ)

ایک اثر صحابی سے اس پر روشنی پڑتی ہے:

''تعوذوا باللّٰہ من رأس السبعین ......وامارۃ الصبیان'' [۱۸]

(ستر (۷۰) کے آغاز......اور بچوں کی حکومت سے پناہ چاہو۔)

(۳) مرد ہو، اسلام میں عورتوں کو بار خلافت دینے کی اجازت نہیں، اور نہ اس کی ذہنی و جسمانی ساخت اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانے کی متحمل ہے۔

☆ دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

''اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاء بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُواْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ'' (النساء:۳۴)

(مرد عورتوں پر نگراں ہیں، اس بنیاد پر جو اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔)

☆ نیز رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''لن یفلح قوم ولّوا أمرھم إمرأۃ'' [۲۰]

(وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جو اپنے معاملات کی ذمہ داری کسی عورت کے حوالے کر دے۔)

☆ ایک اور حدیث میں ہے:

"إذا كان أمراء كم خيار كم وأغنياء كم سمحاء كم وأمر كم شورىٰ بينكم فظهر الارض خير لكم من بطنها وإذا كان أمراء كم اشرار كم وأغنياء كم بخلاء كم وامور كم إلىٰ نسائكم فبطن الارض خير لكم من ظهرها" [۲۱]

(جب تمہارے امراء تم میں بہتر لوگ ہوں، تمہارے مالدار سخی ہوں اور تمہارے امور باہم مشورہ سے طے ہوں، تو زمین کی پشت تمہارے لئے اس کے بطن سے بہتر ہے، اور جب تمہارے امراء تم میں بدترین لوگ ہوں، تمہارے مالدار بخیل ہو جائیں، اور تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے سپرد ہو جائیں تو تمہارے لئے زمین کا بطن اس کی پشت سے بہتر ہے۔)

(۴) آزاد ہو، غلام نہ ہو۔ [۲۲]

(۵) اعضاء وحواس صحیح سالم ہوں، اور امور خلافت کی انجام دہی پر خود قدرت رکھتا ہو۔ [۲۳]

بعض مختلف فیہ شرطیں:

(۶) عدالت اور علم واجتہاد، فقہاء مالکیہ، شافعیہ، اور حنابلہ کے نزدیک امیر کے لئے عادل ہونا شرط ہے (یعنی ایسا شخص جو امانت ودیانت اور اخلاق فاضلہ کا حامل ہو، صادق القول ہو، گناہوں سے بچتا ہو، اعتماد اور وقار رکھتا ہو، رضا اور غضب ہر حال میں قابل بھروسہ ہو، اس کی دینی اور اخلاقی حالت لوگوں میں معروف اور مسلم ہو) اور صاحب اجتہاد (یعنی اتنا علم وفہم کہ مختلف مسائل وواقعات میں کسی نتیجے تک پہونچنے کی اس میں

صلاحیت ہو)،اسی لئے ان کے نزدیک صاحب عدل واجتہاد شخصیت کے رہتے ہوئے کسی فاسق یا غیر مجتہد کو امیر بنانا درست نہیں ہے،حنفیہ کی رائے میں امیر میں یہ صفات بطور شرط صحت نہیں بلکہ بطور اولویت وترجیح مطلوب ہیں،یعنی اگر عادل ومجتہد شخصیت کی موجودگی میں کسی ایسے شخص کو ذمہ داری دے دی جائے جو ان صفات سے محروم ہو تو یہ انتخاب کا غیر مناسب طریقہ ہوگا لیکن منتخب شدہ امیر کی امارت باطل نہیں ہوگی۔۲۴؎

(۷) سماعت وبصارت اور ہاتھ اور پاؤں سلامت ہوں،جمہور فقہاء کے نزدیک اس کے بغیر امامت ہی منعقد نہیں ہوتی، اس لئے ان کے نزدیک اندھے، بہرے،ہاتھ اور کان کٹے کو امام بنانا درست نہیں،اور اگر وہ شروع میں صحیح سالم تھا بعد میں یہ نقائص پیدا ہو گئے،تو اس کی امامت باطل ہو جائے گی۔۲۵؎

(۸) بہتر نسب کا حامل ہو،جمہور فقہاء کے نزدیک امام کے لئے قرشی النسل ہونا ضروری ہے۔۲۶؎

علامہ ماوردیؒ،علامہ نوویؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے عہد صحابہ سے آج تک اس پر اجماع نقل کیا ہے۔۲۷؎

بعض علماء اس کو ضروری قرار نہیں دیتے۔۲۸؎

جمہور کا مأخذ حدیث پاک ہے:

"الائمة من قریش" ۲۹؎

(ائمہ قریش سے ہونگے۔)

لیکن میرے خیال میں خاندان کی شرط لزومی یا شرط صحت نہیں ہے، بلکہ یہ شرط ترجیح ہے،اس لئے کہ اسلام ایک ابدی مذہب ہے اور اگر کسی زمانہ یا علاقہ میں قریشی خاندان کے افراد میسر نہ ہوں تو نظام سلطانی کس طرح قائم ہوگا؟......یا یہ کہ اس کو محض علامتی شرط کہا جائے اور اس کا مقصد یہ ہو کہ امام کا انتخاب اچھے خاندان سے ہونا چاہئے، تاکہ لوگوں کے لئے اتفاق رائے میں آسانی ہو،ورنہ اسلام میں اصل چیز تقویٰ اور دیانت ہے،اس کی طرف اشارہ اس حدیث پاک میں ملتا ہے:

"من استعمل عاملاً من المسلمين وهو يعلم أن فيهم أولىٰ بذلك منه وأعلم بكتاب الله وسنة نبيه فقد خان الله ورسولهٗ وجميع المسلمين" ۳۰

(جس نے مسلمانوں پر ایسا عامل مقرر کیا جس سے بہتر صاحب علم و تقویٰ لوگ موجود ہوں اور وہ جانتا ہو تو اس نے اللہ اور رسول اور تمام مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی۔)

حضرت عمر بن الخطابؓ کے اثر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، انہوں نے ارشاد فرمایا:

"إن أدركني أجلي وأبوعبيدة حي استخلفتهٗ فإن سألني ربي لم إستخلفتهٗ علىٰ أمة محمد؟ قلت إني سمعت رسول الله ﷺ يقول: "إن لكل نبي أمين وأميني أبوعبيدة بن الجراحؓ" وإن أدركني أجلي وقد توفي أبوعبيدة إستخلفت معاذ بن جبل، .... ولو أدركني أحد الرجلين ثم جعلت هذا الامر إليه لوثقت به "سالم مولىٰ أبي حذيفة وأبوعبيدة بن الجراح" ۳۱

(اگر میری موت کے وقت ابوعبیدۃ بن الجراحؓ زندہ رہے، تو ان کو اپنا خلیفہ بناؤں گا، اگر پروردگار مجھ سے پوچھے گا کہ تو نے ان کو امت محمدیہ کا خلیفہ کیوں بنایا؟ تو عرض کروں گا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ ہر نبی کا ایک امین ہوتا ہے اور میرے امین ابوعبیدہ بن الجراح ہیں، اور اگر میری وفات کے وقت ابوعبیدہ زندہ نہ رہے تو معاذ بن جبل کو خلیفہ نامزد کروں گا، ......ایک روایت میں ہے کہ اگر مجھے دو شخصوں میں سے کوئی ایک مل جائے اور میں یہ خلافت اس کے حوالے کردوں تو مجھے اطمینان ہوگا وہ دو اشخاص ہیں ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالم اور

ابوعبیدہ بن الجراح۔)

ظاہر ہے کہ حضرت معاذؓ یا حضرت سالمؓ خاندان قریش سے نہیں تھے ،اگر خلافت کے لئے قریشی ہونا ضروری ہوتا تو حضرت عمر فاروقؓ جیسے محرم اسرار شریعت اس سے بے خبر نہ ہوتے ،جبکہ خود ان کا تعلق بھی اسی شعبہ سے تھا۔

بعض علماء نے حضرت سالم کو قریش ہی میں شمار کیا ہے اس لئے کہ وہ حضرت ابوحذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام تھے اور روایت میں آتا ہے کہ آزاد کردہ غلاموں کا شمار ان کے مالکوں کی قوم میں ہوتا ہے۔[۳۲]

(۹) بعض علماء نے سیاسی بصیرت اور صاحب رائے ہونے کی بھی قید لگائی ہے، یعنی اسے سیاسی مسائل ،ملکی اور قومی مصالح اور اجتماعی ضروریات اور تقاضوں کی خبر ہو، ماوردی کے الفاظ ہیں:

''الرائ المفضی إلیٰ سیاسة الرعیة وتدبیر المصالح''[۳۳]

اسی سے ملتی جلتی بات بعض دوسرے علماء نے بھی لکھی ہے۔[۳۴]

(۱۰) بعض اصحاب علم نے مضبوط قوت ارادی ،عزم وہمت ،صلابت وجرأت ،چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ،ملک وملت کی حفاظت ،مظلوموں کی دادرسی ،شرعی قوانین اور نظام عدل ومساوات کے اجراء کی صلاحیت اور جذبہ کی بھی قید لگائی ہے۔[۳۵]

ارکان شوریٰ کا معیار:

یہاں ایک ضمنی بحث یہ آتی ہے، کہ ارباب شوریٰ کس قسم کے لوگ ہوں گے اور ان کی کم از کم تعداد کیا ہونی چاہیۓ؟

ارکان شوریٰ کے معیار کا تعین علماء نے اس طرح کیا ہے کہ وہ عادل (یعنی دینی واخلاقی لحاظ سے قابل اعتماد) صاحب علم (کم از کم مسائل امارت اور اہلیت امارت کی تفصیلات جانتے ہوں)،صاحب رائے اور حکمت وتدبیر کے فن سے واقف ہوں، موقع ومحل کی نزاکت سے آشنا ہوں،ضروری حد تک لوگوں کی نفسیات سمجھتے ہوں۔[۳۶]

شافعیہ نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ اگر انتخاب کا اختیار فرد واحد کو ہو تو احکام امامت کے مسئلے میں اس کا مجتہد ہونا بھی شرط ہے، اور اگر کئی لوگ مل کر یہ فریضہ انجام دیں تو ان میں کم از کم کسی ایک کا مجتہد ہونا ضروری ہے۔[۳۷]

ارکان شوریٰ کی تعداد

جہاں تک تعداد کا مسئلہ ہے تو اس میں علماء کرام کے درمیان اختلاف ہے،

☆ ایک رائے یہ ہے کہ ملک کے تمام ارباب حل وعقد کا اتفاق ضروری ہے، اس کے بغیر یہ انتخاب پوری امت کے لئے واجب الاتباع نہ ہوگی، امام احمد سے ایک روایت یہی منقول ہے[۳۸]

مگر ظاہر ہے کہ یہ بہت مشکل عمل ہے اور اکثر حالات میں تمام اصحاب حل وعقد کا ایک جگہ جمع ہونا اور پھر کسی ایک رائے پر متفق ہونا ناممکن ہے، خود حضرت صدیق اکبرؓ کے انتخاب میں حضرت سعد بن عبادہؓ جیسے جلیل القدر صحابی نے اختلاف کیا اور زندگی کے آخری لمحے تک بیعت نہیں کی، ان کا انتقال شام میں حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ہوا، انہوں نے حضرت عمرؓ سے بھی بیعت نہیں کی۔[۳۹]

☆ اس سے قریب ترین رائے مالکیہ اور حنابلہ کی ہے کہ مجلس انتخاب میں اکثر ارباب حل وعقد کی شرکت وتائید ضروری ہے اور جو لوگ شرکت نہ کرسکیں وہ اپنا نمائندہ بھیجیں، اسی طرح ہر شہر سے نمائندگی ضروری ہے، اس کے بغیر امیر کا انتخاب غیر آئینی ہوگا[۴۰]

لیکن ظاہر ہے کہ عام حالات میں یہ بھی مشکل ہے، اور عملاً اس میں بھی وہی دشواریاں ہیں، جو اجماع کی صورت میں ہیں۔

☆ دوسری رائے جس کو حنفیہ، جمہور شوافع اور اکثر علماء اہل سنت نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ انتخاب کے وقت ہر شہر کے ارباب حل وعقد کی شرکت ونمائندگی ضروری نہیں ہے بلکہ فی الجملہ ایک جماعت ہونی چاہیے، کوئی خاص تعداد بھی مقرر نہیں ہے۔[۴۱]

☆ البتہ شافعیہ میں بعض دیگر آراء بھی ہیں، دو، تین، چار، اور پانچ ہر طرح کی رائے ہے، اور ہر ایک کا اپنا اجتہاد ہے، دو کا مأخذ نصاب شہادت ہے۔۴۲ تین اس لئے کہ جماعت تین سے بنتی ہے۔۴۳ چار اس لئے کہ اکثر نصاب شہادت کی حد یہی ہے۔۴۴ اور پانچ (۵) کی دلیل حضرت صدیق اکبرؓ کی بیعت کا واقعہ ہے، نیز حضرت فاروق اعظمؓ نے جو چھ (۶) رکنی کمیٹی تشکیل دی تھی، اس میں ایک امیر کو چننے کے لئے پانچ کی تعداد ہی رہ جاتی ہے، بعض شافعیہ چالیس (۴۰) کے قائل ہیں، وہ جمعہ پر قیاس کرتے ہیں، مگر شافعیہ کا راجح مسلک یہ ہے کہ کوئی عدد مقرر نہیں ہے، بلکہ پوری ریاست میں اگر ایک فرد واحد بھی حل وعقد کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس کا تنہا انتخاب کر لینا کافی ہوگا اور اس سے امارت قائم ہو جائے گی، اور پوری قوم پر اس کی تائید واتباع لازم ہوگی۔۴۵

افضل کو چھوڑ کر غیر افضل کا انتخاب

یہاں ایک بحث یہ آتی ہے کہ اگر شوریٰ کسی مصلحت کے تحت افضل ترین لوگوں کی موجودگی میں نسبتاً کمتر درجہ کے شخص کو منصب امارت کے لئے چن لے تو کیا یہ انتخاب درست ہوگا؟ ایک طبقہ کی رائے یہ ہے کہ یہ انتخاب غلط قرار دیا جائے گا۔۴۶ باقلانیؒ، ابوالحسن الاشعریؒ، اور ابویعلیٰ کا رجحان اسی طرف ہے۔۴۷

لیکن اکثر فقہاء ومتکلمین کا مسلک یہ ہے کہ افضل کے رہتے ہوئے غیر افضل کا انتخاب اگر چہ بہتر نہیں ہے لیکن اگر اس میں تمام شرائط اہلیت موجود ہوں تو انتخاب درست قرار پائے گا، جس طرح کہ زیادہ لائق شخص کے رہتے ہوئے نسبتاً کمتر شخص کو منصب قضاء حوالہ کرنا درست ہے، اس لئے کہ بنیادی چیز اہلیت ہے، اور فضیلت محض وجہ ترجیح بنتی ہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ کا نام خلافت کے لئے پیش فرمایا جبکہ یہ دونوں تمام صحابہ سے افضل نہیں تھے۔۴۸ اسی طرح انصار حضرت سعد بن عبادہؓ کو تاج خلافت دینا چاہتے تھے جبکہ صحابہ میں ان سے افضل لوگ موجود تھے۔۴۹ البتہ ارباب شوریٰ کو چاہئے کہ بلا عذر اس قسم کے

غیر متوازن انتخاب سے احتراز کریں، البتہ کوئی مجبوری ہو، مثلاً افضل شخص یہ ذمہ داری قبول کرنے کو آمادہ نہ ہو، یا موجود نہ ہو، یا بیمار رہتا ہو، یا لوگوں میں زیادہ مقبول ومحبوب نہ ہو وغیرہ تو ان صورتوں میں افضل کے رہتے ہوئے غیر افضل کو امیر بنانا درست ہوگا۔[۵۰]

مدت حکومت

یہاں ایک بحث یہ ہے منتخب یا نامزد خلیفہ تا حیات اقتدار پر باقی رہے گا یا اس کی مدت حکومت کی تحدید کی جاسکتی ہے؟ یہ ایک نئی بحث ہے جس سے پچھلی تمام کتابیں خاموش ہیں، گذشتہ ادوار میں دنیا کے کسی نظام حکومت میں بالعموم محدود مدتی حکومت کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، اسلام کی آمد کے بعد بھی وہی صورت حال قائم رہی، اسلام نے اس روایت کو ختم نہیں کیا، بلکہ اسلامی ادوار میں بھی جتنے خلفاء برسر اقتدار آئے وہ تا حیات اپنے منصب پر فائز رہے، خواہ وہ عہد خلافت راشدہ کے حکمراں ہوں یا بعد کے ادوار کے، ہمارے فقہاء نے بھی اپنے مباحث میں اس روایت کی شرعی حیثیت کو چیلنج نہیں کیا، بلکہ عزل امیر کی پوری بحث میں اختتام مدت کی کوئی گفتگو نہیں آئی، اس سے لگتا ہے کہ حکمراں کے لئے اصل مزاج یہی ہے وہ تا حیات خدمت کرے، الا یہ کہ ایسے معقول وجوہات پیدا ہوجائیں جن سے اس کا اقتدار پر باقی رہنا مشکل ہوجائے، اسی لئے پہلے ادوار میں صرف رائے دہی پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا بلکہ باقاعدہ اس کے لئے تا حیات وفاداری کی بیعت لی جاتی تھی اور اس کے خلاف خروج وغداری کو جرم مانا جاتا تھا، اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”خیار ائمتکم الذین تحبونهم ویحبونکم وتصلون علیهم ویصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تبغضونهم ویبغضونکم وتلعنونهم ویلعنونکم، قال قلنا یارسول الله! أفلاننابذهم عند ذلک قال لاماأقاموا فیکم الصلاة، لاماأقاموا فیکم الصلاة، الامن ولّی علیه وال فرآه یاتی

شیئاً من المعصیة فلیکرہ مایاتی من معصیة اللہ ولا ینزعن یداً عن طاعة'' [۵۱]

(تمہارے بہترین حکمراں وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں، تم ان کے لئے رحمت کی دعائیں کرو اور وہ تمہارے لئے دعائیں کریں، اور بدترین حکمراں وہ ہیں جن سے تم نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں، تم ان پر لعنت بھیجو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں، راوی (حضرت عوف بن مالکؓ) کہتے ہیں، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ایسی صورت میں ہم ان سے اپنی گردن نہ چھڑالیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا نہیں جب تک وہ نماز قائم کئے ہوئے ہوں، نہیں جب تک وہ نماز قائم کئے ہوئے ہوں، سنو! جس پر کوئی حاکم مقرر کیا گیا، اور اس نے اس کو معصیت کا مرتکب دیکھا تو وہ اس کی معصیت کو پسند نہ کرے لیکن اطاعت سے ہاتھ نہ نکالے۔)

حدیث کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت کے باوجود بھی حکمراں کو اس کے منصب سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی جائے گی، اور ملک کے نظم ونسق کو معطل نہیں کیا جائے گا،......

یہ تصور عہد حاضر کی پیداوار ہے، جو دراصل حکمرانوں کے ظلم وستم اور قوت و اختیار کے غلط استعمال پر قابو پانے کے لئے وجود میں آیا، اس لئے کہ جب انسان کو غیر محدود مدت کے لئے اقتدار حاصل ہو، جس میں چند استثنائی حالات کو چھوڑ کر اس کی سلطانی کو کوئی خطرہ نہ ہو تو بالعموم آدمی فرعون بننے کی کوشش کرتا ہے، اور حق وانصاف کے راستے اکثر مسدود ہو جاتے ہیں، ان حالات میں کبھی اصلاح واحتجاج کی تحریک بھی کارگر نہیں ہوتی، جیسا کہ پچھلے ادوار میں حکمرانوں کے ظلم وستم کے خلاف بڑے بڑے ائمہ علم و فن نے تحریکات چلائیں، اور پرامن اور پرتشدد دونوں طرح کے مظاہرے ہوئے، لیکن ان کا نتیجہ دار ورسن اور خون شہیداں کے علاوہ کچھ نہیں نکلا ......حکمرانی کی تاریخ کی یہی

وہ دشواریاں ہیں جن کے بطن سے اس فکر وخیال نے جنم لیا کہ مدت اختیار کو محدود کر دیا جائے ،یعنی شاہینوں کے پر کتر دیئے جائیں ،سلطانی کو ملازمت میں تبدیل کر دیا جائے، اور ایسا نظام بنایا جائے جس میں کل کا سلطان آج کا فقیر بنادیا جائے ،یہ تصور حکمرانوں کی طرف سے نہیں بلکہ عوام کی طرف سے پیش کیا گیا تھا اس لئے اس میں خاص طور پر اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ سلطانی کو ہر آدمی کے لئے سہل الحصول بنایا جائے ،اور ہر شہری کو اس معاملے میں رائے دہی اور امیدواری کا حق دیا جائے ۔......

لیکن تعجب ہے کہ پچھلے ادوار میں کسی کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ اس طرح کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے محدود مدتی نظام رائج کیا جائے ،جبکہ ظلم وستم کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔

بہر حال جہاں تک تحدید مدت کے جواز کا معاملہ ہے تو میرے خیال میں اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہونا چاہیئے ۔

☆اس لئے کہ حکمراں کی حیثیت عرفی کے ضمن میں یہ بحث گذر چکی ہے کہ حکمراں یا خلیفہ بنیادی طور پر قوم کا نمائندہ اور وکیل ہوتا ہے ،جس کو ارباب حل وعقد منتخب کرتے ہیں، تو عقد وکالت کی روشنی میں مؤکلین کو مدت وکالت کی تحدید کا اختیار ہوتا ہے۔

☆نیز یہ امامت بیعت کے ذریعہ وجود میں آتی ہے ،گویا یہ ایک عقد معاہدہ ہے،اور معاہدے کے وقت جس چیز کا التزام کیا جائے اس کی پابندی ضروری ہوتی ہے ،تو اگر بوقت بیعت ہی محدود مدت کا معاہدہ کیا جائے تو اس کی گنجائش ہونی چاہیئے ۔

☆اسی طرح بعض آثار سلف سے پتہ چلتا ہے کہ امامت میں حدود وقیود کی گنجائش ہے بشرطیکہ ابتدا ہی میں اس کی وضاحت کردی جائے مثلاً حضرت عمر فاروق ؓ نے تاسیس خلافت کے لئے جو مجلس قائم فرمائی تھی ،اس کی تاسیسی کارروائیوں کے ضمن میں مؤرخین کا بیان ہے کہ مجلس کے نمائندہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ؓ نے حضرت علی بن ابی طالب ؓ سے خلافت کی شرائط پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آپ مملکت کے تمام معاملات

میں قرآن وحدیث کے ساتھ سیرت شیخین ؓ کو بھی پیش نظر رکھیں گے، لیکن حضرت علیؓ نے قرآن وحدیث کے علاوہ کسی چیز کو معیار ماننے سے انکار کردیا، پھر یہ شرط حضرت عثمانؓ کے سامنے رکھی گئی، وہ اس کے لئے تیار ہو گئے، تو ان کا انتخاب کرلیا گیا۔۵۲

اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ خلافت کے پیش کرتے وقت کچھ شرطیں رکھی جاسکتی ہیں، اور ان کو قبول وانکار بھی کیا جاسکتا ہے، ...... تحدید مدت بھی ایک قسم کی قید ہے اگر انتخاب کے وقت ہی اس قید کو پیش نظر رکھا جائے اور خلیفہ وعوام اس کے لئے رضا مند ہوں تو جواز کی پوری گنجائش نظر آتی ہے، لیکن اس نظام حکومت میں کئی خرابیاں ہیں جن کی بنا پر وقتی طور پر اسے گوارا تو کیا جاسکتا ہے لیکن دائمی دستور کے طور پر قبول نہیں کیا جاسکتا، مثلاً:

☆ یہ حکمرانی کی اصل روح کے خلاف ہے، کل کا سلطان ہو آج کچھ نہ ہو، اس کو حادثہ تو کہا جاسکتا ہے، دستوری جواز نہیں دیا جاسکتا۔

☆ نیز اس طریقۂ کار سے کوئی آئیڈیل شخصیت وجود میں نہیں آسکتی، اور نہ اس کی عظمت وتقدس کا احساس دلوں میں جاگزیں ہوسکتا ہے،

☆ جس کی بنا پر احکام خلافت اور ملکی قوانین کا احترام بھی لوگوں کے دلوں میں پیدا نہیں ہوگا اور نہ مخلصانہ جذبات پیدا ہونگے، قانون کا احترام اور جذبۂ عمل ہمیشہ ملک و آئین سے محبت اور شخصیت کی عظمت وعقیدت دونوں سے ملکر پیدا ہوتا ہے، اس کے بغیر قانون کی حکمرانی کی نمائش تو ہوسکتی ہے حقیقت نہیں بن سکتی۔

☆ نہ بہت زیادہ پائیدار نظام حکومت تشکیل پاسکتا ہے، اس لئے کہ ہر نئی حکومت ایک نئی راہ نکالنے کی کوشش کرتی ہے، اور پرانے نقوش کو مٹادینے یا ان کی اہمیت گھٹادینا چاہتی ہے،

☆ ہر تھوڑے وقفے کے بعد انتخابات کا جو اقتصادی بوجھ ملک کے خزانہ پر پڑتا ہے وہ ان کے علاوہ ہے، پھر انتخابات کی ناہمواریاں اور بدعنوانیاں، کہ الامان والحفیظ،

☆ ہر نیا آنے والا حکمراں پہلے اپنے مفادات کے لئے ملک کی دولت بٹورنے کوشش کرتا ہے، اس لئے کہ اسے معلوم ہے کہ ایک محدود مدت کے بعد یہ موقعہ

اسے پھر کبھی نہیں ملنے والا ہے، اس طرح غیر محدود حکمرانی میں اگر ملک کی دولت کو ایک شخص یا خاندان لوٹتا ہے تو محدود مدتی حکومت میں بے شمار لوگ اور خاندان وقفہ وقفہ سے ملک کی دولت اور اقتصادی قوت کا استحصال کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کی اقتصادی حالت مفلوج ہوتی چلی جاتی ہے، اور توانائی کے تمام تر وسائل استعمال میں لانے کے باوجود خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے ...... اسی ملک ہندوستان میں جب تک مسلم حکمرانی کا دور تھا، اور ہر حکمراں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملک کے لئے صرف کرتا تھا تو یہ ملک سونے کی چڑیا کہلاتا تھا، اور اپنی خوش حالی میں پوری دنیا میں ضرب المثل تھا، ساری دنیا کے بہترین دماغوں اور اعلیٰ صلاحیت کے لوگوں کا یہ مرکز توجہ تھا، آج اقتصادی پسماندگی، غربت وافلاس اور طلب ورسد کے عدم توازن کی کس پستی میں جا گرا ہے، وہ ہر شخص محسوس کرسکتا ہے۔

اسلامی طریقۂ انتخاب

اس موضوع کا سب سے حساس مسئلہ انتخابی طریقۂ کار کی بحث ہے، ...... اسلام میں کوئی ایک طریقۂ انتخاب مقرر نہیں ہے، اور نہ منصوص طور پر کسی خاص طریقۂ انتخاب کی نشاندہی کی گئی ہے، بس کچھ اشارات دیئے گئے ہیں، باقی چیزیں امت کے اجتہاد پر چھوڑ دی گئی ہیں، اشارات مثلاً:

☆ نبی کریم ﷺ اپنی حیات طیبہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ نامزد کرنا چاہتے تھے جس کا تذکرہ آپ ﷺ نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا، اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ ہر کس وناکس اس کی آرزو نہ کرنے لگے اور یہ منصب جلیل بازیچۂ اطفال نہ بن جائے، لیکن پھر آپ نے یہ سوچ کر ترک فرمادیا کہ قوم خود ہی ان کو منتخب کرلے گی۔[۵۳]

حضور ﷺ کے اس عمل سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ امام اگر مصلحت محسوس کرے تو وہ اپنی زندگی میں اپنا خلیفہ نامزد کرسکتا ہے، اور اگر مفسدہ کا اندیشہ نہ ہو تو عام

مسلمانوں پر چھوڑ دے کہ وہ اپنا خلیفہ خود منتخب کرلیں، یعنی اس واقعہ سے استخلاف کا جواز بھی نکلتا ہے، اور عام مشورہ کا ثبوت بھی ملتا ہے، اب اس میں مجتہد کو طے کرنا ہے کہ کن حالات میں کون سا طریقہ اختیار کیا جانا چاہئے؟...... اور حضور اکرم ﷺ کی خواہش کو ترجیح ملنی چاہئے یا آپ کے عملی اسوہ کو؟...... اسی طرح دونوں کے حدود وقیود کیا ہونگے؟ حالات وظروف کی روشنی میں یہ بھی امت کے مجتہدین اور علماء طے کریں گے۔

☆ اشارہ کی دوسری مثال: قرآن کریم میں حکمراں پیغمبروں میں حضرت داوٗدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا تفصیلی ذکر آیا ہے، اس میں ایک طرف حضرت سلیمانؑ کی حکومت ہے جو ان کو اپنے والد ماجد حضرت داوٗدؑ سے وراثت میں ملی تھی:

''وَوَرِثَ سُلَیْمَانُ دَاوٗدَ'' (النمل:۱۶) سلیمان داوٗد کے وارث ہوئے۔

قرآن کریم نے بیان واقعہ کے طور پر اس قصہ کو نقل کیا ہے، لیکن اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اہلیت ہوتو حکومت میں بیٹا اپنے باپ کا جانشیں ہوسکتا ہے، اور باپ بھی اپنے لائق فرزند کو اپنے جانشین کے طور پر نامزد کرسکتا ہے،

☆ اسی سورہ میں یہ بھی ہے کہ حضرت سلیمانؑ متعدد مسائل میں اپنے درباریوں سے مشورہ کرتے تھے:

''قَالَ یَا أَیُّهَا الْمَلَأُ أَیُّکُمْ یَأْتِیْنِیْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَنْ یَأْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ'' (النمل:۳۸)

(آپؑ نے فرمایا اے ارکان جماعت! قبل اس کے کہ وہ خاتون حکمراں میرے پاس فرمانبردار ہوکر حاضر ہو اس کا عرش میرے پاس کون لاسکتا ہے؟)

☆ اسی سورہ میں خاتون حکمراں ملکۂ سبا بلقیس کا ذکر ہے، جس نے حضرت سلیمانؑ کی تعلیم وتلقین اور جاہ وجلال سے متأثر ہوکر اپنی ریاست، مملکت سلیمانی میں ضم کردی تھی، وہ ملکہ بھی خود مختار ہونے کے باوجود اپنے پاس شورائی نظام رکھتی تھی، اور مختلف مسائل میں ان سے تبادلۂ خیال کرتی تھی:

''قَالَتْ یَا أَیُّهَا الْمَلَأُ إِنِّیْ أُلْقِیَ إِلَیَّ کِتَابٌ کَرِیْمٌ، ...... قَالَتْ یَا

أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي أَمْرِي مَا كُنتُ قَاطِعَةً أَمْراً حَتَّى تَشْهَدُونِ" (۳۲)

(ملکہ نے کہا اے ارکان جماعت! میرے پاس ایک بہت اہم خط آیا ہے ......ملکہ نے کہا میرے معاملے میں اپنی رائے دو، میں تمہاری شمولیت کے بغیر اس مسئلہ کو نہیں دے سکتی۔)

الملأ کی تفسیر مفسرین نے اہل مشورہ سے کی ہے، ایک انتہائی قدیم ترین تفسیر "تفسیر مقاتل" کے الفاظ ہیں:

"ثم قالت المرأة لأهل مشورتها" [54]

ان دونوں حکمرانوں کے طرز عمل سے شوریٰ کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے، اور قرآن کریم کے اس بیان سے شورائی نظام کی برتری کا ثبوت ملتا ہے۔

رہا ایک خاتون کے سربراہ مملکت ہونے کا معاملہ، تو اگر اسلام نے صراحت کے ساتھ اس کی ممانعت نہ کی ہوتی، تو اس کے اشارے سے اس کا جواز بھی ثابت ہوتا، لیکن خود قرآن کے انداز بیان نے بھی اس کی نفی کر دی ہے، ایک عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی خبر سنکر حضرت سلیمانؑ حیرت و استعجاب میں پڑ گئے، انہوں نے فرمایا:

"سَنَنظُرُ أَصَدَقْتَ أَمْ كُنتَ مِنَ الْكَاذِبِينَ" (۲۷)

(ہم دیکھیں گے کہ تمہارا بیان سچا ہے یا جھوٹا؟)

اسی طرح جب حضرت سلیمانؑ نے ملکہ کو اطاعت کی دعوت دی تو بالآخر اس نے اطاعت قبول کر لی اور گویا اس کا مستقل وجود فنا ہو گیا، اور اس کا ملک مملکت سلیمانی کا حصہ بن گیا:

"قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ" (۴۴)

(ملکہ نے کہا میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔)

یہ دونوں چیزیں عورت کے سربراہ حکومت ہونے کی نفی کرتی ہیں۔

غرض قرآن وحدیث میں اس طرح کے بعض اشارات موجود ہیں، جن سے انتخاب امیر کے معاملے میں روشنی حاصل کی جاسکتی ہے، مگر کسی ایک شکل کو قطعیت نہیں دی جاسکتی، خود صاحب شریعت نے کسی ایک صورت کی واضح طور پر تعیین نہیں کی، اور معاملے کو امت کے اجتہاد پر چھوڑ دیا ...... اسی لئے علماء اس معاملے میں مختلف الرائے رہے ہیں کہ کون سا طریقۂ انتخاب بہتر ہے؟ نصوص سے کون زیادہ قریب ہے؟ عملی طور پر بھی اس میں اختلاف رہا، اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہر دور کے حکمرانوں اور ارباب حل عقد نے کسی ایک طریقہ کا التزام کیا ہو، مختلف ادوار میں مختلف تجربے ہوئے، اور کسی پر شرعی اعتبار سے نکیر نہیں کی گئی، اس لئے کہ مسئلہ منصوص نہیں ہے، اور غیر منصوص مسئلے میں اختلاف رائے بھی ممکن ہے اور اختلاف عمل بھی، حضرت عمر بن الخطابؓ کا یہ قول اسی تناظر میں ہے کہ:

"إن أستخلف فقد إستخلف من هو خير مني أبوبكر، وإن أترك فقد ترك من هو خير مني رسول الله" ۵۵

(اگر میں خلیفہ بنادوں تو مجھ سے بہتر شخصیت حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ بنایا تھا، اور اگر چھوڑ دوں تو مجھ سے بہتر رسول اللہ ﷺ نے نہیں بنایا تھا۔)

انتخاب امیر کی جائز صورتیں

انتخاب امیر کی دنیا میں بہت سی صورتیں رائج ہیں اور بھی نئی صورتیں وجود میں آسکتی ہیں، لیکن علماء اہل سنت نے ان میں تین (۳) صورتوں کو درست قرار دیا ہے، یعنی ان کی بنیاد پر منتخب ہونے والی حکومت جائز تصور کی جائے گی، اور اس کو وہ تمام شرعی اختیارات حاصل ہونگے جو ایک جائز حکومت کو حاصل ہوتی ہیں۔

پہلا طریقہ

(۱) خلیفہ کے انتخاب کا سب سے بہتر طریقہ جس کو اکثر علماء سلف نے پسند کیا ہے وہ یہ ہے کہ قوم کے ارباب حل وعقد کے مشورے سے یہ عمل میں آئے ،اور جس شخصیت کا انتخاب ہو پہلے یہ حضرات اس کے ہاتھ پر بیعت کریں، یہی اصل اسوہ ہے رسول اللہ ﷺ کا، آپ دنیا سے تشریف لے گئے،اور امیر کے مسئلے کو امت کے حوالہ فرمادیا، یہ طریقہ اختلافات علماء، نیز خطرات اور اندیشوں سے بڑی حد تک پاک اور ہر زمانے کے لئے قابل قبول ہے۔ ۵۶

علامہ کندیؒ نے اس پر اجماع امت نقل کیا ہے:

”وقد أجمع رای المسلمین من بعد رسول الله ﷺ أن الإمامة لاتجب لإمام من بعد إمام أو عزلهٗ إلا عن مشورة أهل العلم، ورضى منهم على النصح لله ثم یکون حجة علی من غاب“ ۵۷

(عہد رسالت کے بعد سے مسلمان اس پر متفق الرائے ہیں کہ امام پر اپنے بعد امام مقرر یا معزول کرنا اہل علم کے مشورہ اور ان کی مخلصانہ رضامندی کے بغیر لازم نہیں ہے ،اور جب ہی یہ بعد والوں پر لازم ہوگا۔)

☆ اس طریقۂ انتخاب کا ثبوت اس آیت کریمہ سے ملتا ہے جس میں مسلمانوں کے جملہ اجتماعی مسائل کو مشورہ پر مبنی کیا گیا ہے:

”وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ“ (سورہ الشوریٰ:۳۸)

(جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہا ،اور نماز قائم کی ،اور ان کے معاملات باہم مشورہ سے انجام پاتے ہیں، اور اللہ کی دی ہوئی دولت سے خرچ کرتے ہیں۔)

☆ دوسرا ماخذ اجماع صحابہ ہے،اس لئے کہ چاروں خلفاء راشدین کا انتخاب

اصلاً باہم مشورہ سے ہوا، اختلاف یا تردد جو کچھ رہا وہ منتخب ہونے والی شخصیات کے تعلق سے تھا نہ کہ طریقۂ انتخاب کے سلسلے میں۔ [۵۸]

☆اس ضمن میں خود ان خلفا راشدین کا طرز عمل بھی خاص اہمیت رکھتا ہے مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا، اس میں حضرت علیؓ کو تھوڑا تامل رہا ،حضرت سعد بن عبادہؓ نے بھی بیعت نہیں کی، اس موقعہ پر نو منتخب خلیفہ حضرت ابوبکرؓ نے قوم سے اپنے خطاب میں فرمایا:

''هذا علی بن أبی طالب ولابيعة لی فی عنقهٖ وهو بالخيار فی أمرهٖ ،ألا وأنتم بالخيار جميعاً فی بيعتكم إيای فإن رأيتم لها غيری فأنا أول من يبايعه'' [۵۹]

(یہ علی بن ابی طالب ہیں ان کی گردن میں میری بیعت نہیں ہے اور یہ اپنے معاملے میں آزاد ہیں ،اور آپ سب کو بھی میری بیعت کے معاملے میں اختیار ہے، آپ حضرات کی رائے میرے علاوہ کسی اور کے بارے میں ہو تو سب سے پہلے اس سے بیعت کرنے والا میں ہوں گا۔)

حضرت عمر بن الخطابؓ ارشاد فرماتے ہیں:

''من بايع رجلاً من غير مشورة من المسلمين فلايُبَايَع هو ولاالذی بايعهُ تَغِرَّةَ أن يُقْتَلا'' [۶۰]

(جس نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی سے بیعت کر لی تو اس کی بیعت نہیں کی جائے گی اور نہ اس کی جس نے قتل کے اندیشے سے اس کی بیعت کی ہو۔)

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ارشاد ہے:

''إن بيعتی لاتكون خفية ولاتكون إلا عن رضا المسلمين'' [۶۱]

(میری بیعت خفیہ نہیں ہوسکتی اور نہ مسلمانوں کی مرضی کے بغیر ہوسکتی ہے۔)

کبھی اس عمل کو مصالح کی بنیاد پر ارباب حل وعقد کی مخصوص کمیٹی تک بھی محدود

کیا جاسکتا ہے، جس طرح کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے جانشین کے مسئلے میں کیا یہ ایک زیادہ محفوظ راستہ تھا، اس سے امیر کے اس اختیار پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ انتخاب کے مسئلے کو تمام مسلمانوں کے بجائے ایک مخصوص کمیٹی کے وہ حوالے کرسکتا ہے، اس چیز کو تمام صحابہؓ نے من وعن تسلیم کیا، چنانچہ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد جس وقت اس مجلس منتخبہ کی میٹنگ ہورہی تھی حضرت عباسؓ نے اس مجلس میں شرکت کی خواہش کی تو حضرت علیؓ نے جو اس کمیٹی کے اہم رکن تھے سختی کے ساتھ ان کو روک دیا۔ (الموسوعۃ الفقہیۃ بحث الامامۃ الکبریٰ)

انتخاب کا دوسرا طریقہ

(۲) انتخاب امیر کا دوسرا طریقہ جس کو فقہاء اہل سنت نے بالاتفاق درست قرار دیا ہے، وہ یہ کہ خلیفۂ وقت خود اپنی زندگی میں اپنے بعد کے لئے امیر نامزد کردے۔ ٦٢

☆اس کا سب سے بڑا ماٴخذ قرآن کریم کی آیت کریمہ ......**وورث سلیمان داؤد** (النمل:١٦) ہے۔

☆دوسرا ماٴخذ حدیث پاک ہے: حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> **"لقد هممت –او أردت –أن ارسل إلىٰ أبى بكر وابنه، فأعهد أن يقول القائلون أو يتمنى تمنون ،ثم قلت يأبى الله ويدفع المؤمنين او يدفع الله ويأبى المؤمنون"** ٦٣
>
> (میں نے تو ارادہ کرلیا تھا کہ ابو بکر اور ان کے بیٹے کو بلوا کر عہد نامہ تیار کرادوں تاکہ کسی بوالہوس کو کچھ کہنے اور تمنا کرنے کی نوبت نہ آئے، لیکن پھر میں نے کہا کہ اللہ پاک اور مسلمان خود اس کو دفع کردیں گے۔)
>
> علامہ ابن تیمیہؒ اس حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"یغنی عن العھد فلایحتاج إلیه فتركهٗ لعدم الحاجة وظھور فضیلة الصدیق وإستحقاقهٖ وھٰذا أبلغ من العھد"[۶۴]

(عہد نامہ کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی فضیلت واستحقاق بالکل ظاہر بات تھی، اور یہ عہد نامہ کے مقابلے میں زیادہ بہتر بات تھی۔)

اس حدیث میں آپ کا چاہنا اور ارادہ فرمانا استخلاف کے جواز کی دلیل ہے، اور چھوڑ دینا مشیت الٰہی جان لینے کی بنا پر تھا، نیز اس لئے بھی کہ ایک زیادہ افضل طریقہ کی عملی رہنمائی کی جائے۔

☆ تیسرا مأخذ حضرت صدیق اکبرؓ کا عمل ہے، جس سے تمام صحابہ نے اتفاق کیا کہ آپ نے اپنی وفات سے پیشتر حضرت عمر فاروقؓ کو اپنا جانشیں نامزد فرمایا، اور اس کا اعلان بھی اپنی زندگی میں فرمادیا، حضرت صدیقؓ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے بالاتفاق حضرت عمرؓ کو اپنا خلیفہ تسلیم کیا، کسی ایک شخص نے بھی حضرت صدیقؓ کے اس انتخاب کی مخالفت نہیں کی۔[۶۵]

حضرت صدیقؓ کے اس عمل سے اسلامی تاریخ میں عملی طور پر ولی عہدی کا دستور جاری ہوا۔

☆ ایک دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے آخری عہد خلافت میں بعض صحابہؓ نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اپنی زندگی میں اپنا خلیفہ نامزد کردیں تو انہوں نے فرمایا کہ اگر میں خلیفہ نامزد کردوں تو مجھ سے بہتر شخصیت حضرت ابو بکر صدیقؓ کی تقلید ہوگی اور اگر نامزد نہ کروں تو رسول اللہ ﷺ نے بھی نامزد نہیں فرمایا تھا۔[۶۶]

البتہ ایک نکتہ یہاں یہ زیر بحث آیا ہے کہ آیا محض نامزدگی سے امارت قائم ہوجاتی ہے یا امیر کی وفات کے بعد دوبارہ تمام مسلمانوں کا اس سے بیعت کرنا ضروری ہوگا؟ بعض علماء بصرہ کا خیال ہے کہ ولی عہد خواہ کوئی ہو عزیز قریب ہو یا اجنبی ہر حال میں محض نامزدگی کافی نہیں ہے، بلکہ امیر کی وفات کے بعد ولی عہدی کی تجدید دوبارہ

مسلمانوں کی بیعت کے ذریعہ ضروری ہوگی، اگر مسلمان اس کے لئے راضی نہیں ہوئے تو اس کی ولی عہدی منسوخ ہو جائے گی، لیکن صحیح قول یہ ہے کہ ولی عہد اگر امیر کا کوئی انتہائی قریب ترین رشتہ دار نہ ہو تو مسلمانوں کی رضامندی شرط نہیں ہے، اس لئے کہ حضرت عمرؓ کے مسئلے میں صحابہ سے اس طرح کی کوئی رضامندی حاصل نہیں کی گئی تھی البتہ ولی عہد اپنا بیٹا یا باپ اور کوئی انتہائی عزیز ترین قریب ہو تو اس صورت میں علماء کی آراء مختلف ہیں:

(۱) ایک رائے یہ ہے کہ امیر کے لئے اپنے بیٹے یا باپ وغیرہ کو ارباب حل و عقد اور اصحاب علم وفہم کے مشورے کے بغیر تنہا اپنی مرضی سے ولی عہد بنانے کی اجازت نہیں ہے، اس لئے کہ یہ شہادت کے زمرے میں آتا ہے یا حکم کے، اور دونوں صورتیں تہمت سے خالی نہیں ہیں۔

(۲) دوسری رائے یہ ہے کہ کوئی مضائقہ نہیں، اس لئے کہ وہ امیر ہے اور اس کی دیانت وامانت پر لوگوں نے اعتماد کیا ہے، اس لئے اپنے جانشیں کے مسئلے میں بھی اس پر اعتماد کیا جانا چاہئے، اس صورت میں اس کے نسبی رشتہ سے زیادہ اس کے مقام کا لحاظ رکھنا قابل ترجیح ہوگا۔

(۳) تیسری رائے یہ ہے کہ امام کسی اجنبی شخص (جس سے باپ یا بیٹے کا رشتہ نہ ہو) کے معاملے میں اہل الرائے کے مشورہ کا پابند نہیں ہے، البتہ اپنے بیٹے یا باپ کے معاملے میں اہل شوریٰ سے مشورہ ضروری ہے، اس لئے کہ اپنے والد یا اولاد کے حق میں انسان بالعموم کمزور ثابت ہوتا ہے، طبیعت کا میلان ادھر ہوتا ہے، اس لئے شک وشبہ کا اندیشہ ہے، ...... البتہ بھائی یا اور کسی رشتہ دار کے معاملے میں گنجائش ہے ان کا حکم عام اجنبیوں کی طرح ہے، یہ ایک معتدل اور زیادہ قابل قبول رائے ہے۔[۶۷]

ولی عہدی کی شرائط قبولیت

☆ البتہ جمہور فقہاء کے نزدیک ضروری ہے کہ ولی عہد میں وہ تمام شرائط اہلیت موجود ہوں جو امام کے لئے ضروری ہیں۔

☆ولی عہد نے امیر کی زندگی میں یہ ذمہ داری قبول کر لی ہو، ورنہ یہ محض خلافت کی وصیت ہوگی، اور احکام وصیت جاری ہو نگے۔ ۶۸

☆ولی عہد میں ولی عہدی قبول کرنے کے وقت سے خلافت کے سنبھالنے تک شرائط اہلیت مسلسل موجود ہوں، کسی نابالغ، مجنوں یا فاسق کو ولی عہد بنانا درست نہ ہوگا، اور اگر ولی عہد بناتے وقت یہ نقائص نہ تھے لیکن بعد میں پیدا ہو گئے تو بھی ولی عہدی باطل ہو جائے گی۔ ۶۹

حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ نابالغ کو ولی عہد بنایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ امام کی وفات کے بعد ملکی معاملات اور ذمہ داریوں کے لئے عارضی طور پر اس کا کوئی نائب مقرر کر دیا جائے، جو ولی عہد کے بالغ ہونے تک امور مملکت انجام دے، ولی عہد کے بلوغ کے بعد نائب خود بخود معزول ہو جائے گا۔ ۷۰

☆علماء بصرہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ ولی عہد ارباب حل وعقد کے مشورہ سے مقرر کیا گیا ہو، جمہور علماء اہل سنت کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ۷۱

تیسرا طریقہ

(۳) امارت کی تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی صاحب قوت واختیار بالجبر حکومت پر قبضہ کر لے، اور اپنی امارت کا اعلان کر دے، تو جمہور فقہاء کے نزدیک اس کی امارت نافذ ہو جائے گی، اور اس کی اقتداء میں نماز، جہاد و حج وغیرہ شرعی احکام کی ادائیگی درست ہوگی اور اس کے خلاف بغاوت جائز نہ ہوگی، البتہ شافعیہ نے اس میں یہ شرط لگائی ہے کہ اس شخص میں اہلیت امارت کی جملہ شرائط موجود ہوں، ورنہ اس کی خلافت جائز نہ ہوگی، اور یہ محض غاصبانہ تسلط قرار پائے گا۔ ۷۲

☆اس کا ماٰخذ دراصل وہ حدیث پاک ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

"إن أمّر عليكم عبد مجدع اسود يقودكم بكتاب الله فاسمعوا له وأطيعوا" ۷۳

(اگر تم پر کوئی کن کٹا غلام بھی امیر ہو جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تم پر حکومت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔)

☆ اسی طرح حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

"من كره من أميره شيئاً فليصبر فإنه من خرج من السلطان شبراً مات ميتة الجاهلية" [۴]

(جو اپنے امیر کی طرف سے ناپسندیدہ چیز دیکھے وہ صبر کرے، اس لئے کہ جو حکومت کی اطاعت سے نکل گیا اس کی موت جاہلیت پر ہوگی۔)

☆ واقعۂ حرہ کے موقعہ پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے اہل مدینہ کے ساتھ نماز پڑھی اور ارشاد فرمایا

"نحن مع من غلب" جو غالب آ جائے ہم اس کے ساتھ ہیں۔[۵]

☆ علاوہ ازیں اس صورت میں سخت فتنہ اور جان و مال کے ضیاع کا اندیشہ ہے، اس لئے عام مسلمانوں کے لئے عافیت اور سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ قوت قاہرہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے اور اس کی اطاعت قبول کر لی جائے، تاکہ مسلمانوں کے جان و مال کا بھی تحفظ ہو اور ملک و ملت کے وہ داخلی مسائل معلق نہ رہ جائیں جو امیر کے بغیر انجام نہیں پا سکتے۔[۶]

البتہ یہ امارت کی ایک اضطراری صورت ہے، جو صرف مخصوص حالات میں ہی قابل قبول ہو سکتی ہے، اور اس کی بنیاد محض دفع ضرر پر ہے، اس کو عام ضابطہ کے طور پر نہ پیش کیا جا سکتا ہے، اور نہ علمی بنیادوں پر اس کی حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے، یہ ایک ابتلائی صورت حال ہے، جس کو صبر کے اصول پر قبول کر لینے اور خاموش رہنے کو کہا گیا ہے۔

عوامی انقلاب

جو حکمراں عوامی انقلاب اور افرادی قوت کے ذریعہ اقتدار میں آتے ہیں وہ

بھی ابتدائی طور پر اسی زمرہ میں آتے ہیں، الا یہ کہ خواص اور اہل علم وفضل کا طبقہ بھی اس کی تائید کرے...... اسلامی تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں، جن میں عوامی طاقت کے ذریعہ حکومت کا تختہ پلٹنے کی کوشش کی گئی، اور متعدد کو کامیابی بھی ملی، خود حضرت امام حسینؓ کا سفر کوفہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے عوامی انقلاب کے ذریعہ مکہ معظمہ میں اپنی حکومت قائم فرمائی وغیرہ، بعد کے ادوار میں بھی ایسی کئی کوششوں کا تذکرہ ملتا ہے جن میں بعض کو ہمارے مشہور ائمہ کی تائید وحمایت بھی حاصل رہی، مثلاً عہد بنی امیہ (صفر ۱۲۲ھ م ۷۴۰ء) میں حضرت زید بن علیؒ نے عوامی تحریف پر حکومت کا تختہ پلٹنے کی کوشش فرمائی، جس کو حضرت امام ابوحنیفہؒ کی تائید حاصل تھی، آپ نے ان کے خروج کو رسول اللہ ﷺ کے خروج کے مشابہ قرار دیا، البتہ علانیہ حمایت اور ان کے ساتھ عملی شرکت سے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کی کہ:

"لو علمت أن الناس لايخذلونه ويقومون معهٗ قيام صدق لكنت أتبعهٗ، وأجاهد معهٗ، لأنهٗ إمام حق"

(اگر مجھے معلوم ہوتا کہ لوگ ان کو ذلیل ورسوا نہیں کریں گے، اور ان کے ساتھ مخلصانہ برتاؤ کریں گے، تو میں بھی ان کا ساتھ دیتا اور ان کے ساتھ جہاد میں شامل ہوتا، اس لئے کہ یہ امام برحق ہیں،...)

البتہ حضرت امامؒ نے ان کو مالی مدد فراہم کی۔ [۷۷]

تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی زندگی میں ایسے کئی موقعے آئے، جن میں ظالم حکومت کے خلاف انتہائی نیک ہستیوں نے عوامی انقلاب کی کوششیں کیں اور حضرت امامؒ نے گو عملاً ان میں حصہ نہیں لیا، لیکن اپنے فتاویٰ اور دروس کے ذریعہ ان کی حمایت کی، مثلاً:

☆ حسن بن قحطبہ کا ذکر ملتا ہے، اموی حکومت کے خلاف ان کی بغاوت کی امام صاحبؒ نے تائید فرمائی۔ [۷۸]

☆ عباسی خلیفہ منصور کے دور میں حضرت حسنؓ کے پوتے حضرت ابراہیم بن

عبداللہؒ نے خروج کیا تو امام صاحبؒ نے ان کی تائید فرمائی، اور اس میں شرکت وامداد کو پچاس (۵۰) نفل حج سے بہتر قرار دیا، ایک خاتون اپنے بیٹے کو اس میں شامل ہونے سے روکتی تھی، امام صاحبؒ نے اس عورت کو ایسا کرنے سے منع کیا، اگرچہ ان کی کوشش بار آور نہ ہوسکی لیکن کہتے ہیں کہ امام صاحبؒ کے پاس جب کبھی ان کا یا ان کے بھائی محمد بن عبداللہؒ کا ذکر آجاتا امام صاحب کی آبدیدہ ہوجاتے تھے۔۹ے

دراصل حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جبری تسلط کے ذریعہ قائم ہونے والی حکومت کے مقابلے میں عوامی انقلاب والی حکومت زیادہ قابل قبول تھی، اگرچہ اسلام کی مطلوبہ آئینی حکومت کی دونوں ہی مصداق نہیں ہیں، لیکن اھون البلیتین کے اصول پر عوامی حکومت میں خاندانی یا آمرانہ نظام حکومت کے بہ نسبت اظہار رائے کی آزادی زیادہ ہوتی ہے، اور ارباب حل وعقد اور اصحاب علم ودانش سے استفادہ کرنا یہاں نسبتاً آسان ہوتا ہے، اسی لئے امام صاحب نے آمرانہ اور جابرانہ نظام کے بالمقابل ہمیشہ عوامی نظام حکومت کی حمایت کی، بشرطیکہ اس کی باگ ڈور صالح اور قابل اعتماد ہاتھوں میں ہو، امام صاحب کے اس نظریہ کا اظہار ایک اور واقعہ میں زیادہ واضح طور پر ہوتا ہے:

ایک بار خلیفہ منصور نے اپنے دربار میں حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت ابن ابی ذویبؒ اور حضرت امام مالکؒ تینوں بزرگوں کو ایک ساتھ طلب کیا، تاکہ اپنی خلافت کے بارے میں ان کی رائے معلوم کرے، چنانچہ اس نے ان تینوں کے سامنے اپنی بات رکھی، حضرت امام مالکؒ نے تھوڑا نرم انداز اختیار فرمایا، حضرت ابن ابی ذویبؒ نے بہت سخت جواب دیا، اور حضرت امام ابوحنیفہؒ نے ارشاد فرمایا، اپنے دین کے لئے رہنمائی حاصل کرنے والا غصہ سے دور رہتا ہے، اگر آپ نے اپنے مفاد کے لئے ہم کو بلایا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کے پیش نظر خلوص اور رضائے الٰہی نہیں ہے، آپ کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم آپ کے ڈر سے آپ کے موافق طبع رائے دیں اور عام لوگوں کو یہ تأثر دیا جائے کہ یہ علماء ہماری خلافت اور نظام حکومت سے پوری طرح مطمئن ہیں، حالانکہ جب آپ نے خلافت حاصل کی تو اس وقت اہل افتاء میں سے دو آدمی کو بھی نہیں بلایا گیا، جبکہ

خلافت عام مسلمانوں کے مشورہ سے قائم ہوتی ہے۔۸۰

اس سے امام صاحب کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ صحیح اسلامی خلافت کی تاسیس کے لئے عوامی اجتماع کو جس میں اہل فتویٰ، ماہرین قانون اور اصحاب دانش کی بھی نمائندگی ہو ضروری سمجھتے ہیں، اس کے بغیر حکومت تو قائم ہوسکتی ہے، اور ثمرات کے لحاظ سے اس کو جائز بھی کہا جا سکتا ہے، مگر اس کو خلافت راشدہ نہیں کہا جا سکتا اور نہ اس سے وہ مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکتے ہیں جو روئے زمین پر اسلامی نظام کے قیام سے رب العالمین کو مطلوب ہیں۔

عوامی انقلاب ایک قوت قاہرہ ہے، اور اس کے ذریعہ جو حکومت قائم ہوتی ہے وہ شرعاً درست ہوتی ہے اور اس کی قیادت میں وہ تمام امور انجام دیئے جا سکتے ہیں جن کے لئے اسلامی حکومت کی ضرورت ہے، البتہ عوامی انقلاب کے ذریعہ برسر اقتدار آنے والے حکمراں کو چاہیئے کہ وہ ارباب علم وتقویٰ اور اصحاب فضل وفہم پر مشتمل ایک شورائی نظام قائم کرے، عوامی ووٹنگ کی شریعت اسلامی میں کوئی حقیقت نہیں ہے، تاہم اسلام اس کے ذریعہ قائم ہونے والی حکومتوں کو ناجائز نہیں کہتا، اسلام کے پاس اپنا ایک نظام العمل ہے، ایک دستور اور آئین ہے، اور دنیا کو اس کی بہر حال ضرورت ہے، تاکہ اسلامی نظام کے وہ تمام شعبے قائم اور جاری ہوں، جن سے یہ روئے زمین جنت نظیر بن سکتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسلام اپنے نظام کے علاوہ دنیا کے تمام نظاموں کو غلط قرار دیتا ہو، اور اگر عوام اور خواص کی شرکت سے حکومت عمل میں آتی ہے تو اس سے گو وہ نتائج حاصل نہ ہوں جو اسلامی نظام کا نصب العین ہیں، لیکن اس کے جواز اور اس سے حاصل شدہ ثمرات کی صحت شبہ سے بالاتر ہے، ...... دراصل اسلامی نظام حکومت میں طریقۂ انتخاب سے زیادہ قائم ہونے والی حکومت کا طور طریق، حکمراں کا دینی اور اخلاقی معیار اور حق وانصاف اور اقامت دین کے معاملے میں اس کی دلچسپی اور جدوجہد کی زیادہ اہمیت ہے، جیسا کہ پچھلے صفحات میں اشارہ کیا گیا کہ صحیح شرعی اصولوں کے مطابق امیر کا انتخاب ہو لیکن بعد میں اس کا طرز عمل درست بنیادوں پر قائم نہ رہ سکے، تو اسلام کی نگاہ

میں وہ غیر شرعی حکومت ہے اور نامناسب طریقے سے منتخب ہونے والا حکمراں حق و انصاف پر مبنی بہترین اسلامی حکومت قائم کر لے تو وہ جائز حکومت کہلانے کی مستحق ہوگی، واللہ اعلم بالصواب وعلمہٗ اتم واحکم۔

حواشی ومراجع

۱۔ التفسیر الکبیر للرازی، ج:۲۹ص ۲۴۲-۲۴۳ط دارالفکر بیروت ۱۹۸۱ء

۲۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۹، دارالفکر

۳۔ شرح العقائد النسفیة ص ۱۵ ط دار احیاء الکتب العربیة

۴۔ الاحکام السلطانیة ص ۵، دارالفکر ۱۴۰۴ھ

۵۔ دیکھئے جامع البیان للطبریؒ ج ۱، ص: ۱۵۷، الاحکام السلطانیة للماوردیؒ، ص: ۱۴، الاحکام السلطانیة لابی یعلیٰ ص: ۲۷، مقدمہ ابن خلدون ص: ۱۹۱

۶۔ الاحکام السلطانیة للماوردیؒ، ص: ۱۴، الاحکام السلطانیة لابی یعلیٰ ص ۲۷ط دارالقلم ۱۴۰۴ھ، مقدمہ ابن خلدون ص ۱۹۱

۷۔ طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۱۸۳، دار صادر ۱۴۰۵ھ

۸۔ صحیح البخاری مع فتح الباری ج ۱۳ص ۲۰۵ط دارالفکر

۹۔ منہاج السنة لابن تیمیة ج ۱، ص ۱۴۱، دارالکتب العلمیة بیروت

۱۰۔ بخاری شریف کتاب الاحکام ج ۲ ص ۹۰۱، حدیث نمبر ۲۴۱۶، مسلم شریف کتاب الامارة، ج ۱۲، ص ۲۰۹، حدیث نمبر ۴۸۲۸، دارالفکر مکتبة الریاض الحدیثة، ۱۴۰۱ھ

۱۱۔ مسند احمد، ج ۳۹، ص ۱۰۸، حدیث نمبر ۱۸۵۰۲، مصر، المعجم الکبیر للطبرانی، ج ۲۰، مکتبة العلوم والحکم، الموصل ۱۹۸۳ء

۱۲۔ صحیح مسلم، ج ۶، ص ۶، حدیث نمبر ۴۸۲۳، دارالجبل بیروت

۱۳۔ مصنف ابن ابی شیبة۔تحقیق محمد عوامة، کتاب الزہد، باب کلام عمرؓ، ج ۱۳، ص ۲۷۷، حدیث نمبر ۳۴۳۳۳، دارالسلفیة، ممبئی ۱۹۸۳ء

۱۴ صحیح مسلم، ج ۶، ص ۶، حدیث نمبر ۴۸۲۱، بیروت، بخاری، کتاب الاحکام، باب ما یکرہ من الحرص علی الامارۃ، ج ۴، ص ۳۳۰، حدیث نمبر ۷۱۴۸، مکتبۃ السلفیۃ القاہرۃ، سنن البیہقی الکبریٰ ج ۱۰ ص ۱۰۰ حدیث نمبر ۲۰۰۳۵ ط مکتبۃ دار الباز مکۃ المکرمۃ ۱۹۹۴ء

۱۵ ابوداؤد، کتاب الامارۃ، ج ۳، ص ۹۱، حدیث نمبر ۲۹۳۲، دار الکتاب العربی بیروت، سنن النسائی، ج ۵، ص ۲۲۶، حدیث نمبر ۸۷۴۶، دار الکتب العلمیۃ، بیروت

۱۶ بخاری، کتاب الاحکام، باب من سأل الامارۃ وکل الیہا، ج ۴، ص ۳۳۰، حدیث نمبر ۷۱۴۷، مکتبۃ السلفیۃ القاہرۃ

۱۷ سیرۃ عمر بن عبدالعزیزؒ للحافظ جمال الدین ابی الفرج عبدالرحمٰن بن الجوزیؒ ص ۵۱-۵۳، مطبعۃ المؤید مصر ۱۳۳۱ھ

۱۸ اخرجہٗ احمد ۲/۳۲۶ ط السلفیۃ واسنادہٗ ضعیف، المیزان للذہبی ۳/۴۰۲ ط الحلبی

۱۹ الاحکام السلطانیۃ للماوردیؒ، الروضۃ للنوویؒ ۱/۴۲ ط المکتب الاسلامی ۱۴۰۵ھ، المسامرۃ (لابن ابی شریف) شرح المسایرۃ لابن الہمامؒ ص ۳۲۰ ط المکتبۃ التجاریۃ مصر، الجامع لاحکام القرآن للقرطبیؒ ۱/۲۷۰ ط دار الفکر ۱۳۷۲ھ

۲۰ رواہ البخاری وأحمد والنسائی والترمذی فتح الباری ۸/۱۲۶ ط السلفیۃ

۲۱ ترمذی ۴/۵۲۹ حدیث نمبر ۲۲۶۶، ط داراحیاء التراث العربی بیروت، تہذیب الآثار للطبری ج ۱ ص ۱۱۳ ط مطبعۃ المدنی القاہرۃ

۲۲ الاحکام السلطانیۃ للماوردیؒ ص ۶، الروضۃ للنوویؒ ۱/۴۲، المسامرۃ شرح المسایرۃ لابن الہمامؒ ص ۳۲۰، الجامع للقرطبیؒ ۱/۲۷۰

۲۳ المصنف للشیخ احمد بن عبداللہ الکندیؒ م ۵۵۷ھ ج ۱۰ ص ۵۷ ط مطبعۃ عیسیٰ البابی عمان ۱۴۰۳ھ، الاحکام للماوردیؒ ص ۶، الاحکام لابی یعلیٰ ص ۲۱، ۲۲

۲۴ حاشیۃ ابن عابدین ۱/۳۸، ۴/۳۰۵ ط دار الفکر ۱۳۹۹ھ، الاحکام السلطانیۃ للماوردی ص ۶، جواہر الاکلیل علیٰ مختصر الامام خلیل للشیخ صالح الآبی الازہری ۲/۲۲۱ ط المکتبۃ الثقافیۃ بیروت، مغنی المحتاج للشربینی علی المنہاج للنوویؒ ۴/۱۶۸، ۱۶۹ ط دار المعرفۃ بیروت، شرح الروض

۴/۱۰۸، الانصاف ۱۰/۱۱۰ بحوالہ الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ بحث الامامۃ الکبریٰ

۲۵ المصنف للکندیؒ ج ۱۰ ص ۵۷، الاحکام للماوردیؒ ص ۶، الاحکام لابی یعلیٰ ص ۲۱، ۲۲

۲۶ الاحکام للماوردیؒ ص ۶، الاحکام لابی یعلیٰ ص ۲۰، الام للشافعیؒ ج ۱ ص ۱۶۱ ط دار المعرفۃ بیروت، اصول الدین للبغدادی ۲۷۵ ط مطبعۃ الدولۃ استنبول ۱۹۳۶ء، مآثر الانافۃ فی معالم الخلافۃ لاحمد بن علی القلقشندی م ۸۲۱ھ ج ۱ ص ۳۷ ط الکویت ۱۹۶۴ء، منہاج السنۃ لابن تیمیۃ ج ۱ ص ۱۳۴ ط دار الکتب العلمیۃ بیروت، الانصاف فیما یجب اعتقادہ ولا یجوز الجہل بہ لابی بکر بن الطیب الباقلانیؒ م ۴۰۳ھ ص ۶۹ ط موسیٰ الخانجی ۱۳۸۲ھ

۲۷ الماوردیؒ ص ۶، شرح المسلم للنوویؒ ج ۱۲ ص ۲۰۰ ط دار الفکر ۱۴۰۱ھ، فتح الباری لابن حجرؒ ج ۱۳ ص ۱۱۹

۲۸ غیاث الامم لامام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک الجوینیؒ م ۴۷۸ھ ص ۶۳ ط دار الدعوۃ الاسکندریۃ، مقدمہ ابن خلدون ص ۱۹۴

۲۹ اخرجہ الطیالسی ص ۱۲۵ ط دائرۃ المعارف النظامیۃ)واصلہٗ فی البخاری مع الفتح ۱۳/۱۱۴ ط السلفیۃ) بلفظ إن ھذا الامر من قریش ......

۳۰ کنز العمال للمتقی بہامش مسند الامام الاحمدؒ ۲/۱۴۲ ط مؤسسۃ الرسالۃ ۲۰۰۱ء، سنن الکبریٰ للبیہقی ج ۱۰ ص ۱۱۸ حدیث نمبر ۲۰۱۵۱ ط مکتبہ دار الباز ۱۹۹۴ء، المستدرک للحاکم ج ۴ ص ۱۰۴ حدیث نمبر ۷۰۲۳ ط دار الکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۹۰ء

۳۱ مسند الامام احمد ج ۱ ص ۲۶۳ حدیث نمبر ۱۰۸ ط مؤسسۃ الرسالۃ ۲۰۰۱ء

۳۲ مقدمہ ابن خلدون ص ۲۱۳

۳۳ الاحکام السلطانیۃ، ص ۴

۳۴ دیکھئے: اصول الدین للبغدادی ۲۷۷، مقدمہ ابن خلدون ۱۶۱ فصل ۲۶ ط المہدی

۳۵ حوالہ جات بالا، وعقائد نسفیہ ۱۴۵ ط دار احیاء الکتب العربیۃ

۳۶ حاشیۃ الدسوقی ۴/ ۲۹۸، الاحکام السلطانیۃ ص ۳، ۴

۳۷ مغنی المحتاج ۴/۱۳۱، اسنی المطالب ۴/ ۱۰۹، بحوالہ الموسوعۃ

۳۸۔ الاحکام لابی یعلیٰ ص ۲۴

۳۹۔ سیرت ابن ہشام ج ۴ ص ۳۰۸ ط دار الکتاب العربی ۱۴۰۹ھ، تاریخ الامم والملوک للطبری ج ۲ ص ۲۴۲ ط دار الکتب العلمیۃ بیروت ۱۴۰۷ھ، طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۶۱۶ ط دار صادر ۱۴۰۵ھ

۴۰۔ حاشیۃ الدسوقی ج ۴ ص ۲۹۸ ط دار احیاء الکتب العربیۃ عیسیٰ البابی الحلبی، المغنی ج ۸ ص ۱۰۷، الاحکام لابی یعلیٰ ص ۷

۴۱۔ حاشیۃ ابن عابدین للنوویؒ، ج ۱۰ ص ۴۳، المآثر للقلقشندیؒ، ج ۱ ص ۴۴، المسامرۃ شرح المسایرۃ لابن الہمام ص ۳۲۶، منہاج السنۃ لابن تیمیہؒ ج ۱ ص ۱۴۲) ۱/ ۳۶۹، الروضۃ

۴۲۔ المصنف للکندی ج ۱۰ ص ۱۰۱، الغیاث للجوینی ص ۵۳

۴۳۔ نہایۃ المحتاج للرملی ج ۷ ص ۴۱۰ ط دار الفکر ۱۹۸۴ء

۴۴۔ المآثر للقلقشندی ج ۱ ص ۴۳

۴۵۔ مغنی المحتاج ۴/ ۱۳۰، ۱۳۱، روضۃ الطالبین ۱۰/ ۴۳، اسنی المطالب ۴/ ۱۰۹، بحوالہ الموسوعۃ)

۴۶۔ الفصل فی الملل والاہواء والنحل لابن حزمؒ ۴/ ۱۸۳ ط دار الجبل بیروت

۴۷۔ التمہید للباقلانیؒ بحوالہ نصوص ص ۵۴، اصول الدین للبغدادیؒ ص ۲۹۳، الاحکام لابی یعلیٰ ص ۲۳

۴۸۔ فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۵۶

۴۹۔ الفصل لابن حزم ج ۵ ص ۵

۵۰۔ الاحکام السلطانیۃ ص ۵۰

۵۱۔ صحیح مسلم ج ۱۲ ص ۲۴۵

۵۲۔ تاریخ الخلفاء للسیوطیؒ ص ۱۷۰ ط دار الفکر العربی القاہرۃ

۵۳۔ صحیح البخاری مع فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۰۵ ط دار الفکر

۵۴۔ تفسیر مقاتل لمقاتل بن سلیمان بن بشیر (م ۱۵۰ھ) ج ۲ باب ۱۵ ص ۴۹۷ نسخہ الشاملہ

۵۵۔ صحیح البخاری مع فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۰۵

۵۶۔ منہاج الطالبین وبلاغ الراغبین للشقصیؒ ج ۸ ص ۴۴، الاحکام السلطانیۃ للماوردیؒ ص ۶،

الاحکام السلطانیۃ لابی یعلیٰؒ، ص ۲۳، المسامرۃ بشرح المسایرۃ لابن الھمامؒ وابن ابی شریفؒ ص ۲۸۱، المغنی للقاضی عبدالجبار ج ۲۰ ق ۱/۲۵۱ ط الدار المصریۃ، التاج للصنعانیؒ ج ۴ ص ۴۱۰ ط مکتبۃ الیمن الکبریٰ ۱۳۸۰ھ، الجامع للقرطبیؒ ج ۱ ص ۲۸۱

۵۷۔ المصنف ج ۱۰ ص ۹۵

۵۸۔ المصنف للکندیؒ ج ۱۰ ص ۹۵، شرح مسلم للنوویؒ ج ۱۲ ص ۲۰۵، المغنی لابن قدامۃؒ ج ۸ ص ۱۰۷ ط عالم الکتب بیروت، الغیاث للجوینیؒ ص ۴۴-۴۵

۵۹۔ المسامرۃ شرح المسایرۃ لابن الھمامؒ ص ۲۲۷

۶۰۔ صحیح البخاری مع شرح ابن بطال القرطبیؒ، کتاب الرجم ج ۸ ص ۴۵۴ ط مکتبۃ الرشد الریاض ۲۰۰۳ء، ومع عمدۃ القاری للعینیؒ ج ۳۴ ص ۲۴۸

۶۱۔ تاریخ الطبری ج ۲ ص ۶۹۶

۶۲۔ الاحکام السلطانیۃ للماوردیؒ ص ۶، الاحکام السلطانیۃ لابی یعلیٰؒ ص ۲۳، المسامرۃ لابن الھمام ۳۲۶، مقدمہ ابن خلدون ص ۲۱۰

۶۳۔ صحیح البخاری مع فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۰۵ ط دار الفکر

۶۴۔ منہاج السنۃ لابن تیمیۃ ج ۱ ص ۱۴۱، ط دار الکتب العلمیۃ بیروت

۶۵۔ الاحکام السلطانیۃ للماوردی، ص ۱۰

۶۶۔ صحیح البخاری مع فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۰۵

۶۷۔ تفصیل کے لئے دیکھئے الاحکام السلطانیۃ للماوردیؒ ص ۱۰

۶۸۔ مغنی المحتاج ۴/۱۳۱

۶۹۔ مغنی المحتاج ۴/۱۳۱، اسنی المطالب ۴/۱۰۹، ۱۱۰، الاحکام السلطانیۃ لابی یعلیٰ ص ۹، ۱۰، بحوالہ الموسوعۃ

۷۰۔ حاشیۃ ابن عابدین ۱/۳۶۹

۷۱۔ الاحکام السلطانیۃ ص ۹

۷۲۔ الاحکام السلطانیۃ لابی یعلیٰ ص ۷، ۸، حجۃ البالغۃ ۲/۱۱۱، حاشیۃ ابن عابدین ۳/۳۱۹، مغنی المحتاج ۴/۱۳۰، حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۴/۲۹۸

۷۳ے صحیح مسلم ۳/۹۴۴ط عیسی الحلبی

۷۴ے بخاری مع فتح الباری ۱۳/۵،مسلم مع النوویؒ ج ۱۲ص ۲۴۰

۷۵ے الاحکام السلطانیۃ لابی یعلیٰ ص ۲۳

۷۶ے حوالۂ بالا

۷۷ے المناقب لابن البزاریؒ ج ۲ ص ۷۲،الجصاص :۱/۸۱، الخیرات الحسان للمکیؒ :۱/۲۶۰ ،
ابوحنیفۃ حیاتہٗ وعصرہٗ لابی زہرۃ ط دار الفکر ص ۱۸۰

۷۸ے المناقب للمکیؒ ج ۱۰ص ۹۲

۷۹ے المناقب للمکیؒ ج ۲ص ۸۴بحوالہ ابوحنیفۃؒ حیاتہٗ لابی زہرۃ ص ۱۸۳ط دارالفکر

۸۰ے المناقب للبزاریؒ ج ۲ص ۱۶،ابوحنیفۃ - حیاتہٗ وعصرہٗ لابی زہرۃ ص ۱۸۵

☆☆☆

موجودہ پارلیمانی نظام اور اسلام کی شورائیت

کمال اختر قاسمی*

(جمہوریت) Democracy بادشاہوں کے سیاسی مظالم اور کلیسا کے مذہبی استبداد اور نامعقول تشدد کا ردعمل ہے، بادشاہوں نے اپنی سیاسی طاقت وقوت کو مستحکم کرنے کے لیے مظالم کی راہیں اختیار کرلی تھیں، ادھر ارباب کلیسا نے جو مقدمات کے فیصلے کا اختیار رکھتے تھے مذہبی استبداد اور اپنی تنگ ظرفی سے عوام کو سخت متنفر کردیا تھا، لوگ دوطرفہ مظالم سے تنگ آ کر بے لگام آزادی کا راستہ تلاش کرنے لگے، جس کے نتیجہ میں بادشاہوں اور ارباب کلیسا سے تنفر کے ساتھ خدا اور رسول کا تصور، مذہب اور اخلاقی اقدار پر مبنی تعلیمات اور ان تمام نظریات سے سخت نفرت کرنے لگے جو انھیں مذہبی ادارے سے ملتے تھے، بالآخر خانہ جنگی کا عجیب وغریب طوفان شروع ہوا، نتیجتاً ۱٦۸۸ء میں عوامی انقلاب کے بعد آزاد حکومت کی بنیاد رکھی گئی، آزاد حکومت کا طرز حکمرانی کیا ہو اس کے لیے اس زمانہ کے مفکرین نے مختلف طرز ہائے فکر کو پیش کیا، ۱٦۹۰ء میں ایک مغربی مفکر ''جان لاک'' نے "Civil Government" کے نام سے ایک کتاب شائع کی، اس میں انقلاب کے بعد طرز حکمرانی کا تفصیلی ڈھانچہ پیش کیا جس کو من وعن قبول کرلیا گیا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

> ''عوام کو مقتدر اعلیٰ اور مختار کل ہونے چاہئیں، ان کی خواہش اور مرضی کو سرچشمۂ قانون اور طاقت کا مرکز ہونا چاہیے، حکمران کو عوامی خواہشات کا پابند ہونا چاہیے، صحیح معاشرہ وہ ہے جس میں اختیار فرد واحد کے ہاتھ

---

* رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

میں نہ ہو بلکہ عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں ہو۔"[۱]

جمہوریت انگریزی لفظ Democracy کا ہم معنی ہے، جو یونانی زبان کے دوالفاظ Demos بمعنی عوام اور Kratos بمعنی حکومت سے مل کر بنا ہے، یعنی عوام کی حاکمیت۔

مشہور ماہرین "James macgego" اور "ڈیوڈ ہیلڈ" وغیرہ جمہوریت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(جمہوریت) Democracy کا لفظ سولہویں صدی عیسوی میں فرانسیسی سے انگریزی میں آیا، جو اصلاً یونانی زبان کے Demos بمعنی عوام اور Kratos بمعنی حکومت کا مجموعہ ہے، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ڈیموکریسی اس طرز حکومت کا نام ہے جس میں ملوکیت اور اشرافیت کے برعکس عوام خود حاکم ہوں۔[۲]

سترھویں صدی میں یہ لفظ باضابطہ طور پر سیاسی اصطلاح کی شکل میں استعمال کیا جانے لگا، بہت سے ممالک میں Direct Democracy یعنی راست جمہویت کا طرز اختیار کیا گیا جس میں عوام کو بذات خود اپنی حکومت چلانے کا اختیار دیا گیا۔[۳]

جمہوریت کی شکلیں

(راست جمہوریت) Direct Democracy:

جس میں عوام بذات خود اپنی حکومت چلاتی ہیں۔ موجودہ دور میں یہ طرز حکومت سوئزرلینڈ اور ولایات متحدہ کی چند قلیل آبادی والی بلدیات میں پائی جاتی ہے۔

(بالواسطہ جمہوریت) **Indirect Democracy**:

جس میں عوام اپنے نمائندے منتخب کر کے بالواسطہ حکومت چلاتی ہے۔

دور جدید میں کثیر آبادی والی مملکتوں کے وجود میں آ جانے سے عوام کی راست حکومت ممکن نہیں رہی اس لیے سیاسی نمائندگی کا طریقہ ایجاد ہوا اور نمائندوں کا انتخاب کر کے حکومت کی تشکیل کی جانے لگی، جس میں لوگوں کے منتخب نمائندے عوامی مفادات و

مرضیات کے مطابق ان کے دیے گئے حق اقتدار کو استعمال کر سکیں۔[۴]

جمہوریت کی تعریف

(جمہوریت) Democracy کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں، اس کی مشہور تعریف ابراہیم لنکن کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

> ''جمہوریت سے مراد عوام کی حکومت عوام کے لیے اور عوام کے ذریعہ ہے۔''

مشہور امریکی ماہر سیاست "Joseph Schum Peter" کے مطابق:

> ''جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جس میں مملکت کے اقتدار حاکمیت کو کسی خاص طبقہ یا طبقات کے تصرف میں نہ دے کر بحیثیت مجموعی عوام میں ودیعت کیا جائے۔''[۵]

جدید و قدیم ماہرین سیاست کے مطابق جمہوریت دراصل عوام کی مرضی کی تابع حکومت کا نام ہے۔

ایک ماہر سیاست "Michel Stewert" جمہوریت کی حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

> ''ایک مکمل جمہوریت تمام معاملات میں تمام شہریوں کے مشورہ سے چلتی ہے، یہ اپنے شہریوں کو نہ صرف اجتماعی فیصلوں میں شرکت کا احساس دلاتی ہے بلکہ انھیں ان فیصلوں کی حقیقت پر اثر انداز ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔''[۶]

پارلیمانی نظام

پارلیمانی نظام جمہوری حکومت کا ایک نظام ہے جس میں مجلس عاملہ کے وزراء پارلیمینٹ اور مقننہ کو جوابدہ ہوتے ہیں، جس میں ایک کابینہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک پارلیمنٹ کے تحت کام کرتی ہے، اس نظام میں اختیارات عموماً وزیر اعظم کو ہوتے ہیں،

کابینہ پارلیمانی نظام حکومت کا ایک حصہ ہے جو عوام کے ذریعہ منتخب نمائندوں میں سے وزراء پر مشتمل ہوتی ہے، جس کی سربراہی عموماً وزیراعظم کرتا ہے۔[۷]

پارلیمنٹ عوام کی حاکمیت کی عملی صورت ہے، لہذا اسے ہر طرح دستور وضوابط اور قانون سازی کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔[۸]

پارلیمانی نظام کی بنیاد

رائے عامہ:

رائے عامہ سے مراد عوام کی معتد بہ تعداد کے خیالات و مزعومات ہے جو حکومت کی پالیسی پر اثر انداز ہوں، پارلیمانی نظام یا پارلیمانی جمہوریت کی بنیاد رائے عامہ پر ہے۔ ارکان حکومت کے انتخاب سے لے کر قانون سازی اور اس میں ترمیم و تنسیخ رائے عامہ کی بنیاد پر ہی عمل میں آتی ہے۔

رائے عامہ کے حصول کے ذرائع

مسئولین کا ذاتی مشاہدہ، ادراک و مطالعہ سے عام رجحانات کا اندازہ لگانا۔ تحریر دستاویزوں اور اخبار ورسائل کے مواد کی تحلیل اور ان کا تجزیہ کرکے نتائج حاصل کرنا، سیاسی نمائندوں اور ارکان پارلیمنٹ کی آراء اور مشاہدات اور لابیوں اور پریشر گروہوں کے خیالات سے اندازہ کرنا، سیمپل سروے کے ذریعہ لوگوں کے رجحانات کو معین کرنا وغیرہ۔

سیاسی پارٹیاں

پارلیمانی نظام کی دوسری اہم بنیاد سیاسی پارٹیاں ہے، جو سماج اور حکومت کے درمیان ثالث اور رابطہ کے طور پر کام کرتی ہیں۔

سیاسی پارٹیاں دراصل انسان کا وہ گروہ ہے جو عوام کو مختلف مفادات کی طرف متوجہ کرکے ان کی رائے کو اپنے حق میں استعمال کرتا ہے۔ لوگوں کی رائے سے منتخب ہوکر

برسر اقتدار آتا ہے، اور یہی پارلیمنٹ کا ممبر ہوتا ہے۔

سیاسی جماعت سیاسی گروہ بندی کا نام ہے جو ریاست کی حکومت میں سیاسی قوت کے حصول کے لیے تشکیل دی جاتی ہے، ریاست میں انتخابی مہم، عوامی احتجاجی مظاہروں کی مدد سے اپنی موجودگی اور سیاسی طاقت کا اظہار کرتی ہے، سیاسی جماعتیں اکثر اپنے نظریات منصوبہ جات تحریری شکل میں عوام کے سامنے پیش کرتی ہیں، جو کہ اس جماعت کا منشور کہلاتا ہے، اس کا مقصد اقتدار کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔[9]

حزب اختلاف اور حزب اقتدار

پارلیمنٹ میں حزب اختلاف اور حزب اقتدار دو مستقل گروپ ہوتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے سازشی حد تک متحارب رہتے ہیں۔ ہر جمہوری ملک کی مجلس قانون ساز میں مختلف پارٹیاں ہوتی ہیں، جن میں سے ایک یا ایک سے زیادہ جماعتیں آپس میں ملی جلی حکومت قائم کر لیتی ہیں، باقی جو جماعتیں مجلس قانون سازی میں رہ جاتی ہیں انہیں برسر اقتدار جماعت سے اصولی اختلافات ہوتے ہیں، جن کی بنا پر وہ بالعموم حکومت وقت کی پالیسیوں پر معترض رہتی ہیں۔ انھیں حزب اختلاف کہا جاتا ہے۔[10]

اسلام کا شورائی نظام

اسلامی نظام کی ماہیت وحقیقت سے قبل یہ ذہن نشیں کرنا ضروری ہے کہ یہ محض اقتدار اعلیٰ کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ رضائے الٰہی اور انسانیت کی صلاح وفلاح کا ذریعہ ہے، کیونکہ اسلام میں آخرت کی کامیابی کو اصل اصیل قرار دیا گیا ہے جو باطنی پاکیزگی اور رضائے الٰہی کے حصول پر مبنی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"تِلْکَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوّاً فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَاداً وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ" (قصص:۸۳)

(ہم دار آخرت انہیں کے حصہ میں دیتے ہیں جو زمین میں برتری اور فساد کے طالب نہیں ہیں، اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔)

اسی لیے اسلامی نظام نہ تو طبقاتی اور قومی مملکت سے میل کھاتا ہے اور نہ ہی اس میں جاگیردارانہ جبر و استبداد اور سرمایہ دارانہ جوع البطنی کی گنجائش ہے، بلکہ سراسر رضائے الٰہی اور فلاح انسانی کے تصور پر مبنی ایک منفرد نظام ہے، اس لیے اسلام کا اصول حکمرانی یکسر منفرد ہے۔

مجموعی طور پر اسلامی نظام مندرجہ ذیل بنیادوں پر قائم ہے:

توحید و ربوبیت اور حاکمیت الٰہیہ کا اقرار، امامت عادلہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، عدل اجتماعی، مساوات بین الناس، شوریٰ، شخصی آزادی اور شخصی ذمہ داری اور اقتدار طلبی کی ممانعت۔

اسلامی نظام کی بنیاد حاکمیت الٰہیہ پر

اسلامی نظام کی بناء اس بات پر ہے کہ حاکمیت کا اعلیٰ مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، نص قرآنی کے مطابق اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا خالق ہے، سارا نظام کائنات اس کے اختیار میں ہے، وہ حاکم ہے اور سب محکوم، لہٰذا انسانی زندگی میں حکمرانی اسی کی مانی جائے گی، اخلاقی اقدار کے حسن و شر کی تعیین اور قانون سازی کا اختیار اسی کو حاصل ہوگا۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ بات کہی گئی ہے، مثلاً:

”أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ“ (مائدہ:۵۰)

(کیا یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، حالانکہ جو اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ کے فیصلے سے بہتر کسی کا فیصلہ نہیں ہے۔)

”إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لاَ يَعْلَمُونَ“ (یوسف:۴۰)

(اللہ کے علاوہ کسی کو فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے، اس کا حکم ہے کہ اس کے علاوہ تم کسی کی اطاعت نہ کرو، یہی سیدھا اور راست طریقہ ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔)

قرآن کریم کے نزول کا خاص مقصد یہ بتایا گیا کہ اسی کی روشنی میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے:

”وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ“ (بقرہ: ۲۱۳)

(اور ان کے ساتھ سچی کتاب اتاری تا کہ لوگوں کے اختلافی امور میں فیصلہ کیا جا سکے۔)

دستور اساسی

حکومت کے قواعد وضوابط جو تحریری شکل میں موجود ہوں اسے دستور یا آئین کہا جاتا ہے، جمہوری نظام میں دستور سازی کا مکمل اختیار عوامی نمائندگان پر مشتمل پارلیمنٹ کو دیا گیا ہے اور اس کا پابند بنایا جاتا ہے کہ وہ دستور عوام کی مرضیات اور ان کی خواہشات پر مبنی ہو، گویا جمہوری نظام میں دستور وہی ہے جو عوام کی اکثریت کی خواہش ہو۔

اسلامی نظام میں دستور بنیادی قوانین کو کہا جاتا ہے جن میں عوام کی خواہشات اور ان کی مرضی کا کوئی دخل نہ ہو، بلکہ قرآن کہتا ہے کہ ہر قوم کو مذہب و شریعت کی شکل میں ہمیشہ بنیادی ضابطۂ حیات اور آئین حاصل رہا ہے اور عوام کی بے جا خواہشات کی تکمیل کے لیے اساسی آئین میں تبدیلی ہی اس قوم کی تباہی کا ذریعہ بنی ہے۔

”لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجاً“ (مائدہ: ۴۸)

(تم میں سے ہر قوم کے لیے ہم نے ایک شریعت اور آئین مقرر کیا ہے۔)

”لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكاً هُمْ نَاسِكُوهُ“ (حج: ٦٧)

(ہر امت کے لیے ہم نے ضابطۂ حیات مقرر کیا تھا جس پر وہ چلیں۔)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے بارے میں کہا گیا:

"وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا سَأُرِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ" (اعراف:۱۴۵)

(اور ہم نے ان کے لیے تختیوں پر ہر طرح کے ناصحانہ دستور اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔ (اور ان کو یہ حکم دیا کہ) اس کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور اپنی قوم کو اس احسن ترین آئین کو اختیار کرنے کا حکم دو، میں تمھیں عنقریب نافرمانوں کے علاقہ دکھادوں گا۔)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کے تعلق سے مذکور ہے:

"وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ" (مائدہ:۴۷)

(اور اہل انجیل پر لازم ہے کہ اللہ نے جو کچھ اس میں نازل کیا ہے اسی کے مطابق فیصلہ کریں، اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔)

اسلامی نظام میں ریاست و معاشرہ کی تعمیر و تنظیم میں مذہب کا بنیادی کردار ہے۔ قیام حکومت بھی ایک مذہبی فریضہ ہے جس میں یہ مطالبہ ہے کہ انسان اللہ کے عطا کردہ آئین و دستور کی روشنی میں سیاسی وسماجی، اخلاقی و معاشرتی تمام امور کو انجام دے، کیونکہ مذہب کے بغیر انسانوں کی تنظیم ممکن ہی نہیں ہے جو حکومت کی اصل بنیاد ہے۔

بہت سے مغربی مفکرین جن کے یہاں نہ خدا کا تصور ہے اور نہ مذہب سے سروکار، لیکن حقائق بینی کی بنیاد پر انھیں بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا۔

مثلاً ایک مشہور نظریہ ساز مفکر "Toynbee Arnold" اپنی کتاب "A study of history" میں رقمطراز ہے:

''مذاہب اپنے پیروکاروں میں سماجی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہیں، انسانی اخوت کا تصور خدا کے تصور پر ہی قائم ہے، اگر انسانی خاندان سے خدا کو باہر نکال دیا جائے تو انسانیت کو اخوت کی بنیاد پر منظم کرنے کا کوئی امکان باقی ہی نہیں رہ جاتا۔''[۱۱]

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی تصورات کے بغیر اخلاقی اقدار پر مشتمل سوسائٹی کی تشکیل ایک ناکام کوشش ہے، تاریخ کے کسی دور میں ایسا معاشرہ وجود میں نہیں آیا جہاں مذہب کے بغیر با اخلاق زندگی گذارنے میں کامیابی ملی ہو۔

ایک اور مغربی مفکر "Ariel" اپنی کتاب "Lesson For History" میں اعتراف کرتا ہے:

''تاریخ کے کسی بھی زمانہ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی معاشرہ مذہب کی اعانت کے بغیر اخلاقی زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہوا ہو۔''[۱۲]

اسلام کا دستور اساسی

اسلامی نظامِ سیاست میں بنیادی اصول اور محکم ہدایات پر مشتمل قرآن کو اول ترین دستوری ماخذ قرار دیا گیا ہے، اس میں موجود تمام اصول وضوابط آفاقی حیثیت کے ہیں، جو ہر طبقے اور ہر زمانے کے تمام انسانوں کے مناسب تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ان کی انفرادی واجتماعی زندگی کی کامیابی کے لیے پوری طرح ضامن ہیں۔

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اللہ کے رسول ﷺ نے ایک مثالی اور منظم ریاست قائم کرکے اس دستور اساسی کو عملی طور پر پیش کرکے دکھا دیا، تاکہ آنے والی امت اس سے استفادہ کرکے قرآنی دستور کو دنیا میں نافذ کر سکے۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس کا مطالبہ کیا گیا ہے: مثلاً:

''وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ

الْكِتَابِ وَمُهَيْمِناً عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ وَلاَ تَتَّبِعْ أَهْوَاءهُمْ عَمَّا جَاءكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجاً'' (مائدہ:۴۸)

(اور ہم نے تمہاری طرف سچی کتاب اتاری جو الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ ونگہبان ہے، لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو، اور جو حق تمہارے پاس آ چکا ہے اس سے منہ موڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو، ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور راہِ عمل مقرر کی ہے۔)

''وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ وَلاَ تَتَّبِعْ أَهْوَاءهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللّهُ إِلَيْكَ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللّهُ أَن يُصِيبَهُم بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ وَإِنَّ كَثِيراً مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ. أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ'' (مائدہ:۴۹ تا ۵۰)

(اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو، اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو، ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تمہیں فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے، پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے ان کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مصیبت میں مبتلا کرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے، اور یہ حقیقت ہے ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں، (اگر یہ لوگ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں تو) کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔)

قرآن کریم کو دستور اساسی کے طور پر نافذ کرنے کی احادیث میں بھی متعدد مقامات پر تاکید آئی ہے، مثلاً:

"عن علیؓ - کتاب اللہ فیه نبأ ما قبلکم وخبر ما بعدکم وحکم ما بینکم هو الفصل لیس بالهزل، من قال به صدق ومن عمل به اجر و من حکم به عدل"[۱۳]

(یہ اللہ کی کتاب ہے جس میں گزشتہ قوم کے حالات ہیں، اور بعد میں آنے والی قوموں کی خبریں ہیں، اور تمہارے درمیان فیصلہ کرنے کا ذریعہ ہے، یہ کوئی مذاق نہیں ہے، جس نے اسی کی بات کی وہ سچا ہے، جس نے اس پر عمل کیا اس کو اجر دیا جائے گا، اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا وہی عدل کرنے والا ہے۔)

"عن ابی ایوب الانصاریؓ قال قال رسول اللہ ﷺ : علیکم بکتاب اللہ احلّوا حلاله وحرّموا حرامه"[۱۴]

(اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: تم اللہ کی کتاب کو لازم پکڑو، اس کی حلال کی ہوئی چیز کو حلال اور حرام کو حرام سمجھو۔)

شوریٰ

شوریٰ اسلامی شریعت کا اساسی ضابطہ ہے، نہ صرف اماموں کے انتخاب بلکہ تمام اہم اجتماعی امور میں فیصلے کی بنیاد شوریٰ پر ہے۔

قرآن مجید میں کہا گیا:

"وامرهم شوریٰ بینهم" (الشوریٰ:۳۸)

(ان کے سارے امور شوریٰ کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں۔)

ایک دوسری آیت میں باضابطہ اللہ کے رسول ﷺ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ" (آل عمران:۱۵۹)

(اللہ کی رحمت کی وجہ سے آپ لوگوں کے لیے نرم ہیں اور اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ سے الگ ہوجاتے، ان سے عفو و درگذر کا معاملہ کیجیے اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعاء کرتے رہیے۔ اور اہم معاملے میں ان سے مشورہ کیجئے، مشورہ کے بعد جب کسی رائے کا عزم و ارادہ ہوجائے تو اللہ پر بھروسہ کیجئے، اللہ تعالیٰ بھروسہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔)

شوریٰ کے ثبوت کے لیے یہ آیت انتہائی اہم ہے، اللہ کے رسول کو مشورہ کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا تاکہ امت میں شورائیت کا طریقہ رائج رہے۔

شورائی نظام کے قیام کے لیے اللہ کے رسول نے بڑی تاکید فرمائی ہے، اور اس روئے زمین سے خیر کے حصول اور شر سے نجات یعنی اسلامی ریاست اور صالح معاشرے کے بنیادی ڈھانچے کی تشکیل کے لیے جن اہم ترین اسباب کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں سے ایک شوریٰ کے ذریعہ معاملہ کا تعین کرنا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

"اذا كانت أمراء كم خياركم وأغنياء كم سمحاء كم وأموركم شورىٰ بينكم فظهر الارض خير لكم من بطنها، وإذا كانت أمراء كم شراركم و أغنياء كم بخلاء كم وأموركم إلى نساء كم فبطن الارض خير كم من ظهرها". [۱۵]

(جب تمہارے حکمراں تم میں سے بہتر لوگ ہوں اور تمہارے دولت

مند لوگ سخی ہوں، اور تمہارے معاملات باہمی مشورہ سے طے کیے
جاتے ہوں تو زمین کی پشت تمہارے لیے اس کی پیٹ سے بہتر ہوگی۔
لیکن تمہارے حکمراں تم میں سے بدترین لوگ ہوں اور تمہارے دولت
مند لوگ بخیل ہوں اور تمہارے معاملات عورت کے سپرد ہوں (اصل
فیصلہ انھیں کا ہو) تو زمین کا پیٹ تمہارے لیے اس کی پشت سے
بہتر ہوگا۔)

ممبرانِ شوریٰ کا انتخاب

شوریٰ اسلامی نظام کی انتہائی حساس مجلس ہے، جس کے مشورے کی روشنی میں اسلامی نظام کے تمام امور طے پاتے ہیں، اس مجلس کے ممبران پر اسلامی نظام کی بقاء کا انحصار ہوتا ہے، اس لیے اس کے ممبران کا انتخاب اسی قدر حساس اور انتہائی اہم معاملہ ہے، لہٰذا ان کے انتخاب کو عوام کی رائے اور ان کی خواہشات پر چھوڑ دینا، عوام کے ہر فرد عامی اور ماہرین علم وفن، امانت دار اور خائن، مفاد پرست اور انسانیت کی فلاح کے لیے اپنے مفاد کو قربان کر دینے والا، مختلف قسم کے سنگین جرائم کو انجام دینے والے اور شریف الطبع، فتنہ وفساد پھیلانے والے اور مصلحین ہر ایک کی رائے اور مشورہ کو برابر سمجھنا عقل و خرد کے کسی معیار کو متعین نہیں کرتا، بیشتر انسان ظن وخیالات کے دلدادہ ہوتے ہیں، ان سے دنیا کی تعمیر کے بجائے تخریب کو فروغ ملتا ہے، اجتماعی معاملات کو اکثریت کی خواہشات کے حوالہ کر دیا جائے تو اجتماعی مفاسد اور اخلاقی تباہی کے علاوہ کوئی قیمتی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا، قرآن کریم میں یہی بات ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

"وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ" (الانعام:۱۱٦)

(اگر آپ زمین میں بسنے والوں میں اکثریت کی بات مان لیں تو یہ
آپ کو اللہ کے راستہ سے گمراہ کر دیں گے، یہ تو صرف ظن وگمان پر چلتے

ہیں اور قیاس آرائیوں سے کام لیتے ہیں۔)

شعور و بصیرت کے لحاظ سے تمام انسان برابر نہیں ہو سکتے، اس لیے تمام انسانوں کی رائے بھی برابر نہیں ہو سکتی:

"قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ" (الزمر:۹)

(آپ کہہ دیجیے کہ کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں، عقل والے ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔)

"قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَى وَالْبَصِيرُ" (الانعام:۵۰)

(آپ کہیے کہ کیا اندھے اور بصارت رکھنے والے برابر ہو سکتے ہیں۔)

پاکباز اور اعلیٰ اقدار کے حاملین اور بدکردار اور بداخلاق لوگ برابر نہیں ہو سکتے، اگرچہ تعداد میں بدکردار ہی زیادہ ہوں:

"قُل لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ" (المائدہ:۱۰۰)

(آپ کہہ دیجیے کہ بدکردار اور پاکباز برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ بدکردار کی کثرت تمھیں تعجب میں ڈال دے۔)

عوام کی اکثریت کی رائے پر فیصلہ کرنے کے بجائے ماہرین و مدبرین اور اربابِ بصیرت سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ارکان شوریٰ کی اہلیت کے شرائط

ارکان شوریٰ کے لیے چند بنیادی اور اصولی شرائط ہیں جن کی پابندی ارکان شوریٰ میں ضروری ہے۔

(۱) ایمان: اسلامی نظام ایک نظریاتی اور اصولی نظامِ سیاست ہے، لہٰذا اس کے نظریات پر یقین و ایمان ضروری ہے۔

(۲) اسلامی دستور اساسی پر دسترس۔

کسی بھی ریاست کے ارکان کے لیے ضروری ہے اس کے دستور اساسی پر گہری نظر ہو، اللہ کے رسول نے حضرت علیؓ کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"عن علی قلت یا رسول اللہ ان نزل بنا امر لیس فیه بیان امر ولا نهی فما تامرنی؟ قال شاوروا فیه الفقهاء العابدین ولا تمضوا فیه رأی خاصة"[۱۶]

(حضرت علی کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے پوچھا اگر ہمارے درمیان کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس میں کوئی امر یا نہی (قرآن وسنت میں) نہیں ہو تو ایسے واقعہ کے بارے میں آپ کیا حکم دیتے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ اس کے بارے میں عبادت گذار ماہرین شریعت سے مشورہ کرلیا کرو، اور انفرادی رائے کو اختیار نہ کرو۔)

(۳) امانت ودیانت:

ممبران شوریٰ کے انتخاب کے لیے تیسری اہم شرط یہ کہ وہ امانت ودیانت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوں، وہی شخص شوریٰ کی رکنیت کا اہل ہوسکتا ہے جس کی امانت داری کی مثالیں دنیا کے سامنے ہوں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

"المستشار مؤتمن"[۱۷]

(جس سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ امانت دار ہی ہوتا ہے۔)

کسی سے مشورہ لینا امانت ہے، لہٰذا اسے صحیح مشورہ دینا چاہیے، اگر غلط مشورہ دیا تو اس نے خیانت کی۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

"من استشاره اخوه المسلم فاشار علیه بغیر رشد فقد خانه"[۱۸]

(جس شخص سے کسی نے مشورہ طلب کیا اور اس نے غلط مشورہ دیا تو گویا

اس نے اپنے بھائی کے ساتھ خیانت کی۔)

امانت کی ادائیگی کے متعلق قرآن کریم میں ایک جگہ حکم دیا گیا ہے:

"إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا" (النساء:۵۸)

(اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو۔)

خلفائے راشدین کے یہاں انھیں اوصاف کے حاملین کو ممبران شوریٰ کے لیے رکھا جاتا تھا:

"کانت الائمة بعد النبی یستشیرون الامناء من اهل العلم فی الامور المباحة لیاخذوا باسهلها فاذا وضح الکتاب والسنة لم یتعدوه إلیٰ غیره اقتداء بالنبی"[۱۹]

(اللہ کے رسول ﷺ کے بعد مسلمانوں کے ائمہ (خلفاء راشدین) ان لوگوں سے مشورہ لیا کرتے تھے جو اپنی دیانت و امانت کے لحاظ سے قابل اعتماد ہوتے تھے، اور جو اہل علم تھے اور یہ مشاورت غیر منصوص معاملات میں اس لیے ہوتی تھی تاکہ آسان اور مفید ترین راہوں کو اختیار کیا جاسکے، جن معاملات میں قرآن وسنت کے اندر وضاحت مل جاتی تھی ان سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتے تھے، بلکہ اللہ کے رسول کی پیروی کرتے تھے۔)

باطنی پاکیزگی اور خوف آخرت

اسلامی نظام میں یہ ضروری ہے کہ شوریٰ کے افراد باطنی پاکیزگی اور خوفِ آخرت سے متصف ہوں، وہ دنیا طلبی اور عیش وعشرت کے مقصد سے اس عہدے پر براجمان نہ ہوں، بلکہ انسانیت کی فلاح و بہودگی کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوں، باطنی پاکیزگی اور آخرت کے خوف کے استحضار کے علاوہ کوئی اور خارجی طاقت نہیں جو برسر اقتدار لوگوں کو عیش وتعیش کی راہ سے ہٹا کر انسانیت کی فلاح و بہودگی کا دلدادہ بنادے، اس لیے ہر

صاحب اقتدار کے لیے اس کا استحضار ضروری ہے، تاکہ وہ بدعنوانی، اور مختلف قسم کے جرائم سے دور رہ سکیں۔

”عن عبداللہ عن النبی ﷺ قال: إن المومن یریٰ ذنوبہ کانہ قاعد تحت جبل نخاف ان یقع علیہ وان الفاجر یریٰ ذنوبہ کذباب مرّ علیٰ انفہ فقال بہ ھکذا“[۲۰]

(اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: مومن اپنے گناہوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے وہ کسی پہاڑ کے نیچے بیٹھا اور ڈر رہا ہو کہ کہیں وہ اس کے اوپر نہ گر پڑے اور فاجر و بدکار اپنے گناہوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے کوئی مکھی اس کے سر پر سے گذرتی ہے اور وہ اس کو اڑا دیتا ہے۔)

ایک مشہور فلسفی "Voltaire" جو اگرچہ مذہب سے جذباتیت کی حد تک بے زار ہے لیکن تحقیق و جستجو کے نتیجہ میں اس نے بڑے پتے کی بات کہہ دی کہ:

”خدا اور آخرت کا تصور اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ وہ اخلاقیات کے لیے مفروضے کا کام دیتا ہے، صرف اسی کے ذریعہ سے بہتر اخلاق کی فضا پیدا کی جاسکتی ہے، اگر یہ عقیدہ ختم ہو جائے تو حسنِ عمل کے لیے کوئی محرک باقی ہی نہیں رہتا، اور اس طرح سماجی نظام کا باقی رہ جانا ناممکن ہو جاتا ہے۔“[۲۱]

عوامی نمائندگی

اسلام کے شورائی نظام میں عوام کے مسائل شوریٰ تک لانے کے لیے عوامی نمائندگی ضروری ہے، تاکہ عوام کے مسائل ارباب حل وعقد کے سامنے پیش کیے جاسکیں۔

اسلامی نظام میں عوامی نمائندے کے انتخاب میں بھی تمام عوام کی آراء کو یکساں نہیں مانا جاتا ہے، بلکہ یہاں بھی نمائندوں کی امانت و دیانت کی شہادت اور اس کی باطنی پاکیزگی کے ساتھ تدبیر سیاست اور امور مملکت سے پوری طرح واقفیت ضروری

ہے، اللہ کے رسول نے جہاں عوامی نمائندگی کو ضروری قرار دیا وہیں انھیں احساس ذمہ داری کی تلقین کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”ان العرافة حق ولا بد للناس من العرفاء ولكن العرفاء في النار.“ ۲۲

(علاقائی نمائندگی ضروری ہے، اور لوگوں کے لیے نمائندے مقرر کرنا ضروری ہے، لیکن برے نمائندے جہنم میں ہوں گے۔)

عریف اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اپنے محلے یا شہر کا منتظم اور ان کے معاملات کا ذمہ دار ہو، امیر اسی کے ذریعہ محلے یا شہر کے حالات معلوم کرتا ہے۔ اسی کو نقیب بھی کہا جاتا ہے۔ ۲۳

صاحب حل وعقد

عوامی نمائندگی صاحب حل وعقد کے ذریعہ کی جاتی ہے، یہ اپنی دیانت وامانت اور علم وفن میں مہارت کی بنیاد پر منتخب ہوتا ہے، دیانت داری کی بنیاد پر اسے قوم کا اعتماد حاصل ہوتا ہے، یہی لوگ عوام کے مسائل و احوال مجلس شوریٰ میں پیش کرتے ہیں اور قرآن وسنت اور ارباب عقل ودانش کی رائے کی بنیاد پر فیصلے کیے جاتے ہیں۔

اسی کو قرآن میں ''اولوالامر'' کہا گیا ہے۔

امام رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”المراد بقوله اولی الامر اهل الحل و العقد من الامة“۔ ۲۴

(اولوالامر سے مراد امت کے اہل حل وعقد ہیں)

شیخ محمد عبدہ اپنی کتاب ''الاسلام والتجدید فی مصر'' میں تحریر فرماتے ہیں:

”قرآن میں مذکور ''اولوالامر'' سے مراد وہ صاحب بصیرت اور صاحب عقل و دانش لوگ ہیں جنھیں اسلام کی اصطلاح میں اہل شوریٰ اور اہل حل وعقد کہا جاتا ہے۔“ ۲۵

حواشی ومراجع

۱۔ اسلامی سیاست، از گوہر رحمٰن، ص۸۰، ناشر: مکتبہ ذکریٰ، رام پور، سن اشاعت غیر مذکور

۲۔ Government by The People, New Youk - 1953, p:33,34

۳۔ حوالہ سابق: Government by The People

۴۔ Soltau, An introduction to politics p:179

۵۔ Captalism, Socialism and Deomcracy New york, 1948

۶۔ Modern Forms of Government, London, 1959, p:56

۷۔ Justin Beach & society politics, Eitow culture

۸۔ An introduction to politics P:179

۹۔ ملاحظہ کیجیے: دائرۃ المعارف، وکیپیڈیا، بعنوان، سیاسی جماعتیں

۱۰۔ بعنوان: wikipedia. org. opposition

۱۱۔ Odridgement, DC somervell London: oxford universty press

۱۲۔ New york, Simonand Schuster, 1968

۱۳۔ ترمذی، ابواب فضائل القرآن

۱۴۔ الترغیب للمنذری، ج۱، ص:۳۸، مطبوعہ: مصر

۱۵۔ ترمذی، ابواب الفتن

۱۶۔ رواہ الطبرانی فی الکبیر وقال الہیثمی: رجالہ موثون من اہل الصحیح

۱۷۔ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی المشورہ

۱۸۔ ابوداؤد، باب العلم

۱۹ الدارمی، باب الفتیا، جلد ۱، ص ۵۸، طبع قاہرہ، ۱۹۷۸ء

۲۰ بخاری، کتاب الدعوات، باب التوبۃ

۲۱ Windelleand, History of Philosophy, p:496

۲۲ ابوداؤد، جلد ۳، ص ۳۴۸

۲۳ دیکھئے: لسان العرب، ابن منظور افریقی، مادہ: عرف، ونقب

۲۴ تفسیر کبیر، ج ۱، ص ۱۱۴، بذیل آیت: اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم

۲۵ بحوالہ: ثلاثۃ من اعلام الحریۃ، ص ۱۶۰



اسلامی نظامِ حکومت پر کیے جانے والے اعتراضات

(علی عبدالرازق کی کتاب 'الاسلام واصول الحکم' کی روشنی میں)

محمد رضی الاسلام ندوی*

اسلام زندگی کے جملہ پہلوؤں میں انسانوں کی رہ نمائی کرتا ہے۔ اس نے جس طرح یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، رسولوں اور ان پر نازل ہونے والی کتابوں، فرشتوں، قیامت، حشر ونشر، حساب و کتاب اور جنت وجہنم وغیرہ سے متعلق کیا عقائد ہونے چاہئیں؟ اللہ تعالیٰ کی عبادت کس طرح کی جائے؟ اس کے سامنے جبینِ نیاز کس طرح جھکائی جائے؟ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور دیگر مراسمِ عبودیت کس طرح بجالائے جائیں؟ ٹھیک اسی طرح اس نے اس کی بھی مکمل وضاحت کردی ہے کہ انسانوں کے باہمی معاملات کس طرح انجام پائیں؟ وہ ایک دوسرے کے حقوق کیسے ادا کریں؟ ان کی باہم معاشرت کیسی ہو؟ ان کے درمیان لین دین اور تجارتی معاملات کن بنیادوں پر استوار ہوں؟ اگر ان میں کچھ اختلافات پیدا ہوجائیں تو انھیں کیسے حل کیا جائے؟ کوئی شخص دوسرے پر ظلم وزیادتی کرے، اس کا حق نہ دے یا اس کا مال غصب کرلے تو ظالم کو اس کے ظلم سے کیسے روکا جائے اور مظلوم کی دادرسی کیسے کی جائے؟ انسانی معاملات کی صحیح طریقے سے انجام آوری کے لیے اس نے حکم دیا کہ ایک سربراہ ہو، جو تمام معاملات کو نظم واجتماعیت کی لڑی میں پروئے، تمدن کے تمام ادارے قائم کرے اور ان کی نگرانی رکھے کہ وہ صحیح طریقے سے کام کررہے ہیں یا نہیں؟ قضا کا نظام جاری کرے، تاکہ لوگوں کے تنازعات حل ہوں، ظلم وزیادتی کا خاتمہ ہو، عدل وانصاف کو فروغ ملے اور لوگ چین و

* سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

سکون سے زندگی گزاریں۔اس کا یہ بھی کام ہو کہ وہ اس اجتماعیت کو مستحکم کرنے کی کوشش کرے اور اسے بیرونی حملوں سے محفوظ کرنے کی تدابیر اختیار کرے۔ پھر اسلام نے اپنے تمام پیروکاروں کو حکم دیا کہ اس سربراہ کی معروف میں اطاعت کریں اور جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق ان کے معاملات کی نگرانی کرتا رہے، اس کی نافرمانی نہ کریں۔قرآن وحدیث میں اس مضمون کی نصوص کثرت سے مذکور ہیں۔ یہاں صرف ایک آیت اور ایک حدیث پیش کی جارہی ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَطِيعُواْ اللّهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ'' (النساء:۵۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ان امّر علیکم عبد مجدّع یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا و اطیعوا''. (صحیح مسلم ۱۲۹۸)

(اگر تم پر کوئی عضو بریدہ غلام حکم راں بنا دیا جائے جو اللہ کی کتاب کی روشنی میں تمھاری رہ نمائی کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو)

پوری زندگی (جس میں عقائد اور عبادات کے ساتھ معاملات اور سیاستِ مدنیہ بھی شامل ہیں) احکامِ الٰہی کے مطابق زندگی گزارنے کی قرآنی اور نبوی تعلیمات و ہدایات کے ساتھ انسانوں کے سامنے عملی نمونہ بھی پیش کر دیا گیا۔اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن میں مذکور احکام کی تشریح وتوضیح فرمائی اور ان پر عمل کرکے بھی دکھایا۔ہجرتِ مدینہ کے بعد آپؐ نے اسلامی ریاست کی بنیادیں استوار کیں، معاشرتی اور معاشی میدانوں میں انسانی فلاح و بہبود کے اقدامات کیے، مدینہ کے اطراف میں بسنے والے یہودی قبائل سے معاہدے کیے۔ بیرونی جارحیت کا پامردی سے مقابلہ کیا۔دشمنوں سے جنگ بھی کی اور صلح بھی۔ مدینہ سے باہر جن علاقوں تک اسلام پہنچ گیا تھا وہاں کا نظم ونسق

چلانے کے لیے امراء و قضاۃ بھیجے اور اسلام کی مزید تبلیغ و اشاعت کے لیے دعاۃ بھی روانہ فرمائے۔ اس طرح آپؐ کے ذریعے اسلام کی تکمیل ہوئی اور اعلان کر دیا گیا:

"اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا" (المائدۃ:۳)

(آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر کیا ہے)

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد کچھ افراتفری کے آثار پیدا ہوئے۔ بہت سے قبائل مرتد ہو گئے، کچھ لوگوں نے زکوٰۃ کی ادائی سے انکار کر دیا، لیکن مسلمانوں نے متفقہ طور پر حضرت ابوبکرؓ کو خلیفۂ رسول تسلیم کر لیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ انھوں نے تمام اٹھنے والے فتنوں کی سرکوبی کی اور نظم مملکت کو استحکام بخشا۔ ان کے بعد دیگر خلفائے راشدین نے بھی اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات اور عملی نمونہ کے مطابق امور مملکت انجام دیے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں اپنے اسوہ کے ساتھ خلفائے راشدین کے اسوے کو بھی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے:

"علیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين، عضّوا عليها بالنواجذ" (سنن الترمذی:۲۶۷۶)

(میری اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو اختیار کرو، اسے اپنے دانتوں سے پکڑ لو)

مغرب میں ایک مخصوص صورت حال میں مذہب اور سیاست کے درمیان علیحدگی کا نظریہ ابھرا۔ اس کا سبب کلیسا کا ظلم و زیادتی اور استحصال تھا۔ چنانچہ عوام میں اس کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا ہوئے۔ انھوں نے کلیسا کے تسلّط سے گلوخلاصی کی جدوجہد کی، جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس پس منظر میں دین اور دنیا کی علیحدگی کی فکر پیش کی گئی۔ مذہب کو انسان کا پرائیوٹ معاملہ قرار دے کر اسے صرف چند مراسم عبادت

تک محدود کر دیا گیا اور اجتماعی امور و معاملات بہ شمول سیاست کو ''لامذہبیت' کی بنیاد پر منظّم اور استوار کیا جانے لگا۔

بیسویں صدی عیسوی میں مسلم ممالک استعمار کے پنجوں سے آزاد ہونے لگے تو جہاں ایک طرف ایسی شخصیات اور تحریکیں ابھریں جنھوں نے اسلامی نظام حکومت کا پرزور مطالبہ کیا، وہیں دوسری طرف مغرب کے زیر اثر یہ دعوے بھی پیش کیے گئے کہ اسلام کوئی سیاسی نظام نہیں پیش کرتا اور امور مملکت چلانے کے لیے اس نے کچھ ہدایات نہیں دی ہیں۔ یہ باتیں مختلف انداز سے بعض افراد کی جانب سے ہندوستان، پاکستان اور دیگر ممالک میں کہی گئیں۔

علی عبدالرازق (۱۸۸۸-۱۹۶۶ء) کی پیدائش مصر میں محافظۃ المنیا کے ایک گاؤں ابوجرج میں ہوئی۔ انھوں نے گاؤں کے مکتب میں قرآن کریم حفظ کی، پھر ازہر سے عالمیت کی۔ اس کے بعد آکسفورڈ یونی ورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے واپس آکر' قاضی شرعی' کے منصب پر فائز ہوئے۔

۱۹۲۵ء میں' الاسلام واصول الحکم' کے عنوان سے ان کی کتاب شائع ہوئی۔ اسی سال چند ماہ کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد کچھ کچھ وقفے سے یہ پانچ مرتبہ شائع ہوئی۔

۱- ۱۹۶۶ء- مکتبۃ الحیاۃ بیروت
۲- نومبر ۱۹۷۱ء- مجلۃ الطلیعۃ مصر کے خصوصی شمارہ کی حیثیت سے
۳- ۱۹۹۳ء- الہیئۃ المصریۃ العالمۃ للکتاب
۴- ۲۰۰۰ء- الموسسۃ العربیۃ للدراسات والنشر مع تعقیب ڈاکٹر محمد عمارہ
۵- ۲۰۰۷ء- مکتبۃ الأسرۃ مع کتاب اصول الحکم فی الاسلام لعبدالرزاق السنہوری

اس کے علاوہ دارالہلال کی جانب سے بھی اس کی اشاعت ہوئی، مگر اس پر سنۂ اشاعت درج نہیں ہے۔ میرے پیش نظر دارالہلال کا مطبوعہ نسخہ ہے، جس میں ۱۷۲ر صفحات ہیں۔ یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں تین فصلیں ہیں۔

پہلے باب کا عنوان 'الخلافۃ والاسلام' ہے۔ اس میں مصنف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ خلافت کا قیام دینی وشرعی ذمہ داری نہیں ہے۔ قرآن وسنت میں اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ نے قیام خلافت کی جو کوشش کی وہ ایک دنیاوی کام سمجھتے ہوئے کی۔ چنانچہ اس معاملے میں ان کے اختلافات ظاہر ہوئے۔

دوسرا باب 'الحکومۃ والاسلام' کے عنوان سے ہے۔ اس میں انھوں نے اپنا یہ خیال پیش کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے کے لیے مبعوث کیے گئے تھے، حکومت قائم کرنا اور چلانا آپ کی پیغمبرانہ ذمہ داریوں میں سے نہ تھا۔

تیسرے باب میں انھوں نے خلافت وحکومت پر تاریخی اعتبار سے بحث کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اگر خلافت کی کوئی دینی وشرعی بنیاد ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد کر دیتے۔

عبدالرازق کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ خلافت اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے نہیں ہے، بلکہ دنیوی اور سیاسی مسئلہ ہے۔ قرآن اور احادیث صحیحہ میں ایک بیان بھی ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ تنصیبِ خلافت واجب ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ دینی شعائر کا قیام حکومت پر موقوف نہیں ہے، مسلمانوں کے دینی مصالح قیام خلافت پر موقوف نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے دینی و دنیاوی امور کی انجام دہی کے لیے خلافت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کی پناہ کہ وہ اس دین کی عزت وعظمت کو کسی طرح کی حکومت سے وابستہ کر دے اور خلافت کا مرہونِ منت بنا دے......''

> ''خلافت کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حکومت کے تمام ادارے محض سیاسی اقدامات ہیں۔ ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دین نے اس کا حکم دیا ہے نہ اس سے روکا ہے۔ اس نے ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ ہم عقل، قوموں کے تجربات اور سیاست کے قواعد کے مطابق جو چاہیں کریں۔''

جو آیات اور احادیث خلافت و امارت اور سمع و طاعت کے موضوع پر پیش کی جاتی ہیں، ان کے بارے میں مصنف نے یہ تاویل پیش کی ہے کہ "اگر ایسا ہو"۔ اس کی مثال انھوں نے یہ دی ہے کہ انجیل میں ہے کہ "قیصر کو اس کا حق دو اور اللہ کو اس کا حق۔" اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قیصر کی حکومت شریعت الٰہی کے مطابق ہے۔

علی عبدالرازق نے ایک بحث یہ اٹھائی ہے کہ کیا اللہ کے رسول ﷺ کو ملک (بادشاہ) کہا جا سکتا ہے؟ ان کا کہنا ہے کہ رسالت اور ملک (حکومت) دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کا فریضۂ منصبی اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچا دینا تھا، حکومت کرنا آپ کی ذمہ داریوں میں شامل نہیں تھا۔

وہ کہتے ہیں کہ دعوت الیٰ اللہ دلوں میں قبول حق کی آمادگی پیدا کرنے کا نام ہے۔ قوت و طاقت کے ذریعے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ پیغمبروں کی تاریخ میں ہمیں کوئی پیغمبر ایسا نہیں ملتا، جس نے تلوار کے زور پر لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کیا ہو۔ اگر پیغمبر خاتم النبیین کی سیرت میں ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ آپ نے طاقت و قوت کا استعمال کیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ آپؐ کے وظیفۂ رسالت سے خارج تھا۔

مصنف نے لکھا ہے کہ قرآن میں رسول اللہ ﷺ کی صرف رسالت والی پوزیشن پر زور دیا گیا ہے اور حکومت و امارت والی پوزیشن کا انکار کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے صرف وہ قرآنی آیات پیش کی ہیں جن میں آں حضرت ﷺ کے حفیظ، وکیل، جبار، مسیطر ہونے کا انکار کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ آپ کا کام صرف پہنچا دینا ہے۔ اسی طرح انھوں نے وہ آیتیں بھی پیش کی ہیں جن میں آپؐ کے صرف نبی، مبشّر، منذر اور مبلّغ ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

انھوں نے وہ حدیث بھی پیش کی ہے جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

"انتم أعلم بأمر دنیاکم". (مسلم: ۲۳۶۳)

(تم اپنے دنیاوی معاملات میں زیادہ جاننے والے ہو۔)

علی عبدالرازق کہتے ہیں کہ اسلام عربوں کے درمیان ظاہر ہوا، اس کی بنیاد پر ان کی وحدت قائم ہوئی، لیکن یہ وحدت سیاسی نہیں تھی۔ اسی لیے انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی صرف دینی ماتحتی قبول کی تھی، حکومتی ماتحتی قبول نہیں کی۔ اسی بنا پر آپ ﷺ کی وفات کے بعد انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کی ماتحتی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خلافت وامارت کی کوئی دینی وشرعی بنیاد نہیں ہے، اسی بنا پر آپؐ نے اپنے بعد کسی کو خلیفہ نام زد نہیں کیا تھا۔

مصنف نے اس سے بھی بحث کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر تمام صحابہ کا اجماع نہیں ہوا تھا۔ ان سے اختلاف کرنے والوں میں انھوں نے حضرت علیؓ اور حضرت سعد بن عبادہؓ کے نام پیش کیے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ علی عبدالرازق نے اسلامی نظامِ حکومت کے سلسلے میں پیش کیے جانے والے تمام اعتراضات کو جمع کر دیا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت نے عالمِ عرب اور خاص کر مصری معاشرے میں زبردست خلفشار پیدا کر دیا تھا۔ کتاب کی اشاعت کے کچھ ہی دنوں کے بعد شیخ الازہر جناب محمد ابوالفضل کی صدارت میں ھیئۃ کبار العلماء کی ایک نشست ہوئی، جس میں ۲۴ر علماء شریک ہوئے۔ اس کے فیصلے کے نتیجے میں علی عبدالرازق کی ازہر کی ڈگری منسوخ کر دی گئی، انھیں علمائے ازہر کی فہرست سے خارج کر دیا گیا اور 'قاضی شرعی' کے منصب سے بھی انہیں ہاتھ دھونا پڑا۔ بعد میں متعدد علماء اور دانش وروں نے اس کتاب کا رد لکھا اور ضخیم اور مبسوط کتابیں لکھیں، جن میں علی عبدالرازق کے اعتراضات کا تحقیقی اور مدلل جواب دیا۔ چند کتابوں کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

۱۔ حقیقۃ الاسلام واصول الحکم، الشیخ محمد بخیت المطیعی مفتی الدیار المصریۃ، ۱۹۲۶ء

۲۔ نقد علمی لکتاب الاسلام و اصول الحکم، العلامۃ السید محمد الطاہر بن عاشور، مفتی الدیار التیونسیۃ، المطبعۃ السلفیۃ ومکتبتھا، القاھرۃ، ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۶ء [صفحات: ۳۷]

۳۔ نقض الاسلام و اصول الحکم، الشیخ محمد خضر حسین، المطبعۃ السلفیۃ ومکتبتھا،

القاھرۃ، ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء، [صفحات: ۲۵۴]

۴۔ معرکۃ الاسلام واصول الحکم، د۔ محمد عمارۃ، دار الشروق القاھرۃ، ۱۹۸۹ء، [صفحات: ۴۳۲]

۴۔ نقض الاسلام و اصول الحکم، د۔ محمد عمارۃ، دار نھضہ للطباعۃ و النشر و التوزیع، القاھرۃ، ۱۹۹۸ء، [صفحات: ۵۷]

اسلامی نظام حکومت کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر جاننے کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا۔ یہاں کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں عالم اسلام کے مشہور مفکر اور داعی مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب 'مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کش مکش' میں لکھا ہے:

> ''ازہری عالم شیخ علی عبدالرزاق، جو اس وقت مصر میں شرعی قاضی (جج) بھی تھے، ان کے قلم سے ایک کتاب شائع ہوئی، جس کا نام 'الاسلام و اصول الحکم' ہے۔ اس نے مصر کے دینی حلقہ میں سخت بے چینی اور ناراضگی کی لہر پیدا کردی اور اس کے نتیجے میں مصنف کو ازہر کی سند اور اس کے حقوق و امتیازات سے محروم ہونا پڑا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مستشرقین کے خیالات تعلیم یافتہ طبقہ میں یہاں تک مقبول ہو چکے تھے کہ ایک عالم دین ان کی پرزور وکالت اور تبلیغ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں مصنف کا دعویٰ ہے کہ خلافت ایک محض عربی اور رائج الوقت نظام تھا، جس کو مسلمانوں نے اختیار کرلیا تھا اور شریعت اس کا پابند نہیں کرتی۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ خلافت، قضا، سرکاری عہدے اور حکومت کے مناصب سب خالص دنیاوی عہدے اور انتظامات ہیں، جن کی نہ کوئی دینی حیثیت ہے نہ شریعت سے ان کا کچھ تعلق ہے۔''
>
> (مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کش مکش، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، ۲۰۰۳ء، ص ۷۳-۸۱)

☆☆☆

السیاسۃ الشرعیۃ لابن تیمیہؒ کا مطالعہ

سید حامد عبدالرحمٰن الکاف اصلاحی*

اس مقالے کا موضوع ''امام ابن تیمیہ کی کتاب'' ''السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاحی الراعی والرعیۃ'' ہے۔

اس کتاب پر بحث کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہ کی سیرت مختصراً بیان کردی جائے۔

امام ابن تیمیہ ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۲۸ھ میں انتقال کیا انھوں نے اپنے پیچھے بڑی بڑی علمی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے جس سے دنیائے اسلام کے علماء، مفکرین اور عوام سب کے سب مستفید ہورہے ہیں۔

اس عظیم ذخیرہ میں ان کی کتاب ''السیاستہ الشرعیۃ'' بھی ہے۔ یہ کتاب ۳۴۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کو' جیسا کہ اس کے عنوان کے نیچے براکٹ میں لکھا ہے، پہلی دفعہ مکمل شائع کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ اسکی تحقیق کا فریضہ فضیلۃ الشیخ علی بن محمد العمران نے فضیلۃ الشیخ بکر بن عبداللہ ابو زید کی نگرانی میں انجام دیا ہے ۔اس کے اخراجات موسستہ سلیمان بن عبدالعزیز الراجحی الخیریہ نے اٹھائے ہیں اور دار عالم الفوائد للنشر والتوزیع نے اس کو شائع کیا ہے۔ اس کو منظمۃ المؤتمر الاسلامی (OIC) کے مجمع الفقہ الاسلامی نے شائع کیا ہے جیسا کہ اس پر چھپی ہوئی مہر سے ظاہر ہورہا ہے۔

کتاب کی ہیئت ترکیبی

عجیب بات یہ ہے کہ صفحہ ۳۴۷ پر دی ہوئی فہرس الموضوعات میں یہ لکھا گیا ہے:

* معروف عالم دین، مصنف، مفسر قرآن، حیدرآباد

اس کے بعد صفحہ ۴۲ تک مختلف عنوانات اور موضوعات کا ذکر ہے۔ پھر اچانک صفحہ ۳ پر یہ کہا گیا ہے کہ اس پر ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخوں کے نمونے دکھائے گئے ہیں۔ صفحہ ۴ پر مؤلف کا مقدمہ ہے اور صفحہ ۵۔۷ اس رسالے کی فہرست مضامین سبب تالیف کے ساتھ ہے۔اس میں سورۃ النساء کی آیت نمبر ۵۸، ۵۹ کی تفسیر ہے۔اسی صفحہ ۷ پر پہلی فصل: اداء الامانات ہے جسکی دو قسمیں ہیں جن میں سے ایک قسم الولایات ہے۔

یہاں سے فصلوں کا آغاز ہے جن کی تعداد ۲۴ ہے۔ان فصول کی ابتداء فصل: اداء الامانات نوعان احدھا: الولایات سے ہوتی ہے۔ ۲۳ ویں فصل :الامر بالشوریٰ ہے جب کہ ۲۴ ویں فصل کا عنوان: فی ولایات امر الناس وانھا من اعظم الواجبات وبعض مسائلھا ہے۔

جب خود انہوں نے ۲۴ ویں فصل میں یہ فرمایا ہے کہ ولایۃ امر الناس من اعظم الواجبات تو بجا طور پر ان سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ شوریٰ، اسکی اہمیت اور ضرورت اور ولایۃ امر الناس سے یعنی ۲۳ ویں اور ۲۴ فصل سے اپنی کتاب کا آغاز کرتے یعنی شوریٰ اور امیر یا حاکم کا تعین یا انتخاب اور اس کی صفات وغیرہ سے آغاز کرتے اور اس میں شوریٰ کی ضرورت اور اہمیت کو اُجاگر کرتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

اس موضوع میں ترتیب

اسلام کے سیاسی نظام کا آغاز شوریٰ کے تصور سے ہوتا ہے۔جس کے بارے

میں امام ابن تیمیہ نے خوب فرمایا ہے کہ: ''ولی الامر مشاروت سے مستغنی نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دیا تھا۔'' اللہ سبحانہ تعالیٰ کا فرمان ہے: انہیں معاف کرو اور ان کے لیے استغفار کی دعاء کرو اور معاملات میں ان سے مشورہ کرو تو جب عزم کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرو' بے شک اللہ بھروسہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے (سورۃ آل عمران' آیت ۱۵۹)

اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد مومنین کی صفات کا ذکر کیا اور ان کی تعریف اس لیے فرمائی کے وہ اپنے معاملات مشورہ سے طے کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ رزق انہیں دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔'' (الشوریٰ: ۳۸)

ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ: رسول اللہؐ سے زیادہ کوئی شخص اپنے اصحاب سے مشورہ نہیں کرتا تھا۔''[1] یہ عمل نبیؐ کی حیات مبارکہ میں جاری رہا۔ جب آپؐ کی وفات ہوئی تو صحابہ کرامؓ (مہاجرینؓ اور انصارؓ) نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن دفن سے پہلے مدینہ منورہ کی نوزائیدہ ریاست کے سربراہ کی تعین کے فکرمند ہوئے کیونکہ کسی بھی سیاسی نظام میں صدر یا حاکم یا خلیفہ کا عدم وجود ایک بڑا خلاء پیدا کردیتا ہے جس کا پُر کرنا از حد ضروری ہے۔ یہ جس قدر جلد ہو اتنا ہی بہتر ہے۔

امام الماوردی کی سعیٔ حمید

اپنی کتاب ''الاحکام السلطانیہ والولایات الدینیۃ'' میں امام ابوالحسن الماوردی (۹۷۴/۳۶۴ھ وفات ۱۰۵۸ء/۴۵۰ھ) امام الماوردی نے سقیفۃ بنی ساعدہ میں نبیؐ کی وفات کے فوراً بعد منعقد ہونے والے اجتماع کا ذکر سرسری انداز میں کیا مگر انہوں نے اجتماع کے اہم نکات بیان نہیں کیئے اور نہ اس کے نتائج کا ذکر ہی کیا جبکہ یہ اجتماع اور اس کی پوری کی پوری کاروائی اسلام کی سیاسی تاریخ و مقام میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کاروائی کی مکمل رپورٹ اس کے ہیرو سیدنا عمرؓ نے اپنی موت سے چند دن پہلے کے دیئے ہوئے خطبۂ جمعہ میں حاضرین کے سامنے پیش کی تھی۔ اس کی غیر معمولی

دستوری حیثیت کی وجہ سے اس کا بہت گہرا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ یہ نہ صرف خلفاء راشدین المھدیین کی وہ سُنّت رہی ہے بلکہ یہ ان مہاجرینؓ و انصارؓ سابقین اولین کا متفقہ فیصلہ تھا جن کے نقش قدم پر چلنے کا ہمیں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہؐ نے حکم دیا ہے۔ پہلے کلام اللہ سنئے: پہل کرنے والے سبقت لے جانے والے مہاجرینؓ اور انصارؓ اور وہ لوگ جنھوں نے (حسن عقیدۃ و عمل) کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے اور اس نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کرر کھے ہیں جن کے تحت نہریں بہتی ہونگی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اِس میں رہینگے۔ اور یہ ایک بڑی کامیابی ہے (سورۃ: التوبہ، آیت ۱۰۰)

خود امام ابن تیمیہ نے اس کتاب کے صفحہ ۳۸ پر اس حدیث کی جس کی روایت حضرت ارباز ابن ساریہ کی حدیث نقل کی ہے جس میں نبیؐ نے فرمایا کہ: تم پر میری سنت اور خلفاء راشدین مھدیین کی سنت کی پیروی واجب ہے۔ تو تم ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور دانتوں کو ان میں گاڑ دو اور تم ہی نئی چیزوں سے بچو کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

سیدنا عمرؓ کے خطبہ کو نقل کرنے اور اس کی مفصل شرح لکھنے کے بجائے امام صاحب نے امیر یا حاکم کے نصب کی ضرورت بیان کرتے ہوئے یہ تک لکھ دیا ''اس لیے روایت میں آتا ہے کہ سلطان زمین میں اللہ کا سایہ ہے"۔ یہ ایک نہایت ضعیف حدیث ہے۔ اس پر محقق فضلیتہ الشیخ علی بن محمد العمران نے یہ تبصرہ کیا ہے'' العقیلی نے اُسے ''الضعفاء (۳/ ۳۵۳) میں اس کی تخریج کی ہے اور ابونعیم نے ''فضیلتہ العادلین (نمبر ۳۲۔ تخریج کے ساتھ) میں اور البیھقی نے (۸/ ۱۶۲) میں حضرت انسؓ سے روایت کی ہے۔ اس حدیث کی روایت چند دیگر صحابہؓ سے بھی ہے مگر وہ سب کی سب ضعیف ہیں ۳؎

سیدنا عمرؓ کا خطبۂ جمعہ

ان وجوہات سے سیدنا عمرؓ کے جمعہ کے خطبہ کی اہمیت دوبالا ہوجاتی ہے کیونکہ سقیفتہ بنی ساعدہ میں عامتہ المہاجرینؓ والانصارؓ کی بحث ومباحثہ کے بعد بیعت نے

انتخاب امیر/ حاکم کی راہ معین کر کے قرآنی حکم اور نبیؐ کی سنت کے معنی متعین کر دیئے۔
یہاں سوال یہ ہے کہ حدیث ابھی تک گوشۂ گم نامی کیوں رہی؟ میری محدود اور علم میں اس گم نامی کے یہ اسباب ہیں۔

۱) امام بخاریؒ نے اس کو پہلے تو کتاب الحدود میں درج کیا۔

۲) پھر اس کا عنوان ''رجم الحبلٰی من الزنا اذا حصنت (اس شادی شدہ عورت کو رجم کرنا جس کا حمل زنا سے ٹھہرا ہو) رکھا۔

ان دو وجوہ کے سبب سے یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ حدیث وجوب رجم کے بارے میں ہے نا کہ وجوب انتخاب امیر/ حاکم کے بارے میں جس میں رجم اور اپنے حقیقی باپوں کی طرف اپنے آپ کو منسوب نہ کرنے کی مذمت کے مسائل کو بطور تمہید بیان کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے حافظ ابن حجرؒ نے رجم اور نسب الی غیر ابیہ کے اور خطبے کے دوسرے حصے میں نظم وربط قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اپنی طرف سے حتی المقدور کوشش کی ہے۔

۳) اس کا ایک سبب وہ حالات بھی ہو سکتے ہیں جو امام بخاریؒ کے زمانے میں عالم اسلام پر چھائے ہوئے تھے اور جن میں مستبد حکمران: وجوب انتخاب ولی الامر/ خلیفہ/ حاکم جیسے عنوانات کو برداشت کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے۔

ایک تجویز

اس لیے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اس عنوان اور ایسے عنوانات کے ساتھ یا تو بین قوسین میں یا حاشیہ میں ایسے نئے عنوانات لکھ دیئے جائیں تا کہ قاری کی نظر میں حدیث کا پورا متن اور مقصد آ جائے اور امام بخاریؒ اور دیگر ائمہ کرامؒ کے عنوانات بھی اپنی جگہ اصل حالت میں جوں کے توں برقرار رہیں۔

جیسا کہ امام بن حزم نے اشارہ کیا ہے اسلام کے سیاسی نظام کے سلسلے میں خاص طور سے احادیث نبویہ شریفہ کی نئی ترتیب کی سخت ضرورت ہے اس کی ابتداء خطبۂ عمرؓ سے ہونی چاہیے۔ پھر انحراف امیر بعد الانتخاب اور عزل امیر وغیرہ کا ذکر آئے اور آخر

میں خروج اور عدم خروج کی احادیث بیان کی جائیں تاکہ ہم السلطان ظل اللہ فی الارض جیسی احادیث سے نجات پاکر خلفائے راشدین مھدیین کی سنت پر عمل پیرا ہوکر بلا وجہ کے اختلافات سے بچ سکیں اور خوں خرابوں سے نجات پاکر تعمیری کاموں کی طرف متوجہ ہوسکیں۔

الحمد للہ ہمیں اس کتاب کا ایک اور نسخہ ملا جسکی شرح، شیخ محمد بن صالح العیثمین ؒ نے کی ہے۔ اسے الدار العثمانیہ، اور دار ابن حزم نے شائع کیا ہے۔ ہم نے دونوں نسخوں کا مقابلہ کر کے یہ اطمینان کر لیا ہے کہ ہم نے اپنے مقالے میں جن عبارتوں سے تعرض کیا ہے وہ شیخ العثمین ؒ کے نسخہ میں بھی موجود ہیں۔ یہ نسخہ سلطنتِ عمان، الاردن سے ۱۴۲۵ھ (۲۰۰۴ء) میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔

سیدنا عمرؓ کا خطبہ

اب میں سیدنا عمرؓ کے خطبہ کا وہ ترجمہ پڑھوں گا جس کو خود میں نے کیا۔ اس کے بعد اس کا تجزیہ اور اس سے حاصل کردہ اور نتائج پیش خدمت کروں گا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا خطبہ اور اس کا عربی متن

رجم الحبلیٰ من الزنا اذا احصنت

"حدثنا عبد العزيز بن عبدالله ، حدثني إبراهيم بن سعد ، عن صالح عن الزهري عن عبيدالله بن عبدالله بن عتبة بن مسعودؓ عن ابن عباسؓ قال: كنت أقرئ رجالاً من المهاجرين منهم عبد الرحمن بن عوف فبينما أنا في منزله بمنىٰ وهو عند عمر بن الخطاب في آخر حجة حجها إذ رجع إليَّ عبد الرحمن فقال: لو رأيت رجلاً أتىٰ أمير المؤمنين اليوم فقال: يا أمير المؤمنين هل لك في فلان يقول: لو قد مات عمر لقد بايعت فلاناً فوالله ما كانت بيعة

أبی بکر إلا فلتة فتمت، فغضب عمر ثم قال: إنی إن شاء الله لقائم العشية فی الناس فمحذرهم هؤلاء الذين يريدون أن يغصبوهم أمورهم قال عبدالرحمن : فقلت يا أمير المؤمنين لاتفعل فإن الموسم يجمع رعاع الناس وغوغاء هم، فإنهم الذين يغلبون على قربک، حين تقوم فی الناس وأنا أخشی أن تقوم فتقول مقالة يطيرها عنک کل مطير، وأن لا يعوها وأن لايضعوها علی مواضعها، فأمهل حتی تقدم المدينة فإنها دارالهجرة والسنة، فتخلص بأهل الفقه وأشراف الناس فتقول: ماقلت متمکناًفيعی أهل العلم مقالتک ويضعونها علی مواضعها فقال عمر: أم والله إن شاء الله لأقومن بذلک أول مقام أقومه بالمدينة، قال ابن عباسؓ: فقدمنا المدينة فی عقب ذی الحجة فلما کان يوم الجمعة عجلت الرواح حين زاغت الشمس ، حتی أجد سعيد بن زيد بن عمر وبن نفيل جالساً الی رکن المنبر فجلست حوله تمس رکبتيی رکبته، فلم أنشب أن خرج عمر بن الخطاب فلما رأيته مقبلاً قلت لسعيد بن زيد بن عمر وبن نفيل : ليقولن العشية مقالة لم يقلها منذ استخلف قط قبله فانکر علی وقال: ما عسيت أن يقول: ما لم يقل قبله فجلس عمر علی المنبر، فلما سکت المؤذنون قام فأثنی علی الله بما هو أهله ثم قال: أما بعد فإنی قائل لکم مقالة قد قدر لی أن أقولها لا أدری لعلها بين يدی أجلی فمن عقلها ووعاها فليحدث بها حيث انتهت به راحلته، ومن خشی أن لايعقلها فلا أحل لأحد أن يکذب علی: إن الله بعث محمد

اً ﷺ بالحق وأنزل عليه الكتاب فكان مما أنزل الله آية الرجم فقرأناها وعقلناها ووعينا ها، رجم رسول الله ﷺ ورجمنا بعده، فأخشى ان طال بالناس زمان ان يقول قائل : والله مانجد آية الرجم في كتاب الله فيضلوا بترک فريضة انزلهاالله ، والرجم في كتاب الله حق على من زنى، اذا أحصن من الرجال والنساء، اذا قامت البينة أو كان الحبل أو الاعتراف ثم انا كنا نقرأ فيما نقرأ من كتاب الله أن لا ترغبوا عن آبائكم فانه كفر بكم ان ترغبو ا عن آبائكم أو ان كفرآ بكم ان ترغبوا عن آبائكم ألا ثم ان رسو ل الله ﷺ قال: لا تطروني كما أطرى عيسى ابن مريم وقولوا عبدالله ورسوله ثم انه بلغني أن قائلاً منكم يقول: والله لؤقدمات عمربايعت فلاناً فلا يغترن امرؤ أن يقول: انما كانت بيعة ابى بكر فلتة، وتمت ألا وانها قد كانت كذلک، ولٰكن الله وقىٰ شرها وليس فيكم من تقطع الاعناق اليه مثل ابى بكر من بايع رجلا من غير مشورة من المسلمين، فلا يبايع هو ولا الذى بايعه تغرة ان يقتلا وانه قد كان من خيرنا حين توفى الله نبيه ﷺ إلا أنّ الانصار، خالفونا واجتمعوا باسرهم في سقيفة بنى ساعدة، وخالف عنا على والزبير ومن معهما واجتمع المهاجرون الىٰ ابى بكر فقلت لابى بكر: يا ابابكر انطلق بنا الى اخواننا هؤلاء من الانصار، فانطلقنا نريد هم فلما دنونا منهم لقينا منهم رجلان صالحان فذكرا ما تمال عليه القوم فقالا: اين تريدون يا معشرالمهاجرين ؟ فقلنا: نريد اخواننا هؤلاء من

الانصار، فقالا: لاعليكم ان لا تقربوهم اقضوا امركم فقلت: والله لنأتينهم فانطلقنا حتى اتيناهم في سقيفة بني ساعدة، فاذا رجل مزمل بين ظهرانيهم فقلت: من هذا؟ قالوا: هذا سعد بن عبادة فقلت: ماله؟ قالوا: يوعک، فلماجلسنا قليلا تشهد خطيبهم فأثنى على الله بما هو أهله، ثم قال: أما بعد فنحن أنصارالله وكتيبة الاسلام، وأنتم معشر المهاجرين رهط وقد دفت دافة من قومكم، فاذا هم يريدون ان يختزلونا من اصلنا ،وان يحضنونا من الامر فلما سكت أردت ان أتكلم وكنت قد زورت مقالة اعجبتني أردت ان اقدمها بين يدى ابى بكر ، وكنت ادارى منه بعض الحد فلما أردت ان اتكلم قال ابوبكر: على رسلک فكرهت ان اغضبه ، فتكلم ابوبكر فكان هو احلم مني وأوقر،والله ماترک من كلمة اعجبتني في تزويرى الاقال في بديهته مثلها ، او افضل منها حتى سكت فقال: ماذكرتم فيكم من خير فانتم له اهل ولن يعرف هذا الامر الا لهذا الحي من قريش هم اوسط العرب نسباوداراًوقد رضيت لكم احد هذين الرجلين فبايعوا ايهما شئتم ، فاخذ بيدى ويد ابي عبيدة بن الجراح وهو جالس بيننا، فلم اكره مما قال غيرها: كان والله ان اقدم فتضرب عنقي لا يقربني ذلک من اثم احب الى من ان اتامر على قوم فيهم ابوبكر اللهم الا ان تسول الى نفسي عند الموت شيئا لااجده لان فقال قائل: من الأنصار اناجذيلها المحكک وعذيقها المرجب منا أمير ومنكم أمير يا معشر قريش فكثر اللغط

وارتفعت الاصوات حتى فرقت من الاختلاف فقلت : ابسط يدک یا أبابکر فبسط یده، فبايعته وبايعه المهاجرون ثم بايعته الأنصار ونزونا على سعد بن عبادة فقال قائل منهم: قتلتم سعد بن عبادة فقلت: قتل الله سعد بن عبادة ، قال عمر: وإنا والله ما وجدنا فيما حضرنا من امر اقوىٰ من مبايعة أبي بكر خشينا ان فارقنا القوم ولم تكن بيعة أن يبايعوا رجلا منهم بعدنا ، فاما بايعناهم على مالا نرضى وأما نخالفهم فيكون فساداً فمن بايع رجلا على غير مشورة من المسلمين فلا يتابع هو ولا الذی بایعه تغرة أن يقتلا " [حدیث نمبر ۶۸۳۰]

اس عظیم حدیث کا اردو میں ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔

(ہمیں بتایا عبدالعزیز بن عبداللہ نے ،انہوں نے کہا کہ مجھے ابراہیم بن سعد نے بتایا، صالح کے ذریعہ، الزھری کے واسطے سے اور انہوں نے عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود کے ذریعہ اور انہوں نے ابن عباسؓ کے ذریعہ بتایا کہ انہوں نے کہا: میں مہاجرین میں سے چند حضرات کو پڑھایا کرتا تھا جن میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی شامل تھے تو جب میں ان کے خیمے میں (جو منٰی میں تھا) بیٹھا ہوا تھا جبکہ وہ عمر بن الخطابؓ کے پاس تھے، اس آخری حج میں جو انہوں نے (یعنی عمرؓ) نے کیا، تو عبدالرحمٰن بن عوفؓ میرے پاس آئے اور کہا: "اگر تم نے اس شخص کو دیکھا ہوتا جو آج امیر المؤمنینؓ کے ہاں آیا اور کہا: اے امیر المؤمنینؓ! اس شخص کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو یہ کہتا ہے:" اگر عمرؓ مر چکے ہوتے تو میں فلاں کے ہاتھ پر بیعت کرتا کیونکہ قسم خدا کی! ابوبکرؓ کی بیعت ایک اچانک ہونے والی چیز تھی جو ہوگئی۔ تو عمرؓ اس پر غضبناک ہوئے پھر کہا

:" میں اگر اللہ نے چاہا، تو زوالِ آفتاب کے بعد لوگوں کے درمیان کھڑا ہوں گا اور ان کو ان لوگوں سے ڈراؤں گا / باخبر کروں گا جو چاہتے ہیں کہ ان کے (اقتدار کے) معاملات کو غصب کر لیں / ہڑپ کر جائیں / چھین لیں"۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا: "اے امیر المؤمنینؓ! آپ ایسا نہ کیجئے (یعنی مجمع میں تقریر نہ کیجئے) کیونکہ موسم حج سفلے لوگوں کو اور شور وغل مچانے والوں کو جمع کرتا ہے کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو آپ سے قریب پاس جمع ہو گئے (ایسے میں) میں نے ابوبکر سے کہا: اے ابوبکر! ہم کو ہمارے انصاری بھائیوں کی طرف لے چلو، تو ہم ان کی جانب چل پڑے۔ جب ہم ان کے قریب پہنچے تو ہم ان میں سے دو صالح حضرات سے ملے۔ انہوں نے اس بات کا ذکر کیا جس کی طرف وہ حضرات (یعنی انصار) مائل ہو چکے تھے۔ انہوں نے کہا: کیوں تم ان کے پاس نہیں جاتے تا کہ تم اپنے معاملہء اقتدار کا فیصلہ کر سکو؟ اس پر میں نے کہا: خدا کی قسم! ہم ان کے پاس جائیں گے، تو ہم چل پڑے یہاں تک کہ ہم انکے پاس سقیفہ بن ساعدہ میں پہنچ گئے۔ ہم نے اچانک دیکھا کہ ایک شخص کمبل اوڑھے انکے پیٹھ پیچھے موجود ہے، تو میں نے پوچھا": یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا: " یہ سعد بن عبادہؓ ہیں۔ میں نے سوال کیا": انہیں کیا ہو گیا ہے؟ انہوں نے کہا: "وہ بیمار ہیں" جب ہم بیٹھ چکے، تو ان کا خطیب کھڑا ہوا اور اس نے اللہ کی ویسی ہی تعریف کی جس کا وہ مستحق ہے" پھر اس نے کہا: اس کے بعد سنو! ہم اللہ کے مددگار یعنی انصارؓ ہیں اور اسلام کے فوجی دستے ہیں اور تم مہاجرینؓ! اتنے قلیل التعداد ہو کہ تمہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے نہ صرف ہم انصارؓ کے مقابلے میں بلکہ خود تمہاری اپنی قوم کے مقابلے میں بھی تم قلیل التعداد ہو، تو وہ اچانک ہم کو کم تعداد کر کے، ہماری ہی جگہ میں، ہمیں اقتدار

سے محروم کرنا چاہتے ہیں (یعنی اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں) جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو میں بات کرنا چاہتا تھا اس حال میں کہ میں نے ایک تقریر ایسی تیار کر رکھی تھی جو مجھے پسند تھی (اور) جس کو میں ابوبکرؓ کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا اور میں ایک خاص حد تک اپنے آپ کو ان سے زیادہ صاحب علم تصور کرتا تھا" جب میں نے تقریر کرنے کا ارادہ کیا تو ابوبکر نے کہا" صبر سے کام لو" تو میں نے ان کو غضبناک کرنا پسند نہیں کیا۔ (پھر) ابوبکرؓ نے تقریر کی اور وہ مجھ سے زیادہ بردبار تھے اور بہتر (خطیب بھی تھے)۔ خدا کی قسم! انہوں نے کوئی ایسا لفظ نہیں چھوڑا جو میں نے' سوچ سمجھ کر اس تقریر میں استعمال کرنا چاہتا تھا' جو میں نے تیار کر رکھی تھی جبکہ وہ فی الفور تقریر کر رہے تھے (یعنی اسکی تیاری نہیں کی تھی) اور اس سے بہتر تقریر کر رہے تھے یہاں تک کہ انہوں نے اپنی تقریر ختم کی۔ انہوں نے (اپنی تقریر میں کہا) "جو اچھی باتیں آپ لوگوں نے اپنے بارے میں کہیں ہیں، ان کے آپ حضرات اہل ہیں جبکہ اقتدار کے معاملے میں قریش کے قبیلہ کے علاوہ کوئی اور قبیلہ نہ مانا اور نا ہی تسلیم کیا جائے گا۔ وہ عربوں کے درمیان باعتبار نسب و دار یعنی مقام افضل درجے کے ہیں اور میں راضی ہو گیا ہوں تمہارے لیے ان دو شخصیتوں سے، تو تم ان میں سے جس کو چاہتے ہو اسکے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ پھر انہوں نے میرا اور ابوعبیدۃ بن الجراحؓ کا ہاتھ تھاما جبکہ وہ خود ہم دونوں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے، تو مجھے اسکے علاوہ جو کچھ کہا وہ سب پسند آیا یعنی مجھے خلیفہ بنانے کی تجویز مجھے پسند نہیں آئی۔ خدا کی قسم! مجھے یہ بات زیادہ پسند تھی کہ مجھے آگے بڑھایا جائے اور میرا سر قلم کر دیا جائے اس بات کے گناہ سے کہ مجھے ان لوگوں کا امیر بنایا جائے جن میں ابوبکر بھی موجود ہوں الا یہ کہ مجھے میرا نفس' موت کے وقت' کوئی ایسی بات

سمجھائے جسے میں اب نہیں پاتا ہوں۔ اس پر (انصار) کے کہنے والے نے کہا: ہم عربوں کے چالاک ترین لوگ ہیں ہم میں سے ایک امیر اور (اس کے بعد) تم میں سے ایک امیر ہونا چاہیے اے قریش کے لوگو! پھر شور مچا اور آوازے اونچی ہوئیں یہاں تک کہ میں اختلاف سے گھر گیا، تو میں نے کہا: اے ابوبکرؓ! تم اپنا ہاتھ بڑھاؤ۔ تو انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ تو میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور مہاجرینؓ نے بیعت کی اور پھر انصارؓ نے بیعت کی۔ (اسکے بعد) ہم نے سعد بن عبادہؓ کی عیادت کی اس پر ان میں سے کہنے والے نے کہا": تم نے سعد بن عبادہؓ کو قتل کیا ہے" میں نے کہا، "اللہ نے سعد بن عبادہؓ کو قتل کیا ہے" عمرؓ نے کہا، قسم بخدا! ہم جس غرض کے لیے جمع ہوئے تھے، اس بات سے زیادہ قوی بات نہیں پائی کہ ہم ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں ہم ڈر رہے تھے کہ اگر ہم نے ان لوگوں کو (یوں ہی بغیر فیصلے کے) چھوڑ دیا بغیر بیعت کے تو وہ ہمارے نکل جانے کے بعد اپنے میں سے کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے۔ (اس کے بعد ہمارے لیے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہوتا کہ) ہم اس چیز پر بیعت کر لیتے جس سے ہم راضی نہیں تھے یا پھر ان سے اختلاف کرتے تو اس کا نتیجہ ناخوشگوار ہوتا۔ تو جو کوئی بھی کسی شخص کے ہاتھ پر مسلمانوں سے مشورہ کئے بغیر بیعت کر لے، تو اس شخص کو جس کے ہاتھ پر بیعت کی گئی ہے چاہیے کہ اسکی اتباع کو روک دے یعنی مزید بیعت کو وقوع پذیر ہونے نہ دے اور نہ اس شخص ہی کو مزید لوگوں کو بیعت کی دعوت دینی چاہیے جس نے بیعت کی تھی اس خوف کی وجہ سے کہ ان دونوں کو قتل نہ کر دیا جائے۔) (فتح الباری علی صحیح البخاری، جلد ا، ص ۱۰۹-۱۱۱، دارالفکر، بیروت ۱۴۰۹ھ، تحقیق الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن بازؒ)

اس عظیم حدیث کی شرح

بعض وقت غیر معمولی کلام یا غیر معمولی عمل ردعمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب کہ ردِعمل کو ظاھر کرنے والے شخص کے شان وگمان تک میں یہ بات نہیں گزری تھی۔ یہی حال اس حدیث کا بھی ہے۔ کہنے والے نے حج کے موقعہ پر منیٰ میں ایک بات کہی۔ سننے والے نے اسے سیدنا عمرؓ تک پہنچایا۔ سیدنا عمرؓ چند دنوں بعد ایک ایسا خطبہ ارشاد فرمایا جس میں بعض شرعی احکام کی تائید اور تاکید ایک طرف تھی تو دوسری طرف ایک نہایت فیصلہ کن شرعی دستوری اور قانونی فتویٰ انہوں نے اسلام میں انتخابِ امیر' اس کی اہمیت' اس کا طریقہء کار' اس کا عملی نمونہ اور اس کے دوررس نتائج کے بارے میں صادر فرمایا۔

کہنے والا نے یہ کہا --- اور بالکل صحیح کہا ___ کہ سیدنا ابوبکرؓ کا خلیفہ بنایا جانا ایک اچانک ہونے والی بات تھی تو ہوگئی یعنی یہ کوئی سوچی سمجھی منظّم اور مرتب بات نہیں تھی۔ انصارؓ اور مہاجرینؓ جمع ہوئے اور حجت اور بحث کے بعد' انہوں نے بالاتفاق سیدنا بوبکرؓ کو پہلا خلیفہء رسول منتخب کرلیا اور ان کے ہاتھ پر حاضرین نے بیعت بھی کرلی۔

سیدنا عمرؓ نے اس امر کا بذاتِ خود اعتراف بھی کیا ہے۔

......مگر......

اس حقیقت کو پورے شدومد کے ساتھ بیان کرنے کے لیے اس دن ___ وفاتِ نبیؐ کے دن ___ جو کچھ بھی ہوا وہ انتخاب امیر /حاکم /خلیفہ کے باب میں مشاورتِ مسلمین کی ابدی مثال اور ابدی نمونہ تھا۔ اس سے پہلے کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جس دین کے نازل کرنے والے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب اپنے نبیؐ کو یہ حکم دیا کہ:

"وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ" (۱۵۹۔آل عمران)

(اور تم ان سے حکومت کے معاملات میں مشورہ کیا کرو' تو جب تمہارا ارادہ پکا ہو جائے تو پھر اللہ پر بھروسہ کرو۔ بے شک اللہ توکل کرنے

والوں سے محبت کرتا ہے)

اور جس نے مؤمنین کی کئی صفات میں سے اس صفت کو بھی بیان فرمایا کہ:

"وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُوْنَ" (شوریٰ: ۳۸)

(یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا اور نماز کو قائم کیا اور ان کے حکومتی معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوتے ہیں اور جو کچھ بھی ہم نے ان کو دیا ہے اس میں خرچ کرتے ہیں)

اس سے پہلے کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس حکم اور اس صفت کو کس طرح عمل کا لباس پہنانا چاہیے تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار کو سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع کر کے انکو وہ لائحہ عمل سمجھایا جس کے ذریعہ حاکم کو چنا جانا چاہیے۔

اس دن کے اصل ہیرو اگر دیکھا جائے تو سیدنا عمرؓ ہی تھے جنہوں نے سیدنا ابوبکرؓ سے درخواست کی کہ آپؓ ہمیں ہمارے انصاری بھائیوں کے پاس لے چلئے۔ آگے چل کر عمرؓ کی بیعت پر ہی سب نے ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور بات ختم ہوگئی۔

اس بیچ میں سیدنا ابوبکرؓ کی سراپائے اخلاص شخصیت، اقتدار سے بالکل بے نیاز، ان کے درمیان موجود تھی۔ انہوں نے خود سیدنا عمرؓ اور سیدنا ابوعبید بن الجراحؓ کا نام خلافت کے لیے پیش کیا۔ شاید اسی وجہ سے شور مچا کیونکہ لوگ حیران ہوکر ایک دوسرے سے ابوبکرؓ کی موجودگی میں عمرؓ یا ابوعبیدہؓ کو خلیفہ کے بارے میں آپس میں بات چیت کرنے لگے کیونکہ یہ ایک بالکل ہی غیر متوقع امر تھا۔ لوگ خاموش اس وقت ہوئے جب ابوبکرؓ کا نام لیا گیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

اس عظیم حدیث کی مفصل شرح درج ذیل ہے۔

(۱) یہ ایک واقعہ کا ردِ عمل ہے جو منیٰ میں پیش آیا تھا جب سیدنا عمرؓ اپنا آخری حج ادا کر رہے تھے۔ اس وقت آپؓ کے خیمہ میں ایک اور جلیل القدر صحابی عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی تھے۔ ایسے میں ایک شخص داخل ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ " اے امیر المؤمنین آپؓ کی

رائے کیا ہے اس شخص کے بارے میں جس نے کہا کہ اگر عمر وفات پا چکے ہوتے تو میں فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لیا ہوتا"۔ اس نے خدا کی قسم کھا کر کہا کہ "ابوبکرؓ کی بیعت ایک اچانک ہونے والی بات تو ہو چکی'۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں بھی اچانک اسی طرح بیعت کر سکتا ہوں جیسا کہ ابوبکرؓ کی بیعت اچانک ہوئی۔

اس پر عمرؓ غضبناک ہوئے۔ کیوں؟ وہ اس لیے کہ اس شخص نے مہاجرینؓ اور انصارؓ کے اس بڑے اجتماع کا ذکر ہی نہیں کیا اور نہ اس میں ہونے والی تقریروں کی طرف کوئی اشارہ کیا اور نہ اس بات چیت کا ذکر کیا جو اس موقعہ پر ہوئی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ سیدنا عمرؓ کے آخری زمانہء خلافت ہی سے منتخب خلیفہ اور اسکی خلافت کو چیلنج کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا جو سیدنا عمرؓ کے بعد ۱۰، ۱۲ برس انڈے بچے دیتا رہا یہاں تک کہ بات ایک منتخب خلیفہ کو ہٹانے کے مطالبہ تک پہنچی اور جب یہ نہ ہو سکا تو "باغیوں" نے آگے بڑھ کر خود خلیفہ کو شہید کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں دیگر سیاسی، اقتصادی، مالی اور دیگر عوامل بھی شامل تھے مگر منتخب خلافت کے خلاف سر اٹھانے کا آغاز منیٰ میں ایک شخص کے قول سے ہوا تھا۔

۴) سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ، سیدنا عمرؓ کے خیمہ سے اپنے خیمہ میں واپس ہوئے جہاں سیدنا عبداللہ بن عباسؓ ان کا انتظار کر رہے تھے تاکہ وہ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو (قرآن) دوسرے اصحاب النبیؐ کے ساتھ پڑھا سکیں۔ یہ بجائے خود بڑی اہم بات ہے کیونکہ:

اُ) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ علم کے ___ خاص طور پر علوم قرآن مجید کے ___ کس قدر قدردان تھے جبکہ قرآن کریم خود انکے اپنے سامنے' ان کی اپنی زبان میں اور خود ان ہی کے بارے میں نازل ہوا تھا۔

ب) وہ رسول اللہؐ کے اس قول پر محکم ایمان رکھتے تھے کہ سیدنا ابن عباسؓ حبر الامۃ تھے۔ وہ ان کے علم سے مستفید ہونا چاہتے تھے۔

ج) اس میں وہ سیدنا ابن عباسؓ کی (age) عمر کو مانع نہیں ہونے دیتے تھے کیونکہ علم ــــ خاص طور پر علم قرآن مجید ــــ ایسی بیش بہا شئے ہے کہ اسے حاصل کرنے میں عمر (age) وغیرہ جیسے مسائل کو حائل نہیں ہونے دینا چاہیے۔

د) اس سے صحابہ کرامؓ کی سادگی اور خاکساری اور تواضع کا اظہار ہوتا ہے۔

ھ) منیٰ میں ذکر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا جو حکم آیا ہے، وہ حصول علم قرآن (اور حدیث وفقہ) کو بھی شامل ہے کیونکہ وہ ذکر جو علم پر مبنی ہو زیادہ معنیٰ خیز اور بار آور ہوتا ہے۔

(۴) سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے سیدنا ابن عباسؓ کو یہ واقعہ من وعن سنا دیا۔

(۵) اس لیے جب ان کے اور سیدنا عمرؓ کے مدینہ پہنچنے کے بعد پہلا جمعہ آیا تو زوال آفتاب کے فوراً بعد وہ یعنی ابن عباسؓ مسجد پہنچ گئے تا کہ منبر سے قریب بیٹھ کر سیدنا عمرؓ کا یہ اہم خطبہ خود اپنے کانوں سے پورے اہتمام کے ساتھ سن لیں۔ اس لیے اس واقعہ کے دو راوی ہوئے: پہلے راوی منیٰ کی حد تک، سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے تو اُس قصہ کے اِس حصہ سے جس کا تعلق مدینہ سے تھا، اس کے راوی سیدنا ابن عباسؓ ہیں۔

(۶) سیدنا ابن عباسؓ نے بیٹھتے ہی ــــ منبر کے قریب مسجد میں بیٹھتے ہی، سیدنا سعید بن زید بن نفیل سے کہا کہ آج عمرؓ ایک ایسی بات کہنے جارہے ہیں جو انہوں نے "خلیفہ بنائے جانے" کے بعد سے آج تک نہیں کہی تھی۔ لاعلمی کی وجہ سے سیدنا سعید بن زیدؓ نے اس بات سے انکار کیا کہ آخر وہ ایسی کونسی بات ہے جو انہوں نے آج تک نہیں کہی اور وہ جو آج بیان کرنے جارہے ہیں؟

(۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا ابن عباسؓ کو موضوع کی اہمیت اور ندرت کا اور نزاکت کا پورا پورا احساس تھا۔ ان کے کلام میں "اُسْتُخْلِفَ" کا لفظ آیا ہے جو فاعل کے مجہول ہونے کی علامت ہے اور اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ سیدنا عمرؓ خود خلیفہ نہیں بنے تھے بلکہ انتخاب کے ذریعہ اور لوگوں کے مشورہ سے خلیفہ بنائے گئے تھے۔

(۸) اس میں "مؤذنوں" جمع کے صیغہ کے ساتھ آیا ہے یعنی ایک سے زائد مؤذن تھے جو امام کے منبر پر چڑھنے کے بعد اذان دیا کرتے تھے تا کہ زیادہ سے زیادہ

لوگ خطبہ سننے کے لیے حاضر ہو سکیں۔

(۹) اصل بات کے کہنے سے پہلے سیدنا عمرؓ نے کہا کہ آج مجھے ایک ایسی بھاری بھر کم بات اپنے خطبہ میں کہنی ہے جس کا کہنا میرے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ شاید یہ کہ میری موت سے پہلے آخری غیر معمولی اہمیت کی بات ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمرؓ ایک طرف تو اپنے خطبہ کی غیر معمولی اہمیت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے تو انہیں حکم الٰہی سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی وفات کی گھڑی قریب آ چکی ہے۔ یہ ان کی غیر معمولی فراست کے دلیل تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ انکی موت سے چند دن قبل ان کی زبان سے 'ایک غیر معمولی اہمیت کا دستوری فیصلہ امت کو انتخابِ خلیفہ اور اس سلسلے میں مسلمانوں سے مشورہ کی ضرورت پر سنا دینا چاہتے تھے۔

مگر افسوس کہ اس خطبہ کو وہ غیر معمولی اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ مستحق تھا اور آج بھی ہے، اس لیے یہ امت اپنے سیاسی نظام ___ اسلام کے سیاسی نظام ... کے ایک بہت ہی اہم رکن سے غفلت برتنے کی وجہ سے اس حالت تک پہنچ چکی ہے جس میں وہ آج اپنے آپ کو پاتی ہے۔ یہ الفاروق کی بات پر کان تک دھرنے اور اس کو دانتوں سے مضبوطی سے نہ تھام لینے اور اس پر پوری قوت اور شدت کے ساتھ عمل پیرا نہ ہونے کا حتمی نتیجہ تھا اور ہے۔

۱۰) اس کے بعد آپؓ نے آیت رجم ___ اس آیت رجم ___ کا ذکر جس کو انہوں نے اور دوسرے صحابہ کرامؓ نے پڑھا بھی اور سمجھا بھی تھا مگر وہ منسوخ قرار پائی اور مصحف شریف کے آخری نسخے سے جسے آخری سرکاری نسخہء وحیدۃ قرار دیا گیا محذوف کر دی گئی مگر اس کا حکم باقی رکھا گیا یہی حال اس آیت کا ہوا جو اپنے آپ کو اپنے والدوں ربا پوں کی طرف منسوب نہ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ اس کو حذف کر دیا گیا مگر اس کا بھی حکم آیتِ رجم کی طرح باقی اور برقرار ہے۔

یہ بھی کوئی عجیب اور انہونی بات نہیں ہے۔ خود اللہ تبارک وتعالیٰ کا قول ہے:

"مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا أَلَمْ تَعْلَمْ

أَنَّ اللّٰهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" (البقرة:۱۰۶)

(ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے یا اس کو بھلاتے نہیں ہیں (الا یہ کہ)

ہم یا تو اس سے بہتر آیت لیے آتے یا پھر اس جیسی آیت اتارتے ہیں۔

کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

اگر ہم قرآن مجید میں ___ خاص طور پر آیاتِ احکام میں ___ تدریج کے قائل ہیں تو پھر ناسخ اور منسوخ کو ماننا ہی پڑے گا۔ اس سے پہلے کی حدیث ___ حدیث نمبر ۶۸۲۹ ___ سے اس پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے خاص طور پر اس کے آخری حصہ میں۔ آپؓ نے رجم کے شرائط یہ بتائے: ثبوت اور دلیل کا ملنا، حمل کا ٹھہر جانا یا اعتراف کیا جانا۔

رجم اور باپوں کی طرف منسوب نہ کرنے کے علاوہ آپؓ نے رسول اللہ ﷺ کی غیر معمولی مدح سرائی سے منع کیے جانے کی حدیث بھی سنائی جس کا مطلب یہ تھا کہ مبالغہ آرائی کے سواء معتدل قسم کی حقیقت پسندانہ مدح وثناء کسی بھی شخص کی جائز ہے۔ دراصل وہ اس کے ذریعہ اس تعریف اور توصیف کا جواز ثابت کر رہے تھے جو انہوں نے سیدنا ابوبکرؓ کے حق میں تھی۔

۱۱) پھر انہوں نے صراحتاً اعتراف کیا کہ ابوبکرؓ کی بیعت ایک اچانک ہونے والی چیز تھی جو ہوگئی کیونکہ اسکے لیے پہلے سے نہ تو انصارؓ ہی نے تیاریاں کی تھیں اور نہ مہاجرین نے۔ انصارؓ اچانک سے جمع ہوئے اور وہاں مہاجرین بھی اچانک پہنچ گئے، ساری تقریریں اور بات چیت اچانک ہی ہوئیں اور بیعت بھی اچانک ہوئی۔

......مگر......

بھرے مجمع میں، تقریروں اور بات چیت کے بعد نا کہ چھپ کر اور سازشی انداز میں جس کے بارے میں آپؓ نے اپنا تاریخی دستوری فیصلہ سنا دیا کہ بیعت کرنے والے اور بیعت قبول کرنے والے دونوں اشخاص کو قتل کر دینا چاہیے کیونکہ وہ دونوں

مسلمانوں کے حق اختیار اور حق مشاورت سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔

۱۲) بعد ازاں آپؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع کی پوری رپورٹ پیش کی اور انصارؓ کے خطیب کا خطبہ بھی بیان کیا اور ابوبکرؓ کا جواب بھی نقل کیا اور بیعت کے مراحل واضح کئے اور آخر میں پھر ایک بار بیعت کرنے والے اور بیعت قبول کرنے والے کو سزائے موت کا مژدہ سنایا تا کہ آپؓ کا یہ تاریخی فیصلہ مؤکد اور متفق ہو جائے۔

اس حدیث میں نظم قائم کرنے کی ابن حجرؒ کی کوشش اس حدیث شریف کا مرکزی مضمون "انتخاب امیر" ہے جن پر سب سے پہلے عمل سقیفہ بنی ساعدہ میں وفاتِ نبیؐ کے فوراً بعد ہوا۔ اپنے اس خطبہ میں جس کو امام بخاریؒ نے بحیثیت حدیث اپنی صحیح میں نقل کیا ہے، سیدنا عمر ابن خطابؓ نے تین چیزوں سے تمہید باندھی ہے یا استدلال کیا ہے! پہلی بات یہ کہ رجم سنتِ رسول اللہؐ ہے، دوسری بات یہ کہ اپنے باپوں کی طرف اپنے آپ کو منسوب نہ کرنا بداھۃً صرف اپنی ماؤں پر زنا کا الزام لگانا ہے بلکہ یہ عمل ناشکری کی ایک صورت بھی ہے۔ تیسری بات یہ کہ مدح رسولؐ میں مبالغہ آرائی سے کام نہ لیا کرو۔

سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ان تین امور کا حدیث کے مرکزی مضمون سے کیا تعلق، نظم، ربط وضبط ہے؟ یہ سوال پہلے لمحے ہی سے میرے دل میں کھٹک رہا تھا یہاں تک کہ میں کتاب الحدود رحدیث ۶۸۳۰ کے صفحہ ۱۱۷ کے آخری پیراگراف پر پہنچا جس کا آخری حصہ نصاً یہ ہے:

"....ويحتمل أن تكون المناسبة ان الذى وقع منه (يعنى عمرؓ) فى مدح ابى بكر ليس من الاطراء المنهى عنه ومن ثم قال وليس فيكم مثل ابى بكر، ومناسبة إيراد عمر قصة الرجم والزجر عن الرغبة عن الآباء للقصة التى خطب بسببها وهى قول القائل : لومات عمر لبايعت فلانا أنه أشار بقصة الرجم إلى زجر من يقول لا اعمل فى الأحكام الشرعية إلا بما وجدته فى القرآن وليس فى القرآن

تصريح باشتراط التشاور إذا مات الخليفة، إنما يؤخذ ذلك من جهة السنة كما إن الرجم ليس فيما يتلى من القرآن وهو مأخوذ من طريق السنة. وأما الزجر عن الرغبة عن الآباء فكأنه أشار إلى أن الخليفة ينزل للرعية منزلة الأب فلا يجوز لهم أن يرغبوا إلى غيره بل يجب عليهم طاعته بشرطها كما تجب طاعة الاب، هذا الذى ظهر لى من المناسبة والعلم عند الله تعالىٰ ". (فتح الباری۔ جلد۱۴۔ص ۱۱۶۔۱۱۷۔الحدود/الحدیث ۶۸۳۰ تحقیق الشیخ عبدالعزیز بن بازؒ)

(اس بات کا احتمال پایا جاتا ہے کہ اس بات کی مناسبت (یعنی نظم وربط وضبط) یہ ہو کہ انہوں نے (یعنی عمرؓ نے) جو باتیں ابوبکر کے بارے میں کہیں وہ اس مدح کی تعریف میں نہیں آتی ہوں جس سے منع کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا: تم میں سے کوئی ابوبکر کی طرح ہے۔ اور وہ مناسبت یہ ہوسکتی ہے جس کے سبب سے انہیں یہ خطبہ دینا پڑا وہ کہنے والے کا یہ قول تھا: اگر عمرؓ مر چکے ہوتے تو میں فلاں کے ہاتھ پر بیعت کرلیا ہوتا۔ (وہ مناسبت یہ تھی کہ) وہ رجم کے قصہ کے ذریعہ اس شخص کو ڈانٹیں پلا رہے تھے جو یہ کہتا ہے کہ میں صرف ان شرعی احکام پر عمل پیرا ہونگا جن کو میں قرآن میں پاتا ہوں اور قرآن میں صراحتہً مشورہ کی شرط مذکور نہیں ہے جب خلیفہ کی وفات ہوجائے۔ بلکہ وہ سنت کی طرف سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح رجم بھی ان چیزوں میں سے ہے جنکی قرآن میں تلاوت نہیں کی جاتی ہے جبکہ وہ سنت سے ماٴخوذ ہے۔ اور اپنے باپوں کی طرف منسوب نہ کرنے کی بات پر اظہار غضب انہوں نے شاید اس لیے کیا کہ وہ اس کے ذریعہ اس بات کی طرف اشارہ کریں کہ خلیفہ کا درجہ رعایا کے مقابلہ میں باپ کے درجے کی طرح

ہے۔ اس لیے ان کے لیے یہ امر جائز نہیں ہے کہ وہ کسی اور شخص میں رغبت رکھیں بلکہ ان پر یہ امر واجب ہے کہ وہ اس کی مشروط اطاعت کریں جیسا کہ ان پر اپنے باپ کی اطاعت واجب ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو مناسبت کے لحاظ سے مجھ پر ظاہر ہوئی ہے۔ اور علم تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے!!)

یہ تھی حافظ ابن حجرؒ کی رائے تینوں امور کی مناسبت کے بارے میں جو اس حدیث کے مرکزی مضمون سے تعلق رکھتی ہے۔

میں یہاں پر اپنی کچی پکی ٹوٹی پھوٹی سوچ بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اَ) شادی شدہ عورت کو رجم کرنے کا نظم: اس حدیث کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ:

(الف) اس عورت کو شادی کے ذریعہ اپنی جنسی خواہشات پورا کرنے کی پوری آزادی دی گئی تھی۔ یہ کوئی چوری چھپی کا کام نہیں تھا۔ شادی کے ذریعہ اس کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ پھر اس کا اس پر صبر نہ کرنا بلکہ اس کو توڑ کر چھپ کر رات کے اندھیروں میں زنا کر کے حاملہ ہو جانا' ایک اسلامی معاشرے میں بے حیائی اور بد کاری پھیلانے کا سبب بنتا ہے، اسلیئے اس کی سزاء بھی اتنی ہی سنگین رکھی گئی ہے۔

(ب) اب ذرا شادی بیاہ پر غور کر لیجئے۔ عام طور پر شادی لڑکا لڑکی کے والدین / رشتہ داروں یا دوست احباب اور جان پہچان والوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ بعض رشتے قبول کئے جاتے ہیں اور بعض رشتے رد کر دیئے جاتے ہیں۔ دونوں فریق چھان بین کر لیتے ہیں۔ پھر نکاح کی بات چیت اور شرائط طے پاتے ہیں۔

(ج) نکاح میں دولہا' دلہن کے علاوہ نکاح پڑھانے والا اور دو گواہ یعنی کم از کم پانچ افراد ضرور ہوا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ طرفین کے ماں باپ' قریبی رشتہ دار اور دوست احباب ہوتے ہیں۔ پھر دف بجا کر اور کچھ گیت گا کر اور ولیمہ کر کے اعلان نکاح ہوتا ہے۔ اس طرح یہ کوئی ڈھکی چھپی اور چوری اور ڈکیتی کی طرح خاموش اندھیروں میں کی جانے والی بات نہیں ہوتی ہے۔ اس میں ایجاب وقبول اور شہود اور

اعلان وغیرہ ازحد ضروری ہیں۔

اس کے برعکس زنا چھپ چھپ کر رات کے اندھیروں میں کیا جاتا ہے جس کی خبر اکثر صرف زانی اور زانیہ ہی کو ہوتی ہے۔ اسی طرح انتخاب امیر بھی اسلامی معاشرہ کا ایک اجتماعی عمل ہے۔ اس کو بھی علی الاعلان ڈنکے کی چوٹ پر قابل ذکر لوگوں کی تعداد کے درمیان طے پانا چاہیے۔ جس طرح نکاح میں ایجاب وقبول ضروری ہے اسی طرح جس کا نام امارت/خلافت کے لیے تجویز کیا جائے اس کا علی الاعلان بھرے مجمع میں قبول کرنا ضروری ہے اور حاضرین کا بیعت کر کے اپنی قبولیتِ امیر کا اعلان کرنا بھی ضروری ہے۔

چونکہ اسلام نکاح کے بعد چوری چھپے زنا کرنے والوں ___ دو روحوں اور جانوں ___ کو پتھر مار مار کر ختم کرنے کی سزاء سناتا ہے، اس لیے ان دو کی سزاء بھی موت اور قتل ہے جو چوری چھپی امیر کو تجویز کرتا ہے اور اسکے ہاتھ پر کسی بھی وجہ سے، بیعت بھی کرتا ہے اور وہ امیر بھی مستحق قتل ہے جو اس بیعت کو قبول کرتا ہے۔ آپ شادی شدہ جوڑے کے زنا کو معاشرتی خیانت کا گناہ کبیرۃ قرار دیکر رجم کا حکم دیتے ہیں تو چوری چھپی ایک شخص اگر بیعت کر لیے اور دوسرا شخص امیر بن جائے بیعت قبول کر کے تو یہ سیاسی خیانت ہوئی جو ایک گناہ کبیرہ ہے اور جسکی سزاء قتل ہی ہے۔

یہی وہ حکیمانہ دستوری اور قانونی فیصلہ تھا جو سیدنا عمرؓ نے اس خطبہ میں سنایا اور اس کے لیے بیعت کرنے اور بیعت قبول کرنے والے دونوں شخصوں کو موت کی بشارت سنائی کیونکہ اس کے ذریعہ وہ امت کو اس کے حق اختیار خلیفہ/حاکم سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔

۲) اب جہاں تک لوگوں کا اپنے باپوں کی طرف اپنے آپ کو منسوب نہ کرنے کا تعلق ہے تو اس کا گھناؤنا پن دو طرح سے ظاہر ہوتا ہے:

(أ) اس سے ماں پر زانیہ ہونے کا الزام عائد ہوتا ہے اس کے بالمقابل جو ایک حلال نکاح سے پیدا ہونے والا بچہ یا بچی ہرگز سوچ بھی نہیں سکتا/سکتی ہے یہاں تک کہ وہ علی الاعلان اس کا اعلان بھی کر دے۔

(ب) اس سے اس باپ کی ناشکری بھی ثابت ہوتی ہے جس نے اس بچہ/بچی کو

بچپن سے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے پال پوس کر بڑھا کیا۔ بجائے اسکے وہ اس کا شکر گزار ہوکر فرمان بردار بنے وہ اس کا باپ ہونے سے انکار کر کے اس کی ذلت اور توہین کرتا رکرتی ہے۔

اس سے اسلامی معاشرہ میں قذف ـــــ تہمتِ زنا ـــــ اور انکار ابُوت (باپ ہونا) کے مسائل کھڑے ہوسکتے ہیں جو معاشرہ میں بے حیائی پھیلانے اور زنا کو آسان کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔

اس لیے وہ دو لوگ جو تاریکیوں میں سازش کے ذریعہ یا قوت وطاقت اور تلوار کے بل بوتے پر بیعتِ امیر کا ناجائز بچہ اسلامی معاشرہ کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں، ان دونوں کی سزاء بھی شادی شدہ جوڑے کی سزاء کی طرح موت ہی ہونی چاہیے خواہ دونوں کی سزاؤں کی شکلیں مختلف ہی کیوں نہ ہوں مگر دونوں کا نتیجہ موت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

۳) رہا سیدنا عمرؓ کا سیدنا ابوبکرؓ کی تعریف وتوصیف کرنا تو وہ اس لیے ضروری تھا کہ تلوار یا قوت یا طاقت کے ذریعہ انصارؓ اور مہاجرینؓ کو بیعت پر مجبور نہیں کرنا تھا بلکہ آپؓ کی ان بعض خاص الخاص صفات اور خصوصیات کو یاد دلانا تھا جن کو بالاتفاق سب مہاجرینؓ اور انصارؓ جانتے تھے اور ان کے معترف بھی تھے۔

اس لیے الیکشن کی صورت میں لوگ امیدوار کی برحق تعریف وتوصیف اس کے سابقہ کردار، جدوجہد علم وفضل وتجربات اور علمی اور عملی صلاحیتیں بیان کرسکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس پروگرام کی بنیاد پر وہ ووٹ مانگ سکتا ہے جو وہ عوام کے سامنے اپنے اور اپنی پارٹی کی طرف سے پیش کر رہا ہے۔ یہ امور نہ صرف جائز بلکہ ضروری بھی ہیں تاکہ عوام مطمئن ہوکر اپنے ووٹوں کا صحیح استعمال کرسکیں۔

اسی طرح انتخابِ امیر کے وقت ان لوگوں کا جو کسی خاص شخص کو امیر بنانا چاہتے ہیں، دوسروں کو ہم رائے بنانے یا پھر مطمئن کرنے کے لیے، اس کے اوصاف اور خدمات بیان کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ خود کسی منصب یا عہدہ کا

خواہش مند نہ ہو۔لوگ خود آگے بڑھکر ،اس کو اس کالائق اور مستحق سمجھ کر اس کو وہ منصب اور یہ عہدہ عطا کرنا چاہتے ہوں۔

اس کے بعد دو چار افراد میں سے ،اکثریت جس کو بھی قبول کر لے، وہ امیر قابل اطاعت امیر ہوگا۔

اس حدیث سے جماعت سازی کا ثبوت بھی ملتا ہے۔انصارؓ یہاں ایک جماعت تھے جبکہ مہاجرین ایک دوسری جماعت تھے۔ ہر جماعت نے بہ حیثیت جماعت اپنی اپنی جماعت کے اوصاف اور خصوصیات بیان کیئے۔اس کے بعد بحث ہوئی۔ بالآخر بات سیدنا عمرؓ کی پہل کی وجہ سیدنا ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر بات ختم ہوئی۔

اس طرح کسی بھی مسلم معاشرہ میں جماعتیں اپنے پروگراموں اور امیروں کی خوبیاں اور پارٹی کی کامیابیاں اور کارنامے بھی بیان کر سکتے ہیں اور ان کی بنیاد پر عوام سے ووٹ مانگ سکتے ہیں۔

اس سے اسلام کے سیاسی نظام کے (مزید) پہلو اور خدوخال ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اس عظیم حدیث اور اس کے مضامین اور موضوعات کے بارے میں' یہی کچھ امور میرے دماغ میں آئیے ہیں۔

جماعتوں رفریقوں PARTIES کی حیثیت سے شریک ہونے کی مثال ہمیں حیاتِ نبیؐ میں اس وقت ملتی ہے جب آپؐ نے "میثاق مدینہ" کو تحریری شکل دی۔یہی وہ "میثاق مدینہ" ہے جس کو دنیا کا پہلا تحریری دستور ہونے کا شرف حاصل ہے۔اس پر دستخطِ شمولیت مہاجرینؓ، انصارؓ اور یہود نے علیحدہ علیحدہ گروپس کی حیثیت سے کی جن پر بعض اجتماعی ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں۔

اس عظیم حدیث سے اخذ کردہ نتائج کا خلاصہ

یہ عظیم حدیث ہم کو اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں یہ بتاتی ہے کہ:

۱) اس میں کہا گیا ہے کہ انتخابِ خلیفہ/حاکم کا عمل ایک کھلا عمل Process ہے جسکو علی الاعلان مسلمانوں کی رائے اور مشورے سے طے پانا چاہیے۔ظاہر بات ہے کہ تبدیلیء زمانہ کے بعد طریق انتخاب میں بھی تبدیلی آئے گی۔آج کل کے حالات میں اگر کوئی مسلم ملک اور معاشرہ بہت زیادہ ترقی یافتہ ہوتو پھر گھر بیٹھے ووٹرس اپنی رائے الکٹرانک ووٹنگ سسٹم کے ذریعہ دے سکتے ہیں۔

اس میں صدر ریاست/خلیفہ کا الگ سے انتخاب ہوسکتا ہے اور ممبران پارلیمنٹ کا انتخاب بھی الگ سے ہوسکتا ہے۔یہ سب طرز حکومت پر منحصر ہے کہ آیا وہ صدارتی ہے یا پارلیمانی یا دونوں کا متوازن امتزاج ہے۔

مختلف ملکوں کے حالات کے لحاظ سے ان میں کسی کو بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔
تجربات کے بعد اس میں تبدیلی بھی لائی
جاسکتی ہے۔اس کے علاوہ نئے طرز کا طریقۂ حکومت بھی سوچا جاسکتا ہے۔

......مگر......

ان سب کی اساس اور روح آزادانہ انتخاب/انتخابات پر رکھی جانی چاہیے۔

۲) باالفاظ دیگر اس کا مطلب فوجی انقلابات اور یا وراثتی طرز حکومت کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔خود خلفائے راشدینؓ کے عہد میں جہاں سیدنا ابوبکرؓ کا تقرر انتخاب کے ذریعہ ہوا وہیں انہوں نے عمرؓ کو جانشین بنایا لیکن خیال رہے کہ یہ ان کی صلاحیتوں اور قربانیوں کی بنیاد پر تھا کیونکہ وہ انکے رشتہ دار نہ تھے۔

سیدنا عمرؓ نے چند حضرات کی کمیٹی بنادی جن میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا تھا۔یہ کام جناب عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے حوالے کیا گیا تھا جنھوں نے رائے عامہ ______ ہاں رائے عامہ ____ کی روشنی میں سیدنا عثمانؓ کو خلیفہ مقرر کیا۔حالات کے لحاظ سے اس کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں جن کی رعایت ضروری ہے۔

۳) جو لوگ سیدنا داؤد علیہ السلام کے بادشاہ ہونے کی بنا پر اسلام میں بادشاہیت

کی گنجائش پر استدلال کرتے ہیں وہ غلط ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب بات عدل اور عدم اتباع ہواء کی آئی تو فرمایا اور مخاطب کیا لفظ "خلیفہ" سے: یٰدا ودانا جعلنا ک خلیفه فی الارض فاحکم بین الناس بالعدل ولاتتبع الھویٰ فیضلک عن سبیل الله ج ان الذی یضلون عن سبیل الله لھم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب (ص۔۲۷)

(اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں (ہمارا) خلیفہ بنایا ہے۔ اس لیے لوگوں کے درمیان انصاف سے حکومت کرو اور خواہشات کی پیروی نہ کرو کیونکہ خواہشات کی پیروی اللہ کے راستے سے دور کر دیتی/ہٹا دیتی ہے۔ بے شک وہ لوگ جو اللہ کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں ان کے لیے یوم حساب کو بھول جانے کی وجہ سے شدید عذاب ہے۔)

دیکھئے یہاں خلافت کی/خلیفہ کی ذمہ داریاں یوں بیان کی گئی ہیں:

أ) اقامت عدل وانصاف جو صرف (۲) عدم اتباع ھویٰ سے ممکن ہے یعنی اتباع ھویٰ عدل کا حقیقی دشمن ہے۔ اتباع ھویٰ سے ظلم پیدا ہوتا ہے اس لیے ظالمین کے لیے شدید عذاب ہے۔

اب رہا سیدنا سلیمان علیہ السلام کا وارث ملک ونبوت ہونا تو یہ امر الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اقتدار کے مالک ہیں جو جس کو چاہیں اقتدار عطا کر سکتے ہیں۔ اسلئے مشیت الٰہی کا تقاضا تھا کہ ان کو حکومت کے ساتھ نبوت بھی عطا کی گئی جبکہ طالوت کو حکومت دی گئی تھی تو کسی اور کو نبوت عطا کی گئی تھی۔ بہرحال یہ الٰہی فیصلے تھے۔ اب ہمارے لیے شوریٰ کا عملی نمونہ سقیفہ بنی ساعدہ کا اجتماع اور اس کی کارروائی اور اس کے فیصلے ہیں۔ اس میں انتخاب کے ذریعہ امتِ مسلمہ نے "انتخابی حکومتوں" کی راہ انسانیت کو دکھائی ہے جس پر فخر خواہ مخواہ برطانیہ، یورپ اور امریکہ کر رہے ہیں ورنہ یہ تسلسل جاری رہتا تو آج ہر طرف خلافت کا ڈنکا بجتا۔ لله المراد فیما أراد۔

۴) اب احکام سلطانیہ کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اب صرف احکام الھیہ ہی چلیں گے۔ پہلے دن ہی سازشوں کو ختم کر دیئے۔

میں امت کی فلاح ہے ورنہ استبداد سینکڑوں گنا زیادہ قتل کرتا ہے اور امت کو ہر طرح بانجھ بھی کرتا ہے اور اس پر پسماندگی اور فقر و فاقہ مسلط کرتا ہے۔

۵) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رجم نہ صرف سنت سے بلکہ قرآن مجید سے ثابت ہے۔ تورات بھی اس پر شاہد ہے۔

۷) نہایت اہم نکتہ یہ ہے کہ ہم اطاعت امیر کے بارے میں واردہ احادیث کو کیسا پڑھیں؟ میری رائے میں چونکہ ان احادیث کا کوئی پس منظر نہیں بیان کیا گیا ہے اس لیے ان کو موافق اور مخالف دونوں اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر لیتے ہیں۔

لیکن......

اس عظیم حدیث کے ملنے کے بعد ہمارے ہاتھ اصلی ڈور آ گئی ہے یعنی اگر امیر /خلیفہ/ حاکم کا انتخاب مسلمانوں کے مشورہ سے ہوا ہے تو اگر وہ امیر حبشی غلام کی طرح کالا کلوٹا اور بدصورت کیوں نہ ہو اسکی اطاعت واجب ہے کیونکہ مسلمانوں کے مشورہ سے وہ حکومت کرر ہا ہے۔

اگر انتخاب کے کچھ عرصے بعد اس میں شخصی، دینی اور حکومتی امور میں "انحراف" دکھائی دے تو اگر حالات معمول پر ہوں اور کوئی ایمرجنسی نہ ہو تو اُسے مشورے کے ذریعہ راستے پر لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر وہ راستے پر نہ آئے اور ٹال مٹول سے کام لے تو ان مسلمانوں کو جنھوں نے اسے منتخب کیا تھا یا ان کے نمائندوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی رائے واپس لے کر اسے معطل کریں اور اس کو اس کے منصب سے ہٹادیں۔ اگر وہ مزاحمت کرے تو بغاوت کی جا سکتی ہے کیونکہ دستور کو توڑنے اور معطل کرنے میں پہل اس نے ہی کی تھی۔

متذکرہ نکات کچھ تعبیریں حمید اللہ مرحوم کی معروف کتاب محمد رسول اللہ ﷺ میں بھی نظر آتی ہیں۔ جیسے ۲۰۱۱ کے اسلامک بک فاؤنڈیشن کے تیسرے اڈیشن میں صفحہ ۱۰۹، صفحہ ۲۶۴ میں اور صفحہ ۲۶۸ میں نظر آئینگی: پھر ابو بکرؓ نے لوگوں کو جمع ہونے کیلئے کہا،

اُنھوں نے اِجلاسِ عام کیا تا کہ وہ سقیفہء بنی سعدہ کے فیصلہ کو قطعی تصور نہیں کرتے تھے اور اب ہر شخص خلافت کے فیصلہ پر رائے دینے کے لئے آزاد ہے کہ وہ جسے چاہیں خلافت کے لئے منتخب کرلیں مگر کسی نے سقیفہ کے فیصلے کی مخالفت نہیں کی اور حاضرین نے متفقہ طور پر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کا اِقرار کیا۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلیفہ کا اِنتخاب کھلی اور آزاد فضا میں ایک یا ایک سے زائد بار بھی ہونا چاہیئے تا کہ اِختلاف کی جڑ کاٹ سکے۔ یہی کچھ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کیا تھا جنھیں خلیفہ خامس کہا گیا ہے۔ اِسکا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ولی عہد کی بیعت ایک بادشاہ کے اِنتقال کے بعد پھر سے اسکی تصدیق لوگوں کی عقل کا مزاق اُڑانا نہیں تو اور کیا ہے۔ اِس سے ولی عہد کے بطلان کی دلیل ہمارے ہاتھ لگتی ہے۔

اس امور کے متعلق دستور میں' انسانی تجربات کی روشنی میں ،بعض دفعات کا اضافہ کیا جاسکتا ہے جن میں حاکم کی کم از کم یا زیادہ سے زیادہ عمر' مدت انتخاب' عزل کے اسباب اور طریقہء کار اور مقدمہ چلانے کے احکام شامل کئے جاسکتے ہیں ۔وغیرہ وغیرہ

اہل علم وقلم سے امید ہے کہ وہ اس حدیث کا بغور مطالعہ فرما کر اس کے مزید پہلوؤں اور گوشوں پر روشنی ڈال کر سب کو استفادہ کا موقعہ عنایت فرمائیں گے ۔

علاوہ ازیں ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ احادیث نبویہ شریفہ کے اندرونی، بیرونی اور کلی نظموں کے بارے میں مزید چھان بین کر کے اظہار خیال کریں گے تا کہ بات آگے بڑھ سکے۔

الحمدللہ اولاواخیراً والصلاۃ والسلام علیٰ سیدنا ونبینا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ الطیبین الطاہرین واصحابہ المیامین.

☆☆☆

''الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ'' لابن القیم کا مطالعہ

مزمل کریم*

یہ کتاب الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ علامہ ابن القیم الجوزیہ کی اہم تصانیف میں سے ایک ہے۔ آپ علامہ ابن تیمیہ کے مایہ ناز شاگرد ہیں اور مختلف مسائل میں آپ نے ان کی آراء پر اعتماد کیا ہے۔ اس کتاب میں آپ نے اسلامی حکومت کو پیش آنے والے مقدمات اور مسائل کے حل کے شرعی طریقوں پہ بحث کی ہے اور اس کو ۳۲۷ فصول میں تقسیم کیا ہے۔ اس مقالہ میں میں نے کتاب کا معروضی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

جسے شریعت کا صحیح علم ہوگا وہ یہ جان لے گا کہ شریعت جو فیصلہ کرتی ہے نہ اس سے بہتر فیصلہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس کے پیش کردہ مصلحت سے بہتر کوئی مصلحت ہوسکتی ہے، سیاست اسلام کا ایک جز ہے اور جسے شریعت کا فہم کامل ہوگا وہ کسی بھی حالت میں کسی دوسری شریعت کی طرف رجوع نہیں کرے گا۔[۱]

حاکم کو قرائن اور حالات کے فہم کی اچھی صلاحیت ہونی چاہیے، کیوں کہ یہ صحیح فیصلہ تک پہنچانے میں بہت معاون ہوتے ہیں جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کی براءت کا فیصلہ قرائن حال کی بنیاد پر کیا گیا، فرمایا گیا:

''إِن كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ.
وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ''
(۱۲/ ۲۷)

---

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، اے-ایم-یو، علی گڑھ

(اگر یوسف کا قمیص آگے سے پھٹا ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا اگر اس کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہو تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچا۔)

سیاست کی دو قسمیں ہیں سیاست ظالمہ جسے شریعت حرام قرار دیتی ہے، سیاست عادلہ جو کہ شریعت کا ہی ایک جز ہے۔[۲]

جب فریق اپنے پاس مدعی کا سامان نہ ہونے کا دعوی کرے اور مدعی تلاشی کا مطالبہ کرے تو قاضی کے لیے تلاشی لینا ضروری ہے تاکہ حق دار کو اس کا حق پہنچ سکے، جیسا کہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کا خط عورت سے مانگا گیا تو اس نے نہ ہونے کا دعویٰ کیا تو حضرت علی نے کہا کہ اگر تم نے نہیں نکالا تو تمہارا کپڑا اتار کر تمہاری تلاشی لے جائے گی چنانچہ پھر اس نے اپنی چوٹی سے خط نکال کر حضرت علیؓ کے حوالے کیا۔

پھر صاحب کتاب فرماتے ہیں کہ بینہ اسے کہتے ہیں جو حق کو واضح کرے، بعض لوگوں نے بینہ کو شاہد کے ساتھ خاص کیا ہے حالاں کہ قرآن وحدیث میں دلیل، حجت اور برہان کے معنی میں استعمال ہوا ہے خواہ وہ شاہد کی شکل میں ہو یا قرائن اور دلائل کی شکل میں۔[۳]

امام شافعیؒ کے حوالے سے علامہ ابن القیم فرماتے ہیں کہ سیاست وہی ہے جو شریعت کے موافق ہو، ابن عقیلؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ اس طرح معاملہ کیا جائے جو ان کی صلاح سے زیادہ قریب اور فساد سے دور ہو گرچہ اس سلسلے میں کوئی وحی نازل نہ ہوئی ہو، کیوں کہ اگر یہ کہا جائے کہ صحیح سیاست وہی ہے جس کے بارے میں کوئی آیت نازل ہوئی ہو تو یہ تعریف غلط ہے، جیسا کہ خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ کرامؓ کے عمل سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت عثمانؓ کا جمع قرآن کے وقت دیگر مصاحف کو جلا دینا وغیرہ۔ اس سلسلے میں کوئی آیت نازل نہیں ہوتی تھی، ص ۱۲-۱۴۔ اس کا نام سیاست عام اصطلاح کی رعایت کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ ورنہ اصلاً تو یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا عدل ہے۔[۴]

امام موصوف لکھتے ہیں حاکم اپنے فیصلے میں عرف اور عادت کی رعایت کرے گا اور شریعت اس کی اجازت دیتی ہے مثلاً اگر کسی نے جانور کو کرایہ پر لیا تو جانور کے صحیح سے

نہ چلنے پر مستاجر اسے مار سکتا ہے گرچہ عقد کے وقت ایسی کوئی بات نہ ہوئی ہو۔[5]

علامہ موصوف نے کتاب کے ایک فصل میں ان ولاۃ اور حکام کے واقعات بیان کیے ہیں جو دلائل اور قرائن کے صحیح فہم کے نتیجہ میں درست رائے تک پہنچے، للٰہذا فقہاء نے یہ صراحت کی ہے کہ جب حاکم کو شہادت پر شک ہو تو وہ پوچھے گا کہ تم نے کیسے اور کہاں سے یہ شہادت حاصل کی اور جب دعویٰ پر شک ہو تو مدعی سے حق کا سبب اور ذریعہ پوچھے گا اور اس کے حالات کے بارے میں غور کرے گا اور جب مدعی علیہ پر شک ہو تو حالات کی تفتیش کرے گا مثلاً حضرت عمرؓ کے پاس ایک عورت آئی اور کہا کہ میرے شوہر دنیا کے بہترین لوگوں میں سے ہیں وہ رات بھر قیام کرتے ہیں اور دن بھر روزہ رکھتے ہیں پھر حیاء اس کے آڑے آ گئی، آپؓ نے جزاک اللہ کہا، جب وہ عورت چلی گئی تو کعب بن سور نے کہا کہ اس نے بہت بلیغ انداز میں آپؓ تک شکایت پہنچائی ہے آپؓ نے کہا اس نے کس کی شکایت کی ہے، کعبؓ نے کہا اپنے شوہر کی اور آپؓ ان کے درمیان فیصلہ کیجیے، تو آپؓ نے کہا تم خود فیصلہ کرو کیوں کہ تم وہاں تک پہنچ گئے ہو جہاں میں نہیں پہنچ سکا، حضرت کعبؓ نے کہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ......الیٰ آخرہ۔ (جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرلو۔ الیٰ آخرہ (۴/۳)۔ اور پھر شوہر کو حکم دیا تم تین دن روزہ رکھو اور ایک دن بغیر روزہ کے رہو اور اس کے پاس دن گزارو، اور تین دن قیام اللیل کرو اور ایک رات اس کے ساتھ گزارو، حضرت عمرؓ حضرت کعبؓ کی فراست سے بڑے خوش ہوئے اور انھیں بصرہ کا قاضی بنا دیا۔

قاضی کے لیے حدود کے علاوہ معاملات میں ایک آدمی کی شہادت پر فیصلہ کرنا جائز ہے جب کہ حق واضح ہو جائے، شریعت نے صرف دو شاہد پر فیصلہ کرنا واجب نہیں قرار دیا ہے، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شاہد اور یمین پر فیصلہ کیا۔ نص قرآنی ہے کہ: وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ ......۔ ترجمہ: (پھر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو اس پر گواہ کرلو اگر

دومرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔) (۲/۲۸۲)

اور آپؐ نے محض ایک شاہد اور یمین پر فیصلہ کیا لیکن صاحب فہم کے نزدیک کتاب اللہ اور فرمان رسولؐ میں کوئی اختلاف نہیں ہے قرآن "فرجل وامرء تان" تک ذکر کرکے خاموش ہوجاتا ہے پھر آگے وضاحت سنت رسول کرتی ہے جس طرح دیگر جہت سے امور قرآن کے بجائے سنت رسولؐ سے ثابت ہیں مثلاً لا وصیة لـــوارث. الرجم علی المحصن ، قطع الوارثة بین أهل الاسلام وأهل الکفر۔ دراصل ایک مرد دو عورتوں کی شرط اس وقت ہے جب وہ دونوں پائے جائیں اور جب دو عورتیں نہ ہوں تو یمین ان کے قائم مقام ہوجاتی ہے۔[۶]

دعوی کے سلسلے میں اہل مدینہ کا مذہب

دعوے تین طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) ایسا دعویٰ جس میں عرف مشابہت کی شہادت دیں یعنی حالات سے معلوم ہو کہ مدعی کا دعویٰ حق ہوسکتا ہے۔

(۲) جس میں عرف دعویٰ میں مشابہت نہ ہونے کی شہادت دیں مگر جھوٹ ہونے کا بھی فیصلہ نہ ہوا ہو۔

(۳) جس میں عرف دعوی کے جھوٹے ہونے کی شہادت دیں۔

پہلا مثلاً کوئی مسافر اپنے رفیق کے پاس امانت رکھنے کا دعویٰ کرے، ایسا دعویٰ سنا جائے گا اور مدعی پر بینہ پیش کرنا لازم ہوگا اور مدعی علیہ سے قسم لی جائے گی۔ دوسرا یہ کہ کوئی بہت مشہور مالدار آدمی پر دعویٰ کرے کہ اس نے اپنے نان ونفقہ کے لیے مجھ سے قرض لیا تھا۔ یہ دعویٰ بھی سنا جائے گا اور مدعی پر بینہ پیش کرنا لازم ہوگا۔

تیسرا یہ کہ ایک عورت کئی سالوں کے بعد یہ دعویٰ کرے کہ اس کے شوہر نے اب تک اسے نان ونفقہ میں سے کچھ نہیں دیا تو اس طرح کے دعوے نہیں سنے جائیں گے کیوں کہ عرف میں ایسا نہیں ہوتا، خاص طور پر اس وقت جب بیوی غریب اور شوہر مالدار

ہو، بعض علماء نے کہا کہ مدعی کے دعوے پر مدعی علیہ قسم نہیں کھائے گا کیوں کہ اگر ہر طرح کے الٹے سیدھے دعوے کر کے مدعی علیہ کو عدالت میں گھسیٹ کر قسم کھلوانے پر مجبور کر دیا جائے تو یہ صاحب مروت اور شرافت کو ذلیل کرنے کا ایک ذریعہ بن جائے گا اور یہ کہ عرف کی رعایت کرنا واجب ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے۔ **وأمر بالعرف۔** ۷

علامہ موصوف اگلی فصل میں فرماتے ہیں جو شخص لوگوں کے امور کا ذمہ دار بنایا جائے تو عدل کے ساتھ اور کتاب اللہ و سنت رسولؐ کے ذریعہ فیصلہ کرے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔** ترجمہ: (ہم نے رسولوں کو صاف صاف اور نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔) (۲۵/۵۲) پھر آگے فرماتے ہیں کہ دعویٰ کی دو قسمیں ہیں دعویٰ تہمت و دعویٰ غیر تہمت۔

دعوت تہمت: کسی حرام فعل کا دعویٰ کیا جائے جس میں سزا واجب ہوتی ہو مثلاً قتل، ڈاکہ زنی، ان حالات میں بینہ کا قائم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

دعوی غیر تہمت: کسی عقد کا دعویٰ کیا جائے مثلاً بیع، قرض، رہن وغیرہ۔ ان سب میں اگر مدعی ثبوت پیش کر دے تو اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے گا ورنہ مدعی علیہ کا قول یمین کے ساتھ معتبر ہوگا جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے: ''اگر لوگوں کو ان کے دعوی کے مطابق دے دیا جائے تو لوگ عوام کے خون اور مال کا دعویٰ کرنے لگیں گے لیکن یمین مدعی علیہ پر واجب ہوتی ہے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض دعویٰ کرنے پر کسی کے حق میں فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یمین ہمیشہ منکر (مدعی علیہ) کی جانب سے ہوگی البتہ دوسرے علماء کے نزدیک جانبین میں سے مضبوط فریق کے اوپر ہوگی۔ ۸

اب آپ فیصلہ کرنے کے مختلف طریقوں پہ بحث کرتے ہیں۔

پہلا طریقہ:

فیصلہ کی دو قسمیں ہیں: اثبات اور الزام

اثبات کا انحصار صدق پر ہوتا ہے اور الزام کا عدل پر جیسا کہ ارشاد باری ہے۔
وتمت کلمة ربک صدقا و عدلا ۔ترجمہ (تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے)۔(۱۱۵/۶) خالی ہاتھ کو یمین کی ضرورت نہیں ہوتی ہے مثلاً کوئی شخص میت پر موجود کفن کے بارے میں یہ دعویٰ کرے کہ یہ اس کا ہے اور کوئی بینہ بھی نہ ہوتو بغیر کسی یمین کے کفن اسے دیا جائے گا جس کے اوپر ہے۔۹

دوسرا طریقہ:

بغیر کسی بینہ کے یہ دعویٰ کیا جائے کہ قاضی نے اس کے خلاف غلط فیصلہ کیا ہے تو محض الزام پر قاضی کو ارتفاع منصب کی وجہ سے قسم نہیں کھلائی جائے گی۔

تیسرا طریقہ:

صاحب قبضہ یک گونہ فوقیت رکھتا ہے لہٰذا اگر ایک شخص نے کسی کے ہاتھ میں موجود کسی چیز کا دعویٰ کیا اور اس نے انکار کیا تو پھر اس سے قسم کا مطالبہ کیا جائے گا اگر اس نے قسم کھالی کہ یہ میرا ہے تو فیصلہ اسی کے حق میں کیا جائے گا۔لیکن اگر کوئی ظاہری قرینہ یہ بتا رہا ہو کہ صاحب قبضہ باطل پر ہے مثلاً کوئی شخص بھاگ رہا ہے، اس کے ہاتھ میں ایک عمامہ ہے اور اس کے سر پر بھی ایک عمامہ ہے اور ایک دوسرا شخص ننگے سر اس کے پیچھے دوڑ رہا ہے حالاں کہ عادتاً وہ ننگے سر نہیں ہوتا تو قطعی طور پر یہ کہا جائے گا کہ عمامہ جس کے ہاتھ میں ہے وہ اس کا نہیں بلکہ دوسرے شخص کا ہے۔۱۰

چوتھا اور پانچواں طریقہ:

قسم سے پیچھے ہٹنے پر فیصلہ انکار کرنے والے کے خلاف کیا جائے گا جیسا کہ مسند احمد کی ایک حدیث ہے کہ عبداللہ بن عمر حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس آئے، حضرت عثمانؓ نے ان سے کہا کہ قسم کھاؤ کہ تم نے غلام کو اس حالت میں نہیں بیچا تھا کہ اس میں عیب تھا، تو ابن عمرؓ نے قسم کھانے سے انکار کیا تو حضرت عثمانؓ نے غلام انھیں واپس کر دیا۔اس طرح حاکم تین بار قسم کھانے کے لیے کہے گا اور قسم نہ کھانے کی صورت میں فیصلہ اس کے خلاف کر دیا جائے گا۔

چھٹا طریقہ:

بغیر یمین کے محض ایک آدمی کی شہادت پر فیصلہ۔ مثلاً کوئی رمضان کا چاند دیکھنے کی شہادت دے، امام احمدؒ کا ظاہری مذہب یہی ہے ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے چاند دیکھنے کی کوشش کی، پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کو خبر دی کہ میں نے اسے دیکھا ہے چنانچہ آپؐ نے روزہ رکھا اور لوگون کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (ابوداؤد)

البتہ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دو شہادتیں ضروری ہیں، عبدالرحمان بن زید بن خطابؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: صوموا لرؤیته وأفطروا لرؤیته وأمسکوا فان غم علیکم فأتموا ثلاثین یوما فإن شهد شاهدان ذوا عدل فصوموا وأفطروا ۔ترجمہ: (چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو اور اسی پر قائم رہو، اگر بادل چھا جائیں تو تیس دن مکمل کرو اور اگر دو عادل گواہ شہادت دیں تو پھر روزہ رکھو اور افطار کرو۔)

امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ اگر آسمان میں بادل ہو یا کوئی چیز دیکھنے میں مانع ہو تو ایک عادل شخص کی گواہی قابل قبول ہوگی لیکن اگر آسمان صاف ہو اور کوئی چیز دیکھنے میں مانع نہ ہو تو ایک شخص کی گواہی معتبر نہ ہوگی۔[۱۱]

ساتواں طریقہ:

ایک شاہد اور یمین پر فیصلہ کرنا، یہ تمام علماء حدیث اور علماء فقہ کا مذہب ہے، سوائے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے۔ صحیح مسلم میں ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے ایک شاہد اور یمین پر فیصہ کیا"۔ آگے فرماتے ہیں کہ جب ایک شاہد اور یمین پر فیصلہ کیا جائے تو فیصلہ دراصل تنہا شاہد پر ہوتا ہے اور یمین تقویت اور تو کید کے لیے ہوتی ہے لہٰذا اگر شاہد اپنی شہادت سے رجوع کر لے تو پورا ضمان اسی پر ہوگا۔[۱۲]

آگے آپ فرماتے ہیں شہادت دینا کسی شخص پر واجب نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کہے کہ میرے لیے فلاں شخص شاہد ہے اور وہ شہادت سے انکار کرے تو قاضی زبردستی اس سے شہادت نہیں دلوائے گا، البتہ جب یہ شہادت ایک حق کی صورت میں ہو تو

قاضی اس کو حاضر کرے گا، پھر فرمایا کہ متعین شہادت شاہد پر فرض ہے اور اس کی ادائیگی ضروری ہے ترک کرنے کی صورت میں گنہگار ہوگا جیسا کہ ارشاد باری ''لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ......'' ۔ترجمہ: (اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ جو شہادت چھپاتا ہے اس کا دل گناہ میں آلودہ ہے۔) (۲/۲۸۳)۔[۱۳]

آٹھواں طریقہ:

ایک مرد اور دو عورتوں کی بنیاد پر فیصلہ کرنا، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

''وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى'' (۲/۲۸۲)

(پھر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو اس پر گواہ کرلو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، جن کی شہادت سے تو راضی ہو، اس میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔)

ہر اس جگہ ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت درست ہے، جہاں ایک مرد اور یمین پر فیصلہ کرنا درست ہے، لہٰذا جب مرد خلع کا دعویٰ کرے تو ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت جائز ہے لیکن جب عورت دعویٰ کرے تو دو مردوں کی گواہی ضروری ہے، دونوں مسئلوں میں فرق یہ ہے کہ جب مدعی شوہر ہو تو گویا وہ مال کا دعویٰ کر رہا ہوتا ہے تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی اس کے لیے کافی ہے، لیکن جب عورت دعویٰ کرتی ہے تو گویا وہ فسخ نکاح کا دعویٰ کرتی ہے اور مسند احمد کی روایت ہے کہ ''نکاح اور طلاق میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں ہے''۔[۱۴]

نواں طریقہ:

ایک شاہد کی موجودگی میں نکول (یمین سے احتراز) پر فیصلہ کرنا عمرو بن شعیب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا جب عورت اپنے شوہر پر طلاق کا دعویٰ کرے اور ایک عادل گواہ پیش کرے، تو اس کے شوہر سے قسم کھلوایا جائے گا، اگر اس

نے قسم کھالیا تو شاہد کی شہادت باطل ہو جائے گی اگر اس نے قسم کھانے سے احتراز کیا تو یہ ایک دوسرے شاہد کے برابر ہو جائے گا اور طلاق جائز ہوگی۔

دسواں طریقہ:

اموال اور حقوق میں دوعورتوں اور مدعی کے یمین پر فیصلہ کرنا، یہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی دوروایوں میں سے ایک ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ دوعورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی عدالت اور صحت ایک مرد کے برابر ہوتی ہے لہٰذا اگر مرد کے بغیر وہ دونوں تنہا گواہی دیں تو ایک مرد کے برابر ان کی گواہی معتبر ہوگی اور یمین کے ساتھ صاحب حق کے سلسلے میں فیصلہ کیا جائے گا۔ ۱۵

گیارھواں طریقہ:

فقط دوعورتوں کی شہادت پر فیصلہ۔ امام احمدؒ کی روایت کے مطابق ان کا مذہب یہی ہے، ہر وہ جگہ جہاں مرد واقف نہیں ہو سکتے وہاں ان کی شہادت معتبر ہوگی، مثلاً عیوب النساءؑ بکارت، ولادت وغیرہ۔

بارھواں طریقہ:

تین آدمیوں کی گواہی پر فیصلہ کرنا، کوئی مشہور مالدار شخص فقیر ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ قبول نہیں کیا جائے گا یہاں تک کہ تین گواہ پیش ہوں، بعض نے کہا کہ دو ہی گواہ کافی ہیں۔ ۱۶

تیرھواں طریقہ:

چار آزاد مرد کی گواہی پر فیصلہ کرنا۔ یہ زنا اور لواطت کے جرم میں ہوگا۔ جیسا کہ نص سے ثابت ہے کہ چار گواہوں کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا۔ وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ ۔ ترجمہ (تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہو ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو۔) (۴/۱۵)

مسئلہ لواطت کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے گا کیوں کہ عمل قوم لوط کو بھی فحش سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا گیا: ''أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ '' ترجمہ: (کیا تم آنکھوں

دیکھ بدکاری کرتے ہوئے) (۵۴/۲۷) البتہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس مسئلہ میں دو گواہوں کی شہادت کافی ہے۔ ۱۷

چودھواں طریقہ:

ہروہ جگہ جہاں آزاد مرد وعورت کی شہادت قبول کی جاتی ہے ایک غلام یا باندی کی شہادت پر فیصلہ کرنا جائز ہے، علماء کے نزدیک ان کی شہادت قبول کرنے میں کوئی احتیاط نہیں ہے امام احمدؒ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا میں کسی کو نہیں جانتا جو غلام کی شہادت رد کرنے کا قائل ہے، آگے آپ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے بعد کچھ لوگ آئے جنھوں نے غلاموں کی شہادت قبول نہ ہونے کی بات کہی حالاں کہ کتاب وسنت، اجماع وقیاس کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً“ (۲/۱۴۳)

(اس طرح ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔)

الوسط کے معنی عدل اور خیار کے ہیں، بلاشبہ اس خطاب میں غلام بھی شامل ہیں۔

پندرہواں طریقہ:

ہوشمند بچوں کی شہادت پر فیصلہ کرنا، یہ کافی مختلف فیہ مسئلہ ہے، بعض مطلق اس کو رد کرتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ جب وہ متفق ہوں تو ان کی شہادت قبول کی جائے گی جب ان میں اختلاف ہو جائے تو پھر قبول نہ کی جائے گی۔ ۱۸

سولہواں طریقہ:

فاسقین کی شہادت پر فیصلہ- اگر کوئی شخص اعتقاد کے اعتبار سے فاسق ہو مگر دین کا محافظ ہو تو اس کی شہادت قبول کی جائے گی، مثلاً بہت سے اہل بدعت ہیں جن

کے فاسق ہونے کا ہم نے فیصلہ کر رکھا ہے مگر ان کو کافر نہیں قرار دیا جاتا، مثلاً رافضہ، خوارج، معتزلہ وغیرہ۔

البتہ امام احمد بن حنبلؒ نے وہ لوگ جو سر عام اپنی بدعت کا اعلان کرتے ہیں ان کی شہادت قبول کرنے اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے منع کیا ہے تا کہ مسلمان ان کی بدعت کے ضرر سے محفوظ رہیں۔

صاحب کتاب آگے فرماتے ہیں جب فاسق کا صدق معروف ہو تو اس کی شہادت کو رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، جیسا کہ نبیؐ مدینہ کے راستے میں ایک کافر کو رہنما مقرر کیا تھا اور آپؐ کو اس کے قول پر یقین تھا لہٰذا اس کی رہبری قبول کی تھی۔ ۱۹

سترہواں طریقہ:

کافی کی شہادت پر فیصلہ کرنا، اس مسئلہ کی دو صورتیں ہیں:

(۱) کفار کی شہادت باہم ایک دوسرے کے خلاف۔

(۲) کفار کی شہادت مسلمانوں کے خلاف۔

پہلے مسئلہ میں شروع ہی سے کافی اختلاف رہا ہے، بعض نے کہا کہ باہم ایک دوسرے کے خلاف ان کی شہادت جائز نہیں کیوں کہ قرآن کا ارشاد ہے: **فأغرينا بينهم العداوة والبغضاء الى يوم القيامة**۔ ترجمہ: ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور آپس کے بغض و عناد کا بیج بو دیا۔ (۵/۱۴) ایک دوسری جگہ فرمایا: ممن ترضون من الشھداء۔ ترجمہ: جن کی شہادت سے تم راضی ہو۔ (۲/۲۸۰) اور یہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کی شہادت سے ہم راضی ہوں۔

البتہ جو ان کی شہادت کے قائلین ہیں ان کی دلیل زیادہ مضبوط ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے۔ وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ ۔ ترجمہ: اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمہارا مال تمھیں ادا کر دے گا۔ (۳/۷۵) ایک دوسری جگہ فرمایا وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۔ ترجمہ: جو لوگ منکر حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے

ہیں۔ (۷۳/۸) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض بعض کے ولی ہوسکتے ہیں اور ولایت شہادت سے بڑا رتبہ ہے لہٰذا شہادت بدرجۂ اولیٰ قبول کی جائے گی۔ مزید یہ کہ کفار باہم بہت سے معاملات مثلاً بیع وشراء وغیرہ کرتے ہیں اور باہم جرائم بھی واقع ہوتے ہیں لہٰذا جب وہ اپنے مقدمات ہماری عدالت میں لے کر آئیں تو اگر ان کی شہادت رد کردی جائے تو بڑا ظلم واقع ہوگا۔

رہا مسئلہ کفار کی شہادت مسلمانوں پر تو باجماع امت حالت سفر میں ان کی شہادت قبول کی جائے گی جیسا کہ نص قرآنی ہے: أَوْ آخَـرَانِ مِـنْ غَيْـرِكُـمْ إِنْ أَنتُـمْ ضَـرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ ۔ ترجمہ: یا اگر تم حالت سفر میں ہو تو دو غیر لوگوں ہی میں سے دو گواہ لے لیے جائیں۔ (۱۰۶/۵)۔ [۲۰]

اٹھارہواں طریقہ:

اقرار یا قبول جرم کی بنیاد پر فیصلہ کرنا۔ چنانچہ بغیر کسی اختلاف کے اس کو قبول کرنا ضروری ہے۔

اگر قاضی نے اپنے زمانہ ولایت میں کسی چیز یا جگہ کو دیکھا تو کیا وہ اپنے مشاہدہ کی بنا پر فیصلہ کرسکتا ہے؟ صاحب کتاب فرماتے ہیں کہ وہ اپنے علم کی بنا پر فیصلہ نہیں کرے گا، البتہ اگر حادثہ کو دو ایسے آدمیوں نے دیکھا ہے جن کی عدالت کا علم قاضی کو ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ فیصلہ کرے۔ [۲۱]

انیسواں طریقہ:

تواتر کی بنیاد پر فیصلہ کرنا۔ گرچہ خبر دینے والے عادل اور مسلمان نہ ہوں، ایسی صورت میں دو عادل گواہوں کی ضرورت نہ ہوگی، کیوں کہ تواتر کا فائدہ دو عادل گواہوں سے زیادہ ہے، کیوں کہ تواتر یقین کا فائدہ دیتا ہے، دو شاہد ظن غالب کا فائدہ دیتے ہیں۔ [۲۲]

بیسواں طریقہ:

استفاضہ کے ذریعہ فیصلہ کرنا۔ استفاضہ دراصل خبر تواتر اور آحاد کے درمیان کا

درجہ ہے، یعنی وہ مشہور واقعہ جس کے سلسلے میں عوام گفتگو کرنے لگیں، لہٰذا جب کسی کا زنا لوگوں میں مشہور ہو جائے اور پھر شوہر اس عورت قذف باللعان کا مقدمہ کرے تو اس پر اعتماد کیا جائے گا، اور حاکم کا اس خبر پر اعتماد کرنا جائز ہے۔[۲۳]

اکیسواں طریقہ:

خبر آحاد پر فیصلہ کرنا۔ یعنی ایک ایسا عادل شخص خبر دے جو قابل اعتماد ہو لیکن کیا محض اسی کی بنا پر فیصلہ کر دیا جائے گا؟ یہ محتاج تفصیل ہے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی ایسی خبر جڑی ہوئی ہو جو یقین کا فائدہ دیتی ہے تو اس پر فیصلہ جائز ہے۔ اور یہ ایک شاہد کے مماثل ہوگی، یہی جمہور ائمہ کا قول ہے اور اس میں ''میں گواہی دیتا ہوں'' جیسے الفاظ کہنا ضروری نہیں ہے۔[۲۴]

بائیسواں طریقہ:

مجرد تحریر پر فیصلہ کرنا۔ جمہور محدثین کا قول یہی ہے کہ اگر قاضی کے پاس کوئی محفوظ تحریر ہے تو وہ اس پر فیصلہ کر سکتا ہے اور یہ حق تک پہونچنے کا قابل اعتماد ذریعہ ہے۔ اگر تحریر قابل قبول نہ ہوتی تو اسلام کا ایک بہت بڑا حصہ ''سنت رسول'' ضائع ہو جاتی، خود آپؐ بادشاہوں کے پاس خطوط لکھا کرتے تھے اور لے جانے والے سے خط کا مضمون نہیں ذکر کرتے تھے بلکہ مہر بند خط مکتوب الیہ تک پہونچانے کے لیے دیا کرتے تھے۔[۲۵]

تیئیسواں طریقہ:

علامات ظاہرہ پر فیصلہ کرنا۔ چنانچہ دو آدمی اگر کسی ایک تھیلی کا دعویٰ کریں جس میں درہم ہو تو قاضی دونوں سے اس کی علامتیں بیان کرنے کے لیے کہے گا اب اگر ان میں سے ایک گہری خفیہ علامتیں بیان کر دیں اور دوسرے نے دوسری علامتیں بتائیں پھر جانچنے پر پہلے والے کی علامتوں سے مطابقت ہوئی تو تھیلی اس شخص کو دے دی جائے گی، حضرت ابی بن کعبؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تمہارے پاس کوئی شخص آئے اور وہ تمھیں تعداد، برتن اور بندھن کے بارے میں بتلا دے تو وہ اسے دے دو۔ (ص ۲۱۴-۲۱۵)

چوبیسواں طریقہ:

قرعہ اندازی کے ذریعہ فیصلہ کرنا۔ ۲۶؎

پچیسواں طریقہ:

قیافہ کے ذریعہ فیصلہ کرنا، ایسا سنت رسولؐ سے ثابت ہے، خلفاء راشدین اور صحابہ کرامؓ کا بھی اس پر عمل رہا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس آئے دراں حالیکہ ان کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا، آپؐ نے فرمایا، اے عائشہؓ! کیا تم نے مجزر المدلجی کو آتے ہوئے نہیں دیکھا تبھی آپؐ نے حضرت اسامہؓ اور حضرت زیدؓ کو دیکھا، ان کے اوپر ایک چادر تھی جس سے انھوں نے اپنے سر کو ڈھک رکھا تھا، اور ان کے پیر سکڑے ہوئے تھے آپؐ نے فرمایا یہ پیر ایک دوسرے سے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیافہ کے ذریعہ نسب ثابت ہوتا ہے اور رسول ﷺ اس سے خوش ہوئے اور آپؐ کبھی باطل پہ خوش نہیں ہوتے تھے۔ ۲۷؎

فیصلہ ان امور میں جو دعووں پر موقوف نہیں ہوتے

ابھی تک دعوی کرنے پر فیصلہ کرنے کے مختلف طریقوں پر بحث تھی اب ان مسائل پر بحث ہے جو دعویٰ پر موقوف نہیں۔ کوئی بھی شخص جو دو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے وہ ان آیات کے ذیل میں آتا ہے: إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ۔ ترجمہ۔ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ (۴/۵۸)۔ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ ترجمہ: اور جو اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔ (۵/۴۵)

چنانچہ حکام کی ذمہ داری ہے وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فرائض کو انجام دیں۔ اور ان امور میں کسی دعویٰ کے آنے کا انتظار نہیں کریں گے۔ ۲۸؎

سامان بازار میں آنے سے پہلے ہی خرید لینا بائع کو دھوکہ دینا ہے

سامان کو بازار میں آنے سے پہلے ہی خرید لینا جائز نہیں کیوں کہ اس میں بیچنے والے کو دھوکہ دینا ہے چوں کہ بیچنے والے کو بازار کی قیمت معلوم نہیں۔ نبی ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ شہری دیہاتی سے سارا سامان خرید لے بلکہ لوگوں کو چھوڑ دو، اللہ ایک دوسرے کے ذریعہ لوگوں کو رزق دیتا ہے، آپؐ نے جمع خوری سے بھی منع فرمایا۔ لہٰذا اگر جمع خور شخص سامان کو روکے رکھے تاکہ قیمت بڑھ جائے اور لوگ محتاج ہوں تو ولی الامر سامان کو مثل قیمت پر بیچنے پر مجبور کرے گا۔[۲۹]

قیمت کی تعیین کرنا

جب لوگ بغیر کسی زیادتی کے ایک معروف قمیت پر سامان بیچ رہے ہو پھر چیزوں کی کمی یا خریداروں کی کثرت کی وجہ سے قیمت بڑھ جائے تو حاکم زبردستی کسی خاص قیمت پر بیچنے کے لیے مجبور نہیں کرے گا۔ چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں ''نبیؐ کے زمانے میں قیمت بڑھ گئی لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ آپؐ ہمارے لیے قیمت کو متعین کر دیجئے، آپؐ نے فرمایا اللہ ہی تنگی پیدا کرنے والا، رزق دینے والا، کشادگی پیدا کرنے والا اور قیمت متعین کرنے والا ہے''۔

ولی الامر پر اپنی ذمہ داریاں پوری کرنا لازمی ہے

نبی اکرمؐ اپنے عمال کا پورا پورا حساب لیا کرتے تھے اور آمد و صرف کا پورا پورا ریکارڈ رکھا کرتے تھے، چنانچہ صحیحین میں ہے کہ ابن اللتبیہ نامی شخص صدقات کا ذمہ دار بنایا گیا، جب وہ لوٹا تو اس سے حساب لیا گیا، اس نے کہا یہ آپؐ کا حصہ ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، آپؐ نے فرمایا کیا معاملہ ایسے شخص کا جسے ہم نے کسی ایسے کام پر عامل بنایا جس کی اللہ نے ہمیں ذمہ داری دی ہے، پھر وہ کہتا ہے یہ تمہارا حصہ ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں کیوں نہ بیٹھا رہا پھر دیکھتا کیا اسے ہدیہ ملتا ہے یا

نہیں، ہم کسی آدمی کو ایسے کام پر جس کی اللہ نے ہمیں ذمہ داری دی ہے عامل نہیں بنائیں گے کہ وہ چیزوں میں خیانت کرے مگر قیامت کے دن وہ اس کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے گا۔ ۳۰؎

ضرورت کی چیزیں محتاجوں پر خرچ کرنا ضروری ہے

جب کچھ لوگ دوسروں کا سامان عاریتاً لینے پر مجبور ہوں مثلاً کوئی کپڑا جس سے وہ گرمی حاصل کر سکیں، یا ڈول،، ہانڈی اور کلہاڑی وغیرہ تو مالک کو اسے دینا ضروری ہے البتہ کیا وہ اس پر اجرت لے سکتا ہے اس میں اختلاف ہے، جو اجرت لینے کے قائل ہیں وہ اجرت مثل لینا جائز کہتے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ کے مطابق بلا قیمت دینا ضروری ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ. الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ. الَّذِينَ هُمْ يُرَاؤُونَ. وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ''۔ (۱۰۷/۴)

(تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کیلیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو ریا کاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔)

حسب حال سزا اور تعزیر کا حکم

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عمل شرعی سزاؤں کو قائم کر کے ہی ہو سکتا ہے، حدود کو قائم کرنا واجب ہے، سزائیں جرائم کے چھوٹے اور بڑے ہونے کے اعتبار سے دی جائیں گی، تعزیر میں ڈانٹنا، قید کرنا، جلاوطن کرنا، کوڑے مارنا سبھی شامل تھیں، تعزیر میں قتل کرنا بھی درست ہے جب کہ قتل کے بغیر چارہ نہ ہو، مثلاً اس شخص کو جو جماعت میں انتشار پیدا کر رہا ہو۔ صحیحین میں ہے کہ نبیؐ نے فرمایا جب دو خلیفہ کے لیے بیعت کی جائے تو ان میں سے ایک کو قتل کر دو۔ ۳۱؎

حقوق اللہ اوران کی قسمیں

ابن تیمیہؒ نے فرمایا شرعی واجبات جو کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں تین طرح کے ہیں:

(۱) عبادات جیسے صلوۃ، زکوۃ۔ (۲) عقوبات (۳) کفارات

اور ہرایک کی تین قسمیں ہیں۔ بدنی، مالی اور بدنی اور مالی دونوں سے مرکب۔[۳۲]

متعدی امراض میں مریض کو تنہا کرنا

اگر متعدی بیماری میں مبتلاء شخص کسی مشترک گھر میں رہ رہا ہو تو باقی گھر والے اس سے کسی الگ گھر میں رہنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں، اگر اس شخص کے پاس الگ گھر لے کر رہنے کی حیثیت ہو تو وہ خود لے گا ورنہ بیت المال سے اس کا نظام کیا جائے گا، البتہ اسے مسجد میں آنے سے نہیں منع کریں گے کیوں کہ حضرت عمرؓ نے اسی جیسے مرض میں مبتلا ایک عورت کو طواف کرتے ہوئے دیکھا تو کہا ''کہ اگر تو اپنے گھر میں بیٹھی رہتی تو زیادہ اچھا ہوتا، البتہ دوسری مشترک جگہوں پر جانے سے روکا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ آپؐ نے فرمایا:

لاضرر ولا ضرار۔ (نہ نقصان اٹھاؤ اور نہ نقصان پہونچاؤ)

قرعہ اندازی سے فیصلہ بحکم نص اور اجماع ثابت ہے

فیصلہ کا ایک طریقہ قرعہ اندازی بھی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ذٰلِکَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْکَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ''۔ (۳/۴۴)

(اے نبیؐ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سے بتا رہے ہیں ورنہ تم اس وقت وہاں موجود نہ تھے جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے

کے لیے کہ مریم کا سرپرست کون ہے اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے اور نہ تم اس وقت حاضر تھے جب ان کے درمیان جھگڑا برپا تھا۔)

حضرت قتادہؒ کہتے ہیں حضرت مریمؑ سردار کی بیٹی تھیں ہر ایک ان کی کفالت کرنا چاہتا تھا، تو لوگوں نے قرعہ ڈالا کہ کون ان کی کفالت کرے گا تو قرعہ حضرت زکریاؑ کے نام نکلا، یہ ایک متفقہ علیہ تفسیر ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

"وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ. إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ. فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ" (۳۷/۱۴۰-۱۴۱)

(یقیناً حضرت یونس رسولوں میں سے تھے، یاد کرو جب وہ بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلے پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوئے اور اس میں مات کھائی۔)

آگے آپ قرعہ اندازی کی مختلف صورتوں پر بحث کرتے ہیں اور پھر کتاب کا اختتام ہو جاتا ہے۔

حواشی و مراجع

1. الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ لابن القیم الجوزیۃ، ناشر مطبعۃ السنہ المحمدیہ، ص ۵
2. ایضاً، ص ۵
3. ایضاً، ص ۱۲
4. ایضاً، ص ۱۳-۱۴
5. ایضاً، ص ۱۸
6. ایضاً، ص ۲۴
7. ایضاً، ص
8. ایضاً، ص ۶۷-۶۸
9. ایضاً، ص ۸۸-۹۲
10. ایضاً، ص ۱۰۸
11. ایضاً، ص ۱۱۳

۱۲ ایضاً، ص ۱۲۶-۱۲۸

۱۳ ایضاً، ص ۱۳۳-۱۳۴

۱۴ ایضاً، ص ۱۳۹-۱۴۰

۱۵ ایضاً، ص ۱۵۹-۱۶۰

۱۶ ایضاً، ص ۱۶۲

۱۷ ایضاً، ص ۱۶۳-۱۶۴

۱۸ ایضاً، ص ۱۷۰-۱۷۱

۱۹ ایضاً، ص ۱۷۳

۲۰ ایضاً، ص ۱۸۶-۱۸۷

۲۱ ایضاً، ص ۱۹۴-۱۹۵

۲۲ ایضاً، ص ۲۰۰

۲۳ ایضاً، ص ۲۰۱-۲۰۲

۲۴ ایضاً، ص ۲۰۲

۲۵ ایضاً، ص ۲۰۴-۲۰۵

۲۶ ایضاً، ص ۲۱۴-۲۱۵

۲۷ ایضاً، ص ۲۱۶

۲۸ ایضاً، ص ۲۱۶-۲۱۷

۲۹ ایضاً، ص ۲۳۶-۲۳۸

۳۰ ایضاً، ص ۲۴۲-۲۴۳

۳۱ ایضاً، ص ۲۴۴

۳۲ ایضاً، ص ۲۷۰-۲۷۱

☆☆☆

سیاست وحکومت کے مسائل اور عہد وسطیٰ کے ہندوستانی علماء

ظفر الاسلام اصلاحی *

عہد اسلامی کا ہندوستان علم وفن، تہذیب وتمدن کے فروغ اور سیاسی وانتظامی اداروں کی ترقی کے لیے کافی مشہور ہے۔ علمی ترقی کے ضمن میں اسلامی علوم کو فوقیت حاصل رہی ہے۔ علماء کی کاوشوں اور حکمرانوں کی معارف پروری کی بدولت علمی سرگرمیاں جاری ہوئیں، جن کے نتیجہ میں تفسیر، حدیث، سیرت، فقہ، علم کلام، تصوف، تاریخ، سوانح اور زبان وادب جیسے موضوعات پر تصانیف وتالیفات کا بیش بہا ذخیرہ وجود میں آیا۔ فقہی کتب میں فتاویٰ کے مجموعوں کو خاص مقبولیت نصیب ہوئی اور فتاویٰ کے متعدد مجموعے مرتب ہوئے۔ ان میں خاص طور سے فتاویٰ غیاثیہ، فتاویٰ فیروز شاہی، فتاویٰ تاتار خانیہ، فتاویٰ ابراہیم شاہی، فتاویٰ حمادیہ اور فتاویٰ عالم گیری قابلِ ذکر ہیں [1]۔ ان فتاویٰ کے مباحث اور معاصر مورخین کے بیانات سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ علماء وقت نے مذہبی، سماجی، معاشی اور سیاسی مختلف مسائل پر اظہارِ خیال کیا اور اپنے مطالعات وتجربات کی روشنی میں ان مسائل کے بارے میں اپنا موقف واضح کیا [2]۔ سیاست وحکومت کے مسائل پر علماء وقت کے خیالات مختلف قسم کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں فقہی تالیفات (بالخصوص فتاویٰ کے مجموعے)، اصول جہاں بانی سے متعلق تالیفات، کتب تاریخ، تذکرہ جات، مکتوبات کے مجموعے اور ملفوظات لٹریچر شامل ہیں۔ ان کے

---

* پروفیسر وسابق چیرمین، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، اے ایم یو، علی گڑھ

گہرے مطالعہ سے سیاست وحکومت سے متعلق بہت سے مباحث سامنے آتے ہیں۔ان میں خاص طور قابلِ ذکر یہ ہیں: مسلم حکمراں کی حیثیت،ان کے مطلوبہ اوصاف و اختیارات،فرائض وذمہ داریاں،ان کی اطاعت کے حدود، بیت المال میں ان کے حقوق، نظم ونسق کے طور وطریق، زائد محصول عاید کرنے کا اختیار،حکومت کے ذریعہ اشیاء کی قیمتوں کی تعیین، غیر مسلم شہریوں سے تعلقات ومعاملات کے اصول وضوابط۔ان امور پر عہدوسطیٰ کے علماء کے افکار و خیالات کا تنقیدی جائزہ اس لحاظ سے مفید ثابت ہوگا کہ انہوں نے کس حد تک قرآن وحدیث کی ترجمانی کی ہےاور کہاں تک ان کے افکار معاصر سیاسی وسماجی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ اسلام میں امامِ حق یا امامِ عادل کی حکومت مطلوب ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس حکمراں کو امام حق یا عادل کہا جائے، یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ اسی کے جواب کے مطابق ان کی حکومت کی نوعیت اور ان کی اطاعت کی حد متعین ہوتی ہے۔عہدِ زیر بحث کے بعض فتاویٰ کے مولفین نے بڑی تفصیل سے اس مسئلہ سے بحث کیا ہے۔ پندرہویں صدی عیسوی کے ایک فقیہ مولانا رکن الدین ناگوری کے بیان کے مطابق امام حق اسے کہا جائے گا جو ان شرایط پر پورا اترتا ہو: وہ مسلمان ہو،احکامِ شرع کا پابند ہو، عاقل،فہیم و ذہین ہو،عدلِ و انصاف کا علم بردار ہو،مسلمانوں کی اکثریت نے اسے حکمراں تسلیم کیا ہواور وہ اس سے مطمئن ہوں،اس کے سامنے اصل مقصد اللہ کے دین کا بول بالا کرنا اور مسلمانوں کی طاقت کو مضبوط کرنا ہو، وہ مسلمانوں کی جان و مال اور عزت وآبرو کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کرتا ہواور اس کا اہتمام بھی کرتا ہو، وہ شریعت کے مطابق محاصل وصول کرتا ہو،مسلمانوں کے ساتھ اس طرح مشفقانہ برتاؤ کرتا ہو جیسے ایک باپ بیٹے کے ساتھ کرتا ہے، عام رعایا کے لئے خوش اخلاقی (بالخصوص نرم مزاجی اور بردباری) کا مظاہرہ کرنے والا اور اسلامی حکومت کی سرحدوں کی حفاظت کرنے والا ہو[۳۳]۔

ایک دوسرے عالم نے عادل حکومت کی خصوصیات واضح کی ہیں اور اہم بات

یہ کہ ان میں ان باتوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے جن کا تعلق عام لوگوں کی فلاح و بہبود یا انسانی حقوق کی پاسبانی سے ہے۔فتاویٰ ابرہیم شاہی کے مولف کے خیال میں وہ حکومت عادل حکومت کہے جانے کی مستحق ہے جس کے تحت بحیثیت رعایا حاکم ومحکوم اور غلام و آزاد میں کوئی فرق نہ ہو، جس کے تحت ہر شخص کو عزت کے ساتھ نان ونفقہ حاصل کرنے کے مواقع حاصل ہوں اور کسی کو بہتر اجرت کی تلاش میں کوئی دشواری نہ ہو، کوئی کسی کو بلا وجہ تنگ نہ کرے اور نہ کوئی کسی کو ذلیل و رسوا کرے۔ نیز اس حکومت میں ایک چیز کی دو قیمت نہ ہو اور ضروری استعمال کی چیزوں کی قیمتیں غیر متوازن نہ ہوں اور اگر کوئی طبقہ اپنے ذاتی فائدہ کی خاطر چیزوں کی قیمتوں میں کمی بیشی کرے تو اس کو ایسی سخت سزا دی جائے کہ وہ دوبارہ اس کی جرءات نہ کر سکے۔مزید براں یہ کہ اہلِ حکومت ملکی معاملات کی انجام دہی میں اہل بصیرت اور باشعور لوگوں سے مشورہ کریں[۴]۔

ان تفصیلات سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امام حق و عادل کے مطلوبہ اوصاف میں تین باتوں پر خاص زور دیا گیا ہے: ذاتی زندگی میں شریعت کی پابندی، نظم حکومت میں احکامِ شریعت کا نفاذ اور عوام کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ۔اہم بات یہ کہ عادل حکمراں کی خصوصیات میں اس بات کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے کہ وہ عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں سرگرمی دکھائے اور ان کے حقوق کے تحفظ کو یقینی بنائے اور جو لوگ ان حقوق کی خلاف ورزی کر کے عوام کو تکلیف پہنچاتے ہیں انہیں سزا دینے میں سختی برتے۔ یہاں اس پر یہ ذکر بھی برمحل معلوم ہوتا ہے کہ عہد سلطنت کے مشہور مورخ اور حکومت کے اصول وضوابط پر ایک اہم کتاب (فتاویٰ جہاں داری) کے مصنف ضیاء الدین برنی (۱۲۸۵ء۔مابعد ۱۳۵۷ء) نے حقیقی بادشاہ کی جو تعریف کی ہے اس میں بھی عوام کے حقوق کی پاسبانی پر خاص زور ملتا ہے۔ان کی رائے میں انصاف وسچائی کا تقاضا یہ ہے کہ بادشاہ اسے کہا اور سمجھا جائے جس کی بادشاہت میں ایک آدمی بھی بھوکا ونگا نہ سوئے[۵]۔ مزید براں اسی زمانہ کے ایک فقیہ مولانا رکن الدین نے اپنی منظوم تالیف طرفۃ الفقہاء میں سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱۔۱۳۸۸ء) کے اوصاف وکمالات میں جن باتوں کو

خاص طور سے نمایاں کیا ہے وہ ہیں: شریعت کی ترویج وتنفیذ، عدل وانصاف کا اہتمام اور عوام کی فلاح وبہبود کے کام میں دلچسپی ۶ے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہر نی بھی مسلم حکمراں کے مطلوبہ اوصاف میں ان باتوں کو خاص اہمیت دیتے تھے اور انہیں مسلم حکمراں کی خصوصیات میں شمار کرتے تھے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ فیروز شاہ تغلق عہد وسطیٰ کے ان چند حکمرانوں میں سے تھے جو اپنے دینی رجحان اور شریعت کے نفاذ میں سنجیدہ کوششوں کے لئے معروف تھے ۷ے۔

اسلام کے سیاسی نظام میں مسلم حکمراں کے مطلوبہ اوصاف سے بحث کرتے ہوئے ایک دلچسپ سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ کیا عورت حکمراں بن سکتی ہے یا نہیں؟ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ مختلف دور میں یہ مسئلہ علماء کے مابین موضوع بحث رہا ہے ۸ے۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستانی فقہاء کی کتابوں میں اس پر کوئی براہ راست بحث اب تک نہیں مل سکی ہے۔ البتہ فتاویٰ عالمگیری کے بعض مباحث سے اس کے بارے میں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ اس فتاویٰ میں نماز جمعہ کے مسائل میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر حکمراں عورت ہو اور وہ جمعہ کے قیام کا حکم دے تو یہ جائز ہوگا، لیکن وہ خود جمعہ نہیں قائم کرسکتی یعنی خطبہ و امامت کی ذمہ داری نہیں انجام دے سکتی ۹ے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ عورت کی حکمرانی کی شرعی حیثیت سے بحث نہیں کی گئی ہے، اس سے اس کا جواز ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ سلطان التمش (۱۲۱۰۔ ۱۲۳۵ء) نے بیٹوں کی موجودگی کے باوجود اپنی بیٹی رضیہ کو اپنا جانشیں مقرر کیا اور وہ تقریباً چار برس (۱۲۳۶۔۱۲۳۹ء) دہلی سلطنت کے تخت پر حکمراں کی حیثیت سے متمکن رہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ معاصر تاریخی مآخذ میں سلطان التمش کے جانشیں کی حیثیت سے رضیہ کی تقرری اور پھر اس کی تخت نشینی پر خاص اس دور کے کسی عالم یا فقیہ کا اعتراض یا منفی ردعمل نہیں مل سکا۔ بلکہ ایک معاصر مورخ قاضی منہاج السراج (جو عالم وفقیہ بھی تھے) نے اپنی کتاب (طبقاتِ ناصری) میں سلطانہ رضیہ کے سیاسی شعور، فہم وتدبر، علمیت اور جراءت وہمت کی تعریف کی ہے اور حکمراں کی حیثیت سے ان کی کارکردگی کی تحسین بھی کی ہے۔ خود ان کے الفاظ

میں: ''سلطان رضیہ طاب مرقدہا بادشاہ بزرگ و عاقل، عادل وکریم و عالم نواز و عدل گستر و رعیت پرور ولشکر کش بود۔ ہمہ اوصاف گزیدہ کہ بادشاہان را باید داشت''۱۰۔ البتہ بعد میں محمد تغلق کے عہد کے مورخ عصامی نے رضیہ سلطانہ کے ذکر میں اس پر ناپسندیدگی ظاہر کی ہے کہ عورت گھر کے باہر کوئی کام انجام دے اور یہ خیال پیش کیا ہے کہ وہ اس لائق نہیں کہ اس پر اعتماد کیا جائے ۱۱۔ یہاں یہ ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا کہ اس واقعہ کے تقریباً ساڑھے تین سو برس بعد جب مغل دور میں نامور محدث شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۵۵۱۔۱۶۴۲ء) نے اپنی کتاب ''ذکر الملوک'' یا ''تاریخ حقی'' مرتب کی تو اس میں رضیہ کی تخت نشینی پر انتہائی حیرت وتعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ایں قصہ لغایت غریب و عجیب است کہ باوجود انوثت برخلافِ حکمِ شریعت او را ولی عہد گردانید و علماء و مشائخ آں عصر او را مسلّم داشتند''۱۲۔ (یہ عجیب وغریب معاملہ ہے کہ جب سلطان التمش نے حکمِ شریعت کے برخلاف ایک عورت (یعنی اپنی بیٹی) کو اپنا جانشیں مقرر کیا تو اس دور کے علماء ومشائخ نے اسے تسلیم کرلیا یعنی اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کی۔

جہاں تک سلطان یا حکمراں کی اطاعت کا مسئلہ ہے، عہد زیر بحث کے مورخین، سیاسی اصول ونظریات پر کتابوں کے مولفین اور علماء نے عام طور پر ان کی فرماں برداری اور تعظیم وتکریم پر زور دیا ہے اور اس ضمن میں بعض نے قرآنی آیات (اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم /النساء:۵۹) نقل کی ہیں اور احادیث (مثلاً: من اطاع السلطان فقد اطاع الرحمٰن) کا بھی سہارا لیا ہے، گرچہ ان کی محولہ حدیثوں کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ بعض مورخین نے اس پہلو سے سلطان کی اطاعت کی اہمیت واضح کی ہے کہ معاشرہ میں نظم ونسق کا قیام، لوگوں کی ترقی کا اہتمام اور شریعت کا نفاذ انہی کے وجود سے ممکن ہے۔ اگر سلطان نہیں ہوں گے تو لوگ ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کریں گے۔ سلطان خلفاء حق کے نائب ہیں، ان سے روزِ قیامت رعایا کے احوال کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی ۱۳۔ عہد سلطنت کے مشہور عالم اور سہروردی سلسلہ کے صوفی سید جلال بخاری نے مسلم حکمراں کے مقام ومرتبہ کو اس طور پر اہم قرار دیا ہے کہ وہ اللہ

تعالیٰ کے منتخب بندے ہوتے ہیں۔ اللہ نے بہت سی عبادتیں (نماز جمعہ وعیدین کا قیام) ان کے حکم سے متعلق رکھی ہیں، بیت المال سے کچھ لینا انہی کی اجازت سے حلال ہوتا ہے، لہٰذا ان کی توہین کرنا صحیح نہیں ہے اور نہ ہی ان کی حکم عدولی جائز ہے خاص طور سے ان معاملات میں جو شریعت کے مطابق ہیں (بادشاہان روئے زمیں برگزیدگانِ خداوندعزّ وجلّ اند، ہیچ سبیلے اہانت و ترکِ فرمان ایشاں در مشروعات راست وجائز نیست ولہذا اچندیں عبادات و طاعات راحق سبحانہ تعالیٰ مفوض درامرِ ایشاں گردانیدہ چوں نماز جمعہ نماز عید وستدن مالِ بیت المال باذن وبعلم ایشاں حلال است)۱۴۔ سلطان یا مسلم حکمراں کی حیثیت پر عہد وسطیٰ کے ممتاز عالم اور نامور مصلح مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (۱۵۶۴-۱۶۲۴ء) کا کوئی قول یا بیان نہیں مل سکا، لیکن معاصر بادشاہوں کی اصلاح پر زور دیتے ہوئے انہوں نے سلطان کے مقام کی اہمیت و رفعت اس طور پر واضح کی ہے کہ سلطان روح کی طرح ہے اور تمام انسان بدن کی طرح ہیں۔ اگر روح درست ہے تو بدن بھی درست ہے، اگر روح خراب ہے تو بدن بھی خراب ہے، اس لئے اصلاحِ بادشاہ کی جدوجہد تمام بنی آدم کی اصلاح ہے۱۵۔

سلطان یا حکمراں کے مقام و مرتبہ کی بحث میں ایک اور اہم مسئلہ جس پر معاصر فقہاء نے اپنی رائے ظاہر کی ہے وہ ان کی اطاعت وحمایت کے حدود سے تعلق رکھتا ہے اور یہ کہ حکمراں کے خلاف خروج یا بغاوت جائز ہے کہ نہیں اور کسی گروہ کی بغاوت کی صورت میں باغی گروہ کی حمایت کرنی چاہیئے یا حکمرانِ وقت کا ساتھ دینا چاہیئے؟ مختلف دور میں فقہاء کا عام طور پر یہ موقف رہا ہے کہ افتراق وانتشار سے احتراز اور امن وامان کے قیام کی خاطر خلیفہ یا سلطان کے خلاف بغاوت جائز نہیں۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستانی علماء کا بھی یہی نقطۂ نظر رہا ہے جیسا کہ ان کی فقہی تالیفات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۱۶۔ اسی کے ساتھ یہ مزید وضاحت ملتی ہے کہ اگر لوگوں کی کوئی جماعت کسی حکمراں کے ظلم کی وجہ سے اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے تو نہ باغی اور نہ موجودہ حکمراں کی مدد کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ پہلی صورت سلطان کے خلاف بغاوت کے مترادف ہوگی اور

یہ حرام ہے۔ دوسری صورت میں ظالم کے ساتھ تعاون کرنا لازم آئے گا اور یہ بھی جائز نہیں ہے[۱۷]۔ عہدِ سلطنت کے ایک دوسرے فتاویٰ سے اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے کہ کسی بھی صورت میں ظالم سلطان کے ساتھ تعاون نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ اس سے ظلم کو تقویت ملے گی[۱۸]۔ یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ اسی دور کے ایک دوسرے مجموعہ فتاویٰ (فتاویٰ حمادیہ) میں اس مسئلہ پر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ مولف فتاویٰ دوسرے فقہاء کے مثل امام عادل کے خلاف بغاوت کو جائز نہیں تسلیم کرتے لیکن وہ عام فقہاء کے موقف کے برخلاف غیر عادل امام کی اعانت کو نہ صرف غیر واجب قرار دیتے ہیں، بلکہ اس کے خلاف خروج و بغاوت کو بھی ضروری تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے اس رائے کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ فقہاء نے بغاوت وخروج کے عدمِ جواز کے ضمن میں 'امام عادل' کی جو شرط لگائی ہے اس کا ظاہری مطلب یہی ہے کہ اگر امام عادل نہیں ہے تو اس کی مدد واجب نہیں، بلکہ اس کے خلاف خروج و بغاوت واجب ہے[۱۹]۔ یہ موقف (جو یقیناً اسلام کی جمہوری اسپرٹ کے مطابق ہے) اس وجہ سے اہمیت رکھتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے دوسرے فقہاء کسی امام یا سلطان کے خلاف بغاوت کو جائز نہیں سمجھتے، خواہ وہ عادل ہوں یا غیر عادل۔ مزید براں فتاویٰ عالم گیری میں اس پر ایک اور نکتہ کا اضافہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے کسی گروہ کی بغاوت ظلم کے بجائے کسی اور وجہ سے ہے اور اس گروہ کے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حق ان کے ساتھ ہے اور انہیں حکمرانی کا اختیار ملنا چاہئے تو حکمرانِ وقت کے لیے ان سے جنگ کرنا جائز ہے اور ایسی صورت میں عوام کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ سلطان کا ساتھ دیں یعنی اس کی مدد کریں[۲۰]۔ یہاں یہ واضح رہے کہ ہندوستانی علماء نے عام طور پر سلطان کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے اور ان کی حکم عدولی کو ناجائز ٹھہرایا ہے، لیکن جہاں تک ان کے سامنے حق بات کہنے کا معاملہ ہے اس باب میں ان کا موقف سخت ہے۔ فتاویٰ غیاثیہ کے مولف کی رائے میں اگر کسی سے سلطان یا حکمراں کی طرف سے کچھ پوچھا جائے اور اسے یہ معلوم ہو کہ اگر وہ حق بات کہے گا تو اسے گزند پہنچ سکتا ہو تو بھی وہ سلطان کے

سامنے حق بات کہے، اس لئے کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ سب سے افضل جہاد جابر سلطان کے سامنے حق بات کہنا ہے[۲۱]۔ اسی ضمن میں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ خلاف شریعت کاموں میں سلطان کی اتباع کی جائے یا نہ کی جائے۔ اس ضمن میں بادشاہ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیے جانے اور ایسا نہ کرنے پر قتل کئے جانے کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا ہے۔ فقہاء کی آراء کا خلاصہ یہ ہے کہ افضل یہ ہے کہ سجدہ نہ کرے، اس لئے کہ یہ کفر ہے اور افضل یہی کہ کفر کے کاموں سے احتراز کیا جائے گرچہ اس کے لئے مجبور ہی کیوں نہ کیا جائے۔ لیکن اسی کے فوراً بعد یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص سلطان کے سامنے سجدۂ تعظیمی کرتا ہے یا اس کے سامنے زمین کو بوسہ دیتا ہے تو یہ کفر نہیں ہوگا، مگر ایسا کرنے والا گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا[۲۲]۔ سجدہ تعظیمی کے مسئلہ پر اس زمانہ کے بعض فقہاء کی اس رائے سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے کہ ایسا کرنے والا گنہ گار تو ہوگا، لیکن اس کا یہ عمل کفریہ نہیں کہلائے گا۔ اس کے مطابق بظاہر اس دور کے سلاطین و بادشاہوں کے دربار میں مروجہ آدابِ ملاقات اور رسم پابوسی یا سجدۂ تعظیمی کی بجا آوری کی رعایت نظر آتی ہے۔ یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (۱۵۶۴۔۱۶۲۴ء) کے دربارِ جہاں گیری میں سجدہ تعظیمی کے انکار اور ان کے خلاف بعض دوسری شکایات کی وجہ سے بادشاہِ وقت کی جانب سے ان کو قید کرنے کا حکم جاری ہوا تو شہزادہ خرم رشاہجہاں (جو شیخ سے خاص عقیدت رکھتے تھے) نے اپنے بعض معتمد امراء یا ندماء کو شیخ کے پاس کچھ فقہی کتابوں کے ساتھ یہ پیغام دے کر بھیجا کہ فقہاء نے سجدۂ تحیت کو مباح قرار دیا ہے وہ اگر ایسا کرلیں تو شہزادہ یہ ضمانت دیتے ہیں کہ بادشاہ (جہانگیر) کی طرف سے انہیں کچھ گزند نہیں پہنچے گا۔ مجدد الف ثانی کا یہ جواب قابل توجہ ہے کہ ایسا کرنا رخصت ہوسکتا ہے۔ عزیمت یہی ہے کہ غیر اللہ کے سامنے سجدہ نہ کیا جائے[۲۳]۔

اسلام کے سیاسی نظام میں سلطان یا مسلم حکمراں کی حیثیت، ان کے مطلوبہ اوصاف اور ان کی اطاعت کے حدود کے علاوہ ان کے فرائض یا ذمہ داریوں کے بارے

میں بھی عہد وسطیٰ کے علماء و مورخین نے اپنی آراء ظاہر کی ہیں۔ مسلم حکمرانوں کی ذمہ داریوں میں جن باتوں کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے وہ ہیں: احکام شریعت کا نفاذ، عدل و انصاف کا قیام، امن وامان کی بحالی، امورِ رفاہ عامہ کی انجام دہی، سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا اہتمام۔ ''فتاویٰ جہاں داری'' میں حکمراں کے فرائض سے بحث کرتے ہوئے ضیاءالدین برنی لکھتے ہیں کہ سلطان کا فرض ہے کہ وہ خود شریعت کی پابندی کرے اور عوام میں بھی اسے رائج کرے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اہتمام پر توجہ دے اور ہر قصبہ و شہر میں محتسب مقرر کرے اور حدود شریعت توڑنے والوں کو سخت سزا دے[۲۴]۔ مزید براں یہ بات بخوبی معروف ہے کہ سلاطین دہلی حکومت کا نظم ونسق چلانے کے لئے شاہی فرامین جاری کرتے تھے جن میں ضوابط یا سلطنت کے قوانین کی تفصیلات ہوتی تھیں۔ اس موقع کے لئے بھی برنی نے ان کے لئے یہ واجب قرار دیا کہ وہ یہ خیال رکھیں کہ یہ ضوابط یا ان کے اقدامات شریعت کے منافی نہ ہوں اور نہ ہی انہیں کوئی ایسا ضابطہ بنانا چاہیئے جو جابر و ظالم بادشاہ کی روش پر ہو[۲۵]۔ ایک دوسرے معاصر مورخ (فخر مدبر) نے فرائض سلطانی کی بحث میں عادلانہ طرز عمل، مساویانہ برتاؤ، امن وامان کے قیام اور عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں دلچسپی کو خاص اہمیت دی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق سلطان کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ عدل وانصاف کے اصولوں پر حکومت کا نظم ونسق قائم کرے اور اس بات کو یقینی بنائے کہ کمزور و طاقت ور اور امیر و غریب کے مابین کوئی امتیاز نہ برتا جائے، معاشرہ کا امن و امان برباد کرنے والوں پر قدغن لگائے، شہروں وقصبات میں مساجد و مدارس اور شاہراہوں پر کنوئیں اور سرائے تعمیر کرائے اور اہم مقامات پر قلعہ جات کی تعمیر کا بند و بست کرے تاکہ لوگ ڈاکوؤں اور حملہ آوروں سے محفوظ رہیں۔ ان سب کے علاوہ سلطان کا یہ بھی فرض ہے کہ اپنے حدودِ سلطنت میں ایسے حالات پیدا کرے کہ کسان خوش حال رہیں[۲۶]۔ اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حکمراں کی ذمہ داریوں میں عوام کی بھلائی کے کاموں کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ آخر میں خاص طور سے کسانوں کی فلاح و بہبود کا خیال

رکھنے کو سلطان کے فرائض میں شامل کیا گیا ہے۔اس کی بظاہر وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عہد زیر بحث میں خراج یا محصول آراضی حکومت کی آمدنی کا سب سے اہم ذریعہ تھا اور کسانوں کی حالت کی بہتری ہی پر زراعت کی ترقی منحصر تھی جو بالآخر خراج میں اضافہ کا باعث بنتی تھی، اس لئے حکومت ان کو خوش و مطمئن رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ یہاں یہ ذکر بھی برمحل معلوم ہوتا ہے کہ فتاویٰ عالم گیری میں حکمراں کی ذمہ داریوں میں اسے بھی شامل کیا گیا ہے کہ وہ خراج کی تحصیل کا کام ایسے افسر کے سپرد کرے جو لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئے اور محصولِ آراضی کی وصولی میں ان کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے۲۷۔ تیسری قابل ذکر بات یہ کہ اس زمانہ کے فقہاء و مورخین نے عدل و انصاف کے قیام کو حکمراں کا سب سے اہم فریضہ قرار دیا ہے اور اس سے پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ سلطان کے انتخاب کے لیے مطلوبہ اوصاف میں بھی صفتِ عدل کو اولیت حاصل تھی۔ یہاں اس بات کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ اسی حکومت کے تحت لوگوں کے حقوق کو تحفظ ملتا ہے اور ان کا بھلا ہوتا ہے جس کی بنیاد عدل و انصاف پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں عدل وانصاف کو برپا کرنا اسلامی ریاست کے قیام کے بنیادی مقاصد میں شامل کیا گیا ہے۔ یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ حکمراں کے فرائض میں عادلانہ نظام کے قیام کی اہمیت واضح کرتے ہوئے ضیاء الدین برنی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عدل لازمۂ دین ہے، اگر عدل وانصاف نہیں قائم ہوگا تو پھر دنیا میں اباحت کے سوا کیا رہ جائے گا ۲۸۔ امور جہاں داری سے متعلق سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۵-۱۳۱۶ء) کو نصیحت کرتے ہوئے امیر خسرو نے کہا تھا کہ وہ ایسا طرز عمل اختیار کریں کہ دیہات اور شہر میں امیر و غریب ہر ایک کو سکون واطمینان نصیب ہو۲۹۔ظاہر ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب ایسا نظامِ حکومت قائم ہو جس کی بنیاد عدل و انصاف پر ہو اور پہلے خود اہل حکومت اس کے اصولوں پر کار بند ہوں اور وہ ایسے اقدامات کریں کہ لوگوں کے ساتھ ظلم و زیادتی نہ ہو اور کوئی ان کے حقوق پر دست درازی نہ کرنے پائے۔

اسلامی نظام حکومت میں شوریٰ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

اس باب میں قرآن کریم کی ہدایات بالکل واضح ہیں۔ اہلِ ایمان کے اوصاف میں یہ بیان کیا گیا ہے: وامرھم شوریٰ بینھم (الشوریٰ/۳۸) اوران کے معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔ مختلف دور میں علماء نے اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۳۰۔ بعض ہندوستانی علماء و مورخین نے اس مسئلہ پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور حکومت کے انتظامی امور کی انجام دہی میں مجلس مشاورت منعقد کرنے اور درپیش مسئلہ میں اس کی رائے معلوم کرنے کی ضرورت اور اس کا طریقہ واضح کیا ہے۔ فتاویٰ جہاں داری کے مولف کے بیان کے مطابق بادشاہ کو چاہئے کہ وہ اپنے نظم ونسق کو مخلص مشیروں کی مدد سے چلائے اور انہیں انتظامی معاملات میں پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دے۔ مشورہ دینے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ''محرم اسرار ملکی'' ہوں یعنی ریاست کے حالات سے پوری طرح واقف ہوں۔ دوسرے یہ کہ اصحاب مشورہ ایک مرتبہ کے ہوں۔ تیسرے یہ کہ مشورہ دینے والے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جرءاتِ فکر ونظر کے مالک ہوں۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مشیروں کو جانی تحفظ فراہم کرے۔ چوتھے بادشاہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ زیر بحث مسئلہ پر وہ اپنی ذاتی رائے مجلس کے شرکاء سے مخفی رکھے تاکہ مشاورت میں حصہ لینے والے اس کی رائے سے متاثر نہ ہوں اور وہ خود اپنے فہم وتدبر سے معاملہ کی نوعیت نزاکت کو سمجھ کے اس کے مطابق رائے دے سکیں۔ پانچویں یہ کہ مجلس سے مشورہ کی روشنی میں جو فیصلہ لیا جائے بادشاہ اس کو پوری جرءات و ہمت سے نافذ کرے ۳۱۔ برنی کے علاوہ بعض دوسرے معاصر مورخین (فخر مدبر اور حسن نظامی) نے بھی اپنی کتابوں میں شوریٰ کی اہمیت پر اظہار خیال کیا ہے ۳۲۔ بہر حال اہلِ حکومت کے لئے مشاورت کی اہمیت وضرورت سے متعلق برنی کے بیان کے چند نکات خاص طور سے قابلِ توجہ ہیں جو دوسرے سیاسی مفکرین کے یہاں نہیں ملتے۔ اول یہ کہ مشیرانِ حکومت کے نظم ونسق کی باریکیوں سے پوری طرح واقف ہوں اور سلطنت کے حالات پر ان کی گہری نظر ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ کمزور طبیعت کے نہ ہوں، آزادی رائے کی قدر و قیمت کا شعور رکھتے ہوں اور کسی بھی مسئلہ پر کھل کر اپنی

رائے پیش کرنے کی جرءات سے متصف ہوں۔ تیسرے یہ کہ انہیں حکمراں کی جانب سے جانی امان حاصل ہو اور اس کی مرضی کے خلاف رائے دینے میں انہیں کوئی خطرہ نہ محسوس ہو۔ چوتھے یہ کہ بادشاہ مجلس سے مشورہ لینے سے پہلے اپنا موقف ظاہر نہ کرے۔ اہم بات یہ کہ برنی نے اس نکتہ کی حکمت بھی واضح کردی اور وہ یہ کہ مشورہ دینے والے بغیر کسی ذہنی تحفظات کے یا کسی سے متاثر ہوئے بغیر اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق غور طلب معاملہ کے بارے میں اپنا مشورہ دے سکیں۔ پانچویں یہ کہ جب مجلس مشاورت کوئی فیصلہ لے لے تو بادشاہ پورے عزم وثبات کے ساتھ اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے۔ بلا شبہ یہ اسلامی اصول مشاورت کے عین مطابق ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں ہے۔

اِن سب کے علاوہ حکومت کے نظم ونسق سے متعلق متعدد دیگر مسائل عہد زیر بحث کی فقہی وتاریخی کتب میں معاصر علماء کی آراء منقول ہیں۔ ان میں خاص طور سے یہ قابلِ ذکر ہیں: شرعی وغیر شرعی محاصل، مقررہ محاصل کے علاوہ مزید محاصل عاید کرنے کا سلطانی اختیار، بیت المال میں سلطان وان کے اہل وعیال کے حقوق، سلطان کے ہدایا و تحائف قبول کرنے کی شرعی حیثیت، حکومت کے ذریعہ اشیاء ضروریہ کی قیمت کی تعیین، فوجیوں کی شناخت کے لیے ان پر مخصوص نشان ثبت کرنا، بدعنوان افسروں کے خلاف تادیبی کاروائی، سیاسی مجرمین کی سزا کی نوعیت، غیر مسلموں کے مذہبی، سماجی و معاشی حقوق اوران سے مالی معاملات کے طور وطریق۔

بیت المال میں سلطان کے حقوق کے بارے میں فقہاء نے عام طور پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بیت المال کے وسائل کو بس وہ اسی قدر استعمال کر سکتے ہیں جو ان کے اور ان کے عیال کی کفالت کے لئے کافی ہو[۳۳]۔ مزید براں عہدِ علائی کے مشہور قاضی مولانا مغیث الدین نے سلطان (علاء الدین خلجی) سے طویل مکالمہ میں اس مسئلہ پر کچھ مزید روشنی ڈالی ہے۔ سلطان کے اس سوال کے جواب میں کہ ''بیت المال میں میرا اور میرے فرزندوں کا کتنا حق ہے؟'' قاضی مغیث نے واضح کیا کہ اگر آپ خلفاء راشدین کے

نقش قدم پر چلنا چاہتے ہیں اور آخرت میں بلندیِ درجات کے طلب گار ہیں تو اس سے بس اتنا ہی مال لیں جو آپ کی اور آپ کے اہل وعیال کی ضروریات کی کفایت کر سکے۔ اور اگر بادشاہ سلامت میانہ روی اختیار کرنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ کفاف کی رقم سے بادشاہی کی عظمت نہیں قایم ہوسکتی ہے تو بیت المال سے اپنے اخراجات کے لئے اتنی رقم لے لیں جو سلطنت کے بڑے بڑے افسران کو دی جاتی ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اگر آپ دوسروں سے امتیاز قایم کرنا چاہتے ہیں اور بادشاہت کے وقار کو مزید بلند و بالا رکھنا چاہتے ہیں تو پھر اس سے زیادہ لے سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ نے ان حدود سے تجاوز کر کے اور زیادہ مال بیت المال سے لے لیا اور لاکھوں کڑوروں روپیے اور سونے چاندی کی چیزیں اہل خانہ کو دینا شروع کر دیا تو جان لیں کہ قیامت کے دن اس سے متعلق باز پرس ہوگی[۳۴]۔

سلاطین کے ہدایا قبول کرنے کے بارے میں فقہاءِ وقت نے مختلف انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ اس باب میں فتاویٰ غیاثیہ کے مولف کی یہ رائے بہت متوازن معلوم ہوتی ہے کہ اگر سلطان کے پیش کردہ کھانا کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ وہ مالِ مغصوبہ (زور زبردستی سے حاصل کیا ہوا مال) ہے تو اس کے قبول و استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں[۳۵]۔ بلاشبہ اس مسئلہ کا اطلاق سلطان کے ہدایا پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ عہدِ مغلیہ کے ایک مجموعہ فتاویٰ (فتاویٰ امینیہ) کے مولف کا موقف یہ ہے کہ ان امراء یا اہلِ حکومت کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں جن کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ وہ ''اہل جور'' (یعنی ظلم وزیادتی کرنے والے) ہیں، البتہ اگر قطعی طور پر یہ معلوم ہے کہ ان کے اموال کا اکثر حصہ حلال ہوتا ہے تو اس کے قبول کرنے و استعمال میں کوئی حرج نہیں[۳۶]۔ یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ عہد سلطنت کے ممتاز عالم وسہروردی سلسلہ کے مشہور صوفی سید جلاالدین بخاری (معروف بہ 'مخدوم جہانیان جہاں گشت') کی رائے یہ تھی کہ بادشاہوں کا کھانا کھانا مکروہ ہے، اس لیے کہ ان کے وصول کردہ محاصل کا بیشتر حصہ ظلم وتعدی سے حاصل ہوتا ہے[۳۷]۔ مزید برآں عہد سلطنت کے چشتی صوفیاء عام طور پر شاہی دربار میں

حاضری، سرکاری ملازمت اختیار کرنے اور سلاطین و امراء کے عطایا و وظائف قبول کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور مریدین (بالخصوص خلفاء) کو اس سے اجتناب کی تلقین کرتے تھے[۳۸]۔ ان صوفیاء کا یہ خیال تھا کہ بادشاہ کے ھدایا و تحایف (خواہ جاگیر ہو یا نقد) کو قبول کرنے سے ان کی فکری آزادی متاثر ہو گی اور ان کی روحانی زندگی کی ترقی میں خلل واقع ہوگا [۳۹]۔

شرعی محاصل کے بارے میں فقہی کتب اور علماء کی دوسری تالیفات میں بھی وضاحت ملتی ہے۔ شریعت کے مقررہ محاصل میں زکوٰۃ، خراج، جزیہ، خمس، غنایم و معادن اور عشور (تجارتی ٹیکس) کو شامل کیا گیا ہے[۴۰]۔ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱۔ ۱۳۸۸ء) نے شرعی قوانین کی روشنی میں انتظامی امور میں اصلاحات پیدا کیں اور اسی ضمن میں نظمِ محاصل کو بھی شریعت کے مطابق نافذ کرنے کی کوشش کی[۴۱]۔ اس نے معاصر علماء کے مشورہ سے جن محاصل کو وصول کرنے اور انہیں بیت المال کے ذرائع آمدنی میں شامل کرنے کی ہدایت جاری کی وہ مذکورہ بالا محاصل سے مطابقت رکھتے ہیں جیسا کہ معاصر مآخذ سے اس کی شہادت ملتی ہے[۴۲]۔ مورخین کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا کہ سلطان کی ہدایت کے باوجود غیر شرعی محاصل کی تحصیل جاری رہی اور بہت سے ایسے مقامی ٹیکس وصول کیے جاتے رہے جو عہد قدیم سے اس ملک میں رائج تھے۔ سلطان نے ان رواجی محاصل کی شرعی نوعیت کے بارے میں علماء و قضاۃ کی رائے معلوم کی تو انہوں نے واضح کیا کہ یہ سب غیر مشروع ہیں، ان کی تحصیل جائز نہیں ہے[۴۳]۔ یہ ذکر اوپر آچکا ہے کہ مشہور عالم سید جلال الدین بخاری نے اس زمانہ کے حکمرانوں کا کھانا کھانا اس لیے مکروہ قرار دیا کہ ان کی حکومت کے وسائل میں غیر شرعی محاصل کی آمدنی بھی شامل ہوتی ہے۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ خراج (زراعتی محصول) تھا۔ لہٰذا حکومت اس کی وصولی پر خاص توجہ دیتی تھی۔ اس ضمن میں یہ مسئلہ (جس کا تعلق سلطان کے اختیار سے ہے) ایک فقہی تالیف میں اس طور پر زیر بحث آیا ہے: کیا حکومت کو یہ

اختیار حاصل ہے کہ وہ خراج کی ادائیگی میں غیر معمولی تاخیر کی صورت میں کسی کسان کے غلّہ کو تا وقتِ ادائیگی سرکاری تحویل میں لے لے؟۔ جواب میں سلطان کو اس کا مجاز قرار دیا گیا ہے[۴۴]۔ مزید براں ایک دوسرے مجموعہ فتاویٰ میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اگر کوئی محصّل کسی کسان سے حکومت کی مقررہ شرح سے زیادہ وصول کر لے اور کسان محصّل کے خلاف دعویٰ کر دے تو دعویٰ کی صحت کی صورت میں وہ زائد محصول کی واپسی کا ذمہ دار ہوگا[۴۵]۔ فتاویٰ فیروز شاہی کے مولف نے ان عمال کو قابلِ مذمت و موجبِ سزا قرار دیا ہے جو غیر شرعی محاصل کی تحصیل کا ذریعہ بنتے ہیں[۴۶]۔ اس جزئیہ کی معنویت اس سیاق میں سمجھی جا سکتی ہے کہ اس زمانہ میں خراج کی تحصیل سے متعلق سلطان کی ہدایات کی خلاف ورزی کے واقعات دور دراز دیہاتی علاقوں میں پیش آتے رہتے تھے۔

محاصل سے متعلق ایک اور اہم مسئلہ جس پر عہد سلطنت کے فقہاء نے اپنی رائے ظاہر کی وہ یہ کہ کیا سلطان شریعت کے متعینہ محاصل کے علاوہ نئے محصول عاید کرنے کا مجاز ہے؟ یہ مسئلہ مختلف دور میں فقہاء کے مابین زیرِ بحث رہا ہے۔ ان کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر بیت المال کے معروف وسائل حکومت کی بنیادی ذمہ داریوں کی انجام دہی اور اجتماعی ضروریات کی تکمیل کے لیے ناکافی ہوں تو حکومت اصحاب ثروت شہریوں یا عوام پر بقدر استطاعت نیا محصول عاید کرنے کی مجاز ہوگی[۴۷]۔ سلطنت میں یہ مسئلہ اس وقت زیر بحث آیا جب سلطان فیروز شاہ نے سرکاری مصارف سے تعمیر کی جانے والی نہروں کے ذریعہ آبپاشی پر ٹیکس لگانا چاہا۔ اس سلسلہ میں جب علماء و قضاۃ کی رائے معلوم کی گئی تو انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ نہروں کی کھدائی میں مال صرف کرنے والا آب پاشی کی سہولت اٹھانے والوں سے محصول وصول کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اسی تحت سلطان نے حقِ شرب کے نام سے ایک نیا محصول عائد کیا[۴۸]۔ یہاں یہ واضح رہے کہ قدیم فقہاء نے اجتماعی ضروریات کے ضمن میں کفالتِ عامہ کا اہتمام، جہاد کی تیاری اور قیدیوں کی رہائی کا ذکر کیا ہے، لیکن بعد کے علماء و مفکرین کی رائے میں ان ''ضروریات'' کا دائرہ بجا طور پر عوام کی فلاح و بہبود اور ملک کی معاشی تعمیر و ترقی کے کاموں تک وسیع

کیا جا سکتا ہے[۴۹]۔

ممکن ہے کہ نئے محصول کے حق میں فتویٰ دیتے وقت عہدِ فیروز شاہی کے علماء کے پیش نظر یہی نکتہ رہا ہو۔

عہدِ زیرِ بحث میں حکمراں کے اختیارات کے ضمن میں یہ فقہی مسئلہ بھی بحث کا موضوع بنا کہ کیا اسے اشیاءِ ضروریہ کی قیمتوں کی تحدید وتعیین (تسعیر) کا حق حاصل ہے؟ یہ مسئلہ بھی قدیم فقہاء کے مابین مختلف فیہ رہا ہے۔ حنفی فقہاء کی رائے میں حکومت کی جانب سے قیمتوں کی تعیین جائز نہیں ہے، جب کہ مالکی فقہاء قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ کی صورت یا بحرانی حالات میں حکومت کو اس کا مجاز تصور کرتے ہیں[۵۰]۔ اس پر فیروز شاہ تغلق کے زمانہ کے علماء کی مختلف رائیں سامنے آئیں۔ کچھ نے اس کے جواز کے حق میں فتویٰ دیا، جب کہ بعض نے اسے ناجائز قرار دیا۔ مجموعی طور پر یہ رائے ابھر کر سامنے آئی کہ ضرورت کے تحت اور عوام کے مفاد میں حکومت کے ذریعہ تسعیر میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے[۵۱]۔ میں فتاویٰ فیروز شاہی کے مولف کے بیان کے مطابق یہ جواز مشروط ہے۔ اس میں مذکور ایک استفتاء کے جواب کا ماحصل یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے اشیاء کے قیمتوں کے تعین میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر کسی چیز کی متعینہ قیمت اس کی قیمتِ خرید سے کم ہے تو یہ جائز نہ ہوگا[۵۲]۔ یہاں یہ اضافہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۶۔۱۳۱۶ء) نے (جیسا کہ معروف ہے) معاشی اصلاحات کے تحت مارکٹ کنٹرول کا نظام نافذ کیا تھا جو کافی حد تک اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کی تحدید وتعیین پر مبنی تھا[۵۳]۔ گرچہ معاصر علماء کی جانب سے سلطان کے اس اقدام پر کسی رائے زنی یا فقہی تبصرہ کا ذکر تاریخی مآخذ میں نہیں ملتا، لیکن اس نظام کے نفاذ کے اثر سے جو ارزانی وخوشحالی ظاہر ہوئی اس کا اعتراف درباری مورخین کے علاوہ کچھ علماء ومشائخ کے یہاں بھی ملتا ہے[۵۴]۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ علماء وقت اس اقدام کو خلافِ شرع نہیں سمجھتے تھے۔

فوجی نظم ونسق بھی حکومت کا ایک شعبہ ہوتا تھا اس سے متعلق بعض مسائل سے اس وقت کی فقہی کتب میں تعرض کیا گیا ہے۔ عہد سلطنت کے عسکری نظام کے تحت یہ

دستور تھا کہ سپاہیوں کا نام ان کے شناختی علامت کے ساتھ عریض ممالک (فوجی امور کے اعلیٰ افسر) کے دفتر میں ایک رجسٹر میں درج کیا جاتا تھا اور ہر شہ سوار کے گھوڑے پر ایک مخصوص نشان بنایا جاتا تھا جسے فوجی نظم ونسق کی اصطلاح میں ''حلیہ و داغ'' کہا جاتا تھا ۵۵۔ فتاویٰ فیروز شاہی میں ایک استفتاء کے تحت سپاہیوں کے نام کے اندراج اور گھوڑوں کو نشان زدہ کرنے کا شرعی حکم دریافت کیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں یہ ذکر ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے ۵۶۔ اس استفتاء میں بظاہر حلیہ و داغ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ مزید براں اسی مجموعہ فتاویٰ میں جنگ میں با تصویر ہتھیاروں کے استعمال اور جنگی مہمات میں عورتوں کی شرکت جیسے دلچسپ مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں ۵۷۔
سیاسی مجرمین کی سزا کے بارے میں معاصر عالم ومشہور مورخ ضیاءالدین برنی کا موقف سلطان محمد بن تغلق کے ایک استفسار کے جواب سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ سلطان نے ان سے یہ معلوم کیا تھا کہ قدیم دور کے بادشاہ کس کس جرم میں سزائے موت دیا کرتے تھے اور ان میں شریعت کی رو سے کون جائز ہیں اور کون نا جائز؟ اس ضمن میں ایرانی بادشاہوں کا طرزِ عمل بیان کرنے کے بعد برنی نے یہ واضح کیا کہ حدیث شریف کے مطابق صرف تین جرم میں سزا دینا جائز ہوگا: (۱) ارتداد، (۲) قتل اور (۳) کسی شادی شدہ کا زنا کا ارتکاب کرنا۔ اسی کے ساتھ برنی نے یہ وضاحت کی کہ ان کے علاوہ بعض دیگر جرائم (بادشاہ کے ساتھ غدّاری، اس کے دشمنوں ومخالفوں کی مدد اور اس کے حکم کی علانیہ خلاف ورزی) جن پر قدیم دور کے بادشاہ سزائے موت دیتے تھے ان کا معاملہ سلطنت کے مفاد میں سلطان کی صواب دید پر منحصر ہے۔ سلطان محمد تغلق اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے اور یہ فرمایا کہ میرے زمانہ میں حالات بدل چکے ہیں، بغاوت وسرکشی کے واقعات بڑھ گئے ہیں اور دشمنوں ومخالفوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لیے ملک میں نظم وضبط قائم رکھنے اور سلطنت کے استحکام کے لیے میں بغاوت وسرکشی کے معمولی واقعات اور غداری و بے وفائی کی معمولی مثالوں پر بھی سزائے موت سے گریز نہیں کرتا ۵۸۔ یہاں یہ وضاحت اہمیت سے خالی نہیں ہے کہ مورخین کے بیان کے

مطابق سلطان نے دربار میں چار مفتی مقرر کر رکھے تھے اور ان کی رائے معلوم کیے بغیر وہ کسی کو سزائے موت نہیں دیتے تھے۵۹۔

مذکورہ بالا مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستانی علماء مختلف النوع مسائل پر فقہی نقطۂ نظر سے اظہارِ خیال کرتے تھے جن میں یقینی طور پر سیاست وحکومت کے مسائل بھی شامل تھے۔ اہم بات یہ کہ اِن علماء نے نہ صرف یہ کہ معروف و متداول مسائل کی تشریح و توضیح کی، بلکہ اس وقت کے خاص ماحول میں سیاست وحکومت کے جو مسائل ابھرے تھے ان کے بارے میں بھی اپنا موقف واضح کیا۔ ان مسائل میں سلطان کی شرعی حیثیت اور اس کی اطاعت کے حدود، حکمراں کے ضروری اوصاف و ذمہ داریاں، عورت کی حکمرانی کی شرعی حیثیت، مسلم حکومت میں شوریٰ کا کردار، بیت المال میں سلطان کے حقوق، شرعی و غیر شرعی محاصل، مزید محاصل عاید کرنے کا سلطانی اختیار، حکومت اور اشیاء ضروریہ کی قیمتوں کی تعیین اور سیاسی مجرمین کی سزا کی نوعیت خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ معاصر علماء کی فقہی آراء کے تجزیہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ عصری مسائل کی فقہی تشریح وتعبیر میں علماء نے عصری صورتحال یا اس وقت کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھا اور مجتہدانہ بصیرت دکھائی۔ مزید برآں بعض مسائل میں غیر حنفی موقف اختیار کر کے انہوں نے فقہی توسع کا بھی ثبوت دیا۔ درحقیقت علماء دین وفقہاءِ امت نے ہر دور میں نئے مسائل پر غور وخوض کرتے ہوئے وقت کے جدید تقاضوں کو مدّنظر رکھا ہے اور کتاب وسنت اور فقہ کے دوسرے معروف مآخذ کی مدد سے انہوں نے ان مسائل پر شرعی نقطۂ نظر سے اظہار خیال کیا ہے۔ ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت اس ضمن میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ ان سب کے علاوہ اوپر کی تفصیلات سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ عہدِ زیر بحث کے علماء نہ صرف فقہی تالیفات میں مختلف مسائل پر اظہار خیال کرتے تھے، بلکہ شاہی دربار اور اپنی نجی مجلسوں میں بھی درپیش مسائل پر بحث ومباحثہ کرتے تھے۔ ان مباحثوں کی اہمیت اس سے بخوبی واضح ہوتی ہے کہ معاصر مورخین نے ان کی تفصیلات کو ذکر کرنا ضروری سمجھا۔

حواشی ومراجع

۱۔ فتاویٰ کے ان مجموعوں کے تعارف کے لیے دیکھئے راقم کی انگریزی کتاب: *Fatawa Literature of the Sultanate Period*,New Delhi,2005,pp18-36

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: ظفرالاسلام اصلاحی، عہدِ اسلامی کے ہندوستان میں معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل (علماء کی فقہی تشریحات اور حکمرانوں کے اقدامات کا مطالعہ)، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء

۳۔ رکن ابن حسام ناگوری، فتاویٰ حمادیہ، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، حبیب گنج کلشن، ۱۰۱/۷۷، ورق ۱۴۱ب

۴۔ شہاب الدین احمد، فتاویٰ ابراہیم شاہی، مخطوطہ خدا بخش اورنٹیل لائبریری، پٹنہ، نمبر، ۱۷۴۹، اوراق ۲۰۸۔۲۰۹

۵۔ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۷

۶۔ رکن الدین ملتانی، طرفۃ الفقہاء، مخطوطہ علامہ شبلی نعمانی، لائبریری، ندوۃ العلماء، لکھنو، فقہ فارسی، نمبر ۹۸، اوراق ۸ الف۔۸ب

۷۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: ظفرالاسلام اصلاحی، اسلامی قوانین کی ترویج و تنفیذ عہدِ فیروز شاہی کے ہندوستان میں، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء

۸۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۳۷۹، ۵۰۶۔۵۲۰؛ محمد نجات اللہ صدیقی، مقاصدِ شریعت، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء، ۱۹۲، (بحوالہ شیخ راشد غنوشی، المرأۃ بین القرآن الکریم و واقع المسلمین، دمشق، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۱۔۲۱۶، عبدالحق انصاری، عورت کی سربراہی مملکت کا مسئلہ، زندگی، ۳۴/۴، اپریل، ۱۹۶۵ء، ص ۴۶۔۵۹

۹۔ الفتاوی العالمکیر یہ، بیروت، ۱۹۸۰ء، ۱/۱۴۵

۱۰۔ منہاج السراج، طبقات ناصری، کالج پریس، کلکتہ، ۱۸۶۴ء، ص ۱۸۵۔۱۸۶

۱۱۔ عز الدین عصامی، فتوح السلاطین، مدراس، ۱۹۴۸ء، ص

۱۲۔ عبد الحق محدث دہلوی، ذکر الملوک (معروف بہ تاریخِ حقی)، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی کلکشن، فارسیہ اخبار، نمبر اخبار، نمبر ۲/۳۰، ورق ۷ الف

۱۳۔ فخر مدبر، تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، لندن، ۱۹۲۷ء، ص ۱۱۔۱۳؛ فخر مدبر، آداب الحرب والشجاعت، انتشاراتِ اقبال، تہران، ۱۳۴۶ شمسی، ص ۱۴۔۱۵

۱۴۔ سراج الھدایہ (ملفوظات سید جلال الدین بخاری)، مرتبہ قاضی سجاد حسین، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۶۱۔۶۲

۱۵۔ مکتوبات امام ربّانی (اردو ترجمہ قاضی عالم الدین)، اللجنۃ العلمیہ، حیدرآباد، بدون تاریخ، ۲/۱۹۶

۱۶۔ فتاویٰ فیروز شاہی، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی کلکشن، نمبر ۲۶۰، اوراق ۲۰۹ الف۔۲۱۰ ب؛ الفتاوی العالمکیر یہ، ۲/۲۸۴

۱۷۔ فتاویٰ فیروز شاہی، اوراق ۲۰۹ ب۔۲۱۰ الف

۱۸۔ فتاویٰ ابراہیم شاہی، ورق ۱۴۵ ب

۱۹۔ فتاویٰ حمادیہ ورق ۱۴۱ ب

۲۰۔ الفتاوی العالمکیر یہ، ۲/۲۸۴

۲۱۔ داؤد ابن یوسف خطیب، الفتاویٰ الغیاثیہ، بولاق، مصر، ۱۹۰۹ء، ص ۱۰۷

۲۲۔ الفتاوی الغیاثیہ، ص ۱۰۷، فتاویٰ فیروز شاہی، ورق ۲۱۴ الف، الفتاوی العالمکیر یہ، ۵/۳۶۸

۲۳۔ حضرات القدس (مولفہ شیخ بدر الدین سرہندی)، محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۱۵۔۱۱۶

۲۴۔ ضیاء الدین برنی، فتاویٰ جہاں داری، روٹو گراف نمبر ۶۸ (مخطوطہ انڈیا آفس

لائبریری، لندن)، ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اوراق ۷ب۔۱۹الف

۲۵۔ فتاویٰ جہاں داری، ۱۴۴الف

۲۶۔ تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، ص ۱۴۔۱۸؛ آداب الحرب والشجاعت، ص ۴۔۶

۲۷۔ الفتاوی العالمگیریہ، ۲/۲۴۳

۲۸۔ فتاویٰ جہاں داری، ورق ۱۴۴الف

۲۹۔ امیر خسرو، مثنوی نہ سپہر، کلکتہ، ۱۹۴۸ء، ص ۲۲۲

۳۰۔ اسلام میں شوریٰ کی اہمیت اور اس کے طریقِ کار پر تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: سید جلال الدین عمری، اسلام کا شورائی نظام، لاہور، ۱۸۳ ۹ء؛ Obaidullah Fahad, *Islamic Shura*, New Delhi, 2007

۳۱۔ فتاویٰ جہاں داری، اوراق ۱۷ب، ۲۳ب۔۲۴ب

۳۲۔ آداب الحرب والشجاعت، ص ۶۸؛ حسن نظامی، تاج المآثر، نقل نمبر ۹۴۔۹۶ (مخطوطہ آصفیہ لائبریری، حیدرآباد)، ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ص ۱۹۔۲۰

۳۳۔ الفتاویٰ العالمگیریہ، ۱/۱۹۱

۳۴۔ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۹۰

۳۵۔ الفتاوی الغیاثیہ، ص ۱۰۸

۳۶۔ الفتاویٰ الامینیہ، ورق ۱۳۲ (بحوالہ محمد اسحاق بھٹی، برِّ صغیر پاک و ہند میں علم فقہ، البلاغ پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۲۳۸)

۳۷۔ سراج الھدایہ، محولہ بالا، ص ۱۱۱۔۱۱۲

۳۸۔ اس موضوع پر تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: خلیق احمد نظامی، تاریخِ مشائخ چشت، دہلی، ندوۃ المصنفین، ۱۹۵۳ء، ص ۲۷۸۔۲۸۱

۳۹۔ Khaliq Ahmad Nizami, *Some Aspects of Religion and*

Politics in India

Thirteenth Century, New Delhi,1974,pp.244.246

۴۰ فتاویٰ فیروز شاہی، اوراق ۴۴۸الف۔ ۴۴۸ب

۴۱ تفصیل کے یے ملاحظہ کریں: ظفرالاسلام اصلاحی، سلاطین دہلی اور شریعت اسلامیہ، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء(باب پنجم: فیروز شاہ تغلق اور شرعی قوانین کا نفاذ)، ص۸۵۔۱۰۲

۴۲ فتوحات فیروز شاہی (تصحیح شیخ عبد الرشید) علی گڑھ، ۱۹۴۵ء، ص۶ ؛ سیرت فیروز شاہی نقل (مخطوطہ خدا بخش لائبریری) یونیورسٹی کلکشن، نمبر۱۱۱ ، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ص۱۲۴

۴۳ شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۹۱ء، ص۲۷۸۔۲۷۹؛ فتوحات فیروز شاہی، ص۵؛ سیرت، فیروز شاہی، ص۱۲۴

۴۴ فتاویٰ فیروز شاہی، ورق ۵۷الف

۴۵ الفتاویٰ الغیاثیہ، ص۴۷

۴۶ فتاویٰ فیروز شاہی، ورق ۳۴۳ب

۴۷ تفصیلات کے لیے دیکھئے: ظفرالاسلام اصلاحی، اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں اور مزید محاصل کا مسئلہ۔ایک فقہی تجزیہ، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، ۳/۳، جولائی۔ستمبر ۱۹۸۴ء، ص۶۵۔۸۹

۴۸ عین الدین ماہرو، انشاء ماہرو (تصحیح شیخ عبد الرشید) علی گڑھ، بدون تاریخ، مکتوب نمبر۔۳، ص۵۸۔۵۹؛ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص۱۲۹۔۱۳۰

۴۹ محمد نجات اللہ صدیقی، اسلام کا نظریۂ ملکیت، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۷۸ء، ص۳۹۱۔۴۵۴

۵۰ برہان الدین علی المرغینانی، الہدایہ، نول کشور لکھنو، ۱۳۲۵ھ، ۴/۴۵۵؛ ابوالحسن علی الماوردی، الاحکام السلطانیہ، مطبعۃ السعادہ، مصر، ۱۹۰۹ء، ص۳۲۲؛ ابو یوسف،

کتاب الخراج، المطبعۃ السّلفیہ، القاہرہ، ۱۳۵۲ھ، ص ۲۴

۵۱ انشاء ماہرو، محولہ بالا، ص ۶۸۔۷۳

۵۲ فتاویٰ فیروز شاہی، ورق ۱۷الف

۵۳ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۱۵۔۳۱۶

۵۴ خیر المجالس (ملفوظات شیخ نصیر الدین چراغ دہلی) مرتبہ حمید قلندر (تصحیح پروفیسر خلیق احمد نظامی)، علی گڑھ، بدون تاریخ، ص ۲۴۰۔۲۴۱

۵۵ آداب الحرب والشجاعت، ص ۲۷۶؛ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۱۹؛ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۰۳

۵۶ فتاویٰ فیروز شاہی، اوراق ۲۲۰الف، ۲۲۶الف

۵۷ فتاویٰ فیروز شاہی، ۲۲۰ب، ۲۲۲ب

۵۸ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۱۰۔۵۱۱

۵۹ حوالہ مذکور، ص ۵۴۸

☆☆☆

بھارت جیسے کثیر طبقاتی ملک میں تہذیب وسیاست کے کچھ قرآنی اصول

محمد اسماعیل فلاحی*

قرآن کریم کی بنیادی تعلیم بندگیِ رب کی دعوت ہے، یہی تمام انبیاء کی تعلیم رہی ہے۔ پوری کائنات کا خالق، رازق، مالک، حاکم اور مدبر اللہ ہے، اس لیے وہی بلاشرکتِ غیرے ہمارا الٰہ اور رب ہے۔ پوری کائنات کی طرح انسان کی حیثیت بھی بندے اور غلام کی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ اپنی آزادی اور خودمختاری سے دست بردار ہوکر اپنے آپ کو اللہ کی بندگی اور غلامی میں دے دے۔ زندگی کے کسی ایک گوشہ میں نہیں، بلکہ پوری زندگی میں اس کی پرستش اور اس کی اطاعت اپنے اوپر لازم کرلے، اس لیے کہ وہی فرماں روائے کائنات اور بادشاہِ ارض وسما ہے۔ زندگی کے لیے ضابطہ اور قانون دینا اسی کا کام ہے۔ وہی شارع اور قانون ساز ہے۔ انسان کے لیے صحیح رویہ یہ نہیں ہے کہ وہ خود قانون ساز بن جائے یا کسی دوسرے فرد یا ادارے کے لیے یہ حق تسلیم کرلے بلکہ جہاں ایک طرف وہ ہمارے سجدوں، ہماری نیازمندیوں اور ہماری تعظیم و پرستش اور ہماری محبتوں کا مرکز ہے وہیں دوسری جانب زندگی کے کاروبار میں انفرادی ہوں کہ اجتماعی، داخلی ہوں کہ خارجی، تمام امور و معاملات میں، بے چوں وچرا اسی کے احکام وفرامین کی اطاعت لازم اور واجب الاتباع ہے۔

اَلا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف:۵۴) یادرکھو، اللہ ہی تخلیق کرتا ہے، اس لئے

---

* سابق استاذ تفسیر، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

تنہا وہی امر اور فرماں روائی کا حق بھی رکھتا ہے۔

اس بنیادی کام کی طرف دعوت تکثیری اور غیر تکثیری ہر طرح کے سماج میں، نیز دورِ محکومیت و مظلومیت میں بھی اور دورِ حکمرانی میں بھی محبت و خیر خواہی کے ساتھ، کردار و گفتار دونوں سے دیتے رہنا اہل ایمان کی ذمہ داری ہے۔ اسی سے معاشرہ کی اصلاح ہوگی، معروفات کا قیام ہوگا، فتنوں اور مظالم سے نجات ملے گی اور فساد کا خاتمہ ہوگا لیکن یہ سارا کام فرقہ وارانہ منافرت اور طبقاتی کشمکش سے بچتے ہوئے، تشدد اور تخریب سے دور رہ کر، پرامن طریقہ سے، افہام و تفہیم کے ساتھ، ایجابی اور تعمیری ہوگا۔

قرآن میں مختلف انبیاء کی دعوت کے تذکرے ہیں، ان میں بندگی رب کے تقاضے کے طور پر ان معروف اخلاقیات پر زور دیا جاتا ہے جن کی بنیادیں فطرت انسانی میں گہری جمی ہوئی ہیں اور ان منکرات پر تنقید کی جاتی ہے جنھیں انسانی فطرت پسند نہیں کرتی اور جن سے فرد اور معاشرہ دونوں پر تباہ کن اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ قرآن بھی اسی طرح مکہ کے اندر عدل و قسط کی آواز اٹھاتا رہا اور ظلم کی مختلف شکلوں کے خلاف اس نے انسانیت کے ضمیر کو جھنجوڑنے اور جگانے کی کوشش کی مثلاً قتل اولاد، لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینا یا کسی بھی انسان کا قتلِ ناحق، زنا اور بے حیائی کے دوسرے کام، کمزوروں اور یتیموں کی وراثت پر قبضہ، ان کا مال ہڑپ کر لینا، انھیں دھکے دینا، اترانا، اکڑ کر چلنا، لین دین میں بدمعاملگی، ڈنڈی مارنا، کسی طرح کے بھی باطل کام میں شرکت، ہمز و لمز، حرص و بخل، خود غرضی و خشتِ نفس وغیرہ جیسے رذائل اعمال کے خلاف ضمیر انسانی کو آواز دی ہے، اسی طرح انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کا احترام، تکریمِ انسانیت، ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک، قرابت داروں کے ساتھ صلہ رحمی، یتیموں، مسکینوں کے سر پر دستِ شفقت، خیر کے کاموں میں انفاق، غلاموں اور قیدیوں کو آزاد کرانا، ایفاء عہد اور امانتوں کا پاس و لحاظ، عصمت و حیا کی حفاظت، برائی کے جواب میں حسن سلوک، لغویات سے کنارہ کشی وغیرہ فضائل و مکارم پر فطرتِ انسانی کو بیدار کیا ہے۔

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ انبیائی یا قرآنی انداز، بندگی رب کی دعوت کے ساتھ

ساتھ اپنے معاشرہ سے بے تعلق نہیں بلکہ اس کی صلاح وفلاح کے لیے فکرمندی اور تڑپ ہے۔ معاشرہ سے الگ تھلگ رہنا نہیں بلکہ اس کے خیر اور بھلائی، امن وسکون اور اوپر اٹھانے کے لیے تگ ودو ہے۔

یہ وہ کام ہیں کہ ہر طرح کے سماج میں اور ہر طرح کے حالات میں تا حد مقدور کرنا قرآنی اصول ہے۔لیکن درج ذیل بنیادی ہدایات بھی وہ ذہن نشین کراتا ہے۔جس کا ابتداہی میں ذہن میں رہنا قرآنی تہذیب وسیاست کے خدوخال کو سمجھنے میں معاون ہوگا۔

قرآن کے نزدیک انسانی جان محترم اور قابلِ تکریم ہے،قطعِ نظر اس سے کہ وہ کسی مسلم کی ہے یا غیر مسلم کی۔کسی بھی انسانی جان کے قتل ناحق کو قرآن ایک سنگین جرم قرار دیتا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن کی رو سے کسی شخص کو اپنی جان بھی ختم کرنے کا اختیار نہیں ہے، نہ بچوں کی جان لی جاسکتی ، نہ بچیوں کی ، نہ جاں بلب لاعلاج مریضوں کی، اسلام اس سلسلہ میں اتنا حساس ہے کہ اس نے ضرورت کے تحت جانوروں کی جان لینے پر بھی متعدد قسم کی پابندیاں عائد کررکھی ہیں۔

”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِيْ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلاً“ (بنی اسرائیل:۷۰)

(ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی ہے اور اس کے لیے بَرّ و بحر میں سواریوں کا انتظام کیا ہے اور اسے پاکیزہ اور نفیس چیزیں عطا کی ہیں اور اپنی بہت ساری مخلوقات پر اسے نمایاں برتری عطا کی ہے۔)

”وَلاَ تَقْتُلُواْ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّهُ إِلاَّ بِالحَقِّ“ (بنی اسرائیل:۳۳)

(کسی جان کو جسے اللہ نے حرمت بخشی ہے، ناحق قتل نہ کرو۔)

”وَلاَ تَقْتُلُواْ أَوْلاَدَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلاقٍ“ (بنی اسرائیل:۳۱)

(اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے نہ مار ڈالو۔)

"وَإِذَا الْمَوْؤُودَةُ سُئِلَتْ. بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ" (تکویر:۸،۹)

(جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم کی پاداش میں ماری گئی؟...)

"مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعاً وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا" (مائدہ:۳۲)

(جس نے کسی انسان کا خون بہایا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد پھیلا ہو تو گویا اس نے سارے انسانوں کو زندگی بخشی۔)

انسانی جان کی طرح اس کی عزت و آبرو، عصمت و حیا اور اس کے مال کی حفاظت کو بھی قرآن انسانوں کا بنیادی حق قرار دیتا ہے۔

"وَلاَ تَقْرَبُواْ الزِّنَى إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاء سَبِيلاً" (بنی اسرائیل:۳۲)

(زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو، یقیناً یہ بڑی بے حیائی کی بات اور بہت ہی بری راہ ہے۔)

"لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَى أَن يَكُونُوا خَيْراً مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاء مِّن نِّسَاء عَسَى أَن يَكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ....." (الحجرات:۱۱)

(نہ مرد مردوں کا مذاق اڑائیں ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے کی عیب چینی نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارو۔)

"وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضاً......" (الحجرات:۱۲)

(اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرو۔)

"وَلاَ تَأْكُلُواْ أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُواْ بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُواْ

فَرِيقاً مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ‘‘(البقرہ:۱۸۸)

(تم ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ اور نہ اسے حکام اسی کے ذریعہ بتاؤ کہ تمھیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ ظالمانہ طریقہ سے جانتے بوجھتے کھانے کا موقع مل جائے۔)

کمزور اور بے سہارا لوگوں پر قرآن کی خصوصی توجہ ہے۔

’’وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ‘‘(الذاریات:۱۹)

(اوران کے مالوں میں سائلوں اور محروموں کا حق ہوتا ہے۔)

’’وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِيناً وَيَتِيماً وَأَسِيراً‘‘(الدہر:۸)

(اور وہ (خدا کے وفادار بندے) اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔)

اسی طرح عورتوں کو اس نے اتنا اونچا مقام دیا ہے جو کسی مذہب میں بھی انہیں نہیں مل سکا ہے۔تہذیب مغرب اسے سمجھنے سے اب تک قاصر ہے۔

’’لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُواْ وَلِلنِّسَاء نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ‘‘(النساء:۳۲)

(مردوں کے لیے ان کی کمائی کا حق ہے اور عورتوں کے لیے ان کی کمائی کا حصہ ہے۔)

’’لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ‘‘(البقرہ:۲۲۸)

(ان عورتوں کو بھی معروف کے مطابق ویسے ہی حقوق حاصل ہیں جیسے ان پر ذمہ داریاں ہیں۔)

’’هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ‘‘(البقرہ:۱۸۷)

(تمھاری بیویاں تمھارے لیے بمنزلہ لباس میں اور تم ان کے لیے بمنزلۂ لباس ہو۔ (لباس کی طرح ہر حالت میں ایک دوسرے کے ساتھی، حفاظت کا ذریعہ اور ایک دوسرے کے لیے پردہ پوش ہو۔)

’’مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً

طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ" (نحل:۹۷)
(جو بھی نیک عمل کرے گا، مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو۔ اسے (دنیا میں) اچھی زندگی بسر کرائیں گے اور ایسے لوگوں کو ان کے بہترین اعمال کا صلہ دیں گے۔)

"فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لاَ أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ" (آل عمران:۱۹۵)
(ان کے رب نے ان کی دعا سن لی اور فرمایا کہ تمھارے کسی بھی عمل کرنے والے کا عمل، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ضائع نہیں کروں گا، تم مرد وعورت ایک دوسرے کا حصہ ہو۔)

انسان کی نجی زندگی اس کا بنیادی حق ہے، قرآن اسے کیسے نظر انداز کرسکتا ہے!

"لاَ تَدْخُلُوا بُيُوتاً غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا ......" (النور:۲۷)
(تم دوسرے کے گھروں میں داخل نہ ہو تا آنکہ انس حاصل کرو (اور اجازت لے لو)۔)

"لاَ تَجَسَّسُوا" (الحجرات:۱۲)
(ایک دوسرے کے (پوشیدہ احوال کی) ٹوہ میں نہ رہو۔)

دنیا میں نسل، رنگ، زبان اور وطن کی بنیادوں پر لوگوں نے تفریق اور تقسیم کی ایسی دیواریں کھڑی کردی ہیں جن کی وجہ سے آدم کے بیٹے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہوئے ہیں۔ قرآن کی روشنی میں اس طرح کی بنیادوں پر تفریق وتقسیم حد درجہ مہلک اور فساد فی الارض ہے۔ یہ چیزیں نہ رذالت کی دلیل ہے اور نہ ان سے کسی کی شرافت پرکھی جاسکتی ہے۔

"يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ" (الحجرات:۱۳)
(اے لوگو بلاشبہ ہم نے تمھیں ایک مرد وعورت سے پیدا کیا اور تمھیں

قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تا کہ تم ایک دوسرے کی شناخت کرسکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں کا سب سے زیادہ شریف تم میں کا سب سے پرہیز گار ہے۔)

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيراً وَنِسَاء وَاتَّقُوا اللّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالأَرْحَامَ إِنَّ اللّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيباً“ (النساء:۱)

(اے لوگو! اپنے اس رب کی نافرمانی سے بچو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے پھیلا دیے بہت سے مرد اور عورتیں۔ اس اللہ کی نافرمانی سے بچو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے طالب مدد ہوتے ہو اور رشتوں کا پاس ولحاظ رکھو۔ یقیناً اللہ تم پر نگراں ہے۔)

”وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ“ (الروم:۲۲)

(اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا ہے۔ بلاشبہ اس میں اہل علم کے لیے بڑے دلائل ہیں۔)

سب کا خالق ایک، مادہ تخلیق اور طریقہ تخلیق ایک اور سارے انسان اس خالق کے بندے اور غلام، پھر سب ایک ماں باپ کی اولاد، اس رشتہ سے سب آپس میں بھائی بھائی، اس اصولی حیثیت کو تسلیم کر لینے کے بعد دوریاں قربتوں میں بدل جائیں گی، نفرتیں محبتوں میں تبدیل ہو جائیں گی، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بھائی بھائی ہو جائیں گے۔ اعلیٰ واشرف اور ادنیٰ اور احقر کی خود ساختہ دیواریں منہدم ہو جائیں گی۔ پھر سرمایہ دار اور مزدوروں میں ٹکراؤ نہیں رہے گا۔

قرآن ایک اہم اصول یہ دیتا ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کا ذمے دار ہے اور ہر

ایک کے ساتھ عدل کا برتاؤ ہوگا۔ باپ کے بدلے بیٹا یا بیٹے کے بدلے باپ پکڑا نہیں جائے گا۔ عدل کے معاملہ میں دوست دشمن، چھوٹے بڑے اور حاکم ومحکوم کی کوئی تفریق نہیں ہوگی۔

"لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى" (النجم:۳۸)

(کوئی نفس کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔)

"إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ" (النساء:۵۸)

(اللہ تمھیں امانتوں کو ان کے مستحقین تک پہنچانے کا حکم دیتا ہے اور اس بات کا بھی حکم دیتا ہے کہ کسی قوم کی شدید دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی خداترسی اور تقویٰ سے قریب تر بات ہے۔)

دین وعقیدہ کے معاملہ میں قرآن کا دوٹوک فیصلہ ہے کہ اس معاملہ میں کسی طرح کا جبر واکراہ جائز نہیں۔ دین وعقیدہ کا تعلق انسان کی آزادی فکر ورائے اور دل سے ہے۔ قرآن اس آزادی کے معاملہ میں دنیا کے اندر کسی طرح کی مداخلت تسلیم نہیں کرتا، البتہ آخرت کا معاملہ دوسرا ہے۔ اسی طرح سے دوسرے مذاہب اور ان کے پیشوایان کے سلسلہ میں احترام کی تعلیم دیتا ہے۔

"لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" (بقرہ:۲۵۶)

(دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں۔)

"فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ" (کہف:۲۹)

(جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے انکار کرے۔)

"لَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعاً" (رعد:۳۱)

(اگر اللہ (لوگوں کو زبردستی ہدایت دینا) چاہتا تو سارے لوگوں کو ہدایت دے دیتا۔ (لیکن اس نے زبردستی پسند نہیں کی))

”وَلَوْ شَاء رَبُّكَ لآمَنَ مَن فِي الأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعاً أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُواْ مُؤْمِنِينَ“ (یونس:۹۹)

(اگر تیرا رب چاہتا تو روئے زمین کے سارے لوگ ایمان لے آتے (لیکن اس نے زبردستی پسند نہیں کی) تو کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مومن ہو جائیں؟)

اس تمہیدی گفتگو کے بعد ہم اپنے یہاں کے تکثیری سماج کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں کے حالات حضرت موسیٰؑ کے زمانۂ مصر کے حالات سے ایک حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ حضرت یوسف کے وقت سے لے کر پانچ سو سال تک مسلسل شاہانِ بنی اسرائیل مصر پر حکومت کرتے رہے جس کا تذکرہ درج ذیل آیت میں ملتا ہے:

”وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ اذْكُرُواْ نِعْمَةَ اللّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاء وَجَعَلَكُم مُّلُوكاً وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَداً مِّن الْعَالَمِينَ“ (مائدہ:۲)

(اور یاد کرو موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم کے لوگو! یاد کرو اللہ کے اپنے اوپر احسان کو جو اس نے تم پر کیا یعنی تمہارے اندر انبیاء اور بادشاہ پیدا کرتا رہا اور تمہیں وہ نعمتیں دیں جو دوسروں کو نہیں دیں۔)

اس کے بعد ایک متعصب قبطی النسل خاندان ان سے حکومت چھین کر مصر پر مسلط ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں بنی اسرائیل کو شدید تعذیب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ دور اتنا طویل ہوتا ہے کہ ان کے ذہن وفکر بھی غلام ہو کر رہ جاتے ہیں، مولانا جلیل احسن ندویؒ کہتے ہیں کہ فرعون نے نومولود بچوں کے ساتھ قابلِ دفاع جوانوں کو ختم کرنے کی اسکیم چلائی تھی، نسلی فسادات کراتا، جھوٹے مقدمات میں پھانستا، اس طرح اس نے ظلم کی ساری حدیں پار کر دیں اور عملاً بنی اسرائیل کو غلام بنا کر شودروں کے مقام پر لے آیا۔

ان حالات میں حضرت موسیٰؑ کی پیدائش ہوتی ہے اور وہ خدائی اسکیم کے نتیجے

میں فرعون کے محل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دینی تربیت تو ان کے گھر میں ہوتی ہے اور رموزِ مملکت کے سربستہ راز ان پر فرعون کے محل میں کھلتے ہیں۔ جب وہ شعور کی عمر کو پہنچتے ہیں تو یہ دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں کہ مصر کا بحران کس قدر کربناک ہے۔ اللہ کے بندوں کو کتنے طبقات میں بانٹ دیا گیا ہے اور بس ایک خاندان ہے جو پورے ملک کو اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑے ہوا ہے اور اس میں سب سے خراب صورت حال بنی اسرائیل کی ہے۔ حضرت موسیٰ اپنے اثر ورسوخ اور طاقت کا استعمال معاشرہ کی اصلاح اور ظلم وفساد کے انسداد کے لیے شروع کر دیتے ہیں اور ان کے کچھ اور بھی ساتھی اور ہمنوا شامل ہو جاتے ہیں۔ مزید برآں شاہی خاندان میں بھی ان کے ہمدرد پیدا ہوتے ہیں۔ عوام اور ملک کے سامنے ان کی حیثیت ایک مصلح کے طور پر سامنے آتی ہے۔ لیکن وہ اپنی اسی اصلاحی تحریک کی بنا پر فرعونیوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگتے ہیں اور ان پر نظر رکھی جانے لگتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ کن لوگوں سے ان کے مراسم ہیں۔ جس کے نتیجہ میں لوگ ان سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ قرآن کے تین مقامات سے ان باتوں کی جانب اشارے ملتے ہیں۔

الف: قرآن کہتا ہے: وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلَى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا (قصص:۱۵)
موسیٰ ایسے وقت میں شہر میں داخل ہوئے جبکہ شہر کے لوگ غافل اور بے خبر ہوتے ہیں۔

قرآن یہاں ''عَلَى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا'' کا اضافہ کس مقصد سے کر رہا ہے؟ صرف ودخل المدینۃ کافی تھا۔ اس سے ذہن ادھر جاتا ہے کہ ان کی اصلاحی سرگرمیوں کی وجہ سے ان پر پابندی رہی ہوگی لیکن پھر بھی اپنی بساط بھر عام لوگوں کی نگاہوں سے بچ بچا کر شہر کا جائزہ لینے اور حالات معلوم کرنے کے لیے جاتے ہوں گے تاکہ مظلوموں کی مدد کر سکیں اور ظلم کا انسداد ہو سکے۔

ب: پہلے دن تو ایک قبطی اور ایک اسرائیلی کو جھگڑتے ہوئے دیکھ کر بیچ بچاؤ کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ قبطی سے الجھ جاتا ہے، اپنے دفاع میں جو یہ ہاتھ چلاتے ہیں تو ایسا بے ڈھب پڑتا ہے کہ وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر ان کا یہ کردار بھی قابلِ تحسین اور قابلِ تقلید ہے کہ ایک قوم پرست لیڈر کی طرح خوش نہیں ہوتے کہ دشمن کے

ایک فرد کو جہنم رسید کر دیا بلکہ انھیں افسوس ہوتا ہے کہ خونِ ناحق سے ان کے ہاتھ رنگین ہو گئے۔ گر چہ کہ قتل کا ارادہ نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے ہیں۔ اس واقعہ کے دوسرے دن پھر وہی اسرائیلی ایک دوسرے شخص سے لڑتا ہوا نظر آتا اور دوبارہ پھر ان سے طالبِ مدد ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ پہلے تو اسرائیلی کو ڈانتے ہیں پھر قبطی کو پکڑ کر اس سے الگ کرنے کے ارادے سے آگے بڑھتے ہیں تو اسرائیلی کو دھوکہ ہو جاتا ہے اسے لگتا ہے کہ آج میری باری ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آج مجھے مار ڈالیں۔ وہ فوراً بول اٹھتا ہے۔

قَالَ يَا مُوسَى أَتُرِيدُ أَن تَقْتُلَنِي كَمَا قَتَلْتَ نَفْساً بِالْأَمْسِ إِن تُرِيدُ إِلَّا أَن تَكُونَ جَبَّاراً فِي الْأَرْضِ وَمَا تُرِيدُ أَن تَكُونَ مِنَ الْمُصْلِحِينَ (قصص:۱۹) اسرائیلی بولا: اے موسیٰ! کیا آج مجھے مارنے کا ارادہ ہے جیسے کل ایک جان لی تھی۔ تم تو ملک کے اندر بس ایک جبار اور ظالم بن کر رہنا چاہتے ہو اور تم نہیں چاہتے کہ اصلاح کرنے والوں میں سے ہو۔

اس اسرائیلی کا "وَمَا تُرِيدُ أَن تَكُونَ مِنَ الْمُصْلِحِينَ" کہنا دراصل یہ بتانا ہے کہ تمہارا مصلح ہونے کا دعویٰ غلط اور جھوٹ ہے۔ یہ جملہ اشارہ کر رہا ہے کہ ان کی اصلاحی سرگرمیاں جاری تھیں اور لوگ ان کو مصلح کے طور پر دیکھتے تھے۔

اس سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ جب تک قوم کی اصلاح نہ ہو جائے کوئی بڑا قدم اٹھایا نہیں جا سکتا۔ کل تک وہی اسرائیلی جو حضرت موسیٰ کو مستقبل کا نجات دہندہ اور پتہ نہیں کیا کیا سمجھتا تھا۔ ایک روز پہلے وہ ان سے مدد بھی لے چکا تھا، جب اسے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوا تو اس نے قبطی کے سامنے قتل کا راز افشا کر دیا، حالانکہ موسیٰ اور اس اسرائیلی کے علاوہ کوئی تیسرا نہیں جانتا تھا۔ اگر اس کے اندر کردار کی بلندی ہوتی اور موسیٰ کا صحیح معنوں میں قدر شناس ہوتا تو اس کے سوچنے کا انداز یہ ہوتا کہ میری جان جاتی ہے تو جائے، موسیٰ کو زندہ رہنا چاہیئے اور ان پر آنچ نہیں آنی چاہیئے۔

بنیادی طور سے یہ بہت اہم نکتہ ہے کہ مضبوط اور ٹھوس کردار کے بغیر کوئی قوم اوپر اٹھ نہیں سکتی۔ کردار سے عاری قوم اپنے ہی خنجر سے اپنا گلا گھونٹتی رہتی ہے۔

اسی واقعہ میں ایک اور نکتے کی بات ہے کہ ہماری دعوت کا کام معاشرہ کے ہر طبقہ میں ہونا چاہئے، حضرت موسیٰ اس پہلو سے بھی ممتاز نظر آتے ہیں کہ ان کا کام مختلف سطحوں پر تھا۔ چنانچہ جب قتل کی خبر اعیانِ سلطنت تک پہنچی اور وہ ان کے قتل کے مشورے کرنے لگے تو ان ہی کے ایک فرد نے آ کر موسیٰ کو بروقت خبردار کر دیا اور موسیٰ ان کے ہاتھ نہ لگے۔ مومن آلِ فرعون کا ذکر قرآن نے کتنے شاندار طریقہ سے کیا ہے کہ کس طرح اور کتنے مؤثر اسلوب میں حضرت موسیٰ کا دفاع انھوں نے کیا ہے، فرعون کی بیوی ایمان لے آئی، جادوگر سجدہ میں گر گئے اور پتہ نہیں کس کس طبقہ کے کیسے کیسے لوگ اسلام لائے ہوں گے۔ اس خیال کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اگر پورا مصر فرعون ہی کی طرح دشمن ہوتا تو پوری قوم مصر پر عذاب آجاتا۔ لیکن اللہ نے اس کی عام آبادی کو بچا کر اس کے اشرار کو لے جا کر سمندر میں غرق کر دیا۔

ج: موسیٰ نے فرعون کے سامنے جہاں اپنی دعوت پیش کی، وہیں یہ بھی کہا کہ بنی اسرائیل پر سے پابندی ہٹاؤ، اسے ہمارے پاس آنے دو، ہمارے پاس رہنے دو۔ تم نے ایسے حالات پیدا کر دئے ہیں کہ اصلاح پسندوں اور انقلاب کے نقیبوں کے پاس آتے ہوئے وہ ڈرتے ہیں۔

فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ (طٰہٰ: ۴۷) اس کا ترجمہ عام طور سے لوگ کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے۔ گویا وہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ بنی اسرائیل کو لے کر ہم یہاں سے کہیں اور جانا چاہتے ہیں۔ ایک بات تو یہ کوئی منظم حکومت اس کی اجازت کبھی نہیں دے سکتی، ایسا لغو مطالبہ وہ کریں گے کیوں؟ ارسال کے معنیٰ چھوڑنے کے ہیں۔ یہ امساک کی ضد ہے۔ امساک کے معنیٰ روکنے کے آتے ہیں۔ قرآن میں ہے: مَا يَفْتَحِ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِن رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِن بَعْدِهِ (فاطر: ۲) اللہ اپنی جو رحمت بھی لوگوں کو دیتا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جس رحمت کو وہ روکنا چاہے تو خدا کے روک لینے کے بعد اسے کوئی چھوڑنے والا نہیں یا دینے والا نہیں ہے۔ لفظ ارسال الی کے ساتھ آئے یا پھر کوئی اور قرینہ ہو تب بھیجنے کے معنیٰ میں

آتا ہے۔

مَـعَـنَـا حال ہے ترجمہ ہوگا تو بنی اسرائیل کو چھوڑ، اس حال میں کہ وہ ہمارے ساتھ رہیں گے، ہماری معیت اختیار کریں گے مع اپنے مضاف الیہ کے ساتھ حال واقع ہوا کرتا ہے۔ جیسے الـذیـن امنوا معه کا مفہوم ہوتا ہے کہ ایمان لا کر اس کے ساتھی بنے، معیت اختیار کی، اس کا ساتھ دیا۔ گھر میں بیٹھ نہیں رہے بلکہ نبی کے ساتھ ہر کام اور ہر محاذ پر شانہ بشانہ کھڑے رہے۔ سچے اہل ایمان کے لیے یہ آتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ جس گھڑی یا جس وقت نبی ایمان لایا، اسی وقت وہ ایمان لائے۔

سورہ دخان کی ایک آیت ہے جو اسی سیاق اور اسی موقع کی ہے۔ مندرجہ بالا مفہوم کو واضح کر دیتی ہے اور القرآن یفسّر بعضه بعضاً کی بہترین مثال ہے۔

أَنْ أَدُّوا إِلَـيَّ عِبَـادَ اللّٰهِ (دخان:۱۸) اللہ کے بندوں (یعنی بنی اسرائیل) کو مجھ تک پہنچنے دو۔ ادّی بصلہ الی پہنچانے اور پہنچنے کے معنیٰ میں آتا ہے۔ یہودیوں کے ایک گروہ کے بارے میں آل عمران ۷۵ میں آیا ہے۔ لا یؤدہ الیک وہ تم تک ایک دینار بھی پہنچنے نہیں دیں گے۔ سورہ نساء ۵۸ میں اہل ایمان کو ہدایت ہے۔ إِنَّ الـلّٰـهَ يَـأْمُرُكُمْ أَن تُـؤَدُّوا الْأَمَـانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا۔ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل تک یعنی اہل حقوق تک پہنچاؤ۔

حضرت موسیٰؑ مصر میں سالوں رہے، ارباب اقتدار اور عوام الناس کے سامنے دعوت پیش کرتے رہے اور ساتھ ہی بنی اسرائیل کی اصلاح و تربیت اور تعلیم و تنظیم کی جانب ان کی خصوصی دلچسپی رہی۔ فرعون کے مظالم پر انھیں صبر و توکل کی تلقین کرتے رہے، انھیں ہمت دلاتے رہے، ان کا حوصلہ بڑھاتے رہے اور ان پر ہر پہلو سے نگاہ رکھتے رہے۔ مصر میں اس وقت کے حالات میں تمام بنی اسرائیل کا کسی ایک مقام اور مرکز پر اصلاح و تربیت اور تعلیم کے لیے اکٹھا ہونا ممکن نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے:

وَأَوْحَيْـنَـا إِلَـى مُـوسَـى وَأَخِيـهِ أَن تَبَوَّءَا لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتاً وَاجْعَلُوا بُيُـوتَـكُـمْ قِبْـلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلاَةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ (یونس:۸۷) ہم نے موسیٰؑ اور اس

کے بھائی کو ہدایت کی کہ اپنی قوم (کی اصلاح وتربیت وتعلیم) کے لیے مصر میں چند گھر فراہم کرلو اور اے لوگو! (موسیٰؑ اور ہارونؑ کے فراہم کردہ) اپنے (ان) گھروں کو مرکز کی حیثیت دو (یہاں اصلاح وتربیت وتعلیم کے لیے آؤ) اور نماز کا اہتمام کرو اور اے موسیٰؑ، ان مومنین کو خوش خبری دے دو کہ اب دیر نہیں ہے، صبحِ نو طلوع ہونے والی ہے اور ظلمتِ کفر وشرک چھٹنے والی ہے۔

مسلسل غلامی میں رہتے رہتے بنی اسرائیل کی اخلاقی حالت بہت زیادہ رو بہ زوال تھی، ان کی اصلاح اور ان کے مسائل حل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن حضرت موسیٰؑ نے دینی فریضہ سمجھ کر یہ ملّی کام کیے اور بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم کو اس مقام پر لاکر کھڑا کردیا کہ ان کے اندر شعور پیدا ہوگیا۔ اشرار ومنافقین کے ایک گروہ کو چھوڑ کر پوری قوم میں ایک نیا ولولہ اور شوقِ تازہ پیدا ہوا۔ اخلاقی تربیت ہوئی اور اس حد تک تربیت ہوگئی کہ فرعونیوں پر حجت پوری ہونے کے بعد اللہ کے حکم سے جب ہجرت کے لیے یہ پوری قوم جو لاکھوں کی تعداد میں تھی، خاموشی سے نکلی ہے تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ بچے، بوڑھے، مریض، سب کو اتنی خاموشی سے نکال لے جانا، منزل کے شعور، مضبوط اخلاقی کیرکٹر اور غیر معمولی تنظیم کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

توریت کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے صحرائے سینا میں پہنچ کر قابل جنگ مردوں کی مردم شماری کرائی تو ان کی تعداد ٦ لاکھ تین ہزار پانچ سو پچاس تھی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ عورت، مرد اور بچوں کو شامل کرلیا جائے تو تو ان کی تعداد بیس لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل ٦٧ کی تعداد میں مصر پہنچے تھے، یوسفؑ کو ملا لیجیے تو یہ تعداد ٦٨ ہوتی ہے۔ پانچ سو سال کے عرصہ میں اتنی بڑی تعداد کا ہوجانا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ یوسفؑ کے وقت سے لے کر حضرت موسیٰؑ کے زمانہ تک دعوت کا غیر معمولی کام ہوا تھا اور خاص بات یہ کہ یہ سب نو واردانِ چمن بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں سے کسی نہ کسی میں ضم ہوتے چلے گئے۔ اس موقع پر جو نکتہ میرے نزدیک توجہ طلب ہے وہ یہ کہ بیس لاکھ کی تعداد اس وقت کے مصر میں معمولی تعداد نہیں تھی، لیکن ہمیں

کہیں نظر نہیں آتا کہ ایسے مظالم بھرے دور میں حضرت موسیٰؑ نے کبھی ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کی ہو۔ بس اپنی ملت کی تعمیر، اصلاح وتربیت، تنظیم اوران کے مسائل کے حل پر ممکن حد تک توجہ دی اور ساتھ ہی دعوت کا فریضہ بھرپور طریقہ سے انجام دیتے رہے اور اس جانب ذرا بھی کوتاہی نہیں برتی۔ وہ چاہتے تو بڑی آسانی سے چھاپہ مار دستے تشکیل دے سکتے تھے اور مظالم کا بدلہ کسی نہ کسی شکل میں لے سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا جس کے پیچھے بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

اب ہم اور اوپر کی طرف اٹھتے ہیں اور مصر میں حضرت یوسفؑ کے دور میں آتے ہیں۔قرآن نے حضرت یوسفؑ کے قصہ کے اندر ہمارے لیے اسباق رکھے ہیں۔

الف: یوسفؑ کس مظلومیت اور بے کسی کے عالم میں مصر کے اندر بادشاہ کے بعد سب سے بڑی مقتدر شخصیت کے گھر پہنچتے ہیں اور وہاں ان کو کن حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اپنی اٹھتی جوانی کو بے داغ رکھنے کے لیے انھیں کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ عزیزِ مصر اور دوسرے حکام اپنی عورتوں کی بدچلنی اور حضرت یوسفؑ کی معصومیت اور بے گناہی کے متعدد شواہد دیکھ لینے کے بعد بھی یہی طے کرتے ہیں کہ اپنی عورتوں پر قابو پانا تو مشکل ہے، بہتر ہے کہ انہی کو جیل بھیج کر اپنی بدنامی کم کرائی جائے اور سارا قصور ان کے کھاتے میں ڈال دیا جائے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پہلے انھوں نے اپنے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ یوسفؑ کے خلاف مہم چھیڑی ہوگی، انھیں بدنام کیا ہوگا، یہاں تک کہ جب فضا ان کے حق میں سازگار ہوگئی ہوگی تو انھوں نے یوسفؑ کو حوالۂ زنداں کردیا ہوگا، منظم حکومتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے، پہلے میڈیا کام کرتا ہے، جب فضا موافق ہوجاتی ہے تو اگلا قدم اٹھایا جاتا ہے۔

اس پورے دورِ مظلومیت میں اپنی صفائی اور بے گناہی کے لیے حضرت یوسفؑ دوبار زبان کھولتے دکھتے ہیں۔ ایک بار تو جب بیگمِ عزیز نے محل کے دروازے بند کرکے بڑی بے شرمی کے ساتھ برائی کی دعوت دی اور کہا ھیــت لك (یوسف:۲۳) (آجا، تجھی سے کہتی ہوں)۔ حضرت یوسفؑ نے اللہ کا خوف دلایا، پھر بھی وہ نہ مانی تو دروازے کی

طرف باہر نکل جانے کے لیے وہ بھاگے، پیچھے سے وہ دوڑی اور دروازے کے بالکل قریب عزیز مصر کو دیکھ کر اس نے سارا الزام یوسفؑ پر دھر دیا، یوسفؑ اس موقع پر خاموش نہیں رہتے۔ فرماتے ہیں هِـيَ رَاوَدَتْـنِـيْ عَـنْ نَّـفْسِـيْ (یوسف:۲۶) اسی نے مجھ پر ڈورے ڈالے اور برائی کے دلدل میں گرانے کی کوشش کی۔ دوسری بار اس وقت زبان کھلتی ہے جب بادشاہ بلاتا اور رہائی کا پروانہ آتا ہے لیکن جیل سے نکلنے سے پہلے اپنے معاملہ کی وہ از سر نو تحقیق کراتے ہیں۔ کہتے ہیں:

مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ (یوسف:۵۰) ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے سارے ہاتھ اور ساری قوت قطع کر ڈالی تھی۔ بادشاہ کی تحقیق کے نتیجہ میں جب ان کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے تب وہ باہر تشریف لاتے ہیں۔

اس سے یہ سبق مضمر ہے کہ ممکن حد تک اپنے یا اپنی ملت پر لگنے والے بے بنیاد الزامات کی صفائی پیش کی جائے اور اس کے لیے غیر الٰہی نظام کی طرف بھی رجوع کرنا پڑے تو دریغ نہ کیا جائے بلکہ غیر الٰہی نظام میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اگر مواقع ہیں تو یہ بات وجوب کے درجہ میں پہنچ جاتی ہے کہ آدمی اپنی بے گناہی ثابت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ ہر جگہ خاموش نظر آتے ہیں لیکن یہاں ان کا موقف سخت ہو جاتا ہے اور غیر الٰہی نظام ہی کے تحت سہی اپنی بے گناہی ثابت کرتے نظر آتے ہیں۔

ب: حضرت یوسفؑ جیل سے رہا ہونے والے ساتھی سے کہتے ہیں:

اذْكُرْنِيْ عِندَ رَبِّكَ (یوسف:۴۲)

(اپنے آقا یعنی بادشاہ کے سامنے میرا تذکرہ کرنا۔)

اتنی بات ظاہر ہے کہ بادشاہ حاکمیتِ اللہ کا علمبردار نہیں تھا جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ غیر الٰہی نظام کے حکمرانوں یا دوسرے بااثر لوگوں اور اداروں سے اپنے مقصد حق کی خاطر تعاون حاصل کرنا جائز ہی نہیں بلکہ اگر ممکن ہو تو بعض اوقات یہ وجوب کے درجہ میں ہو جاتا ہے۔

ج: اس پورے عرصہ میں جہاں ان کی زندگی بالکل صاف ستھری بے داغ ہے۔ جیل کے قیدی انھیں ایک شریف انسان کے طور پر دیکھتے ہیں اور یہ دعوت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، وہیں ان کا ایک نمایاں وصف بندگانِ خدا کی خیرخواہی اور ان سے بےلوث محبت اور ان کی خدمت کرنے کا جذبہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہاں کوئی مسلمان نہیں ہے۔ سب دوسرے لوگ ہیں، ارباب اقتدار نے ان کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کی ہے، کیسے گھناؤنے الزام میں پھانسا ہے اور اس پر پورا ملک پورے عرصہ میں خاموش تماشائی بنا رہا ہے، ایک آواز بھی ان کے حق میں اٹھتی سنائی نہیں دی لیکن اس کے باوجود جب بادشاہ خواب دیکھتا ہے تو سوچ کا انداز یہ نہیں ہوتا کہ سب کو مرنے دو، ہمیں ان ظالموں سے کیا لینا دینا، جنھوں نے ہمارے ساتھ اتنے سالوں سے ایسا برا سلوک روا کر رکھا ہے بلکہ نہ صرف خواب کی تعبیر بتاتے ہیں بلکہ اس زبردست طوفانی قحط سے نمٹنے کے لیے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ تدبیر بھی بتاتے ہیں جس کی لپیٹ میں پورا براعظم افریقہ اور ایشیا آیا۔ یہ عام انسانوں ہی سے نہیں بلکہ ان سب لوگوں سے بھی جو کسی نہ کسی طور سے ان کے اوپر ظلم میں شریک ہیں نصح و خیرخواہی اور محبت و ہمدردی کی بہترین مثال ہے جو قیامت تک اہل حق کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

د: اس پورے عرصہ میں دعوت کے کام میں تو مشغول نظر آتے ہیں لیکن کہیں سے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی کہ ارباب سلطنت کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہوں یا کوئی محاذ قائم کرنے یا جتھا تشکیل دینے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ظاہر ہے کہ وہاں کے ظالمانہ نظام میں وہاں کے باشندوں کے مختلف طبقات نابرابری اور ناانصافی کا شکار اور اپنے جائز حقوق سے محروم رہے ہوں گے۔ جنھیں ملا کر ظالموں کو سبق سکھانے کے لیے کوئی حکمت عملی تیار کی جا سکتی تھی لیکن وہ ایسا کرتے نظر نہیں آتے۔

ہ- مَلِک کی خواہش پر صحیح حکومت میں شرکت کی دعوت حضرت یوسفؑ نے قبول کی اور فرمایا قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْأَرْضِ إِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ (یوسف:۵۵) یوسفؑ نے کہا: مجھے مصر کے خزانوں اور سورسز پر فائز کر دیجئے، یقیناً میں نگہبان اور خوب علم رکھنے

والا ہو۔

یہ صحیح ہے کہ عملاً پورے مصر پر اقتدار ملا ہے جیسا کہ کَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوسُفَ فِی الْأَرْضِ یَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَاءُ (یوسف:۵۶) سے ظاہر ہے۔ یَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَاءُ پورے ملک مصر پر تصرف کے اختیار کی تعبیر ہے لیکن بہر کیف و بہر صورت یہ اقتدار بادشاہِ مصر کے تابع تھا۔ جیسے کہ یوسفؑ سے پہلے کے عزیز مصر کے اقتدار کا حال تھا۔ دونوں اقتدار شاہ مصر کے تحت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ نے سابق عزیز کو معزول کیا اور اس کی جگہ پر آپؑ کو مامور کیا۔ آپ کے بھائی آتے ہیں تو آپ کو یاایھا العزیز کہہ کر خطاب کرتے ہیں (یوسف:۷۸) بعد میں بادشاہ بالکل دستبردار ہو گیا یا مسلمان ہو گیا یا مر گیا تب جا کر آپ کی حیثیت ملک (مکمل حکمراں) کی ہوتی ہے جیسا کہ ورفع ابویہ علی العرش (یوسف:۱۰۰) سے واضح ہے لیکن ظاہر ہے کہ اقتدار میں شرکت کے وقت اور اجعلنی علی خزائن الارض کہتے وقت حضرت یوسف کی بہر کیف وہ پوزیشن نہیں تھی، اس وقت کی صورتحال یہ تھی کہ غیر الٰہی نظام قائم تھا۔ ملکی قانون چل رہا تھا، جو قانون بہر کیف اللہ رب العالمین کی حاکمیت تسلیم کر کے نہیں بنایا گیا تھا۔ مَا کَانَ لِیَأْخُذَ أَخَاهُ فِی دِیْنِ الْمَلِکِ (یوسف:۷۶) وہ اپنے بھائی کو ہرگز نہیں لے سکتے تھے ملکی قانون کی رو سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے یہ نہیں کہا کہ بادشاہ خود کو پہلے اقتدار سے الگ کرے جبکہ یوسفؑ جانتے ہیں کہ بادشاہ کا اپنا نظام و قانون ہے، یہ بھی نہیں ہوا کہ مطالبہ کیا ہو کہ پہلے دستور بدلو، حاکمیتِ الٰہ کی شرط کے بغیر انھوں نے حکومت میں شرکت قبول کی اور اس منصب پر فائز ہوئے۔ ملک کا قانون و دستور جو تھا وہی نافذ رہا۔ آیت ۷۶ میں جو دین الملک آیا ہے ظاہر ہے کہ اس سے شاہی ضابطہ و قانون ہی مراد ہے جو پہلے سے چلا آ رہا تھا اور یوسفؑ یہ جانتے تھے کہ اسے بیک جنبشِ قلم یا صبح و شام کے درمیان بدل دینا ان کے بس میں نہیں۔

یوسفؑ نے ایسا کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔ وہ نبی معصوم تھے، ان کا اس منصب پر فائز ہونا حاکمیتِ الٰہ سے متصادم نہیں بلکہ حاکمیتِ الٰہ کے لیے راہ ہموار کرنے کی

خاطر، بندگانِ خدا کو عدل سے ہمکنار کرنے اور انھیں ناانصافی اور ظلم سے تاحدِ مقدور نجات دلانے اور ان لاکھوں انسانوں کو مرنے سے بچانے کی غرض سے تھا جن کی ہلاکت صحیح آدمی کے ہاتھ میں اقتدار نہ آنے کی بنا پر یقینی تھی،

اصولی طور سے کسی ایسے اقتدار میں شمولیت جو حاکمیتِ الٰہ کا قائل نہ ہو، چاہے وہ اقتدار جس شکل میں ہو، جائز نہیں۔ لیکن کچھ مخصوص حالات ایسے ہوتے ہیں جن میں یہ شمولیت جائز ہوتی ہے بلکہ صورت حال کا تقاضا ہو تو واجب بھی ہو جاتی ہے، ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ کا یہ عہدہ قبول کرنا کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں تھا۔ حضرت یوسفؑ کے اس عمل سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ اس کے باوجود ایک مومن کا عقیدہ ہوتا ہے کہ حاکمیت صرف الہ کے لیے اور بندگی بس اسی کی ہونی چاہئے۔ اس کے باوجود ایسے حالات آسکتے ہیں کہ کسی غیر الٰہی نظام کے تحت قائم حکومت میں کسی منصب پر سرفراز ہوا جا سکتا ہے اور اس سے اس کا عقیدہ مجروح نہیں ہوتا۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی گنجائش حضرت یوسفؑ کی شریعت میں تھی اور اب نہیں ہے، حاکمیت اللہ ہی کے لیے مختص ہے۔ یہ ایسی مسلّم اور متفق علیہ بات ہے کہ تمام انبیاء اور تمام شریعتوں میں اس کا ہونا یقینی ہے۔ حضرت یوسفؑ اس کے قبل جیل کے ساتھیوں سے کہہ بھی چکے ہیں کہ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (یوسف:۳۹) اور اِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ (یوسف(۴۰) ایسا نہیں ہے کہ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہوں کہ حاکمیت اللہ ہی کے لیے ہے، اس کے باوجود انھوں نے اس منصب کو قبول کیا۔

کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ معاملہ یوسفؑ کے ساتھ مخصوص رہا ہوگا، اس لیے کہ اللہ اسے اپنی رحمت سے تعبیر کرتا ہے اور نصیب بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ (یوسف:۵۶) کہہ کر اسے عام کر دیتا ہے۔ یوسفؑ بھی اسے بطور احسانِ خداوندی کے ذکر کرتے ہیں۔ (یوسف:۱۰۱)

ایک لطیفہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت یوسفؑ دونوں کے تعلق سے یہ ہے کہ دونوں

کی سیاسی تربیت کا انتظام اللہ تعالیٰ نے غیر الٰہی نظام میں ظالموں کے گھر کیا، ایک کا فرعون کے یہاں اور دوسرے کا عزیز مصر کے یہاں۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ حضرات مفسرین کی اس سلسلہ میں کیا آراء ہیں۔

مدارک التنزیل و حقائق التاویل کے مصنف عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی "اجعلنی علی خزائن الارض" کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

وفيه دليل على أنه يجوز أن يتولى الانسان عمالة من يد سلطان جائر، وقد كان السلف يتولون القضاء من جهة الظلمة، وإذا علم النبي أو العالم أنه لاسبيل إلى الحكم بأمر الله ودفع الظلم إلا بتمكين الملك الكافر أو الفاسق فله أن يستظهر به[1] اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کا کسی ظالم بادشاہ کی ماتحتی میں عہدہ ومنصب قبول کرنا جائز ہے۔ ہمارے اسلاف قضا کی ذمہ داری ظالم حکمرانوں کی ماتحتی میں لیتے رہے ہیں اور جب نبی یا عالم کے علم میں یہ بات ہو کہ اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کرنا اور ظلم کا سدباب کرنا، کافر یا فاسق بادشاہ کو حکومت دینے ہی پر منحصر ہے تو اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ اس کافر یا فاسق بادشاہ سے مدد حاصل کرے۔

قاضی ثناء اللہ امرتسری پانی پتی اپنی تفسیر مظہری میں اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

طلب الولاية ليتوصل بها إلى إمضاء أحكام الله وإقامة الحق وبسط العدل مما يبعث لأجله الانبياء و إلى العباد، لعلم أن أحدا غيره لايقوم مقامه في ذلك، فما كان قلبه الولاية إلا لابتغاء وجه الله لالحب الجاه والدنيا ...... قال البيضاوي...... وفيه دليل على جواز طلب الولاية والقضاء وإظهار أنه مستعدلها إن كان آمنا على نفسه و على جواز أن يتولى الانسان عملاً من يد سلطان جائر أو كافر إذا علم أنه لا سبيل إلى إقامة الحق وسياسة الخلق إلا بتمكين ذلك الكافر أو الجائر......[2] یوسفؑ نے عہدہ طلب کیا تا کہ اس کے ذریعہ اللہ کے احکام کا اجرا، حق اور عدل وقسط کا قیام کیا جا سکے جس کی خاطر انبیاء بندوں کی جانب مبعوث کیے

جاتے رہے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا ان کا بدل نہیں بن سکتا۔ ان کا عہدہ طلب کرنا اللہ کی رضا کی خاطر تھا، جاہ و منصب اور دنیا کی خاطر نہیں تھا...... بیضاوی فرماتے ہیں...... اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ حکومت اور منصب قضا کی طلب جائز ہے، وہ اس بات کا بھی اظہار کرسکتا ہے کہ وہ اس کے لیے تیار ہے بشرطیکہ اپنے اوپر اطمینان ہو، اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ظالم یا کافر بادشاہ کے ہاتھوں کوئی عہدہ لیا جاسکتا ہے جبکہ یہ معلوم ہو کہ حق کا قیام اور بندگانِ خدا کی سیاست وحکومت اس کافر یا ظالم بادشاہ کے دینے ہی پر منحصر ہے۔

ابوالفضل شہاب الدین سید محمود آلوسی اس آیت پر اپنی تفسیر روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی میں یوں گفتگو کرتے ہیں:

وفيه دليل على جواز مدح الانسان نفسه بالحق إذا جُهِل أمره، جواز الطلب الولاية إذا كان الطالب ممن يقدر على إقامة العدل وإجراء أحكام الطريقة وإن كان من يد الجائر أو الكافر، وربما يجب عليه الطلب إذا توقف على ولايته إقامة واجب مثلاً ؎ اس میں اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ انسان اپنی واقعی تعریف کرسکتا ہے جبکہ لوگ اس کی خوبیوں سے ناواقف ہوں، عہدے اور حکمرانی کی طلب اس وقت جائز ہے جبکہ اس کا طالب عدل کے قیام اور احکام شریعت کے نفاذ پر قادر ہو۔ اگر چہ کہ یہ حکمرانی ظالم یا کافر کی ماتحتی میں ہو۔ نیز بسا اوقات یہ طلب اور اس کے لیے سعی واجب ہوجاتی ہے جبکہ اس کی حکمرانی ہی پر کسی واجب یا فرض کا قیام ممکن ہے۔

شیخ محمد طاہر ابن عاشور اپنی تفسیر التحریر والتنویر میں اس آیت پر یہ اظہار خیال کرتے ہیں:

وهذه الآية اصل لوجوب عرض المرء نفسه لولاية عمل من امور الأمة إذا علم أنه لايصلح له غيره، لأن ذلک من النصح للأمة...... فلايعارض هذا ما جاء في صحيح مسلم عن عبدالرحمن بن سمرة قال قال رسول الله

ﷺ ”یاعبدالرحمن لاتسأل الإمارة فإنک إن أعطیتها عن مسألة وکلت إلیها وإن اعطیتها عن غیر مسألة أعنت علیها، لأن عبدالرحمن بن سمرة لم یکن منفرداً بالفضل بین أمثاله ولا راجحاً علی جمیعهم.“ ومن هذه الآیة اخذ فقهاء المذهب جواز طلب القضاء لمن یعلم أنه أهل وأنه ان لم یول ضاعت الحقوق، قال المازری: یجب علی من هو أهل الاجتهاد والعدالة السعی فی طلب القضاء إن علم أنه ان لم یَلِهِ ضاعت الحقوق أو ولیه من لا یحل أن یولی ؁جب انسان کو یہ علم ہو کہ فلاں کام کے لیے وہی موزوں ہے، ایسی صورت میں امت سے متعلق کسی ذمہ داری کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا واجب ہے کیونکہ امت کی خیرخواہی کا یہی تقاضا ہے۔ یہ آیت اس باب میں اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ نیز امارت کے طلب کی ممانعت والی حدیث سے متعارض نہیں ہے کیونکہ اس کے راوی عبدالرحمٰن بن سمرہ فضل و شرف میں منفرد نہیں تھے اور نہ انھیں سب پر ترجیح حاصل تھی۔ فقہاء نے قضا کے طلب کے جواز کی بات اس شخص کے لیے کہی ہے جو جانتا ہو کہ وہ اس کا اہل ہے اور اگر اسے یہ عہدہ نہ ملا تو حقوق ضائع ہو جائیں گے۔ مازری کہتے ہیں کہ جو لوگ اجتہاد اور عدالت کا وصف رکھتے ہیں ان کے لیے منصب قضا کی جدوجہد واجب ہو جاتی ہے، اگر انھیں علم ہو کہ وہ والی نہیں ہوئے تو حقوق برباد ہو جائیں گے یا والی ایسا شخص ہو جائے گا جس کا والی ہونا درست نہیں ہے۔

محمد احمد شوکانی اپنی تفسیر فتح القدیر میں لکھتے ہیں:

طلب یوسف علیه السلام منه ذلک لیتوصل به إلی نشر العدل ورفع الظلم ویتوسل به إلی دعاء أهل مصر إلی الإیمان بالله وترک عبادة الأوثان وفیه دلیل علی أنه یجوز لمن وثق من نفسه إذا دخل فی أمر من أمور السلطان أن یرفع منار الحق ویهدم ما أمکنه من الباطل، طلب ذالک لنفسه، ویجوز له أن یصف نفسه بالأوصاف التی لها ترغیباً فیما یرومه وتنشیطاً لمن یخاطبه من الملوک بإلقاء مقالید الأمور إلیه وجعلها منوطة به ؁ یوسفؑ نے بادشاہ سے یہ جو

فرمائش کی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عدل کو عام کریں گے اور ظلم کا سدباب کریں گے اور اس طرح اہل مصر کو ایمان باللہ اور بت پرستی کے ترک کی دعوت کا یہ چیز وسیلہ بنے گی۔ اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ یہ اس شخص کے لیے جائز ہے جسے اپنی جانب سے اعتماد ہو کہ جب وہ شریکِ سلطنت ہوگا تو پرچمِ حق بلند کرے گا اور باطل کو ممکن حد تک ختم کرے گا اور اس کے لیے جائز ہوگا کہ وہ اپنے وہ اوصاف بیان کرے جن کا وہ مستحق ہے، اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اپنے مخاطب ملوک کے اندر ترغیب پیدا کرنے اور ان کے اندر تیزی لانے کے لیے تاکہ وہ حکومت کی ذمہ داریاں اس کے سپرد کر دیں۔

محمود بن عمر زمخشری اپنی تفسیر میں اس پر بحث کرتے ہیں:

وإنما قال ذلك ليتوصل إلى إمضاء أحكام الله تعالىٰ و إقامة الحق وبسط العدل والتمكن مما لأجله تبعث الانبياء إلى العباد، ولعلم أن أحدا غيره لا يقوم مقامه في ذلك، فطلب التولية ابتغاء وجه الله لالحب الملك والدنيا[۶]

انھوں نے یہ مطالبہ اس کے سامنے صرف اس غرض کے لیے کیا کہ اللہ کے احکام کے اجراء، حق کے قیام، عدل کو عام کرنے اور غلبہ حاصل کرنے کے لیے اس کو استعمال کریں گے جس کی خاطر انبیاء کی بندوں کی جانب بعثت ہوتی رہی ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کوئی دوسرا ان کا بدل بھی نہیں ہوسکتا۔ ولایت و ذمہ داری سپرد کیے جانے کی درخواست انھیں اللہ کی رضا کی خاطر کی نہ کہ سلطنت اور دنیا کی محبت میں پڑ کر۔

مصالحِ اسلام اور مصالحِ امت کے پیش نظر حاکمیت الٰہ کا عقیدہ رکھتے ہوئے غیر الٰہی نظاموں میں شرکت نہ صرف جائز بلکہ بعض حالات میں واجب ہوتی ہے بلکہ ایسا بھی موقع آسکتا ہے کہ عامۃ الخلائق کو بڑے ضرر سے بچانے اور اسلام کے عدل اجتماعی اور وحدت الٰہ اور وحدت بنی آدم اور اللہ کی ربوبیت و الوہیت کی طرف مائل کرنے کی غرض سے بھی کبھی شرکت ضروری ہوسکتی ہے

اس سلسلہ میں بعض آیات سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ مثلاً:

"وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ" (مائدہ:۴۴)

(جولوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔)

"وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ" (مائدہ:۴۵)

(جولوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی ظالم ہیں۔)

"وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ"(مائدہ:۴۴)

(جولوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔)

"فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ حَتَّىَ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُواْ فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُواْ تَسْلِيماً" (نساء:٦٥)

(تمہارے رب کی قسم، یہ مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ تمہیں اپنے اختلافی معاملات میں تم کو اپنا حاکم نہ بنالیں پھر تمہارے فیصلہ کے سلسلہ میں اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پورے طور پر اس فیصلہ کوتسلیم کرلیں۔)

"أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُواْ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُواْ إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُواْ أَن يَكْفُرُواْ بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلاَلاً بَعِيداً"(نساء:٦٠)

(کیاان لوگوں کونہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ تم پراورتم سے پہلے نازل کردہ کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے مقدمات طاغوت کی عدالت میں لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ انھیں طاغوت کے انکار کا حکم دیا گیا تھا اور شیطان تو چاہتا ہی ہے کہ انھیں گمراہ کرکے بہت دور پہنچادے۔)

ان جیسی آیات کے سلسلہ میں یہ بات علم میں رہنی چاہیے کہ یہ اصلاً اس وقت

نازل ہوئیں ہیں جب اسلامی نظام عملاً قائم ہو گیا تھا۔ اس وقت اسلامی نظام کی سعادتوں سے ہم محروم ہیں۔ جب تک اسلامی نظام قائم نہیں ہو جاتا، اس وقت تک اپنے بہت سے امور و معاملات میں غیر اسلامی نظام ہی کی جانب رجوع کرنے کے لیے ہم مجبور ہیں اور اسلامی نظام اسی وقت قائم ہو گا جب لوگوں کی اکثریت اسے صحیح معنوں میں قبول کر کے اپنی زندگی کا دین بنائے گی اور اس کام کے لیے پر امن طریقہ سے دعوت کا لمبا مرحلہ طے کرنا ہو گا۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دعوت کے لازمی مراحل ہجرت اور جہاد ہیں۔ حالانکہ قرآن میں رسولوں اور ان کے ساتھیوں کے پس منظر میں جو بات کہی گئی ہے۔ وہ انہی کے ساتھ خاص ہے۔ آج ہم کیسے پتہ لگائیں گے کہ اتمامِ حجت ہو چکا، اب ہجرت فرض ہو گئی ہے۔ حضرت یونسؑ اپنے اجتہاد سے غیرتِ حق کے نتیجہ میں، خدا کے اذن کے بغیر ہجرت کر جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب کا شکار ہوتے ہیں۔ رسولوں کے پاس تو وحی آتی تھی جس سے ان کو معلوم ہوتا تھا کہ حجت پوری ہو گئی۔ لہٰذا اب ہجرت کرنی ہے، ہجرت کا مقام اور اس کا وقت سب اللہ طے کرتا تھا۔ رسول خدائی عدالت بن کر آتا ہے حجت پوری کرنے۔ اِس کے لیے ہجرت اور قوم پر خدائی عذاب طے ہے، اگر اہلِ ایمان اس پوزیشن میں ہیں کہ باطل کا قلع قمع کر سکیں تو پھر انہیں کے سر ہجرت کے بعد کا مرحلہ بھی آتا ہے۔ لیکن یہ چیز رسولوں کے ساتھ خاص ہے۔ عام انبیاء کے ساتھ بھی ایسا معاملہ نہیں ہے۔ وہ تو قتل بھی کیے گئے ہیں۔ ہمیں تو دعوت کا کام کرتے رہنا ہے اور آج ہم ہجرت کر کے جائیں گے بھی کہاں؟ خشکی، تری، دریا، پہاڑ، جنگل، فضا، کون سا خطہ محفوظ ہے۔ جہاں فراعنۂ مصر کا قبضہ نہ ہو۔ آج پوری دنیا ایک گاؤں کے مانند ہو گئی ہے جس پر کچھ چودھری قبضہ جمائے ہوئے ہیں جن کے شکنجے سے بچ نکلنا آسان نہیں۔ پہلے بچ نکلنے کی راہیں زیادہ تھیں، اب جدید ٹکنالوجی نے اسے بہت ہی محدود کر دیا ہے۔ آج ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جو ہماری چودہ سو سالہ پوری تاریخ میں بالکل منفرد نوعیت کا ہے۔ ہمارے اگلوں نے جو کچھ لکھا اپنے حالات کو سامنے رکھ کر لکھا، ہم

اپنے حالات کو ہو بہو اس پر قیاس نہیں کر سکتے، ہمارے سامنے جو چیلنجز ہیں اور جو امکانات اور مواقع ہیں ان میں ہمیں اپنے لیے قرآن و سنت ہی کی بنیاد پر اجتہاد کے ذریعہ نئی راہیں نکالنی ہوں گی۔

بعض لوگوں کو سورہ توبہ کی ۲۳و۲۴ جیسی آیات سے غلط فہمی ہوتی ہے۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ آبَاءكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاء إَنِ اسْتَحَبُّواْ الْكُفْرَ عَلَى الإِيمَانِ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ. قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُواْ حَتَّى يَأْتِيَ اللّهُ بِأَمْرِهِ وَاللّهُ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ."

(اے اہل ایمان اپنے آباء و اجداد اور بھائی بندوں کو ولی نہ بناؤ، اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیتے ہوں۔ تمہارے جو لوگ ان کو ولی بنائیں گے وہی ظالم ہیں۔ اے نبی کہہ دو اگر تمہارے آباء، اولاد، بھائی بیویاں، خاندان، تمہارے کمائے ہوئے مال اور تجارت جس کی کساد بازاری کا تمھیں ڈر ہے اور تمھارے وہ گھر جو تمہیں پسند ہیں، یہ سب چیزیں اگر تمہیں اللہ و رسول اور اللہ کی راہ میں جہاد سے محبوب تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے۔ اللہ ظالم لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔)

اسی طرح سے سورہ ممتحنہ کی پہلی آیت سے بھی لوگ خلط مبحث کا شکار ہو جاتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاء تُلْقُونَ...... (ممتحنہ:۱)

(اے اہلِ ایمان! میرے اور اپنے دشمنوں کو ولی نہ بناؤ، تم ان سے دوستی بڑھانے میں ہو...... جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ راہِ راست سے بھٹک گئے۔)

حالانکہ اس طرح کی آیات کا موقع ومحل دوسرا ہے، یہ اس زمانے کی ہدایات ہیں جب دارالاسلام اور دارالکفر میں باقاعدہ مسلح جنگ ہورہی تھی۔ عام حالات کے لیے یہ حکم نہیں ہے۔ عام حالات میں تمام انسانوں سے انسانی بنیادوں پر اچھے روابط، محبت و خیرخواہی، خدمت، ایک دوسرے کے کام آنا، اسلام کے پسندیدہ اوصاف ہیں۔خواہ وہ غیر الٰہی نظام کے تحت رہتے ہوں یا الٰہی نظام کے تحت۔

مکہ میں مسلمانوں سے کہا گیا تھا کفوا ایدیکم (نساء:۷۷) اگر ظلم کا جواب دینے کی اجازت دی گئی تو بس برابر سرابر کا بدلہ لینے کی گنجائش رکھی گئی اور اس صورت میں بھی صبر اور عفو ودرگزر کی پالیسی کو بہتر بتایا گیا اور اسی پر ابھارا گیا۔ کہا گیا کہ ان کی بدسلوکیوں کا جواب اپنے حسن سلوک سے دو، دیکھو وہ تمہارے دوست ہو جائیں گے، ہجرت کے قریب مسلمانوں کی اتنی تعداد ہوگئی تھی کہ دو دو ہاتھ کر سکتے تھے لیکن اس کا موقع آنے نہیں دیا گیا۔اس کے اندر بھی بڑی مصلحتیں کارفرما ہیں۔

قرآن ایک اصول دیتا ہے، تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ ہر جگہ اور ہر طرح کے معاشرہ میں ہم کو ایسے افراد تلاش کرنے چاہئیں جن سے ان اصولوں کی بنیاد پر کوئی پلیٹ فارم بن سکے جس میں مختلف طبقات کے لوگ شریک ہوں اور سب مل کر بر وتقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے دست و بازو بنیں اور اثم وعدوان میں یہ معاونت نہ ہو۔ حلف الفضول اس کی بہترین مثال ہے۔

فحشاء، منکر اور بغی سے روکنا اور عدل واحسان اور قرابت مندوں کے حقوق کی ادائیگی ہماری ذمہ داری ہے۔ اس مقصد کے لیے اگر ہم قوت کے مراکز اور قانون سازی کے اداروں میں پہنچ کر اثر انداز ہو سکتے ہوں تو ایسا کرنا ہمارے منصب کا تقاضا ہے۔ کشتی کی مثال نبیؐ نے دی ہے، کشتی کی دو منزلیں ہیں نچلی منزل والے اگر پیندے میں سوراخ

کررہے ہیں اور بالائی منزل والے خاموش رہیں تو دونوں منزل کے لوگوں کو ڈوبنے سے کوئی چیز بچانہیں سکے گی۔

آپ تصور کیجئے ایک ایسے جہاز کا جس پر کروڑوں لوگ سوار ہیں اور ان میں سے صرف چندلاکھ حاکمیتِ الٰہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ بقیہ لوگ مختلف گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ غیر معمولی جہاز بحرالکاہل میں چلا جارہا ہے، اس میں کچھ لوگ جہاز کو غرقاب کرنے کی دانستہ یا غیردانستہ کوشش کررہے ہیں۔ اس جہاز کے اندر طاقت وقوت اور جہاز کے سلسلہ میں قانون سازی کا ایک ادارہ ہے لیکن یہ سب لوگ حاکمیت الٰہ کے قائل نہیں، دوسری جانب صورت حال ایسی ہے کہ اگر ہم وہاں پہنچ جاتے ہیں تو ممکن ہے کہ اس ادارہ کو متوجہ کرسکیں اور ایسا پلان تیارکروانے میں کامیاب ہوجائیں کہ جہاز کو نقصان پہنچانے والوں کا ہاتھ پکڑا جاسکے۔ بصورتِ دیگر اس کا قوی اندیشہ ہے کہ جہاز ڈوب جائے گا ایسے میں ہماری کیا ذمہ داری بنتی ہے؟ کیا جہاز کو ڈوب جانے دیں اور خود بھی ڈوب جائیں یا اضطرار ہی سمجھ کر اس ادارے میں داخل ہوں جہاں پہنچ کر ڈوبتے جہاز کو بچانے کی کوشش کریں؟ ہمارے لیے صحیح لائحہ عمل کیا ہوگا؟ اس مثال پر اپنے سماج سے لدے پھندے جہاز کو جس کا نام ہندوستان ہے جو بحرظلمات میں تیر رہا ہے قیاس کیا جاسکتا ہے اور اپنی ذمہ داریاں سمجھی جاسکتی ہیں۔

ایک شبہ کیا جاسکتا ہے کہ پارلیامنٹ اور اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینے سے اس کے سیکولر جمہوری نظام کو برحق ماننا لازم نہیں آتا اور آتا ہے تو کیا یہ ہمارے عقیدہ سے ٹکراتا نہیں؟ اس کے جواب میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے ڈاکٹر عبدالحق انصاریؒ کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جو ان کی اس تقریر سے ماخوذ ہے جو انھوں نے کل ہند اجتماع ارکان منعقدہ نومبر ۱۹۹۷ء حیدرآباد میں کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

"میں عرض کروں گا کہ اگر ہم اس نظام کے سیکولر کردار اور اس کے حاکمیتِ جمہور کے نظریے پر اپنی اصولی تنقید کرتے رہے ہیں تو اس نظام کو چلانے کی غرض سے نہیں بلکہ صرف اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کی حفاظت اور انھیں غیر معمولی

نقصانات سے بچانے کے لیے، الیکشن میں حصہ لیں یا الیکشن کے عمل کو متاثر کرنے کی کوشش کریں تو اس کی وجہ سے اس ملک کے سیکولر جمہوری نظام کو جائز و برحق تسلیم کرنا لازم نہیں آئے گا۔"

"ہم جب اس ملک میں رہ رہے ہیں، اس کے دستور کی پابندی کرتے ہیں، اس کے قوانین عامہ کا احترام کرتے ہیں، حکومت کے عائد کردہ ٹیکسیز (taxes) ادا کرتے ہیں، امن و امان کے ضابطوں کی پابندی کرتے ہیں اور ایسا کرنا اپنے اوپر شرعاً ضروری سمجھتے ہیں تاکہ نقضِ امن نہ ہو اور فساد فی الارض پیدا نہ ہو جس سے قرآن نے منع فرمایا ہے۔ جب ان سارے ضابطوں کی پابندی سے جمہوری نظام کا جائز و برحق ہونا لازم نہیں آتا تو اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت، نہ کہ اس نظام کو چلانے کی غرض سے الیکشن میں حصہ لینے کی وجہ سے اس نظام کو جائز اور برحق تسلیم کرنا کیسے لازم ہو جائے گا......"

"ایک اسلامی حکومت اگر کسی غیر اسلامی حکومت سے معاہدہ کرتی ہے تو اس کو صرف ایک حکومت تسلیم کرتی ہے، برحق تسلیم نہیں کرتی، اسلامی حکومت کا ایک شہری اگر ویزا لے کر مستامن کی حیثیت سے کسی غیر اسلامی ملک میں جاتا ہے تو اس سے حکومت کا حکومت ہونا ثابت ہوتا ہے، برحق ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اگر رسول ﷺ نے اپنے اصحابؓ کو حبشہ ہجرت کرنے کا مشورہ دیا تھا اور صحابہؓ نے نجاشی کی حکومت میں پناہ لی تھی تو اس سے حکومت کو صرف حکومت تسلیم کرنا لازم آیا، نہ کہ جائز اور برحق ماننا۔ اسی طرح اگر حضور ﷺ نے قریشِ مکہ سے حدیبیہ میں صلح کی تو اس سے ان کے قبائلی نظام کو ایک نظام تسلیم کرنا لازم ہوا نہ کہ اس کا جائز و برحق ہونا۔ آپ نے طائف کے قبائلی نظام کی پناہ چاہی تو اس کے نظام کا برحق ماننا ثابت نہیں ہوا، صرف اس کا ایک نظام ہونا ثابت ہوا......"

درحقیقت اس وقت ملک کے سامنے دو نظاموں میں سے ایک کو اختیار کرنے کا مسئلہ ہے۔ ایک طرف جمہوری نظام ہے جس کی کچھ قدریں ہیں، فکر و خیال کی آزادی،

عقیدہ و مذہب کی آزادی، بنیادی حقوق کا تحفظ، قانون کے سامنے سب کی یکساں حیثیت، ہر ایک کے لیے ترقی کے یکساں مواقع، اسی طرح جمہوریت میں عوام کو اپنے منتخب نمائندوں کا احتساب کرنے، حکومت کی کارکردگی کا جائزہ لینے اور ایک وقت کے بعد ان کو معزول کرنے کا حق بھی حاصل رہتا ہے، جمہوریت میں ''حکومت عوام کے منتخب نمائندوں کی ہوتی ہے، انہیں نمائندوں کو حکومت بنانے اور چلانے کا حق ہوتا ہے، نہ کہ کسی ایک فرد، طبقہ، خاندان یا گروہ کو''

دوسری جانب ایک فسطائی نظام ہے ''جو صرف ایک تہذیب کا قائل ہے، جس میں صرف ایک مذہب، ایک فرقہ اور ایک زبان کو دوسرے مذاہب، فرقوں اور زبانوں پر ترجیح حاصل ہوگی...... جو ہندوستانی کلچر کے نام پر ہندو مذہب اور ہندو فرقہ پرستی کو دسرے مذاہب اور فرقوں پر غالب کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے افہام وتفہیم پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ زور وقوت بھی استعمال کرنا جائز سمجھتا ہے۔'' (تقریر: ڈاکٹر عبدالحق انصاریؒ، سابق امیر جماعت اسلامی، ہند)

قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کو ان کی مشرک قوم کا بھائی کہا گیا ہے، وإلى عاد أخاهم هودا، وإلى ثمود أخاهم صالحاً إذ قال لهم أخوهم لوط وغیرہ اسی طرح انبیاء اپنی مشرک قوموں کو یا قوم، یاقوم سے بار بار خطاب کرتے ہیں اور قرآن کہتا ہے وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہم بھی ہندوستانی قوم کے ایک فرد ہیں اور ہمیں اس حیثیت سے اس ملک کو اور اس کے باشندوں کو دیکھنا اور سمجھنا چاہئے اور اس کے مسائل میں دلچسپی لینی چاہئے، اس کی تعمیر وترقی اور خیر وفلاح کے لیے فکرمند ہونا چاہئے۔ یہ واضح رہے کہ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک امت ہیں جس میں ساری دنیا کے مسلمان شامل ہیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ایک ہندوستانی قوم ہیں۔

اس تناظر میں اگر کوئی مندرجہ بالا شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے اصلی ہدف کو حاصل کرنے کی غرض سے جمہوری نظام کی تائید کرنا، انتخاب میں حصہ لینا اور مجالس

قانون ساز میں جاتا ہے تو یہ عقیدہ سے قطعاً ٹکرانے والی بات نہیں ہے، اس لیے کہ موجودہ صورت حال میں عملاً ان دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا ہماری مجبوری ہے۔

یہ تو اصولی بات تھی، جہاں تک ان حالات میں ہماری حکمت عملی کا سوال ہے کہ کیا ہونی چاہیے، اس وقت ہمارے لیے کیا مناسب ہے اور موجودہ حالات میں ہمارے لیے کس حد تک کون سا اقدام ناگزیر ہے، اس پر اس مقالہ میں گفتگو کا موقع نہیں ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ تفسیر نسفی ج ۳، ص ۲۷۷

۲۔ تفسیر مظہری، القاضی محمد ثناء اللہ العثمانی الحنفی، ج ۵، ص ۱۷۳-۱۷۴

۳۔ ابوالفضل شہاب الدین سید محمود آلوسی، تفسیر روح المعانی القرآن العظیم والسبع المثانی، الجزء الثالث عشر، ص ۵

۴۔ شیخ محمد طاہر ابن عاشور، تفسیر التحریر والتنویر، ج ۱۳، ص ۱۰-۱۱

۵۔ محمد احمد شوکانی، فتح القدیر، ج ۳، ص ۴۴-۴۵

۶۔ محمود بن عمر زمخشری، تفسیر الکشاف، ج ۲، ص ۴۸۲

☆☆☆

تکثیری معاشرے کے مسائل اور اسلام

پرواز رحمانی*

تکثیری معاشروں میں سب سے پہلے ذکر براعظم امریکہ کا آتا ہے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ سنہ ۱۴۹۲ء میں کرسٹوفر کولمبس نامی ایک اسپینی سیاح نے دریافت کیا تھا، مگر اب جدید تحقیق کے مطابق کرۂ ارض پر امریکہ کی موجودگی کا پتہ سب سے پہلے ازبکستانی النسل عرب محقق سیاح ابوریحان البیرونی نے کولمبس سے پانچ سو سال قبل لگایا تھا۔ ایک مغربی اسکالر ایس فیڈرک اسٹار نے اپنے تحقیقی مقالے ''رائٹنگ اِن ہسٹری ٹوڈے'' میں کہا ہے کہ البیرونی نے گیارہویں صدی کے اوائل میں امریکہ دریافت کرلیا تھا۔ (ورلڈ بلیٹن، ۴؍جنوری ۲۰۱۴ء) لیکن اس کی اِس دریافت کوشہرت نہیں مل سکی۔

براعظم امریکہ کا شمالی حصہ پونے دوسو سال تاجِ برطانیہ کے زیرنگیں رہا۔ پھر ۴؍جولائی ۱۷۷۶ء کو برطانیہ کے تسلط سے آزادی کے بعد ایک ایسی آزاد اور خود مختار مملکت کے طور پر اس کی صورت گری ہوئی جہاں دنیا کے مختلف حصوں اور خطوں سے انسان آ کر بس گئے تھے یہاں تک کہ وہ مختلف قوموں اور نسلوں کا ملک بن گیا۔ اسے تارکین اوطان کا ملک کہا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت آج بھی برقرار ہے۔ ہرچند کہ ان اقوام کی اکثریت عیسائی عقیدے کی حامل ہے۔ ان میں اکثریت پروٹیسٹینٹس فرقے کی ہے۔ کیتھولک دوسرے نمبر پر ہیں۔ آرتھوڈوکس اور دیگر عقیدوں کے عیسائی گروپس بھی موجود ہیں لیکن اپنے رہن سہن، عادات واطوار اور سیاسی وسماجی افکار ونظریات کے لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی لیے امریکہ کی تمام پچاس ریاستوں میں سے

---

* سینئر صحافی و ایڈیٹر سہ روزہ دعوت، نئی دہلی

ہر ریاست کا اپنا آئین اور نظامِ قانون ہے۔ مرکز کی حیثیت وفاق کی ہے۔

امریکہ کی مختلف مذہبی، سماجی اور علاقائی اکائیوں کے درمیان کسی قسم کی اندرونی کشمکش یا کشیدگی کا ماحول نہیں پایا جاتا۔ یہ اس لیے کہ بحیثیت مجموعی مذہبی ہونے کے باوجود یہ اکائیاں مادہ پرستانہ طرزِ حیات کی عادی ہیں۔ مادی خوش حالی ان کا مطمحِ نظر ہے۔ اسی لیے عافیت پسند ہیں۔ ان کے درمیان یہی چیز قدرِ مشترک ہے۔ امریکی قوم یا اقوام اپنی اندرونی سوسائٹی میں تو بہت با اخلاق، دیانت و امانت دار ہے، اس کے افراد ایک دوسرے کے لیے خیر سگالی کے مثالی جذبات رکھتے ہیں۔ پڑوسی اپنی طرح دوسروں کے آرام کا خیال رکھتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ ان کی زبان یا عمل سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ دروغ گوئی اور فریب دہی بہت معیوب ہے۔ لیکن ان کی یہ اخلاقیات ان کے عافیت پسندانہ مادی نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے۔ امریکہ سے باہر کی دنیا سے انھیں کوئی غرض نہیں۔ ان کے وفاقی حکمراں دنیا میں کیا کر رہے ہیں، زمین پر کہاں کہاں فتنہ وفساد برپا کر رہے ہیں، کون کون سے ملک اور کون کون سی قوموں پر ظلم ڈھا رہے ہیں، کس کس کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں، قدرتی وسائل سے مالا مال ملکوں کو کس طرح لوٹ رہے ہیں۔ امریکیوں کی مادی خوش حالی میں دنیا بھر سے ہتھیائی ہوئی دولت کا حصہ کتنا ہے، اس سے عام امریکیوں کو کوئی مطلب نہیں، کیوں کہ امریکی عوام اگر ان چیزوں سے بھی مطلب رکھیں گے تو ان کے امن و آرام میں خلل واقع ہوگا، وہ نہیں چاہتے کہ ایسا ہو۔ غرض امریکی معاشرہ ایک نمایاں تکثیری معاشرہ ہونے کے باوجود اندرونی اور باہمی مسائل کا شکار اس لیے نہیں ہے کہ زندگی کے مادی نقطۂ نظر، مالی خوش حالی اور الکحل نے اسے مکمل طور سے عافیت پسند بنا دیا ہے۔ مسیحی عقائد کے حامل افراد اور خاندانوں کی مذہبیت اب محض علامتی یعنی سنڈے سروس اور آمدنی کا ایک متعین حصہ مشنریوں کو دینے تک محدود ہوکر رہ گئی ہے۔

امریکہ کے علاوہ برطانیہ، آسٹریلیا اور کچھ چھوٹے بڑے ممالک کسی نہ کسی درجے میں تکثیری معاشرے کہلاتے ہیں۔ برطانیہ چونکہ ماضی قریب میں نصف دنیا کا حاکم رہا ہے، اس لیے وہاں تارکینِ وطن کی آمد کا سلسلہ بہت پہلے سے جاری تھا۔ آج

بھی وہاں بڑی تعداد میں تارکین وطن آباد ہیں جن کا تعلق تاجِ برطانیہ کی سابق کالونیوں سے ہے۔ برطانوی باشندوں کے ساتھ اِن تارکین وطن کے کچھ مسائل ہیں۔ یعنی برطانیہ میں امریکہ کی طرح اندرونی امن وسکون نہیں ہے۔ جن جن ملکوں میں مقامی باشندوں کے ساتھ تارکین وطن آباد ہیں یا جن کے مذہبی عقائد ایک دوسرے سے مختلف ہیں، خواہ ان کی زبان، رہن سہن اور علاقائی قدامت ایک ہی ہو، وہاں کچھ نہ کچھ مسائل ضرور ہیں۔

ہندوستانی معاشرہ

ہندوستانی تکثیری معاشرہ اس مفہوم میں ہے کہ یہاں مختلف مذہبی اکائیوں کے علاوہ خود اکثریتی سماج کے اندر متعدد نسلی، علاقائی اور لسانی اکائیاں موجود ہیں۔ ان میں سے ہر اکائی اپنی علیحدہ شناخت رکھتی ہے اور اس پر اصرار کرتی ہے۔ یہاں کے انسانوں کو ایک طبقے نے پیدائشی لحاظ سے اونچی نچلی ذاتوں میں منقسم کر رکھا ہے اور انھیں ایک مخصوص لفظ (ہندو) کی بنیاد پر متحد رکھنا چاہتا ہے۔ مورخین بتاتے ہیں کہ اس سماجی نظام کی بنیاد، جسے ورن ویوستھا (یا کاسٹ سسٹم) کہا جاتا ہے۔ کئی ہزار سال قبل (۱۵۰۰ تا ۷۰۰ قبل مسیح کے دوران) وسط ایشیا سے آئے ہوئے تارکین وطن نے رکھی تھی۔ آرین نسل کے وہ لوگ خود کو نسلی، علاقائی، تہذیبی اور علمی لحاظ سے برتر اور یہاں کے قدیم اور اصل باشندوں کو حقیر، گنوار اور کمتر سمجھتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ قدیم کتابیں "وید" بھی لائے تھے۔ انھوں نے یہاں کی آبادیوں کو کچھ عقائد دیے، ان کے معبود مقرر کیے اور کچھ علامات دیں۔ پھر انھیں چار بڑی ذاتوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ خود کو سب سے اوپر رکھا۔ باقی آبادیوں کی زندگی کے جملہ امور کی نگرانی اپنے ذمے لی۔ ان کے عقائد کے تحفظ کو یقینی بنایا، پیدائش سے لے کر موت تک ان کے تمام مسائل، شادی بیاہ، رہن سہن کے اصول وضع کیے۔ سماج میں ان کی ذمہ داریاں متعین کر کے ان کے لیے کام مقرر کیے۔ ایک طبقے کو عسکریت کی تعلیم دی اور اس کے ذمے ہتھیار اور اسلحہ کے ذریعے عقیدے اور سماج کی حفاظت کا کام کیا۔ اس طبقے کو چھتری کہا جاتا ہے جو براہمن کے

بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ تیسرے نمبر پر ویشئے برادری ہے جس کے سپرد مالی وسائل اکٹھا کرکے انھیں سماج کے دیگر طبقات میں اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق تقسیم کرنے کا کام ہے۔ سماج کے جملہ مالی وسائل پر عملاً یہی طبقہ قابض ہوتا ہے۔ ورن یوستھا میں چوتھے اور آخری نمبر پر یعنی سب سے نیچے شودر آتے ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے سماج کا سب سے بڑا طبقہ یہی ہے۔ اس کے ذمے اوپر کی تینوں ذاتوں کی خدمت کرنا اور سماجی لحاظ سے خود کو حالتِ بد میں رکھنا ہے۔ پھر ان چاروں ذاتوں کے اندر ذیلی ذاتوں کا طویل سلسلہ ہے۔ ہر ذات میں ضمنی ذاتیں ہیں۔ شودروں سے بھی نیچے کے کچھ طبقات آؤٹ کاسٹ یعنی سماجی نظام سے باہر سمجھتے ہیں۔ انھیں اَن تیج کہا جاتا ہے۔ ان کے سپرد وہ کام ہیں جو سماج میں نہایت نچلے کام سمجھے جاتے ہیں اور انھیں صرف وہی کرتے ہیں۔ ان کی بستیاں بھی عام آبادیوں سے الگ تھلگ ہوتی ہیں۔

یہاں پیدائش کی بنیاد پر جن طبقات کو کمتر قرار دیا گیا ہے، ماضی میں انھیں اچھوت کہا جاتا تھا۔ بعد میں گاندھی جی نے ہریجن کا نام دیا، جدید اصطلاح میں ان طبقات کو دلت کہا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد ان کے لیے ''شیڈول کاسٹس'' اور ''شیڈول ٹرائبس'' کی دستوری اصطلاح وضع کی گئی۔ ماضی میں ان طبقات کے مصلحین نے ذات پات کے سماجی نظام کے خلاف کئی تحریکیں چلائیں، لیکن کوئی مہم کامیاب نہیں ہوئی۔ اس سلسلے کی آخری اور پُر زور تحریک ڈاکٹر بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر نے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں شروع کی تھی جو ۱۹۵۰ء کی دہائی کے اوائل میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اونچ نیچ پر مبنی برہمنی نظام (برہمن سوشل آرڈر) کی بنائی ہوئی اس حالت سے نکلنے اور سماج میں عزت پانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ جس عقیدے کے تحت یہ نظام قائم کیا گیا ہے، اُسی کو ترک کردیا جائے۔ کیوں کہ ورن ویوستھا کے اندر رہتے ہوئے اس حالت سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔ اس سے قبل اپنی تحریک کے آغاز میں ڈاکٹر امبیڈکر نے برطانوی حکومت سے اپنے طبقے کو سیاسی لحاظ سے ہندو دھرم سے علیحدہ کرکے اس کی علیحدہ شناخت تسلیم کرنے اور انتخابات میں ان کے لیے علیحدہ نشان (رنگ) مقرر کرنے کا مطالبہ کیا تھا جسے انگریزی

سرکار نے ۱۹۳۲ء میں 'کمیونل ایوارڈ' کی شکل میں تسلیم کر لیا تھا۔ کمیونل ایوارڈ میں یوں تو سبھی ذاتوں اور آزاد مذہبی فرقوں کے حقوق کے تحفظ کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن اس کی سب سے بڑی زد برہمنی سماجی نظام پر پڑ رہی تھی لہٰذا اس فیصلے کے خلاف گاندھی جی نے جو ورن ویوستھا کی بنیاد پر قائم سماجی نظام کے سب سے پرزور مگر ذہین ترین خاموش وکیل تھے، شدید احتجاج کرتے ہوئے پونے میں مرن برت شروع کر دیا تھا۔ بالآخر ڈاکٹر امبیڈکر اور گاندھی جی کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جسے 'پونا پیکٹ' کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر اپنی علیٰحدہ شناخت پر اصرار سے دستبردار ہو گئے لیکن سماجی مساوات و برابری کے حصول کی ان کی کوششیں جاری رہیں۔ ۱۹۵۰ء کے بعد جب انھوں نے ہندو دھرم اور سماج سے الگ ہونے کی باتیں شروع کر دیں اور ایک مرحلے میں یہ اعلان بھی کر دیا کہ فلاں تاریخ کو وہ اپنے طبقات کے لاکھوں افراد کے ساتھ ہندو عقیدہ ترک کر کے کوئی اور مذہب قبول کر لیں گے تو انھیں منانے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ آخر کار ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر امبیڈکر نے بدھ مت اختیار کرنے کا علان کیا جس سے برہمن سوشل آرڈر کے لیے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا تھا، اس لیے کہ عملی اعتبار سے وہ اسی سماجی نظام کا حصہ ہے۔ دلت طبقات کی سماجی حیثیت میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں آئی۔

آج دلت طبقات کے اندر سماجی مساوات و برابری کی کوئی کوشش نہیں پائی جاتی۔ اِس طبقے کے دانشوروں اور سیاست دانوں نے اب سماجی مساوات کا خیال ترک کر کے ورن آشرم (کاسٹ سسٹم) کے بانیوں کے ساتھ مفاہمت کر لی ہے۔ اب وہ اسی نظام کے اندر رہتے ہوئے اپنے لیے صرف معاشی آسودگی چاہتے ہیں جو انھیں سرکاری ملازمتوں میں ریزرویشن اور کوٹے کی شکل میں پہلے سے حاصل ہے۔ اب انھیں پوری طرح باور کرا دیا گیا ہے کہ سماجی لحاظ سے نچلے درجے میں رہنا کوئی بُری بات نہیں بلکہ باعث سعادت ہے۔ دلت طبقات کو اب ان کی سماجی حیثیت پر فخر کرنا سکھایا جا رہا ہے؛ بزنس اور کاروبار میں جزوی شرکت کی اجازت دے دی گئی ہے۔ ''فیڈریشن آف انڈین کامرس اینڈ انڈسٹری'' (فکّی) کے طرز پر ''دلت فیڈریشن آف انڈین چیمبرس آف

کامرس اینڈ انڈسٹری'' قائم کرائے جارہے ہیں۔ دلت طبقات کے دانشوروں اور سیاست دانوں کی کوششوں کا سب سے بڑا حاصل یہی رہا کہ اب انھیں ایک درجے میں معاشی آسودگی کی اجازت مل گئی۔ ورنہ منوسمرتی اورارتھ شاستر کی بنیادی تعلیمات میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ یہ چیز قدیم سماجی عقیدے کے خلاف ہے۔ گویا دلت طبقات کی اٹھان اور جارحانہ سیاسی تیور دیکھتے ہوئے سماجی نظام کے بانیوں کو بھی اس سلسلے میں مفاہمت کرنی پڑی۔

آر ایس ایس

راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) نام کا یہ سنگٹھن سنہ ۱۹۲۵ء میں انگریزی حکومت کے دور میں ہندو سماج کی خدمت کے لیے قائم کیا گیا تھا لیکن جلد ہی اس نے جارحانہ قوم پرست تنظیم کی شکل اختیار کرلی۔ ہندو سماج کو متحرک کرکے اس کے اندر قوم پرستی کے جذبات پیدا کرنے کی غرض سے سرزمین ہند کو بھارت ماتا قرار دے کر اسے مقدس و معبود بنادیا...... آج اپنی وسعت کے لحاظ سے یہ دنیا کی سب سے بڑی غیر سرکاری تنظیم (این جی او) ہے۔ اس سنگٹھن کا دعویٰ ہے کہ وہ دھارمک نہیں نیشنل کلچرل آرگنائزیشن ہے۔ لیکن اپنے اِس کلچر کی بنیاد اس نے ہندو (برہمنی) عقائد اور روایات پر رکھی ہے۔ یہ سنگٹھن ذات پات اور پیدائشی اونچ نیچ کو نہ ماننے کا دعویٰ بھی کرتا ہے لیکن عملاً وہ برہمن سوشل آرڈر کا، جو کاسٹ سسٹم کی بنیاد پر قائم ہے، سب سے بڑا نگران، پاسدار اور محافظ ہے۔ اس کے دائرے میں اُن انسانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں جو اس سوشل آرڈر سے باہر ہیں خواہ وہ پیدائشی اور نسلی لحاظ سے سرزمین ہند ہی کے باشندے ہوں۔ ہندوستان کو برہمنی عقائد اور روایات کی بنیاد پر ایک نیشنل اسٹیٹ بنانا آر ایس ایس کا اصل ہدف ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے مختلف ناموں سے درجنوں چھوٹے بڑے ادارے اور گروپس قائم کر رکھے ہیں، درجنوں ذیلی تنظیمیں بنا رکھی ہیں جو ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے میں سرگرم ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) اُسی کا سیاسی بازو ہے۔

آریہ سماج

آریہ سماج ویدک سماج ہے جس کی بنیاد برہمنی عقائد کی قدیم کتابوں، چار ویدوں، پر رکھی گئی ہے۔ ویدوں میں اُس وطن پرستی اور نیشنلزم کا تصور نہیں ہے جس کا پرچار راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کرتا ہے۔ راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ سناتن دھرم کی روایات پر قائم ہے۔ جب کہ آریہ سماج صرف ویدوں کی تعلیمات کا پرچار کرتا ہے۔ ویدوں میں مورتی پوجا کا تصور نہیں بلکہ کسی نہ کسی درجے میں توحید کا تصور پایا جاتا ہے۔ آریہ سماجی مورتی پوجا نہیں کرتے۔ ویدوں میں جغرافیائی حدود یا کرۂ ارض کے کسی مخصوص حصے کے تقدس کا تصور بھی نہیں۔ آریہ سماجی اصولی لحاظ سے لفظ 'ہندو' کے بھی قائل نہیں ہیں۔ تاہم عملی اعتبار سے آریہ سماج بھی برہمنوں کے تشکیل کردہ ہندو سماج ہی کا ناقابل علیٰحدگی حصہ ہے۔ یہ لوگ بھی ذات پات، پیدائشی اونچ نیچ اور چھوا چھوت کے قائل ہیں۔ اس سماج سے باہر کی آبادیوں کے لیے ان کے یہاں بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔ سوامی دیانند جی کی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' اس کی معروف تعارفی کتاب ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں شمالی ہند کے خطۂ گاؤ (کاؤبیلٹ) میں مسلمانوں کی شُدھی کی مہم آریہ سماجیوں نے ہی چلائی تھی۔

جین دھرم/سماج

جین سماج شری مہاویر جی کی تعلیمات پر قائم ہے۔ شری مہاویر کا دور اور گوتم بدھ کا زمانہ قریب قریب ایک ہی ہے جو تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ اپنے بنیادی عقائد اور دھارمک شکشاؤں کی وجہ سے یہ بالکل علیٰحدہ اور آزاد دھرم اور سماج ہے جس کا برہمنی عقائد اور روایات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سماج کے پیشوا بھی خود کو علیٰحدہ دھرم اور دھارمک اقلیت سمجھتے ہیں۔ ملک کی کئی ریاستوں میں انھیں مذہبی اقلیت کے طور پر پہلے ہی تسلیم کیا جا چکا تھا اب حال ہی میں مرکزی حکومت نے بھی انھیں مذہبی اقلیت

تسلیم کرلیا ہے۔لیکن عملاً یہ وسیع تر ہندو سماج ہی کا حصہ ہیں، اور برہمنی ورن ویوستھا (براہمن سوشل آرڈر) کے دائرے میں انھوں نے اپنے لیے عملاً تیسرا مقام یعنی ویش قبول کرلیا ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ پوری کمیونٹی بزنس کمیونٹی ہے۔ ملک کے اندر اور باہر اس برادری کے افراد بڑے بڑے کاروبار کرتے ہیں۔نہایت مخیرّ اور سخی برادری ہے۔ ملک بھر میں بڑے بڑے خیراتی ادارے، ہسپتال، اسکول، کالج اور خدمتِ عامہ کے ادارے چلاتی ہے۔

سکھ مت

پنجاب میں پندرہویں صدی کے اواخر اور یا سولہویں صدی کے اوائل میں بابا نانک نے برہمنی دھرم کی مورتی پوجا سے بیزار ہوکر توحید کے تصور کے تحت یہ مت قائم کیا تھا۔ان کی تعلیمات میں عوام الناس کے لیے بڑی کشش تھی۔لوگ جوق در جوق ان کے ساتھ ہورہے تھے۔ وہ دور مسلم بادشاہوں اور پنجاب کے راجاؤں کی سیاسی وعسکری کشمکش کا دور تھا۔ چونکہ بابا نانک کی تعلیمات دینِ توحید، اسلام سے قریب تھیں، بہت سے اہل علم سمجھتے تھے کہ بابا جی نے اسلامی تعلیمات سے متاثر ہوکر سکھ پنت کی بنیاد رکھی ہے۔ بہت سے لوگوں نے اِس حقیقت کو منفی انداز میں پیش کرنا شروع کردیا۔اس لیے بابا نانک جی کی دعوت محدود ہوکر رہ گئی۔اس کے بعد سکھ مت کے ماننے والوں میں کئی حکمراں گزرے۔مسلم بادشاہوں کے ساتھ ان کی کشمکش پہلے کی طرح جاری رہی۔جنگیں بھی ہوئیں۔ یہ خالصتاً سیاست اور ملک گیری کی کشمکش تھی لیکن برہمنوں کے ایک گروہ نے اسے اسلام اور سکھ مت کی کشمکش بنا کر پیش کیا جس کے اثرات آج تک باقی ہیں۔

(سکھ مت کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ کچھ پنڈتوں کے رابطے اور اثر کی وجہ سے بابا نانک نے اسلامی توحید کے پُرکشش عقیدے کو پھیلنے سے روکنے کے لیے توحید کا متبادل تصور ''واہے گرو'' پیش کیا تھا۔)

سکھ مت کے دسویں گرو گوبند سنگھ (۱۶۶۶-۱۷۰۸ء) کے دور میں سکھ مت

بڑی حد تک برہمنی دھرم کے دائرہ اثر میں چلا گیا اور توحید کا تصور عملاً ختم ہو گیا۔ یہ بھی کہا جانے لگا کہ خالصہ پنت ہندو دھرم کی سُرکشا کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اب اس مت کے پیروکار عملی لحاظ سے اکثریتی سماج کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم سکھ مت کی بنیادی کتاب ''گروگرنتھ صاحب'' میں جو بابا نانک اور دوسرے مہاپرشوں کی تعلیمات پر مشتمل ہے، بابا جی کے عقیدے اور توحید کے اشارے آج بھی ملتے ہیں۔ لیکن آج کے سکھ مت کے پیروکاروں کی عملی زندگی میں وہ دکھائی نہیں دیتے۔ ۱۹۸۴ء کے سکھ مخالف فسادات کے بعد سکھ مت اور سکھ قوم اس ملک کی رولنگ کلاس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہی، اگرچہ دستوری لحاظ سے انھیں مذہبی اقلیت قرار دیا گیا ہے۔

عیسائی برادری

ملک کی عیسائی برادری، جس کی آمد اور جس کے عقیدے کی تبلیغ یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد کے ساتھ شروع ہوئی تھی، ایک علیحدہ مذہبی اقلیت کے طور پر اپنی شناخت رکھتی ہے۔ رولنگ کلاس کے لیے وہ بھی اب تک کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھی۔ لیکن اب گلوبلائزیشن کے دور اور اس ملک پر بڑھتے مغربی (امریکی) اثرات، مغربی ثقافت اور طور طریقوں کی آمد نیز عیسائی مشنری اداروں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ خود کو Assert کر رہی ہے۔

آدی باسی/قبائلی آبادیاں

آدی واسی آبادیوں والے علاقوں (شمال مشرق اور وسطی ہند وغیرہ) اپنی رسوم و روایات، رہن سہن اور عقائد کی وجہ سے ملک کی مین اسٹریم آبادیون سے بالکل الگ ہیں۔ اِن آبادیوں کے کچھ حصے عیسائی مذہب کی قبولیت کے باوجود اپنی قدیم رسوم پر قائم ہیں۔ باقی بڑا حصہ کسی بڑے مذہب سے وابستہ نہیں۔ ان کی دنیا الگ ہے، لیکن ملک کی رولنگ کلاس اپنی سماجی آبادی کا تناسب بڑھانے کی خاطر اِن طبقات کو بھی ہندو دھرم کا

حصہ قرار دیتی ہے۔ ویسے ان آبادیوں کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ ہندوستان کی حکومت، سیاسی پارٹیاں اور یہاں کے لوگ ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں اور انھیں کیا سمجھتے ہیں۔

علاقائی شناختیں

اِس ملک میں علاقائی جذبات انتہائی شدید ہیں۔ یہ علاقائی اکائیاں، لسانی، تہذیبی اور روایاتی بنیاد پر قائم ہیں جنھیں ملک گیر مسائل (نیشنل اِشیوز) سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ۱۹۵۲ء میں لسانی بنیاد پر پہلی ریاست آندھرا پردیش کی تشکیل اور اس کے بعد ۱۹۵۶ء کے قانون کے تحت اِنھی بنیادوں پر دیگر ریاستوں کی تشکیل نو کے بعد علاقائی جذبات مزید شدید ہو گئے۔ بعد میں علاقائی سیاسی پارٹیوں کے قیام نے اِن جذبات کو شدید سے شدید تر بنا دیا، یہ علاقائی سیاست بہت سے لیڈروں کے لیے اپنے ذاتی، خاندانی اور گروہی مفادات کے فروغ کا ذریعہ بن گئی۔ ریاستوں، ریاستوں کے درمیان ایک دوسرے کے کلچر اور زبان کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ کئی ریاستوں کے درمیان سرحدی تنازعات اب بھی موجود ہیں۔ کرناٹک اور مہاراشٹر کے مابین شہر بیلگام کا تنازع حل طلب ہے۔ تمل ناڈو اور کرناٹک کے بیچ دریائے کاویری کی تقسیم کا معاملہ ابھی تک نہیں سلجھا۔ علاقائی عدم رواداری کی نوبت اب تو یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ایک علاقے میں ایک ہی علاقائی زبان کے بولنے والے کچھ دیگر اشیوز پر ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو گئے، اس کی زندہ مثال آندھرا پردیش کی صورت حال ہے جہاں پوری ریاست کی ایک ہی زبان (تیلگو) ہے لیکن وہاں تلنگانہ اور باقی آندھرا کے عوام کے اندر علاقائی جذبات شدید سے شدید تر ہوتے جا رہے ہیں۔

زبان، کلچر اور علاقائی رسوم و رواج کے علاوہ مذہبی عقائد، دھارمک آستھاؤں اور پرم پراؤں میں کئی علاقائی اکائیاں اپنی علیحدہ شناخت رکھتی ہیں۔ اِن اکائیوں کو ہندتو، راشٹر واد اور بھارت ماتا جیسے نعرے ایک حد تک ہی اپیل کرتے ہیں، لیکن جہاں

مقامی آستھاؤں اور پرمپراؤں کا سوال آتا ہے تو یہ اپنی علیحدہ شناخت پر اصرار کرتی ہیں۔گزشتہ این ڈی اے کی حکومت نے تمام تعلیمی اداروں میں سرسوتی وندنا کو لازمی قرار دینے کی کوشش کی تھی، اس کی سب سے شدید مخالفت آندھرا پردیش کی تلگو دیشم سرکار کی جانب سے ہوئی تھی، جب پارلیمنٹ میں اس کی خاتون ممبر نے اسے اپنے عقیدے کے خلاف بتا کر اس کی مخالفت کی تھی۔

علاقائی اور نسلی جذبات کی شدت کی تازہ مثال راجیو گاندھی کے قاتلوں کا معاملہ ہے۔سپریم کورٹ نے انھیں موت کی سزا سنادی تھی مگر گیارہ سال بعد ان کی رحم کی اپیل پر سزائے موت کو سزائے عمر قید میں بدل دیا۔لیکن تمل ناڈو کی اناڈی ایم کے سرکار نے ساتوں مجرموں کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں تمل ناڈو کی تمام چھوٹی بڑی سیاسی پارٹیوں نے ریاستی سرکار کی حمایت کی جب کہ باقی ملک میں ہر پارٹی اس فیصلے پر تنقید کر رہی ہے۔

گلوبلائزیشن کے اثرات

گلوبلائزیشن اور سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے جڑ پکڑنے سے اس ملک کی اخلاقی قدروں میں بھی زبردست تبدیلی آرہی ہے۔ہم جنس پرستی اور بغیر شادی بیاہ کے عورتوں مردوں کے ساتھ رہنے، نوعمر لڑکوں لڑکیوں کے درمیان بغیر شادی کے آزادانہ جنسی تعلقات، ویلنٹائن ڈے جیسی اخلاقی برائیاں خود حکومت اور عدلیہ کی سرپرستی میں فروغ پا رہی ہیں۔عدالتیں اعلیٰ سطح پر ایسے فیصلے سنا رہی ہیں، بیس سال پہلے جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔یہ اخلاقی بگاڑ اعلیٰ سطح سے آرہا ہے اور اسے سماجی مقبولیت اور قانونی جواز بخشا جارہا ہے۔کہنے کو تو یہاں آر ایس ایس موجود ہے جو خود کو کلچرل آرگنائزیشن کہتی ہے، راشٹرواد، پراچین سنسکرتی اور بھارتی سبھیتا کی بات کرتی ہے،لیکن گلوبلائزیشن اور مغربی طرزِ معیشت کے ساتھ آنے والے آبرو باختہ مغربی کلچر سے اسے کوئی پریشانی نہیں ہے۔بلکہ اس کلچر کا سب سے زیادہ دلدادہ اِسی تنظیم کا حامی خوش حال طبقہ ہے۔

اشتراکی تحریک

متحدہ ہندوستان میں کمیونسٹ تحریک کا آغاز ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ہوا تھا، آزادی کے بعد بھی اس کا خاصا زور رہا۔ یہ تحریک معاشی مُساوات کی بنیاد پر سماج کی تشکیل چاہتی تھی۔ سرمایہ دارانہ طرزِ معیشت کے کلچر کی طرح اشتراکی معاشی نظام کا بھی اپنا سماجی کلچر ہوتا ہے جس میں روایتی اخلاقی قدروں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، خدا اور مذہب کے تصورات سوسائٹی کے لیے تباہ کن سمجھے جاتے ہیں۔ گوکہ اس لحاظ سے اشتراکی تحریک نے اِس برصغیر میں مذہب اور روایتی اخلاقی قدروں کوانگیز کرنے کی گنجائش پیدا کی تھی لیکن سوائے مغربی بنگال، کیرالا اور شمال مشرق کے ایک حصے کے، وہ کہیں اور جم نہیں سکی۔ ان علاقوں میں بھی وہ کوئی بڑی سماجی تبدیلی نہیں لاسکی۔ اور اب تو گلوبلائزیشن اور سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت وثقافت کے سامنے کمزور پڑ کر بے اثر ہوچکی ہے۔

سوسائٹی کی رولنگ کلاس

اس طرح ہمارا یہ ملک کرۂ ارض پر تکثیری معاشرے کا ایک بڑا نمونہ ہے۔ یہاں متعدد قسم کے مسائل ہیں، ہر اکائی کے اپنے مسائل ہیں اور اکثر حالات میں یہ مسائل اور مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، جس کی وجہ سے ملک میں کہیں نہ کہیں ہمہ وقت بے چینی رہتی ہے، بسا اوقات یہ بے چینی خطرناک رخ اختیار کرلیتی ہے۔ اس مختلف النوع اور باہم متصادم سوسائٹی کو یہاں کی رولنگ کلاس مذہبی اقلیتوں کے خلاف نت نئے مسائل اٹھا کر خصوصاً اسلام اور مسلمانوں کا خوف دلا کر متحد رکھنا چاہتی ہے۔ اس ملک کے تمام باشندوں کو کچھ مخصوص عقائد اور ایک خاص تہذیب کے دائرے میں لانے کے لیے رولنگ کلاس کا ایک دیرینہ منصوبہ ہے۔

رولنگ کلاس سے مراد شہریوں کا وہ مختصر سا طبقہ جس کی پرورش و پرداخت کاسٹ سسٹم کے اندر ''اعلیٰ ذاتوں'' کے افراد کے طور پر ہوئی ہے۔ یہ طبقہ گزشتہ ۸۰ سال

سے زیادہ کے عرصے میں شِشومندروں سے لے کر اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم اور نجی تنظیموں اور اداروں میں تربیت پا رہا ہے۔ پھر اسی طبقے کے افراد ملک کی عام اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں جاتے ہیں، مقامی انتظامیہ سے لے کر مرکزی انتظامیہ، پولس، عدلیہ وغیرہ ہر جگہ حاوی ہوتے ہیں، اور عملاً ملک کا نظم ونسق چلاتے ہیں؛ مرکزی سیاسی اور سرکاری پالیسیوں کو یہی طبقہ اپنے ذہن وفکر کے لحاظ سے نافذ کرتا ہے یا عملی مرحلے میں انھیں کامیاب یا ناکام بناتا ہے۔ آج کی اصطلاح میں اسے ڈیپ اسٹیٹ (Deep State) کہتے ہیں۔ پھر اِس ڈیپ اسٹیٹ کو اور سیاسی و سرکاری ذہنوں کو کنٹرول کرنے والی ایک غیر مرئی قوت ہے، جو ہر جگہ موجود ہے، نظر کہیں نہیں آتی۔ رولنگ کلاس یعنی ملک کا نظام کنٹرول کرنے والی قوت دراصل یہی ہے۔

سطح پر یہ دکھائی دیتا ہے یا دکھایا جاتا ہے کہ یہاں راشٹر واد، دھرم اور کلچر کے نام پر کی جانے والی مہم جوئی کا ہدف صرف مذہبی اقلیتیں ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ مہم جوئی تمام علاقائی، لسانی، ثقافتی اکائیوں، سماج کے پسماندہ اور کچلے ہوئے طبقوں، انسانی و شہری حقوق کے گروپوں اور نچلی جاتیوں کے مسائل کو دبانے کے لیے ہوتی ہے۔ یہ کشمکش جہاں نام نہاد راشٹر وادی طاقتوں اور مذہبی اکائیوں کے درمیان ہمہ وقت دکھائی دیتی ہے وہیں متذکرہ بالا اکائیوں اور گروپوں کی بے چینی اُس وقت سامنے آتی ہے جب اُن میں سے کسی کے مفاد پر اس کی زد براہ راست پڑتی ہے۔

اسلام کا کردار

غرض یہ کہ ہمارا ملک واضح طور پر ایک تکثیری معاشرہ ہے اور اُسی لحاظ سے یہاں مختلف نوعیت کے متعدد مسائل موجود ہیں۔ ایک گروہ (ہندوستانی سماج کا حکمراں طبقہ) ان مسائل کو مختلف طریقوں سے دبا کر مصنوعی طریقوں سے پورے معاشرے کو اپنے مفاد کے لیے متحد کرنا چاہتا ہے، کمزور بنیادوں پر ملک میں یگانگت اور یک جہتی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اسے کامیابی نہیں ملتی؛ ملتی بھی ہے تو وقتی ثابت ہوتی ہے۔

لٰہذا یہاں ایک ایسے نظامِ حیات کے تعارف کی ضرورت ہے جو اعلیٰ انسانی اخلاقی اور روحانی بنیادوں پر قائم ہو اور تمام باشندگانِ ملک کے مسائل کو حق و انصاف کی بنیاد پر حل کر کے ان کے درمیان باہم حقیقی اتحاد و یک جہتی پیدا کرسکتا ہو۔ گروہوں کی مقامی، علاقائی اور لسانی شناختیں ختم کیے بغیر انھیں باہمی خیر سگالی کی لڑی میں پرو سکتا ہو۔ دین اسلام یہ ضرورت بخوبی پوری کرسکتا ہے۔ کیوں کہ یہ دین تمام انسانوں کے رب کا مقرر کردہ دین ہے اور انسانی حیات کے جملہ مسائل سے بحث کرتا ہے۔ لٰہذا انسانوں کے اس دین کو انسانوں کے سامنے پیش کرنا جہاں اہل ایمان کا فرض منصبی ہے وہیں اس ملک اور یہاں کے تمام باشندوں کی ضرورت بھی ہے۔

ملک کے سیاسی حالات اور سماجی ماحول کو دیکھتے ہوئے بظاہر یہ کام مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے اور اس رائے کے تین بڑے اسباب ہیں:

(۱) لاکھ اخلاقی و سماجی بگاڑ کے باوجود اس ملک کے باشندوں میں خیر موجود ہے۔ خدمتِ خلق کے لاکھوں چھوٹے بڑے ادارے، دیہاتی زندگی میں ایک دوسرے سے تعاون و خیر سگالی کی روایات، اخلاقی برائیوں اور بے انصافی کے خلاف کہیں نہ کہیں آوازوں کا اٹھنا وغیرہ، یہ ایسی خوبیاں اس معاشرے میں ہیں جو بنیادی طور پر اس کے خیر پسند ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ ہندوستانی سوسائٹی بحیثیت مجموعی خیر پسند و بردبار واقع ہوئی ہے۔ اس کی اصل (فطرت) میں تحمل و رواداری کی صفات موجود ہیں۔

(۲) شرک کی مختلف و متعدد اقسام ہیں اور یہاں اس کی بدترین قسم پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہاں کے باشندوں کے لیے توحید میں زبردست کشش ہے۔ اہل علم و فہم میں تلاش حق کی جستجو پائی جاتی ہے؛ جس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے، جب دعوتی پروگراموں میں برادران وطن شریک ہوتے ہیں، وہ گفتگو توجہ کے ساتھ سنتے ہیں، توحیدی لٹریچر احترام کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ مجالس میں خلل ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو۔ تعلیم یافتہ افراد کے اندر سب سے زیادہ خواہش قرآن کے مطالعے کی دیکھی جاتی ہے۔ اس کے بعد سیرت کی کتب پر توجہ ہوتی ہے۔ اس کے مظاہر

ملک بھر میں منعقد ہونے والے بُک فیئرس میں اسلامی کتابوں کے اسٹالس پر دیکھے جاتے ہیں۔ برادرانِ وطن قرآن کا احترام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دعوتی کارکن دعوتی پروگراموں کی دعوت دینے ملک بھر میں جہاں جہاں جاتے ہیں بالعموم ان کا خیر مقدم کیا جاتا ہے، بات توجہ سے سنی جاتی ہے۔ ناخوشگوار واقعات بہت کم پیش آتے ہیں۔ گویا بعض حلقوں کی جانب سے اسلام مخالف کوششوں کے باوجود یہاں اسلام کے پیغامِ رحمت کی بنیاد پر ملک کے تمام باشندوں کو باہم جوڑنے، ان کے اندر ایک دوسرے کے لیے خیر خواہی کے حقیقی جذبات پیدا کرنے اور ہر قسم کی معاشرتی عصبیت ختم کر کے اس عظیم ملک کو صحیح معنی میں حقیقی ترقی وخوش حالی کی راہ پر گامزن کرنے کے بہترین مواقع موجود ہیں۔

(۳) اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہاں کے کچھ حلقوں میں جو ذہن پایا جاتا ہے، وہ اس ملک کی اصل پہچان نہیں ہے جس طرح بیماری انسانی صحت کی اصل نہیں ہے، بعد میں پیدا ہوتی ہے یا پیدا کردی جاتی ہے اسی طرح وہ ذہن بھی بنایا گیا ہے اور بنانے کے لیے دجل وفریب، دروغ، بہتان اور اسی قبیل کے منفی ذرائع استعمال کیے گئے ہیں۔ اس لیے اُس ذہن میں استحکام اور پائیداری نہیں ہے، وہ باطل ذہن ہے اور حق کے سامنے آتے ہی بہ آسانی مٹ جاتا ہے۔ جو ذہن منفی طریقوں سے بنایا جاتا ہے، اسے قائم اور برقرار رکھنے کے لیے بھی منفی طریقے ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔ آج یہی ہورہا ہے۔ لہٰذا اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔

یہاں فکری ونظریاتی لحاظ سے کوئی مضبوط مزاحمتی قوت موجود ہے نہ اسلام مخالف ذہن مضبوط اور ٹھوس بنیادوں پر تیار کیا گیا ہے۔ اس لیے اسلام کی دعوت بالخصوص اس کی اخلاقیات ومعاشرت کی دعوت، جو ظاہر ہے کہ عقیدۂ توحید ہی کی بنیاد پر ہوگی، اگر حکمت وموعظت کے ساتھ پیش کی جائے تو ہندوستانی معاشرہ اقوامِ عالم میں ایک بہترین مثالی معاشرہ بن سکتا ہے۔



تکثیری معاشرہ اور فریضۂ دعوت

توقیر عالم فلاحی*

بنی نوع انساں- عالمگیر برادری

ادیان و مذاہب کی کہکشاں میں اسلام اللہ رب العزت کا دین ہے۔ اس کے علاوہ جتنے ادیان و مذاہب ہیں وہ اسی دین کی محرف شکلیں ہیں اس لیے ان میں سے کسی کو بھی اللہ کی بارگاہ میں سند قبولیت حاصل نہیں ہے۔ یہ دین مکمل شکل میں، نعمت عظمیٰ کی معراج کی شکل میں اور اللہ رب العزت کے حضور قبولیت و پسندیدگی کی سند لیے ہوئے دنیا کے تمام انسانوں کے لیے اور قیامت تک کے لے ہے۔ اسی دین کا یہ امتیاز ہے کہ یہ بلا فرق و امتیاز رنگ و نسل پوری انسانی برادری کو ایک ماں باپ کے رشتے میں منسلک کر دیتا ہے۔ خونی رشتے کے بھائی و بہن کی حیثیت سے بنی نوع انسان کی قدردانی کا علم بلند کرتا ہے۔ قرآن مجید کی یہ درخشاں تعلیم تمام انسانوں کو ایک ہی ماں باپ کی اولاد قرار دے کر اخوت و محبت اور انسانیت نوازی و بشر دوستی کا پیغام عام کرتی ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

”یَا أَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً کَثِیْراً وَّنِسَاءً“ (النساء:۱)

(اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنا دیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔)

---

* پروفیسر، شعبۂ دینیات (سنی)، اے-ایم-یو، علی گڑھ

ایک مرد اور ایک عورت سے نسل انسانی کا فروغ ہوا۔ رنگ و نسل اور قبیلہ و گروہ کے لحاظ سے انسانوں کا مختلف ہونا دراصل ایک دوسرے کی شناخت کی غرض سے ہے۔ کسی ملک کے باشندوں کو کسی دوسرے ملک کے باشندوں پر اور کسی مخصوص رنگ و نسل کے لوگوں کو دوسرے رنگ و نسل کے لوگوں پر کوئی فضیلت و برتری نہیں حاصل ہے۔ ہاں ایک شخص چاہے جس گروہ انسانی سے تعلق رکھتا ہو اور کسی بھی رنگ و نسل سے اپنے آپ کو منسوب کرتا ہو، اگر وہ رب السمٰوٰت والارض سے ڈرنے والا اور اس سے محبت کرنے والا ہے تو وہ افضل و اشرف ہے۔ ذیل کے ارشاد ربانی میں اس حقیقت کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

"يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ" (الحجرات:۱۳)

(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔)

خطبۂ حجۃ الوداع حقوق انسانی کا عالمی منشور ہے۔ اس میں محبوب رب کائنات نے جو تعلیمات و ہدایات حاضرین کے گوش گزار کی تھیں، ان کی بابت یہ فرمایا تھا کہ جو لوگ موجود ہیں وہ ان تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ بایں طور ان زریں اسباق اور حقوق انسانی کی ان تابندہ دفعات کی حیثیت بھی عالمگیر ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے مذکورہ بالا ہدایت ربانی کی تشریح اپنے الفاظ میں یوں فرمائی تھی:

"ان اللہ عز و جل قد اذھب عنکم عیبة الجاھلیة وفخرھا بالآباء مومن تقی وفاجرٌ شقی"[1]

(بلاشبہ اللہ عز و جل نے تم سے جاہلیت کے طریقوں کو ختم کر دیا اور اس میں آباء و اجداد پر فخر کرنے کو ختم کر دیا ہے۔ ایمان والا ہی متقی ہے اور فاجر و بدکار بدبخت ہے۔)

یہ دنیا امتحان گاہ ہے

مذکورہ بالا آیات قرآنیہ اور حدیث نبوی کے علاوہ بھی قرآن مجید کے اندر متعدد تعلیمات وفرامین موجود ہیں جو خونی اور مادّی رشتے میں بندھے ہوئے تمام اولاد آدم کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کے عمل کا فرمان جاری کرتی ہیں اور ایک شخص خواہ کسی بھی نظریہ، مذہب اور مسلک ومشرب سے متعلق ہو اس کے آزادانہ وجود کو تسلیم کرنا اور قبول مذہب کے سلسلے میں جبر واکراہ سے گریز کرنا عین کتاب اللہ کی تعلیمات اور دین خداوندی کے شایان شان ہے۔ کسی بھی دین کے رد واختیار کے سلسلے میں ہر شخص کو حق حاصل ہے اور اسلام اپنے پیروؤں کو اس نہج سے فراخ ذہنی اور وسعت قلبی کا یہ پیغام دیتا ہے:

''لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ'' (البقرہ:۲۵۶)

اللہ رب العزت نے اس کائنات کو بامقصد بنایا ہے جس کا اعلامیہ قرآن مجید میں متعدد بار جاری ہوا ہے۔ خدا کے فراہم کیے گئے مزین آسمان کی چھت ہو یا پھر زمین کی شکل میں وسیع وعریض فرش، گویا پوری کائنات کی یہ بزم اولاد آدم وحوا کے لیے سجائی گئی ہے اور آسمان وزمین کا ذرہ ذرہ بایں طور رب کائنات کی تسبیح خوانی میں مصروف ہے کہ وہ تمام مخلوقات میں مکرم اور تمام موجودات میں افضل انسان کی خدمت کر رہا ہے، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمان وزمین کی تمام مخلوقات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ یہ زمین اصل امتحان گاہ کے طور پر ہے جس کو انواع واقسام کی اشیاء سے مزین وآراستہ کر دیا گیا ہے تاکہ امتحان دہندہ کی حیثیت رکھنے والے انسان کے لیے کوئی حجت باقی نہ رہے۔ جس طرح امتحان دینے والے طلبہ کی سہولت کے پیش نظر انتظامات ہوتے ہیں اور بدانتظامی کی وجہ سے طلبہ کو صدائے احتجاج بلند کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا اور ان کا سارا کیا دھرا نتیجہ امتحان کی شکل میں سامنے آتا ہے تو اس کو بکراہت یا بطیبِ خاطر مان لینے کے علاوہ ان کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ زمین امتحان ہال کے طور پر ہے اور انسان کو کسی بھی ایسی نعمت سے محروم نہیں کیا گیا ہے جو اس کے خوشگوار نتیجۂ امتحان

میں مانع ومزاحم بن جائے۔فرمان باری تعالیٰ ہے:

"إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً. وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْداً جُرُزاً" (الکہف:۷-۸)

(فی الحقیقت زمین پر جو کچھ بھی ہم نے بنایا ہے وہ اس کی زینت کے طور پر ہے تا کہ ہم ان کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ آخر کار ان سب کو ہم ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں۔)

امتحان گاہ میں طرح طرح کے طلبہ ہوتے ہیں۔بعض بہت سنجیدہ اور محنتی ہوتے ہیں،بعض کھلنڈرے اور کام چور ہوتے ہیں،بعض ذہانت وفطانت میں بڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض کند ذہن اور نااہل ہوتے ہیں۔بعض کسی مذہب ومسلک کے ہوتے ہیں اور بعض کسی دوسرے مسلک ومکتبۂ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔امتحان ہال کو ان تمام لوگوں کے لیے مزین کیا جاتا ہے۔یہاں کی سہولتوں سے فائدہ اٹھایا جانا ذہانت واستعداد اور مذہب ومسلک پر موقوف نہیں ہوتا۔اسی طرح اس دنیا میں متعدد مذاہب ومسالک کے لوگ رہتے ہیں اور خدا کی نعمتیں تمام کے لیے عام ہوتی ہیں۔ہاں ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو اپنے آقائے حقیقی اور مربیِ کائنات کی مرضی کے مطابق شب وروز گزارتے ہیں وہ صالح اور شکرگزار بندے ہوتے ہیں اور جو اپنے خالق ومالک کی مرضی کے پابند نہ ہوکر خواہشات نفس کے اسیر،مفاد کے غلام اور مادہ کے پرستار ہوتے ہیں وہ مجرم اور ناشکرے ہوتے ہیں۔اللہ رب العزت کا ارشاد اس سلسلے میں قابل ملاحظہ ہے:

"إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعاً بَصِيْراً. إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ إِمَّا شَاكِراً وَّإِمَّا كَفُوراً" (الدہر:۲-۳)

(ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تا کہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ہم نے اسے راستہ دکھادیا،خواہ وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔)

افکار و مذاہب کا وجود مشیت الٰہی

اللہ رب العزت کے لیے یہ امر دشوار کن اور ناممکن نہیں تھا کہ وہ تمام لوگوں کو ایک ہی شریعت یا ایک ہی دین کا متبع بنا دیتا لیکن امتحان و آزمائش کا مقصد فوت ہو جاتا۔ مختلف افکار و مذاہب کا وجود، مقابلہ اور امتحان میں کامیاب و ناکام ہونے کا تصور بھی کالعدم ہوتا، نیز نیکی و بدی کی جزا و سزا کا تصور بھی بے معنی ہو جاتا۔ قرآن مجید کی ہدایتیں انہی حقائق پر ناطق نظر آتی ہیں۔ ارشاد ربانی ملاحظہ فرمایئے:

> ”لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجاً وَلَوْ شَاء اللّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَلَـٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُم فَاسْتَبِقُوا الخَيْرَاتِ“ (المائدہ: ۴۸)
>
> (ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ عمل متعین کی۔ اگر چہ تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا۔ لیکن اس نے یہ اس لیے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔)

ایمان دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی دولت ہے۔ اسی ایمان کی بنیاد پر کسی کا صحیح عمل عمل صالح قرار پاتا ہے اور پھر وہ اللہ کی عنایتوں کا مستحق بنتا ہے۔ بصورت دیگر اس کا ہر چھوٹا اور بڑا عمل اللہ کے یہاں ناقابل قبول اور مردود ٹھہرایا جاتا ہے اور وہ اللہ کی نظر عنایت سے محروم رہتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو عقل سلیم کی دولت دی اور کائنات کو کھلی ہوئی کتاب کی شکل میں انسانوں کے لیے پیش کر دیا۔ عقل مند اور طالب ہدایت انسانوں کے لیے بے شمار نشانیاں اس کتاب کائنات میں مل جاتی ہیں۔ انعام یافتہ افراد و اقوام کی سرگذشت اور سزا یافتہ اور معذب افراد اور قوموں کے احوال و کوائف کی روداد کتاب اللہ میں کافی و شافی مواد کی حیثیت سے موجود ہے۔ اللہ عزیز ہے، جبار ہے،

متکبر ہے، بادشاہ حقیقی ہے، پوری کائنات اوراس کے ایک ایک ذرہ پراس کی حکمرانی ہے اور کوئی وجود یا کوئی طاقت اس کی قدرت سے پرے نہیں ہے۔ ساری دنیا مل کر اگر کسی کو نقصان پہنچانا چاہے اور قادر مطلق خدا کی مشیت و مرضی نہ ہو تو یہ ممکن نہیں ہے، اسی طرح اگر پوری دنیا کی طاقت اور ذرائع و وسائل کسی کو فائدہ پہنچانے کے لیے استعمال کر لیے جائیں لیکن اللہ کی مرضی اس کو فائدہ پہنچانے کی نہ ہو تو کسی طرح اور کبھی بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کو فائدہ پہنچ جائے۔ ان تمام اوصاف و کمالات کی مجسم ذات حکیم بھی ہے، اس لیے اس امتحان گاہ میں امتحان اور حکمت کے تقاضوں کو وہ کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔ لیکن اگر وہ صرف چاہ لے کہ دنیا کے تمام انسان اس کے تابع فرمان بن جائیں تو اس کی چاہت کے جامۂ عمل پہننے میں کوئی دقت و دشواری نہیں ہوگی۔ اس سلسلے میں فرمان خداوندی بہت واضح ہے:

"إِن نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَآءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ" (الشعراء:۴)

(اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھکی رہ جائیں۔)

مذکورہ بالا قرآنی آیات کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ متنوع افکار و خیالات کے حامل افراد اور مختلف مذاہب و مسالک کے متبعین کی موجودگی مشیت الٰہی کے مطابق ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ باطل کی موجودگی میں حق کی صداقت بے نقاب ہوتی ہے، تاریکی میں روشنی کی اہمیت تشت از بام ہوتی ہے اور بدی و برائی کی موجودگی میں نیکی اور اچھائی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ گویا الاشیاء تتبین باضدادھا کے اصول کے مطابق اسلام کی حقانیت منزہ ہو کر اُسی وقت سامنے آ سکتی ہے جب باطل اس دنیا میں موجود ہو۔ جبھی صبر، توکل اور استقامت کی تعلیمات بھی بامعنی بنتی ہیں اور جبھی اجر و ثواب اور شرف و سعادت کا حصول بھی ممکن ہوتا ہے۔

مختلف المذاہب معاشرہ اور دعوت کا کام

آج کے کثیر المذاہب معاشرے (Multi-religioue society) میں اسلام کے علم برداروں کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اخلاص کے ساتھ کلمہ حق کے مقدس بول کی ادائیگی کرنے والے اشخاص خیر امت، امت وسط اور شہداء علی الناس کے القاب سے سرفراز ہوجاتے ہیں۔ گروہ انسانیت میں قائد و راہنما کے منصب پر فائز ہونے والی اس امت پر دعوت کے کام کو فرض کردیا گیا ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ خیر امت کا یہ منصب و مقام مشروط ہے دعوت کا کام کرنے سے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

”كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ“ (آل عمران:۱۱۰)

گویا امت کا ایک ایک فرد، فرد کی حیثیت سے اور من حیث المجموع جماعت کی حیثیت سے اس بات کا بھی مکلّف ہے کہ لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلائے، خیرات و حسنات کو فروغ دینے کی سعی و جہد کرے اور منکرات و سیئات کا قلع قمع کرنے کے لیے برسرِ پیکار رہے۔ اگر امت مسلمہ کا ایک فرد یا مجموعی حیثیت سے پوری امت اس فریضۂ دینی کی متحمل نہیں ہے تو اس کا تعلق خیر امت سے نہیں ہوسکتا اور دوسرے الفاظ میں اس شکل میں امت محمدیہ سے وابستگی کا دعویٰ باطل ہوجاتا ہے۔

فریضۂ دعوت کی ادائیگی ایک عظیم الشان حق العباد کی ادائیگی سے بھی عبارت ہے۔ چونکہ اللہ کا دین عظیم ترین دولت ہے، اس لیے اس سے وابستگی میں ہی دراصل ایک شخص کے لیے دونوں جہاں کی خیر و سعادت کا راز مضمر ہے۔ دین کو ان بندگان خدا تک پہنچانا امت مسلمہ کا فرض ہے جو خدا کے دین سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اپنی زندگی کی شب تاریک کو روشن نہیں کرتے اور اپنے اصل خالق و مالک کو پہچاننے سے بھی قاصر رہتے ہیں۔

اسلام مسلمانوں کی ملکیت یا جائداد نہیں ہے۔ اللہ رب العزت کی یہ عطا فرمودہ

نعمت ہے۔ جب اس کی مادّی نعمتوں پر کسی مخصوص گروہ یا جماعت کا اجارہ نہیں اور ساری دنیا اس کی مادّی نعمتوں سے فیض یاب ہورہی ہے تو اس روحانی نعمت پر جو آدمی کو انسان بنادیتی ہے اور دونوں جہاں کی سرخروئی کی ضمانت لیتی ہے، کسی مخصوص گروہ یا طبقہ انسانی کی ملکیت کیونکر قابل قبول ہوسکتی ہے۔ اس لیے دین یا طریقۂ زندگی کی شکل میں خدا کی دی ہوئی نعمت بلا فرق و امتیاز پوری انسانی برادری کے لیے ہے۔ ہاں مسلمان اس دین کے امین ہیں۔ اس امانت کی ادائیگی کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ اسلام کے نام لیوا اس امانت عظمیٰ کو اپنی زندگی میں نافذ کریں اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کو ان بندگانِ خدا تک پہنچائیں جو اس کی عظمت سے ناآشنا ہوکر ضلالت و گمراہی کے قعر عمیق میں گر رہے ہیں۔ یہ اس امانت کی ادائیگی بھی ہے جس کی تعلیم قرآن حکیم میں بہت واضح طور پر دی گئی ہے۔ اور دوسری طرف اللہ کے بندوں کے سب سے بڑے حق کی ادائیگی بھی ہے جس سے بے التفاتی و بے نیازی برتنے پر سنگین نتائج آخرت میں بھگتنے پڑیں گے۔

معاشرتی پہلو سے بھی دعوت کی یہ ذمہ داری امت مسلمہ کے کاندھوں پر رکھی گئی ہے اور اس پہلو سے اس کی انجام دہی میں دراصل داعی فرد یا داعی گروہ کا اپنا مفاد بھی مضمر ہوتا ہے۔ اگر معاشرتی اصلاح وفلاح میں سرگرمی عمل دکھائی جائے، اچھائیوں کے فروغ کی جدوجہد کی جائے اور برائیوں سے نبرد آزما ہوا جائے تو یقینی طور پر ایک ایسا خوشگوار ماحول تیار ہوگا جس میں معاشرے کے دیگر لوگوں کے ساتھ ساتھ داعی اور اس کے احباب و متعلقین خود بھی امن و آشتی اور خیر و حسن کے ماحول سے مسرور و شادماں ہوں گے۔ اس پہلو سے دعوت کی عظمت کا اندازہ اس تمثیلی وضاحت سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ پنکھے یا کولر کی ٹھنڈی ہوا فرحت بخش اسی وقت ہوگی جب اس کا گرد و پیش بھی صاف ستھرا اور سایہ دار رہے۔ اس کے برعکس اگر پنکھا یا کولر خس و خاشاک اور غلاظت میں رکھا ہو اور اس کے قریب کا ماحول ٹھنڈا اور سایہ دار ہونے کے بجائے دھوپ اور گرمی کی حدت سے تپ رہا ہو تو یقینی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہوا گرم اور متعفن ملے گی اور یہ کلفت و زحمت کا سبب بنے گی۔ اسی طرح اگر پڑوس اور معاشرے میں مادّی غلاظت

موجود ہو یا برائیوں اور بے حیائیوں کی شکل میں معنوی اور اخلاقی خباثت پنپ رہی ہو تو داعی کا گھر اس مادّی اور معنوی تعفن سے محفوظ نہیں رہ سکے گا، چاہے گھر میں کتنی ہی صفائی ہو اور پورا گھر معطر ہو رہا ہو۔ قرب و جوار کی گندگیوں اور خباثتوں کی زد میں وہ گھر بھی آئے گا جس کے مکیں اپنی مخصوص چہار دیواری میں رہ رہے ہوں اور اپنے آپ کو تمام قسم کی ناخوشگواریوں اور پریشانیوں سے محفوظ و مامون تصور کرتے ہوں۔

فریضۂ دعوت ایک مقدس مشن

داعی کا مقام لیڈر اور راہنما کا ہوتا ہے اور مدعوئین کے مقابلے میں اس پر تمام لوگوں کی نظریں مرکوز ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے امت مسلمہ کا ہر ہر فرد لیڈر ہے اور حسب استعداد وہ اس ذمہ داری کا مکلّف ہے کہ لوگوں کو ایک اللہ کے پرستار ہونے کی دعوت دے اور معبودان باطل سے رشتہ منقطع کرنے کی تعلیم و تلقین کرے، خیر کے فروغ کے لیے پیش قدمی کرے اور مخاطب کو فکری اور عملی لحاظ سے اس کے لیے تیار کرے اور دوسری طرف شر و فساد کے خلاف وہ شمشیر برہنہ ثابت ہو اور مخاطب و مدعو کو بھی اس کے خلاف محاذ آرائی کی دعوت دے۔ اللہ رب العزت کی یافت یا خداشناسی سے بڑھ کر کوئی نیک عمل نہیں ہوسکتا۔ جو شخص اس دولت عظمیٰ کا مالک ہے وہ انتہائی سعادت مند اور خوش نصیب ہے اور اس سے بڑھ کر وہ شخص بڑے نصیبے والا ہے جو اللہ واحد کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے اور اس کے احکام کی بجا آوری کی دعوت دیتا ہے۔ ایسے ہی اشخاص کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے یہ نوید مسرت حاصل ہوتی ہے:

"وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَّقَالَ إِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ" (فصّلت:۳۳)

انبیاء و رسل اللہ رب العزت کے فرستادے ہوتے ہیں اور اپنے اپنے وقت میں پوری انسانی برادری میں انتہائی اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ ہر نبی یا رسول اللہ کی جانب سے مامور ہوتا ہے اور اپنے مخاطب یا مدعو معاشرہ کو سب سے پہلے اللہ واحد کا

پرستار بننے کی دعوت دیتا ہے۔ انبیائی دعوتوں کے اس متفقہ عمل پر قرآن مجید میں مذکور انبیاء کی سند جا بجا ملتی ہے ۔گلے سے معبودانِ باطل کا قلادہ انسانوں کی گردنوں سے اتار کر خدائے واحد کا علم بردار بنا دینا، اچھائیوں کی تشہیر و تبلیغ کرنا اور برائیوں سے رکنے کی تعلیم وتلقین کرنا ان کے مشن کا مرکزی موضوع رہا ہے۔ خاتم الانبیا علیہ ﷺ سے پہلے کی امتیں اگر مکلّف تھیں تو اسی امر کی کہ وہ اچھائی کریں اور برائی سے رکیں۔ دعوت و تبلیغ ان پر فرض نہیں رہی۔ لیکن امت محمدیہ پر یہ کار دعوت فرض کر دیا گیا۔ تبلیغ دین کی عظیم ترین ذمہ داری کی انجام دہی کی بنا پر ہی امت مسلمہ خیر امت اور شہداء علی الناس کے القاب سے نوازی گئی ہے۔ اس فریضے کو انجام دینے والے انبیائی مشن کے علم بردار ہوتے ہیں ۔ خاتم الانبیاء کے امتیوں کے لیے یہ باعث شرف واعزاز ہے کہ ان کو اس کار عظیم کی ذمہ داری دی گئی جو ذمہ داری اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء ورسل پر تھی ، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے دین کو فروغ دینے اور اس زمین پر اس کے احکام کے نفاذ کی سعی وعمل کرنے والے مبارک نفوس 'انصار اللہ' (اللہ کے مددگار) سے معنون وملقب ہوتے ہیں۔

اللہ رب العزت وحدہ لاشریک ہے۔ وہ اپنی ذات میں اکیلا، اپنی صفات میں بے مثل اور اپنے اختیارات میں لاثانی اور یکتائے روزگار ہے۔ ساری دنیا اُسی کے سامنے کشکول گدائی لیے پھرتی ہے اور اسی کی رحمتوں اور عنایتوں کی امیدوار بنتی ہے۔ وہ کسی کا نیاز مند نہیں اور آسمان وزمین اور ان کے درمیان تمام موجودات اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اللہ رب العزت شہنشاہ کائنات ہے، اس کو کسی مددگار کی ضرورت نہیں ہے، لیکن جو لوگ اللہ کی مرضی کو ہی مطمح نظر بنا کر بندگانِ خدا کو اللہ واحد کی طرف بلاتے ہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں، اس کے دین کے غلبہ کی جدوجہد میں وقت، مال اور جان کا اثاثہ لگا دیتے ہیں اور ان کے پایۂ ثبات میں لغزش نہیں آتی، دراصل یہی وہ مبارک ہستیاں ہیں جن پر رحمت الٰہی سایہ فگن ہوتی ہے اور جو شاد کام و سرخرو ہوتے ہیں۔ انبیاء کرامؑ انسانیت کے اس مقدس اور چیدہ جماعت میں ہیں جو بجا طور پر سعادت مندوں میں سرفہرست ہیں۔ خاتم الانبیا علیہ ﷺ اس سلسلۃ الذہب کی

آخری کڑی ہیں جو سردار انبیاء اور محبوب کبریا ہیں اور اخلاق کے اعلیٰ ترین معیار پر فائز ہیں۔ آپ ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت سے مشروط ہے۔ اور آپ ﷺ کی اتباع میں خوشنودیٔ رب کائنات کا راز پوشیدہ ہے۔

آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی یہ تھا کہ اللہ کے دین کو تمام ادیان باطلہ پر غلبہ و تفوق حاصل ہو جائے۔ یہ مقصد آپ کے زمانے میں پورا ہوا، فکری طور پر بھی اور عملی طور پر بھی۔ آج فکری طور پر بلاشبہ اسلام تمام مذاہب و ادیان پر غالب ہے۔ دین و دنیا سے متعلق روشن ہدایات، مساوات، انسانیت اور ہمدردیٔ خلائق سے متعلق درخشاں تعلیمات، فرد اور معاشرے کی اصلاح و فلاح سے متعلق تابندہ افکار کو اگر کسی قسم کی جانب داری اور تعصب کی عینک ہٹا کر دیکھا جائے اور تمام مفروضات و تحفظات سے پرے ہو کر اخلاص کے ساتھ مثبت انداز میں کوئی جویائے حقیقت بننا چاہے تو ہر ذی ہوش شخص کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اسلام مذاہب کی بزم میں انسانیت کا مذہب بننے کا زیادہ مستحق ہے۔ اس صداقت کے آشکار ہونے کے باوجود آج امت مسلمہ پر جوامت دعوت ہے، یہ فرض ہے کہ اللہ کے دین کے سلسلے میں فکر مند ہو اور قولی اور عملی شہادت کے ذریعہ اس کے دین کو اہل امانت تک پہنچانے میں سردھڑ کی بازی لگائیں، کتاب اللہ میں اس جدوجہد کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک جگہ فرمایا جاتا ہے:

> ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ فَآمَنَت طَّائِفَةٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَت طَّائِفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَى عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ'' (الصف:۱۴)
>
> (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے مددگار بن جاؤ جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں کو خطاب کر کے کہا تھا ''کون ہے اللہ کی طرف بلانے میں میرا مددگار؟ اور حواریوں نے جواب دیا تھا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔)

تبلیغ دین کے مشن میں فدا کاری کے جذبہ سے سرشار ہوکر دین کے غلبہ و استحکام میں سرگرم عمل رہنا، گویا اللہ کی مدد کرنا ہے۔ اللہ رب العزت کی طرف سے بندوں کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ وقت، مال اور جان کی شکل میں دی گئی خود اس کی نعمت کو اگر اس کے دین کے احیاء و غلبہ کی کوششوں میں لگا دیا جائے تو وہ اپنا مددگار کہتا ہے اور اپنی عنایتوں اور رحمتوں کی شکل میں اپنی جانب سے تائید و نصرت کا یقین دلاتا ہے۔ آیت کریمہ کے یہ الفاظ قابل ملاحظہ ہیں:

"يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللّٰهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ" (محمد:۷)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا۔)

اللہ رب العزت کی جانب سے بندوں کے ساتھ عزت و توقیر اور اعزاز و اکرام کی یہ انتہا ہے کہ مال و جان اور اسباب و وسائل سب اسی کی عنایت کردہ ہیں، لیکن اپنی جانب سے عطا کی گئی ان نعمتوں کو اپنے بندوں کی ملکیت قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر وہ اپنے مال و جان کو اللہ کے دین اور غلبہ و استحکام میں لگا دیں تو وہ گویا اس کی تیار کردہ اصلی نعمتوں کے باغات کے خریدار اور مالک بن جاتے ہیں۔ اللہ رب العزت کا یہ اعزاز و اکرام اس آیت کریمہ میں ظاہر و باہر ہے:

"إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" (التوبۃ:۱۱۱)

(حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔)

دعوت کا موضوع اور داعی کا دائرۂ کار

اللہ واحد کی طرف لوگوں کو بلانا، رسالت کی اہمیت گوش گذار کرنا، موت کے

بعد کی زندگی کے استحضار کی تلقین کرنا، مساجد کی آبادکاری کی جدوجہد، نماز اور دیگر احکام وفرائض کی تعلیم وتذکیر، سنن ونوافل کی ترغیب، بلاشبہ یہ سب عمل مبارک ہیں اور دعوتی جدوجہد کے مباحث اور مظاہر ہیں، لیکن فریضۂ دعوت کا یہ صرف ایک رخ ہے۔ اسی دائرہ کار میں رہتے ہوئے تمام منہیات ومنکرات سے استغناء اور بے نیازی برتتے ہوئے دعوت کے مقدس عمل کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا جاسکتا۔ بلاشبہ محض معروفات و حسنات کی تبلیغ وتشہیر کو مرکز توجہ بنانا اور اسی دائرۂ کار میں رہتے ہوئے اپنی داعیانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانا اعتراضات واختلافات کو ہوا نہیں دیتے، مخالفتوں اور مزاحمتوں کا طوفان کھڑا نہیں کرتے، بلکہ سکون وعافیت میسر ہوتی ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ داعیانہ کردار کی یہ ناقص نمائندگی ہے اور دانستہ یا نادانستہ طور پر کسی حد تک یہ تصور جلا پاتا ہے کہ چاہے منکرات وسیئات معاشرے میں ہر جگہ پھیلے ہوں اور مدعو فرد یا معاشرہ چاہے جن برائیوں میں ملوث ہو، ان پر انگشت نمائی نہیں کرنی ہے، بلکہ اچھائیوں کی دعوت دینا ہے اور معروفات کو ان کی زندگیوں کی زینت بنا دینا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ جذبہ بہت ہی مبارک اور مستحسن ہے لیکن داعی کو ہی یہ فکر کرنا ہے کہ اس طریقۂ دعوت سے کہیں مدعو اس فکر کا تو نمائندہ نہیں بن رہا ہے کہ برائیاں اگر ہو رہی ہوں تو یہ تشویش کی بات نہیں ہے ہاں اچھائیوں کو جامۂ عمل پہنانے میں پیش قدمی ضرور کرنی چاہیے۔

داعی کی کوششوں کے نتیجے میں مدعو اگر اس طرز فکر کا حامل بن جائے کہ معروفات بہرحال قابل توجہ ہیں۔ احکام ترک نہیں کیے جانے چاہئیں اور فرائض، سنن اور نوافل کا اہتمام والتزام ہونا چاہیے، چاہے برائیوں سے نفرت کا عملی مظاہرہ نہ ہو اور نہ ہی ان کے خلاف محاذ آرائی ہو، تو یہ دین کا آدھا تصور ہے جو بہرحال مطلوب نہیں ہے اور اس سے مجاہدانہ کردار کی آبیاری نہیں ہوسکتی۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ ایک آدمی کا ہاضمہ خراب ہے وہ دست روکنے کی گولیاں بھی کھاتا ہے اور اگر مٹر، چنا اور دوسری دست آور اشیاء کا استعمال کرلے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتا، ایسے شخص کی مثال یوں بھی دی جاسکتی ہے کہ وہ روشنی کو تو بہت پسند کرتا ہے اور اس کا علم بردار ہے، لیکن تاریکی اگر گھر

میں یا معاشرے میں اپنا وجود رکھتی ہے تو یہ اس کے لیے باعث تشویش نہیں ہے۔ اس شخص کی مثال ایسے فرد سے بھی دی جاسکتی ہے جو اللہ واحد کی بات تو کرتا ہو اور اس کے تئیں اپنی محبتوں اور عقیدتوں کے مظاہرے بھی کرتا ہو، ہاں اگر غیر اللہ موجود ہوں اور افراد معاشرہ اگر ان کے آستانے پر جبین نیاز جھکاتے ہوں تو یہ عمل اس کے لیے باعث تعجب اور وجہ اضطراب نہیں ہوتا۔

صداقت تو اس امر میں ہے کہ روشنی کی اہمیت اجاگر نہیں کی جاسکتی یا روشنی سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا جب تک تاریکی کی ہیبت ناکی اور سنگینی پیش نظر نہ ہو۔ بلکہ جب تک اس تاریکی کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی جائے گی، اس کو کالعدم یا نابود کرنے کے عمل کو جب تک بروئے کار نہ لایا جائے، روشنی کی اہمیت وعظمت ذہن نشیں نہیں ہوسکتی اور اس سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ کوئی نیکی اور اچھائی کو اختیار کرنا مفید اور دور رس اثرات کا حامل نہیں بن سکتا جب تک بدی کو بدی نہ سمجھا جائے۔ اسی طرح جب تک تمام باطل خداؤں کا انکار نہ کیا جائے اور دل سے انھیں بے وقعت نہ سمجھا جائے اللہ رب العزت پر ایمان و یقین باوزن، مؤقر اور مستند نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے وجود کے اقرار و اعلان سے پہلے کلمۂ طیبہ کے مقدس بولوں میں لا الٰہ کو اولیت دی گئی ہے۔ یعنی اللہ واحد کے وجود کا اقرار و اعلان ہی معتبر اس وقت ہے جب تمام باطل خداؤں کی وقعت دل سے نکال دی جائے، قولی اور عملی لحاظ سے اس بات کا ثبوت دیا جائے کہ یہ بے حقیقت ہیں، دل و دماغ میں اس کا استحضار ہو کہ اگر دنیا کے سارے خود ساختہ اور باطل خدا مل کر بھی ایک مکھی بنانا چاہیں تو اپنے آپ کو قاصر و کوتاہ پائیں گے اور ایک مکھی اگر ان سے کچھ چھین لے تو اس سے اپنے آپ کو بے بس و مجبور پائیں گے۔ اسی طرح یہ سارے جھوٹے خدا مل کر اور تمام قسم کے اسباب و وسائل استعمال کرتے ہوئے اگر کسی کو کوئی نقصان پہنچانا چاہیں اور اللہ واحد کی مشیت اس کے برعکس ہو تو یہ سب خدا منہ کی کھائیں گے اور اپنے منصوبے کو جامۂ عمل پہنانے سے قاصر و کوتاہ رہیں گے۔ اسی طرح خانہ ساز خدا پوری دنیا کی طاقت کسی کو فائدہ پہنچانے کے لیے صرف کردیں اور

اللہ کی مرضی اس کے برعکس ہوتو وہ اپنے خیال ومنصوبے میں مات کھائیں گے۔ اور ندامت وشرمندگی ان کے حصے میں آئے گی۔ اس کے برعکس اللہ رب العزت جس کے بارے میں جو بھی چاہے اس کی ہر چاہت کن فیکون کے اصول کے مطابق ہوتی ہے اور ساری دنیا کے زعماء، قائدین، دولت کے پجاریوں اور اقتدار کے متوالوں کی انتھک کوششوں کے باوجود اس کی چاہت اور مرضی پر خطر اور مخدوش نہیں ہوسکتی۔

اس فکر وعقیدہ کے ساتھ داعی اگر میدان میں آتا ہے تو یقیناً ماحول اور معاشرے سے مخالفت مول لینا پڑتی ہے، اپنوں اور غیروں کی طرف سے اعتراضات کے وار سہنے پڑتے ہیں، حکومت واقتدار کی طرف سے دلدوز دھمکیوں سے سابقہ پڑتا ہے، عزت، شہرت اور اقتدار کا جھانسہ دلا کر حرص وطمع کے دام میں الجھایا جاتا ہے، فاقوں کی نوبت آتی ہے، مصائب ومشکلات کی وادیاں سر کرنا پڑتی ہیں، لیکن اگر داعی اخلاص و للّٰہیت اور صبر واستقامت کے زیور سے آراستہ ہے تو اللہ رب العزت کی رحمت سایہ فگن ہوتی ہے اور کامیابی وکامرانی اس کا نوشتۂ تقدیر بنتی ہے۔ ایک مومن ہو اور ایسے ناخوشگوار احوال وکوائف سے اس کی آزمائش نہ ہو، یہ اللہ کی مرضی اور اس کی سنت کے خلاف ہے، لیکن موقف کے تئیں پایۂ استقلال میں لغزش نہ آئے، یہ نوید مسرت کا باعث بنتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ایمان والوں سے مخاطب ہے:

”وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوفْ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الأَمَوَالِ وَالأنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ. الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُواْ إِنَّا لِلّهِ وَإِنَّـا إِلَيْهِ رَاجِعونَ. أُولَـئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ“ (البقرہ:۱۵۵-۱۵۷)

(اور ہم ضرور تمھیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے، انھیں خوشخبری

دے دو۔ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔)

دعوت کے تعلق سے یہ بات بھی مستحضر رہنی چاہیے کہ دعوت کا کام اصلاً ان بندگان خدا میں ہوتا ہے جو اپنے خالق سے دور، اللہ کے دین سے ناواقف اور اپنی عاقبت سے بے پرواہ ہیں۔یقیناً برادران اسلام بھی ہماری دعوت کے مخاطب ہوں گے اور ان پر بھی اپنی توجہ مرکوز کی جائے گی تاکہ اللہ کے احکام اور رسول اکرم ﷺ کی سنت کے ذریعہ ان کی زندگی کی شب تاریک روشن ہو جائے، ان کی اصلاح و تربیت ہو جائے اور وہ صحیح معنوں میں اسلام کے نمائندہ بن کر اپنے آپ کو بھی فیض پہنچائیں اور دوسرے بھی ان کی زندگیوں سے فیض حاصل کریں۔لیکن ہماری دعوت کے اصل مستحق اور محتاج وہ لوگ ہیں جو حلقہ بگوش اسلام نہیں ہیں اور ان میں بھی دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ایک تو وہ جن کے اندر طلب صادق ہوتی ہے اور اللہ کی اس عظیم نعمت سے صرف اس لیے محروم ہوتے ہیں کہ وہ اس کی صداقت و شیرینی اور فلاح و کامرانی کے تعلق سے دور اس اثرات و نتائج سے ناآشنا ہوتے ہیں، ہاں اپنے مذہب سے وابستہ ہو کر خوب سے خوب تر کے جویا ہوتے ہیں۔ دوسری قسم ان افراد کی ہے جو اللہ کے دین اسلام سے دور ہیں اور اپنے مذہب یا طریقہ زندگی سے انتہا پسندی اور تشدد کے ساتھ وابستہ ہیں۔علم برداران اسلام کے علاوہ داعی کے لیے مذکورہ بالا دونوں طرح کے افراد مرکز توجہ بننے چاہئیں۔

دعوت کا کام خواہ اپنوں میں ہو یا غیروں میں اسلام کو طریقہ زندگی کی حیثیت سے ماننے والے ہوں یا اس سے محروم افراد، خواہ ان کے اندر شاہراہ ہدایت پانے کی طلب وجستجو ہو یا جس دن سے وہ وابستہ ہوں، اسی پر قانع ہوں۔ان تمام تک اللہ کا دین پراثر اور دلنشیں انداز میں پہنچے، اس بات کے لیے ہر داعیٔ حق اپنی حیثیت و استعداد کے مطابق مکلّف ہے۔ حالات و ظروف کتنے ہی نامساعد ہوں اور ماحول کتنا ہی خراب ہو، اگر دعوت دلوں کو اپیل کرنے والی بن جائے تو پھر بتدریج مزاحمتیں کم ہو جاتی ہیں اور نتیجۂ خیر کی شکل میں روح پرور منظر نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔

فریضۂ دعوت کے بعض اہم مقتضیات

کم وبیش پوری دنیا میں مختلف المذاہب معاشرہ پایا جاتا ہے۔ داعی جس جگہ بھی ہو اور جس معاشرے میں بھی ہو، اس کا مقام قائد کا ہوتا ہے۔ اسے اپنے اندر وہ صلاحیتیں پیدا کرنی چاہئیں جن کی مدد سے دعوتی ذمّہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیا جا سکے۔ ہاں مختلف افکار وخیالات کے حامل معاشرے میں ذمہ داریوں کی انجام دہی کی بابت اسے نسبتاً زیادہ محتاط، حساس اور تیار رہنا چاہیے۔ داعیٔ حق کو جن اوصاف سے مزین وآراستہ ہونا چاہیے ان میں بعض کو بالاختصار حوالۂ قارئین کیا جاتا ہے:

اخلاص وللّٰہیت

عبادات میں اخلاص کو وہی مقام حاصل ہے جو جسم میں روح کو ہے۔ گویا بغیر اخلاص کے کوئی بھی عمل صالح اور کوئی بھی عبادت بارگاہ رب العزت میں شرف قبولیت سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔ ایمان کے ساتھ کوئی بھی نیک عمل عبادت ہے اور یہ عبادت اُسی وقت قابل قبول ہے جب وفاداری، اطاعت اور عبدیت کو صرف اور صرف اُسی کے لیے خاص کرلیا جائے۔ اسی تعلق سے ایک جگہ ارشاد ربانی ہے:

"وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاء" (البینۃ: ۵)

(اوران کواس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنی اطاعت کواسی کے لیے خالص کرکے۔)

بندۂ مومن دن بھر میں کم وبیش پچاس مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ عہد و پیمان کرتا ہے:

"إِيَّاكَ نَعْبُدُ وإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ" (الفاتحۃ: ۵)

(ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔)

بندۂ خدا جو ایمان کی نعمت غیر مترقبہ سے متمتع ہوتا ہے، اپنی نمازوں میں بھی اور

نماز کے علاوہ اوقات میں بھی اپنی جبین نیاز کو صرف اور صرف خدا کے سامنے خم کرنے کا اعلان کرتا ہے:

"إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفاً وَمَا أَنَاْ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" (الانعام:۷۹)

(میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے۔ اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔)

اللہ واحد پر ایمان رکھنے والے حضرات تمام تر مشغولیات و مصروفیات کا محور رضائے الٰہی کو ہی قرار دیتے ہیں۔ وہ رب السمٰوٰت والارض کی رضا و خوشنودی کے خواہاں بلکہ مدعی ہوتے ہیں:

"إِنَّ صَلاَتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" (الانعام:۱۶۲)

(بلاشبہ میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔)

مادّی مفاد کا حصول، شہرت کی طلب، شوکت و حشمت اور قوت و اقتدار کی حرص دعوت کی عظمت کو مخدوش و مجروح اور بے کیف و بے اثر بنا دیتی ہے۔ ان مسموم جذبات اور مذموم خواہشات کے ساتھ دعوت نہ صرف یہ کہ مدعو کو اپنے حلقہ بگوش کرنے سے قاصر رہتی ہے بلکہ داعی کی شخصیت بھی معاشرے میں گہنا جاتی ہے اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں بھی اس کا داعیانہ عمل سعیٔ نامشکور قرار پاتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ رب العزت کے یہاں فیصلہ نیتوں کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ فرمان رسالت مآب ﷺ ہے:

"انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ ما نوی"[2]

((اچھے) اعمال کا دار و مدار (قبولیت اور عدم قبولیت کے اعتبار سے) نیتوں پر ہے۔ اور ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق ہی (بدلہ) ملتا ہے۔)

امت مسلمہ کا ہر ہر فرد خاتم الانبیا ﷺ کا امتی ہونے پر فخر کرتا ہے۔ نبی کریم

ﷺ سے انتساب کا تقاضا یہ ہے کہ فریضۂ دعوت کی ادائیگی میں بھی اس کے سامنے آپ ﷺ ہی کا اسوہ پیش نظر ہو۔ یوں تو آپ ﷺ کی پوری زندگی اخلاص وللّٰہیت کا پیکر تھی۔ قرآن مجید کے اندر دعوت کے پہلو سے بھی آپ ﷺ کا اخلاص جگہ جگہ بدرجہ اتم آشکار ہوتا ہے۔ آپ ایسے معاشرے میں تھے جس میں کفر کے علمبردار خواہ مکہ کی زندگی میں کفار ومشرکین کی شکل میں ہوں جو اپنے آباء واجداد کی روش پر چلتے ہوئے سیکڑوں خداؤں کا طوق لعنت اپنی گردنوں کی زینت بنائے ہوئے تھے یا مدینے کی زندگی میں سابقہ آپ ﷺ کو یہود ونصاریٰ جیسے دو اہم مذاہب کے متبعین کی شکل میں جو ہر محاذ پر محمد عربی ﷺ اور اصحاب نبی ﷺ کو اپنا حریف و مد مقابل سمجھ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ایسے پر آشوب ماحول میں دعوت کا کام کیا، اپنوں میں اصلاح وتربیت کے سلسلے قائم کیے اور اغیار و اجانب میں مختلف انداز سے اللہ کے دین کو پہنچانے کا اہتمام فرمایا۔ اس راہ پر خار میں آپ ﷺ اور آپ کے احباب ورفقاء بلا شبہ سازشوں کا شکار بنے، مذموم جذبات کا نشانہ بھی بنے اور آلام ومصائب کے دلدوز واقعات بھی رونما ہوئے۔ لیکن یہ کام چونکہ اللہ کے دین کی سربلندی کا تھا اور صرف اور صرف خدائے واحد کی رضا اس کی غایت تھی، اس لیے توفیق الٰہی شامل حال رہی اور دعوت وداعی کا کام تمام کرنے کی بابت اعدائے اسلام کے گھناؤنے جذبات مجروح ہوئے اور وہ ذلت آمیز شکست وہزیمت سے دوچار ہوئے۔ اس کے برعکس داعی اعظم ﷺ سرخرو ہوئے، قیصر وکسریٰ کے ایوان ہل گئے، مدعو قوم اور معاشرے پر فتح مندی حاصل ہوئی، مغفرت الٰہی کا پروانہ ملا، اور آپ ﷺ کے اعزاز میں **انا اعطیناک الکوثر** (الکوثر:۱) اور **ورفعنا لک ذکرک** (الم نشرح:۴) کے ذریعہ باری تعالیٰ نے آپ کی نعت کو زندۂ جاوید کردیا۔

افراد معاشرہ کتنے ہی غیر مہذب ہوں، اپنے افکار ونظریات کے تئیں خواہ وہ کتنی ہی شدت دکھاتے ہوں اور اپنے مذاہب ومسالک کے خواہ کتنے ہی بڑے شیدائی ہوں، اگر ان کی فطرت مسخ نہیں ہوگئی ہے اور طلب وچاہت کی تھوڑی سی بھی چنگاری ان کے اندر باقی ہے اور انھیں یہ یقین بھی ہو کہ اللہ کے دین کی طرف بلانے والے کی کوئی

غرض نہ اس سے وابستہ ہے اور نہ اہل دنیا سے تو اخلاص کا یہ وصف داعی کو میدان دعوت کا فاتح سپاہی بنا دیتا ہے۔ چونکہ ہدایت کا تعلق اللہ رب العزت کی ذات سے ہے، اس لیے داعیٔ اس کا مکلّف ہرگز نہیں ہے کہ وہ مخاطب یا فریق ثانی کو صراط مستقیم پر گامزن کرادے۔ ہاں یہ بات بالیقین کہی جاسکتی ہے کہ اگر مدعو متعصب اور ہٹ دھرم نہ ہو، غیر جانب دارانہ طریقۂ عمل کا حامی ہو اور تلاش حق کا شیدائی ہو تو دعوت حق اس کے دل کی دنیا بدل دیتی ہے بشرطیکہ ان اجری الا علی اللہ کے تحت داعی نہ ہی دنیا میں کچھ چاہتا ہو اور نہ ہی دنیا والوں سے اور نہ ہی مدعو فرد اور معاشرہ سے، گویا اللہ کے دین کی سربلندی کی جدو جہد صرف اللہ کے لیے ہو تو اللہ کی تائید ونصرت یقینی طور پر داعی کے ہمرکاب ہوتی ہے۔ اس کی کوششوں سے غیر اللہ کے پرستار بندے اگر اس کی دعوت کا اثر قبول کرتے ہیں اور اللہ کے دین سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں تو روح پرور منظر فضل الٰہی کی شکل میں اس دنیا میں بھی وہ ملاحظہ کرتا ہے اور اللہ رب العزت کے یہاں ابدی سرخروئی کا شرف اس کا نصیبہ ہوتا ہی ہے۔ ہاں اگر اس کی انتھک کوشش اور منظم جدو جہد کے باوجود اگر دنیا میں مثبت نتیجہ برآمد ہوتے ہوئے نہیں دیکھتا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ ناکام و نامراد ہے بلکہ وہ پوری طرح کامیاب ہے، کیونکہ آخرت میں اس کے لیے اجر عظیم اور فضل الٰہی حتمی اور قطعی صداقت ہے جس کا اعلان اللہ رب العزت اپنی کتاب عزیز میں متعدد مقامات پر فرماتا ہے۔

امانت الٰہی کا استحضار

فریضۂ دعوت انجام دینے والوں کے لیے اللہ کے دین کی امانت کا استحضار بھی متاع گراں مایہ ہے۔ اللہ کا دین چونکہ پوری انسانی برادری کے لیے ہے اور جو اس دین کا علمبردار بن جاتا ہے اس کے لیے دین کی یہ دولت جاگیر نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس دین کا مالک اللہ ہے، ہاں دین کو اپنانے والا یا اس کا متبع دراصل اس دین کا امین ہوتا ہے۔ اس امانت کا ایک تقاضا تو یہ ہے کہ اس دین کو اپنی زندگی میں نافذ کیا جائے اور اپنے شب و

روز کے معمولات و مصروفیات میں اسے حکم بنایا جائے۔ دوسرا اور اہم تقاضا یہ ہے کہ چونکہ اس دین کو اپنانے کی وجہ سے ایک شخص امت مسلمہ کا نمائندہ بن جاتا ہے اور اس پہلو سے ایک فرد پر فرد کی حیثیت سے اور ایک جماعت پر جماعت کی حیثیت سے اس امانت کو ان بندگان خدا تک منتقل کرنا فرض قرار پاتا ہے جو اپنے خالق کی عظیم ترین نعمت سے ناآشنا اور محروم ہیں۔

مخاطب یا سامع کو اگر یقین ہو جائے کہ وہ قائل یا متکلم سے جو بات سن رہا ہے یا اسے جو خبر کسی کے ذریعہ موصول ہو رہی ہے، وہ شک و شبہ سے پاک، صاف و شفاف اور مستند ہے تو یہ بات اس کے دل کے تاروں کو چھوتی ہے اور اسے سکینت و طمانیت کی نعمت میسر آتی ہے۔ اسی طرح دعوت و تبلیغ کے مشن میں اگر مدعو یا مخاطب کو یقین ہو جائے کہ جو بات اس تک پہنچ رہی ہے اس کے اندر صداقت و شفافیت ہے، کسی مسلک یا مکتبۂ فکر کی چھاپ اس پر نہیں ہے، تعصب یا جانب داری کا عکس بھی اس پر نہیں پایا جاتا یا اس کی دعوت کوئی ذاتی یا گروہی مفاد کے حصول کے پس منظر میں نہیں ہے تو اس صورت میں مدعو کے تئیں مثبت اثرات و نتائج کی توقع دوچند ہو جاتی ہے۔

اس جہت سے بھی داعیٔ اعظم ﷺ کی سیرت میں درخشاں نمونہ موجود ہے۔ اس داعیانہ وصف سے متعلق قرآن مجید کی متعدد آیتیں قاری کو مخاطب بناتی ہیں۔ اللہ رب العزت کی جانب سے تلقین کی جاتی ہے کہ جو ہدایات آپ کو دی جارہی ہیں ان کو امانت سمجھئے اور قطع و برید اور حذف و اضافہ سے احتراز کرتے ہوئے ان کی اتباع کیجئے۔ اس سلسلے میں ہدایت ربانی ملاحظہ ہو:

> ”اتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ“ (الانعام:۱۰۶)
>
> (اے نبی ﷺ! اس وحی کی پیروی کیجئے جو آپ پر آپ کے رب کی جانب سے نازل ہوئی ہے، کیونکہ اس ایک رب کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔)

الٰہی امانت کے تقدس اور نبی کو اس کے پابند ہونے کی تلقین ایک جگہ یوں کی جاتی ہے:

"فَاسْتَمْسِکْ بِالَّذِیْ أُوحِیَ إِلَیْکَ إِنَّکَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" (الزخرف:۴۳)

(اے نبی ﷺ! آپ اس کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لیجئے جو وحی کے ذریعہ آپ کے پاس بھیجی گئی ہے، یقیناً آپ سیدھے راستے پر ہیں۔)

ایک جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کی پوزیشن خود اپنے محبوب کی زبانی یوں واضح کرتا ہے:

"قُلْ مَا کُنْتُ بِدْعاً مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا یُوحٰی إِلَیَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ" (الاحقاف:۹)

(اے نبی ﷺ: آپ فرما دیجئے کہ میں انوکھا رسول تو ہوں نہیں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور نہ یہ معلوم کہ تمہارے ساتھ (کیا ہوگا)۔ میں تو صرف اسی کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔)

رسول اکرم ﷺ کی داعیانہ زندگی کے اس پہلو سے متعلق درخشاں قرآنی تعلیمات تشنۂ توضیح نہیں چھوڑتیں کہ آپ نے بے کم وکاست اور تعصب وجانب داری کی عینک ہٹا کر معاشرے کو اپنی دعوت کا مخاطب بنایا۔ آج اگر داعیٔ اعظم ﷺ کے اس اسوۂ دعوت پر عمل پیرا ہوا جائے اور اس امانت عظمیٰ کو بعینہٖ اہل امانت تک منتقل کر دیا جائے تو یقینی طور پر دعوت صالحہ مثبت اثرات ونتائج کی ضمانت بن جائے گی۔

مداہنت اور سمجھوتہ سے گریز

مداہنت یا سمجھوتے کی پالیسی سے احتراز وتجنب داعیٔ دین کا مطلوب کردار

ہے۔ اس راہ میں حکمت عملی ایک علمی اثاثہ ہے اور قرآن کی زبان میں خیر کثیر ہے،[۸۱]
جس کی بنا پر دعوت خوش آئند اور دوررس نتائج کی ضامن قرار پاتی ہے اور داعی کو اس کے
اختیار کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔[۸۲] اس کے برعکس مداہنت یا بے جا نرمی کا رویہ بڑا ہی
معیوب و مذموم ہے۔ جس کی بنا پر اپنی دعوت دین کی شناخت کالعدم ہو جاتی ہے اور داعی
کی حیثیت مجروح ہو جاتی ہے۔

اسلام اللہ رب العزت کا دین ہے ادیان و مذاہب کی کہکشاں میں بارگاہ الٰہی
میں قبولیت کا شرف صرف اسلام کو حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ مطالبہ ہوتا ہے کہ اسی دین کا
لبادہ زیب تن کرو اور پورے طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر
اسلام کے رخ زیبا کو داغدار کرنے کی منصوبہ بند کوششیں کی جارہی ہیں۔ اسلام کو اپنی عملی
زندگی میں پوری طرح جاری و ساری کرنے والے شیدایان اسلام بنیاد پرست
(Fundamentalist)، انتہا پسند (Extremist) اور دہشت گرد (Terrorist) جیسے
الفاظ سے معتوب کیے جارہے ہیں۔ باطل طاقتوں کی طرف سے اہل اسلام کے لیے یہ
کوئی نئی سوغات نہیں ہے، بلکہ ابتدا سے ہی اسلام کے سیل رواں کو روکنے کی کوشش کی
جاتی رہی ہے۔ انسانیت کی ہدایت کے لیے اللہ رب العزت کی طرف سے بھیجی گئی
مبارک ترین ہستیوں بشمول نبی عربی ﷺ کی طرف شاعر، ساحر، کاہن اور مجنون جیسے
الفاظ منسوب کیے گئے اور باطل نے اپنی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ آج نئے زمانے میں
الفاظ نئے استعمال کیے جارہے ہیں، اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور عقل وفہم اور ہوش و
خرد رکھنے والے افراد کی غیر معمولی طریقے سے اسلام کے دائرے میں شمولیت سے آج
بھی باطل کے کیمپ میں لرزہ طاری ہے۔

اسلام کے ماننے والوں سے ان کا مطالبہ ہے کہ شدت کے ساتھ اسلام پر عمل
کرنے کے بجائے نرمی اور رواداری کا طریقہ اختیار کریں یا یہ کہ اپنے مذہبی افکار وعقائد
میں دوسرے مذاہب کے لیے بھی نرم گوشہ رکھیں اور کچھ دو اور کچھ لو (give and
take) کی پالیسی کے مطابق ان کے مذاہب کی بعض تعلیمات کو مذہب اسلام میں جگہ

دی جائے اور اسلام کی بعض تعلیمات ان کے مذہب میں شامل کر لی جائیں تاکہ معتدل اور قابل برداشت اسلام ہی مذاہب کی بزم میں موجود رہے اور اس پر عمل کرنے میں سختی و شدت کا مظاہرہ نہ کیا جائے جبھی اسلام کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب بھی یکساں طور پر انسانیت کے لیے قدر و احترام کے حامل قرار پا سکتے ہیں اور بقائے باہم کے لیے حالات سازگار ہو سکتے ہیں۔

چونکہ اسلام کے اختیار و قبول کے بعد مسلمان ایک خدا کا اور ایک مذہب کا ہی ہو کر رہتا ہے۔ اس کی عملی زندگی میں دوسرے خودساختہ خداؤں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی ہے، اس لیے پوری دنیا مسلمان کو اپنا حریف سمجھتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کے دعوتی مشن میں بھی اس قسم کے سمجھوتے اور رواداری رویہ برتنے کے مطالبات مدعو قوم کی طرف سے مسلسل کیے گئے۔ کفار و مشرکین اسلام اور اس کے علم برداروں کے وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار تھے لیکن اس شرط پر کہ اہل اسلام اپنے موقف میں نرمی اور لچک پیدا کریں۔ کتاب اللہ ان کے اس زعم باطل کو یوں بیان کرتی ہے:

”فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ. وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ“ (القلم:۸-۹)

(لہٰذا تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم نرم پڑ جاؤ تو یہ بھی نرم پڑ جائیں۔)

مدعو معاشرہ کے اس مذموم جذبہ کو ایک جگہ بہت واضح الفاظ میں بیان فرمایا گیا:

”وَإِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَ نَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ“ (یونس:۱۵)

(اور جب انھیں ہماری آتیں صاف صاف سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔)

داعیٔ اعظم ﷺ کا مخاطب معاشرہ سیکڑوں معبودوں کا قائل تھا اور لا الٰہ کے اعلان پر ان سب کی خدائی زمین بوس ہو رہی تھی، اس لیے ان کے پرستاروں نے

سمجھوتے کی یہ پالیسی اختیار کی کہ ایذاء رسانی میں وہ اپنے موقف میں نرمی اور رواداری کا رویہ اختیار کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ اہل اسلام اپنے موقف کو تبدیل کر لیں یا قرآن کی جگہ کوئی ایسا کلام لے آئیں جس میں ان کے معبودوں کی عظمت بھی پامال نہ ہوتی ہو۔ حالانکہ رسول اکرم ﷺ کے حاشیۂ خیال میں بھی موقف کی تبدیلی کی بات نہ تھی، لیکن کلام الٰہی میں ردّ و بدل کرنے یا اپنی طرف سے کچھ کہنے پر آپ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے صحابۂ کرام کو بلکہ پوری امت دعوت کو انتہائی دلدوز دھمکی دی گئی۔ فرمایا جاتا ہے:

"وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ. لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ. ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ" (الحاقہ:۴۴-۴۶)

خاتم الانبیا ﷺ کو اس بات کی تلقین کی جاتی ہے کہ اللہ کے کلام میں آپ کسی تبدیلی کے مجاز نہیں۔ اگر اس میں ذرہ برابر بھی تبدیلی ہوئی تو اللہ سے بچ نکلنے کی کہیں کوئی پناہ گاہ ہرگز نہ مل سکے گی۔ حذف و اضافہ کرنے کا جذبہ انتہائی مذموم تھا اور اس دین کی شناخت کو مجروح کر دینے کے مترادف تھا۔ اللہ کو کفار و مشرکین کی یہ پیشکش بڑی ناگوار لگی اور اپنے رسول ﷺ کے ذریعہ یہ علی الاعلان بتکرار کہلوا دیا کہ کسی بھی قیمت پر لین دین کا سودا نہیں ہوگا۔ تم اپنے دین کی بابت آزاد ہو جو چاہو کرو، لیکن اللہ کے دین کے شایان شان ہرگز نہیں کہ تمہارے مطالبے کو خاطر میں لایا جائے۔ آپ ﷺ کے ذریعہ دین و مذہب کے ان سوداگروں کو یہ مسکت جواب بھی دلوایا گیا۔

"قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَى إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ" (یونس:۱۵)

(اے نبی ﷺ! آپ یہ فرما دیجیے کہ میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کروں۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے

ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔)

اس اسوۂ نبوی میں دین کو من وعن تسلیم کرنے اور پورے طور پر اسلام کی تعلیمات کو اپنی زندگی کا زیور بنانے سے متعلق قیمتی سبق موجود ہے۔ اشاعت دین کی جدو جہد کے مرحلے میں یہ حکمت عملی (Strategy) تو اختیار کی جائے گی کہ دین دلنشیں اور مؤثر انداز میں مخاطب کو پیش کیا جائے، نفسیات کا خیال کیا جائے، ان کے مذہب کو مطعون نہ کیا جائے اور مذہب کی مقدس شخصیات کو نشانۂ سب وشتم نہ بنایا جائے، مخاطب کی سمجھی جانے والی زبان میں دعوت دی جائے، لیکن یہ اللہ کے دین کے شایان شان قطعاً نہیں ہے کہ دین میں سے کوئی چیز حذف کر دی جائے اور مخاطب یا مدعو کے مذہب کی کسی ایسی تعلیم کو جو دین اسلام سے متضاد ومتصادم ہو، جزو دین بنالیا جائے۔ کیونکہ اس طریقۂ عمل سے دین کی شناخت پامال ہوتی ہے اور داعی کی حیثیت بھی مجروح ہوتی ہے۔

داعیانہ اضطراب

فریضۂ دعوت کی ادائیگی کے لیے ایک داعی کو جن اوصاف و خصائص سے مزین ہونا چاہیے ان میں داعیانہ اضطراب بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ خدا کے دین سے دوری اور برائیوں میں ملوث رہنے کے جن نتائج بد سے سابقہ مدعو فرد یا معاشرہ کو پڑتا ہے، ان کی بابت اگر داعی کو فکر وتشویش اور اضطراب و بے چینی ہو اور مدعو کو داعی کے تئیں یہ یقین ہو جائے کہ وہ اس کا مخلص ہے، اس کی تکلیف کو وہ اپنی تکلیف سمجھتا ہے اور نتائج اعمال کی سنگینی کے احساس سے اس کے اندر سیمابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس صفت کے ساتھ دعوت کا کام سحر انگیز ہونے کی حد تک اثر آفریں ہوتا ہے۔ مخصوص اوقات میں دروازے پر دستک دینا، تین روز، دس روز، اور چالیس روز کی دعوتی مہم میں حسن سلوک کرنا، ایثار و ہمدردی کے مظاہرے کرنا اور قربت واپنائیت کے ثبوت دینا، نماز کی پابندی کے لیے تلقین کرنا اور مسجد سے تعلق استوار کرنے پر تاکید کرنا اور اپنے آپ کو اس بات سے مطمئن کر لینا کہ مخاطب کی زندگی کے شب تاریک میں قندیل روشن ہو یا نہ ہو، اس

کے احوال وکوائف میں تبدیلی رونما ہو یا جمود وتعطل کا ہی دور دورہ ہو اور مدعو دین کا مستقل اور کل وقتی علمبردار بن جائے یا فوری طور پر اور جز وقتی کارکن ثابت ہو، وہ بہر حال ہر کوشش پر اجر وثواب کا مستحق تو بن ہی جاتا ہے، یقیناً اس جذبہ وخیال کے ساتھ دین کی دعوت میں مصروف رہنا سعادت مندی ہے اور کامیابی یقینی طور پر قدم بوس ہوتی ہے لیکن مخاطب کے تئیں اس اضطراب و بے چینی کی غمازی نہیں ہوتی جو جنون کی حد تک داعی کو متحرک اور فعال بنادے اور وہ مدعو کے دل کی دنیا پر حکمرانی کرنے لگے۔ اگر دعوت کو پر اثر نسخہ شفا کے طور پر پیش کرنا ہے تو محض مخصوص اوقات میں ہی نہیں اور صرف دعوت کے کام سے ہی نہیں بلکہ مدعو کے ذاتی احوال وکوائف سے دلچسپی لینا ہوگی، دیگر اوقات میں بھی اس کی خیر وخبر لینا ہوگی، اس کی پریشانیوں کو جاننا ہوگا اور حتی المقدور دست تعاون دراز کرنا ہوگا۔ داعیانہ اضطراب کو یہ چیزیں بامعنی اور قابل قدر بنادیتی ہیں۔ مخاطب قوم یا مدعو معاشرہ کے انجام بد کی بابت جس پیمانے کا داعیانہ اضطراب نبی عربی ﷺ کی سیرت پاک میں ملتا ہے اس کا عشر عشیر بھی بڑے سے بڑے قائد تحریک، بانیٔ قوم اور امیر سلطنت میں نظر نہیں آتا۔ قرآنی تصریحات آپ ؐ کی داعیانہ کردار کے اس پہلو پر پایہ استناد فراہم کرتی ہیں۔ ایک جگہ فرمایا جاتا ہے:

"لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ" (التوبۃ:۱۲۸)

(تم لوگوں کے پاس ایک رسول آگیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق گذرتا ہے تمہاری ہدایت کا وہ حریص ہے۔ ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔)

مذکورہ بالا آیت کریمہ میں آپ ﷺ کے داعیانہ اضطراب و بے چینی کی تصویر کشی نرالے انداز سے کی گئی ہے۔ مخاطبین یا مدعوئین کا تکلیف میں مبتلا ہونا اور اپنی تباہی و بربادی کا سامان کرنا نبی ﷺ کے لیے باعث قلق واضطراب ہے۔ اور اگر وہ حریص ہے تو محض اس بات کے لیے کہ گم گشتہ راہ افراد قوم ہدایت کی شاہراہ پر آجائیں۔ عامۃ الناس

کی ضلالت و گمراہی پہ آپ کی جو بے چینی ہے، اس کی دلنشیں تعبیر اس آیت کریمہ میں بھی کی گئی ہے۔

"فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفاً" (الکہف:۶)

(پس اے نبی! شاید آپ ان کے پیچھے غم کے مارے اپنے آپ کو ہلاک کر دینے والے ہیں، اگر وہ اس کلام پر ایمان نہیں لائے۔)

انسانوں کی ہدایت کے لیے آپ ﷺ کے دل میں جو کسک تھی، اس سے ایسا لگتا تھا کہ آپ انھیں راہ راست پر گامزن کرنے کی فکر میں اپنی جان بھی گنوا دیں گے۔ اس آیت کریمہ میں بھی آپؐ کی ذات گرامی ہمدردی و غمگساری اور نوع انسانی کے تئیں فکر و اضطراب کا مجسمہ نظر آتی ہے۔ ہدایت کے لیے رحمۃ للعالمین ﷺ کی بے قراری پر رب العالمین کی یہ سند ملاحظہ کیجیے:

"فَلاَ تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ"

محمد عربی ﷺ داعیٔ اعظم ہیں۔ داعیانہ تڑپ کی خوشہ چینی بھی آپ کی حیات طیبہ سے کرنا بڑی سعادت کی بات ہے۔ داعی اگر کاروباری اور بنیاگری کی ذہنیت سے خالی ہوکر رشد و ہدایت سے دور انسانوں کے لیے سعی و جہد کو اپنا شیوہ بنالے، یہاں تک کہ مدعو کے ذہن و قلب پر اس کی مخلصانہ جدوجہد اور داعیانہ اضطراب و بے قراری کے آثار نقش ہو جائیں تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ دعوت صالحہ ان لوگوں کو اپنے حلقہ بگوش کرلے گی جن کے دل میں ذرہ برابر بھی طلب و چاہت موجود ہے۔

کردار کی بلندی

کثیر المذاہب معاشرے میں دعوت کو بامقصد اور بار آور بنانے کے لیے یہ انتہائی اہم حربہ ہے کہ داعی اپنی زندگی کو ایک نمونہ کی حیثیت سے مخاطب کے سامنے پیش کرے۔ داعی اگر دیگر تمام اوصاف سے مزین ہوکر مدعو کو راہ راست پر لانے کی کوشش

کرتا ہے لیکن اس کی عملی زندگی روح اسلام سے متضاد و متصادم ہو، حقوق العباد پر تو بہت ہی لچھے دار گفتگو کرتا ہو لیکن اس کی زندگی میں اس کے والدین تک کے لیے بھی کوئی نرم گوشہ نہ ہو، معذورین اور محتاجوں کی اعانت اور انفاق فی سبیل اللہ پر اپنے تکلم و گویائی کے موتی تو خوب بکھیرتا ہو لیکن دروازے پر دستک دینے والے اور اپنی ضمیر کے خلاف دست سوال دراز کرنے والوں کو زحمت اور وبال سمجھتا ہو، غرباء، فقراء اور مساکین کے ساتھ ہمدردی و غمگساری کے نعرے بھی دیتا ہو لیکن ان کی صحبت سے نفرت کرتا ہو اور ان کی مجلسوں میں بیٹھنا اپنی ہتک عزت قرار دیتا ہو، ایفائے عہد، ادائیگی امانت اور احباب و رفقاء کے ساتھ رواداری اور توسع پر تو اپنے تکلم کے جوہر خوب دکھاتا ہو، لیکن منافقت، عیاری اور مکاری اس کا وطیرۂ حیات بن گیا ہو، اس کردار کے ساتھ دعوت کے پر اثر ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ممکن ہے ایسا داعی دنیا کے کچھ خزف ریزے حاصل کرلے، جھوٹی شہرت بھی اس کو مل جائے اور اسی قماش کے کچھ افراد بھی اس کے حاشیہ نشین بن جائیں لیکن دنیا میں بھی زبان خلق اس کو مکار اور دغا باز سمجھتی ہے اور ایسے کردار کا حامل بن کر وہ دعوت کو بھی مجروح کرنے کا سبب بنتا ہے، اس لیے آخرت کے بازار میں وہ دھوکہ کھائے گا اور اللہ کے عتاب سے بچ نہیں سکے گا۔

انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام وقت کی معزز ترین ہستیاں ہوتی ہیں۔ وہ اللہ کے انتہائی چیدہ اور محبوب بندے ہوتے ہیں۔ وقت کے ہر نبی نے مخاطب قوم کے سامنے اپنی بے داغ زندگی کو کھلی ہوئی کتاب کی شکل میں پیش کیا اور مخاطبین نبی کی زندگی اور اس کے کردار پر انگشت نمائی کرنے یا لب کھونے کی جرأت نہیں کرسکے۔ خاتم الانبیاء محمد عربی ﷺ نے بھی دعوت حق کی صحت و استناد کی دلیل کے طور پر اپنی بے داغ اور پاکباز زندگی کو مخاطبین کے سامنے پیش کیا:

"فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُراً مِّن قَبْلِهِ أَفَلاَ تَعْقِلُونَ" (یونس:۱۶)

(آخر اس سے پہلے میں تمہارے درمیان ایک عمر گذار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟)

تاریخ شاہد ہے کہ دشمنوں نے بھی کبھی رسول اللہ ﷺ کے کردار کو مطعون نہیں کیا۔ امین اور صادق کا خطاب تو نبوت سے پہلے ہی مل گیا تھا۔ نبوت کے بعد صفا کی بلندی سے دعوت حق کا اعلانیہ آغاز کیا اور تمام زعمائے باطل اور اعداء کفر کے جھرمٹ میں اپنے کردار کی سند لے لی۔ ابو جہل جیسا شخص یہ کہا کرتا تھا کہ محمد میں تمہارے اخلاق و کردار پر کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرتا جو کچھ تم کہتے ہو، وہ صحیح ہے،[۳۲] ہاں تم نے جو یہ کلمہ پڑھا ہے اس کے اثرات ہمارے خداؤں پر پڑ رہے ہیں، یہ تکلیف دہ ہے۔ دنیا کو معلوم ہے کہ فتح مکہ سے قبل تک کفر و اسلام کی جو جنگیں لڑی گئیں ان میں اہل کفر کی کمان جس کے ہاتھوں میں تھی، وہ ابوسفیان تھا۔ قیصر کے دربار میں جب کہ کوئی خوف و خطرہ نہیں تھا اور موقع تھا کہ بند کمرے میں نبی عربی ﷺ کے کردار سے قیصر کو بدظن کر دیا جائے تاکہ اس کا لشکر جرار عرب پر چڑھائی کر دے اور محمد عربی اور اس کے اصحاب کا کام تمام کر دے لیکن تاریخ نگار لکھتے ہیں اور دنیا کو یہ معلوم ہے کہ دشمن اسلام کی جانب سے ایک دشمن اسلام کے سامنے محمد عربی کے ایک خدا کے پرستار، باکردار، وعدہ وفا کرنے والے اور صدق و سچائی کے علمبردار ہونے کی شہادت ملتی ہے۔[۳۳]

دعوت و تبلیغ کا کام بہت مبارک ہے لیکن داعی کو صبر آزما مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں اگر وہ کردار کی بلندی پر ہو تو اس کے اندر جراءت و بے باکی پیدا ہوتی ہے اور مدعو کے لیے اس کا وجود مقناطیسی صفت کا حامل بن جاتا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ ہر بشر خواہ کتنا ہی بڑا بزرگ ہو غلطیوں اور گناہوں سے پاک نہیں ہوتا۔ داعی سے غلطیاں ہوں گی، لغزشیں سرزد ہوں گی اور کبھی کبھی بڑے گناہ بھی ہو جائیں گے لیکن داعی جھوٹا ہو، فریبی ہو، عیار و مکار ہو، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر داعی کو ان رذائل و خبائث کی لت لگ گئی ہو تو پھر دعوت کے کام کے لیے یہ کردار سم قاتل ہے اور داعی کے حصے میں بالآخر دنیا میں بھی ذلت ملتی ہے آخرت میں بھی رسوائی اس کا نوشتۂ تقدیر بنتا ہے۔

آسمان و زمین اور ان کے مابین تمام موجودات و مخلوقات پر قادر مطلق خدا کی فرماں روائی ہے لیکن اس دنیا کو امتحان گاہ کی حیثیت حاصل ہے جس میں ہر طرح کے

طالب علم ہوتے ہیں، لیکن ایک اچھے اور ہونہار طالب علم کی لیاقت و استعداد کے جوہر انہی طلبہ کی موجودگی میں آشکار ہوتے ہیں۔ اگر اللہ رب العزت کی مشیت یہ ہوتی کہ تمام جن وانس خدا کے تابع وفرمان ہوکر رہیں اور اس کے عطا فرمودہ طریقۂ زندگی اسلام سے وابستہ رہیں تو خدائے وحدہ لاشریک کی قدرت کاملہ سے یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی اور نہ ہی مشکل۔ اس لیے کہ اس کا ہر کام کن فیکون کے اصول کے مطابق ہوتا ہے۔ چنانچہ دنیا افکار ونظریات اور ادیان و مذاہب کی کہکشاں ہے۔ انسان کو عقل سلیم دی گئی ہے اور ہدایت کے لیے معقول انتظام بھی خالق و مالک نے کردیا ہے۔ پوری کائنات کھلی ہوئی کتاب کی شکل میں اسے ہر لحظہ اور ہر لمحہ دعوت فکر وعمل دے رہی ہے۔ اس کے باوجود اگر ایک شخص ہدایت سے منھ موڑتا ہے تو گویا اپنے خالق سے بغاوت کرتا ہے جس کے لیے امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد نتیجہ گاہ آخرت میں ابدی تباہی و بربادی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ کی ودیعت کردہ عقل سے کام لے کر رب کریم کے چیدہ ترین نمائندے انبیاء کرام کی کی تعلیمات اور ان کی سنتوں سے فائدہ اٹھا کر خاتم الانبیاء کے ذریعہ لائے گئے مکمل دین کا علمبردار اور فکر وعمل میں آپ کی سنت ثابتہ کا مؤید و مداح بن جاتا ہے، پوری کائنات سے خداشناسی کا قیمتی سبق حاصل کرکے رب حقیقی، بادشاہ حقیقی اور معبود حقیقی ؎ کا پرستار بن جاتا ہے، رب السمٰوٰت والارض کے سامنے جواب دہی کا یقین کرلیتا ہے اور دنیا کے اس امتحان گاہ کے ایک ایک لمحہ کے قابل قدر ہونے سے متعلق اس کا شعور پختہ ہوجاتا ہے تو گویا وہ ایمان وایقان کی نعمت بے بہا سے متمتع ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذریعہ انسانیت کو دیے گئے ضابطۂ زندگی اسلام کے آخری منشور قرآن مجید میں ایمان وایقان کی لاثانی اور گراں بہا دولت سے مالا مال ہونے والے افراد تمام دنیا کے انسانوں میں خیر امت، امت وسط اور شہداء علی الناس کے ربانی القاب سے نوازے گئے ہیں اور ان پر ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ اچھائیوں کا حکم دے کر اور برائیوں سے روک کر انسانیت کی قیادت کی ذمہ داری انجام دیں۔ اس بزم عالم میں تمام خودساختہ اور باطل خداؤں سے نبرد آزما ہوکر اللہ واحد کا پرستار بننا اور

انسانیت کو تمام خداؤں سے نجات دلا کر اس کے خالق حقیقی سے تعلق استوار کرنے کی جدو جہد کرنا انتہائی مسعود و مبارک عمل ہے۔ نیکیوں کا حکم دینا، خیرات وحسنات کی تلقین کرنا، مسجدوں کو آباد کرنے کی تدبیر کرنا، بلاشبہ یہ سب دینی کام ہیں اور بڑی مبارک کوششیں ہیں، لیکن دین کا یہ صرف ایک رخ ہے یا امت دعوت کی حیثیت سے فریضۂ دعوت کی انجام دہی کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا رخ یا اس عظیم الشان فرض منصبی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ برائیوں سے روکا جائے، حکمت عملی کو اس راہ کا قیمتی اثاثہ بناتے ہوئے کبھی طاقت سے، کبھی زبان سے اور کبھی دل سے برائیوں کے خلاف نبرد آزمائی ہو۔ یہ دوسرا پہلو بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا پہلا ہے یا بڑی صفائی کے ساتھ اس کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ جب تک یہ دوسرا پہلو اختیار نہیں کیا جائے پہلا قابل اعتبار ہو ہی نہیں سکتا۔ جس طرح کلمۂ طیبہ کے مقدس بول کا آخری اعلامیہ 'الا اللہ' اُسی وقت معتبر ہوتا ہے جب 'لا الٰہ' دل کی گہرائیوں سے کہا جائے۔ ہاں برائی کو برائی کہنا، برائی کے خلاف اقدام وعمل کرنا، باطل کو باطل کہنا اور طاغوت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اللہ واحد کی عبدیت کا تاج سروں پر رکھنا یقیناً ایسے اقدامات ہیں جو مصیبتوں کو دعوت دیتے ہیں، ابتلاء وآزمائش کے جاں گسل مراحل سامنے آتے ہیں، فاقے کرنے پڑتے ہیں، حرص وطمع کے دام میں گرفتار کیا جاتا ہے، دلدوز دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں، اعداء اسلام کی نگاہوں میں سرفروشانِ اسلام کا وجود شہتیر بن کر کھٹکتا ہے اور زمین اپنی کشادگی کے باوجود تنگ ہو جاتی ہے۔

اصلاح و تربیت کے نقطۂ نظر سے دعوت کا کام اپنوں میں بھی ہوتا ہے تاہم اصلاً اس مہتم بالشان فریضے کا تعلق ان بندگان خدا سے ہے جو اللہ کی عطا کی گئی مادّی نعمتوں سے تو خوب فیض حاصل کرتے ہیں لیکن باری تعالیٰ کی طرف سے طریقۂ زندگی کی شکل میں نوازی گئی روحانی نعمت سے کوسوں دور ہوتے ہیں اور احسان شناسی اور شکر گزاری کے بجائے احسان فراموشی اور بغاوت کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ عظیم ترین امانت کو صاحب امانت تک منتقل کرنے کے لحاظ سے، حق العباد کی انجام دہی کے اعتبار سے نیز مادی اور معاشرتی خوشگواریوں کے حصول کے لحاظ سے امت کے ہر فرد پر اپنی

حیثیت و بساط کے مطابق دعوت کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ بالخصوص ایسے معاشرے میں جہاں متنوع افکار ونظریات فروغ پا رہے ہوں اور مختلف ادیان و مذاہب کے نام لیوا موجود ہوں، اس فریضے کی انجام دہی میں داعی کو بڑی حساسیت کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ اپنے آپ کو ان اوصاف سے متصف کرنا پڑتا ہے جو فریضۂ دعوت کی کما حقہ ادائیگی کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں۔ تمام قسم کے مفادات سے پرے ہوکر اخلاص وللّٰہیت کا مظاہرہ، اللہ کی طرف سے دی گئی امانت کا استحضار، مداہنت اور بے جا رواداری سے احتراز، داعیانہ بے قراری واضطراب کا ثبوت اور اپنی زندگی کو مخاطب معاشرہ کے سامنے کھلی ہوئی کتاب کی شکل میں پیش کر دینے کی جرأت و بے باکی، ایسے محرکات وعوامل ہیں جو مختلف النوع افکار و مذاہب کے علمبردار معاشرے میں دعوت اور داعی کی شناخت برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ فریضۂ دعوت کی انجام دہی کو نسبتاً آسان وخوشگوار اور مؤثر و دلنشیں بنا دیتے ہیں۔

حواشی ومراجع

۱۔ مسند احمد بن حنبل: المسند، ج ۲، ص ۳۶۱

۲۔ الجامع الصحیح للبخاری، ج ۱، کتاب بدأ الوحی، ص ۲

۳۔ ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ، ج ۱، ص ۲۳۷

۴۔ سید سلیمان ندوی: الخطبات الاحمدیۃ

☆☆☆

تکثیری معاشرہ کے مسائل اور اسلام

محمد عبداللہ جاوید*

(ا) ہندوستان۔تکثیری معاشرہ

جب ہمارا ملک آزاد ہوا' اسے سنوارنے اور مثالی ترقی دینے کا ایک پاکیزہ جذبہ عام طور سے محسوس ہوا۔اور ایک ایسے مخلوط سماج کی وحدت کی تمنا بھی کی گئی جس میں مذہب' علاقہ اور زبان کے لحاظ سے بڑا فرق پایا جاتا تھا۔بالآخر بڑا ہی پرعزم فیصلہ لیا گیا کہ ہندوستان کو ایک جمہوری اور سیکولر ملک کی حیثیت دی جائے گی۔آج جبکہ ہمارے ملک کو آزاد ہوئے 66 سال ہوگئے' مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جن عزائم کے ساتھ اس ملک کی بنا ڈالی گئی تھی اس کے پیش نظر ملک کی سیاسی' سماجی' مذہبی اور تہذیبی وتمدنی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تاکہ ملک کی خیر خواہی کے لئے مطلوب صحیح جہتیں (dimensions) میسر آسکیں۔

دستور ہند

ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔اس کا اپنا ایک دستور ہے۔ یہ دستور ملک کے حکومتی اور معاشرتی نظام کا وہ مستند منشور ہے جسے اب سے 64 برس قبل متفقہ طور پر تمام شہریوں کے لئے منظور کیا گیا۔ملک کے دیگر تمام قوانین کیلئے اسی کو بنیاد بنایا گیا۔اور یہاں کے طریقۂ حکومت کیلئے اس دستور کو سند جواز کا درجہ دیا گیا۔اس دستور

---

* سابق امیر حلقہ جماعت اسلامی، کرناٹک

کی تمہید کے ذریعہ دستور کے منشا اور باشندگان ملک کیلئے متعین کئے گئے حقوق واختیارات کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

"ہم' بھارت کے عوام' بھارت کو ایک مقتدر سماج وادی سیکولر عوامی جمہوریہ بنانے کے لئے اور اسکے تمام شہریوں کو سماجی' معاشی اور سیاسی انصاف' اظہارِ خیال، عقیدہ، مذہب اور عبادت کی آزادی بہ اعتبار حیثیت اور موقع مساوات حاصل کرانے کے لئے اور ان سب کے مابین فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کو یقینی بنانے والی اخوت کو فروغ دینے کے لئے متانت وسنجیدگی سے عزم کرتے ہوئے اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج مورخہ 26 نومبر 1949ء کو ذریعہ ھذا اس آئین کو اختیار کرتے ہیں' وضع کرتے ہیں اور اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں"

اس دستور کے تحت ایک خوشحال ہندوستان کی تعمیر پیش نظر رہی۔ چنانچہ دستور کا بنیادی مقصد معاشرے کو امن وامان اور سکون کی دولت عطا کرنا اور ملک کے شہریوں اور دیگر لوگوں کو جن پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جائز حدود میں رکھنا قرار پایا۔ آئین کسی کو بھی اس سے انحراف اور تجاوز کی اجازت نہیں دیتا۔ (دیباچہ - بھارت کا آئین صفحہ ix)۔ یعنی ملک میں موجود مختلف فرقوں' مذہبوں' نسلوں' رنگوں اور زبانوں کی اہمیت کے پیش نظر' دستور ہند کے ذریعہ یہ تحفظ فراہم کیا گیا کہ ہر ایک اکائی کو خود اعتمادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے تاکہ سارے باشندے برابری کے ساتھ آگے بڑھ سکیں۔

دستور ہند کی دفعات 25, 27, 28 مذہبی آزادی کا حق دیتے ہیں۔ جن میں نہ صرف مذہب پر عمل کی اور اسکی تبلیغ کی اجازت ہے بلکہ اس سلسلہ میں کسی شخص یا اشخاص پر دباؤ ڈالنے یا مجبور کرنے سے بھی روکا گیا ہے۔ دفعات ,(1)15 ,(2)29 14 شہریوں کے مساوات سے متعلق ہیں۔ جس میں بطور خاص اس بات کا ذکر کیا گیا ہے

کہ ریاست اپنی رعایا کے ساتھ ان کے مذہب' ذات پات' مقام پیدائش وغیرہ کے مدنظر امتیازی سلوک کی مجاز نہ ہوگی۔ دفعہ 16(1) اور (2) میں ملازمت اور ریاستی سطح کے تقررات کیلئے تمام شہریوں کے یکساں حقوق تسلیم کئے گئے ہیں۔ تمام اقلیتوں کو چاہے مذہبی ہوں یا لسانی' تعلیمی اداروں کے قیام اور ان کے نظم وانصرام کا پورا اختیار دفعہ 30 (1) کے ذریعہ دیا گیا ہے۔

یوں ہندوستان دنیا کے موجودہ جمہوری ملکوں میں پہلا ملک بنا جس نے مختلف فرقوں کے اجتماعی حقوق کو یقینی بنایا اور ان کی بازیابی کیلئے خصوصی مراعات متعین کئے۔

تکثیری سماج

جس معاشرہ میں دو یا اس سے زائد تہذیبی اکائیاں ہوں اسے تکثیری سماج کہا جاتا ہے۔ جس میں مختلف نسلی' مذہبی' لسانی' ثقافتی اکائیاں شامل ہیں۔ اس ضمن میں یہ بھی لازم بتایا جاتا ہے کہ ان تہذیبی گروپوں کا کلچر اور علاقہ پوری طرح واضح ہو۔ دنیا میں کئی ممالک تکثیری سماج کی نمائندگی کرتے ہیں جیسے ریاست متحدہ ہائے امریکہ' سری لنکا' تھائی لینڈ' انڈونیشیا اور پاکستان۔ بلاشبہ ہمارا ملک اس لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔

تکثیری سماج کی خصوصیات

الحمدللہ ہمارا ملک' دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ ہمارا معاشرہ مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ *Anthropological Survey of India* کے مطابق 127 کروڑ کی آبادی والے اس ملک میں باشندوں کی تقسیم' مذہبی' لسانی' نسلی اور ثقافتی لحاظ سے کی جاتی ہے۔ یہاں 4599 مختلف قومیں پائی جاتی ہیں۔ 325 زبانیں اور 1652 انداز کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ کل 21 زبانوں میں 5600 روزنامے' 15,000 ہفتہ روزہ اور 20,000 ماہانہ اخبارات اور رسائل نکلتے ہیں جن کی مجموعی تعداد اشاعت تقریباً 14 کروڑ ہے۔ 372 یونیورسٹیاں' 1,500 تحقیقی ادارے' 10,428 اعلیٰ

تعلیمی اداروں کے ذریعہ ہر سال 2لاکھ انجینئرز اور دیگر 3لاکھ تکنیکی لحاظ سے ماہر گریجویٹس تیار ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ تعلیم کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے 2لاکھ گریجویٹس ہر سال تیار ہوتے ہیں ۔امریکہ کے جملہ ڈاکٹرس میں سے 38% ہندوستانی ہیں جبکہ سائنسدانوں میں 12% ہیں۔ہمارا ملک انجینئرز اور سائنسدانوں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے جبکہ اس ملک کی تقریباً ڈیڑھ لاکھ کی فوجی طاقت اسے دنیا کا تیسرا بڑا ملک بناتی ہے۔اس ملک کی ریلوے لائن اور پوسٹل سروس کا دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام ہے۔ہندوستانی سماج کی یہ ہمہ رنگی اسے دنیا کے دیگر ممالک سے نمایاں طور پر ممتاز کردیتی ہے۔

اس ملک میں اسمبلی اور پارلیمانی انتخابات جمہوری طرز پر بڑے منظم اور باقاعدگی کے ساتھ ہوتے آرہے ہیں۔

ہندوستان میں تمام شہریوں کے لیے شادی بیاہ، طلاق وغیرہ کے سلسلہ میں کوئی مشترکہ قانون نافذ العمل نہیں ہے۔ البتہ یہاں کا نظام قانون، مخلوط سماج کا نمائندہ ہے۔اور ہر مذہب کے ماننے والوں کیلئے ان کے اپنے پرسنل لاء کا تعین کرتا ہے۔

10 ہزار سالہ ہندوستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس ملک نے کبھی کسی دوسرے ملک پر قبضہ نہیں کیا۔ بڑا خوش آئند پہلو یہ بھی ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی آبادی والے ملک چین سے ہم نے آزاد جمہوریت (*liberal democracy*) میں تقریباً 9% زائد ترقی کی ہے۔یعنی چین کی بہ نسبت جمہوری قدروں کے تئیں کام کی گنجائش ہمارے ملک میں زیادہ پیدا ہوتی ہے۔

ملک کی یہ ترقیاں' کارنامے اور مخلوط سماج کی خصوصیات بڑی قابل تحسین ہیں۔اس لیے کہ یہ تمام ترقیاں ایک ایسے ملک میں ممکن ہوسکیں ہیں جو مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ہمارے ملک کے بعض داخلی اور خارجی مسائل ہیں جیسے فسادات' بین الریاستی تنازعات' قریبی ممالک کی دراندازی' جنگیں وغیرہ۔

لیکن اس ملک کے اس روشن باب کا دوسرا پہلو بڑا تشویشناک ہے۔اور اس

تشویشناک صورت حال کو ہم ہندوستان جیسی فلاحی ریاست کے تصور کے پیش نظر دیکھتے ہیں، ایک ایسی ریاست جس کی ذمہ داری تمام ہی شہریوں کی بنیادی ضروریات کی تکمیل ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ اس کا انتہائی سنجیدگی کے ساتھ جائزہ واحتساب ہونا چاہئے۔

تکثیری سماج کے مسائل کی نوعیت

تکثیری سماج کے مسائل کی تعریف - ایسے سماج میں مسائل کی نشاندہی اس وقت ممکن ہے جب کہ لوگوں کی ایک قابل لحاظ تعداد معروف سماجی اقدار سے منحرف ہوجائے۔ یعنی تکثیری سماج کے مسائل' وہی مسائل ہیں جو ایک قابل لحاظ تعداد کے اجتماعی رویے کو ظاہر کرتے ہیں چاہے وہ بنیادی معروف اقدار سے انحراف ہو یا دستوری تحفظات سے جو کہ ایک فلاحی ریاست کیلئے ضروری قرار دیئے گئے ہیں۔ اس طرح تکثیری سماج کے مسائل ملک، سماج اور عوام سے متعلق ہوں گے۔ سماجی نابرابری' اخلاقی گراوٹ' قومی یکجہتی کا فقدان، معاشی وسیاسی بدحالی وغیرہ۔ ان سے متعلق وہ تمام چھوٹے بڑے مسائل بھی شمار ہوں گے جو ان بڑے مسائل پر راست یا بالراست اثر انداز ہوتے ہوں یا پھر ان بڑے مسائل کے کڑوے کسیلے پھل ہوں۔ تکثیری سماج کے مسائل کی اس نوعیت کے پیش نظر یہاں گفتگو کی جارہی ہے۔

تکثیری سماج کے مسائل

تکثیری سماج کی مکمل صورت حال کا جائزہ یہاں ممکن نہیں۔ کوشش کی جائیگی کہ چند اہم امور اور انسانی زندگی سے گہرا تعلق رکھنے والے شعبوں کے حالات کا مختصراً جائزہ پیش کیا جائے تاکہ ان کی روشنی میں دین اسلام کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا جاسکے۔

(۲) انسانی عظمت کا حال

خالق سے ناواقفیت - ہمارے ملک میں اسوقت 127 کروڑ سے زیادہ

انسان بستے ہیں۔ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اپنے حقیقی خالق و مالک سے ناواقف ہیں۔انہیں بالکل نہیں معلوم کہ کس نے انہیں پیدا کیا ہے؟ خالق کا ان سے کیا اور کیسا تعلق ہے؟ انہیں دنیا میں کیا کام کرنا ہے؟انسانوں کے درمیان کس قسم کا رشتہ ہے؟ اوران کے روزمرہ کے کاموں کا آخرکوئی حساب کتاب ہوگا کہ نہیں؟ مرنے کے بعدان کا پیدا کرنے والا ان سے کیا پوچھے گا؟ گرچہ یہ سوالات بحیثیت مسلمان کے ہمیں زیادہ متاثرنہیں کرتے کیونکہ کم وبیش ان کے مطابق زندگی گذاری جاتی ہے لیکن اگرکسی خدا کے نہ ماننے والے کی جگہ رہ کر سوچا جائے تو ان سوالات کی حیثیت اندھیرے میں بھٹکنے والے شخص کی سی ہوگی۔

زندگی اورآخرت سے متعلق ان سوالات کے تحت انسانوں کی تربیت کا اوران کے مزاج کو بنانے کا کوئی باضابطہ کام نہ ہوسکا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج مختلف مناصب پر فائز ذمہ داروں کی اکثریت ان افراد کی ہے جنہیں نہ تو خدا کا صحیح پتہ ہے اور نہ ہی جواب دہی کا احساس۔ چنانچہ ان کی خدمات میں بددیانتی' خیانت اور تساہل جیسی اخلاقی برائیاں پروان چڑھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سماج میں فساد پھیلنے لگا۔اورآج بھی اس فساد کے پھیلنے کا سلسلہ رکا نہیں۔مختلف قسم کی سماجی برائیوں کی صورت میں یہ سماجی فساد اجاگر ہوتا رہتا ہے۔اوراس فساد کا علم بردار وہی خدا سے غافل انسان بنا ہے۔

سماجی نابرابری - سماجی نابرابری' سماجی ڈھانچہ کی ایک آفاقی حقیقت تسلیم کی جاتی ہے۔سماجی نابرابری کے معنی انسان کے وضع کردہ عدم مساوات کے وہ معیارات ہیں جو سماجی' سیاسی' معاشی' مذہبی اور ثقافتی امور سے متعلق ہیں۔

سماجی ڈھانچہ تاریخ کے مختلف ادوار میں حالات کے لحاظ سے بدلتا رہا ہے۔ لیکن سماجی نابرابری کسی نہ کسی درجہ میں قائم رہی۔قدیم یونانی تہذیب ہو یا قرون وسطی کی تہذیب، سماج میں انسانوں کی تقسیم کی پتا دیتی ہیں۔قرون وسطی ہی کے سماجی نابرابری کو برقرار رکھے ہوئے ہیں ماضی قریب کی دو بنیادی قسمیں ہیں۔ایک مغربی معاشی سماج (*western capitalist society*) اور دوسرا مشرقی یورپ کا اشتراکی سماج۔انسانوں کی

مختلف طبقات میں تقسیم (social stratification) سماجیات کے مطالعہ کی ایک اہم جہت ہے۔جس کی تعریف میئر (Mayer) یوں کرتے ہیں:

social stratifcation referes to an arrangement of position in a graded hierarchy of socially superior and inferior ranks

سماجی تقسیم مختلف ہیئتوں میں مقام و مرتبہ کو منظّم کرنے کا ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ سماجی اعتبار سے برتر اور کم تر کی درجہ بندی ہوتی ہے۔

زمانہ دراز سے اس سماجی نابرابری نے معاشرہ پر بڑے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔بطور خاص معاشی و سماجی اعتبار سے ملک کے بعض اضلاع کی حالت بڑی دگرگوں ہے۔بہار، اتر پردیش، جھارکھنڈ، اڑیسہ، ارونا چل پردیش، مدھیہ پردیش اور کرناٹکا کے کل 69 اضلاع 268.1 ملین غریب، 27.3 ملین بھوکے، 302.5 ملین ناخواندہ، 12.2 ملین بچوں کو طبی سہولیات بہم نہیں پہنچتی جبکہ 1.8 ملین بچے پیدا ہوتے ہی مرجاتے ہیں۔

قدیم سماجی نظام - آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی قدیم سماجی نظام کے تحت ظلم و جبر سے انسانوں کو انسانی شرف سے محروم رکھا جاتا ہے، صرف اس لئے کہ وہ نچلی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ضلع بیجاپور، تعلقہ باگے واڑی کے کڈکول گاؤں میں اونچی ذات والوں نے 80 دلت خاندانوں کا سماجی اور معاشی بائیکاٹ کیا۔ان کا قصور صرف یہ تھا کہ شہر کے کنوئیں سے انہوں نے پانی لینے کی جرات کی تھی۔میسور ضلع کے کامنا کیرا ہنڈی گاؤں میں 8 دلت خاندانوں کو شہر سے پانی لینے، دکان سے سودا سلف لینے کی اجازت نہیں ہے جس کی وجہ سے بڑی کسمپرسی کی حالت میں یہ خاندان زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوا۔(دکن ہیرالڈ - ۱۴ ڈسمبر ۲۰۰۶)۔یوں پچھڑے طبقات کے خلاف نفرت کا عام ماحول اور انہیں انسانی شرف سے کمتر سمجھنے کی روایت (ostracism) دن بہ دن روبہ ترقی ہے۔

بڑی مضحکہ خیز بات ہے کہ جرم کرنے والوں کے سلسلہ میں اقدامات بھی ذات

پات کی بنیاد پر ہونے لگے ہیں۔ اگر نچلی ذات کہے جانے والے لوگ کسی جرم میں ملوث ہوں تو بغیر کسی تاخیر کے کارروائی کی جاتی ہے اور وہی اگر اونچی ذات کہے جانے والے لوگ ملوث ہوں تو ویسی توجہ نہیں دی جاتی۔ اس کا واضح ثبوت حال ہی میں پیش آئے دہلی کی عصمت دری کا واقعہ ہے۔ اس واقعہ کو لے کر کتنا ہنگامہ مچایا گیا سب جانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں یہ ایک واحد واقعہ ہوا ہے کہ جس پر اتنا ہنگامہ مچانے کی نوبت آئی؟ گجرات' شمالی مشرقی ریاستوں اور ملک کے دیگر مقامات پر ہونے والے واقعات کو اتنا ہی سنگین کیوں نہیں سمجھا گیا؟ اس سلسلہ میں جو تبصرے ہوئے ہیں ان میں نمایاں بات ذات پات ہی کے نظام سے تعلق رکھتی ہے اور کچھ حد تک مختلف سطح کے "حکومتی ذمہ داروں" کے ملوث ہونے کی۔

NCRB کی جانب سے 2005 کی رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ قبائیلی لوگوں پر ظلم و جبر کے 161 معاملات درج کئے گئے ہیں۔ ریاست کرناٹکا میں گذشتہ چند سالوں سے تقریباً 200 قبائیلی خاندانوں کو ناگرہول نیشنل پارک سے دوسری جگہ منتقل کردیا گیا ہے تاکہ ان مقامات پر جنگل میں قیام گاہیں (*jungle lodges*) قائم کی جاسکیں۔ 1972 سے اب تک تقریباً 1600 خاندانوں کو بے گھر کردیا گیا ہے۔ (دکن ہیرالڈ - ۷ جون ۲۰۰۶)

(۳) بنیادی حقوق سے محرومی

لا اینڈ آرڈر کی صورت حال۔ ہمارے ملک میں قانون کی حکمرانی (*rule of law*) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس ضمن میں لا اینڈ آرڈر اور عدلیہ کا رول بالکل واضح ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہلانے والے اس ملک میں ان کے رول کو مزید بہتر بنانے اور اس میں نکھار لانے کی شدید ضرورت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ لا اینڈ آرڈر کی حالت دن بہ دن ابتر ہوتی جارہی ہے۔ کمزور طبقوں پر زیادتیوں کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ بے قصور لوگوں کی گرفتاری' جیلوں میں بند لوگوں پر ظلم و جبر کے واقعات آئے دن

پیش آتے رہتے ہیں۔حتی کے زیر حراست اموات اور کھلے عام فائرنگ کے کئی واقعات پیش آئے ہیں لیکن قصور وار افسران کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی (دکن ہیرالڈ۔ ۲۳ مارچ ۲۰۰۶)۔

اسی طرح عدلیہ کے رول پر بھی توجہ ضروری محسوس ہوتی ہے۔ایک تو یہ کہ عدالت میں پیش کردہ معاملات کی شنوائی بڑی دشوار ہوتی جارہی ہے۔تاریخوں پر تاریخیں بڑھتی جاتی ہیں اور شنوائی کیلئے ایک لمبی مدت انتظار کرنا پڑتا ہے۔فاسٹ ٹراک کورٹ کے قیام کے باوجود بھی صورت حال ویسی ہی ہے۔عدل وانصاف کا حصول آج مہنگے سے مہنگا تر ہوتا جارہا ہے۔ریاست کرناٹکا میں سال 2006 میں درج معاملات کے اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ 91,967 معاملات ہائی کورٹ میں اور 10,66,131 معاملات ضلعی کورٹ میں زیر سماعت ہیں جن کے سلسلہ میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔

(court news, october - december 2006, The Supreme Court of India)

غربت - سماجی نقطہ نظر سے غربت کا مطالعہ مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے۔ تین امور کے تحت غربت کا پتا لگایا جاتا ہے (الف) گذر بسر کیلئے درکار رقم کا نہ ہونا (ب) کم سے کم ضروریات زندگی کی عدم تکمیل یا رائج الوقت معیار زندگی سے کم تر زندگی بسر کرنا (ج) معاشرہ کے چند خوشحال اور اکثریت کی بدحالی کے تقابلی مطالعہ کے ذریعہ۔ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں غربت کا بڑا برا حال ہے۔ایک اندازے کے مطابق 77% عوام ایسی ہے جو دن میں تقریباً 70 روپے کماتی ہے۔ ان کا گزر بسر کیسے ہوگا' سمجھنے میں مشکل نہیں ہوگی۔ یہ بات جو بتائی جاتی ہے کہ ملک کی معیشت میں بہتری آرہی ہے تو اسکا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اس معاشی معجزہ (economic miracle) سے مستفید ہونے والے بقیہ 30% عوام میں سے ہوں گے۔معاشی میدان میں حقیقی ترقی وہ ہے جس سے یہاں کا ہر باشندہ اپنی ضروریات کی تکمیل اور اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لئے مستفید ہوتا رہے۔لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے۔ چند سالوں کے اندر ہزاروں کی

تعداد میں کسانوں نے خودکشی کرلی ہے۔مرکزی وزارت کے مطابق 2000 تا 2005 کے درمیان 8663 کسانوں نے خودکشی کی ہے۔(دکن ہیرالڈ - ۹ جنوری ۲۰۰۶)۔ ریاست کرناٹکا میں 2006، اپریل تا ڈسمبر کے درمیان 134 کسانو ں نے خودکشی کی ہے۔(دکن ہیرالڈ - ۲۰ ڈسمبر ۲۰۰۶)۔یہ تو وہ اعداد و شمار ہیں جو منظر عام پر آنے والے واقعات کی بنا پر درج کرائے گئے ہیں جبکہ ایسے کسانوں کی تعداد لاکھوں میں ہے جو بس جینے کو جی رہے ہیں۔کسانوں کی خودکشی کے واقعات کی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ اس کی اصل وجہ سودی قرض اور فصلوں کا وقت پر حاصل نہ ہونا ہے۔

انڈیا ٹوڈے کے سروے کے مطابق بہار کے 37 اضلاع میں سے 27 اضلاع غربت کے دائرے میں آتے ہیں' ان میں سے 36 اضلاع میں بچوں کیلئے طبی سہولیات نہیں ہیں، 31 اضلاع میں بنیادی تعلیم کیلئے اسکولوں کی کمی ہے۔جھارکھنڈ میں 22 اضلاع غربت کے دائرے میں آتے ہیں جبکہ ان میں سے 10 اضلاع بری طرح متاثر ہیں، 14 اضلاع میں غذا کی کمی پائی جاتی ہے۔اڑیسہ کے 30 اضلاع میں سے 10 اضلاع انتہائی غربت کے دائرے میں شمار کئے جاتے ہیں۔اتر پردیش کے 70 اضلاع میں سے 23 اضلاع غربت کا شکار ہیں اور 30 اضلاع میں بچوں کیلئے طبی سہولتیں مہیا نہیں ہیں۔ مدھیہ پردیش کے 45 اضلاع میں سے 22 انتہائی غریب اضلاع شمار کئے جاتے ہیں اور 39 اضلاع میں شیر خوار بچوں کی اموات کی شرح زیادہ ہے۔اروناچل پردیش کے 14 اضلاع میں سے 3 اضلاع انتہائی غربت کا شکار ہیں' 9 اضلاع میں بھوکے لوگوں کی کثرت ہے' 8 میں طبی سہولتوں کی کمی اور 7 میں ناخواندگی زیادہ ہے۔کرناٹکا کا ایک ضلع گلبرگہ غربت سے بری طرح متاثر ہے جہاں کا ہر دوسرے میں کا ایک سطح غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہا ہے۔

غربت کے کئی اسباب بتائے جاتے ہیں۔شخصی اسباب میں بیماری' دماغی عدم توازن' حادثات' ناخواندگی' سستی و کاہلی' اسراف وغیرہ۔بعض جغرافیائی اسباب بھی ہوتے ہیں جیسے ناسازگار موسم اور آب و ہوا' قدرتی وسائل کی عدم دستیابی' قدرتی آفات۔معاشی

اسباب میں زراعت و آب پاشی کے مسائل، دولت کی تقسیم میں بے احتیاطی، ناقص ترقی، گرانی، مالیہ کی کمی، تجارت کا ماند پڑ جانا، بے روزگاری وغیرہ۔ غربت کے بعض سماجی اسباب بھی ہوتے ہیں۔ جیسے ناقص نظام تعلیم، رہن سہن کا غیر صحت مند طریقہ، تربیت کی کمی، خرافات وتوہم پرستی، طبی سہولتوں کی عدم دستیابی، طبقاتی نظام، بالغ ناخواندہ وغیرہ۔ سیاسی وجوہات میں سے فسادات، جنگیں، بین الریاستی تنازعات، ناقص سیاسی نظام قابل ذکر ہیں۔

حکومت نے غربت کے ازالہ کے لئے بعض اقدامات کئے ہیں۔ پنچ سالہ منصوبہ اس ضمن میں حکومت کا ایک ٹھوس قدم مانا جاتا ہے۔ 1951 سے اس کی شروعات ہوئی اب تک کئی پنچ سالہ منصوبہ بنائے گئے۔ 1975 میں 20 نکاتی پروگرام وضع کیا گیا۔ قحط زدہ علاقوں کی ترقی کیلئے خصوصی منصوبہ بندی کی گئی۔ دیہاتوں کی ترقی کیلئے منصوبے بنائے گئے۔ 1976 سے روزگار کے سلسلہ میں دیہاتوں کے نوجوانوں کی تربیت کا آغاز ہوا۔ قومی سطح پر دیہاتیوں کیلئے روزگار پروگرام بنایا گیا۔ جواہر روزگار یوجنا جیسے اقدامات غربت کے ازالہ میں قابل قدر مانے جاتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے غربت کے ازالہ میں خاطر خواہ پیش رفت نہ ہوسکی۔ جسکی اہم وجوہات میں حکومتوں کی تبدیل اور حکومتی اسکیموں کو نافذ کرنے کیلئے ہمہ جہت تفصیلی منصوبہ بندی کی کمی قابل ذکر ہے۔

(۴) اخلاقی صورت حال

عریانیت اور بے راہ روی۔ عریانیت اور بے حیائی کا یہ عالم ہے کہ گلیاں سڑکیں تو عریاں منظر پیش کرتے تھے ہی اب گھروں میں بھی الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ عریاں پن عام ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس لئے سیکس انڈسٹری اب کھربوں روپیوں کا کاروبار بن گئی ہے۔ انٹرنیٹ پر عریاں مواد دیکھنے والوں کی تعداد 2010 تا 2012 کے درمیان دگنی ہوگئی ہے۔ اور ہر پانچ میں سے تیسرا اپنے 3G موبائیل پر فحش مواد کا خواہش مند بتایا جاتا ہے۔ روزانہ تقریباً 47% طلبا فحش و بے حیائی سے متعلق گفتگو کرتے

ہیں۔(انڈیا ٹوڈے - ۱۸فروری۲۰۱۲ء)

ہمارے ملک کا ایک باوقار سرکاری ادارہ' (National Crime Record Bureau - NCRB) نے مختلف جرائم سے متعلق حسب ذیل اعداد وشمار منظر عام پر لایا ہے۔جس کیلئے ان 35 بڑے شہروں (mega city) کا سروے کیا گیا جہاں کی آبادی 10 لاکھ سے زائد ہے۔ان شہروں میں ہونے والے جرائم میں سے:

عصمت دری کے واقعات 33.2% ہیں۔اغوا کرنے کے واقعات 37.4% ہیں۔ جہیز کیلئے اموات 19.1% ہوئی ہیں۔ عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کے 23.1% واقعات ہوئے ہیں۔اس صورت حال میں میڈیا کے صحت مند رول کے ذریعہ حالات پر بڑی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے لیکن انتہائی افسوس کی بات ہے کہ میڈیا کا رول بھی حالات میں مزید بگاڑ کا سبب بن رہا ہے۔

کرپشن - کرپشن اس قدر سماج میں رچ بس گیا ہے' ایسا لگتا ہے کہ اسے پوری طرح تسلیم کرلیا گیا ہے اور یہ عنقریب ہمارے سماج کا ایک حصہ بن جائے گا۔ (ٹائمس آف انڈیا - ۳نومبر۲۰۱۲ء)۔ ہندوستان کے ایک موقر جریدے کی یہ گواہی بتارہی ہے کہ ہندوستانی معاشرہ میں کرپشن انسانی جسم میں خون کی طرح دوڑ رہا ہے۔ 1940 کے دہے میں jeep scandal منظر عام پر آیا تھا۔جس کے تحت 80 لاکھ روپیوں کی لاگت سے فوجیوں کیلئے خریدی جانے والی جیپوں میں دھاندلی ہوئی تھی۔اس کے بعد سے لگاتار ہر دو چار سالوں میں کوئی نا کوئی بڑا گھپلہ منظر عام پر آتا رہا ہے۔اب تک سینکڑوں سکینڈلز منظر عام پر آچکے ہیں۔حال ہی جو بڑے بڑے گھپلے ہوئے ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے:

(1) Uttar Pradesh Food Grain Scam, 35,000 Crore - 2003

(2) 2G Spectrum Scam, 1,76,000 Crore - 2010

(3) Uttar Pradesh National Rural Health Mission Scam 10,000 Crore - 2012

(4) Karnataka Waqf Board Land Scam 2,00,000 Crore - 2012

(5) Indian Coal Mining Controversy 1,85,591.34 Crore - 2012

اس کے علاوہ رشوت کا لین دین ہر سطح پر عام ہے۔اس سلسلہ میں اصولی بات یہ بتائی جاتی ہے کہ ہر 100 روپیوں میں 70 روپئے ہی استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ کرپشن اصل میں انسان کی مجرمانہ ذہنیت کا نام ہے۔ جب ذہن ہی کرپٹ ہو تو معاملات کیونکر شفاف ہو سکتے ہیں۔نہ صرف معاشی لین دین میں ہیر پھیر ہوگی بلکہ مختلف شعبہ ہائے حیات میں اس کا پرتو نظر آئے گا۔چنانچہ کرپشن کے وسیع تر مفہوم کے پیش نظر ماہرین سماجیات کرپشن کے خدوخال (*anatomy of corruption*) کی وضاحت کرتے ہیں کہ یہ تہذیب وتمدن' علوم وفنون سے لیکر روز مرہ کے معاملات تک پھیل گیا ہے۔فائن آرٹ،لٹریچر،سینما،پریس،میڈیا،مذہبی معاملات،انتظامیہ،لا اینڈ آرڈر،خود مختار تنظیمیں،تعلیم،ان سب میدانوں میں کرپشن مختلف صورتوں میں رچ بس گیا ہے۔

حکومت نے کرپشن کی روک تھام کیلئے کئی قوانین بنائے ہیں۔کئی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔حکومت ہند کی جانب سے 1947 میں *prevention of corruption act* وضع کیا گیا۔1962 میں سنتھانم کمیٹی تشکیل دی گئی۔سیکیورٹی،نگہداشت اور انٹیلی جنز ڈپارٹمنٹس کو کرپشن کی روک تھام کی خصوصی ذمہ داری دی گئی۔ریاستی سطحوں پر لوک پال اور لوک آیوکتا کے قیام کی سفارش کی گئی۔ علاوہ ازیں مختلف شعبہ ہائے حیات میں اصلاحات کی سفارشات کی گئیں۔لیکن اس ضمن میں بھی قوانین کے نفاذ کیلئے وہی دشواریاں محسوس کی گئیں جو اس سے قبل کے مسائل کے سلسلہ میں بیان کی جا چکی ہیں۔

فرقہ واریت - ذات پات اور چھوت چھات کے نظام کو قائم رکھنے' ایک مخصوص طبقہ کی بالا دستی برقرار رکھنے' باشندگان ملک کے درمیان بے جا نفرت وعداوت کو فروغ دینے کے لئے فسطائی قوتیں ہمارے ملک میں مصروف ہیں۔تقریباً چھ سات دہوں کی کوششوں کے بعد یہ فسطائی قوتیں (فاشزم) ایک منفی تحریک کے طور پر سامنے آئی ہیں۔فاشزم ملک کی جمہوری وسیکولر ساخت کے لئے ایک زبردست خطرہ کی حیثیت

رکھتا ہے۔آزاد ہندوستان کی تاریخ کے دو بڑے واقعات بابری مسجد کی شہادت اور شرمناک گجرات فسادات کے پیچھے یہی قوتیں کارفرما رہی ہیں۔ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے خلاف زہر اگلنا' عبادت گاہوں کے سلسلہ میں گمراہ کن باتیں پھیلانا' مذہبی معاملات کو ہوا دے کر فسادات کرانا' دہشت گردی کا ہوا کھڑا کرنا ان کی حکمت عملی کا حصہ ہیں۔نفرت وعداوت اور باہمی عدم اعتماد کے ماحول کی وجہ سے جمہوری قدروں کی بری طرح پامالی ہورہی ہے۔قانون کی حکمرانی کا معاملہ بھی بڑی حد تک تشویشناک صورت اختیار کرگیا ہے۔ بظاہر بین ثبوت ملنے کے بعد بھی خاطیوں کے خلاف قابل ذکر کارروائی نہیں کی گئی ہے۔گودھرا' مکہ مسجد بلاسٹ' مالیگاؤں بم دھماکوں میں ان فسطائی قوتوں کے ملوث ہونے کے واضح ثبوت ملے ہیں۔یہاں تک کہ ملک کے سابق وزیر داخلہ شندے جی کے حالیہ بیان نے ایک طرح سے فسطائی قوتوں کے انسان دشمن چہرہ پر مہر لگادی ہے۔لیکن اس کے باوجود قانون کی حکمرانی نہیں بلکہ فسطائی طاقتوں کا زور زیادہ محسوس ہونے لگا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے سلسلہ میں یہ بھی گمراہ کن افواہ پھیلائی جاتی ہے کہ یہ پڑوسی ممالک سے یہاں آئے ہیں۔لہذا انہیں ہندوستانی شہری ہونے کا حق حاصل نہیں ہے۔بطور خاص شمال مشرقی ریاستوں میں وقتاً فوقتاً ہندوستانی شہریت کو بھی موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ یہاں کوئی بھی کسی کے بھی خلاف غیر ملکی ہونے کا الزام تھوپ سکتا ہے۔مسلمانوں کے سلسلہ میں کہا جاتا ہے یہ بنگلہ دیشی گھس پیٹھی ہیں۔یہ گھس پیٹھی کا معاملہ کیا ہے اور اس میں کس قدر حقیقت ہے؟اس پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔

تشدد وفسادات - گرچہ ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے، یہاں کے باشندوں کو دستور ہند، ملک کی سالمیت اور یکجہتی برقرار رکھنے کیلئے اہم ذمہ داری تفویض کرتا ہے ۔لیکن اس کے باوجود آزادی کے بعد ہی سے بڑے بڑے بین المذاہب فسادات رونما ہوئے ہیں۔ ہندوستان جیسے جمہوری ملک کیلئے یہ فسادات ایک بڑے خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ جب بھی چھوٹے بڑے فسادات ہوئے ہیں، اس ملک کے اس سیکولر اور جمہوری ڈھانچہ کو ہی زیر بحث لایا گیا ہے۔ملک کی ہمہ جہت

ترقی، تمام ہی باشندوں کے باہمی ربط و تعاون ہی سے ممکن ہے، فسادات اس ضمن میں بڑی رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں فسادات کا آغاز انیسویں صدی کے وسط سے ہوا۔ پھر اسکے بعد کئی فسادات ہوئے۔ متحدہ ہندوستان کی تقسیم کے موقع سے 1947 کے فسادات۔ 1961 میں جبل پور مدھیہ پردیش کے فسادات، 1969 میں احمد آباد کا فساد، سکھ مخالف فسادات 1984، میرٹھ کا فساد 1987، بھاگل پور فساد 1989، ممبئی فساد 1992، گجرات فسادات 2002 (ہندوستان ٹائمز نومبر 2011) چھتیس گڑھ، مدھیہ پردیش اور جھارکھنڈ میں نکسلیوں کا فساد۔ آسام فسادات 2012، مظفر نگر فساد 2013۔ ان کے علاوہ کہا جاتا ہے آزادی کے بعد سے تقریباً 50 ہزار چھوٹے بڑے فسادات ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ تشدد کے واقعات بھی وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہے ہیں۔ عبادت گاہوں اور اہم مقامات پر بم دھماکے ہوئے جن سے جانی مالی نقصان کے علاوہ لوگوں کا آپسی اعتماد و بھائی چارہ بری طرح متاثر ہوا۔

مذہبی استحصال کا نیا دور - روحانیت - جس دور میں ہم رہتے ہیں وہ ایک طرح سے روحانیت کا دور بھی ہے۔ ہندوستانی عوام میں مذہب سے بڑا خاص لگاؤ تو پایا ہی جاتا ہے، لیکن دور حاضر کی نئی روحانی تحریکوں (*neo-spiritual movements*) نے مختلف میدانوں میں مذہبی جذبات کو نت نئے رنگ میں ڈھال دیا ہے، اور اس کے لئے وہ مسلسل کوشاں ہیں۔ دفتر سے لیکر بستر مرگ تک اور گھر سے لیکر بازار تک شاید ہی کوئی گوشہ بچا ہو جس کے لئے یہ نام نہاد تحریکیں اور اس سے وابستہ افراد مصروف نہ ہوں۔ زندگی کے ہر معاملہ کو روحانیت سے جوڑ دیا جارہا ہے، روحانی تحفے، روحانی غذائیں، روحانی کتابیں، روحانی رہنما، روحانی موسیقی نہ جانے اور کیا کیا؟۔ مختلف ٹی وی چینلوں کے ذریعہ بعض مخصوص دواؤں اور خاص قسم کے زیور یا پتھر وغیرہ کے اشتہارات بڑے پیمانے پر نشر ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان دواؤں کے استعمال سے بانجھ پن، شکر کی بیماری، گنجا پن، موٹاپا، نامردی جیسے امراض و مسائل سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ بھولی بھالی عوام ان کے جھانسے میں آجاتی ہے۔ اب یہ معاملہ اتنا سنگین ہو چکا ہے کہ بعض

ریاستوں میں تو باضابطہ drugs and cosmetics rules کے تحت ان ٹی وی چینلوں کے خلاف قانونی کارروائیاں کی جارہی ہیں۔(انڈین ایکسپریس ۴ جنوری ۲۰۰۴)۔

ایک گمراہ کن افواہ جو چند دنوں پہلے تک بڑے اہتمام سے پھیلائی جارہی تھی کہ 21 دسمبر 2012ء کو دنیا کا خاتمہ ہوجائے گا' عوام کو بے وقوف بنانے اور اپنی دکان چمکانے کی ایک ایسی ہی ترکیب محسوس ہوتی ہے۔اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ لوگوں کی بھاری اکثریت کو یہ باور کرایا جارہا ہے کہ تمام مسائل کا حل اور الجھنوں سے نجات مخصوص انداز سے زندگی گذارنے' ہنسے ہنسانے' تالیاں بجانے اور صبح و شام ورزش کرنے سے ممکن ہے۔چنانچہ اس ضمن میں کئی انجمنیں اور تنظیمیں وجود میں آئیں۔ laughter clubs, clap clubs, holistic lifestyle club وغیرہ۔نادانوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ صحت مند ہندوستان کیلئے صرف لوگوں کا صحت مند رہنا ضروری ہے' چاہے انسانی اخلاق کتنے ہی پست کیوں نہ ہوجائیں۔حقیقت یہ ہے کہ روح کے مطالبات کی تکمیل میں ہمیشہ سے ایسی بے اعتدالیاں ہوتی رہی ہیں۔اور ہندوستان جیسا تکثیری سماج گویا اسکی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔

(۵) حکومت کی نااہلی

عالمی استعمار کے آگے سپر اندازی - ہمارا ملک دھیرے دھیرے غیر جمہوری نظام معیشت کا حصہ بنتا جارہا ہے' جس میں غلبہ ان اداروں اور کمپنیوں کا ہے جو امریکہ اور یوروپ سے متعلق یا ان کے زبردست حمایتی ہیں۔اور یہ وہ ممالک ہیں جن کی جانب سے زراعت پیشہ کیلئے دی جانے والی سبسیڈی نے یہاں کے لاکھوں کسانوں کی زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا ہے۔اس کا کھلا ثبوت زمین اور کسان دشمن پالیسیاں اختیار کرنا ہے' جس کا نتیجہ کسانوں کی زبوں حالی اور خودکشی کی صورت میں اجاگر ہورہا ہے۔دنیا بھر کے معاشی ادارے بطور خاص امریکی کمپنیوں کی ہندوستان آمد نے بیرون ممالک کی سرمایہ کاری کے کاز کو تقویت پہنچائی ہے۔پچھلے سال صرف زمینوں کے لین دین کے معاملہ میں

26% بیرون ممالک کی راست سرمایہ کاری (*foreign direct investment* - *FDI*) ہوئی ہے۔ جس کے سبب ملکی قوانین کی خلاف ورزی اور بددیانتی کا چلن عام ہوتا جارہا ہے۔

زرخیز زرعی زمینیں خصوصی معاشی زون (*special economic zone* - *SEZ*) کے لئے مختص کی جارہی ہیں۔ ان خصوصی زونس کا وجود سوائے سرمایہ داروں کے لئے سہولتیں فراہم کرنے کے اور کچھ کارکردگی کا متحمل نہیں ہوگا۔ SEZ کے قیام سے جو تباہیاں ہوئیں ہیں ان میں صرف اس ایک معاملہ کو دیکھ لیں۔ مرکزی وزیر مالیات کے مطابق 2006 تا 2009 کے درمیان ادا ہونے والے تمام طرح کے راست اور بالواسطہ ٹیکس سے حکومت کو ہاتھ دھونا پڑا ہے۔ جس کی کل رقم 90 ہزار کروڑ ہے۔ ان خصوصی معاشی زونس کی حیثیت سرمایہ کاروں کے شہروں کی سی ہوگی جہاں صرف انہیں کے قوانین چلیں گے اور ہمارے ملک کی حیثیت برائے نام ایک ریاست کی سی ہوگی۔ گویا SEZ کا قیام کے معنی ایک ریاست در ریاست (*a state within the state*) کے ہوئے۔

سیاسی بدحالی - انتخابات کے لئے غیر جمہوری طرز عمل' داغدار سیاستدان' پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں بداخلاقی کا مظاہرہ' عوام کی ضرورتوں سے قطعی ناواقفیت' اپنے مفاد کے لئے عوام میں بدعنوانی کا فروغ .... یہ وہ امور ہیں جو ہمارے ملک کی سیاست اور سیاستدان کی صورت حال واضح کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کا سیاسی نظام انتہائی بگاڑ کا شکار ہے۔ کس کس پہلو سے گفتگو کی جائے؟ احاطہ مشکل ہے۔ انتخابات کے لئے سیاسی لیڈر کے مقرر کئے جانے سے لیکر ان کے انتخابات لڑنے اور جیتنے تک کے تمام مراحل میں جمہوری اقدار کی کھلی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں صرف *caste* اور *cash* ہی کی زبان چلتی ہے۔ اونچے حلقہ کے سیاستدانوں کے درمیان اختلافات کا ہونا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن بڑی تشویش کی بات یہ ہے کہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں اور ذمہ داروں کے بیانات میں ان اخلاقی حدود کا بھی لحاظ نہیں رکھا جاتا جن کو عام لوگ بھی

اپنی گفتگو میں ملحوظ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔اس سے بھی زیادہ تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ سیاسی لڑائی پارلیمنٹ یا سیاسی پلاٹ فارم سے آگے بڑھ کر سڑکوں اور بازاروں میں آرہی ہے۔عوام کے رہنما کہلائے جانے والے افراد ایسے ہوں تو اسی کی مناسبت سے عوام کا مزاج بنے گا اور نتیجتاً ملک میں بداخلاقی اور بددیانتی کے سیلاب کو آنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

ہم جانتے ہیں کہ دستور کے منشا کے مطابق تقریباً تمام ہی سیاسی پارٹیاں اپنے اصول ونظریات کے تحت آئینی طریقوں سے رائے عامہ ہموار کرسکتی ہیں۔لیکن آزادی کے تقریباً 66 سال بعد بھی وہ حالات پیدا نہیں ہوسکے جو دستور کے منشا پر پوری طرح اترتے ہوں۔یہی وجہ ہے کہ ملک میں ایک طرح کی خانہ جنگی بڑھتی جارہی ہے۔خواہ گجرات کے فسادات ہوں یا آسام کے۔خواہ علیحدگی پسندی کا رجحان ہو یا یوپی اور بہار کے لوگوں کا ممبئی آنے پر پابندی کا معاملہ۔چاہے ریاستوں کے درمیان سرحدوں کا مسئلہ ہو یا آب رسانی کا معاملہ۔ہر جگہ سیاسی' معاشی اور معاشرتی اختلافات نے کش مکش کی ایک بحرانی کیفیت پیدا کررکھی ہے۔اور اس پر بیان بازی اور اپنی غلط حرکتوں کو صحیح ٹھہرانے کے لئے جو جواز فراہم کیا جاتا ہے اس سے ماحول میں مزید بگاڑ اور جمہوری قدریں پامال ہوتی رہی ہیں۔اس پر ستم ظریفی یہ کہ ایسے لوگ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں ہیں جن کے خلاف مختلف جرائم میں ملوث ہونے کے مقدمات چل رہے ہیں۔ڈی این اے انڈیا کی خبر کے مطابق زی نیوز گروپ کے سروے سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ ٹمل ناڈو، کیرلہ' یوپی' مغربی بنگال اور جھارکنڈ جیسی ریاستوں میں ایسے کئی وزرا ہیں جن پر مختلف جرائم میں ملوث ہونے کے باعث عدالت میں مقدمات چل رہے ہیں۔(ڈی این اے - یکم اپریل ۲۰۱۲)۔

جمہوری قدروں کی پامالی - ہمارا ملک دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔یہاں کی جمہوریت نے پچھلے چھ دہوں سے مختلف قسم کے معاشرتی ' معاشی' سیاسی چیالنجز کا بڑا کامیاب مقابلہ کیا ہے جس میں 18 ماہ طویل ایمرجنسی کا دور بھی شامل ہے۔

لیکن اس کے باوجود جمہوریت کے تحفظ کیلیئے ضروری قانون کی حکمرانی (rule of law) کے محاذ پر ہماری ناکامی تشویشناک ہے۔ اور اس بگاڑ میں مزید اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ مختلف سطحوں پر پائی جانے والی غربت اور غیر موثر سیاسی نظام اس کا واضح ثبوت ہیں کہ یہاں قانون کی حکمرانی نہیں ہے۔اس بگاڑ کا ایک سبب حکمرانوں کا طرز عمل ہے تو دوسرا سبب عوام کی بے توجہی ہے۔ایک جمہوری نظام حکومت میں قوانین وضع کرنے کا کام ان نمائندوں کا ہوتا ہے جنہیں خود عوام منتخب کرتی ہے۔اسلئے قانون کی پابندی کے معنی' عوام کا اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں کی پابندی کرنا ہے۔لیکن عوام کی جانب سے قوانین کی پابندی کرنے کا معاملہ بڑا قابل توجہ ہے۔ٹرافک سگنل کی پابندی سے لیکر مختلف سطح کے قوانین کی پابندی کا معاملہ تشویشناک صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔

ملک کی موجودہ صورت حال کے نتیجے میں جو بگاڑ سامنے آیا ہے اس میں جمہوری اقدار کی پامالی بڑی نمایاں ہے۔ قانون' تعلیم' ذرائع ابلاغ اور سیاسی نظام کے حوالے سے جو حالات اوپر بیان کئے گئے ہیں ان میں جمہوری قدروں کی پامالی کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ ملک میں کرپشن اور حالیہ عصمت دری کے واقعہ کی روشنی میں جو عوامی احتجاجات سامنے آئے ہیں' وہ ایک لحاظ سے خوش آئند ہیں کہ معاشرہ میں پھیل رہی بدامنی کو لوگ صحیح نہیں سمجھتے' انہیں ان کا ضمیر جھنجوڑتا ہے۔اس عوامی رجحان کو اگر صحیح رخ دیا جائے تو معاشرتی بھلائی کے بڑے روشن امکانات پیدا ہوں گے۔لیکن اس عوامی رجحان کا جو تشویشناک پہلو ہے وہ جمہوری قدروں کی پامالی سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ عوام کے مطالبات میں عوام ہی کی جانب سے منتخب شدہ نمائندوں کی حیثیت کو چیالنج کیا گیا ہے۔اہل نظر کہتے ہیں کہ یہ صورت حال اصل میں احتجاج بمقابلہ جمہور (conflict vs consensus) ہے جو جمہوریت سے تضاد رکھنے والے امور (paradoxes) میں سے ایک ہے۔

اسی طرح جمہوریت کے جو تین ستون ہیں ان میں ایک ستون میڈیا کا اضافہ ہوتا نظر آرہا ہے۔ جو کام لا اینڈ آرڈر اور عدلیہ کے کرنے کا ہے اسے آج میڈیا بخوبی انجام

دے رہا ہے۔کسی کو بھی مجرم بناتا ہے کسی کے بھی خلاف جرم خود ہی ثابت کر دیتا ہے۔

ہندوستانی باشندوں کے خلاف بعض فرقہ پرست عناصر یہ گمراہ کن افواہ پھیلاتے ہیں کہ یہ پڑوسی ممالک سے یہاں در آئے ہیں۔اصل میں ایک مقام سے دوسرے مقام کے لئے منتقلی چند ٹھوس بنیادوں پر ہوتی ہے۔پہلی بنیاد یہ کہ اگر کسی علاقہ میں رہنے والے اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھیں تو وہ کسی ایسے مقام کو منتقل ہوں گے جہاں انہیں تحفظ فراہم ہوسکتا ہو۔جیسے کہ ہمارے اڈوانی جی پاکستان سے ہندوستان تشریف لائے۔ہم یہ کیسے یقین کریں کہ بنگلہ دیش میں اکثریت میں رہنے والے مسلمان اقلیت میں رہنے والوں کے ہاں نقل مکان کریں گے؟manorama year book میں اعداد وشمار دیئے گئے ہیں جن سے بنگلہ دیش اور آسام کے دس مسلمانوں کی کثیر آبادی (33% to 74%) والے اضلاع (Muslims Concentrated Districts - (MCD) کے درمیان تقابل کیا جاسکتا ہے۔اس کے مطابق بنگلہ دیش میں تعلیم 43% ہے جبکہ MCD میں 38% ہے۔(0 سے 5 سال کے) بچوں کی شرح اموات بنگلہ دیش میں 62% ہے جبکہ MCD میں 68%۔اسی طرح بے روزگاری اور صحت کے معیار وغیرہ کے سلسلہ میں بھی جو اعداد وشمار دیئے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ بنگلہ دیش کی صورت حال MCD سے بہتر ہے۔تو پھر بنگلہ دیش سے لوگ آسام کیوں منتقل ہوں گے؟

ہندوستانی مردم شماری بتاتی ہے کہ بنگلہ دیش کے وجود میں آنے سے بہت پہلے بنگلہ زبان بولنے والوں کی ایک کثیر آبادی یہاں رہتی تھی'اب اگر بنگلہ بولنے والوں کو بنگلہ دیشی سمجھیں تو یہ کس حد تک صحیح ہوگا؟ آسام کا تقریباً 257 کیلومیٹر حصہ بنگلہ دیش کی سرحد سے ملتا ہے جب کہ مغربی بنگال کا تقریباً 2500 کیلومیٹر حصہ بنگلہ دیش کی سرحد سے جڑا ہوا ہے۔پھر اس کے درمیان میگھالیہ کا بھی خاصہ حصہ لگتا ہے تو پھر یہاں گھس پیٹھیوں کا مسئلہ کیوں نہیں ہے'خاص کر کے آسام ہی میں کیوں؟ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان کی بارڈر سکیورٹی فورس انتہائی چوکس رہتی ہے اگر بنگلہ دیشی گھس پیٹھی کو مسئلہ کی

حیثیت سے اچھالا جاتا ہے تو اس میں سب سے زیادہ ہماری بارڈر سکیورٹی فورس کا وقار مجروح ہوتا ہے اور اس پر عدم اعتماد کا ایک منفی تاثر سامنے آتا ہے۔ان حقائق کی بنیاد پر باآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ بنگلہ دیشی گھس پیٹھی کا مسئلہ سوائے چند مخصوص مفادات کے حصول کے کچھ اور نہیں ہے۔واضح رہے ہمارے ملک میں ایسے کئی قوانین ہیں جن کے سہارے یہاں گھس آنے والوں کو باہر نکالا جاسکتا ہے' تو پھر اسے ایشو بنانے کی کیوں ضرورت محسوس ہوتی ہے؟

(٦) حقوق نسواں اور موجودہ صورت حال

دور حاضر میں خواتین کی کم وبیش وہی صورت حال معلوم ہوتی ہے' جو پچھلے زمانوں میں رہی ہے ۔ملک کے مشہور اخبار ٹائمس آف انڈیا کے مطابق۔2009 میں اسوقت کے ہوم سکریڑی نے 10 کروڑ لوگوں کے کاروبار(*human trafficking*) کا انکشاف کیا تھا' جس میں زیادہ تر خواتین اور بچیاں تھیں' جن کی ایک مقام سے دوسرے مقام منتقلی مختلف مقاصد کیلئے ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کے مرکزی تفتیشی بیورو نے انکشاف کیا کہ 2009 میں پورے ملک میں جسم فروشی کا کاروبار کرنے والی فاحشہ عورتوں کی تعداد تقریباً 3 کروڑ ہے۔ہمارے ملک کے بعض ماہرین' جو گھریلو اور خاندانی سطح پر صحت کے معیار(*national family health survey*) کی جانچ کے لئے سروے کرتے ہیں' کا بیان ہے کہ ہر سال ہمارے معاشرہ سے تقریباً 3لاکھ لڑکیاں لاپتہ ہوجاتی ہیں۔حال ہی میں دہلی میں پیش آئے اجتماعی عصمت دری کے واقعہ نے اس ملک میں عورتوں کے تحفظ کو لیکر پھر سے ایک گرما گرم ماحول تیار کردیا ہے۔چاروں طرف سے مانگ کی جارہی ہے کہ مجرموں کو سخت سزا یا پھانسی دے دی جائے۔لیکن المیہ یہ ہے کہ اس ملک میں خواتین کی عصمت دری کے واقعات آئے دن پیش آتے ہی رہتے ہیں۔لیکن ان کے سلسلہ میں کوئی ٹھوس اقدام نہیں کیا جاتا۔فی الحال اب تک کے عصمت دری کے واقعات میں سے صرف 20% کسی نتیجے پر پہنچ سکے ہیں جبکہ 40 ہزار کیسیز کا کسی نتیجے

تک پہنچنے کا امکان نظر آتا ہے۔(انڈین ایکسپریس ۴ جنوری ۲۰۱۳)۔

ہمارے ملک کی بعض ریاستیں ایسی نظر آتی ہیں جہاں مرد وعورت کا تناسب بڑی بری طرح متاثر معلوم ہوتا ہے۔ 2006 کی رپورٹ کے مطابق رحم مادر میں 5 کروڑ بچیوں کا قتل (female foeticide) ہوا ہے (دکن ہیرالڈ - ۳ جنوری ۲۰۱۳)۔اس کے علاوہ بچیوں کی پرورش میں لاپرواہی کی بنا کم عمر ہی میں دنیا سے ان کا گذر جانا۔ شہروں اور دیہاتوں میں رہنے والی خواتین کی ایک بڑی تعداد کا گھریلو مظالم (domestic violence) کا شکار ہونا۔طلاق کی کثرت' شوہر کی بدسلوکی کے باعث عورتوں کا اپنے واجبی حقوق سے محروم ہونا...نہ جانے ایسے کتنے مظالم ہیں جو بڑے نمایاں طور پر معاشرہ کا گھناؤنا چہرہ پیش کررہے ہیں۔اور واضح کررہے ہیں کہ انسانی معاشرہ میں عورت نے اپنا عزت و وقار کا مقام کھودیا ہے۔یوں تو خواتین کے حقوق و مقام کے لئے کوششیں ہر طرف نظر آتی ہیں۔اس صدی کے آغاز سے ہی empowerment of women کی صداؤں نے بڑی تیزی کے ساتھ انسانوں کو متوجہ کیا۔نسوانی تحریکوں (feminist movements) کی کثرت ہے۔خواتین کے حقوق کی پاسداری کے لئے حکومتیں خصوصی ریزرویشن کا اہتمام کررہی ہیں۔حقوق کی پامالی کو روکنے کے لئے سخت سزاؤں پر مشتمل قوانین بنائے جارہے ہیں۔لیکن یہ تمام کوششیں بے سود محسوس ہوتی ہیں۔آج عورت' خود انسانی معاشرہ میں اپنے حقیقی مقام کی متلاشی نظر آتی ہے۔عورت کی عزت اور اسکا مقام روبہ زوال ہے۔اس کا ایک بنیادی سبب تو یہ ہے کہ عورتوں کو ان کی زندگی کے حقیقی مقصد سے دانستہ طور پر دور رکھا گیا ہے۔ پھر یہ کہ ان کے حقوق کی پاسداری' موقع پرست افراد کی کوششوں کے مرہون منت (men centric) ہے۔یہ افراد جتنا اپنے مفادات کیلئے مناسب سمجھیں گے اتنے ہی حقوق عورتوں کو حاصل ہوں گے۔اور دیگر حقوق کو پامال کرنے کے لئے عورتوں کے سامنے پرکشش نعروں' پر رونق دنیا اور اسکی رنگینیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔تاکہ وہ اس پر رونق دنیا (glamourous world) میں عزت و نام کمانے،مس انڈیا اور مس

یونیورس بننے اور اس کے مطابق اپنی زندگی سنوارنے کی دھن میں اپنی عزت و پاکدامنی کے دامن کو تار تار کر دے اور اپنی ساری توانائیاں بے مقصد صرف کر دے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ آج عورت محض ایک شئے (commodity) کی حیثیت اختیار کر گئی ہے' جسے جب چاہا اور جہاں چاہا بڑی بے حیائی سے استعمال کیا۔ اس پس منظر میں عورت کے حقوق و مقام کی بازیافت کی کوششیں ترجیحی طور پر ہونی چاہئیں۔

(۷) اسلام اور تکثیری معاشرہ

بہتری اور سدھار کیلئے اسلامی نظر سے حالات کا مشاہدہ کرنا چاہئے۔ جتنی گہری نظر اسلام پر ہوگی اتنا ہی بہتر نظارہ موجودہ حالات کا ممکن ہو سکے گا۔ دین اسلام' اصل میں اللہ کی نعمت ہے۔ اور اللہ کی نعمت 'اسلام' ہی سے انسانی معاشرہ کا بھلا ہو سکتا ہے۔ جس طرح آسمان سے برسنے والے پانی اور سورج سے نکلنے والی شعاعوں سے انسانی زندگی ممکن ہے' اسی طرح زمین پر اللہ کی نعمت یعنی اسلام کے اپنانے ہی سے انسان صحیح معنوں میں زندہ اور کامیاب و کامران ہو سکتا ہے۔

اللہ ہی کے حکم سے آسمانوں اور زمین کا نظام قائم ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز' اپنے خالق کے حکم کے آگے سر بہ سجود ہے۔ وہ دور گیا جب کہ لوگ آسمانوں اور زمین کی ساخت اور سورج اور چاند کی گردش کو اپنی سوچ و فکر کے اعتبار سے سمجھا کرتے تھے۔ خدا کا انکار بھی کرتے اور ساری کائنات کے وجود میں آنے کو ایک اتفاقی حادثہ قرار دیتے۔ لیکن آج کے ترقی یافتہ دور کے انسان کی حقیقت تک رسائی ہوئی ہے اور اس کے صحت مند طرز سوچ و فکر میں مزید وسعتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ کہ اس کائنات میں حیرت انگیز یکسانیت اور ہم آہنگی کے پیچھے ایک غالب اور دانا و بینا ہستی کی حکمت و دانائی کارفرما ہے۔

"لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِباً" (النحل:۵۲)

(اسی کا ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور خالصتاً اسی کا دین (ساری کائنات) میں چل رہا ہے)

دین اسلام - اس کائنات اور یہاں بسنے والے انسانوں کے سامنے یہی حقیقت واضح کرتا ہے کہ زندگی' زندگی دینے والے کی مرضی کے مطابق گذارنی چاہیے۔ اچھا بندہ وہ ہے جو اپنی مرضی اور خواہش کو اپنے خالق کی مرضی اور خواہش کے مطابق کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دین اسی طرح انسانوں کے لئے فائدہ مند ہے جس طرح ہوا' پانی اور سورج کی روشنی ہے۔ جس طرح زمین میں بیج کا وجود ایک سرسبز و شاداب باغ اور کھیت کی شکل اختیار کرنے میں مددگار ہوتا ہے اسی طرح انسانی دلوں میں دین اسلام کی رسائی انسانی زندگی کو بلندیٔ اخلاق اور پائیداریٔ عمل سے سرفراز کرتی ہے۔

دین اسلام کی ان خوبیوں کے پیش نظر ملک کی تقدیر سنوارنے کی کوشش کی جائے۔ دلوں میں یہ پاکیزہ تمنا اور ایک اعلیٰ وژن ہو۔ ایک تکثیری سماج کی اصلاح کے لیے یہی اسوۂ رسولؐ ہے۔ مکہ کے ابتدائی دور میں آپؐ نے واضح فرمایا تھا کہ اگر اس دین کو قبول کرلیا جائے تو ساری دنیا تابع ہوجائے گی۔ کسی کو کسی کا خوف نہیں ہوگا سوائے اللہ کے۔ اس دین حنیف کی بنیاد پر تکثیری معاشرہ کی خیر خواہی کیلئے' اسلام کے ان حیات آفریں اور درخشاں پہلوؤں سے دلوں اور ذہنوں کو مزین کرنا ہوگا جو' ہر دور میں انسانیت کے لئے راحت وسکون جان بنے ہیں۔

اسلام کے درخشاں پہلو

مسلمانوں نے' اللہ کی بندگی اور اللہ کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور محبت کی ایک بے مثال تاریخ کی بنا ڈالی۔ صدیاں گذر گئیں، آج بھی دنیا کے کونے کونے سے اس تاریخ کے اعتراف میں آوازیں بلند ہورہی ہیں۔ مشہور مورخ مسٹر ولز اسلامی تعلیمات سے متعلق لکھتے ہیں:

اسلامی تعلیمات نے دنیا کے اندر منصفانہ اور شریفانہ طرز عمل کیلئے عظیم روایات چھوڑی ہیں اور وہ لوگوں میں شرافت اور رواداری کی روح پھونکتی ہیں۔ یہ تعلیمات بہت اونچی انسانی تعلیمات ہیں اور قابل عمل ہیں۔ ان تعلیمات نے ایک ایسی سوسائٹی کو جنم دیا

جس میں اس کے پیشتر کی ہر سوسائٹی کے مقابلہ میں سنگ دلی اور اجتماعی ظلم کم سے کم رہا.... اسلام نرمی، رواداری، خوش اخلاقی اور بھائی چارے کا علمبردار رہا ہے۔[1]

فرانس کے مشہور ماہر سماجیات گستاف لیبان نے کہا:

تاریخ کسی ایسی قوم سے واقف نہیں ہے جو عرب کی طرح رحم دل اور روادار فاتح ہوئی ہو اور نہ تاریخ میں ان کے دین جیسا کوئی صاف اور سادہ اور بے ضرور دین نظر آتا ہے۔[2]

ایک امریکی محقق، مسٹر ڈریپر کہتے ہیں:

خلفائے راشدین کے زمانے میں عیسائیوں اور یہودیوں کے اہل علم کا صرف احترام ہی نہیں کیا گیا بلکہ بڑے بڑے عہدے بھی ان کے سپرد کیئے گئے۔ اور ان کو حکومت کے اونچے مناصب تک ترقی دی گئی۔ ہارون الرشید نے حنان بن ماسویہ کو ڈائریکٹر تعلیمات بنا کر تمام اسکولوں اور کالجوں کو اس کی تحویل میں دے دیا تھا۔[3]

اخلاقی گراوٹ کا حل

انسان جب خدا ہی سے نا آشنا ہو تو اس سے خیر کی توقع کیوں کر کی جا سکتی ہے؟ یہی حال زمانہ جاہلیت کا تھا کہ اخلاق حسنہ کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ اخلاقی گراوٹ اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اخلاقی پستی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ انسان اپنے پیدا کرنے والے کو ہی بھلا بیٹھے؟ اور اپنے ہی جیسے انسانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے لگے؟ خدا کی نافرمانی تو تھی ہی ساتھ ہی انسانی حقوق کی پامالی اپنے درجہ کمال پر تھی۔ ماں باپ اور رشتہ داروں سے ناروا سلوک کرنا، عورتوں کی بے عزتی کرنا، یتیموں اور لاچاروں کا مال ہڑپ کر جانا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر نسل در نسل دشمنی و نفرت کا بازار گرم رکھنا، فحاشی کا چلن، حق کو ماننے والوں پر ظلم ڈھانا، معاشرہ میں پھیل رہی برائیوں سے انتہا درجہ کی لاپرواہی برتنا، یہ انسانی اخلاق کی پستی کی اعلیٰ ترین مثالیں تھیں۔ فی زمانہ بھی انسان کم و بیش اسی طرح کی گمراہیوں میں مبتلا نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زمانہ

جاہلیت کی برائیاں اپنے ایک نئے ورژن کے ساتھ جاری وساری ہیں۔شرک اسوقت بھی تھا'اب بھی ہے' بلکہ خداؤں میں اضافہ ہوتا ہی جارہا ہے۔لوٹ مار اسوقت بھی تھی اور آج بھی ہے' فی زمانہ لوٹ مار کا طریقہ بڑا پروفیشنل ہوگیا ہے۔والدین کی نافرمانی اور بڑوں کی ناقدری اسوقت بھی تھی اور اب بھی ہے بلکہ اولڈ ایج ہوم اور ایلڈرس شلیٹر جیسے خود مختار اداروں کا وجود معاشرہ میں ناسور کی حیثیت رکھتا ہے۔حقوق کی پامالی اسوقت بھی تھی اور اب بھی نئی منزلوں کو چھورہی ہے'اس کے لئے اسمبلی اور پارلیمینٹ بڑے معاون نظر آرہے ہیں۔لڑکیوں کو پیدا ہونے کے بعد دفن کیا جاتا تھا اب زمانہ اس قدر ترقی کرگیا کہ ان لڑکیوں کو دنیا میں آنے کی زحمت بھی نہیں دی جاتی۔

زمانہ قدیم وجدید کی اس تقابلی گفتگو کے پیش نظر ہمیں رسول رحمت ﷺ کی آمد اور انسانی زندگی میں رونما ہوئے اخلاقی انقلاب کے درخشاں پہلو پر نظر ڈالنی چاہئے۔ رسالت مآب ﷺ کی آمد کے موقع پر اخلاقی گراوٹ کا یہ عالم تھا' اور آپ ﷺ نے اپنی آمد اور اپنی حیات نواز تعلیمات کو اجڑی انسانیت کے لئے اللہ کی رحمت اور ایک نایاب تحفہ قرار دیا:

"یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّمَا اَنَا رَحْمَةٌ مُّھْدَاةٌ"

(اے لوگو میں تمہارے پاس رحمت اور راہ راست دکھانے والا بنا کر بھیجا گیا ہوں۔)[۲۴]

اس لئے کہ آپ ﷺ کی آمد مکارم اخلاق کی تکمیل کیلئے خاص رہی۔گویا جہالت بداخلاقی ہے' تو ایمان اخلاق ہے۔اخلاقی پستی اندھیرے کی مانند اور اخلاقی بلندی روشنی کی مانند۔فرد کے ارتقاء اور معاشرہ کی ترقی پذیر تعمیر کیلئے درحقیقت اخلاق ہی معیار ہیں'اور اسی اخلاق سے انسانیت کو مزین کرنے رسول رحمت ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کے بہتر اخلاقی رویے کے لئے جو ضروری ہے'وہ سب کچھ عطا فرمایا۔انسان کا اپنے کانوں سے سننا اور آنکھوں سے دیکھنا'اور دل سے سمجھنا،اس کی وہ خوبیاں ہیں جو اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ وہ انسانی

اعضاء ہیں جو کسی نہ کسی پہلو سے اخلاق کے اظہار کے لئے عطا کئے گئے ہیں۔ اور اخلاق میں سب سے نمایاں وصف شکر گذاری کا رویہ ہے۔ دیکھئے انسانی اعضا اور شکر گذاری کا رویہ باہم کس طرح مربوط ہے:

”وَاللّٰهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئاً وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ“ (النحل: ۷۸)

(اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اس نے تمہیں کان دیئے‘ آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیئے اس لئے کہ تم شکر گذار بنو)

انسانی زندگی میں اخلاقی انقلاب‘ رسول اکرم ﷺ کے اسی حیات آفریں پیغام کے ذریعہ ہوا۔ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ کس کے پاس کس طرح کا سامان زندگی ہے۔ گھر‘ کاروبار‘ مویشی‘ باغات وغیرہ یہ وہ وسائل ہیں جو انسانوں کے پاس تھوڑے بہت فرق کے ساتھ موجود ہیں۔ مسند احمد کی حدیث ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ:

”اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَسَمَ بَيْنَكُمْ اَخْلَاقَكُمْ كَمَاقَسَمَ بَيْنَكُمْ اَرْزَاقَكُمْ“ [۵]

(بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان اخلاق کو بھی اسی طرح تقسیم کیا ہے جیسے تمہارے درمیان سامان زندگی تقسیم کی ہے)

یعنی جس طرح سامان زندگی کی تقسیم ہوئی ہے اسی طرح اخلاق بھی تقسیم کئے گئے ہیں۔ جس طرح سامان زندگی کے حصول کے لئے دولت کا اہم رول ہوتا ہے اسی طرح اچھے اخلاق و کردار کے اظہار کے لئے انسانی جسم کی ساخت نمایاں رول ادا کرتی ہے۔ کان‘ آنکھیں‘ ہاتھ‘ پیر‘ دل یہ وہ اعضا ہیں جن سے اخلاق حسنہ کا صدور ہوتا ہے۔ کان سے اچھا سنو تو یہ اچھے اخلاق میں شمار ہوگا۔ اگر آنکھیں‘ عبرت والی آنکھیں ہوں تو

نیکیاں ہی نیکیاں حصہ میں آئیں گی۔ ہاتھ' دینے والا ہو تو اسکے کیا کہنے۔ پیر' اگر خدا کی راہ میں گرد آلود ہوں تو ایسے شخص کی کیا خوش نصیبی؟ دل میں اچھے جذبات' اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی محبت ہو تو اس دل کی کیا بات ہے۔ انسانی اخلاق' انسانی اعضا ہی سے صادر ہوتے ہیں۔ اخلاق تقسیم کرنے کے معنیٰ' اللہ رب العزت نے بہترین ساخت پر انسان کی تخلیق فرمائی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

"اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یُعْطِی الدُّنْیَامَنْ یُحِبُّ وَمَنْ لَّا یُحِبُّ"[6]

(یقیناً اللہ تعالیٰ دنیا اس کو دیتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے اور اسکو بھی دیتا ہے جس سے محبت نہیں کرتا۔)

دنیا سب کو ملے گی۔ جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ان کو بھی اور جنہیں نہیں چاہتا ان کو بھی۔ چنانچہ اس وقت کی سپر پاور طاقتیں ایران و روم تھیں اور اسوقت امریکہ ہے۔ ہر دو صورت میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دنیا کسی کو بھی مل سکتی ہے۔ لہذا اخلاق حسنہ کے اظہار کے لئے دنیا مطمح نظر نہ ہو۔ اس لئے کہ اللہ کے محبوب اعمال انجام دینے کے لئے کسی کے پاس دنیا نہیں بلکہ دین ہونا ضروری ہے۔ اور دین اس خوش نصیب کو ملتا ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے:

"وَلَا یُعْطِی الدِّیْنَ اِلَّا مَنْ اَحَبَّ"[7]

(مگر دین صرف اسی کو عطا کرتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے)

"فَمَنْ اَعْطَاہُ اللّٰهُ الدِّیْنَ فَقَدْ اَحَبَّهٗ"[8]

(پس جس کو دین ملا اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اللہ کا بڑا محبوب ہے)

لہذا یہ فکر ہر قلب و ذہن میں راسخ ہوئی۔ ہر طرف حسن اخلاق کے بے مثال نمونے ظاہر ہونے لگے۔

☆ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اس شان کے بزرگوار تھے کہ جنہوں نے اپنی علمی فضیلت' عملی کشش' زور بازو' روشن ضمیری اور صالحیت سے

سارے عالم کی رہنمائی کی۔

☆ حضرت عمرؓ ملہم و محدث تھے۔ جب کبھی کوئی اہم معاملہ درپیش آتا اور اس کے سلسلہ میں رسول اکرم ﷺ اپنے صحابہؓ سے مشورہ طلب کرتے تو لوگ اپنی اپنی صوابدید کے مطابق رائے دیتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید میں وحی الٰہی نازل ہو جاتی۔ یوں آپؓ کی رائے تائید ربانی سے قیامت تک کے لئے شریعت و قانون بن گئی۔

☆ حضرت مصعب بن عمیرؓ، حضرت جعفر طیارؓ، حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ بڑی اعلیٰ استعداد کے حامل تھے کہ جنہوں نے مدینہ اور حبش اور نجران کے باشندوں کو اپنے دلنشین وعظ و نصیحت سے مسلمان بنا دیا۔

☆ حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عمارؓ اور حضرت یاسرؓ جیسے صحابہ کبارؓ نے راہ خدا میں وہ جانثاری و حق پسندی کی نظیریں پیش کیں کہ اس طرح کی مثالیں پیش کرنے سے آج بھی تاریخ قاصر ہے۔

☆ حضرت بلالؓ، حضرت سمیہؓ، حضرت یاسرؓ اور حضرت کعبؓ جنہوں نے اپنے استقلال و استقامت سے جابروں اور ظالموں کو ظلم کرتے ہوئے تھکا دیا۔

☆ حضرت لبیدؓ، حضرت سوید بن صامتؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے فصیح و بلیغ انسان تیار ہوئے جو ایک ایک تقریر یا ایک ایک قصیدے سے کئی کئی قبیلوں پر قابو پا لیتے تھے۔

☆ حضرت عمرؒ بن عبد العزیزؒ نے جانوروں پر رحم کے ضمن میں خاص حکم جاری کیا تھا۔ محکمہ پولس کے لئے آپؒ نے باضابطہ یہ قانون تجویز فرمایا:

لوگوں کو اس بات کی اجازت ہرگز نہیں ہے کہ وہ جانوروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ لادیں۔ نہ ان کو یہ اجازت ہے کہ جانوروں کو بہت تیز چلائیں جبکہ ان پر بوجھ لادا ہوا ہو۔ نہ ان کو اجازت ہے کہ وہ جانوروں کو سخت سزا دیں۔ ان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ بوجھ سے لدے ہوئے جانوروں کو عام پارکوں میں کھڑا کریں۔ یہ سب کام

شریعت اسلامیہ کے بالکل خلاف ہیں۔ جانوروں کے مالکوں کا فرض ہے کہ وہ مویشیوں کے چارہ کے معاملہ میں خدا کا خوف رکھیں۔ چارہ اس قدر ہونا چاہئے جس سے جانور سیر ہو جائے۔ نیز چارہ خراب اور تھوڑا نہیں ہونا چاہئے۔

یعنی انسانی اخلاق میں بہار کسی مادی غرض سے نہیں بلکہ اس دین حنیف کے ذریعہ بپا کی گئی جو عین انسانی فطرت ہے۔ چنانچہ اس دین کی بنیاد پر جو اخلاقی مظاہرہ ہوا' عرب کی دنیا' بالخصوص اور سارا عالم بالعموم ششدر رہ گیا۔ دین کے ان جانثاروںؓ کے قول وعمل میں کبھی تضاد نہیں رہا' جن کے معاملات روز روشن کی طرح شفاف رہے' لوگوں کی بے لوث خدمت' بے یار و مددگار لوگوں کے والی' عورتوں کا عزت واحترام کرنے والے اور ہر وقت اپنے رب کو راضی رکھنے کی فکر کرنے والے افراد خود انہیں میں سے ایسے نمودار ہوئے جیسے چودھویں کا چمکتا چاند۔ یہاں تک کے جاہلوں نے کہہ دیا کہ اس دین نے جانوروں کو انسان بنا دیا۔ رسول اکرم ﷺ نے انسانی زندگیوں میں جو اخلاقی بہار لائی اس کی تین جہتیں بڑی نمایاں رہیں اول دل کی کیفیت پر نظر رکھی جائے۔ کیونکہ یہ فوری بتا دے گا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط:

"اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالْاِثْمُ مَاحَاکَ فِیْ صَدْرِکَ وَکَرِھْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ النَّاسُ عَلَیْهِ" 9

(نیکی حسن اخلاق ہے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے سینے میں کھٹکے اور لوگوں کو اس کے بارے میں جاننا تمہیں ناپسند ہو۔)

دوم دنیا سے بے نیازی۔ اللہ تعالیٰ کی محبت شدید ہو' دنیا والوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے نیازی برتی جائے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ معاملہ کسی جرم کا ہو یا رشوت کا' اس میں کہیں نہ کہیں لوگوں کے وسائل سے استفادہ کا ذہن کارفرما رہتا ہے۔ آپ ﷺ نے بطور ترغیب بشارت بھی دی کہ کوئی شخص نہ ہی اپنے مال و جاہ کی بنا پر تکبر میں مبتلا ہوا اور نہ ہی کسی کے قرض تلے دبا ہوا ہو تو اس کا ٹھکانا جنت ہوگا:

"مَنْ مَّاتَ وَھُوَ بَرِیْءٌ مِنَ الْکِبْرِ وَالْغُلُوْلِ وَالدَّیْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ" 10

(جو اس حالت میں مرا کہ تکبر' خیانت اور قرض سے بچا ہوا تھا تو جنت میں داخل ہو گیا۔)

اور سوم عفت و پاکدامنی اور زبان کا محتاط استعمال ہے۔نظریں پاک' دل پاک تا کہ خدا کی پاکیزہ تعلیمات کے لئے پاکیزہ جذبات میسر آسکیں۔اور زبان سے خیر کے کلمات ادا ہوسکیں:

"مَنْ يَّضْمَنْ لِيْ مَابَيْنَ لِحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ اَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ"[۱۱]

(جو مجھے اس کی ضمانت دے جو دونوں جبڑوں کے درمیان ہے اور اس کی ضمانت دے جو دونوں ٹانگوں کے درمیان ہے' میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔)

ان تعلیمات کی پشت پر اللہ کی محبت اور اس کا خوف کارفرما رہا' جسکی آپ ﷺ نے بڑی تکرار سے تاکید فرمائی۔اکثر کسی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے آپ ﷺ فرمایا کرتے اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ ۔میں تمہیں اللہ کا تقوی اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔رسول اکرم ﷺ کی ان تعلیمات کا اثر تھا کہ معاشرہ میں حضرات صحابہ کرامؓ کی زندگیاں الگ سے پہچان لی جاتی تھیں۔معاشرہ میں اس اخلاقی برتری کی بنا مرد وخواتین نے اپنی شخصیت کو نہایت پرکشش اور جاذب نظر بنادیا تھا۔کوئی اس بات کی جرات نہیں کرسکتا تھا کہ کسی کے بھی خلاف کوئی جھوٹی بات منسوب کرے یا کسی کے کریکٹر پر انگلی اٹھائے۔علامہ شوکانیؒ کہتے ہیں کہ کسی ایک عالم یا محدث سے بھی یہ منسوب نہیں کہ انھوں نے روایت کردہ احادیث کو اس لئے رد کردیا ہو کہ اس کی راوی عورت ہے۔کتنی ہی سنتیں ایسی ہیں جن کو امت مسلمہ نے صحابیہؓ کی روایت کی بنا پر اختیار کیا ہے۔[۱۲]

ازالۂ غربت بذریعہ خدمت

اس دین حنیف کے ذریعہ نہ صرف اللہ کے حضور راتوں میں کھڑے رہنے والے اور اسی کی خاطر دن بھر روزہ رکھنے والے مومنین و مومنات تیار ہوئے بلکہ ایسے

خدمت گذار بھی میدان کارزار میں آئے جو یتیموں' بے سہاروں' بیواؤں اور مسکینوں کی خدمت کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا تھا۔

☆ حضرت ابوبکر صدیقؓ محلہ کی ان لڑکیوں کے پاس جاتے جن کے باپ لڑائیوں میں شہید ہو چکے تھے۔اور ان کی بکریاں دوہتے۔[۱۳]

☆ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص بھیک مانگ رہا ہے۔آپؓ نے دریافت کیا تو اس نے کہا جزیہ کی ادائیگی اور ضروریات زندگی کے لئے بھیک مانگ رہا ہوں۔آپؓ نے کہا جب تم جوان تھے تو ہم نے تم سے جزیہ وصول کیا اور بڑھاپے میں تمہیں بدحالی میں چھوڑ دیا۔پھر آپؓ اس شخص کا ہاتھ پکڑا' اپنے گھر لے گئے' اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلایا اور بیت المال کے خازن کے پاس حکم بھیجا کہ اس شخص کے لئے اور ایسے تمام لوگوں کے لئے اتنا روزینہ (daily wage) مقرر کردو جوان کے لئے اور ان کے اہل وعیال کے لئے کفایت کرے۔[۱۴]

☆ حضرت ابودرداؓ نے مرتے وقت اپنے اونٹ سے کہا کہ قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے مجھ سے نہ جھگڑنا کیوں کہ میں نے تیری طاقت سے زیادہ کبھی تجھ پر بوجھ نہیں ڈالا۔

☆ حضرت عدی بن حاتمؓ چیونٹیوں کے لئے روٹی کا چورا بناتے اور کہتے کہ یہ ہماری پڑوسی ہیں لہذا ہم پر بھی ان کا حق ہے۔

☆ حضرت زینبؓ کو ان کی بے لوث خدمات کی بنا پر ام المساکین کے لقب سے جانا جاتا ہے۔حضرت زینبؓ کا یہ عالم تھا کہ جو بھی ہوتا لوگوں کی خدمت کے لئے صرف کر دیتیں اور کچھ نہ ہوتا تو سوت کات کات کر پیسہ کماتیں اور اسے لوگوں کی خدمت میں لگا دیتیں۔

دین اسلام میں جو عبادتیں حقوق اللہ سے تعلق رکھتی ہیں جیسے نماز و روزہ' ان کا لازمی نتیجہ شخصیت پر یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کے حقوق ادا کرنے کے لئے اپنی کمر کس لیتا ہے' انسانوں کی بے لوث خدمت کیلئے وہ تمام اعلیٰ جذبات اور احساسات اسے میسر

آ جاتے ہیں جن سے وہ دوسرے انسانوں کے دکھ درد کو اپنا سمجھنے لگتا ہے۔ ان کی خدمت میں اپنے لئے سکون و عافیت محسوس کرتا ہے۔ یہی وہ جذبات کی بہار ہے جس کی مثالیں انسانی تاریخ دینے سے قاصر ہے۔ انسان کے اس جذبہ کے کیا کہنے کہ وہ خود دوسروں کی تکلیفوں کو ایسے محسوس کرے جیسے وہ اس پر بیت رہی ہوں۔ رسول اکرم ﷺ نے انسانی جذبوں میں پر کیف تبدیلی اسی بنیادی فکر کے ذریعہ لائی کہ اللہ کے لئے عبادت جس قدر اہم ہے اسی قدر اہم اس کے بندوں کی خدمت بھی ہے:

"السَّاعِيُ عَلَى الْاَرْمِلَةِ وَالْمِسْكِيْنِ كَالسَّاعِيْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكَالْقَائِمِ الَّذِى لَا يَفْتُرُ وَكَالصَّآئِمِ الَّذِى لَا يُفْطِرُ" ۱۵

(بیواؤں اور مسکینوں کی خبر گیری کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا۔ وہ اس رات میں قیام کرنے والے کی طرح ہے جو بغیر تھکے قیام کرتا ہے اور وہ اس روزے دار کی طرح ہے جو مسلسل روزے رکھتا ہے۔)

انسانی خدمت کے جذبہ سے بالکل نا آشنا معاشرہ میں محسن انسانیت ﷺ نے خدمت خلق کا جذبہ ایسا فروغ دیا کہ وسائل ہوں تو احسن طریقے سے انسانوں کی خدمت کا کام انجام پایا اور اگر کوئی وسائل سے محروم ہے تو اس نے اپنے ہاتھ اور پیر سے لوگوں کی خدمت کو اپنی خوش نصیبی جانا۔ ایک صحابیؓ نے عرض کیا:

"اَیُّ الرِّقَابِ اَفْضَلُ؟ قَالَ اَغْلَاهَا ثَمَناً وَّاَنْفَسُهَا عِنْدَ اَهْلِهَا. قَالَ فَاِنْ لَّمْ اَفْعَلْ؟ قَالَ تُعِيْنُ صَانِعاً اَوْ تَصْنَعُ لِاَخْرَق. قَالَ فَاِنْ لَّمْ اَفْعَلْ؟ قَالَ تَدَعُ النَّاسَ مِنَ الشَّرِّ فَاِنَّهَا صَدَقَةٌ تَصَدَّقُ بِهَا عَلٰى نَفْسِكَ" ۱۶

(کس طرح کے غلاموں کو آزاد کرنا زیادہ بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ایسے غلاموں کو آزاد کرنا جنکی قیمت زیادہ ہو اور جو اپنے مالک کے نگاہ میں بہتر ہوں۔ اس نے کہا اگر میں یہ نہ کرسکوں تو کیا کروں؟ آپؐ نے

فرمایا تو پھر تم کسی کام کرنے والے کی مدد کرو یا ایسے شخص کا کام کر دو جو اپنے کام کو بہتر طریقے سے نہیں کر سکتا۔اس نے پھر کہا کہ اگر میں یہ بھی نہ کر سکوں تو کیا کروں؟ آپ ؐ نے فرمایا لوگوں کو تکلیف نہ دو تو یہ تمہارا صدقہ ہوگا جس کا تمہیں اجر ملے گا۔)

معاشرہ سے غربت کے خاتمے کیلئے حسب ذیل امور پر بھی توجہ دینی چاہئے:

اجتماعی نظم زکوۃ' مساجد میں تعلیم و تربیت کا نظم' پڑوس اور قریبی ماحول میں رہنے والے مستحقین کی امداد' صاحب ثروت افراد کے ذریعہ روزگار کی فراہمی' خواتین کیلئے سلائی سینٹرس وغیرہ کا قیام' بعض مسائل جیسے نکاح' صحت' پاکی صفائی اور تعلیم کے حل کے سلسلہ میں نادار لوگوں پر توجہ دینا۔

تعلیمی نظام میں اصلاح

ہمارے ملکی تعلیمی نظام کے سلسلہ میں یہ بات بڑے واضح انداز سے بیان کی جاتی ہے کہ یہ نظام تعلیم انگیریزوں نے بہتر غلام بنانے کے لئے وضع کیا تھا۔اس نظام تعلیم سے گذر کر یہ توقع ہرگز نہ اسوقت کی گئی تھی اور نہ اب کی جاسکتی ہے کہ طلبا ملک کی بھلائی کیلئے اسی طرح فکر مند رہیں گے جس طرح اپنے مستقبل اور گھر کو سنوارنے کی فکر کرتے ہیں۔ چنانچہ بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ آج ملک میں پھیلی بدعنوانی' بددیانتی اور خیانت کے معاملات وہی لوگ کرتے ہیں جو اس نظام تعلیم سے "فیض یاب" ہوئے ہیں۔گرچہ فارغ طلبا سے فائدہ بھی ہوا ہے لیکن یہ فائدہ نقصان کی بہ نسبت بہت کم ہے۔ اس لئے یہاں کے نظام تعلیم میں اصلاح ہونی چاہئے۔

نظام تعلیم میں جو لازمی اجزا ہونے چاہئیں ان میں اول تو معرفت خودی کی بات ہونی چاہئے۔یعنی ہر طالب علم جان جائے کہ وہ کون ہے؟ اور اسے کرنا کیا چاہئے؟ پھر اس سے آگے بڑھ کر طالب علم کو اپنے پیدا کرنے والے کا مکمل تعارف ہو اور معلوم ہو کہ خدا چاہتا کیا ہے۔اس بنیادی فکر کی آبیاری اگر ہو تو تعلیمی نظام کی بنیادیں دیگر اہم

امور پر استوار ہو سکیں گی۔ جن میں اہم ترجیحات کا تعین ہوگا۔ یعنی تعلیم اس طرح دی جائے جس سے معاشرہ میں بھلائی پروان چڑھے اور معاشرہ کی ضرورتوں کی تکمیل کا سامان بھی ہو۔ مختلف میدان کے ماہرین تیار ہوں۔ لیکن آج صرف انجینئرنگ' میڈسن اور مینجمنٹ کے میدان ہی میں تعلیم کا رواج زور پکڑتا جا رہا ہے۔ اور ان میدانوں سے تعلق رکھنے والے ہر سال لاکھوں طلبہ فارغ ہوتے ہیں۔ سماجیات' سیاسیات' نفسیات اور سائنس کی دیگر شاخوں سے متعلق پڑھائی کا رجحان بہت کم پایا جاتا ہے۔ اس یک طرفہ پڑھائی کا نتیجہ یہ نکلا کے معاشرہ کے مختلف گوشے بری طرح متاثر ہوئے' اور بعض معاشرتی مسائل ایسے ہیں جنہیں صحیح ڈھنگ سے اڈریس کرنے کے لئے بہت کم لوگ پائے جاتے ہیں۔ کسی بھی ملک کی ہمہ جہت ترقی کے لئے اس کا نظام تعلیم بھی ہمہ جہت اور ضروریات کی ٹھیک ٹھیک تکمیل کرنے والا ہونا چاہئے' ورنہ جس پہلو پر توجہ نہیں دی جائے گی اس پہلو ہی سے معاشرتی بگاڑ شروع ہوگا۔

نظام تعلیم میں اخلاقی اقدار کا فروغ ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ انسانی قدروں سے ناواقفیت نے طلبا میں انسانی خدمت کے جذبہ کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ اعزازی خدمات انجام دینے کے لئے شاید ہی اسکول اور کالجز کے طلبہ آگے آتے ہوں گے۔ طلبہ کی اس نہج پر تربیت نہ ہونے کی وجہ سے آج بعض مسائل انتہائی سنگین بن گئے ہیں۔ جیسے دیہاتوں میں ڈاکٹرز کا خدمات انجام نہ دینا۔ بڑے شہروں کی بڑی تنخواہوں کے پیش نظر بہت کم ڈاکٹرز ایسے ہوتے ہیں جو دیہی عوام کی خدمت کو ترجیح دیں۔ نتیجتاً دیہاتوں میں نقلی ڈاکٹروں کا زور ہے اور بچوں اور بوڑھوں کا علاج اور حاملہ عورتوں کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

اساتذہ کا رول بھی قابل غور ہے۔ اب استاد اور شاگرد کے درمیانی رشتہ میں وہ بات نہیں رہی جو کبھی ہماری قدیم روایات رہی تھیں اور جس نے ملک کی بہتری اور آزادی میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ آج استاد اور شاگرد کے درمیان کی دوری کئی پہلوؤں کو واضح کرتی ہے۔ اول یہ کہ اساتذہ اپنی ذمہ داری کو کمانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ دوم یہ کہ ان

کی تعلیمی استعداد اور قابلیت اس قدر نہیں ہو پاتی کہ وہ اپنے مضمون سے متعلق طلبا سے کھل کر تبادلہ خیال کر سکیں یا طلبا کو تبادلہ خیال کا موقع فراہم کر سکیں۔ پھر انتظامیہ کا بھی ایک طرح کا دباؤ ہوتا ہے جس کے باعث اساتذہ اپنی مفوضہ ذمہ داریاں ادا کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔

تعلیم، طلبا اور اساتذہ کی اس مجموعی صورت حال کے پیش نظر نظام تعلیم میں زبردست اصلاحات کی ضرورت ہے جس پر بغیر کسی تاخیر کے عمل ہونا چاہئے۔ اور اس نظام تعلیم میں خرابی پیدا کرنے والے یا اس کو ایک مخصوص رنگ دینے والی جو گمراہ کن کوششیں ہیں ان کا بھی بروقت نوٹس لینا چاہئے۔

اس ضمن میں ہمارے تعلیمی ادارے نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں اور ایک حیات بخش پیغام ملک کے ان تمام تعلیمی اداروں کو دے سکتے ہیں جو اخلاقی اقدار سے یا تو خالی ہیں یا پھر اس کی اہمیت سے واقف نہیں ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کی بعثت ایک معلم ومزکی کی حیثیت سے ہوئی:

"هُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الْأُمِّیِّینَ رَسُولاً مِّنْهُمْ یَتْلُو عَلَیْهِمْ آیَاتِهِ وَیُزَکِّیهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ ...." (الجمعہ:۲)

(وہی ہے جس نے امیوں میں سے ایک رسول ﷺ خود انہیں میں سے معبوث فرمایا، جو انہیں اس کی آیات سناتے ہیں، ان کی زندگیوں کو سنوارتے ہیں اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں)

اور آپ ﷺ نے انسانی دنیا میں جو حیرت انگیز انقلاب بپا فرمایا وہ اسی تعلیم کا منطقی ولازمی نتیجہ تھا۔ امت مسلمہ، رسول اکرم ﷺ کی محبت سے سرشار، اسی معلّمی ومزکی کے فرائض انجام دے تو ملک کے تعلیمی نظام میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں۔ ہمارے تعلیمی ادارے، معاشرہ میں موجود تعلیمی اداروں میں اضافہ کی حیثیت نہ رکھیں بلکہ ان تعلیمی اداروں کا اخلاقی اقدار پر مبنی نظام تعلیم، صحت مند طریق تعلیم، طلبا کی گوناں گو صلاحیتوں کی نشوونما پر توجہ اور اساتذہ کی کارکردگی کو بہتر بنانے اور ان کی علمی، فکری اور فنی

تربیت کے لحاظ سے منفرد حیثیت کے حامل ہو جائیں۔

اس ضمن میں ہمارے دینی تعلیمی اداروں کا بڑا نمایاں رول ہے' وہ آج کے بگڑتے تعلیمی ماحول میں مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بس ضرورت ہے کہ مدارس سے فارغ طلبا کو عصری علوم اور ٹیکنکل تعلیم کے لحاظ سے اس قدر روشناس کرایا جائے کہ وہ صرف مسجد یا مدرسہ کی حد تک اپنی معاشی مصروفیات کو محدود رکھنے کے محتاج نہ ہوں بلکہ روزگار کے بے شمار مواقع انہیں دستیاب رہیں۔

روحانیت، اسلامی نقطہ نظر

یہ بات مسلمہ ہے کہ انسان روح وجسم کے مجموعہ کا نام ہے۔ جسم کی ضروریات مادی اشیاء سے پوری ہوتی ہیں۔ جنہیں مرغوبات نفس کہا جاتا ہے۔ ان مادی اشیاء کے استعمال سے جو سرور و کیف دل و دماغ پر چھا جاتا ہے' اور جو لذیتیں محسوس ہوتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی درجہ میں مادی ہی ہیں۔ چنانچہ ہر دور میں جسم کے مطالبات کی تکمیل پر کافی زور دیا گیا۔ یہاں تک دنیا پرستی اس قدر غالب آگئی کہ ماضی کی بعض قومیں تو اسی لئے تباہ ہوئیں کہ وہ اپنی مادی قوت کی بنا خدا کے خلاف بغاوت اور زمین میں فساد برپا کرتے تھے الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ٥ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَاد (الفجر: ۱۲۔۱۱)۔ اور اپنی معاشی ترقی و خوشحالی پر اترایا کرتے تھے۔ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا... (القصص: ۵۸)۔

اس مادی نقطہ نظر کی بحث سے پرے جب انسان کے روحانی پہلو پر غور کیا جائے تو حضرت انسان کی کئی الجھنیں آشکارہ ہوتی ہیں۔ روح کی شادمانی اور مسرت کے سامان کیا ہیں اور انہیں کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ اس کا صحیح جواب ان لوگوں کو کبھی نہیں ملا جو خدا کی ہدایت سے بے نیاز اپنی خود مختاری کے زعم میں مبتلا تھے۔ اس معاملہ میں انہوں نے یا تو غلو سے کام لیا یا پھر سراسر گمراہی کے راستے اختیار کئے۔ دین اسلام کا نمایاں جوہر یہ ہے کہ اس میں روحانیت موجود ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے روحانیت کی تعلیم کو الاحسان کے نام سے موسوم فرمایا' اس سلسلہ کی صحیح حدیث مسلم شریف میں ہے

جسے حضرت عمر بن خطابؓ نے روایت فرمایا:

"اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدُ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ" [1]

(احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر تم یہ نہ کرسکو تو پھر اس طرح اس کی عبادت کرو گویا کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے)

رسول اکرم ﷺ کے اس ارشاد مبارک سے روحانیت کا اصل تصور اجاگر ہوتا ہے، جو آج کے تمام نام نہاد طریقوں اور روحانیت کے نام پر کی جانے والی حرکات کی نفی کرتا ہے۔ اس حدیث پاک سے واضح ہوتا ہے کہ روحانیت کا اصل مقصود قلب کا رابطہ اللہ رب العالمین کے ساتھ درست ہو جائے۔ اور اس رابطہ کی درستگی کے لئے کی جانے والی کوشش بندگی رب کہلاتی ہے۔ یعنی بندگی رب کا بلند ترین مقام یہ ہے کہ عبادت اس طرح کی جائے کہ اللہ کا منظور نظر بننا اور اس کی رحمت کا امیدوار بننا پیش نظر رہے۔ اور دوسرا بلند مقام یہ کہ بندگی کے ذریعہ وہ مقام علم و عرفان حاصل کرنے کی کوشش کی جائے جس کے توسط سے اللہ کی نشانیوں سے عبرت اور کائنات میں اس کے حسن و جمال کے جلوؤں سے بصیرت حاصل ہو سکے۔ چنانچہ دلوں کا اطمینان' سکون و راحت اور امن جیسے روح کے مطالبات صرف ایمان ہی سے وابستہ ہیں۔

روح اور جسم کے اس کشمکشی دور میں امت مسلمہ کو اپنا وجود منوانا چاہیے۔ ماضی میں سنتے ہیں کہ سادھو سنتوں کے بالمقابل اولیا اللہ نے بڑی محنتوں سے اسلام کی حقانیت واضح کی اور بڑی حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے۔ کوئی شخصیت یا کوئی میدان ایسا نہیں رہا جہاں صرف باطل ہی کی نمائندگی ہوتی ہو' بلکہ اہل حق نے ہر جگہ باطل کو دندان شکن جواب دیا۔ لیکن افسوس کے دور حاضر میں ملت کے ایسے افراد کا دور دور تک پتا نہیں چلتا۔ صبح سویرے کسی بھی چینل کو دیکھ لیں' انسانوں کی ایسی اکثریت نظر آئے گی جو روحانیت کی تلاش میں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کا یہ حصہ ایک طرح کے روحانی بہار کا

منتظر ہے۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ حسن وسلیقہ سے یہ دعوت ہر خاص و عام تک پہنچائی جائے کہ امن وسکون کا تعلق اصل میں دل کی ایک خاص کیفیت سے ہے۔ اور دل کی اس خاص کیفیت کا حصول تالیاں بجانے' ہنسے اور بے تکی حرکتیں کرنے سے نہیں بلکہ اپنے خالق و مالک کو جانے' پہچاننے اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گذرانے سے ممکن ہے:

"اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُوْلٰـئِکَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ" (الانعام: ۸۲)

(حقیقت میں تو امن وسکون کی زندگی انہیں کے لئے ہے اور راہ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا)

میدان سیاست

لفظ سیاست اصل میں ان اخلاقیات کے لئے بولا جاتا ہے جن کے ذریعہ سے حکومت چلانا' لوگوں کی رہنمائی کرنا اور معاشرہ کو امن وسکون کا گہوارہ بنانا مقصود ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کا وجود ٹھیٹ سیاسی حیثیت اختیار کر جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سارے انسانوں کی رہنمائی ورہبری کیلئے دنیا میں لایا ہے۔

"کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ...." (آل عمران: ۱۱۰)

(دنیا میں بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)

دین اسلام ہی کے پاس اخلاقیات کا وہ ضابطہ ہے جس سے انسانوں کی رہنمائی و رہبری کیلئے اختیار کئے جانے والے میدان سیاست کے اعلیٰ مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ مگر دین سے متعلق ایسا تصور ملت میں عام نہیں ہے۔ جب دین اسلام کو محدود

معنوں میں لیا گیا' نتیجتاً دھیرے دھیرے ایسی اجتماعی فکر بنتی چلی گئی کہ دین کو سیاست سے بالکل لاتعلق قرار دیا گیا۔ حالانکہ قرآن کریم میں اس ضمن کی واضح تعلیمات موجود ہیں اور رسول اکرم ﷺ کا مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں قیام' دعوتی جدو جہد اور اسلامی ریاست کا قیام، اور اس کاذ کے لئے اصحابؓ کی تیاری ظاہر کرتی ہے کہ دین اور سیاست کوئی جدا جدا چیز نہیں بلکہ دین ہی کا ایک حصہ سیاست ہے۔

اس گمشدہ اور گمنام گوشہ - میدان سیاست - میں صالح تبدیلیاں' اسلام کے اہم ترین مطالبات میں سے ایک ہے۔ کیونکہ آج کسی بھی سطح کے حکمران اپنے طرز عمل اور طرز فکر سے یہ باور نہیں کرا سکیں ہیں کہ وہ فی الواقع لوگوں کی رہنمائی و رہبری کے اہل ہیں۔ ہندوستانی سیاست اور سیاسی حکمرانوں کے کارنامے جو گذشتہ چند دہائیوں سے سامنے آئے ہیں وہ ایسے ہیں جو گلی کے چوروں' گھاٹی کے ڈاکوؤں اور مکر و فریب سے اپنے مفاد حاصل کرنے والے دلالوں کو بھی شرمندہ کر جائیں۔ صحت عامہ سے لیکر پانی تک اور زراعت سے لیکر ماحولیات تک ایسے کئی مسائل ہیں جنہیں فوری حل کرنا تو درکنار' ان کا صحیح صحیح احاطہ تک نہیں کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان مختلف میدانوں میں لوگوں کی مشکلات میں دن دگنی اور رات چوگنی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارا ملک سائنسدانوں اور انجینئروں کی کثرت کے باعث دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے اس کے باوجود ملک کی سالانہ شرح آمدنی غریب ترین ملکوں میں شمار کی جاتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ عوام کے ذمہ دار بن کر یہاں کے حکمرانوں نے عوام سے بڑا ہی گھناؤنا مذاق کیا ہے۔ ان کا اپنے وسائل سے عوام کو فائدہ پہنچانا تو دور کی بات ہے جو قدرتی وسائل انسانوں کے تصرف میں آسکتے ہیں ان کو تک بیچ ڈالا۔ اور جو قدرتی وسائل والے علاقوں میں باشندگان بستے ہیں ان پر مختلف الزام لگا کر وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ تاکہ وسائل کے بے دریغ استعمال میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو۔ نام نہاد دہشت گردی کے نام پر بے قصور لوگوں پر جو ظلم ہو رہا ہے وہ تو سارا ہندوستان جانتا ہے۔ غرض انسانی حقوق کی پامالی ہے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی۔ مضحکہ خیز بات یہ کہ جس

جمہوری اور سیکولر ملک کے یہ حکمران ہیں' انہوں نے اپنے طرز عمل سے اس کی دھجیاں اڑائی ہیں ۔ ہندوستان جیسی رفاہی ریاست کا کام عوام کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کرنا ہے۔ اب اس ملک میں کروڑوں کی تعداد میں لوگ بھوکے ہوں اور سطح غربت سے نیچے زندگی بسر کررہے ہوں تو اسکا مطلب یہی ہوگا کہ حکمران کسی بھی لحاظ سے ملک اور باشندگان ملک کے خیر خواہ نہیں ہیں۔ سیاست دانوں کی یہ بے حسی اور غیر ذمہ دارانہ پن کی حیثیت، میدان سیاست میں موسم خزاں کے خاردار درختوں اور کڑوے کسیلے پھلوں کی سی ہے۔ ان حالات میں لوگوں کی رہنمائی ورہبری کرنا' امت مسلمہ کی دینی واخلاقی ذمہ داری بنتی ہے:

"وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ...." (النساء: ۷۵)

(آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جدوجہد نہ کرو جو کمزور پاکر دبا لئے گئے ہیں۔)

افراد امت' دوسری قوموں کی طرح آنسو نہیں بہا سکتے' اور نہ ہی بے بسی و لاچاری کا اظہار کرسکتے ہیں۔ جو قومیں روتی ہیں اس لئے کہ ان کے پاس نہ خدا ہے اور نہ ہی خدائی ہدایت۔ ملت کو چاہئے کہ اس کے پاس انسانوں کی دنیا و آخرت سنوارنے کے جو بیش بہا خزانے قرآن وسنت کی صورت میں ہیں ان کے مطابق اپنے انفرادی اور اجتماعی عمل کو یقینی بنائے' اس یقین کے ساتھ کے اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت حاصل ہو کر ہی رہے گی۔

سیاست کے میدان میں اسلامی اقدار کا فروغ' بہار کا موجب ہوگا' انشاء اللہ۔ اہل ایمان آگے آئیں اور اس دین کی بنیاد پر دنیا کی قسمت سنوارنے کے سیاسی عمل کو اپنے لئے سعادت سمجھیں۔ یہ تمنا دلوں میں کروٹیں لینے لگے کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ اقتدار سے نوازے تو ہم ہر طرف نیکیوں کی بہار لائیں گے اور برائیوں سے معاشرہ کو پاک رکھیں گے:

"الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ...." (الحج:۴۱)

(اگر ہم اہل ایمان کو زمین میں اقتدار بخشیں تو یہ نماز قائم کریں گے' زکوۃ دیں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور برائیوں سے منع کریں گے۔)

سچ جانئے' آج کی سیاست ان اقدار سے بالکل عاری ہے۔ ہمارے ملک میں غربت کی اصل وجہ وسائل کی تنگی نہیں بلکہ دولت کا ارتکاز ہے۔ دولت غریبوں سے امیروں کی جھولی میں چلی جا رہی ہے۔ ہمارے ملک میں بلاشبہ کروڑ پتیوں کی کمی نہیں لیکن بے یارومددگار غریب کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اسلام کا نظم زکوۃ' اصل میں دولت کے بہاؤ کا نام ہے۔ امیری اور غریبی کے اس امتیاز کو مٹانے کے لئے ہے' جس کے تحت دولت امیروں کی جیبوں سے نکل کر غریبوں کے دامن میں آپڑے گی:

"تُوْخذُ مِنْ اَغنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ اِلٰی فُقْرَ ائِهِم"[۱۸]

((مال) تمہارے ساہوکاروں سے حاصل کیا جائے گا اور اسے تمہارے فقرا میں تقسیم کیا جائے گا)

حکمرانوں کے ذہن کے کسی کونے میں شاید ہی یہ بات ہوگی کہ نیکیوں کو پھیلانا اور برائیوں کو مٹانا ان کی ذمہ داری ہے۔ بلکہ ان کے رویے سے الٹا تاثر ملتا ہے کہ وہ کرسی پر اس لئے بیٹھے ہیں کہ برائیوں کو عام کریں۔ الیکٹرانک میڈیا کے بے تکے استعمال اور عوام دشمن پالیساں ان کی اسی مجرمانہ روش کو ظاہر کرتی ہیں۔

رسول اکرم ﷺ سے بے انتہا محبت اور عقیدت کا تقاضہ ہے کہ آپ ﷺ کے ارشاد مبارک کی روشنی میں حکمران اور رعایا کے درمیان صحت مند تعلقات استوار کرنے کی کوشش میں لگ جائیں۔ یہ ایک ایمانی تقاضہ بھی ہے کیونکہ اسلام ہی وہ دین ہے جو حکومت میں رعایا کو حصہ دار بنایا ہے۔ لہٰذا حکمران اور رعایا کے درمیان بڑے والہانہ تعلقات ہوں۔ ان تعلقات کی صحت پر' سماج اور ملک کی صحت کا دارومدار ہے۔ حکمران و رعایا کے درمیان ایسے تعلقات بغیر خدا کی محبت اور ایمان کے ممکن نہیں۔ لہٰذا جب ہم

حکمران ورعایا کے درمیان کے تعلقات کا اظہار رسول اکرم ﷺ کی زبانی اسطرح کریں:

"..... خِيَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ يُحِبُّوْنَكُمْ وَ تُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَ يُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ....."[۱۹]

(تم میں کے بہترین ذمہ دار وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں۔ تم ان پر رحمت وسلامتی کی دعا کرو اور وہ تمہارے لئے رحمت وسلامتی کی دعا کریں)

تو مطلب یہی ہوگا کہ ہم سیاست کے میدان میں اسلام کے حیات آفریں اقدار کو جاری وساری کر رہے ہیں۔

انسانوں کو جس محبت اور یگانگت کے ذریعہ دعوت دین دی جاتی ہے' سیاست اس کا دوسرا پہلو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی انسانوں کو مسائل اور مشکلات سے حتی الامکان آزاد رکھنے کی کوشش ہونی چاہیئے تاکہ وہ امن وسکون کے ماحول میں اپنی ذات' اس کائنات اور خالق پر غور وفکر کرسکیں۔ گرچہ معاشرتی برائیوں کے ازالہ کے لئے اقتدار ضروری نہیں' ایک غالب خیال ذہن میں ابھرتا ہے کہ اگر سیاسی قوت میسر آجائے تو یقیناً معاشرتی برائیوں اور برائیوں میں ملوث افراد کی اصلاح کا کام بدرجہ اتم کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال ہر دو صورت میں معاشرتی بگاڑ کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ اڈریس کرنا چاہیئے۔ کیوں کہ رسول اکرم ﷺ نے معاشرتی بگاڑ کو عذاب الٰہی کے ایک یقینی ذریعہ کے طور پر واضح فرمایا ہے:

"مَا ظَهَرَ الْغَائِلُ فِيْ قَوْمٍ اِلَّا اَلْقَى اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ وَلَا فَشَا الزِّنَا فِيْ قَوْمٍ اِلَّا كَثُرَ فِيْهِمُ الْمَوْتُ وَلَا نَقَصَ قَوْمٌ نِ الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِلَّا قُطِعَ عَنْهُمُ الرِّزْقُ وَلَا حَكَمَ قَوْمٌ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا فَشَا فِيْهِمُ الدَّمُ وَلَا خَتَرَ قَوْمٌ بِالْعَهْدِ اِلَّا سُلِّطَ عَلَيْهِمُ الْعَدُوُّ"[۲۰]

(جس قوم میں خیانت ظاہر ہوجائے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں رعب

ڈال دیتا ہے۔اور جس قوم میں زنا پھیلے وہاں موت کی کثرت ہو جاتی ہے)

جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے اس کا رزق کم کر دیا جاتا ہے جو قوم حق کے خلاف فیصلے کرے' اس کے درمیان خونریزی عام ہو جاتی ہے۔

جو قوم اپنا معاہدہ توڑے اس پر دشمن مسلط کر دیا جاتا ہے۔(حضرت ابن عباس، موطا مالک)

اب ظاہر بات ہے کہ جو لوگ' لوگوں کی فکر کریں' ان کے مسائل کے لئے یکسو ہو جائیں اور انہیں ہر طرح سے سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے نیک اعمال انجام دیں' ان کا یہ طرز عمل' رب کریم کی مزید رحمتوں اور برکتوں کا موجب ہوگا:

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً ...."(النور:۵۵)

(اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ انہیں ضرور ملک کی حکومت عطا کرے گا جیسا ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو عطا کر چکا ہے۔ان کے لئے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے۔اور ان کی حالت خوف کو امن سے بدل دے گا)

اور آخرت میں بلندیٔ درجات کا ذریعہ بھی:

"مَنْ اَغَاثَ مَلْهُوْفاً كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ ثَلٰثاً وَّ سَبعِيْنَ مَغْفِرَةً وَّاحِدَةً فِيْهَا صَلَاحُ اَمْرِهٖ كُلِّهٖ وَثِنْتَانِ وَسَبعُوْنَ لَهُ دَرَجَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"[۱۲]

(جس نے کسی مظلوم کی فریاد رسی کی تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے تہتر (۷۳) مغفرتیں لکھ دیتا ہے جن میں سے ایک اس کے تمام کاموں کو

درست کرتی ہے اور باقی بہتر (۷۲) قیامت کے روز اس کے لئے
درجات ہوں گے)

معاشرہ میں امن کا قیام

آج کے دور کا ایک اور المیہ معاشرہ میں امن وسلامتی کے قیام سے متعلق ہے۔ معاشرہ میں امن کا قیام' معاشرہ میں رہنے والے ہر فرد کے تعاون ہی سے ممکن ہے۔ نہ صرف تعاون بلکہ ہر فرد میں اعتماد کی روح پھونکی جائے کہ اس کا وجود معاشرتی بھلائی کے لئے ہے۔ تا کہ ہر فرد معاشرہ کے ہر فرد سے انسانی بنیادوں پر تعلقات استوار رکھے' ان کے ساتھ مل جل کر رہنے میں اپنا اور دوسروں کا بھلا سمجھے اور اگر کسی وجہ سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر صبر کرے الا یہ کہ معاشرہ سے کٹنے کا خیال اپنے دل میں لائے۔ رسول اکرم ﷺ نے معاشرہ میں امن کے قیام کیلئے اس امر کو ایک بنیاد کی حیثیت سے پیش فرمایا:

"اَلَّذِی یُخَالِطُ النَّاسَ وَیَصْبِرُ عَلٰی اَذَاهُمْ خَیْرٌ مِنَ الَّذِیْ لاَ یُخَالِطُ وَلاَ یَصْبِرُ عَلٰی اَذَاهُمْ" [۲۲]

(وہ جو لوگوں سے مل جل کر رہتا ہے اور ان کے تکلیف دینے پر صبر کرتا ہے اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے مل جل کر نہیں رہتا اور نہ ہی ان کے تکلیف دینے پر صبر کرتا ہے)

معاشرتی امن کیلئے ایک فرد کا بھی معاشرہ سے جدا ہونا پسندیدہ نہیں چہ جائیکہ کسی گروہ کی بات کی جائے۔ مگر ستم ظریفی دیکھئے آج معاشرہ میں امن کی بحالی اور سیکورٹی کے نام پر ایک مخصوص لوگوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اس تناظر میں پرزور وضاحت کرنی چاہئے کہ مظلوموں پر ظلم' معاشرتی امن' ترقی وخوشحالی کے لئے سم قاتل ہے۔ رہی بات سماج دشمن عناصر کی' وضاحت کی جائے کہ دین اسلام نے ان سے کس حد تک دوری اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ کہ دہشت گرد حملہ اور کارروائی تو دور کی بات' رسول اکرم ﷺ

کا فرمان ہے:

"مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا" [۲۳]

(کہ جو ہم پر تلوار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے)

رہی بات عصبیت کی، اس سے فکر و عمل کی پاکی ہی سے ایمان سلامت رہ سکتا ہے۔ لہذا جو بھی برائی کرے گا، اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک شخص نے اللہ کے رسول ﷺ سے عرض کیا:

"اَمِنَ الْعَصَبِيَّةِ اَنْ يُّحِبَّ الرَّجُلُ قَوْمَهُ؟ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا وَلٰكِنْ مِّنَ الْعَصَبِيَّةِ اَنْ يَّنْصُرَ الرَّجُلُ قَوْمَهُ عَلَى الظُّلْمِ" [۲۴]

(کیا اپنے لوگوں سے محبت کرنا عصبیت ہے؟ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا نہیں، بلکہ عصبیت یہ ہے کہ آدمی ظلم کے معاملے میں اپنی قوم کا ساتھ دے)

پھر عصبیت سے لاتعلقی کا اظہار فرمایا:

"لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰى عَصَبِيَّةٍ وَّ لَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَصَبِيَّةً وَّ لَيْسَ مِنَّا مَنْ مَّاتَ عَلٰى عَصَبِيَّةٍ" [۲۵]

(وہ ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی طرف بلائے اور وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کے باعث لڑے اور وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت پر مرے)

امن کے قیام اور استحکام کے لئے باہمی اعتماد کی فضا بڑے پیمانے پر عام ہونی چاہئے۔ کسی بھی فرد کو، کہیں بھی اجنبیت کا احساس نہ ہو اور نہ ہی وہ اپنے کو مجرم سمجھ بیٹھے۔ لیکن یہ ایک عام منظر ہے کہ ہر طرف سیکورٹی اور نگہداشت کے نام پر غیر ضروری چیکنگ اور جگہ جگہ کیمرے نصب کرنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ کیا دکان اور کیا بس اور ریلوے اسٹیشن، کیا ٹرافک سگنل اور کیا ایر پورٹ ہر جگہ مشکوک ہاتھ (سیکورٹی چیک اپ) اور مصنوعی آنکھوں (کیمرے) کا ڈیرہ ہے۔ اس سے بڑی حد تک ایک مصنوعی ماحول فروغ

پار رہا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ معاشرہ کی حفاظت کرنا ہر شہری اپنا فرض سمجھے' اسے کیمروں کی آنکھوں سے گذار کر یہ باور کرایا جاتا ہے کہ بگاڑ کا تم بھی ایک سبب ہو سکتے ہو۔ دکانوں میں بھی کیمروں کی موجودگی نے نوکروں میں سے اپنے مالک کے لئے اخلاص کے ساتھ کرنے والے کاموں کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ یہاں بھی کام کاج میں مصنوعیت غالب نظر آتی ہے۔ اگر معاشرہ میں باہمی اعتماد کی بجائے اس طرح ایک دوسرے کے ٹوہ میں لگنے کا معاملہ ہو تو' امن کا قیام ایک خواب ہی رہ سکتا ہے کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ معاشرہ میں رہنے والے لوگ کار خیر میں باہمی اعتماد کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر سعی و جہد کر سکیں۔ رسول اکرم ﷺ نے معاشرتی بھلائی کے لئے زریں اصول واضح فرمائے:

''اِنَّ الْاَمِیْرَ اِذَابْتَغَی الرِّیْبَۃَ فِی النَّاسِ اَفْسَدَھُمْ''[٢٦]

(جب ایک حکمران اپنے ماتحت لوگوں میں شک کرنے لگے تو ان میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے)

''اِنَّکَ اِذَا اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ اَفْسَدْتَھُمْ''[٢٧]

(جب تم لوگوں کی چھپی ہوئی باتوں کی ٹوہ میں پڑ جاؤ گے تو انہیں خراب کر دو گے)

انہیں زریں اصولوں کے تحت شک وشبہ میں گھرے معاشرہ کو آپسی اعتماد اور محبت کی فضا سے دلکش وخوشنما بنایا جا سکتا ہے۔

تکثیری معاشرہ میں مسلمانوں کا متوقع کردار

ایک تکثیری سماج میں ملت اسلامیہ کا وجود بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جس انسانیت کی جانب رسول اکرم ﷺ مبعوث فرمائے گئے، اس کی رنگارنگی، اس کے افکار و خیالات اور تہذیب وعقائد ایک مخلوط معاشرہ میں ہی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اور ہمارا ملک اس کی بہترین مثال ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت جو شرک کا عالم تھا' اس

سے زیادہ آج ہمارے معاشرہ میں شرک نظر آتا ہے۔ جو اخلاقی گراوٹ اس وقت تھی، آج بھی وہ گراوٹ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس لئے ملت اسلامیہ کو انسانوں کی رہنمائی و رہبری کے سلسلہ میں بڑا ہی منفرد رویہ، قرآن و سنت کی روشنی میں اختیار کرنا چاہیئے۔ معاشرہ الگ سے محسوس کرے کہ یہ امت، انسانوں کی رہنما امت ہے۔ اس ضمن میں جہاں اخلاص وللّٰہیت، عبادات و معاملات میں شفافیت کی ضرورت ہے وہیں اعلیٰ اخلاق و کردار اور دین کی بنیاد پر انسانی مسائل کو حل کرنا بھی ضروری ہے۔ انسانوں سے محبت و الفت کے تعلقات، بے لوث خدمت کا جذبہ، مختلف انفرادی و اجتماعی مسائل کے حل کی کوشش بلاشبہ ملت کے مقام کو بڑا ہی نمایاں کرسکتی ہے۔ ایک تکثیری سماج میں جس طرح دیگر قومیں گذر بسر کرتی ہیں اور اپنے مطالبات منوانے کیلئے کوئی بھی طریقہ اختیار کرنے سے گریز نہیں کرتی، اس طرح کا معاملہ امت مسلمہ کا نہیں ہونا چاہیئے۔ دستور ہند نے جو مراعات دیئے ہیں اور حکومت کی جانب سے جو صحت مند پالیسیاں وجود میں لائی جاتی ہیں ان سے استفادہ ہونا چاہیئے۔ دیگر حقوق کے حصول کی قرآن و سنت کی بنیاد پر کوشش ہونی چاہیئے۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ تم میرے بعد عنقریب ناپسندیدہ امراء اور ان کے اثرات دیکھو گے۔ لوگوں نے عرض کیا اگر ہم میں سے جو شخص ایسا زمانہ پائے تو کیا کرے؟ آپؐ نے فرمایا:

"اَدُّوْا الْحَقَّ الَّذِیْ عَلَیْکُم وَ سَلُوْا اللّٰہَ الَّذِیْ لَکُمْ" [۲۸]

(اپنے اوپر واجب حقوق ادا کرو اور اپنے حقوق اللہ تعالیٰ سے مانگو)

جس دور میں ہم ہیں، جو حکمراں ہم پر مسلط ہیں، انہیں معلوم ہی نہیں کہ کس سمت میں ملک و باشندگان ملک کو لے جانا ہے؟ کسی بھی سطح کی ان کی کارکردگی سے نہیں لگتا کہ ان کی اپنی کوئی سوچ و فکر ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے ملک دھیرے دھیرے ذہنی غلامی کی طرف بڑھ رہا اور عوام کی اکثریت مفلوک الحال ہے۔ اور ہر پیدا ہونے والا بچہ اپنے اوپر ہزاروں کا قرض لے کر دنیا میں آتا ہے۔ ایسے ناپسندیدہ حالات میں واجب حقوق کی ادائیگی پر توجہ ہو۔ اور ہمہ جہت ترقی کیلئے کوشش بھی۔

اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی۔ حقوق کی ادائیگی سے مراد انسانوں کی بہی خواہی کیلئے کما حقہ جدو جہد کی جائے۔ اور اللہ تعالیٰ سے اس کام کیلئے تائید و نصرت طلب کی جائے۔ اس پرفتن دور میں ملک اور باشندگان ملک کی خیر خواہی کیلئے مثالی جدو جہد اللہ کے رسولؐ کے اس ارشاد مبارک سے واضح ہوتی ہے:

ایک مرتبہ اللہ کے رسولؐ نے فتنہ کا ذکر فرمایا اور اسکا قریب ہونا بھی واضح کیا۔ لوگوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ (فتنہ کے ایسے حالات میں) کون شخص بہتر ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا:

"رَجُلٌ فِيْ مَا شِيَتِهٖ يُؤَدِّيْ حَقَّهَا وَيَعْبُدُرَبَّهٗ"[۲۹]

(ایک تو وہ شخص جسکی ملکیت میں جانور ہوں اور وہ ان کا حق ادا کرتا ہو اور ساتھ ہی اپنے رب کی عبادت کرتا ہو)

"وَرَجُلٌ اٰخِذٌ بِرَأْسِ فَرَسِهٖ يُخِيْفُ الْعَدُوَّ وَيُخَوِّفُوْنَهٗ"[۳۰]

(اور دوسرا وہ شخص جو اپنے گھوڑے کا سر پکڑ کر نکلے دشمن اس سے خوف زدہ ہوں اور وہ اس کو ڈراتے ہوں)

جس کی ملکیت میں جانور ہوں' وہ ان کا حق ادا کرے۔ روزگار کا جو بھی ذریعہ ہو اس کا بھی حق ادا کرے تا کہ معاشی استحکام ہو سکے۔ اور اس کاروباری مصروفیات میں وہ اپنے رب کو یاد رکھے' عبادت کا اہتمام کرے۔ انسانوں کی خدمت کیلئے ہمیشہ اپنے وسائل کے ساتھ تیار رہے۔ جب جدھر ضرورت مند و مستحق نظر آئیں ان کی خدمت کے لئے دوڑ پڑے۔ اور جب مسائل کے حل کیلئے توجہ دی جائے اور انسانوں کی ضرورتیں پوری کرنے کی کوشش ہو تو جو لوگ اپنے مفادات کیلئے خطرہ محسوس کریں گے وہ ایسے بے لوث خادم سے خائف بھی رہیں گے اور اسے ڈرانے دھمکانے کی کوشش بھی کریں گے۔ ہر دو صورت میں حرکت و عمل' معاشرتی سدھار کا بڑا انمول نسخہ ہے۔ ہندوستانی معاشرہ کی بھلائی' مسلمانوں کے ایسے ہی بے مثال کردار سے ممکن ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ H.Wills - Islamic History

۲۔ Gustave Le Bon - The World of Islamic History

۳۔ John William Draper - The History of the Intellectual Development of Europe

۴۔ صحیح مسلم، ابی الحسین مسلم بن الحجاج القشیری، بروایت ابوہریرہؓ

۵۔ مسند احمد، الامام احمد بن حنبل الشیبانی، ۱/۳۸۸

۶۔ مسند احمد، ۱/۳۸۸

۷۔ مسند احمد، ۱/۳۸۸

۸۔ مسند احمد، ۱/۳۸۸

۹۔ مسند احمد، ۴/۱۹۴؛ ترمذی، زھد، ص ۵۳

۱۰۔ ترمذی، ابوعیسیٰ الترمذی، ابواب السیر، باب ماجاء فی الغلول، حدیث نمبر: ۱۵۷۳

۱۱۔ بخاری، محمد بن اسماعیل البخاری، کتاب الآداب، باب حفظ اللسان، حدیث نمبر: ۶۴۷۴

۱۲۔ نیل الاوطار للشوکانی

۱۳۔ اسدالغابہ، عزالدین بن الاثیر ابوالحسن علی بن محمد الجزری

۱۴۔ اسدالغابہ

۱۵۔ بخاری، کتاب الادب، باب الساعی علی المسکین، حدیث نمبر: ۶۰۰۷

۱۶۔ بخاری، کتاب العتق، باب ای الرقاب افضل، حدیث نمبر ۲۵۱۸

۱۷۔ مشکوٰۃ، محمد خطیب التبریزی، کتاب الایمان، حدیث جبرئیل

۱۸۔ بخاری، کتاب الزکاۃ، باب اخذ الصدقۃ من الاغنیاء وترد فی الفقراء، حدیث نمبر: ۱۴۹۶

۱۹۔ مسلم، کتاب الامارۃ، باب خیار الائمۃ وشدائدہم، حدیث نمبر: ۱۸۵۵

۲۰۔ موطا امام مالک، کتاب الجہاد، ص ۱۹

۲۱۔ ابوبکر بیہقی، حضرت انسؓ

۲۲۔ مسند احمد، ۳/۴۳؛ ۵/۴۶۰۰

۲۳۔ بخاری، کتاب الفتن، باب من حمل علینا السلاح فلیس منا

۲۴۔ مسند احمد، ۴/۱۶۰؛ ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب العصبیۃ۔

۲۵۔ ابوداؤد، الامام ابی داؤد بن الاشعث بن اسحٰق السجستانی، ابواب الادب، باب فی العصبیۃ

۲۶۔ ابوداؤد، کتاب الادب، ص ۳۷؛ مسند احمد، ۶/ ۴۸

۲۷۔ ادب المفرد، محمد بن اسماعیل البخاری

۲۸۔ ترمذی، کتاب الفتن، ص ۲۵؛ مسند احمد، ۱/ ۴۳۸

۲۹۔ ترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء فی الرجل یکون فی الفتنۃ، حدیث نمبر: ۲۱۷۷

۳۰۔ ترمذی، کتاب الفتن، حوالہ سابق

☆☆☆

اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیت کے معاشی حقوق

ظفر دارک قاسمی *

اسلام تمام نوع انسانیت کی جملہ ضروریات و حاجات کا ضامن ہے۔ اسلام نے زندگی کے تمام شعبوں پر امت کی رہنمائی کی اور ان کی تعلیمات سے متنبہ کیا ہے تاکہ معاشرہ پرامن رہے۔ زندگی گذارنے کے لیے صالح معاش کا حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔ معاشی وسائل کا اختیار کرنا اور اس کی جدو جہد میں وقت گزارنا کار خیر ہے قرآن و حدیث میں اسباب معیشت کی جستجو کی خاصی اہمیت و فضیلت آئی ہے کیونکہ معاشرہ اور سماج کے مہذب ہونے کے لیے ضرری ہے کہ صالح معیشت کی فراہمی ہو اگر انسانی حاجات کی تکمیل نہ ہوگی تو لامحالہ سوسائٹی کا امن و امان غارت ہوگا آپسی تناؤ، تشدد و بربریت اور بدعنوانی سے ہمارا سماج عبارت ہونے لگے گا اگر ہم صالح معاشرہ کی تشکیل کے خواہاں ہیں تو ضروری ہے کہ اپنی سوسائٹی، ملک وقوم میں صالح معاش اور اس کے وسائل کی جڑیں مضبوط کریں۔ تبھی جاکر بقائے باہم اور جذبۂ خیر سگالی سے معاشرہ مزین ہوگا۔ یقیناً تلاش رزق اور وسائل معیشت حاصل کرنے کو اسلام میں عبادت سے تعبیر کیا گیا ہے جہاں تک معاشی وسائل کو اختیار کرنے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں قرآن و سنت میں تین اہم اور بنیادی شعبوں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ جنہیں ہم کسب معاش کی شاخیں کہہ سکتے ہیں (۱) زراعت (۲) تجارت (۳) صنعت وحرفت۔ ان عناصر ثلاثہ کو اختیار کرکے معاش کا حاصل کرنا ایک آسان امر ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب سے نوع انسانی نے مذکورہ عناصر کو ترک کیا ہے۔ اس وقت سے آج تک امت خوشحال زندگی

---

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ دینیات (سنی)، اے-ایم-یو، علی گڑھ

گزارنے کے لیے ترس گئی۔ اورغربت و افلاس کے گڑھے میں جا گری۔ جو قومیں اپنی زندگی کو خوش حال گزارنا چاہتی ہیں وہ اسباب معیشت کو زندگی کا جز ولا ینفک سمجھتی ہیں۔ اسلام نے مذکورہ تین اہم شعبوں کی طرف امت کی رہنمائی فرمائی ہے ان کے متعلق اسلامی نقطہ نظر سے جو تعلیمات و ہدایات وارد ہوئی ہیں۔ وہ عام ہیں ان میں کسی قوم مذہب یا رنگ و نسل کی تعیین نہیں ہے، زیر نظر مقالہ میں غیر مسلموں کے معاشی حقوق سے متعلق گفتگو کی جائے گی۔ آج عالمی سطح پر جو قومیں آپس میں دست و گریباں ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے حقوق غصب کررہے ہیں۔ اور ہماری اقتصادیات زوال یافتہ ہیں جہاں بھی قومیں اقلیتوں میں شمار ہوتی ہیں وہ کہیں نہ کہیں ہمارے بے جا مظالم کا شکار ہیں اس لیے ہمیں ان کے جملہ حقوق و فرائض کا عطا کرنا ضروری ہے۔ تبھی جا کر ایک صحت مند معاشرہ کی تشکیل عمل میں آسکتی ہے۔

کسب معاش کی اہمیت

قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ بات کہنا درست ہے کہ جس طرح اسلامی ریاست میں ایک مسلم معاشرہ اپنی خوشحال و خوشگوار زندگی گزارنے کی جدو جہد کرسکتا ہے۔ اسی طرح اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری (ذمی، مستامن، معاہد) بھی خوشحال معیشت کے لیے تگ و دو کرسکتا ہے۔ آزادانہ معاشی جدو جہد اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کا بنیادی حق ہے۔ ایک صالح اور فلاحی ریاست کا یہ فریضہ ہے کہ اس کے تمام شہری خوشحال اور پر امن رہیں۔ کیونکہ معاش یا معیشت اور تلاش رزق کی آزادانہ جدو جہد شہریوں کا بنیادی حقوق ہے۔ قرآن و سنت میں ان گنت ٹھوس شواہد موجود ہیں جو بلاتفریق ہر فرد و بشر کو کسب معاش کی ترغیب دیتے ہیں۔

"وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلاً مَّا تَشْكُرُونَ"(اعراف:۱۰)

(اور بے شک ہم نے تمہیں زمین میں ٹھکانہ دیا اور اس میں تمہاری

زندگی کا سامان رکھا مگر تم لوگ کم ہی شکر کرتے ہو۔)

اللہ تعالیٰ تلاش رزق کے متعلق ارشاد فرماتا ہے:

''فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ''(جمعہ:۱۰)

(پس جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل (رزق) کو تلاش کرو)

سورہ عنکبوت میں ارشاد ہے:

''إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوا عِندَ اللَّهِ الرِّزْقَ''(عنکبوت:۱۷)

(جس کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو وہ تمہاری روزی کے مالک نہیں ہیں سو تم تلاش کرو اللہ کے پاس سے روزی)

''وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ''(مزمل:۲۰)

(اور کتنے لوگ ہیں جو پھرتے ہیں ملک میں اللہ کے فضل (روزی) کو تلاش کرتے)

علامہ جصاص نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ:

''سوی اللّٰہ تعالیٰ فی ھذہ الآیة بین درجة المجاھدین والمکتسبین المال الحلال لنفقتة علی نفسه وعیا له: قال طاؤس الساعی علی الأرملة والمساکین کالمجاھدفی سبیل اللہ ابتغیٰ من فضل اللہ ضاربافی الارض''[1]

جہاں قرآن نے مردوں کے لیے یہ حق عنایت کیا ہے وہیں یہ بھی کہا گیا کہ عورتیں بھی اپنی زندگی گذارنے کے اسباب تلاش کریں باقاعدہ سورہ نساء میں اس کا اعلان کیا گیا ہے۔

''لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُواْ وَلِلنِّسَاء نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْأَلُواْ اللَّهَ مِن فَضْلِهِ''(نساء:۳۲)

(مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں اور عورتیں کے لیے حصہ ہے جو وہ کمائیں)

لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ معاشی اسباب کو اختیار کرنے کا حق جملہ نوع انسانی کو حاصل ہے چاہے وہ کسی مذہب وقوم سے وابستہ ہو یا کسی بھی جگہ کا رہنے والا ہو بنا بریں یہ برحق ہے کہ اسلامی ریاست میں جس طرح مسلم وغیر مسلم مرد وسائل معیشت تلاش کرنے کا حق رکھتے ہیں اسی طرح غیر مسلم عورتیں بھی اپنے اس حق کو حاصل کرنے کی حقدار ہیں۔

روزی کی مقدار کے متعلق قرآن نے بڑی عمدہ بات کہی ہے۔ سورہ نجم میں ارشاد ہے۔

"وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ٥وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ"(نجم:۴۰)

(نہیں ہے آدمی کے لیے مگر وہی جو اس نے کمایا اور قریب ہے کہ دکھائی دے اسے اپنی کمائی)

خود حضور ﷺ نے کسب معاش پر کسقدر زور دیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کے ارشادات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

''طلب کسب الحلال فریضة بعد الفریضه'' [۲]

(حلال رزق کا کمانا اللہ کے فریضہ عبادت کے بعد اہم فریضہ ہے)

دوسری روایت میں ارشاد ہے: اذا صلیتم الفجر فلا تنوموا عن ارزاقکم [۳]

''جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنے رزق کی جدو جہد کے بغیر آرام کا نام مت لو''

تلاش رزق سے متعلق حضرت محمد ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے: اطلبو الرزق فی خبایا الارض [۴] ''اپنی روزی کو زمین کے پوشیدہ خزانوں میں تلاش کرو'' وسائل معیشت کی جستجو آپ کے اس فرمان مبارک سے مزید واضح ہوجاتی ہے۔

لایقعد احدکم عن طلب الرزق [۵] ''تم میں سے کوئی شخص بھی طلب رزق کی جدو جہد میں پست ہوکر نہ بیٹھ جائے'' صاحبِ اتحاف السادہ نے مذکورہ قول کی تائید

اس طرح کی ہے۔

"ای لا بدّ للعبد من حرکة و مباشرة بسببٍ من اسباب یتحصل به طریق الوصل إلی الرزق"[۶]

(ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جائز اسباب معیشت میں سے کسی سبب اور وسیلہ کو ضرور اختیار کرے۔ جس سے وہ رزق کو حاصل کر سکے)

تلاش رزق کو حضور ﷺ نے بعض گناہوں کا کفارہ بھی بتایا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رزق کی کدو کاوش انتہائی ضروری ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

"من الذنوب ذنوب لایکفر ھا الا انھم فی طلب المعیشة"[۷]

(بعض گناہوں میں ایسے گناہ ہیں جن کا کفارہ صرف طلب معیشت کی فکر اور جدو جہد کی کاوش ہی سے ہو سکتا ہے)

ایک شخص نے حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا کہ اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو یہ سوچ کر گھر یا مسجد میں بیٹھ جائے کہ میری روزی خود بخود میرے پاس پہنچ جائے گی۔ اس کے لیے مجھے محنت کرنے کی ضرورت نہیں امام احمد بن حنبلؒ نے جواب دیا کہ ایسا شخص جاہل ہے اسے معلوم نہیں کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان الله رزقنی تحت رمحی[۸] "اللہ نے میرا رزق میرے نیزے کے نیچے رکھا ہے"۔

تاریخ اور عمرانیات کے نامور عالم دین علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فابتغو اعندالله الرزق[۹]

ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جائز طریقہ سے رزق کی تلاش کرنا زندگی کے بقا و تحفظ کے لیے ضروری ہے۔ بنی نوع انسان کی کامیابی اور خوشگوار زندگی گزارنے کا راز اسی میں مضمر ہے کہ اس کی تلاش کا محور حلال اور طیب مال کے لیے ہو۔ ہماری تلاش و جستجو کا دائرہ اتنا وسیع نہ ہونے پائے کہ حرام کی آمیزش ہونے لگے، کیونکہ قرآن نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا ہے کہ ہماری جدو جہد جائز ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"یَا أَیُّھَا النَّاسُ کُلُواْ مِمَّا فِی الأَرْضِ حَلاَلاً طَیِّباً وَلاَ تَتَّبِعُواْ

خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ" (بقرہ:۱۶۸)

(اے لوگو جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال طیب کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو)

سورۃ نحل میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلاَلاً طَيِّباً (نحل:۱۱۴) "یعنی کھاؤ جو روزی تم کو اللہ نے دی ہے۔ حلال اور پاک" وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلاَلاً طَيِّباً (مائدہ:۸۷) "پس اللہ نے جو کچھ تم کو حلال دیا ہے اس میں سے حلال طیب کھاؤ" علامہ رشید رضا نے "طیب" کی تفسیر یہ کی ہے کہ:

طیب سے مراد وہ اشیاء ہیں جن کے ساتھ غیر کا حق متعلق نہ ہو۔ اس لیے کہ نص قرآنی نے جن اشیاء کو حرام کیا ہے ان کی حرمت تو ذاتی ہے اور اس لیے مضطر کے علاوہ کسی حال میں کسی کے لیے ان کا استعمال درست نہیں اور ان کے علاوہ جن اشیاء کی حرمت اس شئی کی حقیقت اور ذات میں نہیں پائی جاتی بلکہ باہر کے اسباب سے حرمت آتی ہے ان کی ممانعت "طیب" کے ذریعہ سے کر دی گئی ہے۔ پس جو شئی ناحق لی گئی ہو اور صحیح طریق کار سے حاصل نہیں کی گئی بلکہ ربا، رشوت، جوا، ظلم، غصب، دھوکا، خیانت اور چوری جیسے ناپاک ذرائع سے حاصل کی گئی ہو وہ بھی حرام ہے اس لیے کہ "طیب" نہیں ہے پس ہر خبیث شئی حرام ہے خواہ وہ خبث باہر کے اسباب و ذرائع سے اس میں آیا ہو اور خواہ اس کے اندر موجود ہو جیسا کہ کھانے پینے کی چیزوں میں سڑ کر بو آ جانا۔[۱۰]

غیر مسلموں سے کاروبار

وسائل معیشت کا پہلا شعبہ تجارت ہے اس کی ترغیب بھی قرآن و سنت میں خاصی وضاحت کے ساتھ آئی ہے۔ مگر ان کے دو اہم جز بتائے گئے ہیں۔ (۱) صحیح تجارت (۲) فاسد تجارت قرآن و سنت کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ صالح اور صحت مند معاشرہ کے وجود کے لیے ضروری ہے کہ تجارت میں صحیح اور غلط کا پورا خیال رکھا جائے۔

نیز اسلام فاسد تجارت کی مذمت کرتا ہے بہر حال معاشی بڑھوتری کے لیے تجارت ایک اہم ذریعہ ہے۔ لہٰذا اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ریاست کے تمام مسلم و غیر مسلم شہریوں کو صاف ستھری اور جائز تجارت کے مواقع فراہم کرے۔ فقہاء نے بڑی عمدہ بات کہی ہے:

فالبیع والشعراء من أکبر الوسائل الباعثة علی العمل فی هذه الحیوة الدنیا وأجل اسباب الحضارة والعمران [11] ''تجارت اس دنیا میں معاشی وسائل میں سے سب سے بڑا وسیلۂ معاش ہے اور تمدن و حضارت کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب ہے''۔ تجارت کی طرف رغبت دلاتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

لاتَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُم (سورہ نساء:۲۹) ''اپنے اموال کو آپس میں باطل کی راہ سے مت کھاؤ بلکہ باہمی رضا کے ساتھ تجارت سے نفع حاصل کرو''

صالح تاجر کے بارے میں حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جو تاجر تجارت میں عدل وانصاف اور عوام کی خیر خواہی کا خیال رکھتے ہیں ان کا حشر شہداء صدیقین کے ساتھ ہوگا۔

قال رسول الله ﷺ التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشهداء [12] ''حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سچے اور امانت دار تاجر کا حشر نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا''۔

اسی مضمون کی دوسری روایت ملاحظہ کیجیے۔

''عن النبی ﷺ قال التجار یحشرون یوم القیامة فجارا إلا من اتقی وبر وصدق'' [13]

(رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن تاجر فاسق و فاجر ہوکر اٹھیں گے مگر یہ کہ انھوں نے بھلائی اور سچائی سے کاروبار کیا ہو)

کیونکہ تجارت کا بنیادی مقصد باہمی تعاون ہے، قرآن نے امت کے جملہ افراد کو حکم دیا ہے کہ اچھائی میں تو تعاون کیا جائے اور برے کاموں میں کسی کا بھی تعاون

نہ کیا جائے۔

"تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلاَ تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (مائدہ:۲)

(بھلائی اور پرہیز گاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہوں اور ظلم پر کسی کے ساتھ تعاون نہ کرو)

پتہ یہ چلا کہ معاملہ تجارت میں جانبین سے حقیقی رضاء کا وجود ضروری ہے۔ جبری رضاء معتبر نہیں ہے۔ یعنی یہ نہیں ہو کہ ایک شخص بخوشی اس معاملہ کے لیے آمادہ نہیں ہے مگر اس کی اضطراری کیفیت اس کی رضاء کی سبب بن گئی ہو۔ معاملہ کرتے وقت اس چیز کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ اہل معاملہ، معاملہ کی اہلیت رکھتا ہے یا نہیں۔ تجارت میں کسی کو دھوکہ دینا سخت گناہ ہے۔ اسی لیے فقہا نے لکھا ہے:

"والبیع المبرور ھو البیع الذی لاخیانة فیه ولاشبهة فلم یغش ولم یخل ولم یعص الله فیه" [۱۴]

(اور بیع مبرور ایسی بیع و مبرور کو کہتے ہیں کہ جس میں متعاقدین ایک دوسرے سے تعاون اور بھلائی کا معاملہ کریں یعنی نہ اس میں دھوکہ ہو نہ خیانت اور نہ خدا کی معصیت لازم آتی ہو)

اس لیے ضروری ہے کہ متعاقدین معاملہ کو پوری طرح واضح کریں تا کہ باہمی رضا مندی، تعاون اور بھائی چارگی میں کسی طرح کی جھول پیدا نہ ہو۔ جائز اور پاک تجارت خود حضور ﷺ نے کی ہے۔

"ان النبی ﷺ اشتریٰ طعاما من رجل یهودی إلی أجل ورهنه درعاً من حدید" [۱۵]

(حضور ﷺ نے ایک یہودی شخص سے کھانے کی چیز خریدی معین مدت تک جس کے لیے لوہے کی ذرہ آپ نے رہن رکھی)

اسی طرح حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ کی وفات اس حال میں

ہوئی کہ آپ کی ذرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع جو کے عوض رہن تھی ۱۶؎ اس حدیث سے ابن دقیق العید نے یہ استدلال کیا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کفار سے معاملہ کرنا جائز ہے۔ اور یہ کہ ان کے آپس کے معاملات کے فساد کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ احکام الاحکام کے محشی اور تعلیق نگار صاحب عمدہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ کفار سے اس بحث کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ خنزیر کا کاروبار کرتے ہیں یا سود کھاتے ہیں یا یہ کہ ان کے پاس مال کیسے آیا؟ اسلامی ریاست ان سے جزیہ لے گی اس کے بعد ان سے بیع و شراء اور خرید و فروخت کا معاملہ اسی طرح کرے گی۔ جیسے ان کے پاس حلال مال ہو الا یہ کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت مل جائے۔ ۱۷؎ حافظ ابن حجر نے مذکورہ حدیث سے کئی باتوں کا جواز پیش کیا ہے۔

الف: کفار سے معاملہ کرنا جائز ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ جس چیز کا معاملہ کیا جا رہا ہے وہ حرام نہ ہو۔ اس میں ان کے عقائد کے فساد اور ان کے آپس کے معاملات کے غلط ہونے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

ب: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر غیر مسلم حربی نہیں ہے تو اسے ہتھیار فروخت کیے جا سکتے ہیں۔ اور اس کے پاس رہن رکھا جا سکتا ہے۔

د: اس سے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ ذمیوں کی املاک ان کے قبضے میں رہے گی۔ ۱۸؎

اسی طرح عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ رسول کی خدمت میں ہم لوگ موجود تھے کہ ایک مشرک جو پراگندہ بال اور دراز قد تھا کچھ بکریاں لے کر پہنچا آپ ﷺ نے اس سے سوال کیا کہ کیا یہ فروخت کے لیے ہیں یا تحفے میں؟ اس نے کہا فروخت کے لیے ہیں۔ آپ ﷺ نے اس سے ایک بکری خریدی۔ ۱۹؎

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس سے ایک تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر مسلم سے بیع جائز ہے۔ دوسرے یہ کہ جو چیز اس کی ملکیت میں ہے وہ اس کے پاس باقی رہے گی۔ ۲۰؎

ابن عربی اپنی تفسیر احکام القرآن میں حضرت عمرؓ کا ایک فرمان نقل کرتے ہیں۔

کہ ذمیوں سے شراب بطور جزیہ نہیں لی جائے گی لیکن اگر وہ اسے اپنے لوگوں میں فروخت کر کے جزیہ ادا کریں تو قبول کرلیا جائے گا۔آگے فرماتے ہیں۔ شک کی بیماری اور اختلاف کو ختم کرنے والی بات یہ ہے کہ ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اہل حرب سے تجارت ہوسکتی ہے۔[۲۱]

پتہ یہ چلا کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو خرید وفروخت تجارت وزراعت کے حقوق حاصل ہیں۔مگر اس میں کچھ پابندیاں بھی عائد ہوں گی۔فقہ کی کتابوں میں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے تجارت اور کاروبار میں ذمی بھی مسلمان کی طرح ہیں۔اور اس کی تائید میں یہ حدیث پیش کی گئی ہے ذمیوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں ان پر وہ پابندیاں بھی ہوں گی جو مسلمانوں پر ہیں۔[۲۲]

چنانچہ متذکرہ بالا شواھد کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے مسلم وغیر مسلم دونوں کو صاف اور صالح خرید وفروخت کی اجازت دی ہے اس لیے کہ تجارت وسائل معاش کو اختیار کرنے کا ایک اہم شعبہ ہے۔اور اس کی ہر فرد کے لیے اجازت ہے کسی خاص طبقہ یا مذہب سے اسلام کی تعلیمات وابستہ نہیں ہیں۔مگر اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری ان چیزوں کی خرید وفروخت کرسکتے ہیں جو اسلام میں ممنوع ہیں۔ مثلاً شراب وغیرہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح اسلام نے غیر مسلموں کو جملہ مراعات عطا فرمائی ہیں وہ کسی اور مذہب میں نہیں ہے۔ البتہ تجارت جائز خطوط پر کی جائے جانبین میں سے کسی کی دل آزاری نہیں ہونی چاہیے، حدیث کی کتابوں میں مروی ہے کہ حضورﷺ نے بیع محاقلہ، مزابنہ، حبل الحبلۃ، غرر، حصاۃ، ملامسہ، منابذہ، اور اسی طرح بیع معاومہ اور مخابرہ کی ممانعت فرمائی ہے۔ کیونکہ مذکورہ مثالوں میں انسان دوستی اور ہمدردی کا رشتہ ختم ہوتا ہے۔اور یہ اسلام میں ناجائز ہے۔

غیر مسلموں کے زراعتی حقوق

زراعت بھی وسائل معیشت کی توسیع کا ذریعہ ہے جس طرح اسلامی ریاست

میں مسلم شہری زراعت وکاشتکاری کر کے اپنی معیشت میں توسیع کرنے کے حقدار ہیں اسی طرح اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری بھی زراعت کا پیشہ اختیار کرنے کے مجاز ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں زراعتی پیداوار کو انسانی دنیا پر عظیم الشان احسان بتایا ہے اور اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے کہ طبعی وسائل معیشت میں ''زراعت'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سورہ واقعہ میں ارشاد ہے:

''أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ. أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ. لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ. إِنَّا لَمُغْرَمُونَ. بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ'' (واقعہ:۶۷-۶۳)

(بھلا بتاؤ تم جو کھیتی کرتے ہو اس کو تم پیداوار بناتے ہو یا ہم بناتے ہیں، اگر ہم چاہیں تو اس کو چورا چورا کر دیں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تاوان ڈالا گیا کہ ہم تو محروم رہ گئے)

زراعت کی اہمیت واضح کرنے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے زراعت کے متعلق گراں قدر ارشاد فرمائے ہیں:

''قال رسول الله ﷺ مامن مسلم يغرس غرسا اويزرع زرعاً فياكل منه طير او انسان او بهيمة الا كانت له صدقة''[۲۳]

(رسول اللہ نے فرمایا جو مسلمان درخت لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اور اس سے پرندہ انسان اور جانور اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں تو یہ عمل اس کے حق میں صدقہ بنتا ہے)

علامہ بدرالدین عینی مذکورہ حدیث کی تشریح فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں: اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ درخت لگانے والے اور کھیتی کرنے والے کو اس عمل پر اجر وثواب ملتا ہے خواہ اس نے اس ثواب کا ارادہ بھی نہ کیا ہو حتی کہ اگر اس نے درخت بویا اور فروخت کر دیا اور کاشت کی اور اس کو فروخت کر دیا تب بھی یہ اس کے حق میں صدقہ ہو جائیگا۔ اس لیے کہ اس کا یہ عمل مخلوق خدا کی روزی میں اضافہ کا

باعث ہوا۔[۲۴]

علامہ سرخسی نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ اس عمل کا کار خیر ہونا مسلم اور غیر مسلم دونوں کے حق میں یکساں ہے۔[۲۵]

اسی طرح علامہ سرخسی نے یہ بھی لکھا ہے کہ خود حضور ﷺ نے زراعت کی ہے۔

"وازرع رسول الله ﷺ بالجرف" [۲۶]

(رسول ﷺ نے مقام جرف میں زراعت کی ہے)

اسی وجہ سے لکھا ہے کہ بعض مشائخ زراعت کو تجارت سے افضل فرماتے ہیں اس لیے کہ اس کا نفع عام ہے اور اس کی خیر کثیر ہے اور نبی ﷺ کے ارشاد اور عمل مبارک میں ان رکیک خیال لوگوں کا رد ہے جو کہ کاشت کاری کو برا سمجھتے ہیں۔[۲۷]

شاہ ولی اللہ بنیادی معاشی وسائل میں سے زراعت کو اس قدر اہمیت دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

"فأنهم إن كان أكثر هم مكتسبين بالصناعات و سياسة البلدة والقليل مكتسبين بالرعي والزراعة فسد حالهم في الدنيا" [۲۸]

(اگر باشندگان ملک کی اکثریت صنعت وحرفت اور شہری سیاسیات ہی میں مصروف رہے اور زراعت اور مویشیوں کی حفاظت اور پرورش کی جانب بہت تھوڑے لوگ مشغول ہوں تو ان کی دنیاوی تمدنی زندگی فاسد اور خراب ہو جائے گی)

بدرالدین عینی نے لکھا ہے کہ معاشی وسائل کی اہمیت دراصل ذاتی نہیں ہے بلکہ وہ مخلوق کی فلاح وخوشحالی کا ذریعہ ہے لہٰذا جن ممالک کے طبعی ماحول میں زراعت زیادہ مفید ہے تو وہ تجارت وصنعت پر لائق ترجیح ہے۔ اور جن مقامات میں تجارت یا صنعت عوام کے لیے نفع بخش ہے تو وہاں وہ قابل ترجیح ہیں۔

"واذا كان كذالك فينبغي ان يختلف الحال في ذلك باختلاف حاجة الناس فحيث كان الناس محتاجين الى

الاقوات اكثر كانت الزراعة افضل للتوسعة على الناس وحيث كانو محتاجين الى التجر لا نقطاع الطرق كانت التجارة افضل وحيث كانوا محتاجين الى الصنائع اشد كانت الصناعة افضل و هذااحسن"[۲۹]

(اور جب یہ بات متعین ہوگئی کہ ان وسائل معیشت کی افضلیت کا منشا نفع عام ہے تو پھر ظاہر ہے کہ لوگوں (اہل ملک) کی حاجات و ضروریات کے اختلاف سے ان کی باہمی افضلیت بھی مختلف ہوگی، پس جب باشندگان ملک خام اجناس کے زیادہ محتاج ہوں تو زراعت افضل ہے تاکہ لوگوں کے لیے اس کا نفع عام ہو اور اگر کسی جگہ زراعت مفقود ہو تو وہاں تجارت کو برتری حاصل ہوگی اور اگر کسی ملک کے باشندوں کو قدرتی اور طبعی طور پر زراعت اور تجارت کے مقابلہ میں صنعت کی زیادہ حاجت ہو تو وہاں صنعت وحرفت کو فوقیت ہوگی اور یہی فیصلہ بہتر اور خوب ہے)

غیر مزرعہ آراضی کا حکم

زراعت کو پروان چڑھانے اور اس کی افادیت کو عام کرنے کے لیے جو ذرائع واسباب اختیار کیے جاتے ہیں ان میں ایک ذریعہ غیر مزروعہ زمینوں کو کاشت کے قابل بنا نا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے:

"فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" (فاطر:۹)

"اسلام کے معاشی نظام میں اس کا طریقہ یہ ہے کہ امیر المومنین تمام شہریوں کو ترغیب دے اور اعلان کرے کہ جو شخص ان زمینوں کے جس قدر حصہ کو آباد کریگا وہ اس کا مالک قرار دیا جائے گا۔ اس کو عربی میں "اقطاع" اور اردو میں "جاگیر" کہتے ہیں۔

فقہا نے لکھا ہے کہ بنجر زمین، سخت زمین، ریتیلی زمین یا ریت چڑھی ہوئی

زمین، پتھریلی زمین، ٹیلے جو آبادی سے دور ہوں اور جن کا نہ کوئی مالک ہے یا مالک کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہیکہ جو زمین ناکارہ پڑی ہو اور اس کی یہ خرابی قدیم اور عادی ہو (تو یہ سب موات ہیں) پس کسی مسلمان یا ذمی و کافر، امیر المومنین کی اجازت سے اس کو زندہ (قابل زراعت) کرے تو وہ زمین اس کی ملکیت ہو جائیگی۔[٣٠]

غیر مزروعہ زمین کے متعلق حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں۔

"عادی الارض للّٰه ولرسول ثم لکم من بعد فمن احیا ارضاً میتاً فھی له ولیس لمحتجر حق بعد ثلاث سنین"[٣١]

(افتادہ زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے پھر ان کے بعد تمہارے لیے ہے پس جس شخص نے اس کو زندہ کر لیا تو وہ اس کی ہے اور بے کاشت روک رکھنے والے کا حق تین سال کے بعد ساقط ہو جاتا ہے)

چنانچہ امام یوسف تحریر فرماتے ہیں:

"اقطاع (جاگیر دینے) کے بارے میں ان آثار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول ﷺ نے بھی مختلف اقوام کے لوگوں کو زمین دی ہیں اور آپ کے بعد خلفاء نے بھی، اور نبی ﷺ نے اپنے اس عمل میں یہ حکمت سمجھی کہ اس کے ذریعہ سے اسلام کے ساتھ غیر مسلموں کی رغبت بڑھتی ہے اور زمین کی آبادی بھی ہوتی ہے اور اسی طرح آپ ﷺ کے خلفاء اس کو اسلامی بیت المال کی ترقی اور دشمن کو زک دینے کا سبب سمجھتے تھے یعنی مالی خوشحالی حکومت کے رعایا کی وفاداری کا موجب ہوتی ہے۔[٣٢]

اسلام نے اپنے نظام معیشت میں وحدت عمومی کا کس قدر خیال رکھا ہے

اسلام کی یہ خواہش ہے کہ دنیا کی تمام قومیں اور ریاستیں اگر اسلامی اقتدار اعلیٰ کو نہ بھی قبول کریں تب بھی ان معاشی وسائل میں ایک دوسرے کی معاون ثابت ہوں اور معاشی پسماندگی کی وجہ سے ظلم کی راہ نہ کھولیں۔

غیر مسلموں کی صنعت

معاشی وسائل کی ترقی وخوشحالی کے لیے صنعت وحرفت بھی ایک اہم ذریعہ ہے۔ افسوس اس بات کا ہے آج مختلف ایجادات کا دور دورہ ہے نئے نئے انکشافات ہورہے ہیں ایسے وقت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان ایجاد و انکشافات سے شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے فائدہ حاصل کریں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

"عن المقدام عن النبی و قال ما أكل احد طعاماً قط خبزاً من أن ياكل من عمل يده وأن نبی الله داؤد علیه السلام كان ياكل من عمل يده"٣٣

(مقدام کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کوئی کھانا نہیں اور حضرت داؤد اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے)

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جمعہ کا خطبہ پہلے تاریخی ستون سے کھڑے ہوکر دیتے تھے جس کا نام "استن حنانہ" تھا لیکن جب کھڑے ہوکر خطبہ دینے میں آپ کو گرانی محسوس ہونے لگی تو حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں۔

"كان رسول الله يخطب يوم الجمعه إلیٰ جزع فی المسجد قائما فقال إن القيامة قد شق علی فقال له تميم الداری الا اعمل لک ممبراً كما رائت الشام فشاور المصطفی المسلمين فی ذلک فروا ان يتخذوه"٣٤

(رسول ﷺ جمعہ کے دن ایک کھمبے سے لگ کر جو مسجد میں تھا کھڑے ہوکر خطبہ ارشاد فرماتے تھے آپ ﷺ نے فرمایا کہ کھڑے ہونے میں مجھے گرانی محسوس ہوتی ہے تب تمیم داریؓ نے عرض کیا کہ آپ ﷺ کے لیے ہم منبر نہ بنائیں جیسا کہ میں نے شام میں دیکھا ہے رسول ﷺ نے صحابیوں سے مشورہ کیا رائے یہی طے ہوئی کہ منبر بنایا جائے)

''یہ منبر سب سے پہلے تمیم داری نے بنایا تھا۔ جو رسول ﷺ نے استعمال کیا، شام کے گرجوں میں تمیم داری نے منبروں کو دیکھا تھا۔ ۳۵

اسی طرح سے تاریخ کے حوالے سے یہ واقعہ بھی ملتا ہے۔

عرب میں عموماً لنگی باندھنے کا دستور تھا لیکن ایرانی شلوار (سراویل) استعمال کرتے تھے اتفاقاً بعض عرب تاجر ایران سے عرب (سراویل) لائے آں حضرت ﷺ کی نظر مبارک جب اس ایرانی لباس پر پڑی تو آپ نے اسے خرید لیا۔ ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ شلوار نہیں پہنیں گے؟ ہاں میں سفر میں حضر میں، دن میں رات میں، ہر حال میں اس کو پہنوں گا۔ اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ مجھے حکم دیا گیا ہے ستر پوشی کا اور اس سے زیادہ ستر پوشی کسی لباس میں نہیں پاتا ہوں۔ ۳۶

ان واقعات سے اس جانب اشارہ ملتا ہے کہ غیر اقوام کی صنعت کو اختیار کر کے وسائل رزق کو کافی حد تک وسعت دی جاسکتی ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ طائف پر جو دبابہ استعمال کیا گیا تھا اسے رسول ﷺ نے خود ہی بنوایا تھا۔

"أول دبابة صنعت في الاسلام دبابة صنعت على الطائف حين حاصر ها رسول ﷺ" ۔۳۷

(سب سے پہلا دبابہ جو اسلام میں بنایا گیا تھا وہ وہی دبابہ تھا جو طائف پر لگانے کے لیے بنایا گیا تھا جس وقت رسول ﷺ نے طائف کا محاصرہ فرمایا تھا)

اس طائف کے محاصرہ میں منجنیق کو بھی آں حضرت ﷺ نے استعمال فرمایا تھا۔

"أول من رمى بالمنجنيق رسول ﷺ أهل الطائف دخل نفر من اصحاب رسول الله ﷺ تحت دبابة ثم رجعوا إلىٰ جدار الطائف يحرقوه" ۔۳۸

(سب سے پہلے منجنیق کو رسول ﷺ نے استعمال فرمایا۔ طائف والوں پر (صورت یہ ہوئی) کہ رسول ﷺ کے چند صحابہ دبابہ میں داخل ہو کر

طائف کی فصیل تک پہنچے تاکہ اس کے دروازہ میں آگ لگا دیں)

''رسول ﷺ سے پوچھا گیا کہ انسان کے لیے کسب معاش کا کونسا ذریعہ بہتر ہے۔ فرمایا دستکاری''۔ [۳۹]

بعض روایتوں میں ہے کہ کہ حضرت زکریاؑ ''نجاری کا کام کیا کرتے تھے۔ اور اس سے معاش پیدا کرتے تھے''۔ [۴۰]

مذکورہ ماخذ کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ قرآن و سنت میں صنعت و حرفت کے اختیار کرنے کے متعلق بے شمار ٹھوس ثبوت موجود ہیں مگر آہ! آج امت کے اکثر طبقہ نے ان بنیادی اور ضروری معاشی وسائل کو ترک کر دیا۔ خود حضور کا عمل اس بات پر شاہد ہے کہ کچھ صنعتوں کی ایجاد خود آپ ﷺ نے کی اس لیے آج امت کے ہر فرد کو ان چیزوں کو سیکھنے کی ضرورت ہے۔

غیر مسلموں کی اجرت

باہمی لین دین کی ایک صورت اجارہ ہے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اجارہ نوکری، مزدوری، کاریگری، کرایہ داری مکان کی ہو یا زمین کی سب اجارہ میں شامل ہے۔

مزدور کی اجرت کے متعلق اسلام میں بہت ترغیب دلائی گئی ہے کہ اس کو کسی طرح سے دبانا یا ستانا نہیں چاہیے یہ مزدور چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم چنانچہ بخاری شریف میں روایت ہے۔

''اخواتکم خولکم جعل الله تحت أيديكم فمن كان أخوه تحت يده فليطعمه مما ياكل وليلبسه مما يلبس ولا تكلفو هم مما يغلبهم فان كلفتموهم فاعنهم'' [۴۱]

(تمہارے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے تمہارے بھائی ہیں حق تعالیٰ نے ان کو تمہارے ماتحت کیا ہے پھر جس کا بھائی کسی کے ماتحت ہو اس کو

چاہیے کہ جو کچھ خود کھاتا ہے اسے کھلائے اور جو خود پہنتا ہے اسے
پہنائے اور ان پر اتنا کام نہ ڈالو کہ وہ برداشت نہ کر سکے اور ان پر بار
ڈالو تو ان کی اعانت کرو)

حدیث قدسی میں ارشاد ہے: ''تین آدمیوں کا قیامت میں، میں فریق مخالف ہوں گا ایک وہ شخص جس نے میرے نام سے کسی کو کچھ دیا اور عہد شکنی کی۔ دوسرا وہ جو کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اس کی قیمت کھائے، تیسرا وہ جس نے کسی کو مزدور رکھا اور اس سے پورا کام لیا لیکن اس کی پوری مزدوری ادا نہ کی۔[۴۲]

ایک اور حدیث میں آتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مزدور کو اس کی مزدوری ادا کرو قبل اس کے کہ اس کا پسینہ خشک ہو''۔[۴۳]

اب سوال یہ ہے کہ کسی غیر مسلم کی اجرت پر خدمت کرنا جائز ہے یا نہیں اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات یہ وضاحت کرتی ہیں کہ غیر مسلم کی خدمت کرنا اور اس پر اجرت حاصل کرنا جائز ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ پر فاقے کی کیفیت تھی حضرت علیؓ کو اس کی اطلاع ملی تو وہ کسی کام کی تلاش میں نکلے۔ تاکہ اس کی آمدنی سے آپ کے لیے کھانے کا انتظام کر سکیں۔ ایک یہودی کے باغ میں پہنچے اس کی سینچائی کی۔ سترہ ڈول کھینچے اور ہر ڈول پر ایک عمدہ کھجور ملی اسے لے کر آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔[۴۴] یہ واقعہ مدنی دور کا ہے مکہ میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت خبابؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک لوہار تھا میں نے مکہ میں عاص بن وائل کا کام کیا میری اجرت اس کے پاس جمع ہوگئی۔ میں نے اس کا تقاضا کیا تو اس نے کہا قسم خدا کی میں اس وقت تک ادا نہیں کروں گا جب تک کہ تم رسالت کا انکار نہ کر دو۔ میں نے کہا قسم خدا کی تمہارے مر کر زندہ ہونے تک بھی یہ نہیں ہوگا۔ اس نے سوال کیا کہ کیا مرنے کے بعد میں دوبارہ زندہ ہو کر اٹھوں گا۔ میں نے جواب دیا ہاں یہ ہوگا۔ اس نے

کہا اگر ایسا ہوا تو اس وقت میرے پاس مال اور اولاد سبھی کچھ ہوگا۔تمہارا قرض بھی ادا کردوں گا۔[۴۵]

اس حدیث کے ذیل میں حافظ بن حجر نے لکھا ہے کہ اہل علم نے اجرت پر غیر مسلم کا کام کرنے کو ناپسند کیا ہے۔ہاں مجبوری ہو تو دو شرطوں کے ساتھ یہ جائز ہوگا۔
الف: غیرِ مسلم جو کام لے اس کا کرنا مسلمان کے لیے حلال ہو۔ب: کسی ایسے کام میں اس کی معاونت نہ کرے جس کا نقصان بالآخر مسلمان کو پہنچے۔[۴۶]

راقم کی نظر میں اس کے ناپسندیدہ ہونے کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس لیے ہے کہ مسلمان ایک خود دار قوم ہے۔ یہ قوم کسی دوسرے کی غلامی اور نوکری پسند نہیں کرے گی۔مذکورہ روایتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام نے غیر مسلم کی اجرت کا کس قدر خیال رکھا ہے۔ضمناً یہ بھی عرض کردوں کہ اسلامی تعلیمات میں کہیں بھی ذرہ برابر ذات پات،قوم یا مذہب کا امتیاز نہیں رکھا گیا ہے۔مذکورہ بالا حدیث میں مطلق مزدور کی اجرت دینے کی تاکید کی گئی ہے خواہ وہ مزدور غیر مسلم ہو تب بھی اس کے ساتھ بھلائی اور حسن سلوک کا معاملہ کرو۔چنانچہ مزدور کے ساتھ نرمی ہمدردی اور حسن سلوک سے پیش آؤ یہی اسلام کی تعلیمات کا لب لباب ہے۔

تمام مخلوق کا کفیل اللہ ہے

روئے زمین پر جتنی بھی مخلوق آباد ہے تمام کو رزق دینے والی ذات اللہ کی ہے اس سلسلے میں قرآن نے مختلف مقامات پر وضاحت فرمائی ہے۔

''وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا'' (ہود:۶)

(اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

''وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ'' (ذاریات:۲۲)

(اور تمہارا رزق اور جس شئے کا تم وعدہ دیے گئے ہو آسمان میں یعنی اللہ

کے ذمہ ہے)

صاحب تدبر نے لکھا ہے حالات کی ظاہری نامساعدت سے بددل ہوکر کوئی خدا کی رزق رسانی وکارسازی کے باب میں کسی شک میں مبتلا نہ ہو۔رزاق حقیقی اللہ تعالیٰ ہےاور وہ بڑا ہی محکم قوت کا مالک ہے حالات کی نامساعدت اور مخالفتوں کی مزاحمت اس کی تدبیرں کوشکست نہیں دے سکتی۔[۴۷]

''وَمَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ''(نمل:٦٤)

(اور آسمان اور زمین سے تم کو روزی کون پہنچاتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے)

تفسیر ماجدی میں لکھا ہے:

یعنی زمین کے ذریعہ سے انسان کے علاوہ ان مخلوقات کو بھی سامان زیست بہم پہنچا دیا گیا جو ظاہراً بھی انسان کے واسطے سے پرورش نہیں پاتے، معایش کے تحت ماکولات، مشروبات، ملبوسات سب آگئے۔[۴۸]

جولوگ خشیت رزق کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل کردیتے ہیں قرآن ان کے متعلق کہتا ہے۔

''وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ''(بنی اسرائیل:٣١)

(افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو نہ مار ڈالا کرو ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انھیں بھی)

یہ قتل اولاد کی ملعون رسم دختر کشی کے دستور کے علاوہ ہے۔افلاس کا ذکر اس لیے فرمایا کہ فلاسفہ مادئین اور مفکرین جاہلیت اپنے نظریہ کی عقلی دلیل یہی پیش کرتے ہیں چنانچہ آج جاہلیت فرنگ کے زیرسایہ جو شاندار تحریک قتل اولاد کی خفی و باریک صورت کی وضع حمل کے نام سے جاری ہے اس کا محرک بھی یہی خوف افلاس ہے۔[۴۹]

''وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا

أَقْوَاتَهَا فِيْ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِيْنَ" (حم سجدہ:۱۰)

(اور رکھے اس نے زمین میں بوجھل پہاڑ اور برکت رکھی اس کے اندر اور چار دن میں اندازہ سے رکھیں اسمیں ان کی خوراکیں جو برابر ہیں حاجت مندوں کے لیے)

پتہ یہ چلا کہ روزی دینے کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور وہی پوری مخلوق کو پالتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ رزق کو تقسیم کرنے میں اس نے درجات کو اختیار فرمایا ہے۔

مولانا مودودی نے لکھا کہ رزق کا معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے جتنا سرسری طور پر پڑھ کر ہم محسوس کر لیتے ہیں۔ اس زمین پر لاکھوں حیوانات کی اور نباتات کی تعداد پائی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر نوع کی غذا کا سامان اس کثرت سے فراہم کیا ہے کہ کسی نوع کے افراد بھی یہاں غذا پانے سے محروم نہیں۔ ۵۰

غیر مسلموں کی کفالت

یہ نکتہ بڑا اہم ہے کہ اسلامی ریاست کے وہ غیر مسلم شہری جو روزگار حاصل کرنے سے محروم ہو چکے ہیں اور ان کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے ان کی کفالت و پرورش کون کریگا اور انھیں زندگی گزارنے کے اسباب کہاں سے مہیا ہوں گے۔

فقہا نے لکھا ہے کہ ان کی ذمہ داری اسلامی ریاست کے بیت المال سے کی جائیگی۔ قرآن نے بھی بیشتر مقامات پر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"وَفِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ" (ذاریات:۱۰۔۱۹)

(اور ان کے مالوں میں حق ہے مانگنے والوں کا اور معاشی زندگی سے ہارے ہوؤں کا)

امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے کہ محسنین جس طرح خدا کا حق پہنچاتے ہیں اسی طرح اس کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرنے والے ہیں وہ اپنے مال میں اپنے نفس ہی کا حق نہیں سمجھتے بلکہ اور محروموں کا حق بھی سمجھتے ہیں اور اسکو اسی طرح ادا کرتے ہیں جس

طرح اہل حق کے حقوق ادا کیے جاتے ہیں۔[۵۱]

سورہ معارج میں ارشاد ہے۔

"الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ. وَالَّذِيْنَ فِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ" (معارج:۲۳-۲۵)

(اور جو اپنی نمازوں پر قائم ہیں اور وہ جن کا مال میں حصہ مقرر ہے سائل کے لیے اور معاشی زندگی سے ہارے ہوؤں کے لیے)

اسی طرح سورۃ دھر میں فرمایا گیا ہے۔

"وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْناً وَيَتِيْماً وَأَسِيْرا" (دھر:۸)

(اور وہ کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت پر محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو)

غیر مسلموں کو صدقہ کا جواز

"لَّيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ" (بقرہ:۲۷۲)

(تیرے ذمہ نہیں ہے ان کو راہ پر لانا اور لیکن اللہ راہ پر لے آئیگا جس کو چاہے گا اور جو کچھ خرچ کرو گے اپنے مال میں سے سو وہ اپنے ہی واسطے ہے)

اس آیت کے ذیل میں ابوبکر جصاص نے لکھا ہے: بین فیه جواز الصدقة علی المشرکین وقال المهدوی رخص للمسلمین أن یعطوا المشرکین من قراباتهم من صدقه الفریضة بهذه الآیة۔[۵۲] مذکورہ آیت میں اس بات کا جواز موجود ہے کہ زکوۃ کے علاوہ نفلی صدقات غیر مسلموں پر صرف کیے جا سکتے ہیں اور وہ ان کے ذریعے سے اپنی ضروریات زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ حدیث اور فقہ و تاریخ اسلام میں بیشتر واقعات ایسے ہیں جو غیر مسلموں کو صدقے کے جواز پر دلالت کرتے ہیں، چنانچہ کتاب الاموال میں لکھا ہے: إن رسول الله تصدق علی اهل بیت من اهل الیهود فهی تجری علیهم [۵۳]

''رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کے ایک گھرانے کو صدقہ دیا اور حضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی انھیں دیا جاتا رہا ہے۔'' ابوعبید نے یہ بھی لکھا ہے: ان صفية زوج النبی ﷺ تصدقت علی ذوی قرابة فهما یهودیان فبیع ذلک بثلاثین درهما۔۵۴ ''بے شک ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے رشتہ داروں کو صدقہ دیا حالانکہ وہ دونوں یہودی تھے، جو تیس ہزار کے عوض فروخت کیا گیا'' عمرو بن میمون عمرو بن سرحبیل اور مرۃ ہمدانی سے روایت کیا گیا ہے۔إنهم كانوا يعطون الرهبان من صدقة الفطر ۵۵ ''وہ راہبوں کو صدقہ فطر میں سے دیتے تھے''

غیر مسلموں سے جزیہ نہ لینے کا جواز

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں سے جزیہ لیا جاتا ہے جو ان کی جان و مال کی حفاظت کا ضامن ہوتا ہے مگر کچھ معاندین اسلام اس بات پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں سے جزیہ کیوں لیا جاتا ہے۔جب کہ جزیہ کے نام پر مسلمانوں سے کوئی رقم وصول نہیں کی جاتی ہے تو اس سلسلے میں امام یوسف نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف کتاب الخراج میں مسئلہ لکھا ہے

''وجعلت لهم أيماشيخ ضعف على العمل أو أصابتهُ آفة من الآفات أو كان غنيا فا فتقر وصار أهل دينه يتصد قون عليه طرحت جزيته وعيل من بيت مال المسلمين وعياله ما أقام بدارا لهجرة و دار الاسلام''۵۶

(اگر ان کے ضعیف العمر اور ناکارہ لوگوں یا آفت رسیدہ یا بعد از غنی فقیر ہو جانے والوں کو ان کے مذہب کے لوگ خیرات دینے لگیں تو ان سے جزیہ ہٹا لیا جائیگا اور مسلمانوں کے بیت المال سے ان کے نان ونفقہ کا بندوبست کیا جائے گا جب تک کہ وہ اسلامی ملک میں رہیں)

ابن حزم ظاہری نے لکھا ہے: کہ ہر ایک بستی کے ارباب دولت کا فرض ہے کہ

وہ فقراء اور غرباء کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر بیت المال کی آمدنی سے ان غرباء کی معاشی کفالت پوری نہ ہوتی ہو تو سلطان (امیر) ان ارباب دولت کو ان کی کفالت کے لیے مجبور کر سکتا ہے اور ان کی زندگی کے اسباب کے لیے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری حاجت کے مطابق روٹی مہیا ہو۔ پہننے کے لیے گرمی اور سردی دونوں موسم کے لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لیے ایک ایسا مکان ہو جو ان کو بارش گرمی دھوپ اور سیلاب جیسے امور سے محفوظ رکھ سکے۔[57]

یہ حقیقت ہے کہ عملی طور پر تاریخ اسلام میں اس قسم کی ان گنت مثالیں موجود ہیں جن کے ذکر کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ایک یہودی کو دیکھا جو اندھا ہو چکا تھا تو آپؓ نے اس کے لیے ماہانہ وظیفہ مقرر فرمادیا۔[58] اجتماعی کفالت کے حق اور حقوق عامہ میں اسلامی ریاست کی نگاہ میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے بلکہ وہ بالکل برابر کے شہری ہیں۔

خلاصہ

مذکورہ سطور میں ماخذ کے حوالے سے یہ بات کہی گئی ہے کہ اسلامی ریاست کے ہر شہری کو معاشی وسائل اختیار کرنے کا حق ہے نیز اسلامی ریاست کے سربراہ کا یہ حق ہے کہ وہ لوگوں کی معاشی ضرورت کو پورا کرنے کا انتظام کرے تاکہ کوئی فرد بھی محروم المعیشت نہ رہے۔ یہاں چند باتیں نکل کر سامنے آتی ہیں۔

۱- غیر مسلموں پر اسلامی ریاست میں کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے پرسنل لاء پر عمل کر سکتے ہیں، بیع و شراء، تجارت و زراعت، صنعت و حرفت، کے ذریعہ معاش کو بڑھانے کی آزادی حاصل ہے حتی کہ وہ اپنے محلوں، گلیوں اور شہروں میں خنزیر اور شراب بھی بیچ سکتے ہیں جیسا کہ درمختار میں لکھا ہے۔ ویضمن المسلم قیمه خمره و خنزیر إذ أتلفه [59]

یعنی اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کی شراب یا خنزیر کو نقصان پہنچائے تو اسے اس کا

تاوان ادا کرنا پڑیگا۔

۲- اسلام نے انھیں ہر طرح کی آزادی عطا کی ہے۔اگر تجارت وزراعت یا صنعت وحرفت کا پیشہ اپنائیں تو ضروری ہے کہ اس میں اعتدال اور میانہ روی کو مدنظر رکھ کر ہی انجام دیں کسی کو دھوکہ یا اس طرح کے دیگر مذموم ومکروہ چیزوں کا خاصا خیال رکھنا پڑیگا۔ کیونکہ اسلام نے جو ہدایات دی ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک مہذب اور سنجیدہ معاشرہ وجود میں آئے جس سے دنیائے انسانیت کو نفع پہنچے حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ: أحب الناس إلى الله أنفعهم للناس ۶۰؎ ''سب سے زیادہ پسندیدہ اللہ کو وہ شخص ہے جو لوگوں کو زیادہ نفع پہنچائے''۔

۳- تیسری بات بھی کافی اہمیت کی حامل ہے، آج پوری دنیا میں اسلام کے خلاف غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں اور یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کے حقوق اور ان کی آزادی کو ختم کیا ہے۔ جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اسلام دنیا کا ایسا واحد مذہب ہے جس میں جملہ انسانیت کو پورے پورے حقوق دیے گئے۔اس لیے ضرورت ہے آج امت مسلمہ کے دانشوروں، علماء کو کہ وہ امانت کے ساتھ ان کے سوالات واعتراضات کے جواب دیں تاکہ اسلام کی حقیقی تعلیمات ان تک پہنچیں۔اور پھیلائی جانے والی تمام بدعنوانیوں اور الزام تراشیوں کا قلعہ قمع ہو۔

حواشی ومراجع

۱- جصاص، امام الحجہ الاسلام ابی بکر احمد علی الرازی، الجصاص احکام القرآن، ج۱، ص ۵۵۔مطبع مصر سن اشاعت ۱۳۴۷ھ

۲- سنن کبری، ابوبکر بیہقی، کتاب الاجارۃ، باب کسب الرجل وعمل بیدہ

۳- کنز العمال، العلامہ علی المتقی علاء الدین، کتاب البیوع، باب فصل الثانی فی آداب الکسب

۴- ایضاً

۵- ایضاً، کتاب آداب الکسب والمعاش: ص: ۶۲

۶- مولانا محمد حفظ الرحمٰن، اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۶۳، بحوالہ اتحاف السادۃ، ج ۵، ص ۲۱۷، مطبع، برقی پریس دہلی سن اشاعت، ۱۳۶۱ھ، ۱۹۴۲ء

۷- غزالی، امام ابی حامد محمد بن الغزالی (متوفی ۵۰۵) احیاالعلوم الدین ج ۲ ص: ۶۱ باب الاول فی فضل الکسب والحث علیہ۔ مکتبہ التجاریہ الکبری، مصر

۸- ایضاً ص ۶۳

۹- ابن خلدون، عبدالرحمٰن بن خلدون، مقدمہ ابن خلدون ص: ۴۶۲ مطبع جامعہ ازہر قاہرہ ۱۴۲۵ھ ۲۰۰۴ء

۱۰- شیخ محمد عبدہ، ترتیب و تالیف سید محمد رشید رضا، تفسیر القرآن الحکیم، المشتہر باسم تفسیر المنار، ج: ۲ ص ۸۷ مطبع دار المنار مصر سن اشاعت ۱۳۷۳، ۱۹۵۴ء

۱۱- عبدالرحمٰن بن محمد عوض الجریری (۱۴۹۹-۱۳۶۰) کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج: ۲ ص: ۳۶-۱۳۵، مطبع دار احیاء التراث، انھوں نے بیع کی لغوی تعریف یہ کی ہے، هو في اللغة شئي بشئ فمقابلة السلعة بالسلعةتسمى بيعاً لغةلمقابلتها بالنقد۔ ایضاً ص: ۱۲۹

۱۲- سنن ترمذی، ابوعیسیٰ الترمذی، ابواب البیوع باب ماجافی التجار وتسمیۃ النبی ایاھم۔

۱۳- ایضاً مگر صاحب ترمذی نے یکثرون کی جگہ یبعثون کا لفظ استعمال کیا ہے۔

۱۴- شرح السنۃ للبغوی، کتاب الحج وفضلہ، باب وجوب الحج۔ مکتبہ اسلامی، دمشق، ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۳ء

۱۵- صحیح البخاری، محمد بن اسماعیل البخاری، کتاب البیوع، باب شری النبی بالنسیۃ

۱۶- بخاری، کتاب الجہاد، باب ماقیل فی درع النبی والقمیص فی الحرب۔

۱۷- ابن دقیق العید، ابوالفتح تقی الدین محمد بن علی القشیری، احکام الاحکام، شرح عمدۃ الاحکام، ج ۳، ص ۱۹۶-۱۹۷، مطبع، المنیریہ، مصر۔ ۱۳۱۰ھ،

۱۸- ابن حجر، الحافظ احمد بن علی بن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری ج ۵،

ص ۱۴۱، مطبع البابی الحلبی مصر، ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء

۱۹- بخاری، کتاب البیوع، باب الشراء والبیع مع المشرکین واہل الحرب۔

۲۰- فتح الباری، ج ۴، ص ۴۱۰

۲۱- ابن عربی، ابوبکر محمد بن عبداللہ الاشبیلی المالکی، احکام القرآن، ج ۱، ص ۲۱۴، مطبع السعادہ، مصر ۱۳۳۱ھ

۲۲- فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ کافر شراب فروخت کر کے مسلمان کا قرض ادا کرتا ہے تو مسلمان کے لیے اس کا لینا جائز ہے۔ اس لیے کہ شراب اس کے نزدیک قیمت رکھتی ہے۔ اس کی بیع اس کے لیے صحیح ہے۔ اس کے برخلاف مسلمان اگر شراب فروخت کر کے کسی کا قرض ادا کرے تو یہ ناجائز ہوگا۔ اس لیے کہ شراب اس کے نقطہ نظر سے مال متقوم نہیں ہے اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ مرغینانی، برہان الدین، الہدایہ بشرح الہدایہ ج ۴، ص ۴۵۴، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، ۱۳۵۸ھ

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ مسلمان کی یہودی کے ساتھ کاروباری شرکت ہو۔ امام شافعی نے یہودی یا نصرانی کے ساتھ مشارکت کو مطلقاً ناپسند کیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ وہ سودی کاروبار کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے مال میں شراب اور خنزیر کی آمدنی شامل ہوتی ہے۔ امام مالک، امام احمد، اور سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ اگر کاروبار میں مسلمان کی موثر شرکت ہو تو اس کو سود سے پاک رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے بغیر شرکت صحیح نہ ہوگی۔ البتہ جمہور فقہاء کے نزدیک غیر مسلموں کے ساتھ کاروبار میں شرکت جائز ہے۔ اس کی دلیل میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی روایت پیش کی جاتی ہے: رسول اللہ ﷺ خیبر کی فتح کے بعد یہود کو اس شرط کے ساتھ مقبوضہ زمین پر کاشت کی اجازت دی کہ انہیں پیداوار کا نصف ملے گا۔ بخاری، کتاب الشرکہ، باب مشارکۃ الذمی والمشرکین فی المزارعۃ

۲۳- بخاری، ابواب الحرث والمزارعۃ وما جاء فیہ باب فضل الزرع والغرس اذا اکل منہ

۲۴- عینی، علامہ بدرالدین عینی، حنفی، عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ج:۵ ص ۱۷۱ مطبع دارالطباعہ

۲۵- سرخسی، شمس الدین سرخسی، کتاب المبسوط ج:۲۳ص:۱۴ مطبع سعادہ، مصر۔
۲۶- ایضا، ص ۲۷۲
۲۷- ایضاً ص:۱۴
۲۸- ولی اللہ، شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم المحدث الدھلوی، حجۃ اللہ البالغۃ من ابواب ابتغاء الرزق، ج:۲ص ۱۰۵ ادارۃ الطباعہ المنیریہ سن اشاعت ۱۳۵۲ھ
۲۹- عینی ج:۵ ص ۱۱۷
۳۰- مولانا حفظ الرحمٰن، اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۲۲۱، بحوالہ سعیدیات فی المعاملات ص ۳۰۰-۳۰۱
۳۱- قاضی ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج ص ۳۷ مطبع بولاق مصر، سن اشاعت ۱۳۰۲ھ
۳۲- ایضاً ص ۳۳۳۵- صحیح البخاری کتاب الاجارہ، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ
۳۴- کتانی، العلامہ الشیخ عبدالحی الکتانی، نظام الحکومۃ النبویہ المسمی التراتیب الاداریہ ج:۱ ص ۶۸ مطبع بیروت
۳۵- ایضاً
۳۶- جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد، کتاب اللباس والزینہ، باب انواع من اللباس والوانھا وحیث یطلب اللبس وترکہ
۳۷- الکتانی ج:۱ص ۳۷۵ ۳۸- ایضاً ص:۳۷۴
۳۹- جمع الفوائد کتاب البیوع، باب الکسب والمعاش وما یتعلق بالتجارہ۔
۴۰- ایضاً
۴۱- صحیح البخاری، کتاب الایمان باب المعاص من امر الجاھلیۃ
۴۲- صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب اثم من باع حراً
۴۳- ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید الربعی، کتاب الرھون، باب الرجل یستقی کل دلو بتمرۃ
۴۴- بخاری، کتاب الاجارہ، باب ھل یواجر الرجل نفسہ من مشرک فی ارض الحرب، فقہ حنفی

میں لکھا ہے کہ مسلمان کنیسہ کی تعمیر میں اجرت پر کام کرسکتا ہے۔ (رد المختار علی الدر المختار، ص ۳۴۴-۳۴۵)

۴۵- فتح الباری، ج ۴، ص ۴۵۲۔ مذاہب فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مسلمان کاریگروں کا اپنی دکانوں میں بیٹھ کر ذمیوں کے لیے کام کرنا جائز ہے۔ اس میں ذلت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ایک مسلمان کا کسی ذمی کے گھر اس کی خدمت کرنا اور اس کی ماتحتی اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس میں ذلت ہے۔ فتح الباری، ج ۴، ص ۴۵۲۔ امام احمد کے نزدیک اجرت پر کسی ذمی (غیر مسلم) کی ذاتی خدمت کرنا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی سے اس کے جواز اور عدم جواز دونوں طرح کی روایتیں منقول ہیں۔ جواز کے حق میں یہ بات کہی گئی ہے کہ جب اجرت پر ذمی کا کوئی کام کرنا جائز ہے تو اس کی خدمت کو بھی جائز ہونا چاہیے۔ امام احمد کہتے ہیں اس کے اندر مسلمانوں کی تذلیل ہے۔ اس لیے وہ ناجائز ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے لکھا ہے کہ ہمارے علم کی حد تک اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کہ مسلمان اجرت پر ذمی کا کوئی کام انجام دے۔ جیسے کپڑے کی سلائی، یا دھلائی، اس طرح متعین کیے گئے کام کرنا بھی جائز ہے۔ ابن قدامہ، المغنی علی مختصر الخرقی، ج ۸، ص ۱۳۵-۱۳۶ مطبع مصر ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۲ء

۴۶- بخاری، کتاب الاجارہ، باب من استاجر اجیرا فترک اجرہ فعمل فیہ المستاجر فزاد و من عمل فی مال غیرہ فاستفضل

۴۷- تدبر ج: ۷ ص: ۶۳۳

۴۸- تفسیر ماجدی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ج ۲ ص ۷۳۷

۴۹- مالتھس نامی ایک ماہر معاشیات جو برطانیہ میں انیسویں صدی کی ابتداء میں پیدا ہوا ہے۔ قتل اولاد یا وضع حمل کی تحریک اسی کی چلائی ہوئی ہے اس کے نظریہ کی بنیاد بھی خوف افلاس ہے تفسیر ماجدی ج: ۲ ص: ۱۲۱

۵۰- تفہیم القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ج: ۳ ص: ۵۹۵

۵۱- امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، ج ۷، ص ۵۹۴ مطبع تاج پرنٹرس، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء

۵۲- جصاص، احکام القرآن، ج ۱۷، ص ۲۹۱

۵۳- ابوعبید، قاسم بن سلام، کتاب الاموال ص ۶۱۳

۵۴- ایضاً ص ۶۴۱

۵۵- ابن زنجویہ، کتاب الصدقہ واحکامہا وسننہا، باب ماجاء فی صدقۃ علی اہل ذمہ

۵۶- ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۲۶

۵۷- ابن حزم ظاہری، ج ۳، ص ۱۲۵

۵۸- ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۲۶

۵۹- حصکفی علاء الدین، الدر المختار ج ۲ ص ۲۲۳ مطبع بیروت لبنان، سن اشاعت ۱۳۸۶ھ

۶۰- صحیح الترغیب والترہیب، ج ۲، حدیث نمبر: ۲۶۲۳

☆☆☆

اقدار پر مبنی سیاست اور قومی متبادل سیاسی جماعت کی ضرورت

سید شکیل انور *

ملک میں اس وقت جو سیاسی جماعتیں مرکزی و ریاستی سطح پر برسر اقتدار ہیں وہ خاندانی، زعفرانی اور ریاستی نوعیت کی حامل ہیں، انڈین نیشنل کانگریس اور بھارتیہ جنتا پارٹی قومی سطح پر ترنمول، بیجو جنتا دل، جنتا دل (یو)، سماج وادی، نیشنل کانفرنس، اکالی دل، عام آدمی پارٹی، انا-ڈی-ایم-کے، نیشنل کانگریس پارٹی وغیرہ ہیں دیگر سیاسی پارٹیاں بھی ریاستی سطح پر پائی جاتی ہیں۔ خاندانی اور زعفرانی سیاست کا قومی متبادل بنانے کا عمومی تقاضہ بھی پایا جاتا ہے۔ ایک طرف کی وفاقی سیاسی جماعت کے ابھرنے کے امکانات ہیں جو مرکزی سطح پر تشکیل حکومت کے موثر دعوے دار کے طور پر عام انتخابات کے نتائج کے بعد سامنے آئے گی۔

ملک میں اقتدار پر مبنی سیاست کے امکانات بھی قوی ہیں کیوں کہ قومی سیاسی عمل کو بدعنوانی، جرم، مکر و فریب، دھوکہ و دھاندلی، تشدّد و غنڈہ گردی، جھوٹ، دغابازی اور مفاد حاصلہ نے اس قدر متاثر کر رکھا ہے کہ سیاست نام ہی شیطانیت کا پڑ گیا ہے۔ اخلاق، اصول، شرافت، ایمان داری اور اخلاص مندی و ایثار پسندی کی حامل سیاسی قیادت کے لیے عمومی فکر مندی کے باوجود کوئی قومی متبادل میدان عمل میں نظر نہیں آتا اس لیے بہ حالت مجبوری کم تر معیار کی سیاسی قیادت ہی ملکی سیاسی زندگی کے درو بست پر حاوی اور بدی و برائی کا چکر (Vicious Circle) ٹوٹنے میں نہیں آتا اور نتیجتاً غربت، جہالت، لاچارگی، بیماری، کمرتوڑ گرانی، بدامنی، قتل و غارت گری اور ہر طرح کی نا

---

* سکریٹری شعبۂ تربیت، جماعت اسلامی ہند، حلقہ آندھرا پردیش، حیدرآباد

انصافی، ظلم وزیادتی نے ڈیرے جمار کھے ہیں۔

اقدار پر مبنی سیاست کیا ہے؟ اولاً لفظ 'سیاست' پر غور کریں۔ سیاست کے لغوی معنی:

☆	سیاسة القوم	:	قوم کے امور کی تدبیر کرنا، انتظام کرنا
☆	سیاسة الامر	:	قوم کے امور کی تدبیر کرنا، انتظام کرنا
☆	اساسه الناس	:	لوگوں کا کسی کو اپنا سردار بنالینا
☆	سُوِّس فلان امر القوم	:	فلاں قوم کے امور کا مختار و مالک بنایا گیا
☆	السیاسة	:	ملکی تدبیر وانتظام
☆	السیاسه المدنیة	:	شہر کا انتظام، اہل شہر کی معاش، اصلاح اور عدل وانصاف کا پورا پورا لحاظ

☆ سیاست کا مادہ س اس ہے۔ اسی سے ابتداء سیاسہ الدواب۔ جانوروں کو سیدھارنا اور انکی دیکھ بھال کرنا ہے۔ سائیس۔ سدھارنے اور دیکھ بھال کرنے والا۔

☆ سیاست کے مفہوم سے آگاہی کے بعد قرآن حکیم کی آیت ذیل پر غور کریں:

"وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ" (سورہ آل عمران:۱۰۴)

(تم میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہونے چاہیے جو نیکی کی طرف بلائیں بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں اور جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ امر ونہی کے لیے اقتدار ضروری ہے۔)

اقدار پر مبنی سیاست کا علم بردار ایک گروہ کا منظم ہونا مذکورہ بالا آیات سے واضح ہے اس گروہ کی موجودگی اور اس کی سرگرمیاں اس بات کی ضمانت ہوں گی کہ عصر حاضر میں قانون کی حکم رانی، عدل وقسط کا قیام اور حقیقی مساوات ومواخاۃ کا حصول اگر ممکن ہے تو وہ اسی گروہ کے ہاتھوں ہوگا کیوں کہ وہ حسب ذیل اصولوں کا پابند ہوگا۔

☆ اخلاقی حدود کی پابندی۔

☆ صداقت و دیانت کے خلاف ذرائع و طریقوں سے اجتناب

☆ فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی کش مکش اور فساد فی الارض کے موجب طریقوں سے بھی اجتناب

☆ پرامن اور تعمیری طریقوں کو اختیار کرنا

☆ تبلیغ و تلقین اور اشاعت افکار سے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح

☆ ملک کی اجتماعی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب کے لیے رائے عامہ کی تربیت کرتے ہوئے اقدار پر مبنی سیاست کو رواج دے گا۔

اقدار پر مبنی سیاست صالح انقلاب کا مطمح نظر ہے کیوں کہ معاملات دنیا کی زمام کار فساق و فجار کے ہاتھوں میں رہے گی تو شیطانیت کی ننگا ناچ جاری رکھے گی۔ اس کے بجائے جب بہ تدریج اقتدار کی باگ ڈور صالحین کے ہاتھوں میں منتقل ہوگی وہ سارے انسانی سماج کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں گے، ان کے کاموں میں شفافیت ہوگی اور سیاست کو وہ خدمت کا ذریعہ سمجھ کر اپنائیں گے نہ کہ جلب منفعت اور مفادات حاصلہ کے حصول کا ذریعہ۔

عموماً اخلاق و دیانت اور انسانی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم مخلصین سیاست کی موجودہ گندگیوں میں ملوث ہونا پسند نہیں کرتے لیکن اگر مطمح نظر یہ ہو کہ جاں بلب انسانیت کو بچانے کی ترکیب اس کے سوا نہیں ہے کہ مخلصین و اصلاح پسند آگے بڑھ کر اس گندہ تالاب میں اتر کر ڈوبتی ہوئی انسانیت کو نہیں بچائیں گے تو یوم آخرت اس کی جواب دہی ان کو کرنا ہوگی۔ سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۰ میں وارد ہوا ہے: واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا (سورہ بنی اسرائیل: ۸۰) اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے یعنی یا تو مجھے اقتدار عطا فرمایا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تا کہ اس کی طاقت سے

میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کرسکوں، فواحش اور معاصی کے اس سیلاب کو روک سکوں اور تیرے قانون عدل کو جاری کرسکوں۔ یہی تعبیر ہے اس آیت کی جو حسن بصریؒ اور قتادہ نے کی ہے اور اسی کو ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے اور اس کی تائید نبی ﷺ کی یہ حدیث کرتی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدّ باب کر دیتا ہے جن کا سدّ باب قرآن نہیں کرتا اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف وعظ و تذکیر سے نہیں ہوسکتی بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ پھر جب کہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو خود سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامت دین اور نفاذ شریعت اور اجرائے حدود اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب ومندوب ہے۔[۲]

ہندوستان کے موجودہ حالات میں ایک اصول و اخلاق پسند قیادت کیوں سیاسی میدان میں اترنے اور اقتدار پر مبنی سیاسی عمل کو انجام دینے سے گریزاں ہے اس کے متعدد وجوہات میں یہ بات بھی ہے کہ تاریخی وجوہات کے علاوہ ملک کے موجودہ نظام اور اس میں انتخابی حصہ داری کے بارے میں غلط فہمیاں، سابقہ فکری رہنمائی کا غلط انطباق اور صحیح ومتوازن سیاسی فکر کا شعور نہیں ہے۔ اور ایک طرح کی ''اُصولی تقویٰ شعاری'' (لاشعوری جھجک نے اذہان واعمال) نے جذبہ پیش رفت کو مفلوج کررکھا ہے۔

آیئے! کوشش کریں کہ اولاً موجودہ نظام اور اس میں انتخابی حصہ داری کے سلسلہ میں جماعتی موقف کو سمجھنے سے شروعات کریں۔

جماعت اسلامی ہند کا سیاسی موقف

ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں جماعت اسلامی ہند کی حصہ داری، امکانات اور

مستقبل کے لائحۂ عمل کو زیر بحث لانے کے سلسلہ میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ:

☆ جماعت اسلامی ایک اصولی، فکری اور داعی جماعت ہے جو اصلاح فکر و نظر کے ساتھ تعمیر کردار کے لیے کوشاں ہے اور ملی، رفاہی اور دعوتی سرگرمیوں کے ذریعہ اپنی ایک مخصوص پہچان بنا چکی ہے۔ اس کو ایک اصلاحی دینی جماعت سمجھا جاتا ہے۔

☆ انتخابی سیاست اور ملکی نظام میں حصہ داری کے موضوع پر آزادی ملک سے قبل اس کا جو اصولی موقف تھا وہ عملاً کسی حصہ داری کو ممنوع نہیں تو اس قدر محدود مشروط کر دیتا ہے کہ رائے عامہ کے قابل لحاظ طور پر استوار ہو جانے اور ملکی انقلاب احوال کے آخری مرحلہ میں ہی عملی سیاست میں ناگزیر شرکت کی اجازت اس کی رو سے دی جاسکتی ہے۔ اس موقف کے بڑے گہرے اثرات کسی نہ کسی صورت میں وابستگان جماعت کے ذہنوں میں اب بھی باقی ہیں۔

☆ گذشتہ چار دہائیوں کے دوران ملکی نظام اور انتخابی سیاست کے موضوع پر جماعت کے طرز فکر اور اصولی موقف کی جو نئی تعبیر سامنے آئی ہے اس کی رو سے موجودہ نظام کو غیر اسلامی اور خلاف حق سمجھتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کے لیے انتخابات میں حصہ لینے کو جائز و درست سمجھا گیا ہے چنانچہ ارکان جماعت پر انتخابی رائے دہی میں حصہ لینے پر جو پابندی تھی اس کو مشروط طور پر برخواست کر دیا گیا ہے۔

☆ مگر یہ حقیقت ہے کہ گذشتہ تین چار انتخابات عام کو مواقع پر جن ارکان و متوسلین جماعت نے رائے دہی (Voting) کی اجازت سے استفادہ کیا ہے وہ ابتدائی فوائد و اثرات سے زیادہ کوئی نمایاں اثر (Impact) اور نتیجہ خیز بات ملکی سیاسی ماحول میں نہیں پیدا کر سکے اور اب تو یہ مجہول قسم کی رسمی کاروائی بن گئی ہے۔

☆ جن اعلیٰ مقاصد، دوررس سیاسی فوائد و اثرات اور خوش آئند امکانات کی جستجو میں قائدین جماعت نے برسوں انتھک محنتوں اور دماغی کاوشوں کے بعد جو راہ نکالی ہے وہ وسیع و موثر عوامی و سیاسی رابطہ طاقت ور وسیلہ ترسیل، سیاسی بصیرت اور دانش مندانہ پیش رفت کے بغیر ابھی تک ہمارے لیے اجنبیت، ناپختگی اور عدم کارکردگی کا مظہر بنی

ہوئی ہے۔ اور ہمارے مزاج، شعور و آگہی اور دل چسپیوں کی آسودگی اس میں نہیں مل رہی ہے بے مقصد وقتی مصروفیت سے آگے اس کا کوئی مصرف نظر نہیں آتا۔

☆ جماعت نے ملّی رابطہ کے لیے مسلم مجلس مشاورت، جمہوریت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ کے لیے فورم برائے جمہوریت اور فرقہ وارانہ خیر سگالی اور بین المذاہب تعامل و تعاون کے لیے دھارمک جن مورچہ بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کی وہ تاسیسی تنظیم ہے۔ سیاسی میدان اور انتخابی سرگرمیوں میں تال میل (Co-ordination) کے لیے اگر وہ پہل کرے اور سیکولر جمہوری عناصر، گروہوں اور سیاسی جماعتوں میں ہم خیالی، اتفاق رائے اور اتحاد عمل پیدا کرنے کی سعی کرے تو غلط نہیں ہوگا۔ ملک میں بڑھتے ہوئے فاشسٹ خطرہ کی روک تھام کے لیے یہ امر بے حد ضروری ہو گیا ہے کہ ملک کی سیکولر جمہوری قوتوں کو مشترک پلیٹ فارم پر لایا جائے وہیں ملک میں سیکولر جمہوری رائے عامہ کو بیدار و باشعور بنانے کی جدو جہد کی جائے۔

مذکورہ مقاصد کے لیے اگر کوئی فورم بنایا جائے تو اس کا نام (National Consensus Forum) کے طرز پر رکھنا احسن ہوگا۔

☆ مذکورہ فورم کے ایجنڈہ میں حسب ذیل مقاصد کے حصول کے تدابیر کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

ملک کے تمام مذہبی و تہذیبی گروہوں اور اقلیتوں کے لیے (Religious and Cultural Autonomy) کا دستوری تیقن اور ملک کے انتظامی ڈھانچہ میں اس کا بندوبست۔

الف۔ عدالتوں میں پرسنل لا کورٹس کا قیام جہاں متعلقہ فرقہ کے ماہرین قانون بطور جج مقرر کیے جائیں۔

ب۔ اقلیتوں کی مذہبی تعلیم و مدرسہ نظام کو تسلیم (Recognision) کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اندرونی خودمختاری کی ضمانت دی جائے۔ اور سرکاری

مدارس میں اخلاقیات و دینیات کی تعلیم متعلقہ فرقوں کے لحاظ سے دی جائے۔

ج۔ مذہبی اوقاف، مساجد و عبادت گاہوں، مذہبی تقریبات وغیرہ کے انعقاد کے لیے بااختیار و نمائندہ بورڈز تشکیل دیے جائیں جن کا انتظام و انصرام متعلقہ فرقوں کے حقیقی نمائندوں کے سپرد ہو۔

د۔ مذہبی، تہذیبی، ثقافتی ولسانی گروہوں اور فرقوں کے امور و معاملات اور ان کے معاشی اور سیاسی مفادات کے لیے متعلقہ فرقوں کے نمائندوں پر مشتمل مشاورتی ادارے (Advisory Councils) ہوں جو متعلقہ فرقوں کے قانونی و دستوری حقوق و فرائض کے سلسلے میں حکومتوں کو مشورہ دیں اور ان کے قانون سازی کے امور میں ماہرانہ رائے دیں۔

ھ۔ ملک کے انتخابی نظام میں اصلاحات لائی جائیں اور اس کو دھونس، دھاندلی اور دھاچوکڑی سے نجات دلائی جائے اور متناسب طریقہ رائے دہی و نمائندگی (Proportional Representation System) رائج کیا جائے۔

و۔ ملکی خدمات اور قومی معیشت میں اقلیتوں کی پس ماندگی دور کرنے کے لیے خصوصی انتظام کی ضمانت ہو اور ملکی آبادی میں ان کے حصہ کا پاسنگ (Weightage) انھیں ملے۔

☆ اگر مذکورہ ایجنڈہ کو موثر طور پر روبہ عمل لایا جائے تو شمال مشرقی ہندوستان اور جموں وکشمیر کی علیحدگی پسند قوتوں کو بے اثر کیا جاسکتا ہے اور ملک میں اتحاد و بھائی چارہ، امن و عافیت اور استحکام و ترقی کی نئی فضا پیدا کی جاسکتی ہے۔

☆ متوسلین جماعت کے سیاسی طرز فکر اور شعور و آگہی کو حرکیاتی رخ دینے کے لیے سیاسی تربیت کا انتظام کیا جائے اور سیاسی وسماجی کارکنان (Socio-political Wrokers) کی ایک کھیپ تیار کی جائے جو سیاسی وسماجی موضوعات، دستور و قانون کے اہم پہلوؤں، سیاسی حکمت عملی کے ماہرانہ امور، امور مملکت کی جانکاری، سیاسی و قانونی تنازعات کو حل کرنے کی صلاحیت، مظاہرے کرنے، تحریکات چلانے کا تجربہ، رائے عامہ

کی استواری کے فن، ترسیل و ابلاغ کے ہنر اور ان سب امور کی منصوبہ بندی اور عمل آوری کا صحیح علم اور عملی تربیت حاصل کریں۔ قیادت، مہارت اور سرمایہ کے حصول اور اس کے استعمال کے مناسب طریقوں کا علم اور تربیت کا حصول کر سکیں۔

☆ ملکی مسائل کے حل اور تعمیر نو کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا جائے جس میں صحت مند اقدار و اخلاقی اوصاف اور حقیقی فلاح و بہبود کے سیاسی، سماجی، معاشی، صنعتی معاملات، داخلہ و خارجہ پالیسی کے خطوط کار اور رہنمایانہ خطوط اجاگر کیے جائیں اور ان کو ہندوستان کی تعمیر نو کے منشور (Manifesto for the Reconstruction of India) کے نام سے پیش کیا جائے اور اس کے حق میں رائے عامہ ہموار کرتے ہوئے ایک متبادل قومی سیاسی جماعت کے قیام کی ضرورت کو اجاگر کیا جائے اور قومی اتفاق رائے کا جو فورم (National Consensus Forum) بنے اس کی قیادت کو یہ کام سونپا جائے کہ اس کو بہ تدریج رو بہ عمل لانے کے لیے مذکورہ سیاسی جماعت کا پختہ کار، صحت مند کردار اور اونچے قائدانہ صلاحیتوں کے افراد کو مقرر کیا جائے جو مساوی درجہ کے دیگر ابنائے وطن کو ساتھ لے کر عوام الناس میں نفوذ کریں اور اتفاق رائے کی مذکورہ مساعی کو جاری رکھتے ہوئے عوامی مسائل کے حل کے لیے عملی جدوجہد کریں۔ اس فورم کی جدوجہد کے تین مرحلے ہوں گے۔

پہلا مرحلہ:

قومی سطح کے اتفاق رائے کا حصول جو عام انتخابات سے کافی قبل سیکولر جمہوری قوتوں کے باہمی ٹکراؤ کو روکنے، مضبوط اخلاق و کردار کے حامل ان امیدواروں کی تائید کرنے اور فورم کے مقاصد کی تکمیل کا وعدہ کرنے والوں کی حمایت کو یقینی بنائے گا۔

دوسرا مرحلہ:

اس میں میونسپل اور پنچایت انتخابات میں عملی حصہ داری اور جہاں یہ ممکن نہ ہو

وہاں متبادل اور پسندیدہ امیدواروں کی تائید کرنا ہوگا یہ حصہ داری غیر جماعتی ہوگی۔

تیسرا مرحلہ:

قومی سطح پر منتخب مقامات پر انتخابات میں عملی حصہ لینا اور دیگر مقامات پر متبادل پسندیدہ امیدوار کی تائید کرنا ہوگا۔ اس مرحلہ پر متبادل سیاسی جماعت کا کوئی مناسب غیر فرقہ وارانہ نام رکھنا ضروری ہو جائے گا۔

مذکورہ فیصلے تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستانی جمہوریت کی بعض بنیادی باتوں پر نظر ڈالی جائے۔

ہندوستانی جمہوریت کے چار ستون ہیں:

الف- دستورِ ہند

ب- سیکولرزم

ج- انتخابات

د- ہندوستانی عوام

ا- دستورِ ہند کے بنیادی ڈھانچہ میں شہریت، بنیادی حقوق، پارلیمانی نظام، مملکت کی حکمت عملی کے ہداتی اصول، بنیادی فرائض اور چند فہرست بند (Schedules) وغیرہ ہیں۔

مولانا محترم ابواللیث مرحوم نے اپنی کتاب ''مسلمانانِ ہند کا لائحہ عمل'' میں دستورِ ہند کے اولین دو ابواب شہریت اور بنیادی حقوق پر تفصیلی اظہارِ خیالات فرمایا تھا۔ آپ کے خیالات کی ترجمانی ایک پیراگراف میں یوں کی گئی ہے:

''گویا جہاں تک آئین کا تعلق ہے اس میں اور وجوہ سے نقائص ہو سکتے ہیں اور ہیں لیکن جن امور کے سلسلہ میں مسلمان خاص طور سے پریشانیاں محسوس کر رہے ہیں ان کے سلسلہ میں ان کے موجودہ ظرف کے مطابق کافی سامانِ اطمینان موجود ہے۔ اور آئین ہند میں ان کے

لیے جو مساویانہ حقوق تسلیم کیے گئے ہیں وہ کچھ اکثریت کا صدقہ نہیں ہیں بلکہ وہ ان کے جائز حقوق ہیں جن کو تسلیم کیا جانا ہی چاہیے تھا"۔[۳]

مولانا مودودی علیہ الرحمۃ نے تقسیم ہند سے قبل حاکمیت جمہور کے مغربی تصورات پر شدید تنقید کی ہے لیکن آزادیٔ اجتماع اور اظہارِ خیالات، بنیادی حقوق، وغیرہ کے پہلو سے موصوف نے جمہوریت کی خوبیوں کا بھی اعتراف کیا ہے، فرماتے ہیں:

"شخصی بادشاہی (Monarchy) اور امیروں کے اقتدار اور طبقوں کی اجارہ داری کے ہم بھی اتنے ہی مخالف ہیں جتنا موجودہ زمانے کا کوئی بڑے سے بڑا جمہوریت پرست ہوسکتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں تمام لوگوں کے یکساں حقوق، مساویانہ حیثیت اور کھلے مواقع پر ہمیں بھی اتنا ہی اصرار ہے جتنا مغربی جمہوریت کے کسی بڑے سے بڑے حامی کو ہوسکتا ہے۔ ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ حکومت کا انتظام اور حکمرانوں کا انتخاب تمام باشندوں کی آزادانہ مرضی اور رائے سے ہونا چاہیے۔ ہم بھی اس نظامِ زندگی کے سخت مخالف ہیں جس میں لوگوں کے لیے اظہارِ رائے کی آزادی، اجتماع کی آزادی اور سعی وعمل کی آزادی نہ ہو یا جس میں پیدائش اور نسل اور طبقات کی بنیاد پر بعض لوگوں کے لیے مخصوص حقوق اور بعض دوسرے لوگوں کے لیے مخصوص رکاوٹیں ہوں۔ یہ امور جمہوریت کا اصل جوہر (Essence) ہیں۔ ان میں ہماری جمہوریت اور مغربی جمہوریت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے"۔[۴]

دستورِ ہند کے ایک مخصوص پہلو پر بہت کم توجہ دی گئی ہے وہ تہذیبی خوداختیاری ہے۔ اس کے فہرست بند (۶) میں، شمال مشرقی علاقوں میں رہنے والوں کے لیے تہذیبی خوداختیار کے اصول کے تحت علاقوں کا تعین، ان کی مشاورتی کونسلوں کا قیام اور ان کو قانون سازی، عدل گستری، تعلیم، مالیاتی امور، خصوصی محصول لگانے اور وصول کرنے،

دستور العمل وضابطے وغیرہ بنانے کے اختیارات حاصل ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ شمال مشرق میں عیسائیت کو فروغ ملا اور گذشتہ نصف صدی کے دوران کل کے قبائلی علاقے آج مکمل ریاستوں (Full-fledged States) کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔

مولانا مودودیؒ نے تقسیمِ ہند کے متبادل کے طور پر تہذیبی خود اختیاری کا ایک خاکہ پیش فرمایا تھا۔ آزاد ہندوستان میں بھی وہ مسلمانوں کے سیاسی لائحہ عمل کا ایک نہایت اہم باب اور اقامتِ دین کا دیباچہ بن سکتا تھا۔ مگر تحریکی قیادت نے اس کو لائق اعتناء نہیں سمجھا۔

دستورِ ہند کا ایک اور پہلو جو تیسرے فہرست بند میں حلف و وفاداری یا اقرار صالح کے نمونوں پر مشتمل ہے ہمارے لیے خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ اس حلف کے ذریعہ کوئی رکن پارلیمان یا مجلس قانون ساز خدا کے نام پر حلف اٹھاتا ہے کہ وہ بھارت کے آئین پر جو قانون کے بموجب طے پایا ہے اعتقاد رکھے گا اور اس کا وفادار رہے گا اور وہ بھارت کے اقتدارِ اعلیٰ اور سالمیت کو برقرار رکھے گا (اس کا دوسرا نمونہ اقرار صالح کے لیے ہے)۔ مجھے یہاں صرف اس امر سے دل چسپی ہے کہ ''خدا کے نام پر'' حلف اٹھانے والوں کا تناسب پارلیمان یا مجالس قانون ساز میں کیا ہوتا ہوگا۔ مجھے اس کے اعداد و شمار تو نہیں ملے لیکن یقین ہے کہ مارکسی زیر اثر ریاستوں کو چھوڑ کر ملکی پارلیمان و مجالسِ قانون ساز میں خدا کے نام پر حلف اٹھانے والوں کی بھاری اکثریت رہتی ہوگی۔ اگر یہ صورت حال ہو جسے آپ چاہے کچھ کہہ لیں لیکن الحاد و دہریت کا ٹھپہ ان اداروں پر نہیں لگا سکتے۔

جیسا کہ قبل ازیں کہا گیا ہے کہ:

دستور ہند کا ایک پہلو جو اس کے تیسرے فہرست بند (IIIrd schedule) میں ہے خدا کے نام پر حلف وفاداری یا اقرار صالح کے نمونوں پر مشتمل ہے اگرچہ کہ یہ ایک رسمی نوعیت کی بات ہے مگر یہ بھی ان چند در چند ذہنی رکاوٹوں میں سے ہے جن کی وجہ سے انتخابات میں بطور امیدوار کھڑا ہونے میں ہم تکلف برت رہے ہیں۔

خدا کے نام پر جب کوئی رکن پارلیمان یا مجلس قانون ساز یا پنچایت یہ حلف اٹھاتا ہے کہ وہ بھارت کے آئین پر جو قانون کے بہ موجب طے پایا ہے اعتقاد رکھے گا اور اس کا وفادار رہے گا اور وہ بھارت کے اقتدار اور سالمیت کو برقرار رکھے گا تو وہ عام شہری کی طرح خود کو بھی اس امر کا پابند بنالیتا ہے کہ:

☆ ملک کے دستور و قانون کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔

☆ ضرورت پڑنے پر وہ ملک کے دفاع کے لیے کمر بستہ رہے گا۔

☆ ملک کے واجب کردہ ٹیکس ادا کرے گا۔

☆ امن و قانونی حکمرانی کی برقراری کے لیے حکومت سے تعاون کرے گا۔

☆ ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو بالاتر سمجھے گا۔

☆ دستور میں درج بنیادی ذمہ داریوں کو حتی الامکان ادا کرے گا۔

یہ امور ملک و دستور سے وفاداری کے تقاضے ہیں۔ اگرچہ کہ دستور ملک تنقید و تبدیلی (Sacroscent) سے بالاتر نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی خدائی قانون و دستور کے مانند کامل (Absolute) ہے اس کی وفاداری اور اس پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے اور مذہباً یہ ممنوع بھی نہیں ہے کیوں کہ دستور لاقانونیت کو روکتا ہے اور جب تک اس کا متبادل نہ ہو اس کو خوش اعتقادی (In Good Faith) سے ماننا اور اس کی خلاف ورزی نہ کرنا (بہ الفاظ دیگر اس کے وفادار رہنا) احسن ہے۔

صلح حدیبیہ سیرت طیبہ ﷺ کا ایک سنگ میل کارنامہ (Landmark work) ہے۔ آپ ؐ کا خود کو رسول اللہ ﷺ لکھنے پر اصرار نہ کرنا (حالاں کہ آپ کا مشن اپنی رسالت منوانا تھا) اس قبیل سے ہے۔

دستور ہند شہریان ہند کے درمیان ایک معاہدہ و اقرار ہے اور مسلمان بھی اس کے فریق ہیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے عہد و اقرار کا پابند رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔

وأوفوا لعھد یا وأوفوا بالعقود

ویسے ایک پڑوسی ملک کو کلمہ پڑھانے کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ وہاں نہ تو

جمہوریت قدم جما سکی ہے نہ اسلامی نظام کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ یہی حال بیش تر مسلم ممالک کا ہے جہاں آمریت یا بادشاہت چل رہی ہے، محدود جمہوریت بھی ہے اور اگر غلطی سے مکمل جمہوریت کہیں ہے تو اسلامی طاقتوں کو برسرِ اقتدار نہ آنے دینے کے لیے وہاں طرح طرح کی رکاوٹیں لگادی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں بھی مسلم ممالک کی تحریکاتِ اسلامی انتخابات کے مسئلہ میں اختلاف کا شکار ہوئیں وہاں ان وجوہات کے باعث نوجوانوں کی فعالیت (Activism) نے عسکریت پسندی کی راہ لی ہے۔

ب۔ ہندوستانی جمہوریت کا دوسرا استون سیکولرزم ہے جس کا ترجمہ غیر مذہبیت کیا جاتا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اس کو غیر دینی یا دنیاویت کہا ہے اور اس کی چند اقسام کی تفصیلی تشریح بھی کی ہے۔ اس کی ایک قسم کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ''غیر دینی کا ایک سادہ مفہوم یہ ہے کہ اسٹیٹ کا اپنا کوئی مذہب نہ ہو، وہ بجائے خود دنیوی ہو اس کی اساس کسی مخصوص شریعت پر نہ ہو، وہ کسی خاص مذہب کی نصرت وحمایت نہ کرے، مگر اس کے ساتھ ہی وہ مخالف دین (Anti Religious) بھی نہ ہو بلکہ اپنے دائرے میں مذہبی نظامات کو تسلیم (Recognize) کرے اور ان کو حکومت کے اختیارات میں سے کم از کم اتنے اختیارات تفویض کردے جو اندرونی تنظیم کے لیے ضروری ہیں مثلاً اپنے پیروؤں پر ٹیکس عائد کرنا، مذہبی قوانین کو ان پر نافذ کرنا اور ان کی دینی تعلیم کا انتظام کرنا، عام اس سے کہ وہ علیحدہ مدارس کی شکل میں ہو یا مشترک تعلیمی نظام کے ماتحت ہو''۔[۵]

سیکولرزم کا یہ تصور یورپ کی ان ریاستوں میں رائج تھا جو تکثیری سماج پر مشتمل تھیں، برطانوی ہند میں اس تصور کا جزوی وناقص چربہ اتارا گیا تھا۔ آزاد ہندوستان میں بھی سیکولرزم کا جو تصور عام ہے وہ جزوی طور پر سیکولرزم کے اس روادارانہ پہلو (Liberal Aspect) کا حامل ہے اور دستورِ ہند کے بنیادی حقوق (دفعات ۲۵ تا ۳۰)

سے جس کا اظہار ہوتا ہے مگر دفعہ ۴۴ جو یکساں دیوانی قانون (Uniform Civil Code) کی تدوین کے مملکتی عزم کا اظہار کرتی ہے۔ وہ سیکولرزم کے جارحانہ پہلو (پرسنل لا سے مذہب کو جدا کرنے) کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

مولانا مودودیؒ نے سیکولرزم کے اس سادہ مفہوم پر کوئی تنقید نہیں کی ہے۔ اور جنھوں نے تہذیبی خود اختیاری والے مولانا مرحوم کے خاکے کو ملاحظہ کیا ہے وہ گواہی دیں گے کہ یہ خاکہ بعینہٖ غیر دینی کے اس تصور پر مبنی ہے۔ اگرچہ کہ مولانا محترم نے اپنے سیاسی تدبر سے اس کو چند دیگر پہلوؤں سے مستحکم کرتے ہوئے ایک دوسری سیاسی اصطلاح میں بیان کیا ہے۔ مولانا محترم نے سیکولرزم کے الحادی و بے دینی رخ کو ہی ہدف تنقید بنایا تھا اور چونکہ یہی رخ بیش تر مسلم ممالک میں شریعت کے نفاذ میں رکاوٹ تھا اس لیے محترم کی یہ تنقید ضروری اور بروقت تھی۔

'سیکولرزم' کے بارے میں جماعت کی مجلس شوریٰ نے ایک قرارداد کے ذریعہ اس کے جس مفہوم کی تائید کی ہے وہ اسی (Context) میں ہے۔ یعنی ''حکومتی کاروبار میں کسی مذہبی فرقہ کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کیا جائے اور اس کے ساتھ بلا امتیاز مذہب وملت یکساں برتاؤ ہو اور سب کو یکساں مواقع حاصل رہیں تو جماعت نے اس تخیل کی بھی مخالفت نہیں کی''۔ (مجلس شوریٰ، جولائی ۱۹۶۱ء)۔ جب کہ جماعت نے بھی سیکولرزم کے الحادی پہلو کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

سیکولر جمہوری طرز حکومت پر جماعت کی ایک مبسوط قرارداد وہ بھی ہے جو اس کی مجلس شوریٰ نے اگست ۱۹۷۰ء کو منظور کی تھی۔ اس کے چند اقتباسات لائق توجہ ہیں:

> ''ہندوستان اس معنی میں ایک سیکولر ریاست ہے کہ اس کا دستور مختلف مذاہب اور دین کے پیروؤں کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں رکھتا۔ دستورِ ہند کی رو سے ہر فرد کو اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی عقیدہ ومسلک اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی یکساں آزادی ہے''۔ نیز ''دستورِ ہند کی مذکورہ بالا خصوصیات ہندوستان میں

دعوتِ اسلامی کے لیے مواقع فراہم کرتی ہیں اور یہی خصوصیات ایک ایسے ملک کے لیے موزوں ہیں جس کی غالب اکثریت کو اپنے پروردگار کی بھیجی ہوئی ہدایت کی پہچان حاصل نہ ہو، اس وجہ سے موجودہ صورت حال میں جماعتِ اسلامی ہند یہ چاہتی ہے کہ دوسرے کلیت پسندانہ اور فسطائی طرز ہائے حکومت کے مقابلے میں ہندوستان کا مذکورہ بالا سیکولر جمہوری طرز حکومت برقرار رہے۔ ہم موجودہ طرزِ حکومت میں ہر اس تبدیلی کے مخالف ہیں جو باشندگانِ ملک کی ان آزادیوں میں کسی طرح کی رکاوٹ ڈالے جو انھیں اپنی مرضی کے مطابق عقیدہ ومسلک اختیار کرنے، اس کی تبلیغ واشاعت کرنے اور جمہوری طریقوں سے اس کے مطابق رائج نظام میں تبدیلی لانے کی کوشش میں حاصل ہیں''۔[۶]

ہندوستانی جمہوریت کے دو اہم ستونوں یعنی دستورِ ہند اور سیکولرزم کے بارے میں آپ نے جماعت کے موقف کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔ مختلف وجوہات کی وجہ اور حکومتی حلقوں میں ایسے عناصر کے وجود کے باعث جو جمہوریت وسیکولرزم کے فوائد اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں تک پہنچنے میں سدراہ بنے رہتے ہیں، گذشتہ نصف صدی سے زائد کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ سیاسی وحکومتی سطح پر 'کہنی اور کرنی' میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ہندوتوا کے علم بردار اپنے مخصوص تہذیبی قوم پرستانہ نظریات کی وجہ اقلیتوں کے جمہوری حقوق سلب کرنے اور سیکولرزم کی اقلیت نواز پالیسی کے ازلی دشمن بن کر ابھر رہے ہیں۔ وہیں مسلمانوں کے بعض بے شعور افراد بھی سیکولر جمہوریت پر نظرِ عنایت کیے رہتے ہیں اور اپنی برہمی کا اظہار مختلف پیرایوں میں کیا کرتے ہیں۔ ان کی برہمی کی رد میں سیکولرزم کا لبرل تصور بھی آجاتا ہے۔

ج- ہندوستانی جمہوریت کا تیسرا اہم ستون بلا وقفہ انتخابات عام کا انعقاد ہے۔ بالغ رائے دہی کے اصول پر ہر شہری اپنے جمہوری حق کا استعمال کرتے ہوئے ایک مخصوص میقات کے لیے اپنے نمائندے ملکی پارلیمان اور ریاستی مجالسِ قانون ساز

میں بھیجتا ہے۔ جمہوری راہ کی اثر انگیزی نے اشتراکی انقلابی نظریہ کے حاملین کو ہی نہیں ہندوتوا کے فسطائی عناصر تک کو اپنے قسمتیں آزمانے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہندوستان میں جو تبدیلیاں گذشتہ پچاس سالہ عرصہ میں آئی ہیں وہ اسی جمہوری عمل سے گذر کر آئی ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کے لیے جماعت نے انتخابات کی راہ اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مگر صرف ارکانِ جماعت پر جو پابندی رائے دہی (Voting) میں حصہ لینے پر عائد تھی اس کو محدود اور مشروط طور پر اٹھایا گیا ہے۔ اس فیصلے کے بارے میں وابستگانِ جماعت کا ایک قلیل حصہ ذہنی تحفظات رکھتا ہے جس کا اظہار جماعتی اخبار و رسائل میں بھی ہوتا رہتا ہے اور اجتماعاتِ ارکان کی نشستوں میں بھی اکثر یہ موضوعِ بحث بن جایا کرتا ہے۔ ملک کے دستور کے تحت مملکتی نظام میں مسلمان بحیثیت باشندگانِ ملک برابر کے حصہ دار ہیں سیاسی اصطلاح میں وہ شریک اقتدار کہے جاتے ہیں مگر مختلف وجوہ سے جن میں ان کے مخصوص ذہنی تحفظات کو بھی دخل ہے وہ اپنی اس حیثیت کے بجائے محض Vote Bank بن کر رہ گئے جن کا استحصال انتخابات کے مواقع پر سیاسی جماعتیں کرتی رہتی ہیں۔

ضرورت ہے کہ کسی کرو کشیتر یا ماچھی گوٹ سے گذرے بغیر اس کا حل نکالا جائے۔

موجودہ سیکولر جمہوری نظام حکومت (Secular-Democratic System of Governance) جو کسی تکثیری سماج (Plural Society) میں فطری طور پر ابھرتا ہے، انتخابات عام کا انعقاد نہ صرف سیاسی ضرورت ہے بلکہ ملکی ارتقاء کے لیے لازمی بھی ہے۔ اسلام کے سیاسی تصورات مسلمانوں کی بنیادی فکر کا حصہ ہیں اور جس طرح تبلیغ و تلقین اور اشاعت افکار کے ذریعہ ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح و تربیت کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور ان تصورات کے لحاظ سے میدان کار، بنیادی ڈھانچہ اور لوازمات فراہم کرنا ضروری ہو جاتا ہے اسی طرح اسلام کے سیاسی تصورات بھی فرد، معاشرہ اور ریاست کی سطح پر سعی و جہد کے متقاضی ہوتے ہیں اور انھیں بھی ان ترسیلی واسطوں سے گذار کر ہی فعال رکھا جا سکتا ہے جن سے دیگر تصورات فعال رہتے ہیں۔

ہم جس تکثیری سماج میں رہتے ہیں وہ اپنے اندر غالب اکثریت غیر مسلمین کی رکھتا ہے جو جمہوری نظام کے طریقہ انتخابات کے باعث غیر معمولی اکثریت سے اپنے نمائندے ملکی پارلیمان اور ریاستی مجالس قانون ساز میں بھیج سکتے ہیں اور مسلم اقلیت اپنی عدد طاقت کے لحاظ سے بھی ان اداروں میں اپنے نمائندے نہیں بھیج سکتی۔ اگر یہاں متناسب نمائندگی (Proportional Representation) کا طریقہ رائج ہوتا تو ان اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی کم وبیش ان کی آبادیوں کے تناسب سے ہوتی اور ان اداروں کے فیصلوں، حکومتی تشکیل پر اثر انداز یا حزب مخالف کے کردار کو مؤثر کرنے کا باعث ہوتی۔

ملکی پارلیمان اور ریاستی مجالس قانون ساز دستور ہند کے تحت کام کرتی ہیں جو حکومت چلانے کا ایک اجتماعی معاہدہ ہے۔ اس 'معاہدہ' کی تدوین، آزادی ملک کے برطانوی قانون کی رو سے ایک مجلس دستور ساز نے کی تھی جس میں مسلم نمائندے بھی شریک تھے۔ ملکی پارلیمان اور ریاستی مجالس قانون ساز کو جو اختیارات اس دستوری معاہدہ کے رو سے حاصل ہیں ان کے بہ موجب وہ نظم حکومت چلانے کے لیے قوانین وضوابط کی تدوین کرتی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ تدوین قوانین کا یہ عمل دنیوی علوم اور دنیوی مہارت و تجربہ کی بنیاد پر ہوا کرتا ہے۔ ان اداروں کے عوامی نمائندے اگر خدائی ہدایت اور اسوۂ انبیاء سے بہرہ ور ہوں تو اپنی دینی بصیرت کا اظہار حکمت و تدبر سے کرکے ملکی پالیسیوں اور قانون سازی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ ملک کا دستور و نظام دنیوی (Secular) ہے اس لیے مذہبی غیر جانب داری برتنے میں کسی بھی مذہبی ہدایت، شاستر و شریعت کے حوالے سے عام قانون سازی نہیں کی جا سکتی۔ البتہ مختلف فرقوں (بشمول مسلمانوں کے) کے احوال وقوانین شخصیہ (Personal Laws) کے مطابق قانون سازی کا تحفظ فی الحال حاصل ہے لیکن یکساں دیوانی قانون جس کا ذکر رہنمایانہ اصولوں (Directive Principles) میں کیا گیا ہے وہ مختلف قوانین شخصیہ کے استرداد کا باعث ہو سکتا ہے۔

اگر مسلمان بہ حیثیت مجموعی ملکی پارلیمانی و ریاستی مجالس قانون سازی کے

میقاتی انتخابات کا مقاطعہ مستقل اساس پر کریں تو ان اداروں میں ان کی نمائندگی کے فقدان کے باعث ان کی ملکی وملّی زندگی کے بارے میں بہت سارے امور ان کی مرضی کے خلاف اور ان کے مذہب وتہذیب کے مغائر طے پائیں گے اور ان حالات میں بنے ہوئے قوانین وضوابط کی پابندی پر وہ مجبور ہوں گے اور خلاف ورزی کی پاداش میں اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں جوکھم مول لے لیں گے۔

اس لیے اپنے دینی، ملی، تہذیبی تشخص کی برقرار، ارتقاء وعمل درآمد کے امکانات کو بڑھاوا دینے ملک کی پارلیمان وریاستی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی قابل لحاظ نمائندگی ضروری ہے بلکہ یہ ان کے دین کا تقاضہ بھی ہے۔اس کے علاوہ ''امر بالمعروف و نھی عن المنکر'' کے فریضہ کی ادائیگی اور ''کلمة الحق عند سلطان جائر'' کے بہ موجب مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا اظہار ''قضیہ زمیں برزمیں'' کے مصداق پارلیمانی اداروں میں ہونا ضروری ہے۔طاغوت سے کنارہ کشی تو اصولی بات ہے لیکن اس کو من مانی کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دینا منشائے ربانی کے مغائر ہے اس وقت ''اذھب الیٰ فرعون انه طغیٰ'' کی پیروی کرنا واجب ہے۔کوئی احتجاجی جلسہ، مظاہرہ یا بیان جو بیرون پارلیمان دیا گیا ہو اس کا بدل نہیں ہوسکتا۔اس کے علاوہ حدیث شریف ''من راء منکم منکر'' کی عصری تشریح میں ''ہاتھ سے روکنے'' کی تاویل جمہوری رائے دہی (Voting) میں حصہ لینے سے کی جاسکتی ہے کیوں کہ دور سابق میں منکر کو مٹانے یا روکنے کے لیے قوت (تلوار) کے استعمال کا رواج تھا مگر آج بُرے اور ناپسندیدہ حکمران کو ہٹانے کے لیے رائے کی طاقت (Voting Power) کا استعمال مروج ہے 'زبان سے روکنے' کا صحیح محل بھی برائی کے مبداء کے قریب ترین ہی ہو تو احسن سمجھا جائے گا۔اگر مسلمان پارلیمانی اداروں سے دور رہیں اور بیرونی طور پر ہی ان اداروں سے پھیلنے والی برائیوں کو سہتے رہیں یا دل میں بُرا سمجھیں یا زیادہ سے زیادہ تقریر و بیان یا مظاہرہ سے ان کی مخالفت کریں تو وہ زیادہ موثر طریقہ برائیوں کے ازالہ کا نہ ہوگا۔ شریعت اسلامی کے مغائر قانون سازی کی حتی الامکان مخالفت پارلیمان کے اندر ہی

کرنے کے مسلم نمائندے مکلف ہیں اور ان کی مخالفت کے باوجود کوئی قانون سازی ہو جائے تو اس کا وبال از روئے شرع ان پر نہیں آئے گا وہ اس طرح قانون سازی کے خلاف آخری چارہ کار کے طور پر رائے دہی سے احتراز یا مقاطعہ (Walkout) کر سکتے ہیں اور پارلیمان کے باہر بھی اپنی مخالفت عوامی رائے عامہ کے اظہار سے کر سکتے ہیں ان امور میں ان نمائندوں کا کردار بیش تر ایک اصولی حزب مخالف کا ہوگا۔ انتخابی عمل میں عدم شرکت یا اس کے مقاطعہ سے دین میں حرج واقع ہونے کا قوی احتمال ہے جو خود ایک منکر ہے جس کا سدّ باب ضروری ہے۔ بہ موجب فرمانِ الٰہی "وما جعل الله فی الدین من حرج" اور ایک فقیہ پر واجب ہے کہ "رفع الحرج عن الناس" کی راہ نکالے نہ کہ الٹا انھیں منصوصات سے باندھ کر رحمتِ الٰہی سے دور کر کے، بہ حالاتِ موجودہ جب کہ اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات انتخاباتِ عام سے وابستہ ہوں مسلمانوں پر یہ شرعاً واجب ہوگا کہ کثرت رائے دہی سے نیک و صالح امیدواروں کو کامیاب کرائیں ورنہ رائے دہی سے پہلو تہی "مداھنت فی الدین" قرار پائے گی۔ اللہ ہمیں ہر قسم کے شر اور غلط فیصلوں سے محفوظ رکھے۔

د- ہندوستانی جمہوریت کا چوتھا ستون یہاں کے ایک ارب دس کروڑ عوام ہیں جن میں سے زائد ٦٠ فیصد رائے دہندے ہوں گے یہاں مسلمانوں کا تناسب ۱۵ تا ۲۰ فی صد ہے اور ایک سروے کے مطابق ایک سو پارلیمانی حلقے ایسے ہیں جہاں وہ فیصلہ کن موقف کے حامل ہیں۔ ہندوستانی عوام فی الوقت موافق سیکولر اور ہندوتوا مؤیدین میں بٹے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان کوئی غیر جانب دار گروہ مؤثر نہیں ہے۔ انتخابات عام کے مواقع پر رائے دہی بہت زیادہ متاثر کن بھی نہیں ہوتی، ہندوستانی رائے دہندوں میں جتھہ بندی کا عمل (Polarisation) کسی کرشماتی شخصیت کا منتظر رہتا ہے۔ ہندوتوا اور اس کے حامی ۲۵ فی صد رائے عامہ کو متاثر کر پائے ہیں مگر قومی اتحاد (Alliance) کے نام پر مخلوط نظریہ حکومت کے بل بوتے پر برسر اقتدار آ گئے تھے۔ سیکولر عناصر متفرق اور مؤثر قیادت سے محروم ہیں کوئی متبادل کانگریس اور بھاجپا کو نظر انداز کر کے ابھی تک نہیں بن سکا ہے۔

ہمارا موقف

سیکولر جمہوریت اور انتخابات عام کے بارے میں جماعت کے موقف بڑے طویل مراحل طے کر کے آگے بڑھا ہے۔ موجودہ نظام کی شرعی حیثیت اور اس کی سیکولر جمہوری پالیسی، رائے دہی اور اس میں حصہ داری یہ سب باتیں شورائی عمل سے طے ہو چکی ہیں مگر کہیں نہ کہیں کوئی ذہنی الجھن باقی رہ گئی ہے جس کے باعث سیاسی طور پر ایک طرح کا جمود و تعطل پایا جاتا ہے بعض فیصلوں پر عمل درآمد (Follow-up action) بھی نہیں ہو سکا ہے۔

مجلس شوریٰ منعقدہ بنگلور جون ۱۹۷۴ء کے فیصلوں میں سے حسب ذیل ہنوز توجہ طلب بنے ہوئے ہیں:

(۱) تحریکِ اسلامی کے فروغ اور مجموعی مفاد کے لیے موجودہ نظام کے تحت کام کرنے والے مختلف رفاہی، تعلیمی اور ترقیاتی اداروں سے شرعی حدود کے اندر استفادہ۔

(۲) ملک کے سیاسی اداروں سے بھی تحریکِ اسلامی اور اسلام کے ناگزیر مصالح کی غرض سے جماعت کے فیصلوں کے مطابق استفادہ۔

اس ضمن میں پنچایت اور لوکل باڈیز کے انتخابات میں عملی حصہ داری کا مسئلہ ہنوز جہاں کا وہاں رہ گیا ہے۔

تقسیم ہند سے قبل جماعت کا ایک اہم پالیسی فیصلہ یہ تھا کہ ''موجودہ نظام سے ایسے تعلق کو جو اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے لیے ناگزیر یا مددگار ہو حلال قرار دیا گیا ہے بلکہ بعض صورتوں میں ناگزیر بھی کردانا گیا ہے''۔ ۷؎

اس طرح کا واضح موقف رکھنے کے باوجود بعض محض مجہول قسم کے ذہنی تحفظات ہمیں سیاسی اقدامات سے دور رکھے ہوئے ہیں۔ جماعت نے مسلمانوں کے تہذیبی تشخص، اجتماعیت اور مشاورتِ باہمی، تعلیمی امور وغیرہ کے لیے ملی ادارے اور فورم

بنائے ہیں اسی طرح امن، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور جمہوریت کے تحفظ کے لیے فورم (FDCA) بنا چکی ہے اور اب مذہبی خیر سگالی کے لیے مورچہ بنایا گیا ہے۔ اگر جماعت ملک کے سیاسی مسائل اور سیکولر جمہوری نظام کی برقراری (جس کے لیے وہ اپنے ایک قرارداد میں بڑے شدومد سے اظہار کر چکی ہے) اور انتخابات عام پر اثر انداز ہونے کے لیے کوئی سیاسی فورم قائم کرے تو وہ اب تک کے اس کے فیصلوں کے اگلے مرحلہ کی نشان دہی کر سکے گا اور کوئی جاندار قومی سیاسی متبادل اگر اس کے توسط سے وجود میں آجائے تو ایک اچھی خدمت ملک وقوم کی ہوگی۔

تاریخ کا دھارا بہت آگے نکل گیا ہے اور جماعت نے گذشتہ عرصہ میں جو فیصلے اس ضمن میں کیے ہیں ان کی توثیق (Reaffirmation) کرتے ہوئے اس کو آگے کے مراحل کی بات سوچنا چاہیے۔ ان امور کے سلسلہ میں کوئی ذہنی تحفظ نہ رہے اس کے لیے ایسا ایک اجتماعی فیصلہ لینا چاہیے جو آگے کی راہیں کھولے اور کسی نظر ثانی کی سوچ کو آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم کسی خطرناک مذاق کا موضوع الگ بنیں اور آئندہ نسلیں بھی ہمیں معاف نہ کریں۔

حواشی ومراجع

۱۔ المنجد: ص ۵۰۱

۲۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تلخیص تفہیم القرآن

۳۔ مولانا ابواللیث اصلاحیؒ، مسلمانان ہند کا لائحہ عمل، طبع ۱۹۵۲ء، ص ۶۴-۶۵

۴۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، دعوتِ اسلامی س کے اصول اور طریقِ کار اور مقتضیات، ص ۲۱

۵۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مسلمان اور سیاسی کش مکش، حصہ دوم، ص ۱۰۳

۶۔ روداد جماعت اسلامی ہند، حصہ اول

۷۔ روداد حصہ چہارم، مجلس شوریٰ ستمبر ۱۹۶۴ء

☆☆☆

الیکشن کی شرعی حیثیت اور ہندوستانی معاشرہ

محمد عرفان قاسمی*

سیاسی مسائل

مسلمانوں کی مطلوب اور مثالی پوزیشن یہ ہے کہ وہ جہاں بھی رہیں، اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور غیر مشروط بندگی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں، وہ سر بھی اللہ کے آگے جھکائیں، دل میں بھی اس کی یاد بسائیں اور دماغ میں بھی اس کی محبت و اطاعت کا چراغ جلائیں، وہ عبادت بھی اسی کی کریں، سیاست میں بھی اسی کی ہدایت کی پابندی کریں، معیشت میں بھی اسی کے ضابطۂ احکام کو اختیار کریں اور معاشرت کو بھی اسی کے نور ہدایت سے منور کریں۔ غرضیکہ زندگی کے کسی گوشہ میں وہ اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی بندگی نہ کریں، مسلمانوں کی زندگی اللہ کے اس ارشاد کی عملی تفسیر ہونی چاہیے:

''قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ''۔ (الانعام: ۱۶۲)

(کہو میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔)

یہ صرف ایک شرعی تقاضا نہیں، بلکہ منطقی اور اخلاقی معاملہ بھی ہے، جو ذات کائنات کی خالق ہے وہی اس کی مالک بھی ہے اور وہی معبود برحق بھی ہے، جو لائقِ سجدہ ہے۔ قرآن پاک نے اس فطری کلیہ کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

---

* استاذ دینیات، سینئر سکنڈری (سٹی اسکول)، اے۔ایم۔یو، علی گڑھ

''أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ''۔(الاعراف:۵۴)

(آگاہ رہو کہ خلق اور حکم اسی کا ہے تو بابرکت ہے اللہ جو تمام جہانوں کا رب ہے۔)

''وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ''۔(الزخرف:۸۴)

(وہی ذات ہے جو آسمان میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہ حکمت والا علم والا ہے۔)

''إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوْا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ''۔(یوسف:۴۰)

(حکم تو بس اللہ کا ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔)

مذکورہ آیات صراحت کے ساتھ مسلمانوں کی زندگی کے نصب العین کو روشن کرتی ہیں اور مقصد زندگی کو واضح کرتی ہیں۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ زندگی کے کسی معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول محمد عربی ﷺ کی تعلیم کو نظرانداز کرکے کوئی خودساختہ نظریہ اور دوسرا طریقہ اختیار کرلے، کیوں کہ ایسا کرنا ایمان کی نفی کرنا ہے اور اپنی دینی بنیادوں کو کمزور کرنا ہے۔

اس وقت مسلمان جن ملکوں میں آباد ہیں، ان میں کچھ ممالک تو ایسے ہیں جہاں ان کو عبادت، معیشت، معاشرت اور سیاست ہر شعبۂ حیات میں اللہ کے حکم کو نافذ کرنے اور اس کی اطاعت کرنے کا اختیار اور آزادی حاصل ہے۔ وہاں وہ اسلامی زندگی کا مکمل نفاذ کرسکتے ہیں اور ہر شعبۂ حیات کی تشکیل اسلامی اصول واحکام کی روشنی میں کرسکتے ہیں۔ فریضۂ عبادت بھی کامل یکسوئی سے انجام دے سکتے ہیں اور اسلام کے عائلی اور دیوانی فوج داری قوانین کو نافذ کرسکتے ہیں۔

مگر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان ممالک میں بھی آباد ہے جہاں اقتدار

غیروں کا ہے اور وہ حکومتیں قومی جمہوری یا بادشاہی نظام کے ماتحت قائم ہیں، جہاں نہ اللہ کو مالک حقیقی تصور کیا جاتا ہے اور نہ اس کے احکام کو سرکاری نظام میں دخل دینے کی اجازت ہے۔ ایسے ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہ نظریہ حکومت کو تبدیل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور نہ اپنے دینی اقدار و آئین کو نافذ کروانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض ممالک ایسے ہیں جن میں مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلم ملکوں سے زیادہ تعداد میں ہیں۔ وہاں ان کی اپنی جمعیت ہے، اپنی تاریخ ہے، اپنا تہذیبی ورثہ ہے اور ان کی دیرینہ روایات ہیں، ان ملکوں میں مسلمانوں کے بڑے بڑے دینی تعلیمی اور سماجی ادارے ہیں، بڑی تعداد میں مساجد اور مدارس ہیں، علمی اور سماجی انجمنیں ہیں، اوقاف کی جائدادیں ہیں، تجارتی اور معاشی مراکز ہیں، ان سب کو ختم کر کے کسی مسلم ملک میں ہجرت کرنا ان کے لیے آسان نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ معاشی ترقی، انسانی حقوق کی بظاہر یقین دہانی اور شخصی آزادی کے حصول کی وجہ سے مسلم ممالک میں ہجرت کر کے جارہے ہیں اور وہاں کی شہریت اختیار کررہے ہیں۔ چونکہ ان غیر مسلم ممالک میں اقتدار کی باگ ڈور غیر اقوام کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، اس لیے وہاں اقتدارِ اعلیٰ اللہ کا نہیں بلکہ انسانوں کا ہوتا ہے جس کی وجہ سے خاص طور پر مسلمانوں کے لیے بے شمار مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ان ممالک میں اکثر ملکوں کا نظام حکومت جمہوری طرز پر قائم ہوتا ہے، جہاں اقتدار کا حصول ووٹوں پر منحصر ہوتا ہے اور نمائندگی کی کثرت سے قوانین بنتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں مسلمانوں کے لیے بہت بڑا سیاسی مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اقتدار میں شرکت کے لیے کون سا راستہ اختیار کریں، جس کے ذریعہ ملکی دستور کی روشنی میں حقوق کا تحفظ ممکن ہو اور ان کے مذہب، تہذیب اور ملی مفادات پر آنچ نہ آنے پائے، نیز ایسے قانون نہ بننے پائیں جن سے مسلمانوں کے حقوق پر زد پڑتی ہو یا مذہبی معاملات میں دخل اندازی ہوتی ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عام طور پر ان ممالک کا سیاسی چہرہ کرپشن

اور غیر اخلاقی کاموں کی وجہ سے غبار آلود ہو چکا ہے اور اقلیت خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف قانون سازی کے امکانات رہتے ہیں تو مسلمانوں کی نمائندگی سیاسی قانون ساز اداروں میں کس حد تک ہونی چاہیے اور سیاسی پلیدگی کو دور کرنے کے لیے انھیں کیا کردار ادا کرنا چاہیے۔ ان تمام احوال اور سوالات کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا جا سکتا ہے کہ ملکی سیاست میں حصہ لینا نہ صرف مسلمانوں کی سیاسی بلکہ مذہبی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ اپنے حقوق کی بازیابی اور دینی وملی تشخص کی بقا کے لیے ملکی سیاست میں سرگرم ہوں اور ایسے افراد کو ایوانِ قانون ساز تک پہنچانے کی کوشش کریں جو ان کے مفادات کے محافظ ہوں یا اخلاقی قدروں کے امین ہوں اور سیاست کو ملکی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے اور اسے صاف دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تا کہ ان رہنماؤں کے ذریعہ عملی طور پر یہ پیغام دینا ممکن ہو کہ اسلام نہ صرف دینی معاملات میں اپنے متبعین کی راہنمائی کرتا ہے بلکہ ان کے لیے سیاسی اصول بھی مرتب کرتا ہے اور سیاسی مسئلہ کے تصفیہ کے لیے تشفی بخش حل بھی پیش کرتا ہے۔

انتخابی سیاست میں مسلمانوں کی شرکت

موجودہ انتخابی نظام کے غیر اسلامی ہونے اور ان تمام خرابیوں کے باوجود جو سب پر عیاں ہیں جب یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ غیر مسلم ممالک اور معاشرہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور اسلامی نظام حکومت کے قیام کے امکانات روشن نہیں ہیں تو مسلمانوں کا مفاد اسی میں ہے کہ مذہبی آمریت کے بجائے جمہوریت کی تائید کریں اور جمہوری نظام کا سب سے بنیادی عنصر الیکشن اور انتخابی عمل ہے تو مسلمانوں کے لیے انتخابی عمل اور الیکشن سے صرف نظر ممکن نہیں۔ لہٰذا ایسی صورت حال میں الیکشن میں مسلمانوں کا حصہ لینا صرف درست ہی نہیں بلکہ لازم اور ضروری ہے، تا کہ مسلم نمائندہ مسلمانوں کی آواز قانون ساز اداروں تک پہنچا سکے، نیز ان اداروں میں پاس ہونے والے قوانین سے جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہوں مسلمانوں کو آگاہ کر سکے، اس

کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکے اور مذہبی، تعلیمی، سماجی اور معاشی حقوق کے تحفظ کی سعی کر سکے۔ اس تناظر میں انتخابی سیاست کا بائیکاٹ کرنا یا اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا مسلمانوں کو نہ صرف دیگر شہریوں سے الگ کرے گا بلکہ اکثریت کے ذہنوں میں شکوک و شبہات اور عدم اعتماد کی فضا پیدا کرے گا جو کہ باہمی خیر سگالی اور آپسی بھائی چارہ کے جذبہ کو پروان چڑھانے میں مضر اور نقصان دہ ہے۔

ملک کے آئین اور اس کی اقدار و علامات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ شہریوں کو تحفظ اور حقوق حاصل ہوتے ہیں، انتخاب میں شرکت کرنا اور حصہ لینا یہ شہریوں کا بنیادی حق ہوتا ہے لہٰذا اگر مسلمان الیکشن سے کنارہ کشی اختیار کرلیں تو وہ نہ اپنے حقوق کی جنگ لڑ سکتے ہیں اور نہ برادران وطن کے دلوں میں اپنے حقوق کے تئیں ہمدردی اور تعاون کے جذبات پیدا کر سکتے ہیں۔ اقلیتوں کو اپنے حقوق اور تحفظ کی جنگ برادرانِ وطن کے تعاون کے ساتھ لڑنی پڑتی ہے اور زندہ اقلیتیں ہمیشہ برادران وطن کے صاف عناصر کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب رہتی ہیں، ضروری ہے کہ ان کے ذہنوں میں کسی قسم کے شکوک وشبہات پیدا نہ ہونے پائیں اور انھیں مسلمانوں کی حب الوطنی پر شک نہ ہو اس لیے لازماً مسلمانوں کو غیر مسلم اکثریت والے ممالک میں انتخابی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے اور اس میں ایک سرگرم کردار ادا کرنا چاہیے، کیوں کہ اس میں نہ صرف ملک کا مفاد ہے بلکہ مسلمانوں کے ملی مفادات کے تحفظ کا راز بھی پنہاں ہے۔

الیکشن میں امیدوار بننا

الیکشن میں امیدوار بننا، عوام سے ووٹ کی بھیک مانگنا، ووٹ حاصل کرنے کے لیے جھوٹے اور غلط وعدے کرنا، اپنے کو اس عہدے کے لائق اور دوسرے کو نالائق بتانا اور بے بنیاد دلائل دینا، اپنی پارٹی کی خوبیوں کو ذکر کرنا اور دوسری پارٹیوں کے نقص اور عیب کو بتانا، اسلامی نقطۂ نظر سے ایک ناروا غیر شریفانہ حرکت ہے اور اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ کیوں کہ ایک مسلمان کا کردار یہ ہے کہ وہ جھوٹ، کذب، دروغ گوئی،

وعدہ خلافی، عیب جوئی اور الزام تراشی کو عہدہ حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنائے اور مسلمانوں کا یہ بھی شیوہ نہیں ہے کہ وہ محض دنیا کی خاطر کسی عہدہ اور منصب کی لالچ میں مبتلا ہو۔ قرآن کریم اور احادیث رسول میں حب جاہ اور حب مال سے منع کیا گیا ہے اور عام حالات میں عہدہ طلب کرنے اور ایسے لوگوں کو عہدہ سپرد کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے:

"عن ابی موسی قال دخلت علی النبی ﷺ انا و رجلان من قومی فقال احد الرجلین امرنا یا رسول اللہ وقال الآخر مثلہ فقال انا لانولی ھٰذا الامر من سالہ ولامن حرص علیہ"۔[1]

(میں اور میرے دو چچازاد بھائی اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو ان دونوں میں سے ایک نے اللہ کے رسول ﷺ سے کہا کہ آپ مجھے بعض اس حصہ پر حاکم بنا دیجیے جس پر اللہ نے آپ کو حاکم بنایا ہے، دوسرے نے بھی کچھ اس طرح کی درخواست کی تو اللہ کے رسول نے فرمایا کہ بخدا ہم کسی ایسے شخص کو حاکم نہیں بناتے جو عہدہ کا مطالبہ کرے یا اس کا حریص ہو۔)

دوسری روایت میں ہے:

"عن عبدالرحمن بن سمرۃ قال: قال لی رسول اللہ ﷺ لاتسأل الامارۃ فانک ان اعطیتھا عن مسئلۃ وکلت الیھا وان أعطیتھا عن غیر مسئلۃ اعنت علیھا"۔[2]

(حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ عہدہ کا سوال مت کیا کرو، کیوں کہ اگر عہدہ تجھے طلب پر ملا ہے تو (خدا کی مدد اٹھ جائے گی) وہ تیرے حوالہ کر دیا جائے گا (کہ تو جانے اور تیرا کام) اور اگر بغیر طلب کے ملا ہے تو اللہ کی مدد

تیرے شریک حال رہے گی۔)

جیسا کہ ماقبل میں گذرا کہ دنیا کے بیش تر غیر مسلم ممالک کا نظام حکومت جمہوری طرز پر قائم ہے جہاں ملک کے مستقبل کا فیصلہ اکثریت کی رائے پر منحصر ہے، اور اس کو پرکھنے کا معیار ووٹ اور الیکشن کی سیاست ہے۔ ایسی صورت حال میں مسلمانوں کے لیے اپنے آپ کو امیدوار کی حیثیت سے پیش کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تو ان خصوصی حالات کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے الیکشن میں حصہ لینا اور امیدوار بننا درست ہوگا، تاہم امیدوار بننے کے لیے اس بات کا خیال رکھا جانا ضروری ہے کہ وہ شخص جو امیدوار بننے کا دعویٰ کر رہا ہے وہ اس عہدہ کا اہل ہو اور دوسرے یہ کہ وہ امین اور دیانت دار ہو اور اس کا مقصد جاہ و جلال کی حصولیابی نہ ہو بلکہ وہ اس عہدہ پر فائز ہو کر خلق خدا کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو اس صورت میں مسلمانوں کے لیے الیکشن میں امیدواری کا دعویٰ کرنا اور امیدوار بننا صحیح ہوگا۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے درخواست کی تھی کہ انھیں خزانہ کا نگراں مقرر کر دیا جائے: "اجعلنی علی خزائن الارض"۔

حضرت یوسف علیہ السلام اس عہدہ کے اہل بھی تھے کیوں کہ اللہ نے انھیں بے شمار خصوصیات سے سرفراز فرمایا تھا اور وہ امین بھی تھے کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے انہیں گناہ کی دعوت دی تو انھوں نے انکار کر دیا اور ارشاد فرمایا:

"قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ إِنَّهُ رَبِّیْ أَحْسَنَ مَثْوَایَ"۔ (یوسف:۲۳)

(کہا اللہ کی پناہ، وہ عزیز تو میرا رب یعنی پرورش کرنے والا ہے، اس نے مجھے اچھی طرح رکھا۔)

حق رائے دہی کا مناسب استعمال

انتخابات میں کھڑا ہونے والا ممبر اگر واقعتاً اس عہدے کے لائق، امین اور متدین ہے اور مسلمانوں کے مسائل سے واقفیت رکھتا ہے، نیز اس کے اندر ملی مفادات کے تحفظ کا جذبہ ہے تو ایسے شخص کو ووٹ دیا جا سکتا ہے اور چونکہ اس سے مذہبی، ملی، سماجی

اور معاشی حقوق وابستہ ہیں اس لیے بغیر ترغیب اور دعوت کے از خود جا کر اس کے حق میں ووٹ دینا لازم ہے اور یہ شریعت مطہرہ کے نزدیک پسندیدہ اور مرغوب فعل ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

"ألا اخبركم بخير الشهداء الذى يأتى بشهادته قبل أن يسألها"۔[۳]

(کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ بہترین گواہ کون ہے؟ وہ شخص جو اپنی گواہی طلب کرنے سے پہلے ہی ادا کر دے۔)

ووٹ دینا بھی اس بات کی شہادت ہے کہ امیدوار اس عہدہ کے لیے موزوں اور مناسب ہے، لہٰذا اگر کسی امیدوار کے اندر اہلیت پائی جائے تو اس کا انتخاب کرنا اور اس کے حق میں ووٹ ڈالنا ایک پسندیدہ عمل ہے، بلکہ لازم ہے۔

ووٹ کی شرعی حیثیت

جب انتخابات سے مسلمانوں کے ملی اور مذہبی مفادات وابستہ ہیں تو ایسی صورت حال میں جس طرح نااہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا ناجائز ہے اور گناہ کا باعث ہے، اسی طرح کسی اچھے، قابل اور ایسے شخص جس کے سینہ میں مسلمانوں کی ہمدردی اور غم خواری ہو، وہ ان کے ملی، مذہبی اور معاشی حقوق کے تحفظ کا قصد رکھتا ہو ان کو ووٹ دینا ایک دینی فریضہ ہے، قرآن کریم نے جس طرح جھوٹی شہادت کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے اسی طرح سچی شہادت کو واجب اور ضروری قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں:

"كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَاء بِالْقِسْطِ"۔ (المائدہ:۸)

(تم اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے ہو جاؤ۔)

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ"۔ (الطلاق:۲)

(تم اللہ کے لیے شہادت کو قائم کرو۔)

مسلم سیاسی جماعت کا قیام

جمہوری ممالک میں اقتدار کی حصولیابی کے لیے مختلف سیاسی پارٹیاں سرگرم عمل رہتی ہیں اور اپنے مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے طرح طرح کے سیاسی ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں، کچھ سیاسی پارٹیاں تو سیکولر کردار کو اپنا شعار بناتی ہیں اور کچھ جماعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اقتدار تک پہنچنے کے لیے مذہب، علاقائیت، نسل اور زبان کو بنیاد بناتی ہیں، کچھ پارٹیاں کھلم کھلا مسلم دشمنی کے ذریعہ تخت نشیں ہونا چاہتی ہیں اور کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جو ظاہراً مسلم دوستی اور ہمدردی کا دم بھرتی ہیں اب ایسی صورت حال میں مسلمانوں کے لیے ایک سیاسی مسئلہ ہے کہ وہ الگ کوئی جماعت قائم کریں یا پھر ان پارٹیوں میں شمولیت اختیار کریں جن کے مزاج میں مسلم دشمنی کا عنصر شامل نہیں ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ سیاسی قوت پیدا کیے بغیر مسلمانوں کی حالت میں سدھار نہیں ہوسکتا لیکن اس سیاسی قوت کو حاصل کرنے کے لیے کسی مسلم جماعت کا قیام جب کہ وہ اس ملک میں اقلیت کی حیثیت سے رہتے ہوں نہ صرف آپسی منافرت کو بڑھاوا دے گا بلکہ مسلمانوں اور دیگر اقوام جو کہ اکثریت میں ہیں ان کے درمیان خلیج اور وسیع ہوجائے گی۔ جو یقیناً مسلمانوں کی مذہبی آزادی اور ملی مفادات کے خلاف ہوگی، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ تکثیری معاشرہ میں حالات کا جائزہ لیا جائے اور ملک کی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی احوال کا تجزیہ کرنے کے بعد ایک ٹھوس نتیجہ پر پہنچا جائے کہ آیا مسلم جماعت کا قیام مفید ہے یا مضر؟ اس سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاذ پروفیسر سعود عالم قاسمی کے خیالات سے استفادہ کیا جانا چاہیے جو انھوں نے اپنے ایک مقالہ میں پیش کیا ہے۔ ان کا یہ مقالہ ہندوستانی سیاست کے پس منظر میں ہے، وہ کہتے ہیں:

> ’’ہندوستانی مسلمانوں کے لیے زیادہ اچھی بات یہ ہوگی کہ وہ تابع داری کی سیاست چھوڑ کر ساجھے داری کی سیاست اختیار کریں، یعنی جس

ریاست میں وہ قابل لحاظ تعداد میں ہوں وہاں اپنی سیاسی جماعت بنائیں جو ان کے اصولوں کے مطابق سیکولر امیج رکھنے والی سیاسی جماعتیں ہیں ان سے انتخابی معاہدہ کریں اور مشترکہ اہداف کے لیے کام کریں۔ اسی طرح اسمبلی اور پارلیمنٹ میں اپنے نمائندوں کو بھیجیں جو ان کے ملی حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کریں اور ان کے مسائل کو معقول اور مدلل انداز سے ایوان اقتدار کے سامنے رکھ سکیں''۔[۲]

یہ مقالہ ہندوستانی تناظر میں لکھا گیا ہے تاہم اس کو تمام غیر مسلم ممالک میں قیام پذیر مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے لیے ایک کلید اور نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ اصل چیز ملی مفادات کا تحفظ ہے، پھر حالات کا تجزیہ اور اپنی تعداد پر نظر کہ کسی مخصوص علاقہ اور ریاست میں وہ امیدواروں کی کامیابی میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں تو وہاں اپنی جماعت بنائیں اور اپنی سیاسی قوت کو استحکام فراہم کریں۔

ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس مسلم جماعت کے قیام پر دلائل پیش کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''کیا مسلمانوں کا رول اس ملک میں صرف اتنا ہی ہے کہ وہ اپنے حقوق کا تحفظ کریں؟ اسلام نے انھیں جو مقام اور منصب دیا ہے، کیا یہ بات اس سے فروتر نہیں ہے؟ کیا مسلمانوں کو ملک کے تمام انسانوں کو انصاف دلانے، محروم ومظلوم طبقات کے حقوق کا تحفظ کرنے اور ملک کی پالیسیوں کو منصفانہ اور عادلانہ بنانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے؟ کیا انھیں صرف مسلم معاشرے کی قیادت کرنی چاہیے اور ملک کے عام انسانوں بالخصوص محروم ومظلوم طبقات کی قیادت اور رہنمائی ان کا فریضہ نہیں ہے؟ یقیناً مسلمانوں کا جو مقام ومنصب ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ انھیں تمام انسانوں کو انصاف دلانے، مظلوم ومحروم طبقات کو ظلم وناانصافی سے نجات دلانے، ملک میں امن وامان قائم کرنے کے

وسیع تر ایجنڈے کو بنیاد بنا کر سیاسی میدان میں آنا چاہیے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ان کی قائم کردہ پارٹی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ملک کے تمام انسانوں کی خیر و فلاح کے لیے کام کرے۔ لہٰذا ایک ایسی سیاسی پارٹی کی ضرورت ہے، جس کی قیادت تو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، لیکن وہ بلا تفریق مذہب وملت سب کی بھلائی کے لیے کام کرے''۔[۵]

ان کے نزدیک مسلم سیاسی جماعت کا قیام نہ صرف مسلمانوں کے حق میں ہے بلکہ اس سے دیگر اقوام کا بھی مفاد وابستہ ہے کیوں کہ اس مسلم جماعت کے قیام کی بنیاد عدل و انصاف اور امن و امان کو ملک میں قائم کرنا ہے اور مظلوم اور سماج کے دبے کچلے لوگوں کو انصاف دلانا ہے۔ راقم کا نظریہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ مسلم جماعت قائم کرنے کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ فرقہ پرست اور مسلم دشمن جماعت کو چھوڑ کر ہر سیاسی جماعت میں مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد کی شمولیت ہو اور وہ لوگ اس پارٹی میں ایک مؤثر کردار ادا کریں اور اس کی پالیسیوں پر نہ صرف گہری نظر رکھیں بلکہ پالیسی ساز بننے کی کوشش کریں، ان کے ذہنوں میں ہمیشہ ملی مفاد مقدم رہے اور اگر کہیں اس جماعت کی پالیسی اور مسلمانوں کے ملی مفادات کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت آئے تو ذاتی اغراض و مفاد سے بالاتر ہو کر صدائے احتجاج بلند کریں اور اگر ضرورت پڑے تو اس سیاسی جماعت سے علیٰحدگی اختیار کرلیں، کیوں کہ اصل مقصد مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہے نہ کہ کسی خاص عہدہ کی حصولیابی، اگر مذکورہ تجویز کے مطابق ہر سیاسی جماعت میں مسلمان شامل ہوتے ہیں اور سرگرم رول ادا کرتے ہیں تو کسی بھی سیاسی جماعت کے اندر اتنی جرأت و ہمت پیدا نہیں ہوگی کہ مسلمانوں کے حقوق کو پامال کرنے کی کوشش کرے یا مسلم دشمنی پر مبنی کوئی قانون بنانے کا ارادہ بھی کرے۔

اسلام مخالف پارٹی میں مسلمانوں کی شمولیت اور ووٹ

اگر بعض ایسی سیاسی پارٹیاں الیکشن میں حصہ لیتی ہوں جنھوں نے اعلانیہ اسلام

اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنالیا ہو لیکن ان کے بعض امیدوار ذاتی اعتبار سے نیک خصلت ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ مناسب اور درست ہو تو مسلمانوں کے لیے ان کے جماعتی آئین وقوانین سے قطع نظر اشخاص وافراد کے ذاتی حالات کی بنا پر انھیں ووٹ دینا ناجائز اور حرام ہے اور اس طرح کی فسطائی اور فاشزم پارٹیوں میں مسلمانوں کی شمولیت قطعاً درست اور جائز نہیں ہے، اس لیے کہ مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ اور متاع مذہب اسلام اور اس کے قوانین واحکام ہیں، اس لیے اسلام مخالف پارٹیوں میں کسی بھی طرح کی شمولیت اور ان کو ووٹ دینا درست نہیں۔[۶]

غیر مسلم سیاسی جماعتوں سے معاہدہ اور انتخابی تال میل

تکثیری معاشرہ میں جہاں مختلف مذاہب اور رنگ ونسل کے لوگ رہتے ہوں اور مسلمان اقلیت میں ہوں تو معاشرہ میں امن وامان کو قائم کرنے اور اپنے مذہبی قوانین و احکام کو آزادی کے ساتھ بجالانے کی غرض سے غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ کی اہمیت ہر دور میں مسلّم رہی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات ہر دور کے مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل ہیں چنانچہ آپؐ جب مکہ سے مدینہ ہجرت کرکے آئے تو آپؐ نے ایسے دو امور انجام دیے جو مسلمانوں کی قومی زندگی کے لیے انتہائی دوررس اثرات کے حامل تھے۔ اول تو یہ کہ مسلمانوں کے دونوں گروہ یعنی انصار اور مہاجرین کے درمیان اخوت اور اٹوٹ اتحاد پیدا کرنے کے لیے مواخات کرائی یہ اسلام کے داخلی استحکام کا ذریعہ تھا اور دوسرے مدینہ کے بااثر غیر مسلم قبائل بالخصوص یہود سے انسانی، سماجی اور دفاعی اصولوں کی بنیاد پر معاہدے کیے جو اسلام کے لیے خارجی استحکام کا فارمولہ تھا۔ یہ میثاق مدینہ کے نام سے مشہور تھا، اس معاہدہ کی بنیادی شق یہ تھی:

> ''یہودیوں کو اپنے دین پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی اور مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی، وہ اپنی جانوں اور اپنے غلاموں کے مالک رہیں گے، مگر یہ کہ جو حد سے تجاوز کرے یا گناہ

کرے، تو اس کا مواخذہ اس سے اور اس کے گھر والوں سے ہوگا۔'' [۲]

اسی طرح مشرکین مکہ سے بھی آپؐ نے معاہدہ فرمایا تھا جس کا تفصیلی ذکر سورۃ التوبہ میں ہے:

''إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ''۔ (التوبہ:۴)

(مگر وہ مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کیا پھر انھوں نے تمہارے عہد میں کچھ کمی نہ کی اور تمہارے مقابل کسی کو مدد نہ دی تو ان کا عہد ٹھہری ہوئی مدت تک پورا کرو۔)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

''فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ''۔ (التوبہ:۷)

(تو جب تک وہ تمہارے لیے عہد پر قائم رہیں تم ان کے لیے قائم رہو۔)

یہود مدینہ اور مشرکین مکہ سے معاہدہ کیا جانا اس بات کی علامت ہے کہ بوقت ضرورت دیگر قوموں کے ساتھ معاہدہ کرنے میں امن و سلامتی کا راز مضمر ہے۔ عصر حاضر میں معاہدہ کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہی چیز قومی و بین الاقوامی سطح پر بقائے باہم کا ذریعہ بنتی ہے اور اسی کے ذریعہ شہریوں کے حقوق کے تحفظ میں آسانیاں فراہم ہوتی ہیں۔ مذکورہ اسوۂ نبویؐ سے ہمیں اس بات کی روشنی ملتی ہے کہ ہم انتخابات کے موقع پر غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے ساتھ ملی مفادات کے تحت تال میل، معاہدے، ان میں شرکت اور ان کی حمایت حالات کا تجزیہ کر کے مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے کر سکتے ہیں، تاہم اس انتخابی تال میل میں اس بات کا خیال رکھا جانا ضروری ہے کہ حالات اور مصالح جس کے متقاضی ہوں اس اعتبار سے معاہدے اور حمایت کا فیصلہ اس وقت کے مخلص، خیر خواہ مسلم قائدین کی صواب دید پر چھوڑ دیا جائے کہ اگر وہ ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ کسی خاص غیر مسلم جماعت سے تال میل کرنے میں مسلمانوں کے حقوق اور ملی مفادات کا تحفظ ممکن ہے تو اجتماعی طور پر اس کی حمایت کا فیصلہ کیا جائے

تاکہ اس پارٹی پر مسلمانوں کا ایک دباؤ بنا رہے، کسی پارٹی کی حمایت کا فیصلہ انفرادی طور پر کرنا اور ٹکڑوں میں تقسیم ہونا اجتماعیت کے شیرازہ کو منتشر کرنے کے مترادف ہے اس سے اجتناب ضروری ہے کیوں کہ یہ ایک غیر دانش مندانہ فعل ہے۔ انتخابی تال میل کے لیے ان باتوں کے علاوہ مندرجہ ذیل امور کا بھی لحاظ کیا جانا ضروری ہے۔

۱- بڑے شر سے بچنے کے لیے چھوٹے شر کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔[۸]

۲- غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے ساتھ شرکت پر یہ امید اور توقع ہو کہ قانون ساز اداروں اور حکومت میں شریک ہو کر وہ مسلمانوں کے مذہبی اور قومی مفادات کو حاصل کرنے اور نقصانات سے بچانے میں کوئی اہم رول ادا کر سکیں گے۔

۳- باہمی تعاون اور اشتراک عمل سے اگر ایک اعتبار سے چند فوائد اور مصالح حاصل ہونے کی امید ہو اور دوسرے اعتبار سے مسلمانوں کے ملی اور مذہبی امور کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو پھر "درء المفاسد اولی من جلب المصالح"[۹] کے اصول کی روشنی میں انتخابی تال میل اور اشتراک جائز نہیں، کیوں کہ اصل چیز مسلمانوں کا اجتماعی ملی مفاد ہے، اگر وہ اشتراک اور غیروں کے ساتھ تال میل کرنے سے حاصل ہو تو غیر مسلم سیاسی جماعت کے ساتھ تال میل درست ہوگا ورنہ نہیں۔

سیاست میں مسلمانوں کی شرکت اور فقہ اکیڈمی نئی دہلی کے فیصلے

اسلامک فقہ اکیڈمی نئی دہلی[۱۰] کے چودھویں اجلاس منعقدہ ۲۰-۲۲ جون ۲۰۰۴ء بہ مقام حیدر آباد میں ہندوستان کے علماء وفقہاء نے تکثیری معاشرہ میں رہنے والے مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کرتے ہوئے متعدد فیصلے کیے جو سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فیصلے مندرجہ ذیل ہیں:

۱- اسلام کا اپنا ایک مستقل نظام حکمرانی ہے، لیکن موجودہ عالمی حالات میں دوسرے غیر اسلامی نظام ہائے حکومت کے مقابلہ میں مروج جمہوری نظام ہی مسلم اقلیتوں کے لیے قابل ترجیح ہے، لہٰذا اس نظام کے تحت مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا، امیدوار

بننا، ووٹ دینا اور کسی امیدوار کے لیے انتخابی مہم چلانا جائز ہے۔

۲- مسلمانوں کے ملی و مذہبی مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ووٹ دینے کا قانونی حق بھرپور طریقے سے استعمال کریں۔

۳- جن سیاسی جماعتوں نے اعلانیہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی جماعت کا مقصد بنالیا ہو، ان میں مسلمانوں کی شمولیت جائز نہیں اور ان کے کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی جائز نہیں ہے، خواہ وہ ذاتی طور پر نیک خصلت ہو۔

۴- جمہوری سیکولر سیاسی پارٹیوں سے ملی مفادات کے تحت معاہدے کیے جاسکتے ہیں۔[11]

ہندوستانی سیاست اور مسلمان

ہندوستان کی شناخت کبھی مسلم ملک کی حیثیت سے ہوتی تھی، مگر آج یہ ایک جمہوری ملک ہے جس کی اکثریت غیر مسلموں پر مشتمل ہے اور نظام حکومت سیکولرازم، نیشنل ازم اور ڈیموکریسی کا پابند ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت کی تعریف کردی جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ جمہوریت کے عناصر کیا ہیں اور ہندوستان بہ حیثیت ایک جمہوری ملک کس حد تک کامیاب ہے؟

جمہوریت کی تعریف

دانش وروں نے جمہوریت کی مختلف تعریف کی ہے، چنانچہ سیلی کے نزدیک جمہوریت اس حکومت کو کہتے ہیں جس میں ہر شخص حصہ لے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر ابراہیم لنکن نے اس کی جامع اور مکمل تعریف کی ہے کہ ”جمہوریت عوام یا جمہور کی وہ حکومت ہے جو جمہور کے فائدے کے لیے جمہور ہی کے ذریعے چلائی جاتی ہو“۔[12]

جمہوریت کی بقا کے لیے تین اداروں کا ہونا بہت ضروری ہے:

۱- مقننہ، یعنی قانون بنانے والے ادارے۔

۲- انتظامیہ۔

۳- عدلیہ۔[۱۳]

ان تینوں اداروں کی ذمہ داریاں الگ الگ ہیں۔ مقنّنہ کا کام قانون بنانا ہوتا ہے، انتظامیہ کے ذریعہ قوانین کا نفاذ عمل میں آتا ہے اور عدلیہ کی ذمہ داری جواب دہی طے کرنا اور قانون شکنی پر سزا تجویز کرنا ہوتا ہے اور مقنّنہ کے ذریعہ بنائے گئے قانون پر عمل آوری اور تحفظ کا ذمہ عدلیہ پر ہی ہے۔

بنیادی طور پر جمہوریت کے یہی تین ستون ہیں، لیکن میڈیا کو چوتھا ستون قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ اس کے ذریعے سماج کی صحیح منظر کشی حکومت کے سامنے ہوتی ہے اور ظلم و استحصال اور بدعنوانیوں کی طرف حکومت اور انتظامیہ کو متوجہ کرنا میڈیا کا بنیادی اور اخلاقی پیشہ ہے، بسا اوقات میڈیا کی بیداری عدم مساوات اور ظلم وزیادتی کا قلعہ قمع کرتی ہے اور مستحقین کو ان کا حق دلاتی ہے۔

ہندوستان میں جمہوریت کی عملی شکل

نیشنل ازم اور سیکولرازم کسی بھی ملک کی جمہوریت کی روح ہوتے ہیں، ان دونوں میں کوئی ایک بھی اگر کمزور ہوجائے تو جمہوریت کا ڈھانچہ مجروح ہوجاتا ہے۔ ہندوستان میں اس کی بنیاد ابتدا میں ہی کمزور ہوگئی تھی ، آزادی کی لڑائی میں نیشنل ازم کی بنیاد تو مضبوط تھی، لیکن کہا جاتا ہے کہ آزادی کے بعد محمد علی جناح کے نعروں نے اسے متزلزل کردیا، کیوں کہ سیکولرازم کی جگہ کمیونل ازم نے لے لی جس کے نتیجہ میں یہ ملک دوٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔ (یہاں یہ واضح رہے کہ اس بات کی تہہ میں جانا ضروری ہے کہ کیا واقعی محمد علی جناح تقسیم ہند کے ذمہ دار تھے یا پھر اس کے پس پردہ دیگر اسباب وعوامل کارفرما تھے، جیسا کہ جسونت سنگھ نے اپنی کتاب میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے اور تقسیم کے لیے نہرو کو زیادہ ذمہ دار قرار دیا ہے۔[۱۴]) اور شاید یہی کڑوا اور کسیلا سچ ہے۔ بہر حال ہندوستان میں سیکولرزم کو اپنایا گیا جس کے نتیجے میں تمام تر خامیوں کے باوجود جمہوریت برقرار ہے۔

مسلمانوں کی سیاسی حکمت عملی

جمہوری ہندوستان میں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہیں تاہم ہندوستانی مسلمان اپنے مذہبی امور کی انجام دہی میں آزاد ہیں۔ نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور قربانی کی ان کو اجازت ہے، تبلیغ اور اشاعت دین کی بھی ان کو آزادی حاصل ہے، وہ اپنے مدارس اور مساجد بھی قائم کر سکتے ہیں، تعلیم اور رفاہی ادارے بھی کھول سکتے ہیں۔ غیر سودی لین دین پر مبنی مالیاتی نظام بھی قائم کر سکتے ہیں۔ مسلم پرسنل لا یعنی عائلی قوانین پر عمل کر سکتے ہیں۔ اپنے مقدمات کے تصفیہ کے لیے دارالقضا بھی قائم کر سکتے ہیں اور سیاسی قوت حاصل کرنے کے لیے انتخابی سیاست میں بھی شرکت کر سکتے ہیں۔

اب اہم سوال یہ ہے کہ ہندوستانی آئین نے مسلمانوں کو سیاسی حقوق بھی عطا کیے ہیں اور انھیں نہ صرف اپنے نمائندے چننے کا حق دیا ہے بلکہ انھیں خود انتخاب لڑنے کا اختیار بھی دیا ہے، ایسی صورت حال میں مسلمانوں کی کیا سیاسی حکمت عملی ہونی چاہیے کہ وہ سیاسی طور پر ایک مضبوط قوت بن کر ابھریں۔

یہ عجیب المیہ ہے کہ جب بھی انتخابات کی آمد ہوتی ہے، مسلم قوم بغیر کسی سیاسی منصوبہ بندی کے انتخابی میدان میں کود پڑتی ہے، حالاں کہ مسلمان جس مذہب کے پیروکار ہیں وہ ایک انقلابی مذہب ہے جس نے لوگوں کی زندگیوں، سماجی فکر اور کائنات کے تعلق سے ان کے نکتۂ نظر میں جو تبدیلی پیدا کی ہے اس کے دوررس اثرات سے آج بھی دنیا کی باطل پرست قوتیں خوف زدہ ہیں اس لیے مسلمانوں کو اپنے مذہب کی شاندار تاریخ اور اس کے تقدس کا لحاظ کرتے ہوئے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر کوئی ایسی حکمت عملی بنانی ہوگی جس سے ملی اور قومی مفادات وابستہ ہوں۔

مسلمانوں کی سیاسی حکمت عملی پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر خاور ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''ہمیں سب سے پہلے یہ سمجھنا ہے کہ انتخابات کے تناظر میں پارٹیوں کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے اس لیے کہ جو پارٹی اکثریت حاصل

کرتی ہے اسی کے زیر اثر سیاسی اور معاشی نظام ہی نہیں بلکہ فکر و عمل کے تمام گوشے آجاتے ہیں۔ انفرادی طور پر بہت سے لوگ الیکشن کے میدان میں اترتے ہیں جنھیں آزاد امیدوار کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ علاقائی پارٹیاں بھی مسلمانوں کے ووٹوں کی طلب گار ہوتی ہیں اور اپنی پارٹی کے امیدوار میدان میں اتارتی ہیں۔ لیکن ایسے لوگ اور پارٹیاں مسلم ووٹوں کا سودا کسی بڑی پارٹی سے کرلیتی ہیں اور مسلمانوں کا اعتماد دوسروں کے ہاتھوں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے مسلمانوں کو ایسی حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی جس سے کوئی بھی امیدوار یا پارٹی ان کے اعتماد کو دوسرے کے ہاتھوں فروخت نہ کر سکے"۔ [۱۵]

ان کی تحریر کا حاصل یہ ہے کہ کسی بھی سیاسی جماعت کو مسلمانوں کے اعتماد اور ووٹ سے کھیلنے کا موقع ہرگز نہ دیا جانا چاہیے بلکہ ایک منظّم منصوبہ بندی ہونی چاہیے۔

مسلمانوں کا دوسرا المیہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے حقوق کے لیے وہ ٹھوس اور بامعنی جدو جہد نہیں کی جو ان کا آئینی حق تھا۔ مسلمانوں کی صفوں میں ذات پات اور مسلک کے نام پر جو انتشار پھیلا، اس نے مسلمانوں کی جمہوری حیثیت کو اور ان کی آواز کو کمزور اور بے اثر بنا دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی پارٹیاں بدترین سماجی اور اقتصادی صورت حال سے دوچار مسلمانوں کے مسائل کے تدارک میں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں لے رہی ہیں اور مسلمان اپنے ووٹوں کی طاقت کے باوجود بے دست و پا ہیں۔

ایسی نازک صورت حال میں مسلمانوں کی حکمت عملی یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنی صفوں سے اختلاف اور انتشار کو فراموش کر کے کلمہ کی بنیاد پر متحد و متفق ہو جائیں تاکہ ان کی بازگشت سیاسی گلیاروں میں ایک وزن اور اہمیت پیدا کر سکے۔

اسی اتحاد و اتفاق کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا اسرار الحق قاسمی لکھتے ہیں:

"سیاسی طور پر اس وقت کہا گیا کہ من موہن سنگھ کو اس لیے وزیر اعظم بنایا

گیا تا کہ گولڈن ٹیمپل کی تلافی کی جاسکے اور سکھ فرقہ کی ناراضگی دور کی جاسکے، لیکن ایسا اشارہ کبھی نہیں دیا گیا جس سے یہ ظاہر ہو کہ بابری مسجد کی تلافی کرنے اور مسلمانوں کو قریب لانے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی جارہی ہے۔ دو فیصد کی ناراضگی کا اتنا خیال مگر ۲۰ فیصد کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں۔ ایسا محض اس لیے ہوا کہ ۲۰ فیصد وہ اتحاد واتفاق نہ پیدا کرسکے جو دو فیصد سکھوں میں پایا جاتا ہے۔ اگر بابری مسجد کی شہادت کے وقت تمام مسلم ممبران پارلیامنٹ اور ان کے قائدین ہر قسم کی سیاسی وابستگی سے اوپر اٹھ کر حکومت کے خلاف متحد ہو جاتے تو آج یہ صورت حال نہ ہوتی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمیں حادثات بھی متحد کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ غرضیکہ اتحاد و اتفاق کے سلسلے میں حکمت عملی ضروری ہے"۔[١٦]

حواشی ومراجع

١. الصحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب مایکرہ من الحرص علی الامارۃ

٢. الصحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب من سأل الإمارۃ وکل إلیھا

٣. الصحیح المسلم، کتاب الاقضیۃ، باب بیان خیر الشھود

٤. پروفیسر سعود عالم قاسمی، موجودہ سیاست میں مسلمانوں کی شرکت اور شرعی حدود، مقالہ: سیمینار منعقدہ ۲۵؍اپریل، ۲۰۱۰ء، بنگلور، ص ۵

٥. ڈاکٹر قاسم رسول الیاس، مسلمانوں کے لیے سیاسی پارٹی کا جواز، راشٹریہ سہارا (اردو) نئی دہلی، ۲۷؍فروری ۲۰۰۹ء، ص ۷

٦. تفصیل کے لیے دیکھیے: مقالہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مجلہ بحث ونظر، شمارہ ۵۱، پھلواری شریف پٹنہ

٧. ابو محمد عبدالملک ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ج ۲، ص ۱۲۱

۸ ابن نجیم، الاشباہ والنظائر، ص ۱۴۵

۹ ایضاً، ص ۱۴۷

۱۰ مسلمانوں کو درپیش مسائل کی تحقیق اور شرعی رہنمائی کے لیے قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے ۱۹۸۹ء میں اسلامک فقہ اکیڈمی کی بنیاد رکھی جس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پورے خطے میں ایک نئی علمی امنگ، ذوق تحقیق، اعتدال فکر اور فقہی تحریک کو وجود بخشا۔ (اکیڈمی کے تفصیلی تعارف کے لیے ملاحظہ کریں: اکیڈمی کا کارواں-منزل بہ منزل، از: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)

۱۱ نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص ۱۰۸

۱۲ مبادی سیاسیات، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء، ص ۱۷۴-۱۷۵

۱۳ ایضاً، ص ۲۰۹

۱۴ تفصیل کے لیے دیکھیے: جسونت سنگھ، اتحاد سے تقسیم تک (اردو ترجمہ فرحت احساس)، روپا اینڈ کو، ۲۰۰۹ء

۱۵ ڈاکٹر خاور ہاشمی، عام انتخابات اور مسلمان، روزنامہ جدید خبر اردو، نئی دہلی، ۱۱/ اپریل، ۲۰۰۹ء، ص ۳

۱۶ مولانا اسرارالحق قاسمی، اب آپ بھی احتساب کریں تو بات بنے، راشٹریہ سہارا (اردو) نئی دہلی، ۳/ مارچ، ۲۰۰۹ء، ص ۵

☆☆☆

اسلام میں خواتین کے سیاسی حقوق

محمد ناصر قاسمی*

قدیم اہل عرب جن اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھے ان میں ایک یہ بھی تھی کہ لڑکی کی پیدائش کو نا مبارک اور منحوس سمجھتے اس خبر کو جب کوئی والد سنتا تو غصہ سے سرخ ہو جاتا، پیشانی پر بل پڑ جاتے اس قدر ذلت محسوس کرتا کہ قوم سے منھ چھپائے پھرتا، طرح طرح کے وساوس وخیالات میں مبتلا رہتا کہ کیا کروں زندہ چھوڑ دوں یا دفن کر دوں، زندہ چھوڑوں تو عضو معطل اور بے کار ہے، نہ وارث بنے، نہ میدان جنگ میں کام آئے، نہ ہی بڑھاپے کا سہارا بنے، اور اگر حیات بخشتا بھی تھا تو اس ذلت کے ساتھ کہ اون یا بالوں کا کپڑا پہنا کر جانوروں کے چرانے کی خدمت پر لگا دیتا جیسا کہ صاحب مظہری نے بیان کیا ہے إذا ولدت له بنت وأراد أن يستحيها البسها جبة من صوف أو شعر ترعىٰ له الإبل والغنم في البادية[1]، ان جیسی وجوہات واسباب کی بنیاد پر جنگل میں گڑھا کھودتے اور دفن کر دیتے[2] گوشت پوست سے بنے دل پتھر سے زیادہ سخت ہو گیے تھے جو معصوم اور ننھی پکار پر بھی نہیں پسیجتے تھے اور اس ظالمانہ اور انسانیت سوز حرکت کے لیے نہ باپ کی شفقت آڑے آتی تھی، نہ خون کا جوش رکاوٹ بنتا تھا۔

شریعت اسلامیہ میں عورت کو گھر کی ملکہ گردانا گیا ہے اور ساری ذمہ داریاں مرد پر ڈالی گئی ہیں، قرآن کریم کی ایک آیت میں جہاں انسان کے حالات اولاد ہونے اور نہ ہونے کے اعتبار سے بیان کیے گیے ہیں وہاں لڑکی کا عطا کیا جانا لڑکوں سے قبل بیان کیا ہے فرمان باری تعالی ہے يهب لمن يشاء إناثا ويهب لمن يشاء الذكور[3] افضل البشر حضور ﷺ کے یہاں بھی سب سے اول لڑکی ہی کی پیدائش ہوئی ہے۔

---

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ دینیات (سنی)، اے-ایم-یو، علی گڑھ

اسلام میں خواتین کے سیاسی حقوق

اسلام میں عورت کا کردار صرف معاشرے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کی اہلیت کی بنیاد پر ملکی وریاستی سطح پر بھی اس کردار کا اعتراف کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں عورت و مرد کی ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا والمؤمنون والمومنات یأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر و یقیمو ن الصلوۃ ویؤتون الزکوٰۃ ویطیعو ن اللہ ورسولہ أولٰئک سیرحمھم اللہ ؎ اس آیت مبارکہ میں خواتین و مردوں کو ایک دوسرے کا اس طرح مددگار ٹھہرایا گیا ہے کہ سماجی و معاشرتی دائرہ میں معروف کے قیام و منکر کے خاتمہ اور سیاسی دائرہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی اطاعت کے ذریعہ ایک مثالی معاشرہ تشکیل دے سکیں۔

اسلام میں خواتین کو اپنی رائے دینے کا حق

مذہب اسلام نے خواتین کو ایک مکمل قانونی فرد تسلیم کیا ہے کسی طرح کی تنصیف یا تخفیف کر کے اس کے تقدس و عظمت کو زک نہیں پہنچائی ہے لہٰذا اسے سربراہ کے انتخاب، قانون سازی اور دیگر سیاسی معاملات میں مردوں کے برابر رائے دہی کا حق دیا ہے چنانچہ ریاست مدینہ کے قیام کے ساتھ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت مبارکہ سے خواتین کو حق رائے دہی کی قانونی بنیاد فراہم فرمائی، اور آپ ﷺ کی اس سنت مبارکہ پر عمل کرتے ہوئے خلفائے راشدین نے اپنے اپنے ادوار میں خواتین کی رائے کو ریاستی سیاسی معاملات میں شامل کر کے صنف نازک کے اس حق کو تقویت دی، جیسا کہ مسور بن مخرمہ کی درج ذیل روایت شاہد ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اپنے بعد جانشین کے انتخاب کے لیے چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی اسوقت حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کو چیف الیکشن کمشنر نامزد کیا آپ نے استصواب عام کے ذریعہ تین دن بلا ناغہ گھر گھر جا کر لوگوں کی رائے معلوم کی جن کے مطابق اکثریت نے ذی النورین حضرت عثمان غنیؓ

کو خلیفہ بنائے جانے کے حق میں فیصلہ دیا، اس انتخاب میں خواتین بھی شامل ہوئیں اور تاریخ میں پہلی بار ایسی مثال قائم ہوئی جس میں دونوں اصناف نے اپنے سربراہ کو چنا⁵ جب کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں ہم سیاسی معاملات میں عورتوں کی شمولیت کا سہرا مغرب کے سر رکھتے ہیں حالانکہ حقیقت وہ ہے جسکا ابھی اوپر ذکر آیا کہ یہ اسلام ہی کی شان ہے کہ آج سے چودہ سو سال قبل عورت کو رائے دینے کا حق دیا گیا تھا۔

اسلام میں خاتون کا تقرر بطور سیاسی مشیر

دور جاہلیت میں صنف نازک کو کسی بھی سیاسی وسماجی کردار کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا، نور نبوت نے خواتین کو سماجی و معاشرتی زندگی میں باوقار مقام عطا کیا اور خود شارع علیہ السلام نے اپنی سنت مبارکہ سے خواتین سے مشاورت کی تعلیم دی ہے چنانچہ آغاز نبوت میں حضرت خدیجہؓ کا کردار اسکی روشن نظیر ہمارے سامنے ہے، دوسری مثال صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہؓ کفار مکہ سے معاہدے کے بعد ظاہری صورت حال کے اعتبار سے مغموم تھے آپ ﷺ نے جب انہیں حکم دیا قوموا فانحروا ثم احلقوا ⁶ کہ کھڑے ہو جاؤ اور قربانی کرو اور بال کٹواؤ۔ تو صحابہ کرام میں سے کوئی بھی کھڑا نہ ہوا اس پر آپ ﷺ اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے اور ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے مشورہ کیا، حضرت ام سلمہؓ نے آپ علیہ السلام کو مشورہ دیتے ہوئے فرمایا: یا نبی اللہ أتحب ذلک أخرج إلیهم ثم لا تکلم أحدا منهم کلمة حتی تنحر بدنک، وتدعو حالقک فیحلقک فخرج ،فلم یکلم أحد منهم فعل ذلک نحر بدنه و دعا حلقه فحلقه ، فلما رأوا ذٰلک قاموا فنحروا ،وجعل بعضهم یحلق بعض حتی کاد بعضهم یقتل بعضهم غما ⁷ ''کہ اے اللہ کے نبی! کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ حضرات آپ کے حکم کے مطابق قربانی کریں اور سر منڈائیں (تو پھر) آپ ﷺ ان کی جانب نکلیے اور ان میں سے کسی سے بھی گفتگو نہ کریں بلکہ اپنی قربانی کا جانور ذبح فرمائیں۔ اور حجام کو بلائیں جو آپ کے بال کاٹے گا اس مشورے کے مطابق سرکار دوعالم ﷺ باہر تشریف لے گئے

اور کسی سے کلام نہ فرمایا اور اسی طرح کیا یعنی قربانی کا جانور ذبح کیا اور حجام کو بلایا جس نے آپ ﷺ کے بال کاٹے جب صحابہ نے یہ دیکھا تو کھڑے ہوگئے اور قربانی کرنے لگے اور ایک دوسرے کے بال بنانے لگے جبکہ ان کی شدت غم کا یہ عالم تھا کہ گویا ایک دوسرے کو (اس غم سے) قتل کر دیتے'' اس طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی ﷺ کا ام سلمہ سے مشورہ کرنا خواتین سے مشاورت کی تعلیم دیتا ہے۔

حضور ﷺ کی اس تعلیم پر خلفائے اربعہ کا بھی مکمل طور پر عمل پیرا رہنا جیسا کہ خلیفہ دوم سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کا فوجی خدمات انجام دینے والے حضرات کا گھر سے باہر رہنے کی مدت کا تعین ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے مشورہ سے کرنا خواتین سے مشاورت کی تعلیم دیتا ہے کہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی معاملات میں انکو بطور مشیر ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔

دفاعی ذمہ داریوں میں جوہر دکھانے کا حق

شریعت اسلامیہ نے عورتوں کے جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے پر حوصلہ افزائی کی ہے خواتین کی یہ حیثیت اسلامی معاشرے میں ان کے فعال کردار اور نمایاں مقام کا مظہر ہے جیسا کہ درج ذیل روایت شاہد ہے کہ رسول اللہ ﷺ بنت ملحانؓ کے گھر تشریف لے گیے ٹیک لگا کر سو گئے پھر آپؐ نے مسکرایا تو انہوں نے دریافت فرمایا کہ یا رسول اللہ آپکو کس چیز نے ہنسایا؟۔

فرمایا میری امت کے کچھ افراد راہ خدا میں اس سبز سمندر پر سواری کر رہے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھے ہیں۔عرض کیا گیا یا رسول اللہ دعا کیجیے کہ اللہ تعالی مجھے ان میں شمار کر لے، آپ ﷺ نے دعا کی اے اللہ اسے ان میں شمار کر لے آپ علیہ السلام پھر سو گیے اور ہنسے اور پھر اسی طرح پوچھا گیا آپ نے بھی پہلے ہی کی طرح جواب دیا، انہوں نے التجا کی کہ باری تعالی سے دعا کریے کہ مجھے بھی اس گروہ میں شامل کر لے، فرمایا تمہارا شمار پہلے گروہ میں ہے نہ کہ دوسرے گروہ میں، حضرت انسؓ

فرماتے ہیں کہ اس کے بعد انہوں نے عبادہ ابن صامتؓ سے نکاح کر لیا پھر بنت قرضہ کے ساتھ بحری سفر میں نکلی جب واپس لوٹ رہی تھیں تو اپنے سواری کے جانور پر سوار ہوتے وقت گر گئیں اور جاں بحق ہو گئیں الفاظ حدیث اس طرح سے ہیں: دخل رسول الله ﷺ علی بنت ملحان فاتکا عندها، ثم ضحک، فقالت: لم تضحک یا رسول الله ﷺ؟ فقال ناس من أمتی یرکبو ن البحر الخضر فی سبیل الله مثلهم مثل الملوک علی الأسرة فقالت: یا رسول الله ﷺ أدع الله أن یجعلنی منهم قال اللهم اجعلها منهم ثم عاد فضحک فقالت له مثل ذلک؟ فقال لها مثل ذلک، فقالت: یا رسول الله ﷺ ادع الله أن یجعلنی منهم قال أنت من الأولین و لست من الآخرین. قا ل انس فتزو جت عبادة ابن صامت فر کبت البحرمع بنت قرضة، فلما قفلت رکبت دابتها فوقعت بها فسقطت عنها فماتت۔[8]

ایسے ہی دوسری روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ جب جنگ احد میں لوگ نبی اکرم ﷺ سے دور ہو گیے تو حضرت عائشہ بنت ابو بکرؓ اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ دونوں اپنے دامن سمیٹے ہوئے ہیں اور میں ان دونوں کی پازیب دیکھ رہا تھا دونوں اپنی پیٹھ پر مشکیں لاتی اور پیاسے مسلمانوں کو پلاتی تھیں پھر لوٹ جاتی تھیں اور مشکیزیں بھر کر لاتی اور پیاسے مسلمانوں کو پلاتیں عن انس قال لما کان یوم أحد انهزم الناس عن النبی ﷺ قال ولقد رأیت عائشة بنت أبی بکر وأم سلیم وإنهما لمشمرتان أری قدم سوقهما تنقزان القرب وقال غیره: تنقلن القرب علی موتونهما، ثم تفرغانه فی أفواه القوم ثم ترجعان فتملأ نها ثم تجیعان فتفرغانها فی أفواه القوم[9]۔

ایسے ہی حضرت انس بن مالکؓ کی روایت میں کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ام سلیم اور کچھ انصاری خواتین تھیں جو جہاد میں شریک تھیں یہ خواتین مجاہدین کو پانی پلاتیں تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں کان رسول الله ﷺ یغزو بأم سلیم ونسوة معها من الأنصاریسقین الماء ویداوین الجرحی [10]

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سات لڑائیوں میں شریک ہوئی، میں غازیوں کی منزلوں میں ان کے پیچھے رہتی تھی، ان کے لیے کھانا پکاتی تھی، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھی اور بیماروں کے لیے علاج کرتی تھی جیسا کہ یہ روایت دال ہے: عن أم عطية قالت غزوت مع رسول الله ﷺ سبع غزوات اخلفهم في رحالهم فأصنع لهم الطعام و أداو الجرحى وأقوم على المرضى [۱۱]

جنگ قادسیہ میں تقریباً ساٹھ خواتین نے حصہ لیا جن میں حضرت امیر معاویہؓ کی والدہ محترمہ حضرت ہندہ بھی تھیں، اسی جنگ قادسیہ میں حضرت خنسا شریک تھیں مع اپنے بیٹوں کے، ان کے چاروں صاحبزادے اللہ کی راہ میں شہید ہوگیے حضرت خنسا نے جب ان کے شہید ہونے کی خبر سنی تو اللہ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ان سب کو دولت شہادت سے سرفراز کیا اور مجھے اعجاز بخشا کہ اس کی رحمت اور فضل کے سائے میں ان چاروں کے ساتھ ماں ہونے کی حیثیت سے میں بھی رہونگی۔

دور نبوی ﷺ میں ایسی بہت سی خواتین کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے بے مثال عسکری خدمات انجام دیں مثلاً حضرت عائشہؓ اور حضرت نسیبہ بنت کعبؓ نے غزوۂ احد میں شرکت کی، یہ وہی نسیبہ ہیں جن کو تاریخ ام عمارہ کے نام سے یاد کرتی ہے جنھوں نے اللہ کے دین اور اس کے رسول کے دفاع میں خواتین میں سب سے پہلے ہتھیار اٹھائے، یمامہ کی جنگ میں ان کا ہاتھ لڑتے ہوئے شہید ہوگیا تھا اور جسم پر تیر و تلوار کے بے شمار زخم تھے [۱۲] صفیہ بنت عبد المطلب نے غزوۂ خیبر میں ایک یہودی کو قتل کیا، ازرہ بنت الحارث نے اہل بیسان کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا، حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سات لڑائیوں میں شریک ہوئیں، ام حکیم بنت الحارث روم کے خلاف معرکہ میں شریک تھیں، ان کے علاوہ بھی کتب تاریخ میں بے شمار خواتین کے عسکری کردار کا تذکرہ ملتا ہے، اسی وجہ سے جب خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ مدینہ منورہ کی مستورات کے درمیان کچھ چادریں تقسیم کر رہے تھے ایک عمدہ چادر بچی حاضرین میں سے کسی نے کہا اے امیر المومنین یہ رسول اللہ ﷺ کی اس صاحبزادی کو دیدیجیے جو آپ کے حرم میں

ہے ان کی مراد ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا تھیں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ام سلیط زیادہ حق دار ہیں اورام سلیط انصار کی ان عورتوں میں سے ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی اور یہ اس لیے بھی زیادہ حق دار ہیں کہ جنگ احد میں ہمارے لیے مشکیں بھر بھر کر لاتی تھیں جیسا کہ بخاری میں ہے: ان عمر ابن الخطاب قسم مروطا بین نساء من نساء المدینة فبقی مرط جیدة فقال له بعض من عنده: یا أمیر المومنین اعط هذا ابنة رسول الله ﷺ التی عندک یریدون أم کلثوم بنت علیؓ، فقال عمر أم سلیط أحق وأم سلیط من نساء الانصار ممن بایع رسول الله ﷺ قال عمر فإنها کانت تزفر لنا القرب یوم أحد [۱۳]

خواتین کوانتظامی امور انجام دینے کا حق: شریعت اسلامیہ کی روشنی میں

اسلامی تعلیمات کے مطابق صنف نازک کو صرف مجلس شوریٰ کی رکنیت کا ہی شرف حاصل نہیں ہے بلکہ وہ مختلف ذمہ داریوں کو بھی انجام دے سکتی ہیں جیسا کہ خلفاء اربعہ میں سے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شفا بنت عبد اللہ عدویہ کو بازار کا نگراں مقرر کیا تھا یعنی آپ رضی اللہ عنہا قضائے حسبہ اور قضائے سوق دونوں کی ذمہ دار تھیں، شفا انتہائی سمجھ دار اور با صلاحیت خاتون تھیں، سیدنا فاروق اعظم ان کی رائے کو مقدم رکھتے تھے اور دوسروں کی رائے پر ان کی رائے کو فوقیت بخشتے تھے۔[۱۴]

حضرت سمراء بنت نہیک اسدیہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ میں تاریخ میں مرقوم ہے کہ اس خاتون نے زمانہ نبوت کو پایا تھا مگر عمر کا ایک معتد بہ حصہ پار کر چکی تھیں، جب بازار سے گذرتی تھیں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کرتی ہوئی گذرتی تھیں، ان کے پاس ایک کوڑا تھا جس سے ان لوگوں کو مارتی تھیں جن کو کسی برے کام میں مشغول دیکھتی تھیں۔ ان تمام واقعات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صنف نازک دائرہ اسلام میں رہتے ہوئے محکومی کی زندگی نہیں گذارتی ہے بلکہ اہلیت اگر ہے تو اسے حاکم کے طور پر بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

خواتین کو مجلس شوریٰ یا پارلیامنٹ میں نمائندگی کا حق

کسی بھی تحریک میں سچی لگن اور حقیقت سے قریب تر ہونا اس کی کامیابی کی ابتدائی کلید ہوا کرتی ہے، اس لیے کہ جس اصول کو عملی شکل میں لایا جاتا ہے موثر و کامیاب وہی ہوتا ہے اور اسلام اسی کی تبلیغ وتعلیم دیتا ہے اس لیے کہ اسلام نے مرد و عورت کے درمیان مساوات قائم کی ہے اور اولاد آدم واہل جیسے الفاظ سے تخاطب کیا ہے جس میں دونوں شامل ہیں، جزاء وسزاء کی بنیاد پر بھی دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے فرمان باری تعالیٰ ہے **لیس للانسان إلا ما سعی** ۱۵ دوسری جگہ ارشاد ہے **ومن یعمل من الصلحت من ذکر أو انثی وھو مو من فأولئک ید خلون الجنة ولا یظلمون نقیرا** ۱۶ (اور جو کوئی نیک عمل کریگا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہونگے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی) یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ کسی بھی نظام کو منظم طریقہ سے چلانے کے لیے ایک ناظم کی ضرورت ہوتی ہے جو قوام یا سربراہ کہلاتا ہے باری تعالیٰ بڑا ہی حکیم ودانا ہے اس نے نظام کی صحت کے لیے مرد کو قوام بنایا ہے جیسا کہ فرمان خداوند تعالیٰ ہے **الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض** ۱۷ (مرد عورتوں پر قوام ہیں کیونکہ اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے) اللہ تبارک وتعالیٰ کو جس سے جیسا کام لینا تھا اس کو ویسی ہی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں خواتین کو چونکہ پردہ میں رکھا اور ان کو گھر کی ملکہ قرار دیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان کو خارجی امور کی ذمہ داری بھی دی جا سکتی ہے جیسا کہ خلفائے راشدین کا عمل دال ہے: خلیفہ دوم حضرت عمر ابن خطابؓ نے مختلف معاملات میں خواتین سے مشاورت کی ہے، ایک رات آپ مدینہ منورہ کی گلیوں میں لوگوں کے مسائل سے آگہی کے لیے گھوم رہے تھے کہ ایک گھر سے آپؓ نے کسی خاتون کے اشعار سنے جن میں وہ اپنے شوہر کی جدائی کا ذکر کر رہی تھی جو جہاد پر جانے کی وجہ سے کافی عرصہ سے گھر سے دور تھا، اس واقعہ نے آپ کو بے چین کر دیا اور واپس آتے ہی

ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے اس پر مشاورت کی اور ان ہی کے مشورے سے مجاہدین کے گھر سے باہر رہنے کی زیادہ سے زیادہ مدت چار ماہ مقرر فرمائی [18]۔

حضرت عمرؓ کے نظام خلافت کے طریق کار کی تفاصیل سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کی مجلس شوری میں خواتین کو بھی نمائندگی حاصل تھی چنانچہ ایک موقع پر جب آپؓ نے مجلس شوری سے خواتین کے مہر کی مقدار متعین کرنے پر رائے لی تو مجلس شوری میں موجود ایک نیک خاتون نے کہا کہ آپ کو اس کا حق اور اختیار نہیں کیونکہ باری تعالی کا ارشاد وإن أردتم استبدال زوج مكان زوج و آتيتم إحداهن قنطارا فلا تاخذوا منه شيئا أتاخذونه بهتانا و إثما مبينا [19] (اور اگر تم ایک بیوی کے بدلے دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اسے ڈھیروں مال دے چکے ہو تب بھی اس میں سے کچھ واپس مت لو کیا تم ظلم و دہشت کے ذریعہ اور کھلا گناہ کر کے وہ مال واپس لو گے) اس پر حضرت عمرؓ نے اپنی تجویز واپس لے لی اور فرمایا: امرا ة خاصمت عمر فخصمته کہ ایک عورت نے عمر سے بحث کی اور وہ اس پر غالب آ گئی، ایک دوسری روایت کے مطابق آپ نے فرمایا کہ "عورت نے صحیح بات کی اور مرد نے غلطی کی" امرء ة أصابت و رجل أخطأ [21]۔

اس واقعہ کی روشنی میں آسانی سے ایک بات تو یہ سمجھ میں آسکتی ہے کہ آپؓ کسی عوامی جگہ یہ معاملہ نہیں کر رہے تھے بلکہ یہ مسئلہ شوری میں زیر غور تھا جس کا مطلب ہے کہ عامۃ الناس کے بجائے منتخب افراد ہی اس عمل مشاورت میں شریک تھے، لہذا ایک خاتون کا کھڑے ہو کر اس مسئلہ پر اعتراض کرنے سے یہ مفہوم آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں خواتین کو سیاسی معاملات میں شرکت کرنے، حکومت میں شامل ہونے اور درپیش مسائل پر اپنی آرا کے اظہار کا اختیار حاصل تھا، اس پر حضرت عمرؓ کا اپنی رائے واپس لے لینا اور غلطی کا اعتراف کر لینا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اسلام میں جنسی امتیاز کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور مرد و زن کو یکساں مواقع حاصل ہیں۔

دوسرے آئینی و قانونی معاملات چلانے کے لیے بھی اس واقعہ سے روشن ہدایات ملتی ہیں بطور خاص صنف نازک کے سیاسی معاملات میں مداخلت، انکی رائے کو

قبول کرنے اور اس پر عمل کی بھی واضح تعلیم اس میں موجود ہے۔

ماخذ و مراجع

۱۔ تفسیر مظہری، القاضی محمد ثناء اللہ العثمانی الحنفی المجددی، جلد پنجم، ص ۲۶
۲۔ تفسیر مظہری، جلد ششم، ص ۴۰۳
۳۔ سورہ الزخرف آیت نمبر ۴۹
۴۔ سورہ توبہ آیت نمبر ۷۱
۵۔ تاریخ الامم والملوک جلد سوم ص ۳۵ تا ۳۷
۶۔ تفسیر مظہری، جلد نہم، ص ۱۷
۷۔ تفسیر ابن جریر طبری، محمد بن جریر الطبری، جلد ۲۶، ص ۴۱
۸۔ صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل البخاری، جلد دوم، باب غزوۃ المرءۃ فی البحر، ص ۴۰۳
۹۔ صحیح بخاری، جلد دوم، باب غزوۃ النساء وقتالھن مع الرجال، ص ۴۰۳
۱۰۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، جلد دوم، باب غزوۃ النساء مع الرجال، ص ۱۱۶؛ صحیح بخاری، جلد دوم، باب مداواۃ النساء، لجرحیٰ فی الغزو، ص ۴۰۳
۱۱۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، جلد دوم، باب النساء الغازیات الخ ص ۴۱۷
۱۲۔ فتوح البلدان للبلاذری، جلد اول، ص ۱۴۵
۱۳۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد دوم، باب حمل النساء اقرب الی الناس فی الغزو، ص ۴۰۳
۱۴۔ الاستیعاب برحاشیہ الاصابہ، ابن عبدالبر القاضی، جلد چہارم، ۳۳۵
۱۵۔ سورہ نجم، آیت نمبر ۳۹
۱۶۔ سورہ نساء، آیت نمبر ۱۲۴
۱۷۔ سورہ نساء، آیت نمبر ۳۴
۱۸۔ تاریخ الخلفاء، ص ۱۳۹
۱۹۔ سورہ نساء، آیت نمبر ۲۰
۲۰۔ نیل الاوطار، جلد ششم، ص ۱۷۰

☆☆☆

خواتین کے سیاسی حقوق

شائستہ پروین*

سربراہ مملکت

قرآن کریم کی آیات میں عورت کے لیے کسی ایسے عہدے کے حصول کی ممانعت کا ذکر نہیں ملتا جس کو انجام دینے کی صلاحیت اس کے اندر پائی جاتی ہو یا کوئی ایسا حکم نہیں ہے کہ عورت سربراہ مملکت نہیں بن سکتی علاوہ ایک خاص سربراہی کے (خاندان کی سربراہی) البتہ کچھ آیات میں خواتین اور مردوں کو ایک دوسرے کا مددگار ٹھہرایا گیا ہے اور سماجی، مذہبی، اقتصادی اور سیاسی دائرہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاَةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللّهَ وَرَسُولَهُ" (التوبہ: ۷۱)

(مومن مرد عورت آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ بھلائیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں نمازوں کو پابندی سے بجالاتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی بات مانتے ہیں۔)

نبی کریم ﷺ کے قول سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ:

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، ویمنس کالج، شعبۂ دینیات (سنی)، اے ایم یو، علی گڑھ

"لن يفلح قوم ولوا أمرهم امرأة"[2]

جب کسریٰ مرگیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اب اس کی جگہ کس کو مقرر کیا گیا لوگوں نے عرض کیا: اس کی لڑکی کو آپ نے فرمایا: وہ قوم کبھی فلاح یاب نہیں ہوگی جو کہ اپنی حکومت عورت کے اختیار میں دے دے۔

اس حدیث کی شرح میں علماء کرام کی مختلف آراء ہیں۔

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں:

"فيه دليل على أن المرأة ليست من أهل الولايات ولا يحل يقوم توليتها لأن تجنب الامر الموجب لعدم الفلاح واجب"[3]

(اس میں دلیل ہے کہ عورت سرپرستی اور حکومت کی اہل نہیں ہے اور کسی قوم کے لیے اس کو سرپرست مقرر کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ عدم فلاح کو لازم کرنے والے فعل سے اجتناب ضروری ہے۔)

علامہ ابن حزم لکھتے ہیں:

"وجمع فرق اهل القبلة ليس منهم احد يجيز امامة امرأة"[4]

(اہل قبلہ کے تمام فرقوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو عورت کی امامت کو جائز سمجھتا ہو۔)

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کہتے ہیں:

حدیث میں مذکورہ ولایت سے مراد صرف ولایت عظمیٰ ہے کیونکہ اس کا ذکر اس وقت ہوا جب رسول اللہ ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی موت کے بعد اپنی حکومت کی باگ ڈور اس کی ایک بیٹی کے حوالے کردی ہے اور چونکہ اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ عمومی طور پر ولایت کا منصب عورت کے لیے ممنوع نہیں ہے جس کا ثبوت ہے تمام علماء کا اس بات پر اتفاق کہ ایک عورت نابالغ اور چھوٹے بچوں کی نگراں بن سکتی ہے، کسی کے بھی بزنس یا کھیتوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ان کی وکیل کے فرائض

انجام دے سکتی ہے، گواہی دے سکتی ہے اور فقہاء کے نزدیک گواہی دینا بھی ایک طرح کی ولایت ہی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت کے لیے عدل وانصاف کے عہدے پر فائز ہونا جائز ہے جو کہ ولایت کے زمرے میں آتا ہے تو حدیث کے الفاظ سے جو مفہوم ہم اخذ کرتے ہیں وہ ہے ملکی حکومت کی سربراہی کو عورت کے لیے ممنوع قرار دینا اور اس مخالفت میں وہ سارے مناصب آتے ہیں جو اپنی اہمیت اور نزاکت میں حکومتی سربراہی کے ہم پلہ ہوں اس کے علاوہ جتنے بھی عہدے ہیں اسلام میں عورت کے لیے کوئی ممانعت نہیں پائی جاتی کہ وہ ان کی ذمہ داری نہ سنبھال سکے کیونکہ وہ اس کی اہلیت اور قابلیت رکھتی ہے لیکن ساتھ میں یہ شرط لازمی ہے کہ وہ یہ ذمہ داری اسلامی قیود وضوابط کے دائرے میں رہتے ہوئے ادا کرے۔[۵]

عالم عرب کی مشہور شخصیت شیخ محمد ابوشفہ مذکورہ حدیث پر غور وفکر کے بعد مفہوم بیان کرتے ہیں:

درحقیقت جب فارس پر مسلمان فتح کا پرچم گاڑ رہے تھے اس وقت ان کی حکمراں ایک ظالم وجابر ملکہ تھی، دین بت پرستانہ تھا، حکمراں خاندان نظام شوریٰ سے ناواقف تھا وہ مخالف رائے کا احترام نہیں کرتا تھا، وہاں کے باشندوں کے آپسی تعلقات انتہائی درجہ خراب اور ناگفتہ بہ تھے، ذاتی منفعت کی خاطر ایک شخص اپنے باپ یا بھائی کو قتل کردیا کرتا تھا، عوام کی کچھ حیثیت نہ تھی جب ایرانی لشکر شکست کھا چکا تھا اور حکومت کا دائرہ کم ہوتا چلا جارہا تھا اس وقت یہ ممکن نہ تھا کہ ایسا فوجی قائد حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیتا جو شکست کے سلسلہ کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، لیکن سیاسی بت پرستی نے حکومت کا وارث ایک ایسی نوجوان لڑکی کو قرار دیا جو امور حکومت سے ناواقف تھی یہ پوری صورت حال زبان حال سے کہہ رہی تھی کہ اب حکومت باقی نہیں رہ سکتی، بلکہ ختم ہوجائے گی اس صورت حال میں تبصرہ کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ کہے تھے:

آگے چل کر اپنی فکر کی وضاحت کرتے ہیں۔

کہ نبی کریم ﷺ نے اہل مکہ کو سورۂ نمل کی تلاوت کر کے سنایا اور انھیں اس سورت میں ملکہ سبا کا قصہ سنایا، ملکہ سبا نے اپنی حمت اور ذہانت سے اپنی پوری قوم کو فلاح و کامیابی کی راہ یعنی اسلام کی راہ دکھادی۔ یہ بات محال ہے کہ حدیث میں وارد کوئی حکم قرآن کے کسی حکم کے خلاف ہو، کیا اس قوم کو نا کامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا جنھوں نے اس قسم کی دوراندیشی عورت کو اپنی حکومت کی باگ ڈور دے رکھی تھی۔

اپنی رائے کی تائید میں ابن تیمیہ اور محمد غزالی کی رائے پیش کرتے ہیں۔ ابن تیمیہؒ کا قول:

کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کافر حکومت کو اس کے عدل کے سبب ایسی مسلم حکومت پر غالب کر دیتا ہے جہاں ظلم وستم روا رکھا جاتا ہے؟

یہاں پر مرد ہونے یا عورت ہونے کا کیا عمل دخل ہے؟ ایک دین دار اور طاقت ور عورت ایک باریش کافر مرد سے بہتر ہوتی ہے۔

شیخ محمد الغزالی کا قول:

مرد و عورت کے درمیان تعلقات کی اساس ہمیں ان آیات میں ملتی ہیں:

''جواب میں ان کے رب نے فرمایا میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو''۔ آل عمران:۱۹۵

''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجران کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے''۔ (نحل:۹۷)

اس طرح حدیث میں بھی ان الفاظ کے ساتھ عورت و مرد کے تعلقات کو اساس بیان کیا گیا ہے:

''عورتیں مردوں کی ہم مرتبہ ہیں''۔

شیخ غزالی قرآن و حدیث سے دلیل پیش کرنے کے بعد کہتے ہیں:

''خدا بہتر جانتا ہے کہ اگر چہ مجھے میری رائے اچھی لگتی ہے لیکن پھر میں

شذوذ اور اختلافات کو ناپسند کرتا ہوں، جماعت کے ساتھ رہنے کو ترجیح
دیتا ہوں اور اپنی رائے سے تنازل اختیار کر لیتا ہوں تا کہ امت کا اتحاد
قائم و باقی رہے"۔ [۶]

غرض یہ کہ خواتین کو ملکی سربراہ بنانے کے بارے میں علماء کے دو گروہ بن گئے ہیں وہ علماء جو عورت کے لیے ملکی سربراہی کے قائل ہیں ان کا ماننا ہے کہ مذکورہ حدیث اس زمانے کے لیے خاص ہے جس میں فارس میں عورت حکمراں تھی، جب کہ دیگر علماء کی رائے کے مطابق یہ حکم ہر زمانے کے لیے عام ہے۔

البتہ ہر دور کے علماء کا اس بات پہ اتفاق رہا ہے کہ اسلامی حکومت کی سربراہی صرف اور صرف مردوں کے لیے مخصوص ہے، عورتوں کو اس بات کی اجازت نہیں ہے۔

اس موقع پر ان شرعی احکام کا جائزہ لینا ضروری ہے جو مرد و عورت کے باہمی اختلاط سے متعلق ہیں تا کہ سیاسی سرگرمیوں میں عورت کی شرعی حدود و قیود کے ضوابط واضح ہو جائیں۔

۱- اللہ کے رسول ﷺ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:

"لایخلون رجل بامراۃ الا و معھا ذو محرم ولا تسافر المرأۃ إلا مع ذی محرم" [۷]

(کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ بغیر اس کے محرم کے خلوت نہ کرے اور نہ کوئی عورت بغیر محرم کے سفر کرے۔)

یہ سن کر ایک شخص کھڑے ہوئے، عرض کیا، یا رسول اللہ! میری بیوی حج کرنے جارہی ہے اور میرا نام فلاں فلاں جہاد میں لکھا ہوا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ تو بھی اپنی بیوی کے ساتھ جا کر جہاد کر۔

عام طور سے میدان سیاست میں سربراہِ حکومت کو دوسرے سربراہان حکومت سے ملاقاتیں کرنی پڑتی ہیں جو کہ لوگوں کے درمیان بھی ہوتی ہیں اور تنہائی میں بھی ہوتی ہیں جب کہ کوئی دوسرا وہاں نہیں ہوتا، اسلام تنہائی میں عورت کو نامحرم سے ملاقات کی

اجازت نہیں دیتا۔

(۲) سربراہ کی حیثیت سے دیگر سربراہان سے ہاتھ ملانا ناخوشگوار تعلقات کے لیے ضروری محسوس ہوتا ہے اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا جو کہ آپ ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔

حضرت امیمہ بنت رقیقہ سے روایت ہے کہ میں رسول کریم کی خدمت میں حاضر ہوئی انصار کی خواتین کے ساتھ اور ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ سے بیعت کرتے ہیں اس پر کہ اللہ عزوجل کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے اور چوری نہیں کریں گے اور زنا نہیں کریں گے اور بہتان نہیں اٹھائیں گے دونوں ہاتھ اور پاؤں میں سے اور نافرمانی نہیں کریں گے شریعت کے کام کی آپ نے فرمایا: یہ بھی کہو کہ ہم سے جہاں تک ممکن ہوگا۔ حضرت امیمہ نے عرض کیا: ہم نے کہا کہ خدا اور رسول کا ہم پر بہت رحم ہے کہ ہماری طاقت کے مطابق ہم سے بیعت کرنا چاہتے ہیں ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ آپ آئیں اور ہم سے ہاتھ ملائیں، آپ نے فرمایا: إنی لا اصافح النساء میرا ایک خاتون سے کہہ دینا ایسا ہے کہ جیسے متعدد خواتین سے کہنا۔[۸]

(۳) خواتین کے مخصوص ایام، دورانِ حمل اور بچے کی ولادت کے بعد نفسیاتی و جسمانی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں جو قوت فیصلہ پر بھی اثر انداز ہوسکتی ہیں ان تبدیلیوں کے ساتھ عوام کے درمیان رہنا اور ان کے مسائل معلوم کرنا، ان کی جانب سے گھیرابندی، احتجاج، مظاہرے یہ سب ایسے امور ہیں جو عورت کی صحت کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

چنانچہ اگر عورت کسی ایسے منصب پر فائز ہوتی ہے کہ جس میں لازماً غیر مردوں کے ساتھ تنہائی میں رہنا پڑے یا پھر سفر کرنے ہوں تو شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کی وجہ سے ایسے امور ناجائز ہوں گے۔

سربراہِ حکومت کا انتخاب کرنے کا حق

حضور ﷺ اللہ کے رسول تھے، امام المسلمین اور سربراہ حکومت کے منصب پر

فائز تھے۔ آپ ﷺ نے عورت کو رائے دہی کا قانونی حق دیا اور اپنے عمل سے اس قانون کو یقینی بنایا۔

قرآن کریم میں ہے:

''يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَى أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئاً وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ'' ۹

(اے پیغمبر! جب مسلمان عورتیں آپ سے ان باتوں پر بیعت کرنے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا کاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی اور کوئی ایسا بہتان نہ باندھیں گی جو خود اپنے ہاتھوں پیروں کے سامنے گھڑ لیں اور کسی نیک کام میں تیری بے حکمی نہ کریں گی تو آپ ان سے بیعت کر لیا کریں اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کریں بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا معاف کرنے والا ہے۔

آپ ﷺ یہ بیعت اس وقت لیتے جب عورتیں ہجرت کر کے آتیں۔ علاوہ ازیں فتح مکہ والے دن بھی آپ ﷺ نے قریش کی عورتوں سے بیعت لی۔

اللہ کے رسول ﷺ نے خواتین سے بیعت کی

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ''اللہ کی قسم بیعت میں نبی ﷺ کے ہاتھ نے کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا بیعت کرتے وقت آپ ﷺ صرف یہ فرماتے کہ میں نے ان باتوں پر تجھ سے بیعت لے لی''۔ ۱۰

بیعت عقبہ ثانیہ میں جن حضرات سے بیعت ہوئی ان میں دو خواتین شامل تھیں۔ عبداللہ بن کعب انصاری کی روایت ہے:

”کان ممن شهد العقبة وبايع رسول الله ﷺ وذكر قصة البيعة قال واجتمعنا بالشعب عند العقبة ونحن سبعون رجلا وامرأتان نسيبة بنت كعب ام عصاره واسماع بنت عمرو بن عدی بن نابی احدی نساء منی سلمة وهی أم منيع“[11]

ام عمارہ انصاریہ اور اسماء بنت عمرو یہ دونوں خواتین بیعت عقبہ ثانیہ میں شامل تھیں۔

خلافت راشدہ کے عہد میں بھی اس سنت پر عمل جاری رہا اور رائے دہی کے معاملات میں خواتین کو شامل کیا گیا۔

حضرت مسور بن مخرمہ سے مروی ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اپنے بعد جانشین کے انتخاب کے لیے چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو چیف الیکشن نامزد کیا انھوں نے استصواب عام کے ذریعہ مسلسل تین دن گھر گھر جا کر لوگوں کی آراء معلوم کیں جن کے مطابق بھاری اکثریت حضرت عثمان غنیؓ کو خلیفہ بنائے جانے کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس میں خواتین بھی شامل ہوئیں۔

مذکورہ حدیث میں بیعت اور استصواب کا لفظ استعمال ہوا ہے ان میں الیکشن کا مفہوم بھی شامل ہے جو کہ دور حاضر میں حکمراں کے انتخاب کے لیے عمل میں لایا جاتا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ عورت کی مستقل ایک شخصیت ہے اور رائے دہی کے قانون میں اسے بھی پورا پورا حق حاصل ہے بلکہ بعض اوقات عادل، منصف، اسلام پسند حکمراں کو میدان سیاست میں لانے کے لیے خواتین کی رائے (ووٹ) بہت اہم ہو جاتی ہے کیونکہ الیکشن میں ووٹ کے ذریعہ ان اشخاص کو منتخب کیا جاتا ہے جو کہ حکومت پر نگاہ رکھیں، حکومت کا تعاون کریں اور تمام معاملات میں عوام کی نمائندگی کریں۔[12]

عرب دنیا میں کئی دہائیوں سے صحیح الفکر قائدین کا فقدان ہے ماضی قریب میں جتنے بھی قائدین رہے وہ سب بے دین تھے مسجدوں میں رکوع وسجود کی اجازت ضرور دیتے تھے لیکن دین وشریعت کو ایوان سیاست میں داخل کرنے کے قائل نہ تھے اس طرح

کا استبدادی نظام جہاں بھی ہو اس کے خاتمہ کے لیے اور دینی و شرعی نفاذ کے لیے انتخابات اور پارلیمنٹ کی تشکیل بہترین صورت ہے جس کی تازہ مثال اخوان المسلمین کا الیکشن کے ذریعہ مصر میں برسر اقتدار آنا اور اسلام دشمن شخص کی حکومت کا تختہ الٹ دینا ہے جس میں خواتین برابر شامل رہیں، لہٰذا غیر اسلامی اور ظالمانہ نظام کے خلاف کھڑا ہونا جہاں مردوں کی ذمہ داری ہے وہیں خواتین بھی برابر کی ذمہ دار ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاَةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللّهَ وَرَسُولَهُ" [۱۳]

اسلام کے سیاسی نظام میں رائے دہی کا عمل اتنا مقبول اور مفید ثابت ہوا کہ عالمی سطح پر اس کی مقبولیت بڑھ گئی اور جدید دنیا میں اس کا آغاز ہوا اور آج بھی یہ عمل جاری ہے۔

قانون سازی کا حق

قانون سازی میدانِ سیاست کا اہم شعبہ ہے جس میں تعلیم کے ساتھ معاشرے کے مسائل اور ان کی واقفیت بہت ضروری ہے اسلام نے علم کے حصول کا حق مرد و عورت دونوں کو دیا ہے اسلامی تاریخ میں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جس میں مختلف علوم مثلاً قرآن، حدیث، فقہ، ادب، طب، انساب، تاریخ وغیرہ میں خواتین غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھیں اور ان کے اظہار پر پوری طرح قادر تھیں اور اللہ کے رسول ﷺ نے تمام خواتین کو متعلقہ علوم وفنون کے جوہر دکھانے کے مواقع عطا کیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بنیادی قانون سازی صرف اللہ کے اختیار میں ہے اور امر و نہی کے شرعی اصول اللہ نے نازل کردیے ہیں۔ انسانوں کا کام مجمل احکام کی تفصیل بیان کرنا اور وہ احکام اخذ کرنا جن کے بارے میں کوئی نص نہ ہو یعنی اجتہاد اور اجتہاد کے لیے مرد یا عورت کی کوئی

شرط نہیں ہے۔

آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین بھی ان ہی اصولوں پر کاربند رہے کیونکہ عورت نصف آبادی ہے خواتین کے مسائل کو خواتین بہتر سمجھ سکتی ہیں اور ان کے لیے مناسب حل تجویز کرسکتی ہیں۔ ایک رات حضرت عمرؓ مدینہ منورہ میں خلق اللہ کی خبر گیری کے لیے گشت فرمارہے تھے کہ آپ نے سنا کہ ایک عورت فراقیہ اشعار پڑھ رہی ہے:

تطاول هذا الليل تسرى كواكبه

وارقني أن لا ضجيع لاعبه

فوا الله لولا الله تخشى عواقبه

لزحزح من هذا السرير جوانبه

ولكنني اخشى رقيبا ...... مؤكلا

بانفسنا لا يفتر الدهر كاتبه

مخافة ربي والحياء يصدني

واكرم يعلي ان تنال مراكبه [۱۴]

(یہ رات بڑھ گئی ہے اور ستارے چمک رہے ہیں- مجھے یہ بات جگا رہی ہے کہ میرے ساتھ کوئی کھیلنے والا نہیں- خدا کی قسم اگر اللہ کے عذاب کا خوف نہ ہوتا- تو اس چارپائی کی چولیں ہلتی ہوتیں- لیکن میں اس نگہبان اور مؤکل سے ڈرتی ہوں- اپنے نفس کے ساتھ جس کا کاتب کسی وقت نہیں تھکتا- مجھے خوف خدا اور حیا منع کرتی ہے- علاوہ ازیں میرا خاوند ایسا کریم ہے کہ اس کی سواری پر کوئی سوار نہیں ہوسکتا۔)

یہ اشعار سن کر حضرت عمرؓ نے اس عورت سے دریافت کیا کہ تجھے کیا ہوا تو یہ اشعار کیوں پڑھ رہی ہے اس نے کہا کہ میرا شوہر کئی ماہ سے جنگ پر گیا ہوا ہے اس کے اشتیاق ملاقات میں یہ اشعار پڑھ رہی ہوں چنانچہ آپ نے اس کو تسلی دی اور شوہر کو بلوانے کے لیے قاصد روانہ کردیا اور اس کے بعد اپنی صاحبزادی حضرت حفصہؓ کے

پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ مجھے ایک مشکل درپیش ہے تم اس کو حل کردو اور وہ مشکل یہ ہے کہ یہ بتاؤ عورت کتنے عرصے تک شوہر کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ حضرت حفصہ نے بتایا کہ تین یا زیادہ سے زیادہ چار ماہ! واپس آ کر آپ نے حکم جاری فرمادیا کہ چار مہینے سے زیادہ کسی مجاہد کو میدانِ جنگ میں نہ روکا جائے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ مذکورہ مشکل میں آپ نے بذاتِ خود کوئی فیصلہ نہیں لیا بلکہ ایک خاتون کی مشکل کے مناسب حل کے لیے دوسری خاتون سے رجوع کیا اور اسے باقاعدہ قانون بنادیا۔

ایک مرتبہ ایک قافلہ نے مدینہ میں پڑاؤ ڈالا، حضرت عمرؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ چوروں سے ان کی حفاظت کے لیے وہاں پہنچے اور پوری رات نماز پڑھتے رہے اور ان لوگوں کی حفاظت کرتے رہے اچانک حضرت عمرؓ نے ایک بچہ کی رونے کی آواز سنی جو وقفہ وقفہ سے انہیں سنائی دیتی رہی اور وہ اس بچے کی ماں کو اس کی دیکھ بھال کرنے کی تنبیہ فرماتے رہے۔

رات کے آخری پہر انھیں پھر اس بچے کے رونے کی آواز سنائی دی تو انھوں نے اس کی ماں سے کہا! ہلاکت ہو تمہارے لیے تمھیں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک بری ماں ہو آخر کیا بات ہے کہ پوری رات سے تمہارا بچہ بے چین ہے؟ تو وہ بولی! اے اللہ کے بندے (وہ انھیں نہیں پہچانتی تھی) میں دراصل اس کا دودھ چھڑانا چاہ رہی ہوں اور وہ نہیں مانتا، انھوں نے فرمایا آخر کیوں؟ تو وہ بولی کیونکہ خلیفہ عمرؓ صرف ان بچوں کے لیے وظیفہ مقرر کرتے ہیں جن کا دودھ چھوٹ چکا ہوتا ہے حضرت عمرؓ نے بچہ کی عمر دریافت کی اور فرمایا ہلاکت ہو تمہارے لیے اس کا دودھ چھڑانے میں اتنی عجلت مت دکھاؤ پھر انھوں نے فجر کی نماز پڑھی اور حالت یہ تھی کہ شدت گریہ کے باعث ان کی قرأت نہیں سمجھ پا رہے تھے پھر سلام پھیرنے کے بعد فرمایا! غم ہو عمرؓ کے لیے نہ جانے کتنے مسلمانوں کے بچے مار ڈالے پھر ایک منادی کو حکم دیا تو اس نے اعلان کیا کہ اپنے بچوں کو دودھ چھڑانے میں عجلت سے کام نہ لو کیوں کہ ہم اسلام میں پیدا ہونے والے بچے کے لیے وظیفہ مقرر کرتے ہیں۔

آپ کے دور میں شیر خوار بچہ کے لیے اس وقت تک کوئی حصہ مقرر نہیں کیا جاتا تھا جب تک اس کا دودھ نہیں چھڑا دیا جاتا لہٰذا ایک عورت کے ایک واقعہ کے نتیجے میں قانون میں تبدیلی کی گئی جس سے تمام مائیں فیض یاب ہوئیں۔[۱۵]

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں ہر خاص و عام مرد و عورت کو یہ حق حاصل تھا کہ آپ کی مجلس میں جرأت کے ساتھ اپنا مشورہ دے سکے۔

ایک موقع پر جب آپ نے مجلس شوریٰ سے عورتوں کے مہر کی مقدار متعین کرنے پر رائے لی تو مجلس شوریٰ میں موجود ایک عورت بول اٹھی کہ آپ کو اس کا حق اور اختیار نہیں کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے:

"وَإِنْ أَرَدتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَاراً فَلاَ تَأْخُذُواْ مِنْهُ شَيْئاً أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَاناً وَإِثْماً مُّبِيناً" (النساء:۲۰)

(اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنا ہی چاہو اور ان میں سے کسی کو تم نے خزانہ کا خزانہ دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو کیا تم اسے ناحق اور کھلا گناہ ہوتے ہوئے بھی لے لوگے تم اسے کیسے لوگے۔)

اس پر حضرت عمر نے اپنی تجویز واپس لے لی اور فرمایا:

"امرأة خاصمت عمر فخصمته"

(ایک عورت نے عمر سے بحث کی اور وہ اس پر غالب آ گئی۔)

دوسری روایت کے مطابق

"امراة اصابت ورجل أخطا"

(عورت نے صحیح بات کہی اور مرد نے غلطی کی۔)[۱۶]

اس واقعہ سے چند نکات ابھر کر سامنے آتے ہیں:

۱۔ حضرت عمرؓ وہ عظیم ہستی ہیں جن کے بارے میں آپؐ نے فرمایا:
"عمر کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے حق کو جاری کر دیا ہے"۔

۲۔ مذکورہ مسئلہ عامۃ الناس کے بجائے صحابہ کرام کے مابین زیر بحث تھا۔

۳- ایک عام خاتون کا بل پر جرأت کے ساتھ اعتراض کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قانونی معاملات میں شرکت کرنے اور اپنی رائے پیش کرنے کا حق حاصل تھا۔

۴- آپؓ کا اپنی تجویز خاتون کے سبب واپس لے لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام میں جنسی امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں۔

۵- مشاورت کمیٹی میں شمولیت اور نمائندگی کے لیے علم کا ہونا بہت ضروری ہے، تاکہ مسئلہ کے ہر پہلو پر مدلل بحث کی جا سکے۔

۶- اگر دلائل ٹھوس ہوں تو بل واپس لیا جا سکتا ہے ورنہ باہمی رضامندی سے بل کو قانونی شکل دے دی جاتی ہے۔

حق مشاورت

اظہار رائے کا حق شورائی اور جمہوری نظام کی بنیاد ہے اس حق میں مرد و خواتین دونوں شامل ہیں آپ ﷺ کی سنت مبارکہ میں خواتین کے ایسے بہترین اور کامیاب مشورے ملتے ہیں جن سے خواتین کی عقل و دانائی، حکمت و دور اندیشی اور حسن تدبیر کا بھرپور مظاہرہ ہوتا ہے۔

حضرت خدیجہؓ کی ذات گرامی کے متعلق ابن ہشام میں ہے:

وكانت له وزير صدق على الاسلام۔ (وہ آنحضرت ﷺ کی سچی مشیر کار تھیں۔) [۱۷]

آغاز اسلام سے حضرت خدیجہؓ کے اقدامات اور مشوروں سے آپ ﷺ نے کامیابی کے مراحل طے کیے وہ موقف آپ ہی کا ہے جب آنحضرت ﷺ جلال الٰہی سے خوفزدہ، کانپتے ہوئے گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہ سے کہا زملونی زملونی مجھے کپڑا اڑھاؤ مجھے کپڑا اڑھاؤ، حضرت خدیجہؓ نے کپڑا اڑھایا تو آپ کو تسلی ملی اور حضرت خدیجہؓ نے آپ کے خوف ان الفاظ سے دور کیا:

كلا والله ما يخزيك الله أبداً انك لتصل الرحم وتحمل الكل

وتکسب المعدوم وتقوی الضیف وتعین علی نوائب الحق۔ پھر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں اور سارا واقعہ بیان کیا جس کے جواب میں ورقہ نے آپ کو مستقبل کے اندیشوں اور رسالت کے منصب سے آگاہ کیا اور اس ملاقات سے آپ کی پریشانی دور ہوگئی۔

حضرت خدیجہؓ نے اپنی حسن تدبیر اور دیانت داری کی بدولت اپنے کاروبار تجارت کو احسن طریقہ پر جاری رکھا اور اسے ترقی دی آپ کی تجارت شام و یمن میں پھیلی ہوئی تھی، بڑا عملہ جو آپ کے کاروبار کو چلاتا تھا عربی، یہودی اور عیسائی ملازموں اور غلاموں پر مشتمل تھا۔

حضرت ام سلمہؓ کے بارے میں صاحب اصابہ نے تذکرہ میں لکھا ہے:

"صاحب العقل البالغ والرأی الصائب"

(وہ کامل العقل اور صائب الرائے تھیں۔)

آپ صلح حدیبیہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھیں، صلح کے بعد آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ لوگ حدیبیہ میں قربانی کریں لیکن سب اس قدر دل شکستہ تھے کہ ایک شخص بھی نہ اٹھا تین مرتبہ بار بار کہنے پر بھی کوئی آمادہ نہ ہوا (چونکہ معاہدہ کی تمام شرطیں بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں) اس لیے تمام لوگ رنجیدہ اور غصہ میں تھے۔ آنحضرت ﷺ گھر تشریف لے گئے اور حضرت ام سلمہؓ سے لوگوں کے رویہ کا ذکر فرمایا تب ام سلمہؓ نے کہا:

"آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، بلکہ باہر نکل کر خود قربانی کریں اور احرام اتارنے کے لیے بال منڈوائیں"۔

آپؐ نے باہر آکر قربانی کی اور بال منڈائے اب جب لوگوں کو یقین ہوگیا کہ اس فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہوسکتی تو سب نے قربانی کی اور احرام اتارا، ہجوم کا یہ خیال تھا کہ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے اور عجلت اس قدر تھی کہ ہر شخص حجامت بنانے کی خدمت انجام دے رہا تھا۔[۱۸]

اسلامی تاریخ میں اصابت رائے کی ایسی عظیم الشان مثال ملنے سے قاصر ہے جس کا سہرا صنفِ نازک کے سر ہے۔

حضرت شفا بنت عبداللہؓ کو بارگاہ نبوی میں تقرب حاصل تھا حضرت عمر فاروقؓ کے نزدیک ان کی قدر و منزلت کی یہ کیفیت تھی کہ جب منصب خلافت پر فائز ہوئے تو بعض اہم مسائل میں ان سے مشورہ لیا کرتے تھے اور ان کی رائے کی بہت تعریف کرتے تھے استیعاب میں ان کے متعلق ہے:

"کانت من عقلاء النساء وفضلائهن"[۱۹]

حضرت فاطمہ بنت قیسؓ نہایت زیرک، معاملہ فہم اور صائب الرائے خاتون تھیں جب عمر فاروقؓ نے شہادت پائی تو مجلس شوریٰ کے اجتماع حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کے مکان میں ہوتے تھے اور مجلس شوریٰ کے اراکین ان سے مشورہ لینا مناسب سمجھتے تھے۔[۲۰]

اسی طرح عہد رسالت میں قبیلہ طے کے سردار نے ایک خاتون سے ان کی عقل مندی کو دیکھتے ہوئے مشورہ لیا اور حالت کفر سے دائرہ ایمان میں داخل ہو گئے۔

حضرت سفانہؓ بنت حاتم جو کہ عرب کے مشہور زمانہ سخی حاتم طائی کی بیٹی تھیں حاتم طائی قبیلہ طے کا سردار تھا عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا حاتم طائی کے بعد اس کا بیٹا عدی بن حاتم سیادت پر فائز ہوا۔ ۹ھ میں حضورؐ نے حضرت علی کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا جس سے خائف ہو کر عدی اپنے اہل و عیال سمیت جوشیہ میں اقامت پذیر ہوا گھر سے روانہ ہوتے وقت بھگدڑ میں عدی کی بہن سفانہ ان سے بچھڑ گئیں اور اسلامی لشکر کے ہاتھ اسیر ہو گئیں حضور ﷺ سے رہائی کی درخواست کی جسے آپ نے قبول فرمایا اور ان کے مرتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے مناسب انتظام کے ساتھ یمن کے قبیلہ کے وفد کے ساتھ روانہ کیا جس سے آپ بہت متاثر ہوئیں اور اپنے بھائی عدی کو جو مشورہ دیا انھوں نے اس پر عمل کیا۔

عدی نے پوچھا: تم ہوشیار ہو، عاقلہ ہو، صاحب قریش سے مل کر تم نے کیا

رائے قائم کی؟ بہن نے جواب دیا:

”جس قدر جلد ہو سکے تم ان سے ملو اگر وہ نبی ہیں تو ان سے ملنے میں سبقت کرنا شرف وسعادت ہے اور اگر بادشاہ ہیں تو بھی یمن کا کوئی انکا فرمانرواں کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور ایک بادشاہ سے ملنے میں سبقت بھی تمہاری قدر و منزلت کا وسیلہ ہوگی“۔

سفانہ کے مشورے کے مطابق حضرت عدی مدینہ پہنچ کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور شرف اسلام سے بہرہ ور ہو گئے ان کے بعد سفانہ بھی سعادت اندوز اسلام ہو گئیں۔[۲۱]

سیاسی معاملات میں اصابت رائے کے ساتھ ساتھ اصابت عمل بھی بہت اہم ہے بعض اوقات حالات اتنی سنگینی اور نزاکت اختیار کر لیتے ہیں کہ فی الفور فیصلہ لینا پڑتا ہے فیصلہ گر صحیح ہو تو بڑے سے بڑا معرکہ سر کیا جا سکتا ہے۔

غزوۂ خندق کے موقع پر مستورات انصار کے ایک قلعہ فارع میں تھیں یہ قلعہ بنو قریظہ یہود کی آبادی سے متصل تھا ان کی حفاظت کے لیے حضرت حسانؓ متعین کر دیے گئے تھے، یہود نے یہ دیکھ کر کہ تمام جمعیت آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہے قلعہ پر حملہ کر دیا ایک یہودی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ گیا اور قلعہ پر حملہ کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا حضرت صفیہؓ نے دیکھ لیا حضرت حسانؓ سے کہا اتر کر قتل کر دو، ورنہ یہ جا کر دشمنوں کو پتہ دے گا حضرت حسانؓ نے معذوری ظاہر کی تب حضرت صفیہؓ نے خیمہ کی چوب اکھاڑ لی اور اتر کر یہودی کے سر پر اس زور سے مارا کہ سر پھٹ گیا حضرت صفیہؓ چلی آئیں اور حضرت حسانؓ سے کہا ہتھیار اور کپڑے لے آؤ حضرت حسانؓ تامل کیا تو کہنے لگی کہ اچھا جاؤ ”اس کا سر کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینک دو تا کہ یہودی مرعوب ہو جائیں“ لیکن یہ خدمت حضرت صفیہؓ ہی کو انجام دینی پڑی۔ یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ قلعہ میں فوج متعین ہے اس خیال سے پھر انھوں نے حملہ کی جرأت نہ کی۔

اس واقعہ سے حضرت حسانؓ کے مقابلے حضرت صفیہؓ کی جرأت و ہمت،

اصابت رائے اور قوت فیصلہ کا اندازہ ہوتا ہے جو کہ کامیابی کا سبب بنا اسی کی روشنی میں ہم میدانِ سیاست میں خواتین کی شرکت اور اس کے تعاون کے اصول متعین کر سکتے ہیں۔[۲۲]

حضرت ازدہؓ بنت حارث جن کی تدبیر سے اہل ملیسان کے حوصلے پست ہو گئے، ہوا یوں کہ حضرت مغیرہؓ عورتوں کو میدان جنگ سے بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے لیکن گھمسان کے وقت ازدہ نے کہا: ''کہ اس وقت اگر ہم مسلمانوں کی مدد کرتے تو نہایت مناسب تھا یہ کہہ کر انھوں نے اپنے دوپٹے کا ایک بڑا علم بنایا دوسری خواتین نے بھی اپنے اپنے دوپٹوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈے بنا لیے پھر یہ سب پرچم اڑاتی ہوئی موقع جنگ پر پہنچ گئیں اہل ملیسان نے سمجھا کہ مسلمانوں کی مدد کے لیے تازہ دم فوج پہنچ گئی اور وہ میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ (طبری کے مطابق یہ معرکہ دریائے دجلہ کے قریب اہل میسان اور مسلمانوں کے درمیان پیش آیا)۔[۲۳]

مذکورہ واقعہ عورت کی سیاسی سمجھ داری کا منہ بولتا ثبوت ہے تمام واقعات اس بات کے گواہ ہیں میدانِ سیاست میں خواتین شریک ہوسکتی ہیں اور مردوں سے کہیں بہتر اور جید مشورے پیش کرسکتی ہیں اور جرأت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔ سوائے ملکی سربراہی کے۔

دوسرا اہم نکتہ مذکورہ واقعہ سے سمجھ میں آتا ہے کہ جس طرح ازدہ بنت حارث نے سیاسی قوت کو بڑھانے اور ظاہر کرنے کے لیے میدان جنگ کا رخ کیا اسی طرح اسلامی حکومت کو غالب کرنے یا اسلام کو تقویت پہچانے کے لیے خواتین مظاہروں ریلی، خاموش احتجاج میں اسلامی قواعد کا پاس رکھتے ہوئے حصہ لے سکتی ہیں۔ جو کہ دور حاضر کی شکلیں ہیں۔

انتظامی امور پر تقرری

حضرت شفاؓ بنت عبداللہ عدویہ کو بارگاہ نبوی میں تقرب حاصل تھا، حضرت عمرؓ کو

حضرت شفاؓ کی فضیلت اور رائے کا بڑا پاس تھا اور آپ کو بازار کا نگراں مقرر کیا تھا۔ ۲۴؎

حضرت نعم بنت قناصؓ معرکوں میں شریک ہوئیں جنگ یرموک میں رومیوں کا دلیری سے مقابلہ کیا انتظامی صلاحیتوں کی مالک تھیں چنانچہ بعض موقعوں پر اسلامی لشکر کی رسد کا اہتمام ان کے سپرد کیا گیا۔ ۲۵؎

حضرت سمہراء بنت نہیکؓ اسدیہ جب بازار سے گزرتیں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتی تھیں ان کے پاس ایک کوڑا تھا جس سے ان لوگوں کو مارتی تھیں جو کسی برے کام میں مشغول ہوتے۔ ۲۶؎

واقعات بتاتے ہیں کہ خواتین میں Administration کی صلاحیتیں بہتر ہوتی ہیں جن کو استعمال میں لانے کے مواقع فراہم کیے گئے۔

عوامی معاملات میں شمولیت کا حق

عہد رسالت میں خواتین نے عوامی معاملات میں سنجیدگی سے حصہ لیا اور محمد ﷺ سے بحث کی۔

یہ اشارہ ہے حضرت خولہؓ بنت مالک بن ثعلبہ کے واقعہ کی طرف جن کے خاوند حضرت اوسؓ بن صامت نے ان سے ظہار کرلیا تھا۔ حضرت خولہ سخت پریشان ہوئیں اس وقت تک اس کی بابت کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا اس لیے وہ نبی ﷺ کے پاس آئیں تو آپ نے بھی کچھ توقف کیا اور وہ آپ ﷺ سے بحث و تکرار کرتی رہیں جس پر سورۂ مجادلہ کی آیات نازل ہوئیں۔ جن میں ظہار کی تفصیلات ہیں۔ ۲۷؎

خلیفۂ عمر سے ان کے دور خلافت میں ایک خاتون نے مسجد میں پوری جرأت سے اپنا موقف بیان کیا اور بہت سے اشخاص کے سامنے اس نکتہ کو دلائل سے ثابت کیا جس پر حضرت عمرؓ نے کہا: عورت صحیح ہے اور عمر غلط ہے۔ ۲۸؎

یہ واقعات Public Affairs میں عورت کی شمولیت کے حق میں ہیں۔

خواتین کی نمائندگی خواتین کے ذریعہ

حضرت اسماء بنت یزید کی فصیح البیانی اور حسن تقریر کا کون انکار کرسکتا ہے جس کا اعتراف واستحسان سید المرسلین نے فرمایا جب کہ آپ نے خواتین کی نمائندگی کی اور دین کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

استیعاب میں ہے کہ:

"کانت من ذوات العقل والدین روی عنها أنها أتت النبی ﷺ فقالت: إنی رسول من ورائی من جماعة المسلمین فلهن یقلن بقولی وعلی مثل رائی إن الله تعالیٰ بعثک إلی الرجال والنساء، فامنا بک واتبعناک، ونحن معشر النساء محصورات محذورات، قواعد بیوت وموضع شهوات الرجال .... فالتفت رسول الله وجهه إلی اصحابه فقال: هل سمعتم مقالة امرأة أحسن سؤالا عن بینها من هذه فقالوا: بلی۔(والله) یا رسول الله فقال رسول الله: انصر فی یا اسماء وأعلمی من ورائک من النساء ان حسن تبعل إحداکن لزوجها، وطلبها لمرضاته، واتباء ها لموافقته یعدل کل ما ذکرت للرجال فانصرفت أسماء وهی تهلل وتکبراً استبشاراً بما قال لها رسول الله"[۳۰]

خواتین کے اندر بھی قوت گویائی اور خطابت کا ملکہ پایا جاتا ہے اور اپنی بات کو سربراہ حکومت کے سامنے پیش کرنے کا حق رکھتی ہے اور خواتین کے مسائل سے آگاہ کرسکتی ہے۔

دفاعی ذمہ داریوں میں نمائندگی کا حق

ریاست کے دفاع اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری گرچہ خواتین پر نہیں ہے

لیکن دین کی بقاء وحفاظت کے لیے خواتین مردوں کا تعاون کرسکتی ہیں۔ دورنبویؐ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

الف: بذاتِ خود میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ

حضرت ام عمارہ کا فاروق اعظم اور تمام صحابہ حد درجہ احترام کرتے تھے اور انھیں خاتون احد کہہ کر یاد کیا کرتے تھے حضرت عمر فرماتے ہیں غزوہ احد کے بعد میں نے رسول اللہ سے سنا تھا:

"ماالتفت یمیناً ولا شمالاً الا وانا اراھا تقابل ذونی"

(دائیں بائیں جس طرح بھی میں نے رخ کیا ام عمارہ کو اپنی مدافعت میں لڑتے دیکھا۔)

معرکہ مسیلمہ کذاب کے موقع پر جوش و جذبہ کے ساتھ لڑتی رہیں حتی کہ بارہ زخم آئے اور ایک ہاتھ بھی کلائی سے کٹ گیا۔[۳۱]

حضرت لبنیٰؓ بنت سوار جنگ شحورا میں مردوں کے دوش بدوش جانبازی سے لڑیں اور کئی رومیوں کو قتل کیا۔[۳۲]

اسی طرح حضرت نعمؓ بنت قناص، حضرت سلمیٰؓ، حضرت ام ابانؓ معرکوں میں شریک ہوئیں اور بے مثل شجاعت کے مظاہرے کیے۔[۳۳]

(ب): مجاہدین کی طبی خدمات

حضرت ام عطیہ ان چند خواتین میں تھیں جنھیں حضور ﷺ غزوات میں اپنے ساتھ رکھتے تھے آپ مجاہدین کے کجاووں کی دیکھ بھال کے لیے پیچھے رہتیں، کھانا پکاتیں، زخمیوں کا علاج کرتیں اور مصیبت زدوں کی نگہداشت کرتیں۔[۳۴]

ان کے ساتھ ساتھ حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت ربیعؓ بنت معوذ، ام سلیمؓ، ام سلیطؓ، حمنہؓ بنت جحش، غیرہ کی شرکت سے متعلق احادیث موجود ہیں۔[۳۵]

تقریر کے ذریعہ دین کی مدافعت پر ترغیب

حضرت اسماء بنت ابی بکر کے الفاظ جو انھوں نے اپنے بیٹے عبداللہ بن زبیر سے کہے تھے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی جب کہ مقابلہ حجاج بن یوسف ثقفی سے تھا۔

حضرت اسماء کے الفاظ:

اے میرے فرزند! اگر تم حق پر ہو تو مردوں کی طرح لڑ کر رتبۂ شہادت پر فائز ہو جاؤ اور کسی قسم کی ذلت برداشت نہ کرو اور اگر یہ تمہارا کھکھڑ دنیا طلبی کے لیے تھا تو تم سے برا کوئی شخص نہیں جس نے اپنی عافیت بھی خراب کی اور دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالا۔

ابن زبیر نے عرض کیا:

اماں جان! میں موت سے نہیں ڈرتا صرف یہ خیال ہے کہ میری موت کے بعد دشمن میری لاش کا مثلہ کریں گے اور صلیب پہ لٹکائیں گے جس سے آپ کو رنج ہو گا۔

بہادر ماں نے کہا:

بیٹے جب بکری ذبح کر ڈالی جائے تو پھر اس کی کھال کھینچی جائے یا اس کے جسم کے ٹکڑے کیے جائیں اسے کیا پروا؟ تم اللہ پر بھروسہ کر کے اپنا کام کیے جاؤ راہ حق میں تلواروں سے قیمہ ہونا گمراہوں کی غلامی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ موت کے خوف سے غلامی کی ذلت کبھی قبول نہیں کرنا۔

اپنے لخت جگر کو گلے لگایا اور ان کا منہ چوما اس وقت حضرت عبداللہ نے زرہ پہن رکھی تھی۔ حضرت اسماء کا ہاتھ ان کی زرہ پر پڑا تو پوچھا: بیٹے یہ تمہارے جسم پر کیا ہے؟ عرض کیا زرہ ہے تا کہ دشمن کے حربوں سے بچاؤ ہو۔

حضرت اسماء نے فرمایا:

بیٹے اللہ کی راہ میں شہید ہونے کے لیے نکلتے ہو اور ان عارضی چیزوں کا سہارا لیتے ہو۔

اسی طرح حضرت خنساءؓ بنت عمرو نے جنگ قادسیہ میں اپنے چار فرزندوں کو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے روانہ کیا۔[۳۶]

امان دہی کا حق

خواتین کے ریاستی کردار کا نمایاں اظہار اسے آپ ﷺ کی طرف سے عطا کردہ حق امان دہی سے بھی ہوتا ہے۔

حضرت ام ہانیؓ بنت ابی طالب نے اپنے دیوروں میں سے دو اشخاص کو امان دی اور رسول اکرم ﷺ نے ان کی امان کو برقرار رکھتے ہوئے فرمایا:

''قد أمنا من أمنت''

(اے ام ہانی! جس کو تم نے امان دی اسی کو ہم نے بھی امان دی۔)[۳۷]

عالمی سطح پر خواتین کے سیاسی حقوق کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلم ممالک میں عرصۂ دراز سے خواتین سیاسی عہدوں پر فاز ہیں اور میدان سیاست میں خواتین کی دلچسپی اس بات پر شاہد ہے کہ خواتین کے طبقہ میں اس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ لہٰذا مسلم ممالک کا مختصر سا جائزہ پیش خدمت ہے۔

تیرہویں صدی میں شجاع الدر مصر میں کوئین اورفا Queen orpha یمن میں رضیہ سلطانہ دہلی میں اور بنگلہ دیش، پاکستان اور ترکی میں بھی خواتین نے قائدانہ رول ادا کیا۔ جہان السادہ جو کہ انور السادہ کی زوجہ محترمہ ہیں مصری حکومت میں اپنے شوہر کے ساتھ ریاستی معاملات میں شامل ہیں۔ Wassila Beerguiba جو کہ Habib Bourgiba کی شریک حیات ہیں تیونس میں اپنے زوج محترم کے ساتھ حکومتی امور سے منسلک رہیں۔ بہت سے عرب ممالک نے خواتین کو ووٹ دینے کی اجازت دی جس کے ذریعہ ۱۸۵۷ء میں مصر کی حکومت میں (عرب دنیا) Rawya Ateya پہلی ممبر پارلیمنٹ خاتون منتخب ہوئیں۔

International Parliamentary Union 2005, کے مطابق پوری

عرب دنیا میں خواتین ممبر پارلیمنٹ 6.5% تھیں تیونس میں 23% مصر میں 4% خواتین پارلیمنٹ میں رہیں۔

مسلم اکثریت والے ممالک انڈونیشیا، پاکستان، بنگلہ دیش، ترکی، قزاقستان، مصر اور افغانستان میں خواتین کو میدان سیاست کے مختلف مناسب پر دیکھا جاسکتا ہے۔ افغانستان میں خواتین وزرات، گورنر اور بزنس مین ہیں حتی کہ عذر جافری صدر بلدیہ کے عہدے پر فائز ہیں۔

انڈونیشیا کی اسلامی تنظیم نھضۃ العلماء عبدالرحمٰن واحد کی والدہ مرحومہ کی سرپرستی میں رہی جو کہ ۱۹۸۲-۱۹۶۰ء تک ممبر پارلیمنٹ رہیں۔عبدالرحمٰن کی بہن عائشہ بھی ممبر پارلیمنٹ رہیں۔نھضۃ العلماء کی صدر رہیں اور اس تنظیم کی ممبران خواتین کی اکثریت پر مشتمل ہے۔

اس کے علاوہ سیاسی اداروں میں انڈونیشیا کی خواتین موجود رہیں ہیں۔

Institutions	No. of Women	
DPD Cupper House	27	21%
Constituent assembly	63	11.5%
Supreme Court	8	14.8%
National Election Commission	2	18.1%
Governor	0	0
Mayor	5	1.5%
Civil Service	1883	7%
Judges	536	16.2
State Civil Court	35	13.4

ترکی میں ۱۹۹۱-۱۹۳۵ء تک خواتین ممبر پارلیمنٹ رہیں البتہ ۲۰۱۱-۱۹۹۵ء

کے مابین خواتین کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔

Year	No. of Women MP	Ratio to Total
1995	13	2.4%
1999	22	4%
2000	24	4.4%
2007	46	9%
2011	78	14%

Name	Ministry
Turkan	Minister of Health and Social Security
Akyol	(1971-1971)
(Born	Minister of State (Family (1992-1993)
1928)	
Nermin	Minister of Culture (1974-1975)
Neftci	
Imren	Minister of State (1991-1996)
Aykut	Minister of Labour and Social Security
	(1987-1991)
	Minister of Envioronment (1997-1999)
Guler Ileri	Minister of State (1991-1993)
Isilay	Minister of State (1995-1996)
Saygih	Minister of Envioronment (1997-1999)
	Minister of Tourism (1996)

Tansu Ciller	Minister of Foreign Affairs (1996-1997)
Meral Aksener	Minister of Interior (1996-1997)
Aysel Celiker	Minister of Justice (2002)
Nimet Bas	Minister of National Education (1009-2011)
Fatima Sahin	Minister of Family and Social Policies (2011-Present)

خلاصۂ بحث

ہدایات: عہد رسالت کی خواتین نے شرعی دائرے میں رہتے ہوئے جس طرح اپنی صلاحیتوں کو استعمال کیا اسی طرح آج کی عورت بھی کر سکتی ہے۔

شرعی دائرے: خاندان کی ذمہ داری، اختلاط سے اجتناب، پردہ کا اہتمام محرم کے ساتھ سفر۔

ذمہ داریاں:

- عمومی مسائل میں اپنی رائے کا اظہار خواہ وتحریر کے ذریعہ ہو یا تقریر کے یا پھر مظاہرہ واسٹرائک۔
- امت مسلمہ کی نیابت کے لیے باصلاحیت اور صحیح الفکر امیدوار کو منتخب کرنا بذریعہ ووٹ۔
- امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی۔

- اس سیاسی جماعت کو تقویت پہنچانا جس کے اصول و تعلیمات میں معاشرے کے لیے خیر و فلاح مضمر ہو۔

حواشی

۱۔ سورۃ التوبہ: ۷۱
۲۔ ابی عبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی، سنن النسائی، کتاب آداب القضاۃ، باب النہی عن استعمال النساء فی الحکم
۳۔ قاضی محمد شوکانی، نیل الاوطار، جز ثامن، لبنان، ص ۲۶۵
۴۔ ابن حزم، الفصل فی الملل والاہوا والنحل، ج ۴، ص ۱۱۰
۵۔ ڈاکٹر محمد ملتاجی، مکانۃ المرأۃ فی القرآن الکریم والسنۃ، فرید بک ڈپو، ص ۳۳۳
۶۔ عبدالحلیم محمد باوشقہ، خواتین کی آزادی عہد رسالت میں، المعہد العالمی للفکر الاسلامی، ص ۳۶۹
۷۔ ابی الحسین مسلم بن الحجاج القشیری، صحیح مسلم، کتاب الحج، باب سفر المرأۃ مع محرم الی حج
۸۔ سنن النسائی، باب بیعۃ النساء، ج ۳
۹۔ سورۃ الممتحنۃ: ۱۲
۱۰۔ محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح بخاری، تفسیر سورۃ الممتحنۃ
۱۱۔ ابن الاثیر جزری، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہ، مکتبہ اسلامیہ طہران، ج ۵، ص ۳۹۵
۱۲۔ محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح بخاری، باب الاحکام
۱۳۔ سورۃ التوبۃ: ۷۱
۱۴۔ جلال الدین سیوطی، تاریخ الخلفاء، انور پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ص ۲۲۳
۱۵۔ ڈاکٹر محمد بلتاجی، ص ۳۸۴
۱۶۔ قاضی محمد شوکانی، نیل الاوطار، دار احیاء التراث العربی، لبنان، جزء سادس، ص ۱۷۲
۱۷۔ سعید انصاری، سیر الصحابیات، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ص ۱۱
۱۸۔ صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل العرب

۱۹۔ محمد بن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، مطبوعہ نہضۃ مصر، جزء رابع، ص ۱۸۶۹

۲۰۔ طالب الہاشمی، تذکار صحابیات، مرکزی مکتبہ اسلامیہ دہلی، ص ۲۹۱

۲۱۔ ایضاً، ص ۵۱۳

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ محمد بن عبدالبر، الاستیعاب، جزء رابع، ص ۱۸۶۹

۲۵۔ طالب الہاشمی، ص ۵۲۷

۲۶۔ محمد بن عبدالبر، الاستیعاب، جزء رابع، ص ۱۸۶۳

۲۷۔ سورۃ المجادلۃ

۲۹۔ شوکانی، نیل الاوطار، ص ۱۷۲

۳۰۔ الاستیعاب، ص ۱۷۸۸

۳۱۔ سعید انصاری، سیر الصحابیات، ص ۱۳۳

۳۲۔ طالب الہاشمی، تذکار صحابیات، ص ۲۹۱

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۹۱

۳۴۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب النساء الخازیات

۳۵۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی وکتاب الجہاد

۳۶۔ طالب الہاشمی، تذکار صحابیات، ص ۲۹۲

۳۷۔ ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن موسیٰ الترمذی، الجامع الترمذی، ۴:۱۴۱، وصحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ فی الثواب الواحد

☆☆☆

دنیا میں مسلم اقلیتیں۔مسائل اور حل

غطریف شہباز ندوی*

اصل موضوع پر گفتگو سے پہلے مناسب ہے کہ پہلے اقلیت کی ایک تعریف کردی جائے تاکہ بعد کے مباحث اسی تعریف کے فریم ورک میں دیکھے جاسکیں۔

اقلیت کی تعریف

اسلامی معاشیات کے ایک ماہر لکھتے ہیں: ''اکثریت اور اقلیت بنیادی طور پر عددی تصورات ہیں۔جن کا ارتقاء اسلامی روایت سے باہر ہوا ہے۔لوگوں کے ایسے گروہ کو جن کے درمیان کچھ مشترک نسلی، مذہبی، لسانی یا تہذیبی خصائص ہوں اور جو کسی بڑی آبادی کا جز ہوں، عام طور پر اقلیت کہا جاتا ہے۔تاہم اکثریت اور اقلیت صرف عددی تصورات نہیں ہیں۔ان کے ساتھ اہم سماجیاتی اور تہذیبی مضمرات بھی وابستہ ہوتے ہیں''۔[1]

اس تعریف کے مطابق کسی گروہ کے اقلیت کہلانے کے لیے مندرجہ ذیل شرطیں ضروری ہوئیں:

1 - وہ گروہ اپنی مطلق شکل میں کسی بڑی انسانی آبادی کا ایک حصہ ہو اور نسبۃً تعداد میں کم ہو۔

2 ۔اس گروہ میں کچھ مشترکہ خصائص ہوں جن کی بنیاد پر اس جماعت کو یا اس کے ممبران کو دوسروں سے امتیازی شناخت مل سکے۔مثال کے طور وہ انسانی جماعت کوئی خاص زبان بولتی ہو تو اس کو لسانی اقلیت کہا جائے گا۔اس ملک یا خطہ کے عام رنگ کے

---

* معاون ایڈیٹر، ماہنامہ افکار ملی، نئی دہلی

برخلاف اس انسانی جماعت کا کوئی خاص رنگ ہوتو اس کو نسلی اقلیت کہا جائے گا وغیرہ۔ بعض علاقوں میں یہ امتیازی خصائص ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً عقیدہ، رنگ، نسل، تہذیب اور زبان وغیرہ۔

مسلم اقلیتیں

اس تعریف کی رو سے مسلم اقلیتوں پر ایک نظر ڈالیے تو مذکورہ بالا ساری خصوصیتیں الگ الگ خطوں میں ملتی ہیں مگر ان سب میں ایک قدر مشترک ایسی ہے جو ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہر جگہ کے مسلمانوں کی بنیادی شناخت ان کی اسلامی شناخت ہی ہے۔ ان کے تہذیبی وجود کے دوسرے پہلو مثال کے طور پر زبان رنگ و نسل، ثقافت اور علاقہ وغیرہ سب ان کی اصل شناخت کے تابع ہیں۔ اسلام کے رشتہ نے ان کو ایک دوسرے سے وابستہ کر رکھا ہے۔ جس کے طفیل وہ نہ صرف مشترکہ عقیدہ، انداز برتاؤ اور آدرش رکھتے ہیں بلکہ ان کی تاریخ بھی مشترک ہے اور وہ ایک مشترک ماضی اور مشترک مستقبل بھی رکھتے ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس مشترکہ پہچان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''انڈونیشیا سے مراکش تک چلے جایئے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے تمام ماننے والوں کی ایک مشترکہ تہذیب ہے۔ اس تہذیب کے بنیادی اصول تمام مسلمان ملکوں میں جاری وساری ہیں۔ ایک مسلمان خواہ کسی بھی ملک میں جائے اذان کی آواز اس کے کانوں میں آتے ہی فوراً اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں اس کے اپنے بھائی موجود ہیں، ایک مسجد بھی یہاں ضرور پائی جاتی ہے جس کی جماعت کا وہ ویسا ہی ممبر ہے جیسا کہ اس ملک کے باشندوں میں سے کوئی ہوسکتا ہے، وہ جا کر اس میں شریک ہوتا ہے تو اُسے وہاں کوئی اجنبی نہیں سمجھتا بلکہ یہ معلوم ہونے پر کہ وہ ایک دوسرے ملک سے آیا ہے مسجد کے تمام حاضرین دوڑ کے

آتے ہیں اور محبت سے گلے لگاتے ہیں''۔[۲]

ماہر سماجیات پروفیسر عبدالرحمٰن مومن کے مطابق: ''اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ایک ارب 80 کروڑ ہے ۔ان میں سے کم وبیش 60 کروڑ مسلمان غیر اسلامی ملکوں میں رہتے ہیں جن میں سے مغربی ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد تقریباً 5 کروڑ ہے ۔اس لحاظ سے مغربی ملکوں میں رہائش پزیر مسلم اقلیتوں کا تناسب تقریباً 8 فیصد ہے۔نوے فیصد سے زیادہ مسلمان اقلیتیں ایشیائی وافریقی ملکوں میں رہتی ہیں''۔[۳]

پروفیسر عبدالرؤف ظفر کا خیال ہے کہ ''اس وقت دنیا کے 90 غیر مسلم ممالک میں اقلیت کی صورت میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد 350 ملین بتائی گئی ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کا ایک چوتھائی حصہ ہیں ان میں سے اکثریت ایشیا میں آباد ہے''[۴]

اس مطالعہ کی ضرورت یوں ہے کہ دنیا بھر میں آج کم وبیش 40 فیصد مسلمان اقلیتوں میں رہتے ہیں ۔اوران ملکوں میں رہتے ہیں جہاں اکثریت غیر مسلموں کی ہے اور جہاں زیادہ تر اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے اور اکثر ممالک میں سیکولر و جمہوری نظام حکومت چل رہا ہے۔البتہ یہ واضح رہنا چاہیے کہ مسلمان اقلیتوں کا ظاہرہ (Phenomenon) کوئی نیا ظاہرہ نہیں ہے بلکہ مسلمان اقلیتیں ہر دور میں موجود رہی ہیں ۔ اور ہر دور میں اپنا کردار ادا کرتی رہی ہیں۔[۵]

جو مسلمان غیر مسلم ممالک میں موجود ہیں وہ تین طرح کے ہیں۔ یہ تین حصے مختلف تاریخی پس منظر سے آتے ہیں۔

1-ان میں ایک اقلیت تو وہ ہے جس کے علاقے بہت پہلے آزاد مسلم ملکوں کی حیثیت رکھتے تھے اوراب وہ کسی غیر مسلم طاقت کے مقبوضات میں شامل ہیں مثال کے طور پر مشرقی یوروپ میں آباد بلغاریہ ،یونان ،سربیا، مونٹی نیگرو اور کروشیا کے مسلمان جو پہلے سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھے ۔اوراب ان علاقوں میں اقلیت کے طور پر رہ رہے ہیں۔

اسی طرح ایشیا میں ہندوستان کے مسلمان اور روس کی مختلف ریاستیں یا مثلاً جنوبی فلپائن کے یا تھائی لینڈ کے مسلمان جن کی ماضی میں آزاد ریاستیں تھیں اور اب وہ ختم ہوگئیں۔

2- دوسرا بڑا حصہ ان مسلمانوں کا ہے جو مسلمان علاقوں اور ملکوں سے اعلیٰ تعلیم، تجارت، ہجرت یا کسی اور سبب سے نقل مکانی کر کے غیر مسلم ملکوں میں جا کر آباد ہو گئے ہیں۔ ان میں کچھ یورپ میں کچھ امریکہ میں کچھ جنوبی افریقہ میں اور کچھ آسٹریلیا، مشرق بعید، جزائر شرق الہند، جزائر غرب الہند وغیرہ میں آباد ہیں۔

3- تیسرے وہ مسلمان ہیں جو مقامی طور پر اسلام قبول کر کے نئی آبادیوں میں پیدا ہوئے۔ دنیا کے تمام کے تمام خطوں میں آج بھی لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ اور ان میں بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے جو اسلام کا مطالعہ کر کے اس دین میں داخل ہو رہے ہیں۔[۶]

مسلم اقلیتوں کے مسائل عالمی سطح پر

پروفیسر عبدالرحمٰن مومن کے مطابق: ''دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمان اقلیتیں جن مسائل و معاملات سے دوچار ہیں ان کی نوعیت دو قسم کی ہے۔ ایک طرف وہ مسائل و معاملات ہیں جو عمومی طور پر مسلمان اقلیتوں کو درپیش ہیں۔ دوسری طرف وہ مسائل ہیں جو ملکی یا علاقائی نوعیت رکھتے ہیں''[۷]۔ عالمی سطح پر مسلمان اقلیتوں کو جو مسائل عمومی طور پر درپیش ہیں وہ یہ ہیں:

(ا) ریاستی جبر کا مسئلہ: مثال کے طور پر چین کے علاقہ سنکیانگ میں مسلمانوں کی تعداد 80 ملین سے زیادہ ہے مگر حکومت کی پابندیاں اس قدر ہیں اور جبر کا وہ ماحول ہے کہ ان کا تعلق باقی اسلامی دنیا سے تقریباً کٹا ہوا سا ہے۔ مشرقی چین میں جس کو ہم ترکستان یا سنکیانگ کہتے ہیں مسلمان اکثریت میں آباد ہیں مگر حال ہی میں چین کی حکومت نے اس علاقہ میں ۲۰ ملین چینی باشندوں کو لا کر یوں بسا دیا ہے کہ مسلمان اقلیت میں بدل جائیں۔ یہاں بھی مسلمان بیس ملین سے زیادہ ہیں مگر حکومت نے یہاں ان پر ایسی مذہبی

پابندیاں لگا رکھی ہیں کہ یہاں کی صورت حال فلسطین سے مشابہ ہوگئی ہے، فرق یہ ہے کہ فلسطین کے بارے میں مسلمانوں کا بچہ بچہ جانتا ہے اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔[۸] اسی طرح برما، سری لنکا اور فلپائن میں بسنے والے مسلمان مختلف مشکلات اور ریاستی جبر کا شکار ہیں۔ برما کی کیمونسٹ فوجی حکمراں تو ان پر ظلم وجبر کی حد کیے ہوئے ہیں۔ جن کی کچھ کچھ جھلکیاں اب میڈیا میں آنے لگی ہیں۔اس نے دو لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو جبراً ملک سے باہر نکال دیا اب وہ بنگلا دیش میں پناہ گزیں ہیں۔ کمبوڈیا میں کمیونسٹوں نے سات لاکھ مسلمانوں کا نام ونشان مٹا دیا۔فلپائن میں بھی وہ کئی دہائیوں سے ریاستی جبر کا شکار رہے ہیں۔ وہاں آزادی کی تحریک بھی چلی اور اب فلپائن کے مورو نامی علاقہ میں مسلمانوں اور فلپین کی حکومت میں ایک معاہدہ ہوا ہے۔[۹]

یوروپ کے مختلف علاقوں میں عیسائی تعصبات مسلمانوں کے خلاف اپنا کام کر رہے ہیں۔ بوسینا ہرزے گووینا اور کوسوو میں جو کچھ ہوا اس سے پوری دنیا واقف ہے۔ اس کے علاوہ بلغاریہ میں بھی مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی اور پروفیسر عبدالروف ظفر کے مطابق ایک لاکھ مسلمان ملک بدر کیے گئے حکومت کے مطابق وہاں ان کی آٹھ لاکھ بیس ہزار ہے۔ظفر کہتے ہیں کہ ”یہاں مسلمانوں کی حقیقی تعداد تین ملین سے زیادہ ہے“[۱۰]

غیر مسلمان اقلیتوں کا تقریباً نوے فیصد حصہ برصغیر پاکستان و ہند کے مسلمانوں، عربوں اور ترکوں پر مشتمل ہے۔ان تمام اقلیتوں میں برصغیر کے مسلمان سب سے زیادہ فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ان کے بعد عرب اور ترک ، پاکستان و ہند کے مسلمان حسب ذیل ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہانگ کانگ ،تھائی لینڈ، سنگاپور، برما، نیپال، سری لنکا، آسٹریلیا، فیجی، نیوزی لینڈ، کینیا، یوگنڈا، تنزانیہ، جنوبی افریقہ، زیمبیا، برطانیہ، ہالینڈ، پرتگال، ڈنمارک، ناروے، سوئٹزرلینڈ، کینیڈا، ریاستہائے متحدہ امریکہ، بارباڈوس، گریناڈا، سرینام اور گویانا۔[۱۱]

ڈاکٹر کتانی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ :یونان کے ترک مسلمان یوروپ میں سب سے زیادہ منظّم ہیں اگرچہ ان کو اسلام کی دعوت وتبلیغ سے دلچسپی نہیں لیکن

انہوں نے اپنے دین کی پوری حفاظت کی ہے۔یوروپ کے دوسرے حصوں میں خصوصاً آسٹریا، بلجیم، ہالینڈ اور جرمنی میں وہ بڑی تعداد میں آباد ہیں اور دینی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔کنیڈا اور امریکہ میں بھی ترک مسلمان بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ثروت صولت دنیا میں مسلم اقلیتیں) پروفیسر عبدالرؤف ظفر کے مطابق ''یوروپ وامریکہ کے مسلمانوں کو اگرچہ مکمل مذہبی آزادی ہے لیکن وہاں ان کو ایک ایسے معاشرہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو دینی زبان اور رسم ورواج سب میں ان سے مختلف ہے۔اور اس کے ساتھ ہی ایک ترقی یافتہ معاشرہ ہے جو ترقی پذیر معاشروں پر اثر انداز تو ہوسکتا ہے لیکن خود بہت کم اثر قبول کرتا ہے۔۱۲

۲۔رابطہ کی کمی (Generation Gap): مغربی ماحول میں بسنے والے مسلم خاندانوں میں والدین اور بچوں کے درمیان رابطہ کی کمی ہے مغرب میں فرد کی مطلق آزادی اور والدین کی حاکمیت کا خاتمہ جیسے نظریات کی حکمرانی ہے،وہ اسلام سے نسبت کی انکاری نہیں تو فکر وعقیدہ میں اسلام کی علمبردار بھی نہیں۔

(۳) ماحول کا اختلاف: والدین نقل مکانی کر کے گئے ہیں۔جبکہ اولاد مغرب کے ماحول میں پلی بڑھی ہے۔والدین کا اصرار ہے کہ وہ اس مخصوص تربیتی انداز کو جس پر انہوں نے خود پرورش پائی ہے۔مسلط کر کے رہیں گے۔اسلام اور اس کے اصولوں سے ناواقفیت کے نتیجہ میں اسلامی اصول اور اس کی اخلاقیات کو مختلف تاریخی وسماجی ماحول سے مربوط تقلید کی عادات ورسوم سے خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔مثلاً ایک ہی معاملہ میں بیٹی اور بیٹے میں فرق کیا جاتا ہے۔بیٹی پر تو سہیلیوں سے ملنے پر پابندی لگائی جاتی ہے اور بیٹے کو مرد وزن ہر ایک سے ملنے کی کھلی آزادی دی جاتی ہے خواہ وہ رات گئے تک باہر کیوں نہ رہے''۔۱۳ اس کے برخلاف کچھ والدین ''انتہائی ماڈرن اور جدید اذہان کے لوگ ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ جب یوروپ میں رہنا ہے تو کیوں نہ ان کی اولاد اس ماحول کو مکمل طور پر جذب کر لے۔۱۴

امریکی کمیونٹی میں رہنے والے مسلمان مختلف قسم کے معاشرتی اور تہذیبی مسائل

سے دوچار ہیں۔ مسلم بچے ہسپتالوں میں پیدا ہوتے ہیں لیکن کفن ودفن میں بلدیاتی قواعد کے مطابق میت کو فوراً ہی زمین دوز فیونرل ہوم میں لایا جاتا ہے۔ سوگواران کے لیے ہال کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ مرنے والے کے چہرہ پر میک اپ کیا جاتا ہے۔ تاکہ لواحقین صدمہ سے دوچار نہ ہوں۔ میت کو سیاہ لمبی گاڑی میں رکھ کر جلوس کی صورت میں لایا جاتا ہے' ۱۵؎ مولانا علی میاںؒ نے بھی اسی طرح کا اپنا ایک مشاہدہ نقل کیا ہے۔

مقامی سیاست میں بھرپور کردار: پروفیسر رؤف ظفر مشورہ دیتے ہیں کہ ''مسلم کمیونٹی کو امریکہ کی سیاست میں حصہ لینا ہوگا، مضبوط سیاسی تنظیمیں بنا کر دونوں امریکی پارٹیوں ڈیموکریٹک اور ری پبلکن میں سرگرم عمل ہونا چاہیے اور حکومتی تعلقات استوار کرنے ہوں گے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ: امت مسلمہ کو سائنس وٹیکنالوجی اور جدید علوم سے وابستہ ہونا چاہیے اور یہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں۔ ۱۶؎

یوروپ میں بھی کوریا اور جاپان کی طرح تعلیم یافتہ طبقہ ذاتی مطالعہ کے نتیجہ میں مسلمان ہورہا ہے۔ برطانیہ میں نومسلموں کی تعداد چار ہزار، فرانس میں آٹھ ہزار، جرمنی میں بارہ سو، سوئٹزرلینڈ میں تین ہزار، ڈنمارک میں تین ہزار، اٹلی میں ایک ہزار اور اسپین میں پانچ سو ہے ۱۷؎ بعض مستشرقین نے بھی اسلام قبول کیا ہے اور اسلام کی علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان میں آسٹریا کے محمد اسد، فرانس کے رینے گینوں (عبدالواحد یحیٰ) راجر گارودی، ہنگری کے عبدالکریم جرمانوس، انگلینڈ کے محمد مارمدیوک پکتھال، امریکہ کے ٹی بی ارنگ، مارٹن لنگس (ابوبکر) مریم جمیلہ مرحومہ (جو پاکستان ہجرت کرکے آگئی تھیں)۔ اور جرمنی کی فاطمہ ہیرن ہیں۔ امریکہ میں افریقہ نژاد نیشن آف اسلام بھی قابل ذکر ہے جس کے بانی عالی جاہ محمد ایک منحرف شخص تھے مگر ان کے بیٹے وارث دین محمد نے صحیح عقائد اختیار کرلیے ہیں۔ ان میں مالکم ایکس بھی تھے جن کا اسلامی نام پیر شہباز ملک ہے۔ یہ تنظیم ایک ہفتہ روزہ امریکن مسلم جرنل بھی شائع کرتی ہے۔ امریکہ اور یوروپ کے مختلف ملکوں میں مساجد، اور اسلامک سینٹروں کی بھی کافی تعداد موجود ہے۔ ۱۸؎

مزید غیر اسلامی ماحول میں دینی وتہذیبی شناخت کا تحفظ، عالمیت (گلوبلائزیشن)

سے پیدا ہونے والے مسائل، اسلامی تعلیم کا نظم، اسلامی عائلی قانون کا تحفظ۔ غیر مسلموں سے روابط اور اختلاط کے حدود۔ ملک کے سیاسی نظام میں مسلمانوں کی شرکت اور ان کی نمائندگی۔ اگر چہ یہ مسائل عمومی قسم کے مسائل ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف ملکوں میں بسنے والی مسلمان اقلیتیں مخصوص قسم کے مسائل سے دوچار ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل اور مشکلات چین کے مسلمانوں کے مسائل سے مختلف ہیں۔ یوروپی مسلمانوں کے مسائل یوروپی ممالک کے سیاسی و معاشرتی حالات سے جڑے ہوئے ہیں۔ جنوبی افریقہ کے مسلمان تقریباً چار سو برس سے (اس) ملک میں رہتے آئے ہیں لیکن ملک کا قانون اسلامی قانون نکاح کو تسلیم نہیں کرتا۔ گزشتہ 15 برسوں سے مسلمان یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کے شخصی قانون کو تسلیم کیا جائے اور اس کا نفاذ کیا جائے۔ اگر چہ موجودہ حکومت مسلم پرسنل لا کو نافذ کرنے کے لیے راضی ہے لیکن جنوبی افریقہ کے مسلمانوں میں اب تک اس سلسلہ میں اتفاق رائے نہیں ہو پایا ہے کہ آیا مسلم پرسنل لاء کو قانونی شکل دی جائے۔''[۹۱]

مسلم اقلیت ہندوستان کے پس منظر میں

مسلم اقلیتوں کی ایک عمومی صورت حال آپ نے ملاحظہ کی۔ یہاں پر مناسب ہے کہ ہندوستان کے تناظر میں بعض اہم مسائل کا درجہ بندی کر کے مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بعض اہم پہلوؤں کو الگ سے ذکر کیا جاتا ہے:

(الف) سیاسی: سیاست زندگی کا ایک لازمی اور اہم جز ہے۔ سماجی زندگی میں شاید کل کی طرح آج بھی سیاست ہی سب سے اہم رول ادا کرتی ہے۔ اس لیے اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ مسلم اقلیتوں کو جو سیاسی اور سماجی مسائل درپیش ہیں ان میں بڑی حد تک اختلاف و تنوع ہے۔ مثلاً مغرب کے تمام معاشرے سیکولر بلکہ الٹرا سیکولر اور جمہوری ہیں۔ وہاں مسلمانوں کے سامنے جو چیلنج ہے وہ یہی الٹرا سیکولرزم کا ہے۔ جو مذہبی علامتوں تک کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر فرانس میں مسلمانوں کے نقاب

اور اسکارف سے ان کو خطرہ محسوس ہوتا ہے، سویڈن اور ڈنمارک میں مسجد کے میناروں سے ان کو ڈر لگتا ہے۔

ہندوستان کے تناظر میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان جیسے ملک میں اصولی طور پر جو سیکولرزم اور جمہوریت رائج ہے وہ مغرب سے کافی طور پر مختلف ہے۔ یہ بنیادی طور پر مذہب مخالف نہیں ہے۔اور یہاں یہ اقلیتوں کے حق میں ہے۔ کیونکہ اگر سیکولر اور جمہوری نظام یہاں نہ ہوگا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دائیں بازو کی سیاست غالب آجائے گی ۔مثال کے طور پر ہندوستان میں ہندتو یا ہندو قوم پرستی کا فلسفہ اس ملک کو قدیم ہندو دھرم اور ویدک نظریات کے مطابق چلانا چاہتا ہے۔ یہ برہمن منووادی تحریک مسلمانوں سمیت ملک کی تمام اقلیتوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنانا چاہتی ہے۔جس کے سیاسی بازو نے ملک پر دو مرتبہ حکومت کی ہے اور اب بھی وہ ملک کی کئی ریاستوں میں حکمراں ہے۔ اس جارحانہ ہندتو کے مقابلہ میں سیکولر قوتیں کانگریس اور اس کی اتحادی پارٹیاں بھی نرم ہندتوا کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں کیونکہ ہندو ووٹ بینک وہ بھی نہیں کھو سکتیں۔ یہی سب سے بڑا سیاسی چیلنج مسلمانوں کے سامنے ہے۔

اسی سے جڑا دوسرا بڑا چیلنج فرقہ پرستی کا ہے۔مغرب کے بعض ملکوں اور ہندوستان میں مسلمانوں کو اکثریتی انتہا پسندی کا سامنا ہے۔مثال کے طور پر جرمنی میں، فرانس اور بیلجیم اور ڈنمارک اور امریکہ میں یہ خطرہ نیونازی ازم اور دائیں بازو کی شدت پسند مسیحی تنظیموں کی طرف سے ہے تو ہندوستان میں شدت پسند ہندتو اور اس کی علمبردار تنظیموں سے جن کے مجموعہ کو سنگھ پریوار کہا جاتا ہے۔ یہ قوتیں سیاسی وسماجی طور پر بہت مضبوط ہیں ۔ پولیس، عدلیہ، سیاسی حلقوں، میڈیا اور یہاں تک کہ بیوروکریسی میں بھی ان کی گرفت بہت مضبوط ہے ۔ان کی طرف سے خاص کر مسلم اقلیت کے لیے فرقہ وارانہ فسادات کا چیلنج پیش آتا رہتا ہے ۔ وقفہ وقفہ سے مختلف شہروں میں یہ قوتیں فرقہ وارانہ فساد برپا کرواتی رہتی ہیں۔میڈیا کی متعصّبانہ رپورٹنگ اور پولیس کی جانبداری سے ان میں سراسر اور یک طرفہ نقصان مسلمانوں کا ہی ہوتا ہے ۔ جان و مال کے نقصان کے علاوہ

بڑی تعداد میں مسلم نوجوان گرفتار کر لیے جاتے ہیں۔

سیاسی سطح پر پارلیمنٹ میں صوبائی اسمبلیوں میں اور مختلف سیاسی پارٹیوں اور سیاسی فورموں میں مسلم اقلیت کی نمائندگی ان کے تناسب کے لحاظ سے اتنی کم ہے کہ اس کو ''نہ'' کے برابر قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ بھی ایک بڑا چیلنج ہے۔ اور اسی سے جڑا ایک مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی سیاسی پریشر گروپ نہیں ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد ہی سے مسلمان اس ملک میں مختلف قسم کے سیاسی تجربے کرتے رہے ہیں جو سب ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر جمعیۃ العلماء کا تجربہ، مشاورت کا تجربہ اور مسلم مجلس کا تجربہ۔ کہنے کا مطلب یہ کہ آزادی کے بعد ہی سے مختلف سیاسی تجربات تو ہوئے ہیں مگر پھر بھی مسلمان کوئی مؤثر سیاسی پریشر گروپ بنانے میں ناکام رہے ہیں۔

(ب) سماجی: سماجی مسائل میں بیشتر وہ ہیں مسلمانوں کے اپنے فقہی طرز عمل سے تعلق رکھتے ہیں یا فقہ اسلامی کی جدید تعبیر کی ضرورت کے پیدا کردہ ہیں۔ مثال کے طور پر کفائت کا مسئلہ ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض فقہی مسائل یا مسلم پرسنل لاء ان ممالک کے قوانین سے متصادم ہوں جہاں مسلم اقلیت رہتی ہے۔ کفاءت کا مسئلہ ائمہ اربعہ کے نزدیک مختلف فیہ ہے۔ حنفی، شافعی اور حنبلی فقہاء کے نزدیک رشتہ نکاح میں حسب نسب، خاندان، پیشہ اور مال کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ دوسری طرف مالکیہ کہتے ہیں کہ حسب ونسب، پیشہ اور مال غیر اعتباری چیزیں ہیں۔ امام مالک کے نزدیک رشتہ نکاح میں صرف دینداری کا لحاظ کرنا چاہیے۔ کفاءت کے مسئلہ میں بقول پروفیسر عبدالرحمٰن مومن: ''امام مالک کا مذہب نصوص شرعیہ اور اسوہ نبوی اور تعامل صحابہ کے موافق اور اقرب الی الصواب ہے''۔ مومن یہ بھی کہتے ہیں کہ جس طرح ہمارے ملک کے حنفی فقہاء نے زوجہ مفقود الخبر کے مسئلہ میں امام مالک کے مسلک پر فتوی دیا تھا اسی طرح آج ضرورت ہے کہ کفائت کے مسئلہ میں امام مالک کے مذہب سے رجوع کیا جائے''۔[20]

اس کے علاوہ اور بھی مسائل ہیں، مثال کے طور طلاق کا مسئلہ اور مطلقہ عورتوں کے نان نفقہ کا مسئلہ۔ مسلم خواتین کو میراث سے محروم رکھنے کا مسئلہ۔ الٹراماڈرن مسلم گھرانوں میں

غیر مسلم خواتین یا مردوں سے نکاح کا رواج بڑھ رہا ہے جو شرعاً ناجائز ہے اوراسی طرح کے بہت سے مسائل ہیں۔

(ج) مذہبی وتہذیبی

دنیا کے مختلف ممالک میں بشمول ہندوستان کے مسلم اقلیت کو مذہبی اور تہذیبی چیلنج بھی درپیش ہے۔ یہ چیلنج اپنے مسلم تشخص کی حفاظت اور اپنی تہذیبی روایات کو برقرار رکھنے کا چیلنج ہے۔ مغرب کے ممالک میں جدید تہذیب غالب ہے ۔اوراس کے سیلاب بلاخیز سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔اوراس تہذیب نے ہندوستان جیسے ممالک میں بھی سوچنے کے انداز بدل دیے ہیں۔ فحاشی، اباحیت اورعریانیت موجودہ زمانہ کے عام کلچر کا حصہ بن گیا ہے۔ پوری زندگی کا نظام اسی پر قائم ہے۔ مخرب اخلاق فلمیں، حیاسوز گانے اور نغمے، پاپ میوزک، اوراس کی مختلف اقسام، ناچ رنگ، مقابلۂ حسن، مس یونیورس، مس ورلڈ، مس لندن، مس نیویارک، مس انڈیا کے بعداب مس فیمینا، مس فلم فیئر ہی نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی اب یہ مقابلے ہونے لگے ہیں۔ پاپ شوز، شوبز، ریلٹی شو نے اب ہر گھر میں دستک دے دی ہے۔ عریاں لٹریچراور ٹی وی کلچر کی یلغار سے چھوٹا بڑا کوئی محفوظ نہیں۔ متعدد ملکوں میں مخلوط تعلیم تو ہے ہی اب تو سیکس ایجوکیشن کو بھی ابتدائی درجات سے نظام تعلیم کا جزبنادیا گیا ہے۔ بغیر شادی کے لڑکے لڑکیوں کے ایک ساتھ رہنے (Live in relation ship) اور ہم جنسی کی شادی کا ماحول متعدد ملکوں میں بن رہا ہے۔ جس سے ہندوستان بھی محفوظ نہیں۔ عورتوں اور لڑکیوں کا مطالبہ ہے کہ ان کو مردوں کے برابر حقوق دیے جائیں کہ وہ جس طرح چاہیں رہیں، جیسے چاہیں پہنیں اور جو چاہیں کریں کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ دنیا کا بھی عمومی نظارہ ہے اور ہمارے ملک کا بھی ۔اب اسی ماحول میں مسلمانوں کو رہنا ہے۔ وہ اپنی الگ کوئی دنیا نہیں بناسکتے ۔اس ماحول میں رہنا بھی ہے اوراس میں اپنے تشخص کی اپنی تہذیبی روایات کی اوراپنی اعلیٰ اقدار کی حفاظت بھی کرنی ہے۔ یہی وقت کا بڑا چیلنج ہے۔

چونکہ اسلام مسلمانوں سے قدم قدم پر مختلف مطالبات کرتا ہے۔ لہٰذا دنیا کے

اس ماحول میں رہتے ہوئے ان کو اپنے مذہب وتہذیب کے وہ مطالبے پورے کرنا اور اسلامی طرز زندگی کو اپنانا ایک بڑا مسئلہ ہے۔

(د) اخلاقی وروحانی

حیاء ہمارے معاشرہ کی بہت بنیادی قدر اور ایک مضبوط روایت تھی ،ہم نے اپنے بچپن میں گھر کی خواتین اور گلی محلّہ کی دوسری خواتین کو پایا تھا کہ وہ پردہ کا زبردست اہتمام کرتی تھیں۔ بزرگ خواتین بھی برقع یا لمبی چادر اوڑھ کر ہی گھروں سے نکلا کرتی تھیں۔ آج مغرب کی ثقافتی یلغار نے نامحسوس طور پر معاشرہ کو کچھ اس طرح متاثر کر ڈالا ہے کہ اب گھروں سے پردہ اور نقاب تو رخصت ہو ہی گیا اب چھوٹی لڑکیاں پینٹ، پتلون اور منی اسکرٹ پہن رہی ہیں۔

(ھ) تعلیمی

تعلیم کے میدان میں مسلم اقلیتوں کے سامنے دو طرح کے چیلنج ہیں۔ ایک تو بڑے پیمانہ پر عصری اور جدید تعلیم کے ادارے ان کو کھولنے کی ضرورت ہے۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ان کو اس ضرورت کا احساس تو ہے مگر یہ احساس کسی بھی منصوبہ بندی سے عاری ہے۔ اس کی ضرورت یوں بھی ہے کہ مسلمان اقلیتیں جن ملکوں میں رہتی ہیں ان کے سیکولر تعلیمی نظام ہائے تعلیم میں مذہبی وتہذیبی تعلیم اور انسانی اقدار کی تربیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہاں تعلیم کا مطلب ہے پیشہ ورانہ تعلیم ،جو طلبہ کو پڑھنے کے بعد اچھی جاب دلا سکے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابتداء ہی سے ماڈرن اور معیاری سمجھے جانے والے انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھنے والے مسلم بچے قرآن پڑھنے اور مبادیات دین تک سے نابلدرہ جاتے ہیں۔ اس لیے اقلیتی مسلمانوں کو بڑی تعداد میں ماڈرن تعلیم کے اعلی معیار کے اسکول کالج کھولنے کی ضرورت ہے جہاں عصری اور اسلامی علوم کا بہترین امتزاج ہو۔ مسلم اقلیتوں کے پاس اپنی یونیورسٹیاں اور بڑے کالجوں کی بھی شدید ضرورت ہے۔ جو یونیورسٹیاں اور کالج ان کے پاس ہیں وہ ان کی تعداد کے تناسب سے انتہائی کم ہیں اور کسی بھی درجہ میں ضرورت پوری نہیں کرتے۔

دوسرا بڑا مسئلہ مسلم اقلیتوں کے سامنے ان کے اپنے دینی و مذہبی مکتبی و مدرسی نظام کی اصلاح ہے۔حیرت انگیز ہے کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ علماء نے انگلینڈ، امریکہ اور جنوبی افریقہ وغیرہ میں بڑے بڑے مدرسے اور دارالعلوم قائم کیے ہیں اور ان میں بھی صدیوں پرانا درس نظامی جوں کا توں نافذ کر رکھا ہے ۔ یہاں تک کہ ذریعہ تعلیم بھی اردو کو قرار دے رکھا ہے ۔اس سے بڑی نارسائی اور کیا ہوسکتی ہے۔اس مکتبی و مدرسی نظام سے جو لوگ پڑھ کر نکلتے ہیں وہ جدید علوم سے اس حد تک ناآشنا رہتے ہیں کہ ان کو پتہ ہی نہیں کہ وہ کس دور میں جی رہے ہیں ۔مدارس کے اس نظام کی اصلاح و ترمیم بھی وقت کی ایک ضرورت ہے اور ایک بڑا چلینج بھی ۔

(ز) معاشی واقتصادی

سماج کا تصور معاش کے بغیر نہیں ہوسکتا۔البتہ اس معاملہ میں مختلف معاشروں کے اعتبار سے اقلیتی مسلمانوں کے حالات بھی مختلف ہیں۔مثال کے طور پر جنوبی افریقہ کے مسلمان اقلیت میں ہیں مگر بحیثیت مجموعی خوش حال ہیں ۔اسی طرح مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے۔تاہم ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت غربت وافلاس کی شکار ہے۔اور غربت کا تناسب اس کے ہاں پچاس فیصد سے کم نہیں ہے۔اس کے اسباب کیا ہیں۔ان پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی رقم طراز ہیں: حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر معاشی ترقی کے لیے جدوجہد کے محرکات انتہائی کمزور ہیں اور ان کے درمیان اُس کے لیے کوئی جوش وخروش پیدا نہیں ہوسکا ہے ۔اس مظہر کے بہت سے اسباب وہ جو سارے ہندوستانیوں کے درمیان مشترک ہیں، رواجی زندگی پر قناعت ، ہر اُس تبدیلی کو محال سمجھنا جواب تک واقعہ نہ ہو، اپنی ناطاقتی کا احساس اور بہتری اور تبدیلی کے عمل کا خارج سے انتظار، معاشی وسائل کو صرف ذاتی آراء وآسائش میں اضافہ کا ذریعہ سمجھنا اور اخلاقی وروحانی کو اخلاقی وروحانی اعتبار سے استخفاف کی نظر سے دیکھنا......وغیرہ وغیرہ''۔[۲۱]

پرانے زمانہ میں حکومتیں ہی معاشرہ میں سب سے اہم رول ادا کرتی تھیں۔

سرکاری اور حکومتی ملازمتیں ہی ترقی کی معراج تھی، آج زمانہ بہت حد تک بدل گیا ہے۔ آج وہ سارے کام این جی او، غیر سرکاری ادارے اور پرائیویٹ کمپنیاں کر رہی ہیں۔ نجی سیکٹر کا عمل دخل زندگی کے ہر شعبہ میں بڑھ رہا ہے، کارپوریٹ کمپنیاں اپنے آپ میں خود ایک سلطنت ہیں، نجی زمرہ ہر کام کرنے لگا ہے۔ اور حکومت و ریاست کا رول زندگی میں گھٹتا جا رہا ہے اور محض انتظامی مشینری تک محدود ہو گیا ہے۔ آزاد معاشی مارکیٹ کے تصور کے غلبہ کے بعد یہ اور زیادہ محدود ہوگا۔ زمانہ کی اس رفتار کا ساتھ دینے کے لیے یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس بھی وسیع پیمانہ پر نجی زمرہ کے ادارے ہوں۔ اور وہ ان سبھی کاموں کو کر سکیں جن کو نجی زمرہ یا پرائیویٹ سیکٹر کرتا ہے۔ حکومتیں اور انٹرنیشنل مالیاتی ادارے اس قسم کے اداروں اور اسکیموں کو فنڈ دیتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اقلیتی مسلمان بھی نجی زمرہ پر توجہ دیں اور اس کے ذریعہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے کام انجام دیں۔

(ح) صحافتی و میڈیائی

میڈیا کی قوت اس دور میں کسی بھی قوم کے لیے لائف لائن ہے۔ غیر مسلم معاشروں میں رہنے والے مسلمانوں کی یہ سیاسی، سماجی ضرورت بھی ہے اور دینی و مذہبی تقاضا بھی۔ کیونکہ اسلام ایک دعوتی و تبلیغی دین ہے اور مؤثر میڈیا کے بغیر دعوت و تبلیغ کا کام آج کے دور میں ممکن نہیں۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کا اپنا کوئی میڈیا نہیں۔ الجزیرہ نے البتہ ایک مثبت اور توانا روایت قائم کی ہے۔ اقلیتی مسلمانوں کے لیے تو اس میدان میں نارسائی اور بھی بڑی مصیبت ہے۔ کیونکہ Image building اپنے بارے میں پھیلی غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے مؤثر کمیونیٹی میڈیا کا ہونا بہت ضروری ہے جو کم از کم ہند کے مسلمانوں کے پاس نہیں ہے۔

انگریزی و ہندی پرنٹ میڈیا میں بھی وہ کہیں نہیں الیکٹرانک میڈیا کا تو ذکر ہی کیا۔ بعض مسلم تنظیمیں جو انگریزی یا ہندی میں پندرہ روزہ یا ہفت روزہ نکالتے ہیں ان کی کوئی Readership نہیں۔ اس سے بھی آگے کی بات یہ ہے کہ اب پرنٹ میڈیا سے

کام نہیں چل رہا ہے بلکہ الیکٹرانک میڈیا نے پورے طور پر اس کی جگہ لے لی ہے۔جس میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔بعض مقامی ٹی وی چینلوں پر یا اردو چینلوں پر جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں ان سے مسلم کمیونیٹی کی کوئی حقیقی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔

(ط) مسلم اقلیتوں کے بعض مخصوص مسائل

یہ مسائل مخصوص مسائل مختلف ممالک کی مخصوص فضاء کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ایک ماہر سماجیات نے ان پر یوں اظہار خیال کیا ہے:''مختلف ملکوں میں مسلمان اقلیتوں کو جو مسائل و معاملات درپیش ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کو مقامی حالات و کوائف کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔اس سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ مسجدوں میں خواتین کے داخلہ کا ہے۔جیسا کہ اہل علم واقف ہیں عہد نبوی اور دور صحابہ میں عورتیں مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جایا کرتی تھیں۔لیکن بعد کے زمانہ میں جب لوگوں کی اخلاقی حالت کا وہ معیار نہ رہا جو عہد نبوی میں تھا تو عورتوں کا مسجد میں جانا نامناسب سمجھا جانے لگا۔خود حضرت عائشہ صدیقہؓ کا یہ بیان صحیح بخاری میں مروی ہے کہ آج جو عورتوں نے نئی باتیں نکال لی ہیں آنحضورﷺ ان کو دیکھتے تو عورتوں کے لیے مسجد میں داخلہ قطعاً ممنوع قرار دیتے۔[۲۲]

یوروپی ممالک میں جو مساجد ہیں ان کی ساخت اور دائرہ عمل عالم اسلام کے موجودہ ممالک کی مسجدوں سے قدرے مختلف ہے۔یوروپی ممالک کی مسجدیں نہ صرف نماز اور علوم دینیہ کی تدریس کیلیے استعمال ہوتی ہیں بلکہ مقامی مسلمانوں کے لیے تہذیبی مرکز کی حیثیت بھی رکھتی ہیں اور ان کی دینی وثقافتی شناخت کا مظہر ہوتی ہیں۔چنانچہ یوروپ کی تمام بڑی مسجدوں میں مدرسہ کے علاوہ کانفرنس ہال بھی ہوتے ہیں۔جہاں دینی اور ثقافتی پروگرام منعقد ہوتے ہیں۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ عورتوں کے داخلہ کا دروازہ الگ تھلگ ہو اور جہاں وہ نماز ادا کرتی ہیں وہاں مردوں کی نظر نہ پڑ سکے''۔لہذا یوروپی ممالک کے مخصوص ماحول کے پیش نظر اور پردہ کے اہتمام کے ساتھ مسجدوں میں عورتوں کے داخلہ کی اجازت وہاں کے بہت سے علماء وفقہاء نے دی ہے۔جس پر

باضابطہ عمل کیا جاتا ہے۔یوروپی مسلمانوں کے تعلق سے ایک مسئلہ مختلف موسموں اور اوقات میں روزہ اورنماز کی ادائیگی کا بھی ہے۔یوروپی افتا کونسل نے یہ فتوی دیا ہے کہ یوروپی ممالک میں موسم گرما میں جب کہ عشاء کاوقت نصف شب تک مؤخر ہوجائے، مغرب اورعشاء کی نمازوں کوایک ساتھ جمع کرنا جائز ہے۔ایک متعلقہ مسئلہ غیرمعمولی منطقوں میں روزہ اورنماز کے اہتمام کا ہے۔جیسے جیسے ہم منطقۂ شمالی کی سمت بڑھتے جاتے ہیں تو موسم سرمامیں راتیں طویل ہونے لگتی ہیں اوردن چھوٹے ۔موسم گرما میں راتیں چھوٹی ہونے لگتی ہیں اوردن لمبے ۔بعض علاقوں میں موسم گرمامیں دن ساڑھے تیئیس گھنٹے لمبے اورراتیں صرف دس پندرہ منٹ کی ہوتی ہیں۔جوملک قطب شمالی سے قریب ہیں جیسے کناڈا کے بعض حصے ،الاسکا، ڈنمارک ،ناروے ،سویڈن ،فن لینڈ اور آئس لینڈ وغیرہ ان ممالک میں موسم گرما کے دنوں میں سورج 73 دنوں تک غروب نہیں ہوتا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے علاقوں میں نماز وروزہ کااہتمام کس طرح کیا جائے''۔ان سب مسائل پر علماوفقہاء نے فتوے دیے ہیں اوران سوالوں کوحل کرنے کی کوشش کی ہے۔[۲۳]

مسلم اقلیتوں کی ذمہ داریاں

جہاں تک غیرمسلم معاشروں میں رہنے والے مسلمانوں کی ذمہ داریوں کی بات ہے تواس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ اصولی سوال حل کرنا چاہیے کہ ایک مسلم اقلیت کے فرائض و واجبات بھی مسلم اکثریت کے فرائض وواجبات سے الگ ہیں یادونوں کے فرائض وذمہ داریاں یکساں ہیں۔فقہ اسلامی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر مسلم اکثریت اورمسلم اقلیت دونوں کے فرائض وواجبات میں نمایاں تغیرآ جاتا ہے۔البتہ دین کے بنیادی اوراساسی مطالبات جوہرمسلمان سے فرداًفرداًمطلوب ہیں جیسے ارکان دین، عقائد، اخلاقی تعلیمات ،عبادات اوروہ معاملات جن کے لیے اقتدار کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی وہ سب مطلوب رہتے ہیں مگراسلام کے فوجداری قوانین اوروہ اجتماعی

تعلیمات جن کے لیے اقتدار وحکومت کی شرط ہوتی ہے وہ اقلیتی مسلمانوں سے مطلوب نہیں ہوتے۔ اس لیے اکثریت واقلیت کے فرق کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ بین الاقوامی قانون اور اسلامی شریعت کے ایک ماہر ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے کہ: ''اصولی طور پر اس کی بنیاد ہمیں اسوۂ رسول میں ملتی ہے اور شریعت یا اسلامی فقہ کے عمومی تعارف میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ شریعت کے آٹھ بڑے بڑے شعبے ہیں یعنی عبادات ومناکحات، معاملات، الحظر والاباحۃ، الاحکام السلطانیہ، جنایات، ادب القاضی اور سِیَر۔ ان میں سے اول الذکر چار شعبے وہ ہیں جو ہر مسلمان پر شخصی طور پر وقت اور جگہ واجب ہوں گے یعنی ان کا دائرہ شخصی (Personal) اس کے برعکس آخر الذکر چار شعبوں کے احکام پر عمل درآمد کے لیے سیاسی اقتدار اور حکومت کی ضرورت ہے۔ جہاں مسلمانوں کو سیاسی اقتدار حاصل ہوگا وہاں ان شعبوں کے احکام پر عمل درآمد ہوگا ورنہ مسلمان ان پر عمل کے مکلف نہ ہوں گے۔ اس سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ شریعت کے یہ احکام نعوذ باللہ معطل ہو جائیں گے، اس لیے کہ شریعت کا کوئی حکم کبھی معطل نہیں ہوسکتا بلکہ اس سے مراد صرف اس قدر ہے کہ ان احکام پر عمل درآمد کی ضروری شرائط میں سے حکومت اسلامی کا وجود بھی ہے جہاں یہ شرط پائی جائے گی یہ احکام واجب التعمیل ہوں گے اور جہاں یہ شرط نہ پائی جائے گی وہاں یہ احکام واجب التعمیل نہ ہوں گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح رمضان کا روزہ رکھنے کے لیے رمضان کا مہینہ ہونا شرط ہے۔ اگر کوئی شخص شوال کے مہینے میں مسلمان ہو اور شعبان کے مہینے میں انتقال کر جائے تو یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اس کے لیے روزہ کی فرضیت معطل ہوگئی تھی بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس کے لیے روزہ کے وجوب کی شرط (یعنی وجود رمضان) موجود نہ تھی اس لیے روزے اس پر فرض ہی نہیں ہوئے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کے پاس زندگی بھر بقدر نصاب مال نہ ہوتو اس پر زندگی بھر زکوۃ فرض نہ ہوگی۔ لیکن یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اس کے لیے زکوۃ کی فرضیت معطل ہوگئی ہے۔ اسی طرح مؤخر الذکر شعبوں کے احکام کی بنیادی شرط دارالاسلام اور امام (اسلامی حکومت) کا وجود ہے، اگر یہ شرط پائی جائے گی تو ان احکام پر عمل ہوگا

ورنہ نہیں۔ بالفاظ دیگران احکام کا دائرہ کار علاقائی ہے۔ جب تک کوئی شخص دارالاسلام کی حدود سے باہر رہے گا اس پر ان احکام کا اجراء نہیں لیکن جب وہ دارالاسلام کی حدود میں داخل ہو جائے گا تو یہ احکام اس پر بھی منطبق ہونا شروع ہو جائیں گے''۔[۲۴]

اس بارے میں ایک بڑا خلجان ہے کہ کیا مسلم اقلیت کے لوگوں کو اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور کیا یہ شریعت کا مطالبہ ہے۔ ڈاکٹر غازی نے اس خلجان کو بھی بڑی خوبی سے رفع کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''مزید برآں جس طرح کسی شخص کے لیے یہ ضروری نہیں ہے اور نہ شریعت نے اس کو اس کا مکلّف کیا ہے کہ وہ زکوۃ ادا کرنے کی خاطر پہلے دولت اکٹھی کر کے صاحب نصاب بنے اور پھر زکوۃ ادا کرے۔ فرضیت زکوۃ کا ہمیشہ یہی مفہوم سمجھا گیا کہ اگر کسی شخص کے پاس بقدر نصاب پس اندوختہ ہو تو وہ زکوۃ ادا کرے ورنہ خیر...... یا مثلاً وراثت کے احکام پر عمل کرنے کا مقتضیٰ کسی نے بھی یہ نہیں سمجھا کوشش کر کے مرنے سے پہلے دولت جمع کر جاؤ تا کہ اولاد کو وراثت کے احکام پر عمل کرنے کا موقع ملے ...... ہر ذی فہم آدمی نے اس مفہوم یہی سمجھا کہ اگر مرنے والا کچھ دولت چھوڑ کر مرے تو اس کو احکام وراثت کے مطابق تقسیم کر دیا جائے اور اگر مرنے والا کچھ نہ چھوڑے تو خیر......''۔[۲۵] ان اقتباسات سے بڑی حد تک یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ غیر مسلم معاشروں میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں مسلم اکثریتی معاشروں سے بالکل الگ نوعیت کی ہوتی ہیں۔ اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ سیاست کے میدان میں مسلمان کیا رول ادا کر سکتے ہیں اور ان کی ذمہ داری کیا ہوگی''۔

سیاسی مسائل کے ضمن میں ہندوستان جیسے غیر مسلم اکثریتی ممالک کے سلسلہ میں مسلم علماء و دانشوروں کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان جیسے میں جو سیکولرزم اور جمہوریت رائج ہے یہ مغرب سے کافی حد تک مختلف ہے۔ اور یہ بنیادی طور پر مذہب مخالف نہیں ہے۔ اور یہ مسلمان اقلیت کے حق میں ہے کیونکہ اگر سیکولر اور جمہوری نظام نہ ہوگا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دائیں بازو کی سیاست غالب آ جائے گی۔ جو واضح طور پر ہندو قوم پرستی ہندتوا کے فلسفہ کی علمبردار ہے۔ اسی طرح اس بات پر تمام مسلم مفکرین اور علماء کا

اتفاق ہے کہ مسلم اقلیتیں اپنے اپنے متعلقہ ممالک کے سیکولر دستوروں کی وفادار اور قانون کی پابند ہوں گی۔ اسی طرح بہت سارے علما وفقہاء یہ بھی کہتے ہیں کہ اقلیتی ممالک کے مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک الگ فقہ ،فقہ الاقلیات کی تشکیل ہونی چاہیے۔ اس سلسلہ میں کافی لٹریچر بھی وجود میں آیا ہے ۔اصولی طور پر سیکولرزم اور جمہوریت اسلامی سیاسی تصور سے جد ہیں مگر ہندوستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر یہ دونوں ہی اس ملک میں قابل قبول ہیں کیونکہ ان کا متبادل یہاں جارح ہندوتوا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔لہٰذا تحریکِ آزادی میں برابر کا حصہ لینے والے چوٹی کے مسلمان علماء و مفکرین نے جن میں سے بیشتر کی تعداد علماء دیوبند سے تعلق رکھتی تھی، نے برضاورغبت حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے یہاں سیکولرزم اور جمہوریت کی تائیدوحمایت کی۔ان علماء ودانش وروں میں مولانا حسین احمد مدنی ،مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ،مولانا ابوالکلام آزاد جیسے نابغۂ روزگار شامل تھے۔ان کے نقطۂ نظر کی بنیاد یہ تھی کہ ہندوستان میں فی الوقت اسلامی نظام سیاست کا کوئی موقع نہیں ہے۔اور حقیقت پسندی کا تقاضا یہی ہے کہ جمہوریت وسیکولرازم کو یہاں تسلیم کیا جائے ۔اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہندوستان جیسے ملکوں میں جہاں دائیں بازو کے انتہاپسندوں اور جارح ہندتوا کا خطرہ درپیش ہو جمہوریت اور سیکولرزم کی مخالفت کرنا بالکل بھی صحیح نہیں ہے۔مسلم علماء ودانش وروں کی اکثریت کے نزدیک ایسے ممالک میں نظامِ وقت میں مسلمانوں کو شامل ہونا چاہیے ،انتخاب میں حصہ لینا چاہیے. پبلک ایڈمنسٹریشن ،سول سروسز، پولیس اور عدلیہ میں جانا چاہیے ،پارلیمنٹ میں داخل ہونا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے وہ ملک میں مسلمانوں کے ملی وتہذیبی مفادات کا تحفظ کرسکتے ہیں۔اوران چیزوں کے بارے میں منفی ذہن بنانے سے خودانہیں کا نقصان ہوگا۔ اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے جنرل سکریٹری مولانا خالدسیف اللہ رحمانی نے اس بارے میں لکھا ہے: ’’ایسے مواقع پر شریعت کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ زیادہ درجہ کے مفسدہ سے بچنے کے لیے کم تر درجہ کے مفسدہ کو قبول کرلینا چاہیے ۔فقہاء اِسے مختلف الفاظ میں تعبیر کرتے ہیں مثال کے طور پر’’ جب مفاسد کا تعارض ہو تو چھوٹے ضرر کا ارتکاب کرتے

ہوئے بڑے ضرر سے بچنے کوملحوظ رکھا جائے گا‘‘۔اور’’کم تر نقصان کے ذریعہ بڑے درجہ کے نقصان کودور کیا جائے گا‘‘اور’’دوشر میں سے کم تر کو گوارا کیا جائے گا‘‘۔۲۶؎

غیر مسلم معاشروں میں ایک اہم اصول کی نشان دہی علماء نے یوں کی ہے کہ حالاتِ زمانہ کی رعایت کی جائے گی۔ویسے تو یہ زندگی کا عام اصول ہے جو اکثریت اور اقلیت دونوں مسلمانوں کوشامل ہے۔مگر غیر مسلم معاشرہ میں رہنے والے مسلمانوں کی تو یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے۔علماء کہتے ہیں کہ’’ظاہر ہے کہ اپنے ملک میں مسلمان بڑی حد تک حالتِ اختیار میں ہوتے ہیں اور جہاں اقلیت میں ہوں،وہاں اس درجہ اختیار کے حامل نہیں ہوتے اس لیے اگر ایسے علاقہ میں وہ بعض احکام شرعیہ پر عمل کرنے سے معذور ہوں تو وہ اس انتخاب کے بارے میں جواب دہ نہیں ہیں،پس ان دونوں اصولوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے لیے جمہوری ممالک میں انتخابات میں حصہ لینا نہ صرف جائز ہے بلکہ ممکن ہے کہ بعض حالات میں وہ ان پر واجب قرار پائے اس سلسلہ میں ایک نظیر حضرت یوسف علیہ السلام کی حیات طیبہ میں بھی ملتی ہے‘‘۔کہ امام طبری،علامہ فخر الدین رازی،ابن کثیر اور مفسر ابوالسعو دعمادی سب کے نزدیک یہی راجح ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر(مصر کا بادشاہ)سے وزارت مالیات کا مطالبہ کیا تھا،اس سے استدلال کیا جاتا ہے کہ غیر اسلامی نظام حکومت میں مسلمان حکومت کے کام کاج میں حصہ لے سکتے ہیں،نظام وقت سے تعاون کر سکتے ہیں اور اس میں شرکت کر سکتے ہیں،اس کا حصہ بن سکتے ہیں اور اس میں کوئی شرعی مانع نہیں ہے۔ان تمام اقدامات کے ساتھ ہی بڑی ضرورت ہے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کی،جس کے لیے مسلمانوں کوغیر قوموں سے وسیع پیمانہ پر تعلقات قائم کرنے اور ان کے مذاہب، فرقوں اور تصورات کا مطالعہ کرنے اور ان کو جاننے کی ضرورت ہے۔اور دوسرے مرحلہ میں ان کے ساتھ مذہبی وسماجی ڈائلاگ،متنازعہ ایشوز پر مذاکرے اور گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔اعتراضات اور معاندانہ پروپیگنڈوں کا جواب،اشتعال انگیز تقریر وتحریر سے مکمل احتراز قومی سلامتی کے امور میں زیادہ سے زیادہ شرکت،غیر مسلموں کو اپنے

پروگراموں میں زیادہ سے زیادہ بلانے اور مشترکہ امور میں ان کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

سماجی مسائل کے سلسلہ میں ایک پہلو یہ ہے کہ یوروپ وامریکہ اور ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے مسلمان اپنے اپنے وطن اور قوم کے لیے اپنی نافعت ثابت کریں۔ وہ اپنے ملک کی فوج، پولیس، عدلیہ، تعلیمی سسٹم، انڈسٹری، میڈیا اور تجارت میں آگے آئیں مختلف این جی او قائم کر کے سماج کی تعمیر کا کام کریں، ملک کی سیاست کے اندر جو کرپشن ہے اس کے خلاف میدان میں آئیں۔ سماج کے جن طبقات کے ساتھ ظلم ہوتا ہے مثال کے طور پر ہندوستان میں دلت طبقات کے ساتھ، اس کے خلاف آواز بلند کریں۔ طبقاتی ناہمواری، سماجی ناانصافی اور معاشی نابرابری کے عوامل کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ اپنے تمام کاموں میں وہ مکمل طور پر پرامن رہ کر، قانون کے دائرہ میں اور جمہوری وسیکولر طریقوں کو اپنا کر وہ اس ملک میں اپنے آپ کو نفع بخش بنائیں۔ علماء کی بڑی تعداد ان ملکوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی میں مسلمانوں کی بھرپور شرکت وفعالیت کو ضروری قرار دیتی ہے۔[۲۷]

ملی ومذہبی تشخص کی حفاظت بھی مسلم اقلیتوں کے لیے ضروری ہے۔ ان کو تمام مسائل ومشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا مذہبی، ملی اور تہذیبی تشخص برقرار رکھنا ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف اسکالر اور دانشور یہ رائے دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنا مذہبی لٹریچر قومی وعلاقائی زبانوں میں منتقل کرنا چاہیے۔ انہیں اپنے خود کفیل مدارس ومکاتب کے نظام کا تحفظ کرتے ہوئے اس کو جدید تقاضوں کے مطابق بنانا چاہیے۔ کتب خانے، ریڈنگ روم، این جی او اور سماجی خدمت کے ادارے قائم کرنے چاہیے نیز اپنا ریڈیو وٹی وی چینل قائم کرنے چاہیے۔ کیونکہ آج کے تیز رفتار دور میں اور شدید competition ومسابقت کے زمانہ میں ان کو روایتی طریقوں سے آگے بڑھنا ہوگا اور تیز قدمی کے ساتھ چلنا ہوگا۔ تبھی وہ اپنا ملی وتہذیبی تشخص برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ان جدید وسائل وذرائع سے کام لیکر ہی وہ اپنی image building اور خراب کردہ شبیہ کو درست کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے دنیا میں

جہاں کہیں بھی اسلام کے نام پر جو دہشت گردی کی وارداتیں ہوتی ہیں (جن کو حقیقی یا غیر حقیقی مسلمان افراد اور گروپوں کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے) اس کی مطلق مذمت کرنا اور اس سلسلہ میں واضح طور پر اسلام کے موقف کو بیان کرنا بھی ناگزیر ہے۔

انسانی معاشرہ سے ظلم کا خاتمہ شرعی مقاصد میں سے ہے۔ اور اس ظلم کی بہت ساری شکلیں ہیں، کہیں یہ ظلم ریاست اپنے شہریوں پر کر رہی ہے کہیں یہ ظلم اکثریت اقلیت کے اوپر کر رہی ہے۔ کہیں افراد ایک دوسرے پر ظلم کر رہے ہیں۔ کہیں یہ مالدار کے غریب پر زیادتی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور کہیں مردوں کے غلبہ والا سماج عورتوں کے حقوق پامال کرتا ہے۔ اور ان شکلوں کی مختلف صورتیں دنیا کے مختلف ممالک اور خطوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ پروفیسر نجات اللہ صدیقی نے یہ رائے بھی دی ہے کہ قیام عدل کے لیے ضروری ہے کہ ظلم کو دور کیا جائے کہ ظلم عدل کا متضاد ہے۔ ظلم کا خاتمہ ہوگا تو عدل و انصاف کا قیام ہوگا جو خود مقاصدِ شریعت میں سے ہے۔ قرآن کریم کے مطابق رسولوں کو بھیجنے کا مقصد یہ بھی رہا ہے کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ پروفیسر نجات اللہ صدیقی کے الفاظ میں: ''عدل وقسط پر قائم رہنے کی تاکید قرآن کریم کی متعدد آیات میں کی گئی ہے۔ جوینی، عزالدین ابن عبدالسلام، ابن تیمیہ اور ابن القیم نے اسے مقاصد شریعت میں شمار کیا ہے۔ اس مقصد کے تحت شریعت میں احکام دیے گئے ہیں اور اس کے لیے نیا اجتہاد بھی کیا جائے گا''[۲۸] ہندوستان جیسے غیر اسلامی معاشرہ میں مسلم سماج سے غربت کا خاتمہ بھی لازمی ہے کیونکہ بہت سارے مسائل غربت، ناداری اور معاشی ناہمواری سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر سماج سے غربت کا خاتمہ خود مقاصد شریعت میں سے بھی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو اس میدان میں بھی سرگرم ہونے کی ضرورت ہے۔ اس حوالہ سے شیخ عزالدین ابن عبدالسلام نے واضح کیا ہے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ سماج سے غربت کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اِس سے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ اس سے کم تر درجہ میں یہ عام مسلمان معاشرہ کی بھی ذمہ داری ہوگی۔ غربت کا خاتمہ ہوگا تو معاشی ترقی بھی ہوگی۔ یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ ہندوستانی مسلم اقلیت میں زیادہ تر لوگ غربت و

افلاس کا شکار ہیں اور یہ تناسب پچاس فیصد تک جاتا ہے۔ چنانچہ اس میدان میں ترجیحی طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک میں اور خود ہندوستان میں بڑے وسیع پیمانہ پر اوقاف کی جائدادیں پھیلی ہوئی ہیں۔اور ماضی میں ان اوقاف سے امت کو جملہ علوم وفنون کے ادارے ، مساجد ، لائبریریاں اور تحقیقی وعلمی ادارے چلا کرتے تھے۔اور اس کو ان کے ذریعہ سے ہرطرح کے افراد ملا کرتے اور خدمات حاصل ہوتی تھیں۔آج ان اوقاف کو زوال ہوگیا ہے اوران کی اربوں کھربوں کی جائدادیں کوڑیوں کے مول فروخت ہورہی ہیں یاان کی خرد برد کی جارہی ہے۔اوراس میں حکومتوں کے علاوہ خودان اوقاف کے متولی حضرات اوراوقاف کمیٹیاں ان کی بے محابا لوٹ میں شریک ہیں۔اس لیے شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اوقاف کو بحال کیا جائے اوران کی جائدادوں اورآمدنی کا صحیح اور جائز استعمال کمیونیٹی کی فلاح وبہبود کے لیے کیا جائے۔اوقاف کے سلسلہ میں علمی کاموں اور مذاکرات کے لیے کئی علمی ادارے مثلاً اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا اورانسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز سرگرم ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اوقاف کی بحالی کی ایک تحریک چلائی جائے اوران کوملت کے حق میں استعمال کیا جائے۔

مسلم غیر مسلم تعلقات کے سلسلہ میں علماء ودانشوروں نے متفقہ فیصلے کیے ہیں جو اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کی مطبوعات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ان فیصلوں کے کچھ نکات یہ ہیں:

1- ملک اورانسانیت کے نفع اور معاشرہ میں عدل وانصاف اورامن وسلامتی کی فضا قائم کرنے کے لیے غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کام کیا جاسکتا ہے۔اوران کے اشتراک سے تنظیمیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں۔

2- اسلام انسانیت کا احترام کرتا ہے،اس لیے مسلمانوں کے لیے حتی المقدور انسانی بنیادوں پر مظلوم غیر مسلم بھائیوں کی مدد کرنا ان کا اخلاقی اورمذہبی فریضہ ہے

3- مسلمانوں کی طرف سے چلائے جارہے خدمت خلق کے اداروں مثلاً

ہاسپٹل وغیرہ کے ذریعہ بلا تفریق مذہب تمام لوگوں کی خدمت واعانت کرنی چاہیے۔

4- اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ قدرتی آفات کے موقع پر مسلم تنظیموں کی جانب سے برادران وطن کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا جائے اوران کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا جائے۔[۲۹] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، نئے مسائل اورفقہ اکیڈمی کے فیصلے،اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

حواشی ومراجع

۱۔ اوصاف احمد،محمد منظور عالم ،ہندوستانی مسلم اقلیت نمبر(22) جنوری تا مارچ 2012 (مطالعات) آئی اوایس نئی دہلی ص213

۲۔ مولانا مودودی،اتحاد عالم اسلام ص۲۲ہندوستانی مسلم اقلیت نمبر ص232

۳۔ عبدالرحمٰن مومن ،اوصاف احمد،محمد منظور عالم،ہندوستانی مسلم اقلیت نمبر(مطالعات)آئی اوایس نئی دہلی ص211

۴۔ عبدالرؤف ظفر مجلہ جہات الاسلام کلیہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد سوم شمارہ ایک جولائی،دسمبر 2008)،ص۱۱۹

۵۔ محمود احمد غازی،اسلام کا قانون بین الممالک،(خطبات بھاولپور2)شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد 2007 ص489

۶۔ ایضا

۷۔ اوصاف احمد،محمد منظور عالم،ہندوستانی مسلم اقلیت نمبر(مطالعات)آئی اوایس نئی دہلی ص212

۸۔ جہات الاسلام کلیہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد سوم شمارہ ایک جولائی، دسمبر 2008)

۹۔ حکومت فلپائین اور مورو اسلامک لبریشن کے درمیان معاہدہ،افکار ملی دسمبر 2012 ص28

۱۰۔ جہات الاسلام کلیہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد سوم شمارہ ایک جولائی، دسمبر 2008)،ص۱۲۱

۱۱ ایضا،ص۱۲۲

۱۲ ایضا،ص۱۲۳

۱۳ ایضا،ص۱۳۳

۱۴ ایضا،ص۱۳۳

۱۵ ایضا،ص۱۳۹

۱۶ ایضا،ص۱۴۰

۱۷ ایضا،ص۱۴۳

۱۸ ایضا،ص۱۴۴

۱۹ عبدالرحمٰن مومن ہندوستانی مسلم اقلیت نمبر (مطالعات) آئی اوایس نئی دہلی ص 212

۲۰ ایضاص 214

۲۱ محمد نجات اللہ صدیقی، تحریک اسلامی عصر حاضر میں، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ص 213

۲۲ عبدالرحمٰن مومن ہندوستانی مسلم اقلیت نمبر (مطالعات) آئی اوایس نئی دہلی ص 215

۲۳ ایضا 223

۲۴ محمود احمد غازی، اسلام کا قانون بین الممالک، (خطبات بھاولپور 2) شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد ص 497

۲۵ ایضاص 512-511

۲۶ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ماہنامہ ندائے حرم احمد آباد دسمبر 2012 جامعہ کنز العلوم احمد آباد

۲۷ سلطان احمد اصلاحی، مسلم اقلیتوں کا مطلوبہ کردار فکر و آگہی، بھور مؤ اعظم گڑھ

۲۸ محمد نجات اللہ صدیقی، مقاصد شریعت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ص 43

۲۹ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ایفا پبلیکیشنز نئی دہلی



سیّد قطب شہید کے سیاسی افکار

سلمیٰ فردوس*

سیّد قطب دورِ حاضر کے عظیم اسلامی شخصیتوں میں سے ہیں۔ انھوں نے دنیا کی اسلامی تحریکات اور جماعتوں پر عموماً اور عالمِ عرب پر خصوصاً غیر معمولی اثرات ڈالے۔ عالمِ عرب اور عالمِ اسلام کی جن شخصیات میں بیسویں صدی کے مسلمانوں پر اپنے گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں ان میں سیّد ابوالاعلیٰ مودودی اور سیّد قطب شہید کا نام سب سے نمایاں ہے۔ مولانا مودودی پر سیّد قطب کو اس اعتبار سے فضیلت حاصل ہے کہ جمال عبدالناصر کے دورِ حکومت میں اسلام کی تشریح اور ترجمانی کی راہ میں قید و بند کی سخت صعوبتیں برداشت کیں اور تحریک اخوان المسلمین کے تعلق کی وجہ سے اپنے مشہور زمانہ کتاب معالم فی الطریق لکھنے کی پاداش میں تختۂ دار پر لٹکا دیے گئے۔

ان کا اصل نام سیّد ہے۔ قطب ان کا خاندانی نام ہے۔ ان کے آبا و اجداد اصلاً جزیرۃ العرب کے رہنے والے تھے ان کے خاندان کے ایک بزرگ وہاں سے مصر کے علاقے میں آ کر آباد ہو گئے۔ انہیں میں سے سیّد قطب کے والد بزرگوار حاجی ابراہیم کی پانچ اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے سیّد قطب اور محمد قطب اور تین لڑکیاں حمیدہ قطب، امینہ قطب اور تیسری لڑکی کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ان پانچوں بھائی بہنوں میں سیّد قطب سب سے بڑے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد قطب بھی بڑے صاحبِ علم و فضل ہیں۔

سیّد قطب کی والدہ کا اسمِ گرامی فاطمہ حسین عثمان تھا۔ موصوفہ بڑی دیندار اور خدا پرست خاتون تھیں۔ انہیں قرآن مجید سے بڑا شغف تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ دینیات (سنّی)، اے-ایم-یو، علی گڑھ

بچّے قرآن کے حافظ ہوں۔ سیّد قطب نے اپنی کتاب ''التصویرالفنّی فی القرآن'' کا انتساب اپنی والدہ محترمہ کی طرف کر کے ان کی قرآن تعلق کا ثبوت پیش کیا ہے۔

سیّد کے والد بھی بڑے درویش انسان تھے۔ ان کا پیشہ زراعت تھا۔ سیّد نے اپنی کتاب "مشاھد القیامة فی القرآن" کا انتساب اپنے والد مرحوم کی طرف کیا ہے۔ اس انتساب میں وہ اپنے والد کے تعلق باللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اے باپ! یہ کاوش آپ کی روح کی نذر کرتا ہوں میں بچہ ہی تھا کہ آپ نے میرے احساس و وجدان پر یوم آخرت کا خوف نقش کر دیا۔ آپ نے مجھے کبھی نہیں جھڑکا بلکہ آپ میرے سامنے اس طرح زندگی بسر کر رہے تھے کہ قیامت کی باز پرس کا احساس آپ پر طاری رہتا تھا۔ ہر وقت آپ کے قلب و ضمیر میں اور آپ کی زبان پر اس کا ذکر جاری رہتا تھا۔ آپ دوسروں کا حق ادا کرتے وقت اپنی ذات کے ساتھ تشدد برتتے اور دوسروں سے اپنا حق وصول کرتے وقت تسامح سے کام لیتے۔ اس کی وجہ یہ بتایا تھا کہ اصل حساب روز قیامت کو ہوگا۔[۲]

سیّد قطب شہید کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ جب ان کی عمر چھ سال کی ہوئی تو سیّد کی والدہ کی یہ خواہش تھی کہ ان کو مدرسہ میں داخل کرایا جائے۔ جہاں وہ قرآن کو حفظ کر لیں۔ لیکن خاندان کے دوسرے افراد کی رائے تھی کہ ان کو اسکول میں داخل کیا جائے کیونکہ اسکولوں کی تعلیم زیادہ منظّم اور وہاں کا ماحول صاف ستھرا ہوتا ہے۔ چنانچہ سیّد کو اسکول میں داخل کر دیا گیا لیکن اسکول میں داخلے کے باوجود سیّد قطب نے قرآن حفظ کر لیا۔ اس کی وجہ سیّد قطب خود یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''مدرسہ والوں کو یہ زعم تھا کہ وہ لوگ حفظ قرآن پر توجہ دیتے ہیں اور اسکول والے اس سے لاپرواہی برتتے ہیں اور اسکول سے کوئی طالب علم حفظ قرآن کر کے نہیں نکل سکتا۔ چنانچہ اس زعم کو توڑنے کے لیے انہوں نے اپنی توجہ حفظ قرآن کی جانب مبذول کر دی اگرچہ اس میں ان کو کافی جان توڑ محنت کرنی پڑی۔ نصف رات سے بیدار ہو کر وہ آموختہ پڑھتے تاکہ پچھلا نہ بھول جائیں۔ اس کے ساتھ ان کو دوسرے مضامین

کے لیے بھی وقت دینا پڑتا تھا۔ چنانچہ ایک سال کے اندر اندر انہوں نے اچھی طرح ثلث قرآن حفظ کر لیا اور ابھی چار سال پورے نہ ہوئے تھے جبکہ سیّد کی عمر دس سال سے کچھ کم ہی تھی کہ انہوں نے پورا قرآن حفظ کر لیا۔[۳]

چھ سال کے بچّے میں علم سے اتنا لگاؤ ہی تو تھا جس نے آگے چل کر سیّد قطب کو وہ مقام عطا کیا، جس پر ہر مومن کو رشک ہوتا ہے۔ بچپن میں ہی قرآن سے اپنا شغف اور تعلق کی کیفیت کا بیان وہ اس طرح کرتے ہیں:

''ابھی میں چھوٹا بچہ ہی تھا کہ قرآن پڑھنے لگا، مگر اس کے معانی و مطالب تک رسائی میرے لیے ممکن نہ تھی اور نہ ہی اس کے بلند اغراض کا میرا فہم ادراک کر سکتا تھا۔ تاہم میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور اپنے جی میں قرآن کی تلاوت سے عجب سی کیفیت محسوس کرتا تھا۔ میرا سیدھا سادہ اور چھوٹا سا دماغ قرآن میں وارد شدہ بعض خیالات کو مجسم صورت میں میرے سامنے پیش کرتا، یہ تصاویر گو سادہ اور بے نقش و رنگ ہوتی مگر ان کی وجہ سے میں اپنے اندر عجیب ذوق و شوق اور لذّت محسوس کرتا۔ طویل عرصہ تک یہ کیفیت جاری رہی اور میں ان تصاویر سے مسرّت اندوز ہوتا رہا۔

ان سادہ تصاویر میں سے جو اس وقت میرے ذہن میں مرتسم ہوا کرتی تھیں۔ ایک وہ تصویر ہے جو اس آیت کی تلاوت کرتے وقت میرے سامنے آموجود ہوتی ہے۔

"وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْبُدُ اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انقَلَبَ عَلَى وَجْهِهِ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ" (سورۃ الحج:۱۱)

(اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کنارے پر (کھڑے ہو کر) خدا کی عبادت کرتے ہیں اگر ان کو (دنیاوی) فائدے پہنچتے ہیں تو ان کے سبب مطمئن ہو جاتے ہیں اگر کوئی آفت آپڑے تو منہ کے بل لوٹ جاتے ہیں۔ (یعنی کافر ہو جاتے ہیں) اس نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی نقصان ہے۔)

اس خیالی تصویر کو اگر میں کسی کے سامنے پیش کروں تو اسے ہنسنا نہیں چاہیے، میری نگاہ تصور کے سامنے یہ تصویر یوں اُبھرتی کہ میں ان دنوں ایک گاؤں میں رہتا تھا، اور گاؤں کے قریب ہی وادی کا ایک خاص ٹیلہ میری نگاہ میں تھا، اسے دیکھ کر میرے تصور میں یہ بات آتی تھی کہ گویا ایک شخص ہے جو ایک جھکے ہوئے بلند مکان کے کنارے یا تنگ سے ٹیلہ کی چوٹی پر کھڑا نماز پڑھ رہا ہے، لیکن وہ کھڑا ہونے پر قادر نہیں بلکہ کانپ رہا ہے گویا کہ گرنے ہی والا ہے اور میں اس کے سامنے کھڑا بڑے ذوق وشوق کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں اور عجیب کیف ونشاط محسوس کرتا ہوں۔

اس طرح جو تصاویر ان دنوں مجسم ہوکر میرے سامنے آئی تھیں ان میں سے ایک یہ ہے جو اس آیت کو پڑھتے ہی میرے سامنے آجاتی

”وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ. وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَـٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِن تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَث“ (الاعراف: ۱۷۵-۱۷۶)

(اور ان کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنادو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا۔ مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ پھر شیطان اس کے پیچھے لگا تو وہ گمراہی میں شامل ہوکر رہا اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کے ذریعہ اس (کے درجہ) بلند کردیتے مگر وہ تو پستی کی طرف مائل ہوگیا۔ اور اپنی خواہش کے پیچھے چل پڑا۔ اس کی مثال کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو زبان نکالے اور یوں ہی چھوڑ دو تو زبان نکالے۔)

میں اس آیت کے معنی ومطلب تو نہ سمجھتا تھا مگر اس کے پڑھتے ہی میری چشم تصور کے سامنے ایک تصویر آموجود ہوتی۔ میں دیکھتا کہ ایک شخص منہ کھولے زبان لٹکائے میرے سامنے کھڑا برابر ہانپتا جارہا ہے، میں اس کے سامنے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہتا، لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ ایسا کیوں کررہا ہے میں اس کے قریب جانے کی جرأت ہی نہ

کر سکتا تھا، اس طرح کی مختلف صورتیں میرے کوتاہ ذہن میں منقش ہوتی تھیں اور میں ان میں غور وفکر کرتے ہوئے بہت لطف اندوز ہوتا ان ہی کی وجہ سے مجھ میں ذوق تلاوت پیدا ہوا اور قرآن کریم کی تلاوت کے وقت اس کی وادیوں میں آپسی تصاویر کو تلاش کرتا رہتا تھا۔ [4]

سیّد قطب کی شخصیت کی تشکیل میں جن اجزاء کی کارفرمائی ہے۔ان میں قرآن سے شغف اور لگاؤ کو اوّلیت حاصل ہے۔اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے سیّد لکھتے ہیں:

"............وہ ایام (بچپن) اپنی شیریں اور سادہ خیالات سمیت گزر گئے اب زمانہ بدل گیا اور میں نے علمی اداروں میں تحصیل علم کا آغاز کیا کتب تفسیر نظر سے گزریں اور اساتذہ سے تفسیر قرآن کا درس لیا۔لیکن افسوس بالائے افسوس کہ وہ شیریں اور حسن و جمیل قرآن جس کی تلاوت میں بچپن میں کیا کرتا تھا مجھے کہیں نظر نہ آیا۔

واحسرتا ! قرآن میں حسن و جمال کے وہ سارے بیانات خواب وخیال ہو گئے لذت و اشتیاق سے قرآن خالی ہو گیا کیا یہ دو قرآن ہیں؟ ایک بچپن کا شیریں، سہل، ذوق انگیز لذیذ تصویریں میری نگاہ کے سامنے گھومنے لگیں صرف اتنا فرق تھا کہ وہ پہلی سی سادگی باقی نہ رہی تھی۔ کیونکہ میرے فہم وادراک کے زاویے تبدیل ہو چکے تھے۔ اب میں ان تصاویر کے اغراض و مقاصد سمجھنے لگا تھا اور جانتا تھا کہ یہ تصویریں نہیں مثالیں ہیں جو فہم قرآن کے لیے بنائی گئی ہیں۔ان میں کسی واقعہ کی منظرکشی نہیں کی گئی ہے لیکن ان تصاویر کی سحر طرازی کا وہی عالم تھا۔ ان میں ہنوز وہی جاذبیت اور اثر آفرینی باقی تھی............الحمدللہ میں نے قرآن کو خیر سے تلاش کر لیا۔" [5]

قرآن کی اس تلاش کی راہ میں ان کو معلوم نہیں کتنے تلخ و شیریں تجربات سے گزرنا پڑا اور ان کا جذبۂ دل ان کو کہاں کہاں لیے پھرا۔اس کا اندازہ ان کی پوری زندگی کو سامنے رکھ کر اور اس کے نشیب وفراز کے پس منظر میں ان کے علمی وادبی کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ کر کے اور ان کی ساری تحریروں اور اشعار میں قرآنی اسلوب اور قرآنی تعلیمات کے پَرتو کو محسوس کر کے کیا جاسکتا ہے جب ان کی یہ تلاش مکمل ہوجاتی

ہے تو اللہ عز وجل ان کو انسانیت کے اس بلند مقام سے نواز دیتا ہے جو صرف شہیدان راہِ وفا کے لیے مخصوص ہے۔

سیّد قطب بچپن سے سنجیدگی اور متانت سے بھی بہرہ مند تھے۔ قرآن سے اپنے تعلق کو روز افزوں مضبوط کرنے کے ساتھ ان کو مطالعہ کا شوق بھی ودیعت ہوا تھا۔ اسکول کی مصروفیات سے جو وقت خالی ہوتا اس میں وہ گاؤں میں وقتاً فوقتاً آنے والے کتب فروش سے مختلف موضوعات پر کتابیں خرید کر پڑھتے اچھی اچھی کتابیں لاتے اور سیّد کتابیں خریدنے کے معاملے میں ذرا بھی بخل سے کام نہ لیتے بلکہ مہنگی سے مہنگی کتاب خرید کر اپنے چھوٹے سے کتب خانہ میں مستقل اضافہ کرتے رہتے۔[6]

سیّد قطب اپنے کتب خانہ کی شہرت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گاؤں کے پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ حلقے میں میرے مطالعۂ کتب کی بات اس حد تک مشہور ہوگئی کہ لوگ مجھے قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور میرے شاندار مستقبل کی پیشن گوئی کرنی شروع کردی۔[7]

نہ صرف یہ بلکہ سید قطب کو گھر میں بچپن سے ہی تحسین بھری نظروں سے دیکھا جاتا اور اکثر گھروں سے ان کو اس لیے بلایا جاتا کہ وہ قصّہ کہانیوں کی کتابیں پڑھ کر گھر والوں کو سنائیں۔ سیّد اس حدیث کی کوئی اُجرت نہ لیتے بلکہ بڑے شوق سے ہر ایک کی خواہش پوری کرتے۔[8]

ایک اور اہم خصوصیت سیّد قطب کی شخصیت میں بچپن سے ہی پنپنا شروع ہوگئی تھی اور وہ ظلم وعدوان کے خلاف ان کا ردِ عمل جب کبھی طاقتوروں کو کمزوروں پر ظلم کرتے دیکھتے تو اس کا ان پر ردِ عمل ہوتا۔ جذبۂ حُب الوطنی اور استعماریت سے نفرت کی اس خصوصیت کا اظہار سب سے پہلے اس وقت ہوا جب ان کی عمر دس سال کی تھی۔ سیّد قطب کے والد مصطفیٰ کامل کی سربراہی میں اُبھرنے والی پارٹی حزب الوطنی کے ممبر تھے۔ مدرسہ کے پرنسپل بھی استعماریت کے خلاف لوگوں کے جذبات اُبھارتے رہتے تھے۔ چنانچہ جس وقت مصر میں انقلاب کا صور پھونکا گیا تو پرنسپل نے طلباء کے سامنے ایک پُر جوش

تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اسکول غیر معینہ مدت کے لیے بند کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ وہ اور ان کے تمام رفقاء انقلابی سرگرمیوں میں حصّہ لینے جا رہے ہیں اس لیے کہ یہ ہر انسان کا فرض ہے۔

سیّد قطب اس وقت بچّے تھے ان کے چھوٹے سے ذہن میں انقلاب کے بارے میں شکوک وشبہات بھی پیدا ہوتے رہتے تھے۔ لیکن اس وقت انقلابی جوش میں جب انھوں نے تقریریں کرنا شروع کیں تو اور لوگوں میں انقلابی ولولہ پیدا ہوگیا۔ اور لوگ ان جیسے دس سالہ بچّے تک کی انقلابی گفتگو کو بڑی توجہ اور جوش سے سنتے تھے۔[9]

سیّد قطب نے قرآن حفظ کر لیا تھا اب مسئلہ ان کی مزید تعلیم کا تھا لیکن انقلابی حالات کی وجہ سے تقریباً دو سال تاخیر سے انھوں نے ''تجہیزیہ دارالعلوم'' میں داخلہ لیا جہاں دارالعلوم قاہرہ کالج میں داخلہ کے لیے طلباء کو تیار کیا جاتا تھا۔ یہاں سے فراغت کے بعد ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم کالج (قاہرہ یونیورسٹی) میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے داخلہ لے لیا۔ قاہرہ میں سیّد قطب اپنے ماموں کے گھر قیام پذیر ہوئے اور پوری محنت ولگن سے پڑھتے رہے لیکن جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو ان کی والدہ بھی اپنے سب بچوں کے ساتھ قاہرہ منتقل ہوگئیں تا کہ بچوں کو پوری توجہ اور اچھی تربیت سے پرورش کرسکیں۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد والدہ بھی اپنے خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ سیّد قطب والدہ کی مفارقت سے متاثر اپنے سب بھائی بہنوں کے احساسات کا اظہار ''الاطیاف الاربعة'' میں یوں کرتے ہیں:

''اچھی ماں! ہم اس کتاب کے ذریعہ آپ سے مخاطب ہیں۔ والد کی جُدائی کے بعد ہم سب آپ کے ساتھ وطن سے دور قاہرہ میں پردیسی کی حیثیت سے زندگی گزارتے رہے لیکن آپ رخصت ہوئیں تو ہم خود کو اس دنیا میں ہی اجنبی محسوس کرنے لگے اور زندگی میں اجنبیت کا احساس ہم پر غالب آ گیا''۔[10]

یہاں دارالعلوم کے ماحول میں سیّد قطب کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو اور جلا ملی اور اب وہ اپنے رفقاء میں ممتاز نظر آنے لگے اپنے اساتذہ اور ساتھیوں میں ان کو مخصوص

مقام حاصل ہو گیا۔ جس کا اندازہ سیّد کے ایک اُستاذ محمد مہدی علام کے تاثرات سے ہوتا ہے۔ جب انھوں نے اپنے ان استاذ کی نگرانی میں تیار کردہ مقالہ "مھمة الشاعر فی الحیاۃ" پیش کیا تو انھوں نے فرمایا کہ:

"میں سیّد قطب کو دارالعلوم کے مفاخر میں شمار کرتا ہوں اور جب میں دارالعلوم کہتا ہوں تو اس سے میرا مقصد "دار الحکمة و الادب" ہوتا ہے"۔[۱۱]

امریکہ کا سفر

اوائل ۱۹۴۸ء سے اواخر ۱۹۵۰ء تک سیّد قطب کو ایک سرکاری وفد کے ساتھ امریکہ میں قیام کر کے وہاں نظامِ تعلیم و تربیت کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس وفد کو امریکہ بھیجے جانے کا مقصد ان امریکی پروگراموں کو مصر میں درآمد کرنا تھا جن سے مقلّدانہ ذہنیت رکھنے والے طبقہ کے مفادات وابستہ تھے لیکن سید نے امریکہ اور وہاں کے نظام تعلیم و تربیت کا تنقیدی جائزہ لیا اور مصر کے مشرقی ماحول کے تناظر میں اس کو قطعی نامناسب بلکہ مضحکہ خیز سمجھتے ہوئے عملی طور سے اس کی مخالفت یوں کی کہ وہاں سے واپسی کے بعد مجلسی گفتگوؤں اور تحریروں کی شکل میں اپنے تاثرات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تمام مشاہدات و تاثرات کو "امریکہ التی رأیت" میں جمع کر دیا۔ اس کتاب میں سیّد قطب نے اپنے اس یقین کا اعادہ کیا ہے کہ امریکی نظام تعلیم ہمارے مشرقی ماحول میں قابلِ نفاذ نہیں کیونکہ وہ نظام وہاں کے مغربی ماحول کا عطیہ ہے جس کو ہماری تہذیبی و تمدنی نفسیات کسی صورت میں قبول نہیں کر سکتی اور نہ اس کو قبول کرنے میں ہماری فلاح ہی ہوگی۔ اب سیّد قطب نے ملّت کو اس بات کی دعوت دینی شروع کر دی کہ ہماری فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ ہم اپنا نظام تعلیم اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر تشکیل دیں۔[۱۲] سیّد کو اگرچہ اس دعوت کی راہ میں مخالفتوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سیّد ساری زندگی حق بات کہنے میں چنداں گریز نہیں کرتے۔ خود اعتمادی، جرأت اور بے باکی ان کی پوری شخصیت پر اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ سیّد کا نام آتے ہی ان کی مومنانہ خصوصیات کا

تصوّر بھی خود بخود سامنے آجاتا ہے۔ چنانچہ مصر کی وزارتِ تعلیم میں امریکہ نوازوں خصوصاً اسمٰعیل القبانی نے سیّد قطب پر رجعیت، جمود اور غیر ترقی پسندانہ ذہنیت کے الزامات لگانے شروع کر دیے۔[۱۳] لیکن سیّد نے مغربی تہذیب کو اپنانے میں قوم کے لیے جن خطرات کو محسوس کیا تھا اور اسلامی نظام کو ترک کرنے میں جن نقصانات کو ان کی چشم بصیرت دیکھ رہی تھی اس کا اظہار بلا تأمل کرتے رہے۔

انھوں نے نہ صرف مغربی نظامِ تعلیم و تربیت کو اپنانے کی مخالفت کی بلکہ اسلام کے مقابلہ میں اس جمہوری نظام کے علمبرداروں کی بھی گرفت کی جو رنگ و نسل اور خاندان و اقوام کی عصبیت میں غرق تھے۔[۱۴] جس کے مقابلہ میں اسلام ان عصبیتوں سے بالا ہر کلمہ گو کو ایک صف میں لا کر کھڑا کرتا ہے۔

اس طرح امریکہ سے واپسی کے بعد ان میں اپنے دین کی ان خوبیوں پر غور و فکر کرنے اور اس کی حقانیت کی آواز بلند کرنے کا داعیہ بھی اُبھرا جو مغرب کی مادّی تہذیب سے جنم لینے والے بحران کا مداوا بن سکتی ہے اور ان کے اس یقین میں مزید استحکام اور پختگی پیدا ہوئی کہ اسلام ہی انسان کو ایک متوازن اور صلاحیتوں سے بھرپور زندگی گزارنے کی راہ دکھاتا ہے جبکہ مغربی تہذیب نے دین کے چہرے کو مسخ کر کے اس کو اپنی خواہشات کے مطابق عیش کوشی کا وسیلہ بنا ڈالا ہے۔ سیّد نے وطن واپس ہو کر ہم وطنوں کو مغربی تمدن کے کھوکھلے پن سے متعارف کراتے ہوئے ان کو اسلام کی بنیادی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھال لینے کی پُر زور دعوت دینی شروع کر دی اور ان کو قرآن وسنت کے چمن کی سیر کرنے اور اسی نہج پر اپنی زندگیوں کو سنوارنے پر آمادہ کیا تاکہ ملّت کا ہر فرد ترقّی کی اس راہ پر گامزن ہو جائے جو شرک و بدعات اور فسق و فجور کی ظلمتوں سے پاک وصاف اور ایمان و عمل کے نور سے روشن ہے۔

وہاں انھوں نے مغربی تہذیب وتمدن اور سیاست و معاشرت میں جن تباہ کن خامیوں کو محسوس کیا اس کے اثر سے اسلام اور اسلامی تہذیب سے ان کی وابستگی میں اضافہ ہوا۔ اس وابستگی نے ان میں اسلام کا گہرا مطالعہ کر کے اس کی تہذیب کی حقانیت کو

دنیا کے سامنے ثابت کرنے کا جذبہ اُبھارا۔ چنانچہ اس وقت کم از کم دس گھنٹے یومیہ وہ پڑھنے لکھنے اور مطالعہ میں گزارنے لگے۔[۱۵] اسی زمانے میں انھوں نے ایک مجلّہ ''الفکر الجدید'' نکالنا شروع کیا جس میں ان کے مالی معاون محمد حلمی المیناوی ہیں۔ اس مجلّہ میں جاگیردارانہ نظام پر تنقیدی مضامین کے علاوہ ظالم و جابر حکمرانوں و جاگیرداروں کے استحصال اور سرمایہ داروں کے ظلم و جور سے عوام کو آشنا کرنے کا فریضہ انجام دیا اور اسلامی نظام عدل اور قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلامی معاشرت و معیشت کی خوبیوں کو اُجاگر کیا اور اس کے مقابلہ میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کے ظلم و عدوان کا پردہ فاش کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یوسف العظم کا بیان ہے کہ مجلّہ کے مضامین میں اگر چہ کہیں کہیں سوشلزم کی روح ہی ملحق ہے۔ لیکن اس وقت تک اس نظریہ کا مفہوم سامنے نہیں تھا جس میں وہ دین کو زندگی سے جدا کر کے اس کو اندھیروں میں محصور کرنے کی بات کرتا ہے۔[۱۶]

سیّد قطب ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرتے۔ جرأت و بے باکی سے عدل و انصاف کا مطالعہ کرتے کمزور اور ناتواں لوگوں کو سرکش حاکموں کے چنگل سے نجات دلاتے اور ضعیفوں سے دستگیری کرنے میں اپنی صلاحیتوں کو وقف کر دیتے اور ظالم حکمراں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر کلمۂ حق کی ادائیگی کا عظیم فریضہ انجام دیتے۔

وہ ایک مخصوص تحریکی پروگرام کے مطابق سرگرم عمل ہو کر اور اسلامی زندگی گزارنے کا عملی نمونہ بن کر قوم میں اس دین کی اتباع کرنے کی تحریک پیدا کرنے لگے۔ جو فلاح دارین کی ضمانت دے اور انسان کو گہرائی و گیرائی اور کراہت و خودداری کی دولت سے نوازے۔ لیکن ابھی وہ ان نکات پر سوچ ہی رہے تھے کہ ان کا تعارف اس جماعت سے ہو گیا جس کی تربیت حسن البنّاء جیسے مرد حق کی زیر نگرانی ہو رہی تھی۔ سیّد نے محسوس کیا کہ یہی جماعت تو ان کی آرزوؤں کی تجسیم اور ان کے خوابوں کی تعبیر ہے غالباً اسی احساس نے ان کو ''العدالة الاجتماعیه فی الاسلام'' کے انتساب میں حسن البنّاء کے زیر تربیت اخوان المسلمون کے نوجوانوں کو مخاطب کرنے پر آمادہ کیا اگر چہ سیّد باضابطہ طور پر اس جماعت سے اب تک متعلق نہیں ہوئے تھے لیکن ان کی بصیرت میں ان کو اپنے

خوابوں کی تعبیر نظر آنے لگی تھی۔ چنانچہ یہ کتاب العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام امریکہ جانے سے قبل ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے لکھا:

''ان صالح نوجوانوں کے نام جن کو میں اپنی چشم خیال میں دیکھتا ہوں کہ وہ اس دین کو پھر اسی طرح اپنا رہے ہیں جس طرح وہ ابتدا میں اپنا رہے تھے ...... وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں وہ مومن ہیں ۔ ان کے نفوس کی گہرائیوں میں یہ حقیقت پیوست ہے عزت اللہ اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے''۔ ۱۷

''ان نوجوانوں کے نام جن کے بارے میں ایک لمحہ کے لیے بھی مجھے شک نہیں ہوتا کہ اسلام کی قومی روح نسلوں کے ماضی سے آئندہ نسلوں میں عنقریب ہی ان کو بیدار کردے گی۔'' ۱۸

چنانچہ حسن البناء نے جب اس کتاب کو پڑھا تو بول اُٹھے کہ یہی ہمارے افکار ہیں اور اس کتاب کا مصنف ہماری جماعت کا ایک فرد ہونا چاہیے۔ ۱۹

امریکہ سے واپسی کے بعد ۱۹۵۰ء میں سیّد قطب کو اخوان المسلمون سے گہری وابستگی محسوس ہوئی اور اس جماعت سے ان کے قلبی لگاؤ اور ذہنی تعلق کے مختلف گوشے سامنے آئے۔

سید اپنے جذبۂ خلوص اور اندرونی تحریک سے کسی ایسی جماعت کی تلاش میں سرگرداں تو تھے ہی جس کے شانہ بشانہ چل کر وہ اپنے اسلامی جذبوں کو تسکین دے سکیں یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اگر ان کو قیادت اور لیڈرشپ کی خواہش ہوتی تو اپنی اس خواہش کی تکمیل میں وہ اخوان میں شامل ہونے کے بجائے کسی دوسری تنظیم کی تشکیل کر لیتے اور یقیناً مصری حکومت کی طرف سے ان کو پورا تعاون ملتا لیکن اخوان المسلمون کو ۸ردسمبر ۱۹۴۸ء میں خلاف قانون قرار دیا جاچکا تھا اور اخوان کے ہزاروں نوجوان حوالہ زنداں کردیے گئے تھے اور پھر ۱۲رفروری ۱۹۴۹ء کی شام کو اس جماعت کے مرشد عام حسن

البناء کو سر بازار قاہرہ میں شبان المسلمین کے دفتر کے سامنے شہید کر دیا گیا۔ اس وقت ہسپتالوں سے ڈاکٹروں کی پوری ٹیم غائب تھی۔ آس پاس سڑکوں کی روشنی گل کر دی گئی تھی۔ تاکہ جُرم قتل کی کوئی عینی شہادت دستیاب نہ ہو سکے۔[۲۰] چنانچہ وہ اس تنظیم سے وابستہ ہو گئے جب مرشد عام حسن البنّاء کو شہید کر دیا گیا اور اخوان کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تو ۱۹۵۲ء میں مصر میں فوجی انقلاب آیا تو ''اخوان'' کی آزمائشوں کا دور عارضی طور پر ختم ہو گیا۔ اس دور میں حسن الہضیبی اخوان کے عبدالقادر عودہؒ جنرل سکریٹری اور سید قطب مجلس عاملہ کے رکن اور اخوان کے مرکزی دفتر میں شعبہ دعوت کے انچارج مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنے آپ کو ہمہ تن اخوان کی دعوت کے لیے وقف کر دیا۔ ۱۹۵۴ء میں وہ جریدہ الاخوان المسلمون کے مدیر مقرر ہوئے۔ مگر مصری پیکٹ کی مخالفت کے جرم میں یہ جریدہ ۱۹۵۴ء میں حکومت مصر کے حکم سے بند کر دیا گیا چند ہفتوں کے اندر'' اخوان'' کے پچاس ہزار کارکن جیل کی سلاخوں کے پیچھے ٹھونس دیے گئے۔ ''اخوان'' کے چھ رہنماؤں کو جن میں اخوان کے جنرل سکریٹری عبدالقادر عودہؒ بھی تھے، سزائے موت دی گئی۔ ''اخوان'' کے کارکنوں پر جیل میں سالہا سال تک لرزہ خیز مظالم ڈھائے گئے انھیں گرفتارانِ بلا میں سیّد قطبؒ بھی تھے انھیں مصر کی مختلف اذیت ناک جیلوں میں رکھا گیا اور تین سال تک وہ شدید ترین تعذیب کا شکار رہے۔ اخوان کے چھ رہنما شیخ محمد فرغلی، یوسف طلعت، ابراہیم الطیب، ہنداوی دویر، محمود اللطیف اور عبدالقادر بھی تھے جنھوں نے مسکراتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کیا۔ حسن الہضیبی کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا اور پھر جیل کی تعذیب کے نتیجے میں ان کی صحت اس حد تک خراب ہو گئی کہ حکومت کو انھیں رہا کرنا پڑا۔ اس کے بعد سے وہ اپنے گھر میں نظر بندی کے ایام گزارتے رہے لیکن دوبارہ سازش کے الزام میں انھیں پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اور تین سال قید و مشقت کی سزا سنائی گئی۔

گرفتار شدگان میں سیّد قطب کو بھی بخار کی حالت میں پابند سلاسل کیا گیا اور جیل کی اندھیریوں میں غرق کر دیا گیا۔ بخار کی وجہ سے سید قطب بار بار زمین پر گر جاتے

لیکن جوں ہی ذرا ہوش آتا زبان پر "اللہ اکبر وللہ الحمد" کے نغمے اُبل پڑتے انہیں جب فوجی جیل میں داخل کیا گیا تو جیل کے دروازہ پر ان کی ملاقات جیل کے کمانڈر حمزہ بسیونی اور خفیہ پولیس کے افسروں سے ہوئی جیسے ہی سید قطب نے جیل کے اندر قدم رکھا تو جیل کے کارندے ان پر ٹوٹ پڑے اور پورے دو گھنٹے تک ان کو زدوکوب کیا جیل کے اندر ان پر پولیس کے کتّے بھی چھوڑے گئے جو ان کی ران منہ میں لیکر انھیں ادھر اُدھر گھسیٹتا رہا اس تمہیدی کارروائی کے بعد انھیں ایک کوٹھری میں لے جایا گیا اور ان سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا اور مسلسل سات گھنٹے تک جاری رہا۔ سید قطب کی جسمانی طاقت اگرچہ جواب دے چکی تھی لیکن قلبی حرارت اور اطمینان وصبر کی طاقت نے انھیں پتھر کی چٹان میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان پر گوناگوں اذیتوں کی بارش ہوتی رہی۔ مگر وہ "اللہ اکبر وللہ الحمد" کے سرور جاودانی میں مستغرق رہے۔ رات کو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں ڈال دیے جاتے اور صبح کے وقت بلا ناغہ انھیں پریڈ کرائی جاتی ان کے سر پر کبھی ٹھنڈا پانی اور کبھی گرم پانی ڈالا جاتا۔ فحش کلامی اور بیہودہ اشاروں سے ان کی توہین کی جاتی۔ موصوف کے ایک شاگرد جناب یوسف العظم لکھتے ہیں :

"تعذیب کے گوناگوں پہاڑ سیّد قطب پر توڑے گئے۔ انھیں آگ سے داغا گیا۔ پولیس کے کتوں نے انھیں کچلیوں میں لیکر گھسیٹا ان کے سر پر مسلسل کبھی گرم پانی اور کبھی ٹھنڈا پانی انڈیلا گیا۔ انھیں لاتوں اور گھونسوں سے مارا گیا دل آزار الفاظ اور اشاروں سے ان کی توہین کی گئی۔ مگر ان سب چیزوں نے سید کے ایمان میں اضافہ کیا اور حق پر ان کے قدم مزید جم گئے"۔[۲۱]

عزیمت کی ایک مثال

۱۹۵۵ء کو مصر کی عوامی عدالت کی طرف سے سید قطب کو ۱۵ سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔ عوامی عدالت کا یہ فیصلہ ان کی غیر موجودگی میں سنایا گیا۔ کیونکہ یہ موصوف اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ وہ عدالت میں حاضر نہ ہو سکتے تھے۔ ۱۵/سالہ قید

بامشقت کا ابھی ایک سال گزرا تھا کہ جمال عبدالناصر کی طرف سے ایک نمائندہ سیّد قطب کے پاس جیل خانے بھیجا گیا۔ اس نے سیّد قطب کو یہ پیشکش کی ''اگر آپ چند سطریں معافی نامہ کی لکھ دیں جنہیں اخبارات میں شائع کیا جا سکے تو آپ کو رہا کر دیا جائے گا اور جیل کے مصائب سے نجات پا کر آپ گھر کی آرام دہ زندگی سے متمتع ہو سکیں گے''۔ اس پیشکش کے جواب میں مردِ مومن نے جو جواب دیا اسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی انہوں نے کہا:

''مجھے ان لوگوں پر تعجب آتا ہے جو مظلوم کو کہتے ہیں کہ ظالم سے معافی مانگ لے خدا کی قسم اگر معافی کے چند الفاظ مجھے پھانسی سے بھی نجات دے سکتے ہوں تو میں تب بھی کہنے کو تیار نہ ہوں گا اور میں اپنے رب کے حضور اس حال میں پیش ہونا پسند کروں گا کہ میں اس سے خوش ہوں اور وہ مجھ سے خوش ہو''۔ ۲۲

جیل میں جب کبھی ان سے پیشکش کا ذکر کیا گیا اور معافی کا مشورہ دیا گیا تو انھوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ ''اگر میرا قید کیا جانا برحق ہے تو میں حق کے فیصلے سے راضی ہوں اور اگر باطل نے مجھے گرفتار کر رکھا ہے تو میں باطل سے رحم کی بھیک مانگنے کے لیے تیار نہیں ہوں''۔ عوامی عدالت (محکمۃ الشعب) کی کارروائی حکومت کی طرف سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کارروائی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ سیّد قطب کو حکومت کی طرف سے وزارتِ تعلیم کی پیشکش بھی کی گئی تھی لیکن انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی تھی کہ وزارت کا قبول کرنا اس وقت تک لاحاصل ہے جب تک مصر کے نظامِ تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا اختیار نہ ہو۔

سید قطب شہیدؒ کے سیاسی افکار

اٹھارہویں صدی کے اوائل سے اس وقت تک اسلامی احیاء اور سیاسی بیداری کی جتنی کوششیں عرب دنیا میں ہوئیں ان میں سب سے ممتاز مقام 'الاخوان المسلمون' یا زیادہ صحیح طور پر 'جمیعۃ الاخوان المسلمون' کو حاصل ہے جس کی بناء حسن البنا نے

مصر میں ڈالی۔

الاخوان المسلمون دنیائے عرب میں عہد حاضر کی سب سے بڑی اسلامی تحریک ہے جو ۱۹۲۸ء میں وجود میں آئی اور مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی ۱۹۵۴ء میں یہ شدید آزمائش سے دوچار ہوگئی اور ابھی تک اس کی آزمائش کا یہ طویل دور ختم نہیں ہوا۔لیکن ۱۵رسال کے عرصہ قلیل میں اس تحریک نے جو کام انجام دے دیا تھا وہ اس قدر دوررس، پرانگیز ثابت ہوا کہ کہنے کو تو یہ جماعت ختم کردی گئی مگر ذہن وقلب سے اس کی دعوت نہ محو ہوئی نہ ذوق ونگاہ اس کی عشق ومستی سے بیگانہ ہوسکے نہ اس کے تراشے ہوئے اخلاق و کردار زنگ آلود ہوئے۔ دل برابر اس کی یاد سے معمور ہے اور نگاہ پیہم اس کی جلوہ آفرینیوں سے مسحور ہیں اور مؤرخ کا قلم یہ لکھنے پر مجبور ہوگیا کہ گو اس خدا پرست جماعت کو تنظیم کی حیثیت سے منتشر کردیا گیا ہے۔مگر یہ تحریک کی حیثیت سے نہ صرف قائم ودائم ہے بلکہ کوئی آمریت کوئی استبداد اور کوئی سازش اسے محروم وجود نہیں کرسکتی۔ بلکہ سرزمین عرب اب پھر اس دعوت کی شدت سے پیاس محسوس کررہی ہے اور قومیت ولادینیت، اشتراکیت وبعثیت ،اور ملوکیت وآمریت کے ہزاروں آستانوں پر جبہ سائی کے بعد اب پھر وہ اپنے یگانہ ویکتا مرکز کی طرف لوٹ آنے کو بے تاب ہیں اور فطرت اشارہ کررہی ہے کہ اب پھر کوئی حسن البنّاء اٹھنے والا ہے اور خزاں رسیدہ چمن کی آبیاری کرنے والا ہے۔[۲۳]

تحریک کی تاریخ

۱۹۲۹ء میں حسن البنا نے اسماعیلیہ میں 'جمیعة الاخوان المسلمون' کے نام سے اس تحریک کا سنگ بنیاد رکھا جو بعد میں عرب دنیا کی سب سے طاقتور تحریک بن گئی رسمی طور پر اس قیام کا اعلان ۱۱راپریل ۱۹۲۹ءکو کیا گیا۔۱۹۳۳ء میں حسن البناءکو تبادلہ قاہرہ میں ہوگیا اس وقت تک تحریک کی شاخیں مختلف شہروں اور قصبوں میں قائم ہوچکی تھیں اور اسماعیلیہ ان کا مرکز تھا۔

قاہرہ میں یہ تحریک تنظیم و توسیع کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی دوسری جنگ عظیم سے پہلے اس کی تنظیم نہ صرف سارے قصبوں بلکہ بعض دوسرے ممالک میں بھی قائم ہو چکی تھی بلکہ یہ تحریک اتنی قوی ہوگئی تھی کہ معاشرتی نوعیت کے بعض مطالبات حکومت کے سامنے رکھ دیے گئے۔

۱۹۳۶ء میں فلسطین کی کشمکش شروع ہوئی ''الاخوان'' نے ہر ممکن طریقے سے عربوں کی حمایت کی۔ یہ تحریک برطانیہ کے سخت خلاف تھی اور آخر تک رہی۔ عرب و فلسطین کی حمایت کی بناء پر سارے عرب ممالک میں ''الاخوان'' مقبول ہو گئے۔

تحریک میں وسعت و ترقی

۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک سیاسی لحاظ سے الاخوان کی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہوگئی۔ اس کی سرگرمیوں اور پروگراموں میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوگئی۔ اب اخوان کے اندر قاہرہ یونیورسٹی اور ازہر یونیورسٹی کے نوجوان جوق در جوق شامل ہو گئے۔ مختلف پیشہ ور عناصر جن میں مزدور، تاجر، صنعت کار، کاروباری لوگ، انجینئر، ڈاکٹر، ٹیچر اور وکیل شامل تھے جو اس جماعت سے وابستہ ہو گئے اور مصری معاشرے کے تقریباً تمام گروہوں کی نمائندگی ہونے لگی۔ اخوان نے ایک طرف اقتصادی زندگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اخوان کی شاخیں جو مصر کے کونے کونے میں پھیل چکی تھیں بڑے منظّم طریقے سے ہر کام کو سرانجام دینے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اخوان ایک ایسی طاقت بن گئے جسے اب نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔[۲۴]

تحریک کا عروج

صرف مصر کے اندر الاخوان کے فعال کارکنوں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی۔ اپنے حامی و مددگار اور متفق لوگوں کی تعداد فعال کارکنوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ اسی طرح مصر کے اندر الاخوان کی شاخوں کی تعداد دو ہزار سو ڈال کے اندر ۵۰ ہوگئی۔ دوسرے

عرب ممالک میں بھی متعدد شاخیں کھولی گئیں۔[۲۵]

۱۹۳۸ء تک اس تحریک میں پوری پختگی پیدا ہوچکی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کی ابتداء کے ساتھ ''الاخوان'' نے سیاسی تنظیمی، معاشی، معاشرتی اور تجارتی جدوجہد کے لیے میدان میں قدم رکھا۔ رُکنیت میں ایسے لوگوں کا اضافہ ہوا جو دماغی کام کرنے والے یا معاشرے کے زیریں طبقے سے تعلق رکھنے والے تھے۔

جنگ عظیم (۱۹۳۹ء۔۱۹۴۵ء) کے دوران میں مصر کے سیاسی حالات نہایت خراب رہے۔ انگریزی سامراج کے خلاف ''الاخوان'' کی جدوجہد اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ دوران جنگ کے وزارتی ردوبدل انگریز آقاؤں کے اشارہ چشم پر ان کے مفاد کے مطابق ہوتے تھے جس کے نتیجے میں ''الاخوان'' کے تعلقات ان وزارتوں سے بہت خراب تھے۔

جنگ کے اختتام کے بعد اور اسماعیل صدقی کی وزارت کے زمانے میں فروری-دسمبر ۱۹۴۶ء انگریزی اقتدار کے خلاف ''الاخوان'' کے مظاہروں اور اور سرگرمیوں میں اور زیادہ شدت پیدا ہوگئی معاشی اور ثقافتی میدانوں میں عدم تعاون کی التجاء کی گئی۔ یہاں تک کہ وہ مصر سے غیر مشروط انخلاء پر آمادہ ہوجائیں۔ مصری حکومت سے انھوں نے مطالبہ کیا کہ انگریزوں سے مذاکرات ترک کر کے ان کے خلاف اعلان جہاد کیا جائے۔ ۱۹۴۸ء کی جنگ فلسطین میں ''الاخوان'' نے عرب لیگ پرچم تلے حصہ لے کر عدیم المثال جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کیا۔ ان کے بہت سے آدمی جنگ میں کام آئے۔ محمود فہمی النقراشی (دسمبر ۱۹۴۶ء۔۱۹۴۸ء) نے اعلان جہاد کے دوبارہ مطالبے پر جنگ فلسطین سے پیدا شدہ حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انگریزوں کو خوش کرنے اور اپنی حکومت قائم رکھنے کے لیے ۸ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو ''الاخوان'' کو غیر قانونی تنظیم قرار دے کر ان پر پابندی عائد کردی۔ بیس روز بعد النقراشی کو قتل کرادیا گیا۔ اس قتل کا الزام ''الاخوان'' پر لگایا گیا۔ چنانچہ جوابی کارروائی کے طور پر ۱۲ر فروری ۱۹۴۹ء کو حسن البناء کو قتل کردیا گیا۔ اس وقت جو حالات تھے ان کے پیش نظر اس قتل میں حکومت کا ایما معلوم

ہوتا تھا۔حکومت نے تحریک کو کچل ڈالنے کی پوری کوشش کی۔ ۱۲رجنوری ۱۹۵۰ء کو نحاس پاشا کی حکومت نے ''الاخوان'' پر سے پابندیاں ہٹانا شروع کر دیں اور ۱۵ردسمبر ۱۹۵۱ء کو ''الاخوان'' کی بعض جائیدادیں واگذار ہوئیں۔جن میں مرکزی دفتر اور مطبع کی عمارتیں بھی شامل تھیں۔ یہ دور نئے سرے سے تعمیر کا دور ہے۔''الاخوان'' نے اپنی گم شدہ حیثیت جلد دوبارہ حاصل کر لی اور ۱۹۵۱ء کی آزادی کی کشمکش میں پورا حصہ لیا۔داخلی سیاست میں اس زمانے میں ''الاخوان'' نے کسی قدر محتاط طرزِ عمل اختیار کیا۔ یہ دور اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ ''الاخوان'' کے مصنّفین نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر معرکہ آرا تصانیف تیار کیں اور موجودہ دور کے مسائل کا تفصیلی حل پیش کیا۔''الاخوان'' کی فکری تاریخ میں یہ دور نہایت نتیجہ خیز ہے۔

شاہ فاروق شروع سے تحریک سے حد درجہ خائف تھا اور حسن البنّاء سے بے حد مرعوب۔اس نے انگریزوں کے اشارے پر ''الاخوان'' کو انقلاب پسندی فوجی افسروں کے خلاف استعمال کرنا چاہا مگر یہ ممکن نہ ہوسکا۔انقلاب کے شروع ہوتے ہی ''الاخوان'' نے انقلاب کی پوری حمایت کی اور فوجی افسروں سے مل کر اپنے مشترکہ دشمن شاہ فاروق سے پیچھا چھڑا لیا۔شاہ فاروق کا کہنا یہ تھا کہ اسے نکالنے والے اصل میں ''الاخوان'' بھی ہے اور انھیں نے فوجی افسروں کو اس کے خلاف استعمال کیا۔

فوجی افسروں سے ''الاخوان'' کے تعلقات کی ابتداء دوسری جنگ عظیم کے شروع ۱۹۴۰ء میں ہوچکی تھی۔حسن البناء نے اپنی دعوت کو فوجی افسروں میں پھیلانے کی طرف خاص توجہ کی تھی اور مختلف ذرائع سے فوج میں نفوذ حاصل کر لیا تھا۔دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ''الاخوان'' کا اثر فوج دوش بدوش لڑے اور ''الاخوان'' کی پامردی اور خلوص نے ان افسروں کو بہت متاثر کیا۔خود جمال عبدالناصر پر ''الاخوان'' سے عداوت کا الزام تھا۔ ۱۹۵۱ء۔۱۹۵۲ء کی جنگ سوئیز میں ''الاخوان'' کو پھر فوجی افسروں کی معیت میں دادِ شجاعت دینے کا موقع ملا۔اس طرح دونوں بہت قریب آ گئے۔ ۱۹۴۸ء میں تنظیم کے غیر قانونی قرار دیے جانے کے بعد بھی دونوں کے تعلقات برقرار رہے تھے۔مگر ان

تعلقات کے ساتھ یہ حقیقت ہے کہ اپنے فوجی افسر بھی کسم نہ تھے۔ جو اپنا طریق کار ''الاخوان'' سے آزادرہ کر متعین کرنا چاہتے تھے۔اس کے علاوہ ان میں بعض ''الاخوان'' سے قریب ہونے کے باوجود مغربی اثرات کے تحت لادینیت (سیکولرزم) کی طرف مائل تھے۔

۲۳/جولائی ۱۹۵۲ء کو انقلاب برپا ہوگیا انقلابی کونسل ''الاخوان'' سے ہمدردی رکھتی تھی۔ چنانچہ حسن البناء کی برسی کے موقع پر اعلیٰ فوجی افسروں نے انھیں خراج عقیدت وتحسین پیش کیا۔ شروع میں دونوں میں اتنی قربت تھی کہ انقلابی کونسل ''الاخوان'' سے ہمدردی کا آلۂ کار سمجھا جانے لگا تھا۔ جدید مصر کی تعمیر کن اصولوں پر ہو۔ اور کس کی رہنمائی؟ یہ اپنا سوال تھا کہ جس نے دونوں کے درمیان اختلاف کی ناقابل عبور خلیج پیدا کردی۔ جو بڑھتی ہی چلی گئی۔ ''الاخوان'' اسلامی ریاست کے قیام کے خواہاں ہے۔اور اسلامی خطوط پر حکومت کی رہنمائی کرنا چاہتے تھے۔ انقلابی ان کی رہنمائی پر کسی طرح رضامند نہ تھے اور بعض لادینی ریاست کو ترجیح دیتے تھے۔ ''الاخوان'' کی یہ تجویز محرمات کا مکمل انسداد ہو مابعد میں یہ تجویز کی کہ قانون سازی ان کی نگرانی میں ہو، مسترد کردی گئی۔شہر سوئیز پر انگریزی مصری مذاکرات کے ''الاخوان'' شدید مخالف تھے وہ انگریزوں سے سوئیز سے غیر مشروط انخلاء پر مصر اوراس کے سخت خلاف تھے کہ سوئیز کو بین الاقوامی شاہراہ تسلیم کیا جائے اور انگریزوں کو واپسی کا حق دیا جائے۔

۲۸/مارچ ۱۹۵۴ء کو جمال عبدالناصر فوجی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے اُبھرے اور یکم ستمبر ۱۹۵۴ء کو انخلاء کے معاہدے پر انگریزی اور مصری حکومت کے دستخط ہوگئے۔ اب حکومت اور ''الاخوان'' کی کشمکش نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ ۲۶/اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ایک شخص نے جمال عبدالناصر کی جان لینے کی ناکام کوشش کی اس شخص کو ''الاخوان'' سے منسوب کیا گیا اور تجربات کو غیر قانونی قرار دے کر بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں۔ آٹھ اخوانیوں کو جن میں بعض بہترین دماغ اور چوٹی کے فضلاء تھے پھانسی دے دی گئی۔ تین سو کو طویل المیعاد قید بامشقت کا حکم ہوا اور دس ہزار سے زیادہ کو مختلف سزائیں دی

گئیں۔ انقلابی حکومت سے ''الاخوان'' کے تعلقات کیسے ہی رہے ہوں۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انقلاب کی راہ ''الاخوان'' کی ہموار کی ہوئی تھی اور فوجی حکومت نے ''الاخوان'' ہی کے لگائے ہوئے پودے کے پھل کھائے۔[۲۶]

الاخوان المسلمین اور اس کی دعوت کی کنجیاں

حضور اکرم ﷺ نے حضرت حذیفہؓ سے فرمایا:

''تم مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام سے چمٹے رہو۔'' (متفق علیہ)

مسلمانوں کے لیے ایک جماعت اور امام کا ہونا ضروری ہے۔ اور ایک مسلمان کی بہت بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام سے چمٹا رہے۔ آج تو اسلامی جماعت کا تصور ہی غائب ہو چکا ہے اور جماعت اور امام تک پہنچنے کے لیے صحیح راستہ کیا ہو؟ یہ بھی مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حسن البنا کو یہ توفیق دی کہ جماعت اور امام کو وجود میں لانے کے لیے انھوں نے صحیح اور مکمل راستہ کی رہنمائی کی اور اس مقصد کے لیے جن چیزوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور جس عملی پروگرام اور منصوبہ کی حاجت لاحق ہو سکتی ہے۔ ان سب کو ساتھ لے کر آگے بڑھے کیونکہ مسلمانوں کی کوئی بھی جماعت ہوگی اور افراد کا کوئی بھی مجموعہ ہوگا اس کے اندر فہم وشعور کو بیدار کرنے اور اس کی قیادت کو سکھانے اور جلا بخشنے کے لیے بہت سی شرطیں درکار ہوں گی اور مجھے معلوم نہیں کہ دور جدید کی کسی انجمن یا مجموعۂ افراد کے اندر تمام امور اتنے زیادہ پائے جاتے ہیں، جتنے زیادہ استاد بناء کی برپا کی ہوئی تحریک کے اندر پائے جاتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس دنیا میں مسلمانوں کی جماعت سے مراد وہ جماعت ہے جو کسی مزید صفت سے بے نیاز ہو کر خالص اسلامیت سے متصف ہو وہ ہمیشہ اس کی روشنی میں معتدل ہو یا تغیر و انقلاب لائے یا تعمیری کام کرے اور مسلم جماعت وہ ہے جو فرد اور گھرانہ، قوم اور ملک اور پوری دنیا کے دائرے میں اسلام کی اقامت کے لیے کام کرے نیز مسلمانوں کی جماعت کی امتیازی خصوصیت

یہ ہے کہ اسلام کو سمجھتی ہے اور اس پر اس طریقے سے عمل کرتی ہے جس طریقے سے رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام نے عمل کیا تھا اور یہ اس امت کی نصوص کی روشنی میں مستقل صفت رہی ہے۔ جو قیامت تک باقی رہے گی اس وجہ سے مسلم جماعت کی یہ ذمہ داری ہے کہ پچھلی زبانوں میں امتِ اسلامیہ جن عقائد، فقہ اور سلوک واخلاق سے متصف رہی ہے۔اس پر عمل کرنے اور ان کا دامن تھامے رہنے کے سلسلہ کو برقرار رکھے۔ اخوان المسلمون نے اسی ذمہ داری کا بیڑا اٹھایا ہے۔ چونکہ یہ مسلمانوں کے فرائض میں شامل ہے کہ ان کی وفاداریاں صرف مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ ہیں۔ اس لیے ان کا تقاضہ ہوا کہ ہر علاقے میں ایک ایسا نظم قائم ہو جو مسلمانوں کی جماعت کی نمائندگی کر سکتا ہوتا کہ ایک مسلمان کی دوستی اور وفاداری ضائع اور برباد نہ ہوں یا روزانہ کی ضروریات اور تقاضوں سے مجبور ہو کر غیر مسلموں کے ساتھ اسے استوار نہ کر لیا جائے اور چونکہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے احکام کو قائم کریں اس لیے اس امر کا تقاضا ہے کہ ایک ایسی جماعت قائم کی جائے تو اس مقصد کے لیے کام کریں کیونکہ یہ مقصد بغیر اجتماعیت کے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا اور چونکہ اخوان المسلمین کی جماعت اور ان تمام مقاصد کی خاطر کام کر رہی ہے اور انھیں حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ کر رہی ہے۔اس لیے اس کا وجود اور قیام ایک اسلامی فریضہ ہے جس کا تقاضا خود اسلامی ضروریات کر رہی ہیں یہ وہ دوسری کلید ہے، جس سے اخوان المسلمین اور اس کی دعوت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

پھر کچھ ایسے کام اور ذمہ داریاں ہیں جن کو انجام دینا ناگزیر ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ مسلمان ساری طاقتوں اور ہستیوں سے اپنا ناطہ توڑ کر اسلام کے لیے خالص کر لیں۔ اسلام کی پابندیوں سے گریز کرنے کے بجائے اسے اپنا مقصدِ حیات بنا لیں۔ جہالت اور کفر سے نکل کر علم اور اسلام کی طرف آئیں۔ غفلت اور سرمستی سے بیدار ہو کر شعور و آگہی کی منزل میں قدم رکھیں اور ان کاموں کی انجام دہی خود ایک اسلامی جماعت کے قیام کی متقاضی ہے اور یہ جماعت اللہ کی توفیق اور اس کے فضل سے حسن البناء کے ہاتھوں تشکیل پائی۔

اخوان المسلمین کا وجود ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا تقاضا علمی اور عملی طور پر اور حالات کی پکار کے لحاظ سے خود احیائے اسلام کے کاز نے کیا اور اخوان کی بقا اور ان کا استحکام و تسلسل خود اسلام کی نگہداشت اور اس کی حفاظت اور اس کی اقامت کا تقاضا ہے اگر اسلام کے مقاصد حل کرنے ہیں تو انھیں موجود رہنا چاہیے بلکہ ان کو قوت و طاقت بہم پہنچنی چاہیے۔ یہ سب وہ فرائض ہیں جنھیں اللہ عز و جل نے فرض کیا ہے اور جو لوگ مسلمانوں میں سے پوچھتے ہیں کہ اخوان کی ضروریات کیا ہیں انھیں یہ جواب ملنا چاہیے کہ اگر اخوان نہ ہوتے تو ملت کا کیا ہوتا اور اگر ان کا وجود نہ ہو تو مستقبل میں کیا ہوگا؟

حتیٰ کہ مسلمان علماء جو احیاء اسلام میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ بھی بس اسلام کے بعض اجزاء کو زندہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور بیشتر اوقات ان کے اور دور جدید کی روح کے درمیان ایک پردہ حائل رہتا ہے پھر ان میں سے بہتوں کو حادثات و واقعات اسلام سے بہا دیتے ہیں یا دور پھینک دیتے ہیں خود ان کے اندر کوئی دلچسپی یا بیزاری نہیں ہوتی۔ اگر ہم نے اس مسئلہ کی وسعتوں کو سمجھ لیا ہے تو اخوان المسلمین اور ان کی دعوت کے مہم کی ایک کلید ہمارے ہاتھ آ گئی ہے۔

اخوان المسلمین کی دعوت اسلام کے سیاسی پرچم کو بلند کرنے کی واضح علامت ہے تمام علاقوں میں نہ سہی لیکن بہتیرے علاقوں میں یہ جماعت اسلام کے سیاسی علم اٹھائے ہے۔ اس کے بغیر اسلام کا سیاسی علم سرنگوں رہتا۔ اور حقیقت ہے کہ تمام مسلم علاقوں میں ایسی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں جو غیر اسلامی سیاست کے پرچم بلند کر رہی ہیں۔ کوئی وطنیت کا پرچم اٹھائے ہوئے ہے تو کوئی قومیت کے آگے سجدے کر رہی ہے۔ کوئی نام نہاد انسانیت اور انسانی حقوق کے نام پر بے وقوف بنا رہی ہے تو کسی کا قبلہ و کعبہ سوشلزم اور کمیونزم ہے اور ان میں سے ہر نظریہ کے علم برداروں میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد شامل ہے۔ لیکن اسلام کے سیاسی پرچم کو اٹھانے والا کوئی نہیں۔ حالانکہ اللہ کے دین کے بارے میں یہ بات صاف طور سے معلوم ہے کہ اسلام ایک مکمل اور جامع نظام حیات ہے لیکن دولت عثمانیہ کے سقوط کے بعد بلکہ اس سے پہلے بہت سے مسلم

ممالک پر کافر طاقتوں کے قبضہ کے بعد اسلام کا سیاسی نظام کو قائم کرنے کے لیے پرچم اٹھایا جاتا چنانچہ اخوان نے آگے بڑھ کر یہ پرچم اٹھالیا۔ یہ ایک اور کلید ہے جس سے اخوان المسلمین اور ان کی دعوت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

اخوان کی تحریک ایسی ہے جس کا ساتھ دینا دور جدید کے مسلمانوں کے لیے بہت سے فرائض کی تکمیل کے لیے ضروری ہے حتیٰ کہ ایک مسلمان کی بھی زندگی اگر اسلامی ہوتو بھی بہت سے ایسے اسلامی مقاصد ہیں جو اجتماعی عمل کے محتاج ہیں۔ مثال کے طور پر دعوت کا ایسا فہم حاصل کرنا جو دور جدید سے ہم آہنگ ہو، جدید وقدیم کفر کے ساتھ اسلام کی مسلسل کشمکش کو سمجھنا پوری دنیا میں مسلمانوں کے حالات و واقعات سے واقفیت حاصل کرنا اور ان کی مدد کرنا۔ روزمرّہ زندگی میں اسلام پر عمل کرنے کی وجہ سے آنے والی مزاحمت اور رکاوٹوں کو دور کرنا اسلامی کاز جس کے سایہ تلے رہنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ یہ تمام چیزیں اس بات کا تقاضہ کرتی ہیں کہ اسلامی جماعت کے ساتھ مل کر زندگی بسر کی جائے یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اخوان کی حرکت و زندگی جامع و ہمہ گیر زندگی ہے جو ہر بلندی و برتری اور ارتقاء پر حاوی ہے اور تمام طاقتوں کو ڈائنامیٹ کرتی ہے۔ اسی لیے کسی مسلمان کے لیے اس کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اس دعوت سے پیچھے رہ جائے۔ [۲۷]

اہم نظریات

''الاخوان'' کے نزدیک قومیت کا مغربی تصور کی بناء زبان، علاقے، نسل یا ثقافت پر ہو۔ یہ سراسر غیر اسلامی اور ناقابل قبول ہے۔ اس کی ترقی اسلام کا تنزل ہے۔ قومیت کے مغربی تصور کو اپنانے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اسلامی اتحاد پارہ پارہ ہو گیا اور عیسائی اور یہودی سامراجی طاقتیں مسلمانوں پر مسلط ہوگئیں ان کے خیال میں قومیت کے نظریے کو قبول کرنے کا مطلب سامراجی طاقتوں کے ہاتھ مضبوط کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قومیت کو ''جاہلیت جدیدیہ'' کہتے ہیں۔

''الاخوان'' کے نزدیک صرف اسلام ایسی چیز ہے جو دینی اور دنیوی معاملات میں مسلمان افراد اور مسلمان ملکوں اور حکومتوں کی رہنمائی کرسکتا ہے ان کے نزدیک اسلام صرف روحانی اور مذہبی معاملات پر مشتمل نہیں وہ بیک وقت ایمان وعبادت، وطن وقوم، مذہب وحکومت، روحانیت وعمل، قرآن وشمشیر، سب کچھ ہے۔ اسلام ایسے عالم گیر اور دائمی اصولوں کے مجموعے کا نام ہے جو زمان ومکان کی قیود سے ماوراء ہیں اور ہر نسل رنگ وقوم کے لیے قابل عمل۔ اسلام کے اس جامع تصور کے نتیجے میں وہ سیاست اور مذاہب کی علیحدگی کے سخت ترین مخالف ہیں۔ یہ علیحدگی اب تک قطعی خارجی عنصر ہے جو عیسائی مبلغین، مستشرقین مغرب زدہ سیاست دانوں اور مغربی تعلیم کے ذریعے مسلمانوں میں داخل ہوا۔ اسلام کو سیاست وحکومت سے علیحدہ رکھنے کا مطلب ''الاخوان'' کی نظر میں اسلام کا گلا گھونٹنا ہے۔

اسلام کے نظریۂ دوام وآفاقیت اور انسانی معاشرے کے تغیر پذیر ہونے کی بناء پر ''الاخوان'' اجتہاد کے استعمال پر پورا زور دیتے ہیں۔ فقہ کے عظیم الشان ذخیرے کو وہ اس مسلسل جدوجہد کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ جو ضروریات ومسائل کو سامنے رکھ کر اسلام سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کی گئی۔ وہ اس ذخیرے کے شایانِ احترام اور قیمتی ہونے کے قائل ہیں مگر آخری سند صرف قرآن وسنت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن قرآن وسنت کی تعبیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کی تعبیرات سے ہم آہنگ ہو۔ حق اجتہاد ہو۔ حق اجتہاد کا کام صحیح استعمال ان کے نزدیک اسی وقت ہوسکتا ہے۔ جب انسان کے نفس کا تزکیہ ہوچکا ہو اور وہ فضائی آلودگیوں اور امراض سے پاک ہوچکا ہو۔

''الاخوان'' کی نظر میں سیاست وحکومت اسلام کے کل کا ایک ایسا لازمی جز ہے، جسے اس کے اخلاقی اور روحانی اجزاء سے کسی طرح جدا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ حکومت کو ارکان اسلام میں سے ایک رکن بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا مرتبہ بنیادی اصول و عقائد کا ہے نہ کہ فقہی فروع کا۔ اسلام کا سیاسی نظام ان کے نزدیک نظریۂ خلافت پر مبنی

ہے۔ جس کے مطابق انسان کی حیثیت خدا کے بندے اور اس کے نائب کی ہے اس طرح انسان صرف ایک محدود نیابتی اقتدار کا مالک ہے۔ اسلام کا نظام ان کے نزدیک مذہبی حکومت (تھیوکریسی)، جمہوریت، آمریت اور شہنشاہیت سب سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ خلیفہ کے لیے وہ ''قرشیت'' کی شرط کو ضروری نہیں بتاتے۔ خلیفہ کا انتخاب براہِ راست یا شوریٰ کے واسطے دونوں طرح ہوسکتا ہے۔ خلیفہ کی اطاعت اس پر منحصر ہے کہ وہ شرعی قوانین کی پیروی اور ان کا نفاذ کرے شرعی قوانین کی کھلی ہوئی خلاف ورزی سے اطاعت کا فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔ الاخوان کے نزدیک شوریٰ کے ارکان شریعت کے عالم، صاحب صلاح وتقویٰ اور زمانے کے حالات کے واقف کار ہونا چاہیں۔

اسلامی ریاست کی اہم ترین ذمہ داری قانون شریعت کا نفاذ ہے۔ شریعت ان کے نزدیک ان اصول اور نظریات کا مجموعہ ہے۔ جنھیں خدا نے قرآن کی شکل میں انسان کی ہدایت کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا۔ جو اس کے شارح اور مبین ہیں۔ یہ مکمل زندگی کا نظام ہے اور انسانی زندگی کو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت قرار دے کر عمل پیرا ہوتا ہے خدا کا یہ نازل کردہ قانون، خواہ فوج داری ہو یا دیوانی یا شخصی انسان کے غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ قانون سازی کا حق صرف اللہ کو ہے۔ رسول کی حیثیت اس قانون کے لانے والے اس کے نافذ کرنے والے اور اس کی شرح وتفصیل کرنے والے کی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی ریاست میں ''الاخوان'' کے نزدیک قانون سازی کی سرے سے گنجائش ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شریعت نے ہمیں عمومی نوعیت کے اصول دیے ہیں۔ ہر موقع اور ہر محل کے لیے تفصیلی قوانین نہیں دیے۔ خاص طور سے زمان ومکان کے اختلاف سے متاثر ہونے والے معاملات ہیں اس طرح ملّت اسلامیہ کے لیے وضع قوانین کے حق اور عمل اجتہاد کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ قانون سازی کے عمل پر یہ پابندی ضرور ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں اور روح سے متصادم نہ ہو اور منصوص احکام سے توافق رکھے۔ شریعت کے اصول وقواعد کو مجروح کرنے والے سارے قوانین باطل ہیں۔

''الاخوان'' کے نزدیک معاشی آزادی اور استحکام کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ روٹی کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ مگر ان کے نزدیک مسلم ممالک کے درد کا مداوا سرمایہ داری، اشتراکیت نہیں۔ یہ سب نظام ان کی نظر میں اسلام کی روح سے متصادم ہیں اور مسلمانوں کے مخصوص مسائل کو حل کرنے کے ناقابل۔ صرف خالص اسلامی بنیادوں پر معاشی تنظیم ہی مسلمانوں کے مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ ان کے نزدیک معاشی میدان میں اسلام کا مقصود معاشری بہبود ہے۔ اس کے حصول کے لیے اسلام جہاں قانون سازی سے مدد لیتا ہے تا کہ ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آ سکے اور قائم رہ سکے۔ اور ایک مخصوص سطح سے نیچے نہ گرنے پائے۔ وہاں وعظ و نصیحت، تبلیغ و ارشاد اور اخلاقی تعلیم کو بہت زیادہ اہم قرار دیتا ہے تا کہ انسان جانور کے مرتبے سے اُٹھ کر ایک ارتقاء یافتہ اور اخلاقی زندگی گزارنے کے لیے شورائی طور پر تیار ہو سکے۔ ''الاخوان'' کے نزدیک اسلام ذاتی ملکیت کو جائز قرار دیتا ہے مگر صرف اس حد تک کہ معاشرے کے مجموعی مصالح سے اس کا تصادم نہ ہو سکے۔ ''الاخوان'' ہی وہ پہلی جماعت ہے جس نے حقیقتوں کی تجدید کا مطالبہ کیا۔ اور وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ جبر پر مبنی غیر فطری معاشی مساوات کا اسلام قائل نہیں۔ اسلام نہ تو قعات کو ختم کرتا ہے اور نہ تو طبقاتی منافرت اور کشمکش کی تبلیغ کرتا ہے وہ بالائی اور زیریں طبقات کے فرق کو کم سے کم تر کر کے ایسے باہمی تعلقات کو فروغ دینا چاہتا ہے جن کی بنیاد ہمدردی اور جذبۂ امداد باہمی پر ہو۔ چنانچہ وہ اکتناز، ذخیرہ اندوزی اور اظہار دولت و ثروت کو حرام بتاتا ہے۔ قوم کی دولت میں غریبوں کا حق مقرر کرتا ہے اور استحصال بیجا کے سارے ذرائع اور طریقوں کو ناجائز بتاتا ہے۔ اور سود استحصال بیجا کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے ''الاخوان'' کا کہنا ہے کہ بینکوں کے موجودہ نظام کو جس کی ریڑھ کی ہڈی سود ہے۔ ختم کر کے نفع اور نقصان میں شرکت کے اصولوں پر بینک قائم کرنا چاہیں ان کے نزدیک اسلام اپنی ریاست کے سارے باشندوں کے سماجی تکافل کی ذمہ داری بلا کسی امتیاز کے لیتا ہے۔ معاشی اور قدرتی ذرائع کا کھوج اور حصول ضروری قرار

دیتا ہے۔ ''الاخوان'' صنعتوں کو فروغ دینے پر زور دیتے ہیں۔انھوں نے مطالبہ کیا کہ سب کمپنیوں کو قومی ملکیت قرار دیا جائے۔حتیٰ کہ نیشنل بینک کو بھی۔

''الاخوان'' کی نظر میں معاشرتی اصلاحات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسلامی معاشرہ ان کا نصب العین ہے۔ اصلاح معاشرے کے لیے ان کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ تمام انسانوں کے درمیان اخوت کا اعلان کیا جائے۔مرد اور عورت دونوں کی ترقی کی راہ کھولی جائے اور عام انسانی حقوق میں ان کی باہمی مساوات و کفالت کی تبلیغ کی جائے۔ ہر فرد کی زندگی، ملکیت، کام، صحت، آزادی اور تعلیم کے حق کو تسلیم کیا جائے۔اس کے پیٹ اور جنس کی جائز خواہشات کی تکمیل کے مناسب مواقع بہم پہنچائے جائیں۔جرائم کے روک تھام میں سخت گیری سے کام لیا جائے۔ساتھ ہی حکومت اپنے مخصوص دائرے میں اسلامی نظام برپا کرنے کی جدوجہد کرے۔معاشرے کی اصلاح و تعمیر کو چار ترتیب وار مرحلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) مسلمان فرد (۲) مسلمان قوم (۳) مسلمان خاندان (۴) مسلمان حکومت۔اس میں ہر بعد والا مرحلہ پہلے کی اصلاح و تعمیر کا محتاج ہے۔اور سب کی بنیاد فرد ہے جب تک فرد کی اصلاح نہ ہو کسی بات کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔اس اصلاح کا آخری سرا حکومت کی اصلاح ہے۔جس کے بعد ہی مکمل اسلامی نظام اپنی تمام حرکتوں کے ساتھ برپا ہوسکتا ہے۔[۴۸]

سیّد قطب تختۂ دار پر

۱۹۶۴ء میں جب کہ آپ کی قید کے دس سال گزر چکے تھے۔عراق کے صدر عبدالسلام عارف کی درخواست پر صدر ناصر نے سیّد قطب کو جیل سے رہا کر کے گھر میں نظر بند کر دیا پھر دوبارہ گرفتار کر لیا گیا بہرحال فوجی ٹریبونل نے ۱۹۶۶ء میں سیّد قطب اور ان کے دو ساتھیوں محمد یوسف ہواش اور عبدالفتاح اسمٰعیل کو تختۂ دار پر چڑھا دیا۔ جو دنیا بھر کے دینی و سیاسی رہنماؤں، مذہبی اور اصلاحی تنظیموں، اخبارات و رسائل کے ہمہ گیر احتجاج اور سزاؤں میں تبدیل درخواست کے باوجود ۲۹/اگست ۱۹۶۶ء دوشنبہ کو نافذ

کردی گئی۔ اس طرح عالمِ اسلام کا یہ بطلِ جلیل دنیا کی یہ عدیم النظیر علمی اور فطری شخصیت، قافلہ راہِ حق کا یہ حدی خواں پورے صبر و استقلال کے ساتھ اور گیارہ سال قید و بند کے مسائل جھیلنے کے بعد راہِ حق میں اپنے جانِ عزیزی کا نذرانہ پیش کر کے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

یہ شہادت گہہ اُلفت میں قدم رکھنا لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

حواشی و مراجع

۱۔ التصویر الفنی فی القرآن (الاہداء) ص ۵

۲۔ مشاھد القیامۃ فی القرآن (الاہداء) سیّد قطب شہید، ص ۵

۳۔ یوسف العظم ۔ الشہید سیّد قطب، ص ۲۵، بحوالہ سید قطب شہید (حیات و خدمات)، ص ۱۸، محمد صلاح الدین عمری، مطبع احد پریس، ۵۰ لوئر مال، لاہور

۴۔ سیّد قطب۔ قرآن کے فنی محاسن (التصویر الفنی فی القرآن) ترجمہ غلام احمد حریری، صفحہ ۱۵۔۱۶

۵۔ سیّد قطب۔ قرآن کے فنی محاسن (التصویر الفنی فی القرآن) ترجمہ غلام احمد حریری، صفحہ ۱۶۔۱۷

۶۔ یوسف العظم مصدر مذکور، ص ۲۸

۷۔ یوسف العظم مصدر مذکور، ص ۲۸

۸۔ یوسف العظم مصدر مذکور، ص ۲۹

۹۔ یوسف العظم مصدر مذکور، ص ۳۰

۱۰۔ یوسف العظم مصدر مذکور، ص ۳۲

۱۱۔ یوسف العظم مصدر مذکور، ص ۳۲

۱۲۔ یوسف العظم مصدر مذکور ص ۳۴

۱۳۔ یوسف العظم مصدر مذکور ص ۳۴

۱۴۔ یوسف العظم مصدر مذکور ص ۳۵

۱۵۔ یوسف العظم مصدر مذکور ص ۳۵

۱۶؎ یوسف العظم مصدر مذکور ص ۳۶

۱۷؎ یوسف العظم مصدر مذکور ص ۱۵۲

۱۸؎ ایضاً ص ۱۵۴

۱۹؎ ایضاً ص ۱۵۵

۲۰؎ ایضاً ص ۳۷-۳۶

۲۱؎ الشہید سیّد قطب صفحہ ۳۱، بحوالہ (معالم فی الطریق) ترجمہ جادہ منزل، خلیل احمد حامدی، دار القرآن الکریم للعنایت بطبعه ونشر علومه

۲۲؎ الشہید سیّد قطب صفحہ ۵۱-۵۰، بحوالہ (معالم فی الطریق) ترجمہ جادہ منزل، خلیل احمد حامدی، دار القرآن الکریم للعنایت بطبعه ونشر علومه

۲۳؎ الاخوان المسلمون، تاریخ، دعوت، خدمات، خلیل احمد حامدی، ص ۶-۵، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۱ء

۲۴؎ الاخوان المسلمون والمجتمع المصری، ص ۱۶، بحوالہ حسن البناء شہید کی ڈائری، ص ۸۶، خلیل احمد حامدی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۱ء

۲۵؎ ایضاً، ص ۲۱، بحوالہ حسن البناء شہید کی ڈائری، ص ۸۸

۲۶؎ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲، ص ۲۰۳-۲۰۱، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۶ء/ ۱۳۸۶ھ

۲۷؎ اخوان المسلمون، مقصد، مراحل، طریقِ کار، پروفیسر سعید حوی، ترجمہ: عبید اللہ فلاحی، ناشر: ہندوستان پبلشرز، دہلی-۶

۲۸؎ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲، ص ۲۰۶-۲۰۳، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۶ء/ ۱۳۸۶ھ

☆☆☆

علی عزت بیگووچ کے سیاسی وتہذیبی افکار

محمد شہاب الدین قاسمی*

علی عزت بیگووچ عصر حاضر کے ممتاز اسلامی دانش ور، مصنف، قائد اور سیاست داں کی حیثیت سے شہرت کے حامل ہیں۔ وہ ۸/اگست ۱۹۲۵ء کو بوسنیائی شہر بوسنسکی سماک میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے تو آزاد مسلم جمہوریہ بوسنیا و ہرزیگوونیا کے پہلے صدر اور پھر بوسنیائی سہ رکنی مجلس صدارت کے اولین ممبر کی حیثیت سے ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۰ء تک خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی تصنیفات میں: ''دی اسلامک ڈکلیریشن'' (۱۹۷۰ء) اور ''اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کش مکش'' (۱۹۸۰ء) بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ اول الذکر کتاب میں انھوں نے اسلام، ریاست اور سماج کے باہمی تعلق پر اپنے افکار و تصورات پیش کیے ہیں اور مادی فلسفۂ زندگی پر تنقید کر کے اسلام کی صداقت کو پیش کیا ہے، جب کہ ثانی الذکر میں ان کا نقطۂ نظر زیادہ تفصیلی طور پر سامنے آیا ہے، جس میں مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن اور اسلامی تہذیب کی عظمت و بالادستی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف افکار و نظریات اور مذاہب کے بالمقابل اسلام کی انفرادیت متعین کرتے ہوئے، اسے واحد نظام حیات کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔

آئندہ سطور میں علی جاہ علی عزت بیگووچ کے تہذیبی اور سیاسی افکار وتصورات کو پیش کیا جاتا ہے، جس کے لیے ان کی کتاب ''اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کش مکش'' کو خصوصی حوالے کے طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔

---

* پروجیکٹ فیلو، شعبۂ اردو، اے-ایم-یو، علی گڑھ

تہذیبی افکار و تصورات

تہذیب وتمدن:

علی عزت بیگووچ نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں تہذیب وتمدن کی ماہیت پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور ان کا تعارف بھی پیش کیا ہے۔اس موضوع پر ان کے افکار و تصورات پر گفتگو سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب وتمدن کی شناخت سے متعلق ان کا نقطۂ نظر پیش کر دیا جائے، تاکہ آئندہ مباحث کی تفہیم میں آسانی ممکن ہو سکے۔اس سلسلے میں بیگووچ لکھتے ہیں:

> ''تہذیب سے مراد مذہب کے انسان پر اثرات یا انسان کے اپنی ذات پر اثرات ہوتے ہیں، جب کہ تمدن سے مراد فطرت پر انسان کی ذہانت کے اثرات اور بیرونی دنیا پر اس کی کارکردگی کے اثرات ہیں۔تہذیب کا مطلب ہے ''انسان ہونے کا فن'' جب کہ تمدن سے مراد ''سرگرم رہنے، حکومت کرنے اور چیزوں کو مکمل بنانے کا فن ہے......''[1]......
> بنیادی طور پر تہذیب مذہب سے اور تمدن الحاد سے تعلق رکھتا ہے......''[2]

تہذیب وتمدن سے متعلق بیگووچ کے نقطۂ نظر کو مترجم کتاب محمد ایوب منیر نے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

> ''......علی عزت نے اپنی اس کتاب میں تہذیب انسانی سے عقیدہ اور نظریہ مراد لیا ہے اور ثقافت سے وہ شہری زندگی، جس میں عمارتیں اور طرز تعمیر وغیرہ شامل ہیں، مراد لیتے ہیں......''[3]

علی عزت نے مذکورہ تعارفی گفتگو کے بعد تمدن کے ایک پہلو مصنوعات اور طلب کے متعلق اسلام اور جدید تمدن کے نظریات کو پیش کیا ہے، جس سے دونوں کی حقیقت اور جدید تمدن کا مزاج اور اس کا غیر فطری پن نمایاں ہوتا ہے، بیگووچ لکھتے ہیں:

> ''مصنوعات سے منافع حاصل کرو اور پھر اس منافع کو فضول خرچی میں

استعمال کرو، موجودہ تمدن کا یہ اصل الاصول ہے۔ اس کے برعکس تہذیب (اپنی مذہبی نوعیت کے حساب سے) انسانی ضروریات کو کم سے کم کرتی ہے یا ان کی فراہمی پر حد مقرر کر دیتی ہے اور اس طرح انسانوں کو ایک حد میں رکھ کر انسانی مرتبے پر فائز کرتی ہے ....
اسلام نے تو بہت وضاحت سے یہ نعرہ متعارف کرایا: ''خواہشات کو محدود کرو'' اور وسائل کی تلاش میں کوشاں رہو، اس کے مقابلے میں موجودہ تمدن جس پر ایک متضاد فلسفہ حاوی ہے، اس کے اس نعرے کا جھنڈا بلند کیا: ''نئی خواہشات بار بار پیدا کرو اور انھیں ہمیشہ پیدا کرتے رہو''۔ ان متضاد مطالبات کی حقیقت کو صرف اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں مظاہر اپنے ظہور میں اتفاقی نہیں ہیں۔ انسان ایک پیچیدہ وجود کا نام ہے، جو انسانی فطرت کی ژولیدگی اور تہذیب و تمدن کے اختلاف کے سنگم پر کھڑا ہے''۔[۴]

بیگووچ نے جدید تمدن کے جس نعرے ''نئی خواہشات بار بار پیدا کرو اور انھیں ہمیشہ پیدا کرتے رہو'' کو تحریر کیا ہے، اس کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ اسے امریکی روزنامے ''نیویارک ٹائمز'' نے ''نئے دور کا اولین اصول'' قرار دیا ہے۔[۵]

تمدن و تہذیب—تعلیم اور تدبر

بیگووچ مغربی فلسفے، سماجی، سائنسی اور قانونی علوم کے عالم، مفکر، مدبر اور اسرار مغرب کے رازداں ہیں۔ ان کا ذہن و فکر اسلامی ہے۔ وہ اشیا اور حقائق کو گہرائی تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ''اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کش مکش'' میں تہذیب و تمدن اور ان کے ضمنی موضوعات پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ تمدن و تہذیب کے حوالے سے تعلیم اور تدبر پر ان کی گفتگو بہت مرتب اور خیال انگیز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تمدن علم کے پھیلانے اور تہذیب روشنی اور شعور کا نام ہے۔ پہلے کے

لیے سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے کے لیے غور وفکر کی۔ اپنے آپ کو جاننے اور دنیا میں اپنا مقام پہچاننے کے لیے غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ غور وفکر سیکھنے، علم حاصل کرنے اور معلومات جمع کرنے سے ہٹ کر ایک الگ چیز ہے۔ تدبر استغراق دانائی، شائستگی، ذہنی سکون اور یونانی الفاظ میں Cetharsis (اندرونی تزکیہ) کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ تو اپنے آپ میں ڈوب جانے، اسرار حیات معلوم کرنے، نیز مذہبی، اخلاقی اور جمالیاتی حقائق جاننے کی تڑپ کا نام ہے۔ تعلیم اور تربیت اور کائنات کو جاننے اور بقا کی حالتوں کو تبدیل کرنے کا نام ہے۔ سائنس کے مراحل میں مشاہدہ، تجزیہ، تقسیم اور عملی مطالعہ (Experiment) وغیرہ شامل ہیں، جیسا کہ تدبر کا مفہوم خالص قسم کے سوا کچھ بھی نہیں۔.......... تدبر انسان کو اپنی ذات پر اختیار دلا دیتا ہے، جب کہ سائنس فطرت پر اختیار دلا دیتی ہے''۔[۶]

ترقی: انسان کے خلاف سرگرم

صنعتی اور جدید سائنسی ترقیات کے سبب انسانی زندگی میں جو منفی اثرات، مسائل اور پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں اور جو روز بہ روز بڑھتی ہی جارہی ہیں، علی عزت بیگووچ نے ان کی کنہ پر بہت گہرائی سے غور کیا ہے اور اس کے علاج تجویز کیے ہیں۔ بیگووچ نے اپنی اس کتاب میں تفصیل سے جدید سائنسی اور بالخصوص صنعتی ترقیات کے منفی ثمرات: قتل، شراب نوشی، خودکشی، نفسیاتی بیماریوں اور آلودگی وغیرہ کا مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا ہے اور مختلف ماہرین کی آراء بھی نقل کی ہیں۔ جو چشم کشا اور قابل عبرت ہیں۔ بیگووچ کے مطابق جدید تمدنی ترقیات انسان کے لیے منفی خصوصیات کی حامل ہیں۔ جرائم کے حوالے سے انھوں نے امریکی ماہرین جرائم کی یہ رائے نقل کی ہے کہ ''ہمارا معاشرہ گناہگاروں کا سمندر ہے اور ہر شخص کم یا زیادہ گناہ گار اور مجرم ہے، اور اسے بچنے کا کوئی

راستہ نہیں ہے۔'' [۷] بیگووچ سویڈن میں سماجی برائیوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''......ان سماجی برائیوں کی علامات کسی بھی دوسرے ملک کی نسبت سویڈن میں سب سے زیادہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ ......فرانس، ڈنمارک اور مغربی جرمنی جو اپنے آپ کو سب سے زیادہ مہذب کہتے ہیں عریانی اور برہنگی میں بھی ان کا نام سرفہرست ہے......'' [۸] انھوں نے ایک ممتاز امریکی جج آرتھر ملر کا نوجوانوں کے جرائم کے اسباب سے متعلق بیان نقل کیا ہے۔ ملر جرائم کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''......میرا ایمان ہے کہ اپنی موجودہ شکل میں یہ ٹیکنالوجی کا نتیجہ ہے، جو کہ انسان کا مرتبہ بحیثیت انسان گرادیتی ہے اور اسے حقیر بنادیتی ہے''۔ بیگووچ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مغربی معاشرے کی بے راہ روی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ'' ...... یہ لگتا ہے کہ جیسے انسانی وجود سے شرافت غائب ہوچکی ہے ...... ہوسکتا ہے کہ دو بڑی جنگوں کی وحشت نے انسانوں کو بے راہ رو بنادیا ہو یا پھر یہ ہوسکتا ہے کہ ٹیکنالوجی نے انسان کو ایک مشین بنا کر رکھ دیا ہو۔ [۹] یہاں پر بیگووچ نے معروضی نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے دو ممکنہ اسباب بیان کیے ہیں، حالاں کہ اس معاشرتی بحران کے اسباب میں اول الذکر سے زیادہ ثانی الذکر کو دخل ہے، جس کا خود بھی بیگووچ نے اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے اس پوری گفتگو کے بعد آخر میں اپنی فکر اس طرح پیش کی ہے:
>
> ''یہ ناممکن ہے کہ موجودہ مادی تمدن کو چھوڑے بغیر ان تمام آفات کا مقابلہ کیا جاسکے۔ حقیقی انسانی تمدن میں اقدار سے متعارف ہے، ان میں سے کوئی بھی عریانی اور الکحل کے استعمال کی اجازت نہیں دیتی۔ حقیقت یہ ہے کہ سماجی برائیوں کا فروغ اخلاق سے عاری اور اعلیٰ انسانی اقدار کو نظر انداز کردینے والے تمدن کا عطیہ ہے، اس تمدن کو راہ راست پر لانے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ عقل وشعور سے مزین تہذیب ہے۔

چوں کہ مادی تمدن کے نقطۂ نظر سے سائنس مذہب کی طرف رجوع نہیں
کر سکتی، اس لیے اصلاح احوال کے مواقع میسر نہیں آتے"۔[۱۰]

مضافات اور شہر

علی عزت بیگوویچ شہر اور دیہات کی زندگی سے متعلق بھی مخصوص نظریات رکھتے ہیں۔ انھوں نے ان دونوں کی زندگی میں مثبت اور منفی پہلوؤں کو ایک توازن کے ساتھ بیان کیا ہے:

"شہری زندگی میں انسان کو جو سہولتیں میسر آتی ہیں ان کے باعث ان
کی اہمیت تسلیم کی گئی۔ درس گاہوں اور صنعتی مراکز کے سبب شہر تہذیب و
تمدن کے مراکز بنے اور دیہاتی زندگی کے سلسلے میں بات صرف مناظر
فطرت تک رہ گئی۔"[۱۱]

بیگوویچ کے نزدیک شہری زندگی کے منفی پہلوؤں میں وہاں کی تنگ رہائش اور گھٹن بھرے ماحول، سامان تعیشات کی کثرت اور ذرائع ابلاغ کی منفی ذہن سازی بہت اہمیت کی حامل ہے:

"دیکھا گیا ہے "شہروں" کے اندر انسان ایسے ماحول میں رہتا ہے گویا
چھوٹی چھوٹی بیرکوں میں فوجی بند ہوں یا باڑوں میں جانور قید کر دیے
گئے ہوں۔ اس کے ارد گرد منافع خور صنعتوں کی تیار کردہ فعولیات کا
ڈھیر لگا ہوتا ہے اور ذرائع ابلاغ کے انوکھے بلیٹن اس کی رائے کو مسلسل
متاثر کر رہے ہوتے ہیں۔"[۱۲]

علی عزت بیگوویچ اس خیال کے حامل نظر آتے ہیں کہ شہری زندگی میں تفریح کے ذرائع بالعموم مصنوعی ہیں، دیہات کے مقابلے شہروں میں تفریحی کھیلوں میں عوامی شرکت کا تناسب بہت کم ہے۔ اکثر شہری کھیل دیکھ کر ہی خوش ہو جاتے ہیں۔ دیہاتی آدمی زندہ اور اپنی اصل سے وابستہ ہے، جب کہ شہری صنعتی کارکن، مردہ اور مشین کی

طرح ہے۔ بیگووچ کے نزدیک شہری اور دیہی زندگی میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ دیہات میں روح کی نشو ونما کے مواقع زیادہ میسر آتے ہیں، جب کہ ''شہروں کے باشندے اپنے تعلیمی مراکز اور تہذیبی اداروں کی فراوانی کے باوجود ایک طرح کی مشینی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس زندگی میں روحانیت کے بجائے الحادی رجحان ترقی پاتا ہے۔''[۱۳]

اخلاقیات اور مذہب

علی عزت بیگووچ نے اپنی زیر بحث کتاب میں اخلاقیات پر بہت تفصیلی بحث کی ہے۔ اور ارادہ وعمل، تربیت ونشو ونما، اخلاقیات اور عقل، اخلاقیات اور مذہب، مفاد عام اور اخلاقیات اور بے خدا اخلاقیات کے ذیلی موضوعات کے تحت اپنے افکار و تصورات پیش کیے ہیں باب کے آخر میں انھوں نے اپنے نتائج فکر کو اس طرح پیش کیا ہے:

> ''......ہم دو نتائج اخذ کرنے پر مجبور ہیں۔ اول: مذہب کے بغیر اخلاق کا کوئی وجود نہیں ہے، جب کہ مذہب کے بغیر عملی طور پر اخلاقی مظاہر باقی رہ سکتے ہیں۔ تاہم اس عملی اخلاق کی جڑیں بھی کم زور ہوتی ہیں۔

دوم: اخلاقی ضابطے اور نظام کی بنیاد الحاد نہیں ہوسکتا ...... تاہم الحاد اخلاقیات کا انکار نہیں کرتا۔ کم ازکم اس کے نچلے درجے کی حد تک تو نہیں کرتا اور نچلا درجہ سماجی تنظیم ہے۔ اس کے علاوہ ایک معاشرہ تشکیل دیتے وقت اگر الحاد کو عملی ضابطوں میں باقی رکھا جائے، تب بھی سماجی اخلاق کے مروجہ اصولوں کو یہ قبول کرلے گا ...... اخلاق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ ''مذہب'' ہے۔''[۱۴]

زندگی کی ماہیت

''اسلام اور مشرق ومغرب کی تہذیبی کش مکش'' کے ابتدائی حصے میں بیگووچ

نے زندگی کی ماہیت پر گفتگو کی ہے اور بہ طور شواہد مختلف سائنس دانوں کے بیانات پیش کیے ہیں۔ اس سے زندگی کی پیچیدگی اور انسانی ذہن کے لیے اس کی ناقابلِ فہم حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔ بیگووچ کے نزدیک زندگی ایک معجزے کا نام ہے، اور بہت سے سائنس دانوں نے اس کی ماہیت کو سمجھنے سے عاجزی کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے ایک سائنس داں الیکس کارل کی خلیے کے اندر زندگی کی حقیقت کو سمجھنے میں ناکامی کے اعتراف کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ''اعضا اپنی تعمیر میں جن عوامل سے گزرتے ہیں، انھیں سمجھنا انسانی فہم سے باہر ہے۔ یہ تمام وجود (انسان) ایک مادہ خلیے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک مکمل گھر ایک جادوئی اینٹ سے وجود میں آجائے اور یہ اینٹ جادوئی طور پر دوسری اینٹوں کو جنم دے۔ انسان کے اعضاء اسی طرح جنم لیتے ہیں، جس طرح پریوں کی کہانیوں میں اعضا وجود میں آجاتے ہیں۔ اس عمل کو سمجھنے میں ہمیں تو اپنی عقل بے بس نظر آتی ہے۔''[۱۵]

زندگی کی ماہیت کے سلسلے میں بیگووچ نے انسانی آنکھ اور دماغ وغیرہ کی پیچیدہ ساخت اور ان کے افعال و اعمال پر اس طرح قدرے طویل گفتگو کی ہے کہ ان کی معجزاتی حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔ مختلف مثالوں اور حوالوں کی پیش کش اور گفتگو کے بعد مصنف نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ توحید کو ثابت کرتے ہیں۔ علی عزت لکھتے ہیں:

> ''......تمام سائنسی معجزات کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ یہ حقیقی خدا ہی کی طرف اشارہ کررہی ہیں۔ انسان کے وجود اور تخلیق ہی پر غور کیا جائے تو خدا کا وجود ثابت ہوجاتا ہے۔ جو اس سے سچائی کے منکر ہیں، وہ خام فکر ہیں۔ انسانی آنکھ اور دماغ کو پیچیدہ بھی تسلیم کرنا، جیسا کہ یہ ہیں، اور ان کی پیدائش کو اتفاقی بھی قرار دینا، نادانی ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے، جیسے کسی شخص سے کہا جائے کہ وہ یونانی دیومالائی کہانیوں کو آنکھیں

بند کر کے سچ مان لے۔''[۱۶]

وہ مزید لکھتے ہیں:

''......زندگی کے حقائق کو سمجھنے کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی ہے کہ ہم سائنسی ذرائع سے زندگی کی وضاحت نہیں کر سکتے، کیوں کہ زندگی ایک عمل بھی ہے اور ایک معجزہ بھی۔ مسلسل غور و فکر زندگی کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔''[۱۷]

زندگی کی ماہیت کی اس بحث میں بیگووچ کی تحریر کا تضاد بھی سامنے آتا ہے کہ انھوں نے سطور بالا میں زندگی کو عمل قرار دیا ہے، جب کہ اسی بحث میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''......زندگی ایک عمل کا نہیں بلکہ معجزے کا نام ہے......''۔([۱۸]

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا ''عمل'' ہونا ایک بدیہی امر ہے، جس سے انکار واضح حقائق سے انکار ہے۔

نظریۂ ارتقا

علی عزت بیگووچ نے ''تخلیق اور ارتقا'' کے نظریۂ ارتقا پر تفصیلی بحث کی ہے، اور مغربی مصنفین کی تحریروں اور اپنے عقلی دلائل کے ذریعہ اس پر نقد کی ہے۔ اس بحث میں بیگووچ کی تحریر کا تضاد نظر آتا ہے کہ کبھی نظریۂ ارتقا کے حامل نظر آتے ہیں۔ اور کبھی مخالف۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

''...... انسان اور حیوان کے درمیان فیصلہ کن چیز ذہن یا جسمانی ساخت کا نہیں، بلکہ روحانی فرق ہے اور مذہبی، اخلاقی نیز جمالیاتی پہلو روح کے ساتھ ہی وابستہ ہیں۔ انسان کے ظہور کو اس وقت سے شمار نہیں کیا جانا چاہیے، جب سے اس نے سیدھا چلنا شروع کیا تھا، بلکہ اس وقت سے شمار کیا جانا چاہیے، جب اس نے عبادات کا آغاز

کیا......" ۔[19]

تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ نظریۂ ارتقا کے قائل ہیں، مگر انسان کو مادی وجود یا حیاتیاتی مظہر سمجھنے کے بجائے اس کو روحانی وجود سمجھتے ہیں، لیکن جب وہ بہ ظاہر متضاد عبارت میں یہ کہتے ہیں کہ:

> "انسان ارتقا کے ذریعے موجودہ مقام تک پہنچا ہے، یہ بات انسان کے مادی وجود اور ظاہری تاریخ تک تو صحیح تسلیم کی جاسکتی ہے، لیکن انسان کے اندر کا جو انسان ہے، وہ جانور ہونے کے خیال کی نفی کرتا ہے۔ اگر انسان فطرت کی پیداوار ہے تو پھر اس نے فطرت کی مخالفت کیوں شروع کردی ہے؟......" [20] تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نظریے کے مخالف ہیں۔ نظریۂ ارتقا کی کلی تردید علی عزت نے کئی مقامات پر کی ہے، چناں چہ وہ کہتے ہیں: "......سائنس سنگ دلانہ تعبیرات کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ انسان، جانور کی حالت سے ترقی کرکے انسان بنا ہے......" ۔[21]
>
> "...... جانوروں کا ظہور، ذہنی اور جسمانی تبدیلی، انسان کا ظہور اور بعد ازاں نٹشے کے پیش کردہ 'انسان اعلیٰ' (Superman) کا ظہور کچھ ناممکن سا محسوس ہوتا ہے ...... نظریۂ ارتقا انسانی تفکر سے باہر کی چیز ہے۔[22] فلسفہ جو انسان کے بارے میں ایک طویل عرصے تک ڈارون کی وضع کردہ لائن کو اختیار کیے رہا ہے، اب آئن اسٹائن کے نظریے کو قبول کرکے اس کے تلپٹ ہونے کا منتظر ہے......" [23]

علی عزت کی مذکورہ تحریریں اس کی مظہر ہیں کہ وہ نظریۂ ارتقا کو ایک غلط نظریہ سمجھتے ہیں، لیکن نظریۂ ارتقا کو مجموعی بحث میں ان کے خیالات، تضاد کے حامل نظر آتے ہیں، جو ان کی صحیح فکر کی شناخت میں قدرے مزاحم ہیں۔ لیکن پوری بحث کے تجزیے کے بعد یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بیگووچ کے سامنے جو قاری ہے، وہ مغرب کا قاری

ہے، جس کی غالب اکثریت نظریۂ ارتقا کو درست سمجھتی ہے اور خود بیگووچ کا ذہنی نشو ونما بھی مغرب میں ہوا ہے۔ چناں چہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے وہ بعض جگہوں پر دوٹوک گفتگو کے بجائے لبرل رویہ اختیار کیا ہے، لیکن اس متضاد تحریر کی کہ:

''انسان کے ظہور کو اس وقت سے شمار نہیں کیا جانا چاہیے، جب سے اس نے سیدھا چلنا شروع کیا تھا،......''[۲۴] بلکہ اس وقت سے شمار کیا جانا چاہیے، جب اس نے عبادات کا آغاز کیا......''[۲۵]

کوئی تاویل مشکل ہی نہیں، ناممکن نظر آتی ہے۔

سیاسی افکار وتصورات

علی عزت بیگووچ نے اپنی کتاب ''اسلام اور مشرق ومغرب کی تہذیبی کش مکش'' میں تہذیب وتمدن کے اسلامی اور مادی تصور پر تفصیل سے بحث کی ہے، البتہ اس میں تہذیب وتمدن کے حوالے سے سیاسیات کے بعض مباحث بھی زیر بحث آئے ہیں، جن سے ان کے سیاسی افکار وتصورات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ سطور ذیل میں علی عزت کے سیاسی افکار وتصورات کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے، جن کے لیے ان کی کتاب: ''دی اسلامک ڈکلیریشن'' سے بھی استفادہ کیا گیا ہے:

قانون کی اسلامی ماہیت

علی عزت بیگووچ نے ''اسلام اور مشرق ومغرب کی تہذیبی کش مکش'' میں قانون کی اسلامی ماہیت پر بحث کی ہے اور اس کے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں، ساتھ ہی مادہ پرستانہ نظریات پر تنقیدیں بھی کی ہیں۔ بیگووچ کہتے ہیں کہ ''مذہب کے نزدیک حقوق اور فرائض اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کیے جاتے ہیں''۔ جب کہ اشتراکیت کے نزدیک انسان محض معاشرے کا ایک جزو ہے، اور ریاست سے ہٹ کر اس کے کوئی حقوق نہیں ہیں۔[۲۶] انھوں نے مارکس اور دیگر مصنفین کے انسانی حقوق سے

متعلق نظریات نقل کرنے کے بعد ان پر تنقیدیں کی ہیں اور اسلامی نظریات کو پیش کیا ہے۔ مادہ پرست مصنف جیریمی بینتھم کے مطابق: ''انسانی حقوق بکواس ہیں، اور فطری انسانی حقوق چوگنی بکواس ہیں''۔ ۲۷؎ مارکسی کہتے ہیں کہ: ''قانون تو حکم راں طبقے کے ارادے کا نام ہے، جس کو قانونی ضابطہ بنادیا جاتا ہے۔ ۲۸؎ بیگووچ نے موخرالذکر نظریے پر تنقید کرتے ہوئے قانون کا سرچشمہ مذہب کو قرار دیا ہے۔ مذہب سے یہاں ان کی مراد اسلام ہے:

> ''...... بلاشک وشبہ قانون کی یہ نفی متوازی طور پر مذہب کی نفی ہے اور یہ مادہ پرستانہ فلسفے کا لازمی نتیجہ ہے۔ کیا مذہب کے علاوہ بھی کوئی راستہ ہے، جس کے ذریعے طاقت ور کی طاقت کو محدود کیا جاسکے، کوئی قوم کسی ایسی اقلیت کو کیوں کر برداشت کرے جس کو وہ آسانی سے نکال باہر کرسکتی ہو اور اس کی جائیدادوں پر قبضہ کرسکتی ہو۔'' ۲۹؎

بیگووچ یہ کہتے ہیں کہ ''ہر قانون کی روح اسلامی ہے''۔ ۳۰؎ اس ماحصل سے قبل انھوں نے عیسائیت اور یہودیت کے سرچشمۂ قانون نہ ہوسکنے کی بحث کی ہے، اور ان کی نااہلی ظاہر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''جب تک عیسائیت انسان کی شخصیت، اس کے ارادے، سچائی، حق پرستی، بنیادی انسانی حقوق وغیرہ کی اہمیت کو تسلیم نہ کرے، اس کے دائروں میں کوئی قانون نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی اہمیت اور قدرو قیمت سمجھے بغیر نیز قوت کی اہمیت کے بغیر (قوت کو یہودیت نے بڑی اہمیت دی) قانون کا کوئی مطلب نہ ہوگا۔ مسیحی نقطۂ نظر کے بغیر یہ ممکن نہ ہوگا اور یہودی نقطۂ نظر کے بغیر اس کا نفاذ نہ ہوگا۔ اس تفصیلی گفتگو کے بعد یہ ثابت ہوا کہ ہر قانون کی روح اسلامی ہے۔'' ۳۱؎

علی عزت بیگووچ نیت اور عمل کی روح پر گفتگو کرتے ہیں اور نیت کی قابل لحاظ

حیثیت واضح کرتے ہیں۔ وہ اس کے لیے قتل خطا کے مجرم کے اقرار کی مثال پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> ''......سوال یہ نہیں ہے کہ اصل میں کیا چیز وقوع پذیر ہوئی تھی، سوال یہ ہے کہ قاتل کے دل میں کیا بات چھپی ہوئی تھی؟ حتی کہ جب ہم حقائق کا مطالعہ کررہے ہوتے ہیں، اس وقت بھی ہم روح کی حالت کو جاننے کی کوشش میں مصروف ہوتے ہیں، یعنی اس کی اصل میں نیت کیا تھی......'' ۳۲

بیگووچ نیت پر گفتگو کرتے ہوئے بحث کو اچانک فیصلہ کن موڑ دیتے ہیں اور اس وجود خدا سے متعلق بہت منفرد بصیرت افروز اور لطیف نقلی اور عقلی استدلال کرتے ہیں:

> ''انصاف اپنے فیصلے میں خدا کے فیصلے کی نقالی کی کوشش کرتا ہے۔ فیصلہ کرتے وقت ہم جس قدر کسی شخص کی نیت کا جائزہ لینے میں کام یاب رہتے ہیں، اسی قدر ہم خدا کے قریب ہوجاتے ہیں، ''لیکن اگر فیصلہ کرنے میں تم غلطی کرجاؤ تو اس کا الزام تم پر نہیں ہے۔ اصل چیز تو تمہارے دلوں کا ارادہ ہے۔۳۳ ارادے کو تسلیم کرلینے کے ساتھ، ہم خدا کے وجود کو تسلیم کرلیتے ہیں اور اس طرح مادہ پرستی کا انکار کردیتے ہیں''۔۳۴

تعزیرات: مغربی اور اسلامی نقطۂ نظر

علی عزت بیگووچ نے ''اسلام اور مشرق ومغرب کی تہذیبی کش مکش'' میں جرم و سزا پر بھی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں تعزیرات اور سماجی دفاع سے متعلق دو مغربی نقطہ ہائے نظر پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسلامی نظریات کی روشنی میں اپنے افکار پیش کیے ہیں۔ اول الذکر نظریے کے مطابق ''سزا جائز ہے اس لیے کہ جرائم کی روک تھام ضروری ہے اور ہر شخص کی آزادی دوسرے کی آزادی کا حق تسلیم کرنے کے ساتھ مشروط ہے۔ ثانی الذکر، جو سماجی دفاع کا نظریہ ہے، کے مطابق سزا کا عمل بے فائدہ

ہے، اس لیے کہ جرم انسان کی سرشت میں داخل ہے، لیکن معاشرے کے لیے ایسے دفاعی اقدامات کیے جاسکتے ہیں، جن کے ذریعہ بے گناہ افراد کو نقصانات سے بچایا جاسکے''۔[۳۵] ان نظریات کا تقابل اوران پر نقد کرتے ہوئے بیگووچ لکھتے ہیں:

''......سزا اور حفاظتی اقدام میں فرق یہ ہے کہ سزا کا ہدف انصاف اور شخصیت ہوتا ہے، جب کہ حفاظتی اقدام کا ہدف مفاد اور معاشرہ ہوتا ہے۔ سزا جرم کے مطابق ہوتی ہے، جب کہ حفاظتی اقدام میں مجرم کے سماجی نقصانات کو مدنظر رکھا جاتا ہے، یعنی دیکھا جاتا ہے کہ معاشرے کے نقطۂ نظر سے فرد کتنا خطرناک ہے۔ سماجی دفاع کو مدنظر رکھ کر یہ فرض کرنا ممکن ہوگا کہ ارتکاب جرم سے پہلے ہی مجرم کو بہت سے حقوق سے محروم کر دیا جائے۔ سماجی دفاع کے اقدامات کچھ شدید اور غیر منصفانہ شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں، چاہے حفاظت کا مسئلہ ہو یا احتیاطی تدابیر ہوں، اسی قسم کے اقدامات کچھ ممالک میں سیاسی منحرفین کے خلاف استعمال کیے جاتے ہیں......''[۳۶]۔

بیگووچ اس سلسلے میں روس کی مثال پیش کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

''......ایک خوف ناک مثال سٹالن کے عمل ''صفائی'' کی ہے، کچھ اعداد وشمار کے مطابق صفائی کے اس عمل میں ایک کروڑ افراد کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ اس کی وضاحت یہ کی جاتی ہے کہ یہ صفائی سزا نہیں ہے، بلکہ یہ تو ''غیر ضروری'' افراد سے معاشرے کو پاک کرنے کا عمل ہے......''[۳۷]

بیگووچ اپنی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے تعزیر کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس کے برعکس تعزیر ایک اخلاقی نظریہ ہے، اور پرانی مذہبی کتابوں میں اسے خدائی سزا سے موسوم کیا جاتا رہا ہے، جس سے مذہب اور نظریۂ سزا کے درمیان اصطلاحی اور تاریخی تعلق کا پتا چلتا ہے۔ قانون

سازی کے ساتھ ایک نظریاتی فلسفہ ہے، اور جن سزاؤں کے ساتھ سماجی دفاع کا اصول ہے، اس کو اثبات پسندوں کی رضا حاصل ہے۔"[۳۸]

بیگووچ مزید کہتے ہیں کہ "انصاف مجرم کا انسانی حق ہے اور اس سے انحراف دیگر انسانی حقوق سے بھی انحراف ہے"۔ وہ ہیگل کا ایک قول بھی نقل کرتے ہیں کہ "سزا بطور "علاج" مجرم کی انسانی عظمت سے ہم آہنگ ہے اور اس کا کوئی اور مقصد نہ ہونا چاہیے"۔ بیگووچ کے مطابق "ذمہ داری، انسانی عظمت کا ایک پہلو ہونے کے ناطے ایک اخلاقی حیثیت رکھتی ہے۔ زمین پر ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ ذمہ داری خدا کے وجود کے ساتھ متعلق ہوتی ہے۔ قانون سازی کے تمام مراحل زمین پر خدا کے عدل کی نقالی کی کوشش ہیں"۔[۳۹] بیگووچ سزا کی حکمت سے متعلق ایک اہم تعبیر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: "مذہب میں اس کا مقصد یہ ہے کہ اس اخلاقی معیار کو از سر نو قائم کر دیا جائے، جو جرم سرزد ہونے کی وجہ سے مائل بہ زوال ہو گیا تھا؟...... جزا اور سزا کے جذبے کے پیچھے یہ مذہبی جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ جرم کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ دیگر تمام اقدامات اور اصلاحات سے قطع نظر یہ نظریہ ہمیشہ سماجی قانون کا جزو لاینفک رہے گا......"[۴۰]

جرم و سزا کے اسلامی نظریہ کے اصول کی معقولیت اور مبنی بر صداقت ہونے کے متعلق بیگووچ کا کہنا ہے کہ:

> "اسلام نے بطور مذہب "بدلے کے نظریے" سے آغاز کیا، اور اس نے سماجی دفاع کے اصولوں کو بھی تسلیم کیا...... اسلام کے تعزیری قانون نے کم تر لوگوں کے لیے خصوصی نظام تعلیم کو تسلیم کیا، جو آج کے جدید دور کے تصور سے ہم آہنگ ہے، جس میں آزادانہ شہادت کے ساتھ مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ نیز جرم اور مجرم کے سماجی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے"[۴۱] وہ ایک مصنف سعید مصطفیٰ السعید بے کی پیرس سے شائع شدہ ایک کتاب کے حوالے سے نابالغ مجرموں سے متعلق اسلامی احکام

کا تذکرہ بھی کرتے ہیں:

''......ان مجرموں کے لیے جو بالغ نہ ہوں، بلکہ سمجھ بوجھ والے ہوں، ایک نظام وضع کیا گیا اور اس کے چند پہلوؤں کو سماجی دفاع کے پہلو کہا جاسکتا ہے۔ قرآن نے جن پانچ جرائم کا ذکر کیا ہے، ان سمیت عدالتوں کو یہ اجازت دی گئی کہ جرم کی نوعیت، جرم کن حالات میں صادر ہوا، اور مجرم کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے آزادانہ فیصلے کریں''۔ ۴۲

خیالی ریاست

افلاطون کے نظریات میں ایک اہم نظریہ خیالی ریاست ہے، جس کی تفصیلات اس نے اپنی کتاب ''جمہوریہ'' (The Republic) میں پیش کی ہیں۔ تھامس مور کا نام بھی نظریۂ خیالی ریاست کی پیش کش میں اہمیت کا حامل ہے۔ بیگووچ نے کارل مارکس کا نام بھی اس نظریے کے حاملین میں پیش کیا۔ خیالی ریاست ایک ایسے تصوراتی مثالی نظام کے نقشے پر مشتمل ہے، جس میں فرد خاندان کے بجائے۔ حیوانی جماعت کی طرز پر رہتے ہیں اور جہاں افراد جماعت یا گروہ کے مفاد کے لیے کام کرتے ہیں۔ اس جماعت میں گروہ کے مفاد کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ افلاطون کے نزدیک جہاں شراب نوشی منع ہے، وہیں وہ یہ بھی کہتا ہے:

''......شہری کو بیمار نہیں ہونا چاہیے، تاکہ وہ طبی علاج نہ کروائے، کیوں کہ اس طرح تو ریاست کو نقصان پہنچتا ہے۔ شہری کو چاہیے کہ یا تو کام کرے یا مرجائے، وہ شخص جو طویل عرصے سے بیمار ہو، یا کم زور نسل سے تعلق رکھتا ہو، اس کو چاہیے کہ وہ خودکشی کرلے......''۔ ۴۳

بیگووچ نے خیالی ریاست پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے جامع اور موثر تنقیدیں کی ہیں اور اپنے افکار و تصورات پیش کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''......خیالی ریاست میں انسان کی اندر کی لامحدود دنیا ایک معمولی سے

مصنوعی نکتے تک محدود کردی گئی ہے۔ خیالی ریاست میں یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ انسان کے پاس شعور و ادراک کی حامل روح موجود نہیں ہے، اس لیے خیالی ریاستوں میں انسانی یا اخلاقی مسائل بھی نہیں ہیں۔ اس ریاست میں لوگ اپنا فرض سرانجام دیتے ہیں، زندگی بسر نہیں کرتے۔ معروف معنوں میں وہ زندہ بھی نہیں ہیں، چوں کہ انہیں آزادی حاصل نہیں......''[۴۴] وہ مزید کہتے ہیں کہ:

''......وہ ایک سماجی حیوان ہے یا ایک ایسا جان دار، جس کو عقل دے دی گئی ہے۔ ایک انسان اخلاق اور بد اخلاق میں سے کسی ایک چیز کا مالک ہوتا ہے، لیکن ایک خیالی ریاست کا فرد صرف ''اپنے کام'' کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے''۔[۴۵]

بیگووچ کا کہنا ہے کہ یورپ کی تاریخ میں خیالی ریاست کا اولین شعور عیسائیت سے آیا، جو اس کی تاریخ کا الم ناک پہلو ہے۔ ٹوماسو کمپانیلا نے ''سورج کا شہر'' (Civi'tas Solis) نامی کتاب میں مسیحیت کے برخلاف نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے ایک دنیاوی سلطنت کا تذکرہ کیا ہے، آسمانی سلطنت کا نہیں، چناں چہ یہ کتاب فرد کے بجائے معاشرے سے بحث کرتی ہے۔[۴۶]

بیگووچ کہتے ہیں کہ ''ایک حقیقی انسان انفرادیت پسند بھی ہوتا ہے اور رومان پرور بھی''، ......''مثالی ریاست کے لیے ہر اس چیز کا خاتمہ ضروری ہے، جس کا انسان اور اس کی انفرادیت سے تعلق ہو، آزادی سے تعلق ہو۔

اس لیے خیالی ریاست ملحدوں کے ایمان اور عقیدے کا نام ہے، اہل ایمان کا اس سے تعلق نہیں ہے''...... ''جب سے انسان کا وجود عطا ہوا ہے اس وقت سے ہی ایک خیالی ریاست کا وجود ناممکن ہے۔ بشر کو ''انسانیت'' سے نوازنے کے بعد کے مرحلے سے انسان کا مقابلہ انتشار، بدنظمی، تلاطم اور ڈرامے سے ہے''۔[۴۷] وہ اس کے لیے سورۂ بقرہ کی آیت ۳۶ سے استدلال کرتے ہیں۔ ''نیچے اتر جاؤ (تم سب لوگ) اور تمہارے

درمیان افتراق ہوگا''۔[۴۸] بیگووچ کہتے ہیں کہ:

''خیالی ریاست کے فلاسفہ نے معاشرے اور اس کے مفادات کو سب سے اعلیٰ قدر قرار دیا ہے، جب کہ خدا چاہتا ہے کہ انسان کو سب سے اعلیٰ قدر قرار دیا جائے'' ان کے نزدیک ایک خیالی ریاست کا عمل میں آنا ''بے معنی امید'' اور ''بھولپن'' ہے کہ کیوں کہ اس کی بنیاد انسانی روح کی نفی پر ہے'' ''...... انسان ایک ایسا وجود ہے، جس کی انفرادیت ناقابل علاج ہے۔ اس کو یک شکل، یک نظامی، پالتو اور خاموش نہیں بنایا جاسکتا......''[۴۹]

اسلام- بہ طور نظام حیات

علی عزت بیگووچ اسلام کو واحد نظام حیات کے طور پر تسلیم کرتے ہیں اور مسلمانوں سے اس نظام سے کامل وابستگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے انحصار، پس ماندگی اور غربت سے نکلنے، حصول عظمت اور اپنی قسمت کا مالک بننے کے لیے ان کے پاس واضح نقشہ عمل ہے۔ اس کے لیے وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی مذہبی مفکر کی تجدید کی جائے اور مراکش سے انڈونیشیا تک ایک متحدہ اسلامی معاشرے کی تشکیل ہو، تاکہ اسلام کو انفرادی، خاندانی اور سماجی زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ کیا جاسکے۔ علی عزت اپنی کتاب: دی اسلامک ڈکلیریشن میں لکھتے ہیں:

"... The generating of Islam in all areas of Personal individual life, in the family and society, through the renewal of Islamic religious thought and the creation of a united Islamic community from Morocco to Indonesia."[۵۰]

انھوں نے بہت وضاحت اور صراحت کے ساتھ یہ کہا ہے کہ ''ایک شخص، جس

نے اسلام کو تسلیم کرلیا، اس کے بعد وہ اس سے عاجز ہے کہ کسی اور آئیڈیل کے لیے جیے اور مرے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بات تصور سے بالاتر ہے کہ ایک مسلمان کسی بادشاہ یا حکم راں کے لیے خود کو قربان کردے۔ ایک مسلمان صرف اللہ کے نام اور اسلام کی سربلندی کے لیے ہی اپنی جان نچھاور کرسکتا ہے'':

"Just like an individual, a people that has accepted Islam is there after incapable of living and dying for any other Ideal. It is unthinkable that a muslim should sacrifice himself for any king or ruler .... A Muslim can die ongy in the mane of Allah and for the glory of Islam, or flee the battle ficld."[۱۵]

بیگووچ کی یہ تحریر ان کی قوت ایمانی، بے آمیز اسلامی فکر اور اپنی زندگی میں ان افکار کے عملی انطباق کی مظہر ہے۔

گذشتہ صفحات میں علی جاہ علی عزت بیگووچ کے جن افکار و تصورات کا مطالعہ کیا گیا، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ علی عزت کے نزدیک اسلام واحد نظام حیات اور سرچشمۂ قانون ہے، اور وہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کے نفاذ کو ضروری سمجھتے ہیں۔ علی عزت بیگووچ کے نزدیک جدید مادہ پرستانہ تہذیب مجموعۂ فساد اور انسانی فطرت کے خلاف ہے، اور اسلامی تہذیب ہی فطری، مبنی برحق، انسانی زندگی کے لیے مفید اور باعث فلاح و نجات ہے۔ علی جاہ علی عزت بیگووچ کے یہ افکار و تصورات انہیں بیسویں صدی کے اسلامی مفکرین کی صف میں ایک ممتاز مفکر کی حیثیت عطا کرتے ہی اور احیائے اسلام کی علمی جدوجہد کے سبب ایک رفیع الشان مدبر سلطنت کی حیثیت سے بھی ان کی شخصیت بہت منفرد نظر آتی ہے۔ ان کا علمی ورثہ اور عملی نظیر امت مسلمہ کے لیے حرکت و عمل کے سرچشمے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حواشی و مراجع

۱۔ علی عزت بیگووچ / محمد ایوب منیر (مترجم): اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کش مکش، نئی دہلی، اسٹوڈینٹس اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۹۹

۲۔ ایضاً، ص ۲۶

۳۔ محمد ایوب منیر (مترجم): اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کش مکش، ص ۱۶

۴۔ علی عزت بیگووچ: اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کش مکش، ص ۱۰۱

۵۔ ایضاً، ص ۱۰۱ (حاشیہ)

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۳، ۱۰۴

۷۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۸۔ ایضاً، ص ۱۲۷، ۱۲۸

۹۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۸۸-۱۸۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۷۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۸۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۶۸

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۸

۲۱ ایضاً، ص ۴۵

۲۲ ایضاً، ص ۵۶-۵۷

۲۳ ایضاً، ص ۶۱

۲۴ ایضاً، ص ۵۴

۲۵ ایضاً، ص ۵۴

۲۶ ایضاً، ص ۳۲۳

۲۷ ایضاً، ص ۳۲۴

۲۸ ایضاً، ص ۳۲۴

۲۹ ایضاً، ص ۳۲۷

۳۰ ایضاً، ص ۳۲۸

۳۱ ایضاً، ص ۳۲۸

۳۲ ایضاً، ص ۳۳۲

۳۳ ایضاً، ص ۳۳۳/ احزاب-۵

۳۴ ایضاً، ص ۳۳۳

۳۵ ایضاً، ص ۳۳۳

۳۶ ایضاً، ص ۳۳۶

۳۷ ایضاً، ص ۳۳۶

۳۸ ایضاً، ص ۳۳۶

۳۹ ایضاً، ص ۳۳۸

۴۰ ایضاً، ص ۳۳۸-۳۳۹

۴۱ ایضاً، ص ۳۴۰

۴۲ ایضاً، ص ۳۴۱

۴۳ ایضاً، ص ۲۱۶

۴۴ ایضاً، ص ۲۱۹

۴۵ ایضاً، ص ۲۲۴

۴۶ ایضاً، ص ۲۳۵-۲۳۶

۴۷ ایضاً، ص ۲۳۵-۲۳۶

۴۸ ایضاً، ص ۲۳۶

۴۹ ایضاً، ص ۲۳۶

۵۰ علی عزت بیگووچ The Islamic Declaration، سرایوو، ۱۹۹۰ء، ص ۵

۵۱ ایضاً، ص ۶

☆☆☆

علامہ یوسف قرضاوی کے سیاسی افکار

ضمیر الحسن فلاحی *

اسلام ایک مکمل دین ہے، جو انسانی زندگی کے جملہ جوانب کو محیط ہے مادی، روحانی، انفرادی واجتماعی سب سے بحث کرتا ہے اور سب کے لئے مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ جہاں وہ یہ حکم دیتا ہے کہ **کتب علیکم الصیام** (بقرۃ:۱۸۳) وہیں اسی سورہ میں یہ بھی فرماتا ہے کہ: **کتب علیکم القصاص** (۱۷۸) جہاں ایک طرف وہ ''**کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیر الوصیة للوالدین والاقربین بالمعروف**'' (۱۸۰) کی تاکید کرتا ہے وہیں اس کا یہ حکم بھی ملتا ہے کہ: ''**کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم وعسی ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم**'' (۲۱۶) اور ان ساری ہدایات کی تعبیر ایک لفظ ''**کتب علیکم**'' سے کی ہے اور ظاہر ہے کہ ان سب کی تعمیل ہی کا نام اسلام ہے اور سب پر عمل کر کے ہی خدا کا تقرب حاصل ہو سکتا ہے۔

نبی کریمؐ نے فرمایا: **ماترک امرا یقربنا من اللہ الا وامرنا بہ ولا ترک امرا یبعدنا عن اللہ الا نہانا عنہ**[۱]

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک کل ہے، وہ انسان کی پوری زندگی سے بحث کرتا ہے، اور وہ اپنی اس اکائی کی تقسیم وتجزیہ کا روادار نہیں ہے **افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذالک منکم الآ خزی فی الحیاۃ الدنیا ویوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب** (البقرۃ/۸۵)

---

* رکن، ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

چنانچہ جب یہود نے اپنی شریعت کے بعض تحفظات کے ساتھ اسلام میں داخل ہونے کی پیش کش کی تو اللہ کے رسولؐ نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی اور صاف کہہ دیا کہ اسلام میں مکمل طور پر داخل ہو۔

پھر یہ بات بھی کسی بیان کی محتاج نہیں کہ انسان روح، مادہ، عقل، شعور ہر اعتبار سے ایک وحدت اور کل ہے لہذا اسلام پر جزوی عمل کر کے حیاۃ انسانی کی صلاح فلاح ممکن نہیں۔

اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ سیاسی قوت، مقاصد کے حصول، احکام کے نفاذ، امت کی تعلیم وتزکیہ اور اسے منکرات سے بچانے کا ایک موثر ذریعہ ہے یہی وجہ ہے کہ خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ فرمایا کرتے تھے "ان اللہ یزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن" [۲] خصوصیت کے ساتھ عصر حاضر میں س کی اہمیت اور زیادہ ہوگئی ہے کہ تعلیم و تربیت سے تہذیب و ثقافت تک اور ذرائع ابلاغ سے لے کر معیشت ومعاشرت تک سارے اختیارات حکومت کے کنٹرول میں ہیں ایسی صورت میں اسلام کو سیاست سے الگ کرنا باطل کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حاکم بھی ہم خود ہوں لیکن حکومت کی اصلاح بہر حال ضروری ہے۔

انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلم دانشواروں میں ایسے دانشور بھی موجود ہیں جو سیکولر طرز پر سوچتے ہیں، اسلام کو عملی زندگی سے بے دخل کرنے کے لئے کبھی اسے ذاتی زندگی تک محدود کرتے ہیں اور کبھی اس کی صورت مسخ کرنے کے لئے اس کے مختلف ماڈل اور نوع بنوع ناموں سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلا سیاسی اسلام، اقتصادی اسلام، روشن خیال اسلام، رجعت پسند اسلام، کبھی اسے جغرافیہ کے اعتبار سے تقسیم کرتے ہیں تو کبھی زمانہ اور جنسیت کے اعتبار سے، ہندوستانی اسلام، ترکی اسلام، عربی اسلام۔ اور نہ جانے کون کون سے ماڈل وضع کر رکھے ہیں۔ حالانکہ اسلام ایک ہی ہے اور وہ، وہ ہے جو قرآن وسنت میں موجود ہے اور جسے نبی محترمؐ، آپؐ کے اصحاب اور سلف صالحین نے اپنے عملی نمونوں سے پیش کیا۔ یہی صحیح، خالص اور ہر طرح کی آمیزش سے پاک

اسلام ہے۔

قرآن وسنت پر عمیق غور وخوض بتاتا ہے کہ اسلام کو سیاست سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ سیاست سے بے دخلی کے بعد اسلام، اسلام نہیں رہتا بلکہ کوئی اور ہی دین بن جاتا ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلام کے بہت سے احکامات عین سیاست سے متعلق ہیں۔ اسلام محض ایک روحانی عقیدہ اور چند مراسم عبادت ہی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ عقیدہ وعبادت کے ساتھ تمام معاملات دنیا کو برتنے کا بہترین نظام بھی ہے یہ معاملات سیاسی بھی ہو سکتے ہیں، معاشرتی اور اقتصادی بھی، ان کا تعلق حالت امن سے بھی ہو سکتا ہے اور حالت جنگ سے بھی۔

ان سارے امور میں اسلام کے اپنے اصول وضوابط ہیں اور ان اصولوں سے اعراض دراصل اس خالق کائنات سے روگردانی کے ہم معنی ہے جس نے محض انسانی فلاح کی خاطر یہ اصول وضع کیے ہیں۔

عقیدہ توحید پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ محض عقیدہ نہیں بلکہ زبردست انقلابی وسیاسی نعرہ ہے جو انسان کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کر کے رب کائنات کی بندگی میں لا کھڑا کرتا ہے، انھیں مساوات اور اخوت ومحبت کا درس دیتا ہے اور انسانوں کے اندر یہ شعور بیدار کرتا ہے کہ کسی فرد بشر کو مطلق العنان حکمراں بن کر دوسرے انسانوں کے حقوق غصب کرنے کا حق نہیں ہے۔

اس کی دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ سیاسی مسائل سے کنارہ کش ہو کر کوئی مسلمان، مکمل مسلمان نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے، اس حکم شریعت کا لازمی تقاضہ ہے کہ ہر مسلمان معاشرہ سے منکر کے خاتمہ کی جدوجہد کرے اور معروف کو پھیلانے کے لئے سرگرم رہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے داخلی فساد سے مقابلہ کی ترغیب دی اور اسے خارجی جہاد سے افضل قرار دیا، فرمایا: افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر"[۳] اس لئے

کہ داخلی بگاڑ ہی اصلاً بیرونی بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔

اسلام نے مسلمان کے دل میں ظلم وتمرد کے خلاف آواز اٹھانے کا داعیہ پیدا کیا اور کمزور انسانوں کو ان کے ظلم سے بچانے کے لئے علم بغاوت بلند کرنے کی ترغیب دی. ومالکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ ۔۔۔۔۔(سورہ نساء:۷۵)

اللہ تعالیٰ کو وہ لوگ سخت ناپسند ہیں جو ظلم پر خاموش رہیں۔إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلآئِكَةُ ظَالِمِىْ أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِى الْأَرْضِ قَالُوَا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُوْلٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (النساء:۹۷)

اور لعنت بھیجتا ہے ان لوگوں پر جو سرکشی اختیار کرتے ہیں، اور دوسروں کو جہنم و برے اعمال سے نہیں روکتے۔...... (المائدۃ ۷۸:۷۹)

منکر صرف شراب زنا اور چوری ہی نہیں ہے، معصوم افراد کو جیلوں میں ڈالنا، عوام کی دولت کا بے جا استعمال بھی منکر کے دائرے میں آتا ہے۔منکر یہ بھی ہے کہ سیاسی معاملات میں دلچسپی نہ لے کر زمام حکومت ظالموں اور کرپٹ لوگوں کے ہاتھوں میں دیدی جائے اور یہ ممکن نہیں کہ کوئی غیور مسلمان ان برائیوں پر خاموش رہے اور کچھ نہ کرے۔حضورؐ کا فرمان ہے:

"اذا رأیت امتی تھاب ان تقول للظالم یا ظالم فقدتودع منھم"

آج کے جمہوری معاشرہ میں پھیلی برائیوں (منکرات) کے خلاف آواز اٹھانا، حکومت کی غلط اور ظالمانہ پالیسیوں اور طرز عمل پر تنقید کرنا کسی بھی شخص کا جمہوری حق ہے۔اور دین اسلام اس کو حق ہی نہیں بلکہ فرض وواجب تصور کرتا ہے۔

سیکولرازم کا اپنے سارے اختلافات کے باوجود جس بات پر اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے نام سے کوئی اسلامی ریاست وجود پذیر نہ ہو کہ زمین پر اسلام کا جھنڈا نصب ہو سکے اس کا پیغام عام ہو سکے اور وہ اپنی سرزمین کو متمردین کے پنجہ استبداد سے آزاد کرا سکیں۔لیکن اسلام کا ماننا ہے کہ اسلام عقیدہ بھی ہے شریعت بھی، عبادت بھی اور

معاملہ بھی، دین بھی ہے، سیاست بھی اور دعوت بھی ہے ریاست بھی، اسلام کی نگاہ میں اسلامی ریاست نہ صرف ضروری بلکہ دینی فریضہ اور ضرورت زندگی ہے ۔ اور اس آفاقی تصور سے اسلامی تاریخ کبھی خالی نہیں رہی ہم یہاں اسلامی ریاست کے قیام کے چند اساسی وجوہ کا ذکر کرنا چاہیں گے۔

۱۔ سورہ نساء کی آیت ۵۸ اور ۵۹ جن میں امانتوں کو اہل امانت کو سپرد کرنے اور اطاعت الٰہی، اطاعت رسول اور اطاعت اولی الامر کا حکم دیا گیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امانتوں کا ضیاع اور عدل وانصاف کی پامالی امت کی ہلاکت اور معاشرہ کی بربادی کی نوید ہے؟ اور عوام اللہ ورسولؐ کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کے مکلّف "منکم" کی شرط کے ساتھ ہیں۔ یہ دونوں آیتیں اتنی اہم ہیں کہ امام ابن تیمیہ نے اس کی روشنی میں اپنی معرکۃ الاراء کتاب (السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ) تالیف کی۔

اس کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ مسلمانوں کے لئے ایسے حکام کی بیعت شرعا حرام ہے جو اسلامی تعلیمات کا التزام نہیں کرتے اگر ایسا حاکم میسر نہیں ہے تو اسے حاصل کرنے کی کوشش دین اسلام کا عین تقاضہ ہے۔

۲۔ اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نبی آخرؐ نے اسلامی ریاست کے قیام کی کوشش کی اور ایک ایسی ریاست کی بناء ڈالی جو اسلامی ہو، جو دعوت اسلام کا وطن ہو، جس میں حاکم صرف شریعت ہو، ہجرت مدینہ اسی کوشش کی آخری کڑی ہے اور قیام ریاست کے بعد ہر مدعی ایمان کے لئے اس ریاست سے انضمام، اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں اپنے شبانہ روز گزارنا اور اس کے تحت جہاد کو لازم ٹھہرا دیا اور ہجرت کو معیار ایمان قرار دیدیا۔ فرمایا

"والذین امنوا ولم یھاجروا مالکم ....." (سورہ انفال: ۷۲)

نبی اکرمؐ کے وصال کے موقع پر صحابہ کرام کو جس مسئلہ کی طرف سب سے پہلے توجہ ہوئی وہ یہی امامت وریاست کا مسئلہ تھا۔[۵]

غرض پوری اسلامی تاریخ دین وسیاست کی علیحدگی سے ناواقف ہے، عصر حاضر کے سب سے بڑے بت (سیکولرازم) سے خبردار کرتے ہوئے اللہ کے رسول نے فرمایا تھا: الا ان رحی الاسلام دائرہ فدوروا مع الاسلام حیث دار الا ان القرآن والسلطان (الدین والسیاسۃ) سیفترقان فلا تفارقوا الکتاب الا انہ سیکون علیکم امراء یقضون لانفسھم مالا یقضون لکم فان عصیتموھم قتلوا کم وان اطعتموھم اضلوکم قالوا: ماذا نصنع یا رسول اللہ؟ قال: کما صنع اصحاب عیسی ابن مریم: نشروا بالمناشیر و حملوا علی الخشب، موت فی طاعۃ اللہ خیر من حیاۃ فی معصیۃ اللہ۔ [٦]

۳۔ اس کی تیسری دلیل یہ ہے کہ دین اسلام اپنی فطرت میں ایک دین عام ہے، ایک منہج زندگی اور مکمل شریعت ہے جو امور دین ودنیا، فرد ومعاشرہ سب پر حاوی ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کے جملہ شعبوں میں جاگزیں ہوتا کہ انسانیت کو خیر وسعادت سے ہمکنار کرسکے اور ریاست اس خیر وسعادت کے حصول کا اہم ترین ذریعہ ووسیلہ ہے یہ بات قطعاً غیر متصور ہے کہ ریاست اور معاشرہ کو الگ الگ رکھا جائے اور میدان ان لوگوں کے لئے خالی چھوڑ دیا جائے جو اس بات پر سرے سے ایمان ہی نہیں رکھتے کہ معاشرہ کی تعمیر وتشکیل میں اسلام کا بھی کچھ رول ہے۔ بلکہ امام ابن تیمیہؒ کے الفاظ میں ولایت کا مسئلہ واجبات دین میں سے ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ دین ودنیا کی بقا وسلامتی دین اسلام ہی کے ذریعہ ممکن ہے اس لئے کہ انسانی ضرورت کی تکمیل کے لئے اجتماعیت ضروری ہے اور اجتماعیت بغیر سربراہ کے ناممکن ہے۔ [۷]

یہی بات حجۃ الاسلام امام غزالی یوں فرماتے ہیں دنیا آخرت کی کھیتی ہے دین، دنیا کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، ملک اور دین ایک دوسرے کے مثنی ہیں دین اصل ہے اور سلطان اس اصل کے محافظ کی حیثیت رکھتا ہے، جس چیز کی کوئی اصل نہ ہو اس کا تصور محال ہے اور جس کا محافظ نہیں ہوگا اسے ضائع ہونے سے بچایا نہیں جاسکتا۔ [۸]

سیکولر طرز پر سوچنے والے سیاست کو شجر ممنوعہ تصور کرتے ہیں اور مسلمانوں کی

کسی ایسی سرگرمی کو مطلق حرام سمجھتے ہیں جس میں سیاست، ریاست اور اصلاح احوال کی بو محسوس کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے جو دلائل ہیں وہ دلائل کم اور توھمات زیادہ ہیں جن کی حیثیت تارِعنکبوت کے مانند ہے۔ مثلاً

۱۔ ان کا کہنا ہے کہ دین انتہائی پاک اور اعلیٰ چیز ہے اس لئے اسے سیاست سے آلودہ کرنا ور دین کی بنیاد پر کسی سیاسی پارٹی کی تشکیل کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اسلامی سیاسی پارٹی کے قیام کا مطلب حکومت الٰہیہ ہے جس پر تنقید کرنا اور اس کے راستہ میں مزاحم ہونا کفار وفساق کا کام ہے۔

۳۔ اگر مسلمانوں کو حزب اسلامی کے قیام کی اجازت دینے سے بہت سارے ممالک میں ہر قوم کو اپنی الگ پارٹی کے قیام کی اجازت دینا ہوگا اور اس طرح ریاست کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

۴۔ ان کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ پھر مساجد سیاست کدہ میں تبدیل ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ مسجدوں سے یہ کام نہیں لے سکتے وغیرہ۔

پہلے ہم مذکورہ اعتراضات کا تجزیہ کریں گے۔

۱۔ یہ اعتقاد کہ سیاست گندگی اور شیطانی عمل ہے، یہ اعتقاد بے بنیاد ہے۔ سیاست اپنے آپ میں گندگی، رذیلہ اور فعل حرام نہیں ہے، گندے اصلاً وہ اذھان ہیں جو سیاست کو غلط طور پر استعمال کرتے ہیں زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور اللہ کے بندوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں بے شمار سیاست داں، سربراہان مملکت گذرے ہیں جنھوں نے عدل وانصاف کو قائم کیا، حق کی تاکید کی، خیرات کو فروغ دیا اور انسانوں کی اصلاح کا کام انجام دیا۔ اس لئے یہ کہنا ہی غلط ہے کہ سیاست نجاست ہے۔

۲۔ یہ بات کہ حزب اسلامی کا مطلب حکومت الٰہیہ کا قیام ہے اس پر صرف یہ عرض کرنا ہے کہ حزب اسلامی اس بات کی پابند ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقاصد، اپنے اہداف

اپنے وسائل حکومت اور انسانی معاشرہ کی معاشی، معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی، سیاسی اور تربیتی اصلاح کے ضمن میں اپنا منہج ومنشور واضح کرے، اگر وہ یہ امور طے نہیں کرتی تو اس کا مطالبہ قابل ادا تصور نہیں کیا جائے گا اور اس کی حیثیت دوسری سیاسی پارٹی سے کچھ مختلف نہ ہوگی۔

۳۔ یہ کہنا کہ مسلمانوں کی اس حق کو تسلیم کر لینے کے نتیجہ میں ہر مذہب کے پیروں کاروں کے حق کو تسلیم کرنا پڑے گا اور سب کو سیاسی پارٹی بنانے کا مجاز ماننا پڑے گا، یہ بھی ایک بے بنیاد اور بے وزن بات ہے اور اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کوئی سیاسی پارٹی دن کی روشنی میں کام کرے۔ ہاں یہ بہر حال ضروری ہے کہ ملکی مصالح کی رعایت کو ملحوظ رکھے، کسی کا حق نہ مارے اور اپنے وطن وقوم کے خلاف کسی غیر سے مدد کا طالب نہ ہو۔

۴۔ سیکولرازم کا یہ الزام کہ پھر مساجد میں سیاست ہوگی، یہ بھی قابل تسلیم نہیں ہے اس لئے کہ مساجد کسی خاص گروہ کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ تمام مسلمانوں کی میراث ہیں اور ان کو شخصی وحزبی بنانے سے احتراز ضروری ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ مساجد سے معروف کے فروغ اور منکر کے ازالہ کی ہدایات جاری نہ ہوں جو اس امت کا طرہ امتیاز اور نشان افتخار ہے۔

چند سال قبل مساجد میں سیاسی باتوں کے بارے میں میرے پاس استفتاء آیا میں نے جواب میں لکھا نہ یہ مطلقاً ممنوع ہے اور نہ علی الاطلاق جائز۔

اس سلسلہ میں ہماری رائے یہ ہے:

۱۔ کچھ مخصوص اہل وطن کو ان کے سیاسی حق سے محروم کرنا کہ وہ اپنے ملک عزیز کی تعمیر وترقی کا نقشہ بنائیں اور اس میں اپنا مؤثر رول ادا کریں۔ صحیح نہیں ہے، اور وہ بھی محض اس وجہ سے کہ وہ دین پسند ہیں۔ دینی مزاج کا حامل ہونا اور اس پر استقامت اختیار کرنا انسان کا اپنے ملک کی سیاست میں اشتراک ومشارکت سے محرومی کا سبب نہیں بن سکتا حالانکہ سیکولرازم، لبرلزم، نیشنلزم ور کمیونزم سب کو یہ حق حاصل ہے، ایسا کرنا نہ

صرف ملک کے دستور کی خلاف ورزی ہے بلکہ انسانی حقوق کے خلاف ہے۔

۲۔ مسلمانوں کو ان کے اس بنیادی و دستوری حق سے محروم کرنا اس لئے بھی صحیح نہیں ہے کہ اس میں صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ غیر مسلموں کا مفاد بھی پیش نظر ہوتا ہے۔

جمہوریت اور اسلام

ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام میں ریاست کا تصور کوئی نیا و عجیب تصور نہیں ہے بلکہ معاصر دنیا کی ریاستوں کی طرح وہ مدنی تصور ہے بس فرق صرف یہ ہے کہ اسلامی ریاست کا مرجع و مصدر اسلام ہے جو دوسروں کا نہیں ہے۔ اب ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کی اساس بھی شوریٰ، بیعت اور عوام کا آزادانہ طور اپنے حکمراں کو منتخب کرنا، اس کے ساتھ نصح و خیر خواہی، محاسبہ، معروف میں اس کی اطاعت، معصیت میں اس کے حکم کو ٹھکرا دینا اور اگر وہ اپنی کجی و انحراف سے باز پرس نہیں آتا تو اسے معزول کرنے پر مبنی ہے۔ اور سیاست کی کتابوں میں جمہوریت کی تعریف جو بھی ہو مگر اس کا سیدھا شدہ مفہوم یہ ہے کہ عوام کو اپنی پسند کے حکمرانوں کو منتخب کرنے کی پوری آزادی ہو اور انہیں اس بات کا پورا حق حاصل ہو کہ عوامی اور ملکی مصلحتوں کے خلاف چلنے والے حاکموں کا احتساب کر سکیں اور بوقت ضرورت انہیں معزول و برطرف بھی کر سکیں۔

یہ ہے وہ حقیقی جمہوریت جس کے نفاذ کے لئے مختلف وسائل، الیکشن کی کارروائیاں، پارلیمنٹ کا قیام، متعدد سیاسی پارٹیوں کا وجود، ملک کی اقلیتوں کو سیاسی اختلاف کی آزادی اور عدلیہ کا غیر جانب دار ہونا وغیرہ، اختیار کئے جا سکتے ہیں۔

کیا اس جمہوریت میں کوئی ایسی بات ہے جو اسلام کے منافی ہو؟ اور کیا قرآن و سنت سے کوئی ایک بھی دلیل پیش کی جا سکتی ہے جس کی بنا پر جمہوریت کو اسلامی تعلیمات کے خلاف قرار دیا جا سکے؟۔

حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت اسلام کے منافی نہیں بلکہ عین اسلامی تعلیمات

کے موافق ہے اسلام اس بات کا شدید مخالف ہے کہ عوام کی قیادت و امامت کسی ایسے فرد کو سونپ دی جائے جسے لوگ ناپسند کرتے ہوں چاہے پورے ملک کی قیادت ہو یا نماز باجماعت کی امامت، اس وضاحت کے باوجود بعض حضرات کا اصرار ہے کہ اسلام اور جمہوریت ایک دوسرے کی ضد ہیں کیونکہ اسلام حاکمیت الٰہ کا تصور دیتا ہے جب کہ جمہوریت میں حاکمیت جمہور کی ہوتی ہے۔

اپنے ان بھائیوں سے ہم عرض کریں گے کہ یہاں حاکمیت جمہور کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ حکومت فرد مطلق کے ہاتھ کا کھلونا نہیں ہے۔

ان حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ جمہوریت اور اسلام میں عدم توافق کے متعدد وجوہ ہیں۔

۱۔ اسلام کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے اور جمہوریت انسانی نظام ہے۔۹

۲۔ جمہوریت سے مراد عوام کی عوام کے لئے حکومت ہے جب کہ اسلام سے مراد اللہ کی حکومت ہے۔

۳۔ جمہوری نظام حکومت میں بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا اور یہ بات کسی بیان کی محتاج نہیں کہ اکثریت ہمیشہ حق وصواب پر نہیں ہوا کرتی۔

۴۔ جمہوریت ایک بدعت ہے، گذشتہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے، اور حدیث میں صاف وارد ہے "من احدث في امرنا ماليس منه فهو ردّ"

۵۔ جمہوریت کا مبدا تو یورپ ہے جو دین پر ایمان نہیں رکھتا یا وہ ملحد ہیں جو نبوت، الوہیت اور جزا وسزا کو نہیں مانتے، لہذا ایسے نظام کو اختیار کرنا ہمارے لئے کیونکر درست ہوسکتا ہے۔

ان وجوہ سے یہ حضرات جمہوریت کے سخت مخالف ہیں اور بسا اوقات اسے کفر تک سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو صرف جمہوریت کو ہی امت کے مرض کہن کا چارہ گردانتے ہیں۔ لیکن صحیح اور سچی بات یہ ہے کہ جمہوریت کا جوہر اور اس کا خیر اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ جمہوریت کی تعریف پیچھے گذر چکی ہے۔۱۰

جمہوریت انسانی اجتہاد ہے یہ کوئی عیب کی بات نہیں اور نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس کے خیر کو بھی نہ لیا جائے۔ اس لئے ہر بشری اجتہاد مذموم نہیں ہوتا اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ انسان کو غور وفکر، تفکر وتدبر اور اجتہاد واستنباط کا حکم نہ دیتا ہے۔ انسانی اجتہاد میں دیکھنے کی چیز صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے متناقض تو نہیں ہے؟

ہم یہ دیکھتے ہیں جمہوریت ، اسلام کے نظام شوریٰ ، نصح و خیر خواہی، امر بالمعروف ، نہی عن المنکر ،تواصی بالحق والصبر ، اقامت عدل ،ظلم کے خاتمہ اور دفع مفاسد سے ہم آہنگ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہم مروجہ جمہوریت کے علمبر ادر نہیں ہیں بلکہ ہم اس جمہوریت کی بات کر رہے ہیں جس کے نگران مسلم امت، اسلامی معاشرہ اوراور اسلامی اقدار و ساسیات کریں گے۔

مسلم اقلیتوں کے مسائل

ڈاکٹر یوسف القرضاوی اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کی سیاسی پارٹی کی تشکیل کو وقت کی شدید ترین ضرورت تصور کرتے ہیں۔ لیکن وہ ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ: ایسے ملکوں میں مسلمانوں کا وجود ایک نعمت ہے اور وہاں کی مسلم اقلیتوں کو چاہیے کہ یہ وجود ان کے اور غیروں کے درمیان ہمزہ وصل بن جائے جس سے ان کے تعلقات استوار ہوں غلط فہمیوں کا ازالہ ہو اور غیر مسلم معاشرہ کے شبہات کا جواب دیا جا سکے۔

ان کا ماننا ہے ک ایسے ملکوں میں مسلمانوں کا وجود اصلی ہے، اجنبی نہیں ہے۔ مثلاً ہندوستان ، چین ،تھائیلینڈ ، برما اور دیگر ایشیائی ممالک کہ ان میں مسلمان کہیں باہر سے آکر آباد نہیں ہوئے بلکہ وہ وہاں کے اصلی متوطن ہیں لہذا ان ممالک میں ان کو فعال اور موثر ہونا چاہیے جس سے وہ عالمی سیاست پر اثر انداز ہو سکیں۔

دعوت وارشاد کے نقطہ نظر سے ان کا وجود ضروری ہے تا کہ وہ وہاں کی اکثریت

کو اپنی زبان، گفتگو اور کردار سے اسلام کے حیات بخش پیغام سے روشناس کرائیں یہ اسلئے بھی ضروری ہے کہ نو واردان اسلام ایمان کی حفاظت اور صحیح اسلامی ماحول میں ان کی تربیت وتزکیہ ہو سکے۔

مسلم پرسنل لاء اور مسلمانوں کے اوقاف کی حفاظت کے نقطہ نظر سے یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے وغیرہ۔

مسلم اقلیات کے لئے ڈاکٹر قرضاوی کا پیغام ہے کہ اپنی شناخت بناؤ اور بڑے معاشرہ میں چھوٹے معاشرہ کی حیثیت اختیار کرنے کی سعی کرو ورنہ اندیشہ ہے تم بھی نمک کی طرح پانی میں حلول کر جاؤ گے۔

کوشش کرو کہ تمھارے علیحدہ دینی، تربیتی، ثقافتی اور معاشرتی ادارے ہوں اور اس کے لئے جب باہم اور تعاون واشتراک ضروری ہے کیونکہ آدمی اپنے میں قلیل اور اعوان وانصار کے ساتھ کثیر ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہود بہترین نمونہ ہیں۔

میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ تم اپنی ذات میں گم اور معاشرہ سے کٹ جاؤ، میرا مدعا یہ ہے کہ اپنی اسلامی شناخت کے ساتھ جینے کی کوشش کرو۔ جب ایسے اکثریتی ممالک میں مسلمان موجود ہیں اور اپنی دینی شناخت کے ساتھ موجود ہیں تو فطری ہے کہ وہ اپنے سیاسی وجود کے لئے بھی جہد مسلسل کریں اس لئے کہ ہم سیاست کو چھوڑ بھی دیں تو وہ ہمیں ہوگز نہ چھوڑے گی۔

یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور اس کا پیدا ہونا فطری بھی ہے کہ آیا مسلم اقلیتیں دین سے چمٹی رہیں اور سیاست سے کنارہ کش رہیں۔ یا دین پر استقامت کے ساتھ ساتھ ملک کی سیاست میں بھی حصہ لیں؟ پھر اگر وہ سیاست میں جائیں تو کسی پارٹی میں ضم ہو کر یا اپنی الگ پارٹی کے ساتھ۔ کیا سیکولر پارٹیوں میں ان کی شمولیت جائز ہے؟ کیا ان کے لئے اپنی پارٹی بنانا جائز ہوسکتا ہے جب کہ ان ملکوں کے دساتیر کا اقرار لازم ہے۔ یہ اور اس طرح کے بے شمار سوالات ہیں جن پر غور کئے بغیر آگے بڑھنا تقریباً محال نظر آتا ہے۔

ان سوالات کے مختلف جوابات دیئے جاسکتے ہیں اور دیئے جاتے ہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ اسلام ایک حقیقی و واقعی دین ہے اور اسلامی شریعت انسانی، روحانی، مادی، دینی، سیاسی، تہذیبی، اقتصادی تمام حاجات کا لحاظ کرتی ہے۔ انسان چاہے مسلم معاشرہ میں ہو خواہ اغیار کے درمیان۔

مسلم اقلیت کی ایک ضرورت ہے کہ وہ اپنے دین، عقیدہ، شعائر ور اقدار کو دانتوں سے پکڑے رہے، جس معاشرہ میں وہ ہے اس سے جڑ کر رہے اس کی سرگرمیوں ا نشاطات میں حصہ لے خیر کے کام کرے، ہدایت عام کرے فضائل کی دعوت دے اور رذائل سے روکے اور اس طرح سے اپنے وجود کو تسلیم کرائے۔

ہر اقلیت کی حیثیت اپنے ملک میں مہاجر کی نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت ملک کے اصلی باشندے کی ہوتی ہے اور اکثر یہ نعرہ لگایا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے دیار کی راہ لیں لہذا ضرورت ہے کہ ملک کی اہم نشستوں پر ایسے آواز بلند کرنے والے ہوں جو ان کے حقوق کا دفاع کر سکیں اور ایسے قوانین کو نافذ ہونے سے روک سکیں جو ان پر ظلم وعدوان کا دروازہ کھولتے ہیں اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کرتے ہیں، دینی فرائض کی ادائی میں مزاحم ہوتے ہیں اور ان امور کو ضروری قرار دیتے ہیں جن سے شریعت اسلام نے روکا ہے۔

اس لحاظ سے مسلمانوں کو منتخب ہو کر جانا مسلم اقلیت کے لئے باعث خیر و سعادت ہے تاکہ وہ اپنی حرمات کا دفاع، اپنے حقوق کی حمایت اور اپنے دینی شعائر کی بقا کے لئے کوشش کریں۔

یہاں اسلامی شریعت کے بعض ان اصولوں کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جن سے نفس مسئلہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اور وہ یہ ہیں۔

ا۔ شریعت کا معروف قاعدہ ہے جس چیز سے کسی واجب کی تکمیل ہوتی ہے وہ بھی واجب کے درجہ میں ہو جاتی ہے۔ لہذا جب مسلمانوں پر اپنے دینی و ثقافتی حقوق کا حصول واجب ہے اور سیاست میں شرکت اس واجب کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اس

لئے یہ بھی واجب کے درجہ میں ہوگا۔

۲۔فقہ کی ایک اہم اصطلاح/قاعدہ سد ذرائع ہے، چونکہ سیاست سے دوری ان کے دینی واجتماعی وجود کے لئے خطرہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ ان ذرائع و خطرات کا سد باب کریں۔

۳۔ایک اور قاعدہ یہ ہے کہ ضروریات ممنوعات کو مباح کردیتی ہیں۔اب اگر جمہوری ممالک میں اس کے ذرائع ملتے ہیں کہ ان کے افراد مجلس قانون ساز کے رکن بن کر اپنے حقوق کا دفاع کریں تو انہیں ضرور بننا چاہیے، رہی یہ بات کہ ایسی صورت میں ان پر دستور کا احترام لازم آئے گا اور اس کی وفاداری کا حلف لینا پڑے گا تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اضطرار کی حالت ہے جس میں ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔فمن اضطر غیر باغ ولاعاد فلااثم علیہ (البقرہ،۱۷۳)

۴۔اسی طرح کا ایک مصلحت مرسلہ ہے، اس کا استعمال بھی ہونا چاہیے۔

ان اصولوں کی روشنی میں اولی یہی لگتا ہے کہ مسلمان اپنی دینی واجتماعی مصلحت کی خاطر عملی سیاست میں حصہ لیں اور ان مفاسد وخطرات کا سد باب کریں جن کا سامنا انہیں ہے یا کرنا پڑسکتا ہے۔

کسی ملک کی مسلم اقلیت مختلف حیثیتوں سے اگر اتنی مضبوط اور ملک کا آئین انہیں اجازت دے کہ وہ الگ سیاسی پارٹی بنا سکیں تو وہ اپنی الگ پارٹی بنائیں۔اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ کسی پارٹی جو اسلام کے اصول ومبادی سے قریب تر ہو اور مسلمانوں کے لئے نرم گوشہ رکھتی ہو کے ساتھ مل کر کام کیا جائے۔ان میں سے جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے، عمیق غور وخوض اور علمی وعملی تجربہ وطویل تبادلہ خیالات اور موازنہ کے بعد۔

مسلمان مل کر طے کریں کہ ان میں سے کون سا لائحہ عمل ان کی دین ودنیا کے اعتبار سے قابل عمل اور مفید ہے۔پارٹی بنانا یا کسی پارٹی میں شمولیت اختیار کرنا۔پھر اس پر اتفاق رائے ہو کہ ملک میں موجود پارٹیوں میں کون سی پارٹی ان سے قریب اور ان کی تر

جمع ہو سکتی ہے۔ اس عمل سے گذرنے کے بعد ہی وہ ملکی سیاست پر اثر انداز ہو سکیں گے بصورت دیگر پہلے سے کہیں زیادہ کمزور ہو جائیں گے اور ان کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح راستہ کی ہدایت دے۔ آمین

حواشی ومراجع

۱۔ مسند احمد/۱۴۲/۱۷، ابن ماجہ، ایمان ۴۳، عبرانی، ۱۸/ ۲۴۷

۲۔ البدایۃ والنہایۃ ۲/۱۰

۳۔ ابوداؤد، ملاحم، ۴۳۴۴، ترمذی، فتن، ۲۱۷۴، ابن ماجہ، فتن، ۴۰۱۱، مسند احمد، ۱۱۰۳۵

۴۔ فتاوی یوسف القرضاوی، ۲/ ۲۳۸-۲۴۲

۵۔ البدایۃ والنہایۃ، ۶/ ۳۰۱

۶۔ حلیۃ الاولیاء، ۵/ ۱۶۵، المعجم الکبیر، ۲۰/ ۹۰

۷۔ مجموع الفتاوی لابن تیمیہ، ۲۸/ ۲۶۴

۸۔ احیاء العلوم الدین، ۱/ ۷۱

۹۔ من فقہ الدولۃ فی الاسلام للقرضاوی، ص ۱۳۰-۱۴۰

۱۰۔ من فقہ الدولۃ والاسلام

☆☆☆

تحریک اسلامی اور کارِ جہاں آرائی

محی الدین غازی*

مصر میں اسلامی تحریک نے انتخابات میں شرکت کی اور نمایاں کامیابی حاصل کی، ایک سال تک انھوں نے حکومت بھی کی، لیکن انسانی تاریخ کے لیے یہ کوئی خاص واقعہ نہیں تھا، تاہم فوجی انقلاب کے بعد جبر وتشدد کے مقابلے میں پرامن مزاحمت اور ظلم کے خلاف پرامن احتجاج کا انھوں نے جو انوکھا کردار پیش کیا اسے ہم تمدن کی تاریخ کا ایک سنگ میل قرار دے سکتے ہیں، اس کردار نے تحریک اسلامی کو عالمی سطح پر ایک اچھی اور قابل قدر تقلید پہچان عطا کی۔ گوکہ تحریک اسلامی کے مخالفین نے اس کردار پر کیچڑ اچھالنے اور اس پہچان کو چھین لینے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر ڈالے۔

اس مضمون میں تجویز پیش کی گئی کہ تحریک اسلامی کو اقامت دین کے لیے ترجیحی طور پر تمدن کا میدان اختیار کرنا چاہیے۔ تمدن سے راقم کی مراد وہ سماجی فریم ہے جس کے اندر رہ کر فرد کی زندگی پروان چڑھتے ہوئے مختلف روپ اختیار کرتی ہے۔

غلط فہمی کو دور کرنے کی غرض سے یہ وضاحت عرض ہے کہ تمدن کی گاڑی کس رخ پر چلے اس پر آپس میں اور موقعہ ملنے پر دوسروں سے گفتگو اور بحث ومباحثہ کرنا اور تجاویز اور مشورے دینا ایک کام ہے اور تمدن کی گاڑی کا ڈرائیونگ وہیل اپنے ہاتھ میں لے لینا ایک دوسرا کام ہے، دونوں کی جداگانہ اہمیت ہے۔ گفتگو اور مباحثہ کے لیے وسیع اور عمیق معرفت وشعور درکار ہے، ڈرائیونگ وہیل اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کی ہمت وجرأت اور ڈرائیو کرنے کی مہارت اور استعداد بھی مطلوب ہے۔

---

* سابق ہیڈ آف شریعہ، متحدہ عرب امارات

تحریک اسلامی کی کوششیں زیادہ تر آپس میں اور کبھی کبھی دوسروں سے کچھ گفتگو تک محدود رہی ہیں، فی الوقت تمدن کی گاڑی کا ڈرائیونگ وہیل دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور تحریک اسلامی کے نمائندے گفتگو کے وہ پلیٹ فارم جو انھیں مہیا ہو پاتے ہیں وہاں گفتگو میں شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہمارے خطاب عام اور کانفرنسیں، مقالات اور کتابیں، مدرسے اور تحقیقی ادارے یہ سب گفتگو ہیں، ان کا اثر تمدن کی گاڑی کی رفتار اور رخ پر نظر آ سکتا ہے، بشرط یہ کہ گاڑی چلانے والے اس اثر کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا، گفتگو کرنے والے تجاویز پیش کرتے رہتے ہیں اور گاڑی چلانے والے اپنے خاکے کے مطابق گاڑی چلاتے رہتے ہیں۔ اس لیے جو لوگ تمدن کو بدلنے کا خواب دیکھتے ہیں، وہ گفتگو سے آگے بڑھ کر ڈرائیونگ وہیل اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تحریک اسلامی کو تمدن کی گاڑی کا ڈرائیونگ وہیل سنبھالنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

غلط فہمی سے بچانے کی غرض سے یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ کار جہاں آرائی کا کام کار جہاں بانی سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ کار جہاں بانی کے میدان میں طالع آزما بہت زیادہ ہوتے ہیں، بیش تر ہر قسم کی اخلاقی قدروں سے عاری یا ان پر سمجھوتے کے لیے تیار رہتے ہیں، وہاں کی کامرانی بھی چھاؤں کی طرح ہوتی ہے کہ آنے کے بعد ہی جانا شروع کر دیتی ہے، نادر مثالوں کو چھوڑ کر یہ میدان کوئلے کی کان کی طرح ہے کہ ہاتھ کالے ہو ہی جاتے ہیں، اور نہ ہوں تو بھی پیشانی پر کلنک لگنے کا ہمیشہ امکان رہتا ہے۔

کار جہاں آرائی کے میدان میں افراد کے درمیان اصل مقابلہ قوت بازو اور غیر اخلاقی حربوں کا نہیں بلکہ ہنرمندی اور لگن کا ہوتا ہے، یہ میدان بہت بڑا ہوتا ہے اور زیادہ تر خالی رہتا ہے، یہاں طالع آزما نہیں ہوتے ہیں، کیوں کہ یہاں بغیر اجرت بہت زیادہ محنت کا قانون رائج ہے، خود کو قربان کر کے دنیا کو سجانے کا جذبہ رکھنے والے یہاں آتے ہیں، جہاں بان چلتی ہوئی دنیا کو چلانے کا ڈھونگ کرتے ہیں، جہاں آرا بگڑتی

ہوئی دنیا کو سنوارتے اور سجاتے ہیں۔ شہرت اور ناموری جہاں بانوں کو ملتی ہے، جہاں آرا زیادہ تر گوشہ گمنامی میں زندگی گزار دیتے ہیں۔

غور وفکر کے بعد راقم اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ تحریک اسلامی کو اقامت دین کے مقصد کے حصول کے لیے کار جہاں آرائی کو ترجیحی طور پر اختیار کرنا چاہیے، اس طرح کہ افراد کے انتخاب، ان کی تربیت اور ان سے توقعات ومطالبات میں اس ترجیح کا سب سے زیادہ کردار ہو۔ جب ہم سیاست میں حصہ لیتے ہیں تو یقینی طور پر ہم معاشرہ کے ایک حصہ کو جو اکثریت بھی ہوسکتا ہے اور اقلیت بھی اپنا فریق مخالف نہیں تو فریق مقابل تو بنا ہی لیتے ہیں، جب کہ تمدن کے میدان کار میں ہماری حیثیت اس معلم یا طبیب کی ہوتی ہے جس کا عام معاشرہ میں کوئی مخالف یا مقابل نہیں ہوتا۔

مولانا مودودیؒ نے سیاسی عمل سے متعلق اصلاح معاشرہ کے لیے انتخابی عمل میں صالح جماعت کی شرکت کو ضروری قرار دیا ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب صالح جماعت کو انتخابات میں کامیابی بھی حاصل ہو اور انتخابی عمل میں شرکت اخلاقی قدروں کی واضح اور بھرپور رفاقت کے ساتھ ہو۔ کسی بھی میدان میں بری ناکامی کا منھ دیکھنے والے کھلاڑی کبھی نمونہ نہیں بنتے ہیں، نہ ان کے کھیلنے کا انداز اور نہ ان کے کھیل کی اقدار۔

جب سے مطلق العنان آمریت کو عرب ملکوں کے حوالے کر کے دنیا نے محدود دائرہ کار اور محدود اختیارات رکھنے والے جمہوری طرز حکومت کو اپنایا ہے، حکومت تمدن پر اثر انداز ہونے کے بجائے تمدن کی تابع بن گئی ہے، اب زندگی کی اصل باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہے جو تمدن کے خدوخال طے کرتے ہیں۔

جہاں آرائی کی کچھ مثالیں

موجودہ دور میں خاندانی نظام کیسا ہو، اس پر بہت زیادہ غور وفکر اور گفتگو کی ضرورت ہے، روایتی مشترکہ خاندانی نظام کے اندر بہت ساری خامیاں ہیں جو موجودہ

زمانے میں اور زیادہ ابھر کر سامنے آئی ہیں، جدید مادہ پرستی نے چھوٹے خاندان کا تصور پیش کیا ہے، مگر اس کے پیچھے فرد کی خود غرضی کارفرما ہے، اسلامی تحریک کو گہرے جائزہ اور غور و فکر کے بعد خاندانی نظام کے خدوخال تجویز کرنا ہوں گے۔

خاندانی نظام کے ذیل میں ایک مشہور مسئلہ کفاءت کا ہے، خاص طور سے مختلف پیشوں کے حوالے سے۔ کفاءت کا تصور قدیم فقہاء نے اس نیت سے پیش کیا تھا کہ ازدواجی رشتوں کو پائیداری نصیب ہو، قدیم فقہاء کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے کے بجائے ہماری فکر اس نیک محرک پر مرکوز ہو جو ان کے پیش نظر تھا، دراصل جدید دور میں ہونے والی بہت ساری تبدیلیوں کے تناظر میں کفاءت کے اس پورے تصور کی تشکیل نو کی ضرورت ہے۔

تمدن کی اصلاح میں ادب کا غیر معمولی کردار ہوتا ہے، اسلامی تحریک نے زیادہ تر ادب کے مقصد اور کردار پر گفتگو کی ہے، ذہن و دماغ پر اثر انداز ہو جانے والے اعلیٰ ادب کے نمونے ہمارے یہاں نہیں کے برابر ہیں۔ ہمارے اداروں سے شائع ہونے والے شعری دواوین کسی ایک انسان کی زندگی پر اثر انداز ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ مائل خیر آبادی کے بعد ہمارے یہاں اچھی کہانیاں لکھنے کا سلسلہ بالکل بند ہو گیا۔ ادب اسلامی کے علم بردار ناقدین شعراء اور افسانہ نگار یہ ثابت کرنے میں اب تک ناکام رہے ہیں کہ اسلامی اقدار کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی تخلیق ہو سکتی ہے۔

ہمارے یہاں ایک ایسا ناول بھی نہیں ہے جسے پڑھ کر آدمی اقامت دین کا شعور حاصل کر لے اور اس کے لیے سرگرم ہونے کے جذبہ سے سرشار ہو جائے۔ دوسرے نظریات کے حاملین اس میدان میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔

ہم تمدن کے موجودہ ڈھانچہ میں جو بھی تبدیلی لانا چاہتے ہیں، ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا ان سے بہ خوبی واقف ہونا ضروری ہے، تاکہ ان کی تخلیقات ان تبدیلیوں کے لیے معاون بن سکیں۔ راقم کا ذاتی تجربہ ہے کہ مشترک خاندانی نظام کے خلاف بعض فقہی نوعیت کی کتابیں لکھی گئیں جن کے دلائل اور اسلوب سے وہ کبھی بھی مطمئن نہیں

ہو سکا، لیکن راجندر یادو کے ایک ناول نے مشترکہ خاندانی نظام سے بے حساب متنفر کر دیا۔

زوجیت کے سائے سے محروم عورتیں معاشرہ کا ایک بڑا مسئلہ ہیں، رائج سوچ یہ ہے کہ ایک بیوہ عورت شوہر سے محروم ہونے کی وجہ سے گھر اور ذریعہ آمدنی سے محروم ہو جاتی ہے، اس لیے وہ ایسی مدد کی ضرورت مند ہوتی ہے جس سے اسے جائے رہائش مل جائے اور آمدنی کا ذریعہ میسر ہو جائے، انسانیت کا درد رکھنے والی خواتین اپنے شوہروں کے تعاون سے اس طرح کی کفالت کے لیے پیش قدمی بھی کرتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک بیوہ کی سب سے بڑی ضرورت زوجیت کا سائے بان ہوتا ہے، جس سے وہ محروم ہوگئی ہوتی ہے، بیوہ کے علاوہ وہ عورتیں جنھیں طلاق ہوگئی، یا وہ عورتیں جن کی زیادہ عمر ہو جانے کی باوجود کسی وجہ سے شادی نہیں ہوسکی، مذکورہ مسئلہ میں شامل ہیں، ایسی عورتوں کی واقعی مدد کے لیے عموماً نہ مرد ہمت کر پاتے ہیں نہ خواتین اس سلسلے میں اپنے شوہروں کی مدد کرتی ہیں، انجام کار معاشرہ کے اس زخم کا دائرہ بڑھتا جارہا ہے۔ اگر تحریک کے سب نہیں صرف ایک لاکھ افراد یہ طے کرلیں کہ نکاح ثانی کے ذریعہ ایسی خواتین کو زوجیت کا سائے بان عطا کریں گے، اور پھر وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کو یہ بھی دکھائیں کہ محبت اور عدل وانصاف کے ذریعہ کس طرح ایک سے زائد بیویاں رکھی جاتی ہیں، تو تعدد ازواج کے سلسلے میں جھجھک دور ہو جائے گی، معاشرے میں ایک نیا رجحان پیدا ہوگا، بے شمار محروم خواتین کو شوہر کا گھر ملے گا، اور معاشرہ کا ایک بڑا زخم مندمل ہو جائے گا، اتنے بڑے معاشرتی انقلاب کے لیے نہ کسی مظاہرے کی ضرورت ہے نہ دھرنے کی، بلکہ صرف بہت سارے عملی نمونے درکار ہیں، ہر سطح پر تحریک کی قیادت کو اس اقدام کے لیے آگے بڑھنا ہوگا۔

معاشرہ کا ایک بڑا مسئلہ یتیم بچے ہیں، یتیم بچوں کے سلسلے میں رائج سوچ یہ ہے کہ وہ مشقتوں کا سامنا کیے بنا بڑے ہو جائیں، اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں، اس کے لیے یتیم خانے بنائے جاتے ہیں، جہاں ایک طرف تو بچوں کو بنا مشقت کیے

کھانے پینے کی سہولتیں فراہم کرکے آرام کا عادی بنا دیا جاتا ہے، دوسری طرف یتیم خانہ انھیں معاشرے میں ایک ایسی پہچان دیتا ہے جو بوجوہ انسانی احترام سے مطابقت نہیں رکھتی، اور پھر سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے مستقبل کے سلسلے میں حسین خواب دیکھنے والا سرپرست ان کو نہیں ملتا، تحریک اسلامی کی طرف سے یتیم خانے قائم کرنے کی مختلف مقامات پر کوششیں دراصل اس بات کی غماز ہیں کہ خدمت کا جذبہ تو ہے مگر اس کے پیچھے تمدن کا گہرا شعور اور سوچا سمجھا موقف نہیں ہے۔ اگر تحریک کے سارے مستطیع افراد یہ طے کرلیں کہ ایک یا ایک سے زائد یتیموں کی باعزت کفالت ان کے اپنے گھر میں یا خود اپنے گھر میں رکھ کر کریں گے، اور ان کے مستقبل کے سلسلے میں وہی خواب دیکھیں گے جو اپنے بچوں کے لیے دیکھتے ہیں، تو معاشرہ کا ایک بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا، اور جہان آرائی کی سمت اچھی پیش رفت ہو سکے گی۔

صارفیت ایک خطرناک رجحان ہے جس کی لپیٹ میں کم وبیش ساری دنیا آ چکی ہے، اس رجحان کے غلط ہونے پر تحریک اسلامی کا مکمل اتفاق ہے، لیکن عہد حاضر میں صارفیت سے پاک زندگی کا نمونہ کیا ہے، ضروریات زندگی کو دیکھنے کا وہ کون سا زاویہ ہے جو صارفیت کی ہر قدم پر نشان دہی کرتا چلے، حقیقی ضرورتوں اور صارفیت کے تقاضوں میں فرق بتانے کا پیمانہ کیا ہے، نظریاتی طور پر ان سب سوالوں کا جواب اور عملی طور سے اپنی زندگی میں اس کا اظہار تمدن کی اصلاح کا ایک اہم پہلو ہے۔

عام تقریبات اور خصوصی طور سے شادی کے موقعہ پر ہونے والے بے جا مصارف، فضول رسومات اور جہیز کے سلسلے میں تحریک اسلامی کے افراد کا ایک واضح اور نمایاں عملی کردار، تحریک کو ایک پہچان دے سکتا تھا، افسوس کہ ابتدائی دور میں اس پر سختی سے عمل ہوا، مگر اب کچھ تساہل در آنے لگا ہے۔ بے جا مصارف اور فضول رسومات نیز بھاری ذمہ داریاں تمدنی لحاظ سے ایک صالح معاشرہ کی بیخ کنی میں اور اس کے افراد کو صالحیت کی سزا دینے میں کیا رول ادا کررہے ہیں اس کا جائزہ بڑی گہرائی سے لینے کی ضرورت ہے۔

معقول فیس اور مریض سے ہمدردی تحریک اسلامی کے طبیبوں اور معالجین کی

پہچان بن جائے، طبی اخلاقیات سے آراستہ ہوتے ہوئے، مریضوں کا استحصال کرنے والے کمیشنوں سے اجتناب کے لیے وہ معروف ہوں، لیکن اتنا کافی نہیں ہے، تحریک اسلامی سے وابستہ معالجین کو تشخیص و علاج کے سلسلے میں بھی دوسروں سے ممتاز ہونا چاہیے۔ ایک چھوٹے کلینک کے مقابلے میں ایک بڑے ہاسپٹل سے اخلاقی قدروں کا زیادہ وسیع پیمانے پر تعارف کرایا جاسکتا ہے، ایک معمولی طبیب کے مقابلے میں ایک معروف اسپیشلسٹ اعلیٰ اخلاق کی زیادہ بہتر طور پر تبلیغ کرسکتا ہے۔

تحریک اسلامی سے وابستہ تاجر، اسلام کی تجارتی اخلاقیات کا نمائندہ بن جائے، وہ مناسب قیمت اور اچھا مال فراہم کرنے کے سلسلے میں پورے بازار میں سب سے ممتاز ہو، ملاوٹ کرنے اور فرسودہ یا عیب دار مال بیچنے کا اس پر کبھی الزام نہ آئے۔ اور وہ بازار کا سب سے بڑا تاجر بننے کے لیے بھی کوشاں رہے۔ تاکہ لوگوں کو یقین دلا سکے کہ ایمان داری ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی ہے۔ اسلامی اقدار کے حامل اور داعی کچھ کامیاب تاجر میدان تجارت میں جو تبدیلی لا سکتے ہیں وہ سینکڑوں کتابوں سے نہیں آسکتی۔

تحریک اسلامی کے افراد اگر کوئی اسکول یا مدرسہ چلائیں تو وہ نصابی مشمولات کے علاوہ، اعلیٰ تعلیمی معیار اور فیس کی معقولیت کے لحاظ سے اسلامی تمدن کی نمائندگی کرنے والا ہو، نہ وہ غیر معیاری ہو جیسا کہ عام طور سے قومی اور ملی ادارے ہوتے ہیں، اور نہ وہ اس قدر مہنگا ہو، کہ تعلیم کی تجارت کرنے والوں کی فہرست میں نام آجائے۔ اس تعلیمی ادارے کے اساتذہ اور ذمہ داران کی سرگرمیاں اور مصروفیات اس احساس ذمہ داری کی بھرپور غمازی کریں جو ادارہ میں داخل بچوں کے تئیں ان کے اوپر عائد ہوتا ہے۔

تحریک اسلامی سے وابستہ سول انجینیرس اور ماہرین تعمیرات مکانوں کا نقشہ بناتے وقت، جہاں ایک خوبصورت اور آرام بخش مکان کی فرمائش کا بہترین سامان کریں، وہیں پردے سے متعلق اسلامی احکامات کی بھی پوری رعایت کریں اور اپنی پیشہ ورانہ مہارت کے ذریعہ اسلامی فن تعمیر کو فروغ دیں۔

خدمت کے تصور کی بھی تجارت کاری عام ہو چلی ہے، خدمت کی آڑ میں ناز یبا مقاصد کی تکمیل کے نمونے بھی عام ہیں، خدمت کے ادارے یا تو اچھی خدمت دینے میں ناکام ہو جاتے ہیں، یا دیانت داری کے حوالے سے بدنام ہو جاتے ہیں، تحریک اسلامی کے ذریعہ بے غرض خدمت کے عملی نمونے اس طرح پیش کرنا کہ خدمت بھی واضح طور پر معیاری ہو، اور خود غرضی اور نفع اندوزی کا دامن پر کوئی دھبہ بھی نہ ہو، جہان آرائی کی سمت ایک اچھا قدم ہوگا۔ اس کے لیے ایسے سماجی کارکنان کا انتخاب اور تیاری مطلوب ہے جو سماجی خدمت کے میدان میں نمایاں خدمت انجام دینے کا جذبہ اور ساتھ ہی تحریک اسلامی کے نصب العین سے قلبی وابستگی رکھتے ہوں۔

مذکورہ بالا صرف مثالیں ہیں، جو معمولی غور وفکر سے ذہن میں آجاتی ہیں، ضرورت ہے کہ تحریک اسلامی کے پاس ایک تفصیلی خاکہ ہو جس میں ایک طرف ان تبدیلیوں کا مفصل بیان ہو، جو تمدن کی سطح پر اسلامی تحریک کے اہداف میں شامل ہوسکتی ہوں۔ دوسری طرف ان تبدیلیوں کے تعلقات سے افراد تحریک کا ان کے پیشوں، صلاحیتوں، میدانوں اور حالات کے لحاظ سے جو کردار متعین ہوتا ہے اسے واضح طور سے بیان کیا جائے۔

تمدن پر اثر انداز ہونے اور اس کی جہت کو تبدیل کرنے کا منصوبہ مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل ہوسکتا ہے:

۱- اصلاح معاشرہ، خدمت خلق، اور ادائیگی حقوق کے موجودہ روایتی تصور سے آگے بڑھ کر تمدن کی اصلاح کا تصور پیش کیا جائے۔ تمدن کی اصلاح کے تصور کے بغیر خدمت خلق کے بہت سارے کام صرف موجودہ تمدن کو تقویت پہونچانے کا کام کرتے ہیں۔

۲- تحریک کے افراد کے لیے طے کیا جائے کہ انھیں موجودہ تمدن کا پرزہ بن کر نہیں بلکہ تمدن کو اپنے خطوط کے مطابق بدلنے والا بننا ہے۔

۳- تحریک کے لیے ترجیحی طور پر ان افراد کو تلاش کیا جائے جو تمدن کی سمت

سفر پر زیادہ اثر انداز ہونے کی قوت اور پوزیشن رکھتے ہوں۔

۴- تحریک کے افراد کو تاکید کی جائے کہ وہ اپنے لیے وہ مقام اور قوت حاصل کریں جو تمدن کو بدلنے کے لیے درکار ہے۔

۵- تحریک کے اندر اور باہر تفکیری ذوق رکھنے والے افراد کو عہد حاضر میں اسلامی تمدن کے تحت مختلف عنوانات پر غور کرنے کے تعمیری منصوبے دیے جائیں۔ منصوبے نہیں ہونے کی صورت میں باذوق اور باصلاحیت افراد کی دلچسپیاں بے سود یا کم فائدہ والے موضوعات تک محدود رہتی ہیں۔ مثبت اور نتیجہ خیز کوششوں کا داعیہ نہیں ہو تو تمدنی مسائل پر کی جانے والی تحقیقات تعمیر کے بجائے تخریب کا رخ اختیار کر لیتی ہیں۔

قطرہ قطرہ دریا ہوتا ہے، یہ مثل بہت زیادہ صادق آئے گی ان کوششوں پر جو اسلامی تحریک اپنے محدود وسائل اور قلیل افراد کے ساتھ تمدن کو بدلنے کے لیے کرے گی۔ بایں ہمہ اگر اسلامی تحریک افراد کی قلت کے سبب خود تمدن کی تبدیلی کے عمل میں فعال شرکت نہیں کر سکتی تب بھی یہ تو ضروری ہے کہ وہ تمدن کی تبدیلی کا ایک مفصل خاکہ بنا کر امت کے حوالے کرے اس ارادہ کے ساتھ کہ پوری امت کو تمدن کے میدان میں اقامت دین کی اس ذمہ داری سے آگاہ کرنا ہے جو امت کے ہر فرد پر عائد ہوتی ہے۔

(یہ درست ہے کہ اصلاح معاشرہ اسلامی تحریک کی پالیسی کا اہم جز رہا ہے، لیکن تفصیلات کے بغیر، جس کی وجہ سے یہ جز ہمیشہ ایک طرح کے ابہام کا شکار رہا ہے۔ تحریک جس قدر تفصیلات طے کرے گی اسی قدر تمدن کو تبدیل کرنے کا تصور واضح ہوتا جائے گا، اور تحریک اپنے موجودہ رول اور مطلوبہ رول کے درمیان موازنہ بھی کر سکے گی۔ اصلاح معاشرہ کے عمل کو انجام دینے کے لیے اور انجام دیتے ہوئے تحریک کے ایک فرد کو اپنے اندر کیا تبدیلیاں لانا ضروری ہیں، یہ موضوع بھی اپنی تفصیلات کے ساتھ ہنوز وضاحت طلب ہے۔)

☆☆☆

’’الاخوان المسلمون‘‘ کا ایک سالہ دورِ حکومت

ڈاکٹر مرسی کے دورِ حکومت کا واقعاتی مطالعہ (Case Study)

اشہد رفیق ندوی*

مذہب کی کارفرمائی کے بغیر تہذیب وسیاست بے لگام ہوجاتی ہے، اس کے مظاہر دنیا کے سامنے ہیں۔ اس کی تعمیر میں مذہب بالخصوص اسلام کا کردار یقینی طور پر بہت اہم ہے جو زیر بحث ہے۔ اس موضوع پر نظریاتی پہلو سے ہمارے لٹریچر میں کافی مواد موجود ہے۔ البتہ اس کے عملی نمونے قرن اول کے بعد خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ماضی قریب میں تہذیب وسیاست کے میدان میں اسلام کے مؤثر کردار کو آزمانے کا اخوان المسلمون کو ایک موقع ملا۔ اور اپنے ایک سالہ دورِ حکومت میں اس کو آزمانے کی بھرپور کوشش کی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اس دعویٰ کو مدلل کرنے کے لیے اخوان کے دور حکومت کا واقعاتی مطالعہ (کیس اسٹڈی) کیا جائے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں آسانی ہوگی کہ آیا واقعی تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کوئی کردار ادا کرسکتا ہے یا نہیں۔ اسی تناظر میں چند گزارشات حاضر خدمت ہیں۔

انقلاب مصر پس منظر وپیش منظر

رواں صدی کی دوسری دہائی عالم عرب میں انقلاب کی بہار لے کر نمودار ہوئی، دیگر کئی ممالک کے ساتھ محض ۱۸ روز کی پرامن مزاحمت کے نتیجہ میں حسنی مبارک کا تیس سالہ دور حکومت کافور ہوگیا۔...... فروری ۲۰۱۱ کو حسنی مبارک نے اقتدار کی کلید عبوری حکومت کے سپرد کردی، اسی دن سے متبادل نظام کی تگ ودو شروع ہوگئی، کئی تجاویز

* استاذ عربی، سید حامد سینئر سکنڈری اسکول، اے-ایم-یو، علی گڑھ

آئیں، متعدد مہرے آزمائے گئے، پوری کوشش ہوگی کہ اقتدار کسی طرح بھی حسنی مبارک کی باقیات میں ہی باقی رہ جائے، انقلابیوں کو اقتدار کی لذت نہ مل پائے۔ اس کے لیے عارضی نظام اور عالمی طاقتوں نے تمام ہتھکنڈے آزما لیے مگر ایسے عوامی انقلاب کے بعد عوام کی مرضی کے بغیر کسی نظام کو چلانا ممکن نہ تھا عوام کے بار بار اصرار پر عوام سے رائے مانگی گئی تو انہوں نے بڑی تعداد میں ان کے حق میں رائے دی جو انقلابی مزاحمت کے دوران ان کے ساتھ سربسجود رہتے تھے، جو ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے تھے، جو ان کی عزتوں کے نگہبان تھے جو صحیح معنوں میں ان کی آرزوؤں کی تکمیل کر سکتے تھے اور یہ اخوان المسلمون کے قائدین اور کارکنان تھے۔ عوام نے بڑی تعداد میں ان کے حق میں رائے دی اور چاروناچار عارضی حکومت کو نئے منتخب صدر ڈاکٹر محمد مرسی کو اقتدار سونپنا پڑا۔

۳۰ / جون ۲۰۱۲ کو ڈاکٹر محمد مرسی نے باقاعدہ زمام اقتدار سنبھال لی۔ اس وقت ان کی آنکھوں کے سامنے شہداء کے لاشے انقلابیوں کے جذبات اور اخوان کے اللہ اور قوم سے کیے گئے وعدے مچل رہے تھے کہ اللہ کی مرضی اور اس کا قانون اس کی زمین پر نافذ کرنا، یہ بجائے خود بہت بڑا چیلنج تھا، اسی کے ساتھ ان کے سامنے مصری قوم کے ۲۳-۴۸ فیصد وہ افراد بھی ایک چیلنج تھے جو اللہ کی سرزمین پر طاغوتی نظام کا ہی بول بالا دیکھنا چاہتے تھے اور اس کے لیے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ ایسے افراد کی دنیا کی بڑی طاغوتی طاقتیں خفیہ واعلانیہ مدد کر رہی تھیں۔ انہیں سابقہ نظام کی تباہ کن پالیسیاں، معاہدات، تفرقہ پسندی اور معاشی بدحالی جیسی مشکلات بھی ورثہ میں ملی تھیں جو سب سے بڑا چیلنج تھیں۔ چیلنجز کا مردانہ وار مقابلہ کرنا اخوان کا شعار رہا ہے۔ ایسے سخت حالات میں ڈاکٹر محمد مرسی نے اللہ کی ذات پر بھروسہ کر کے مضبوط عزائم، دوررس پالیسی اور ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار ہو کر صدارتی محل میں قدم رکھا اور اس مہلت عمل کا ایک ایک لمحہ ان خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے میں صرف کر دیا۔

صدارتی انتخاب میں فتح یابی کے بعد پہلی بار جب وہ ۲۸ / جون کو میدان تحریر میں اپنے مداحوں اور ہمنواؤں سے روبرو ہوئے یا ۳۰ / جون کو جامعہ قاہرہ میں قوم سے

خطاب کیا، دونوں مواقع پر اپنی پالیسی، عزائم اور تیور کو اچھی طرح سب پر واضح کر دیا کہ مصر یعنی انبیاء کی سرزمین پر اللہ کی مرضی اور اللہ کے قانون کی بالادستی ہوگی، مصری عوام کی اکثریت عقیدہ واخلاق سے آراستہ جس تہذیب کی خوگر ہے وہ تہذیب واپس لائی جائے گی، سیاسی نظام سے جبر وتشدد اور مطلق العنانی کا خاتمہ ہوگا اور ایسا سیاسی نظام برپا کیا جائے گا جو عدل واخوت پر مبنی، عوامی جذبات کا ترجمان اور وحی الٰہی کے تابع ہو۔ انہوں نے اعلان کیا کہ: وہ پورے مصر کے، مصر کے ہر شعبے اور ہر ادارے کے صدر ہیں اور سب کا پورا احترام کرتے ہیں۔ مصری افواج، اس کا نظام قضاء، اس کے دوسرے تمام ادارے جو قوم کی خدمت پر مامور ہیں، وہ ان پر پورا اعتماد کرتے ہیں، ان کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں ان کی عظمت ووقار کو برقرار رکھنے اور انہیں اونچا اٹھانے کے لیے وہ بھرپور کوشش کریں گے۔

انہوں نے شفاف انتخابات پر فوج اور عدلیہ کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا کہ آمرانہ نظام سے جمہوریت تک کا سفر بہت مشکل کام تھا مگر ان اداروں نے یہ سفر نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پر امن طریقے سے طے کیا، انہی کے طفیل میں مصر آج ایک نئی آزاد فضا میں سانس لے رہا ہے اور ایک نئے مصر کی تعمیر کی طرف گامزن ہے۔ انہوں نے نئے مصر کی تصویر پیش کرتے ہوئے کہا کہ نیا مصر شہداء کے خون اور انقلابیوں کے جذبات کا بھرپور عکاس ہوگا۔ جدید مصر اپنے عظیم الشان ماضی کو واپس لائے گا جب اسے علمی، فنی اور سفارتی میدانوں میں عالم عرب، افریقی خطے اور اسلامی ممالک میں قائدانہ کردار حاصل تھا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جدید مصر سفارتی اور اقتصادی محاذ پر تمام عرب اور اسلامی ممالک کو ساتھ لے کر ایک نیا اقتصادی زون بنائے گا جو یورپ وامریکہ کے اقتصادی پالیسیوں سے بے نیاز کر دے گا۔ انہوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ مصری قوم کا ہر فرد چاہے وہ مسلمان ہو یا مسیحی اور یہودی، ملک کی تعمیر وترقی میں سب کا برابر حصہ ہوگا۔ سب کو ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں گے۔ سب کے حقوق اور اقدار کا تحفظ حاصل ہوگا اور کسی سماجی وریاستی معاملے میں کوئی تفریق روا نہیں رکھی جائے گی۔

ڈاکٹر محمد مرسی نے اپنے خطاب کے آخر میں ایک بار پھر اللہ کی قسم کھا کر ان وعدوں اور پالیسیوں کو صدق دل سے روبہ عمل لانے کا وعدہ کیا کہ ان کی تکمیل میں اپنی توانائیوں کا ایک ایک قطرہ نچوڑ دینے اور کبھی قوم سے خیانت نہ کرنے کا عزم دہرایا۔اس پالیسی خطاب کے بعد وہ میدان عمل میں اترے اور پورے ایک سال ملک کی تعمیر و ترقی میں لگے رہے۔ان کے ساتھ ان کی سرپرست تحریک اخوان المسلمون شانہ بشانہ کھڑی رہی اور اس نے اس وقفہ کو خوابوں کی تکمیل کا موسم، کا عنوان دیا۔اور اس مہلت عمل کے ایک ایک لمحہ کو ملکی سیاست اور تہذیب کی تعمیر و ترقی میں لگا دیا۔ایک برس کے عرصہ میں ڈاکٹر محمد مرسی اور ان کی جماعت نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ شمار اور بیان سے باہر ہیں۔اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔مختلف ویب سائٹس ان کا احاطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں مگر ؎

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

ان کے کارناموں کو شمار کرنے کے لیے ایجازات دکتور محمد مرسی رئیس الجمہوریہ کے مصنف طالب حازم سعید نے دس عناوین کے تحت ۱۰۰ کارنامے کا تذکرہ کیا ہے۔ اہرام آن لائن نے عثمان Osman El shamovi31، کا ایک تجزیہ Egypt's President Morci in Power: A Time Line I&II کیا ہے اس میں تاریخ وار ۷۰ بڑے واقعات کا احاطہ کیا ہے۔

ان جائزوں کی روشنی میں مرسی کے ایک سالہ دور حکومت کے اہم فیصلوں اور اقدامات کو مختصراً درج ذیل الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے:

داخلی محاذ

● فوجی راج کا خاتمہ اور اجتماعی نظام عدل کا قیام: ۶۰ برس تک اقتدار پر قابض رہنے والی سیاہ و سفید کی مالک فوج کو حکمت کے ساتھ بیرک میں پہونچا کر عدل و انصاف پر مبنی نئے نظام حکمرانی کو متعارف کرایا اور ملک کو خودمختاری، تعمیر و ترقی خوش حالی اور

کامیابی کی طرف لے جانے والا نیا دستور عطا کیا۔

● صدارتی کونسل کی تشکیل: صدر کی من مانی کو کنٹرول کرنے کے لیے صدارتی کونسل کی تشکیل کی جن میں مختلف میدانوں کے ماہرین کو داخلی، خارجی اور سیاسی امور کی ذمہ داریاں دی گئیں۔

● عوامی نمائندہ حکومت کا قیام: ڈاکٹر ہشام قندیل کی سربراہی میں ایسی حکومت قائم کی جس میں جماعتی وسیاسی وابستگی سے اوپر اٹھ کر فنی مہارت اور قومی نمائندگی کو ترجیح دی گئی۔ ۳۵ افراد کی کابینہ میں صرف ۵ افراد اخوان کیڈر کے شامل کیے گئے باقی افراد حریف جماعتوں کے نمائندے یا فنی ماہرین تھے۔

● اداروں کی تشکیل جدید: انتظامی اداروں سے بدعنوان افسران کو برطرف کر کے لائق اور ایمان دار افسران کی تقرری کی اور جدید حالات کے تناظر میں نئی منصوبہ بندی کی تاکہ ارتقاء کے عمل میں تیزی لائی جاسکے۔

● سینا کا نسر آپریشن: وادی سینا میں شہریوں اور حفاظتی عملہ کی ہلاکت کے واقعات نے ڈاکٹر مرسی کو ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے مصری فوج کے کنٹرول کو مضبوط کرنے اور علاقہ کی ترقی واعتماد بحالی کے لیے سخت اقدامات کیے اور کئی ترقیاتی منصوبے شروع کیے۔

● ذرائع ابلاغ کی آزادی: سابقہ دور حکومت میں ذرائع ابلاغ کو اظہار رای کو آزادی حاصل نہ تھی۔ ڈاکٹر مرسی نے انتخابی مہم میں وعدہ کیا تھا کہ وہ ذرائع ابلاغ کو مکمل آزادی دلائیں گے۔ پہلی فرصت میں انہوں نے یہ وعدہ وفا کیا حالاں کہ انہیں خوب اندازہ تھا کہ یہ آزادی حاصل کر کے سب سے زیادہ انہی کی مخالفت کی جائے گی۔ انتخابی مہم میں ان کا یہ معاہدہ تھا۔

● سیاسی قیدیوں کی رہائی: حسنی مبارک کے ظالمانہ نظام میں ہزاروں افراد بلا کسی جرم یا سلطان جائر کے سامنے کلمہ حق بلند کرنے کے جرم میں جیلوں میں بند تھے۔ ڈاکٹر مرسی نے ایسے ہزاروں معصوموں کو قانونی طریقے سے رہائی دلائی۔

۸- بجلی اور ایندھن کا بحران: بجلی اور ایندھن کی کمی مصر کا ایک مستقل مسئلہ رہا ہے۔

اس پر طرفہ تماشہ یہ ہوا کہ اس کا کنٹرول فوج اور حسنی مبارک کے باقیات کے ہاتھ میں ہی رہا، انہوں نے منصوبہ بند طریقے سے اس بحران کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ مرسی حکومت نے اس بحران سے نمٹنے کے لیے فوری اور طویل المیعاد اقدامات کیے۔ بدعنوان افسران پر قدغن لگائی، فعال اور ایمان دار افسران ان کی جگہ پر تعینات کیے، اخوانی کارکنوں نے رضا کارانہ خدمات پیش کیں۔ اور مستقل و دیرپا حل کے لیے نئے پلانٹ کی بنیاد رکھی گئی تاکہ عوام روزمرہ کی دشواریوں سے نجات پاسکیں۔

خارجی محاذ

حسنی مبارک کے دور میں مصر کی خارجہ پالیسی عرب اور عالم اسلام دونوں کے خلاف تھی، فلسطینی مجاہدین سے عناد اور اسرائیل کی تابع داری اس پالیسی کا امتیاز تھا، ڈاکٹر مرسی نے خارجہ پالیسی میں انقلابی تبدیلیاں کیں اور مصر کے سابقہ قائدانہ کردار کی بحالی کے لیے سنجیدہ جدوجہد کی، جس کا اعتراف عالم عرب، عالم اسلام اور ناوابستہ ممالک سب نے کیا، اس محاذ پر ان کے چند اہم کارنامے درج ذیل ہیں:

مسئلہ فلسطین

ڈاکٹر محمد مرسی نے مسئلہ فلسطین کو حل کرنے کے لیے سنجیدہ کوششیں کیں۔ حماس کو خاطر خواہ اہمیت دی، ان کے لیے سہولیات بہم پہونچائیں رفاہ کے دروازے وا کیے جس سے ۱۶ لاکھ فلسطینیوں کو راحت ملی۔ حماس قائدین کا والہانہ استقبال کیا۔ اپنے وزیر اعظم کو فلسطینیوں کی حمایت کا اعلان کرنے کے لیے عین جنگ کے دوران فلسطین بھیجا اور اسرائیل کو دوٹوک الفاظ میں معاہدات کی پاسداری اور اوقات میں رہنے کی تلقین کے ساتھ مصر و اسرائیل کے درمیان معاہدات کی منسوخی کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش بھی شروع کردی۔

سعودی عرب سے تعلقات کی ہمواری

مصر و سعودی عرب کے درمیان تعلقات نرم و گرم ہوتے رہے ہیں۔ جب

ڈاکٹر مرسی نے اقتدار سنبھالا، اس وقت سعودی عرب سے تعلقات زیادہ خوشگوار نہ تھے، ڈاکٹر مرسی نے بیرون ملک دورہ کے لیے سب سے پہلے حرمین شریفین کی پاک سرزمین کا انتخاب کیا، ملتزم سے چمٹ کر اللہ سے مدد بھی مانگی اور ملکی قیادت سے عالم اسلام کو متحد و متحرک کرنے کے لیے دل گداز اپیل بھی کی۔ مصری اور مسلم سیاست میں اسے ایک انقلابی قدم تصور کیا گیا۔کاش سعودی قائدین ان جذبات کی روح کو سمجھ پاتے۔

مسئلہ شام

شام میں خون مسلم کی ارزانی پر بہت پریشان ہوئے اوراس کے پائدار حل کے لیے کئی جرأت مندانہ اقدامات کیے، براہ راست بشارالاسد سے خوں ریزی بند کرنے کی اپیل کی۔چینی حکومت سے مطالبہ کیا کہ بشارالاسد کی سیاسی و مادّی امداد پر روک لگائے اور مسئلہ کا پرامن حل تلاش کرنے کی کوشش کرے، ایران جو شام کا سب سے بڑا حلیف سمجھا جاتا اس کے سامنے بشارالاسد کی جارحیت کی کھل کر مذمت کی۔عرب لیگ اور دوسرے متحدہ پلیٹ فارموں پر شام کے مسئلہ کے حل کے لیے آواز اٹھائی اور بالآخر اس سے سفارتی تعلقات تک ختم کر لیے۔

افریقی یونین

افریقی یونین سے دشمنی وراثت میں ملی تھی۔ جب کہ ماضی میں مصر قائدانہ کردار ادا کرتا رہا ہے۔ڈاکٹر مرسی نے ایتھوپیا میں منعقد افریقی یونین کے اجلاس میں شرکت کی اور ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر پوری قوت کے ساتھ اس یونین میں شمولیت کی خواہش کا اظہار کیا اور جس کے نتیجہ میں ممبر شپ بحال ہوئی اور مصر کو قائدانہ کردار ادا کرنے کا دوبارہ موقع ملا۔

ایران سے تعلقات کی استواری

مصر وایران کے تعلقات عرصہ سے خراب چل رہے ہیں۔حسنی مبارک کی اسرائیل نوازی ایران کو کسی طرح گوارا نہ تھی۔ڈاکٹر مرسی کو ناوابستہ ممالک کے اجلاس میں شرکت کا موقع ملا تو اس موقع کو میزبان ملک کے ساتھ تعلقات کی استواری کے لیے

استعمال کیا۔ اندرونی مخالفتوں کے باوجود وہاں گئے اور پوری قوت کے ساتھ فلسطین اور شام کے عوام کی کھل کر تائید کی اور ایران سے مثبت کردار ادا کرنے کی اپیل کی، اس موقع پر انہوں نے ترقی پذیر ممالک کے مسائل، ضروریات اور ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ اس کے نتیجہ میں ایران سے قربت کافی بڑھی اور بڑے مسلم ممالک ایک ساتھ جمع ہوتے نظر آئے۔

چین سے روابط

ڈاکٹر محمد مرسی نے ترقی یافتہ ممالک میں امریکہ اور یوروپ کو چھوڑ کر سب سے پہلے چین کا تجارتی وفد کے ساتھ دورہ کیا اور اعلان کیا کہ ''اب کوئی ملک ہم پر راج نہیں کر سکے گا۔ مصر کے خارجہ تعلقات منافع کے باہم تبادلہ کی بنیاد پر ہوں گے۔ کسی بھی فریق کو دوسرے فریق کے داخلی امور سے کوئی سروکار نہ ہوگا''۔ یہ گویا امریکی معیشت کی غلامی سے آزادی کا اعلان تھا اور ملکی معیشت کے لیے نئے دروازے وا ہو رہے تھے۔

معاشی محاذ

- پائدار معاشی استحکام کے لیے النہضہ پروجیکٹ کا تفصیلی خاکہ پیش کیا جو بیس سالہ طویل المیعاد منصوبہ تھا اور جس کے ذریعہ توقع تھی کہ سماجی اور معاشی استحکام کی طرف ملک زبردست پیش رفت کرے گا۔
- چین کے تعاون سے موئز علاقے میں سات لاکھ آسامی پیدا کرنے کے لیے بڑے بڑے ترقیاتی پروجیکٹ شروع کیے۔
- توانائی، زراعت اور تعمیر نو کے کئی منصوبوں کے لیے ترکی، قطر، چین اور سعودی عرب سے اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کرائی۔
- نہر سوئز اور اس سے ملحق علاقوں کے لیے ایک ایسا جامع منصوبہ تیار کروایا کہ اگر وہ مکمل کرا دیا جائے تو ملک کو سالانہ ۱۰۰ ارب ڈالر دینے کے علاوہ پورے علاقے کا تجارتی اور مواصلاتی مرکز بن جائے۔
- روس کے تعاون سے دو بلین ڈالر کے قرضے پر بجلی کی تیاری کے لیے نیوکلیائی

کارخانہ کا پروجیکٹ منظور کرایا گیا۔

- ہندوستان کے ساتھ سات کلیدی امور پر معاہدے کیے گئے۔
- اسلامی صکوک (Bond) جاری کیے تاکہ عوام کے لیے بڑے پیمانے پر ترقیاتی کاموں کے لیے فنڈس کی فراہمی ہو سکے۔

زراعت

ڈاکٹر مرسی نے زراعت کے محاذ پر خصوصی توجہ دی، ۴۴ ہزار کسانوں کو مالی امداد دی۔ بیج اور کھاد کی سبسڈی بڑھائی، آب پاشی کی سہولیات کو کسان دوست بنایا۔ اجناس کی پیداوار میں اضافہ کے لیے بیج اور کھاد کے پروسیزر کے لیے کئی ریسرچ پروجیکٹ شروع کیے اور ۲۰۲۰ تک مصر کو اجناس کے تعلق سے خود کفیل بنانے کا ٹارگیٹ رکھا، الحمد للہ پہلے ہی برس گیہوں کی پیداوار میں ریکارڈ اضافہ ہوا۔

- سوڈان کے ساتھ مل کر ایک ایسے زرعی منصوبے کی بنیاد رکھ دی کہ مکمل ہو جائے تو ۲۰ لاکھ ایکڑ بے آباد سوڈانی زمین مصر کے لیے غلہ اگانے لگے۔ ۶ لاکھ ۶۰ ہزار ایکڑ کا ایک اور ۳ لاکھ ۶۶ ہزار ایکڑ کا دوسرا زرعی منصوبہ تیار کیا جس کے تحت زمین کاشت کاروں کو ۵ سے ۱۱۰ ایکڑ زمین مل جاتی اور وہ خود کفیل ہو جائے۔

تعلیم

تعلیم ڈاکٹر مرسی کی دلچسپی کا خاص محاذ تھا، جامعہ قاہرہ کے اپنے پہلے خطاب میں انہوں نے طلبہ و اساتذہ کو مخاطب کر کے تعلیمی محاذ پر جنگی پیمانے پر کام کا وعدہ کیا، پرائمری اور ثانوی درجات کے اسکولوں کی تعداد میں اضافہ کیا، اس کے نصاب تعلیم کو اخلاقیات سے آراستہ کرنے کے لیے انقلابی تبدیلیاں کیں، جامعہ ازہر کو مذہبی پیشوائی کا مقام دلایا، ملکی جامعات کی اسناد کا بیرون ممالک جامعات سے معادلہ کرایا۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے اعلی سطحی اداروں کے قیام کے لیے کئی نئے پروجیکٹ شروع کرائے۔ اساتذہ کی تنخواہ میں اضافہ کیا۔

تجزیہ

داخلی، خارجی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی میدان میں اخوان کے یک سالہ دور حکومت میں جو امور انجام پائے ان کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے۔ کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے ان کا احاطہ ایک مقالہ میں ممکن نہیں۔ Case Study کے لیے اتنے نمونے بھی کافی ہیں ان نمونوں میں یہ تلاش کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک اسلامی نظریہ کی حامل انقلابی تحریک کو بے مہار تہذیب اور سیاست کو اسلامی عقیدہ واخلاق سے آراستہ کرنے اور دنیا کے سامنے ایک مثالی تہذیب اور سیاست کا نمونہ پیش کرنے کا موقع ملا تو اس تحریک نے اس کا کس حد تک حق ادا کیا۔

یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ ڈاکٹر مرسی اور ان کی جماعت اسلامی نظام عدل کے نفاذ اور معاشرہ میں اسلامی اخلاق واقدار کے فروغ کے لیے بلند عزائم کا اظہار عرصہ سے کرتی رہی ہے۔ مذکورہ کارناموں کو اسی معیار پر پرکھنے کی ضرورت ہے کہ ان میں تہذیب وسیاست کو صحیح رخ پر لگانے کی کس قدر کوشش ہوتی ہے۔

دستور سازی

مرسی دور حکومت کا سب سے اہم کارنامہ مصر کو ایک متوازن، مبسوط اور اسلامی اقدار سے آراستہ دستور عطا کرتا ہے۔ نئے دستور میں خاص طور سے ریاست کا مذہب اسلام اور قانون سازی کا بنیادی سرچشمہ قرآن وسنت کو قرار دیا گیا ہے۔ یہ بلاشبہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

امت مسلمہ کی وحدت

امت مسلمہ کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی گئی، سعودی عرب، قطر، ایران، ترکی اور پاکستان سے رابطے بڑھانا، فلسطینیوں کی کھل کر مدد کرنا، شام میں خونریزی کو روکنے کے لیے کوشش کرنا سب اسی گوہر مقصود کو حاصل کرنے کے لیے تھا۔ اسلامی نظریات کی حامل کوئی تحریک ہی یہ کارنامہ انجام دے سکتی تھی ورنہ کہنے کو مسلمان حکمران

اور جماعتیں تو پہلے سے کافی تعداد میں موجود ہیں۔

بدعنوانی پر قدغن

انتظامی اداروں میں سود، رشوت اور بدعنوانی کے خاتمہ کے لیے بھرپور کوشش کی تاکہ معاشرہ کو استحصالی لعنتوں سے چھٹکارا ملے، ان لعنتوں کے خلاف مہم جوئی کا دعویٰ ہر حکومت کرتی ہے مگر جرأت مندانہ اقدامات کم ہی کر پاتی ہیں۔

اسلامی تہذیب کا چرچا

اسلامی تہذیب واقدار سے فروغ کے لیے ایک طرف جامعہ ازہر کے وقار کو بڑھانے کی سعی مشکور کی تو دوسری طرف دینی ودعوتی اداروں، اور مساجد کے نظام کو کھل کر کام کرنے کے مواقع بہم پہونچائے تاکہ عوام تک قرآن وسنت کا شیریں پیغام تیزی سے پہونچ سکے اور پورا معاشرہ اسلامی تہذیب واقدار کا جیتا جاگتا نمونہ بن جائے۔

نظام تعلیم میں اخلاقی اقدار کا نفوذ مرسی دور کی قابل ذکر کوشش ہے۔ ابتدائی و ثانوی درجات کے نصاب کو از سر نو مرتب کرایا اس میں اخلاقی مواد کو شامل کرایا۔

ذرائع ابلاغ کو اخلاقیات کا درس

معاشرہ میں فساد اور تہذیبی قدروں کی پامالی میں سب سے بڑا کردار ذرائع ابلاغ کا ہوتا ہے۔ دکتور مرسی نے ایک طرف ذرائع ابلاغ کو اظہار رائے کی آزادی بخشی تو دوسری طرف اپنی وزارت اطلاعات کے ذریعہ بارہا اخلاقی حدود کی پاسداری کی بار بار تلقین کی اور کئی افراد اور اداروں کی سرزنش بھی کی۔

ظلم سے نجات

مرسی نے زمام اقتدار سنبھالی تو اس وقت ہزاروں افراد بلاکسی جرم سے جیلوں میں بند تھے۔ نظام عدل کا تقاضا یہ تھا کہ انہیں ظلم سے نجات دلائی جائے۔ اولین فرصت میں ایسے ہزاروں افراد کو رہائی دلائی اور ان کی دعائیں حاصل کیں۔

خدمت خلق

مرسی حکومت کا امتیاز یہ رہا کہ یہ حاکم کے بجائے ہر جگہ خادم نظر آتے۔عوام کی خدمت ہی ہمیشہ مطمح نظر رہی۔تعلیم،صحت اور زراعت میں ان کی خدمات عوام کی زبان پر تھیں۔اقتدار میں آنے کے بعد ہر ضرورت کی تکمیل، ہر مشکل کا حل، ہر درد کا مداوا ان کے ذمہ تھا، کیا قائد؟ کیا کارکن؟ کیا صدر؟ کیا وزیر؟ ہر شخص اسی جذبہ سے سرشار نظر آتا کہ وہ اپنے بھائی کی کوئی خدمت انجام دے اللہ کے یہاں سرخرو ہو جائے۔

ایک سال کی قلیل مدت میں اتنے محاذوں پر کام کا آغاز بجائے خود بہت بڑی کامیابی ہے۔ دکتور مرسی جو نشانہ لے کر آگے بڑھے وہ طاغوتی طاقتوں اور شیطان دوستوں کو کسی طرح بھی راس آنے والا نہ تھا۔شیطانی قوتوں کو سب سے زیادہ یہ خوف ستا تا رہا کہ اگر اسلامی اخلاقیات اور اقدار کی لذت سے دنیا ایک بار پھر آشنا ہوگئی تو ان کو کہیں جائے پناہ نہ ملے گی، چنانچہ انھوں نے مرسی کے قدم اکھاڑنے کے لیے کسی لمحہ کوئی کسر نہ چھوڑی اور ایک سال کے اس حکومت کو اکھاڑ پھینکا۔ اگر ان کے فیصلوں اور اقدامات کو زمین پر برگ وبار لانے کا موقع ملا ہوتا تو لازماً دنیا ایک رفاہی مثالی اسٹیٹ کا مشاہرہ کرتی، اور اس کے دور رس اثرات مرتب ہوتے مگر ظالموں نے ان غنچوں کو بغیر کھلے ہی مسل دیا۔تاہم یہ ابتدائی نقوش بھی بہت مبارک ہیں اور نظریاتی تحریکات کے لیے اس میں بھی بڑا پیغام ہے۔

اسلام کے حوالہ سے تہذیب وسیاست کی تعمیر کے لیے جو لوگ بھی اٹھیں گے نارِ نمرود کی آگ ان کے دامن کو ضرور چھوئے گی۔دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو موج حوادث سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔دکتور مرسی اور ان کی جماعت نے جس عزیمت کا مظاہرہ کیا ہے، یہ ہزار بار سلام کے مستحق ہیں۔



تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار

(رپورٹ سمینار)

مرتب: ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی

معاونین: مولانا کمال اختر قاسمی

مولانا مزمل کریم قاسمی، فلاحی

سرپرست : مولانا سید جلال الدین عمری

کنوینر : ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

معاون کنوینز: مولانا محمد جرجیس کریمی، ڈاکٹر ضیاء الدین ملک

منعقدہ مورخہ: ۲۳، ۲۴ رفروری، ۲۰۱۴ء

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کو یہ توفیق حاصل ہوئی کہ اس نے ''تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار'' کے موضوع پر دو روزہ سمینار کا انعقاد (۲۳-۲۴ رفروری ۲۰۱۴ء) کرکے اہلِ علم و دانش کو موضوع کی معنویت، امکان اور مشکلات سے روشناس کیا ہے۔ اس سے ''اسلاموفوبیا'' کے اس عہد میں اصحاب علم و دانش، تنظیموں اور اداروں کے سامنے غور وفکر اور عمل واقدام کی راہ ہموار ہوگی انشاء اللہ۔ اس دوروزہ قومی سمینار کے آٹھ علمی اجلاسوں میں چالیس سے زیادہ مقالات کی خواندگی ہوئی جن میں دو عربی، چار انگریزی زبان میں تھے جب کہ باقی مقالات اردو زبان میں پیش کیے گئے۔ پانچ مقالات ایسے تھے جن کی خواندگی کسی وجہ سے نہیں ہوسکی۔ افتتاحی اور تاثراتی اجلاس کو شامل کرکے کل دس اجلاسات ہوئے ان سب میں مقالات اور صدارتی خطابات

کے علاوہ بعض میں خصوصی خطابات بھی ہوئے۔ تمام اجلاسوں میں سوال و جواب اور تاثر وتبصرہ کے لیے بھی وقت مخصوص تھا۔ جس میں شرکاء نے کافی دلچسپی سے حصہ لیا۔

افتتاحی اجلاس: ۲۳؍فروری ۱۰ بجے صبح تا ۱۲ بجے دوپہر

ادارہ کے وسیع میدان میں ڈھائی سو اصحاب علم و دانش کے سامنے خیر مقدمی کلمات کے ذریعہ سکریٹری ادارہ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی نے دل کی گہرائیوں سے مہمانان ذی وقار، مقالہ نگاران اور خواتین وحضرات کا پرتپاک استقبال کیا۔ آپ نے تاریخ اسلام کے سنہرے اوراق پلٹتے ہوئے تہذیب و سیاست کے عملی اقدامات اور تابناک نمونوں سے سامعین کو آگاہ کیا اور معاصر عہد میں تحقیق کے نام پر عیار مغرب کی سازشوں اور سادہ لوح اور فریب خوردہ 'اپنوں' کے اعتراضات وتنقیدات کی منظر کشی کی، تیسری طرف گزشتہ ایک صدی کے دوران عالم اسلام میں قائم اور متحرک اسلامی تحریکات کی پیش رفت پر بھی روشنی ڈالی، جس کی طرف نظر اٹھاتے ہوئے امت کے بعض افراد گھبراہٹ اور اختلاج واضطراب کا شکار ہیں اور مغرب کے فکری مراکز اور پالیسی ساز اداروں پر بدحواسی طاری ہے۔

آپ نے ادراہ کے بانی مولانا صدرالدین اصلاحی مرحوم ومغفور اور موجودہ صدر سید جلال الدین عمری مدظلہ العالی کی علمی خدمات کا خصوصی تذکرہ کیا اور ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے امیر جماعت اسلامی ہند و صدر ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی مولانا سید جلال الدین عمری نے فرمایا کہ تہذیب اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ہر قوم اپنی مخصوص تہذیب کے ذریعہ پہچانی جاتی ہے۔ مغلوب قوم کے اندر غالب تہذیب کو قبول کرنے کی نفسیات پائی جاتی ہے۔ تہذیب کا تعارف کراتے ہوئے آپ نے کہا کہ اسلام کے پاس تہذیب وسیاست کا اپنا نظام ہے۔ اسلام اپنی فکر اور نظام کی بنیاد پر دیگر تہذیبوں پر اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ اسلام تہذیب کو شرک، عریانیت اور بے حیائی سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ وہ دنیا کی دیگر تہذیبوں کے طریقوں، رواجوں اور

رسموں سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا۔ آپ نے کہا، اسلامی اصول سیاست وحکومت کے ذریعہ حقوق کی ادائیگی، فساد کا خاتمہ، معروفات کا فروغ، برائیوں کا ازالہ اور عدل کے قیام کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ آپ نے دنیا کے سامنے اسلامی تہذیب و سیاست کو متبادل کے طور پر پیش کرنے کی تشویق دلائی۔

مہمان خصوصی جناب نصرت علی، جنرل سکریٹری جماعت اسلامی ہند نے کہا کہ آج دنیا اسلامی تہذیب اور سیاست کو ایک خطرہ اور چیلنج کے طور پر پیش کررہی ہے، حالانکہ اسلامی تہذیب نفع بخشی، جواب دہی اور ایک خدا کے تصور سے عبارت ہے جو عیسائیت کی طرح تہذیب اور سیاست کو دو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹتی۔ آپ نے کہا تعلیم، کائنات، انسان اور اس کا نصب العین کسی بھی تہذیب کے عناصر ترکیبی ہیں۔

صدر جلسہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، ایڈیٹر ملی گزٹ و صدر مسلم مجلس مشاورت نے علم وفن میں ترقی کو تہذیب اسلامی کی اہم قدر قرار دیتے ہوئے غالب اقوام کی علم دوستی، محنت اور لگن سے سبق لینے پر زور دیا۔ آپ نے کہا سیاسی غلبہ ہی کسی تہذیب کے پروان چڑھنے کی شاہ کلید ہوسکتی ہے۔ آپ نے چالیس سال قبل لیبیا میں عالمی سمینار میں اپنی شرکت کے حوالہ سے معروف جرمن دانشور محمد اسدؒ (سابق لیوپولد اویز) کا وہ تاریخی جملہ دہرایا کہ ”دنیا کے لیے اسلامی نظام حیات اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اس کا ماڈل یا عملی نمونہ نہ دیکھ لے“۔ آپ نے عالم اسلام میں Think Tank کی غیر موجودگی پر افسوس کا اظہار کیا اور یورپ، امریکہ اور اسرائیل کے سیاسی، تہذیبی اور معاشی پالیسی ساز اداروں کو سنجیدہ غور وفکر کا عنوان قرار دیا۔

افتتاحی اجلاس کا آغاز ڈاکٹر صادق اختر ندوی کی تلاوت سے ہوا تھا، جب کہ نظامت کے فرائض رفیق ادارہ مولانا محمد جرجیس کریمی نے ادا کیے۔ انھوں نے سمینار کے انعقاد سے قبل کی مختصر روداد بتاتے ہوئے اس کے کامیاب آغاز پر اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا۔ اس نشست کا اختتام موصوف کے حاضرین کے تئیں کلمات تشکر اور بارگاہِ ایزدی میں دعا سے ہوا۔

پہلا علمی اجلاس ۲۳ر فروری، ۱۲:۳۰-۲:۰۰

مقالات خواندگی کی پہلی نشست افتتاحی جلسہ کے اختتام کے پندرہ منٹ بعد منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، ڈائرکٹر یو جی سی، اکیڈمک اسٹاف کالج اے ایم یو علی گڑھ نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض راقم سطور (ڈاکٹر ضیاء الدین ملک) نے انجام دیے۔

اجلاس کے پہلے مقالہ نگار جناب ابومتین، حیدرآباد نے ''تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار'' کے موضوع سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، سید قطب شہیدؒ اور فواد سیزگینؒ کے افکار کی روشنی میں ان پیچیدگیوں کی طرف اشارہ کیا جن میں موجودہ مغربی تہذیب نے انسانوں کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

دوسرے مقالہ نگار پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی، ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی، اے ایم یو، علی گڑھ نے ''اسلامی تہذیب اور مغربی چیلنجز'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا اس میں انھوں نے وضاحت کی کہ اسلامی تہذیب نے دنیا کی دیگر تہذیبوں کو مٹایا نہیں ہے بلکہ ان کے صالح عناصر کو قبول کیا اور فاسد عناصر کو رد کیا جب کہ مغربی تہذیب اپنے غلبہ کے نشہ میں اسلامی تہذیب کو پوری طرح ملیا میٹ کرنا چاہتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلامی تہذیب میں صلاحیت اور صالحیت کی بنیاد پر خوبصورت اور بامعنیٰ اجتماعیت کا فروغ ہوتا ہے۔

تیسرے مقالہ نگار ڈاکٹر عبدالرشید بٹ، کشمیر یونیورسٹی نے انگریزی زبان میں ''جمہوریت اور اسلامی شورائیت: ایک تقابلی مطالعہ'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے مغربی نظریہ جمہوریت کے ارتقاء اور اس کے مادر پدر آزاد اصول ومبادیات کا خلاصہ پیش کیا اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں ان کا تقابل کرتے ہوئے اسلامی نظریات، اقدار اور اصولوں کی پائیداری کو مبرہن کیا۔

چوتھے مقالہ نگار پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی، کشمیر یونیورسٹی نے بزبان انگریزی ''نظریہ تصادم، مسلم رد عمل، سعید نورسی کے حوالہ سے'' کے موضوع پر پر مغز مقالہ

پیش کیا۔ انھوں نے بتایا مختلف قوموں کے درمیان ڈائیلاگ اور صالح بنیادوں پر اتحاد ہونا چاہیے۔

مہمان خصوصی پروفیسر کنور محمد یوسف امین، اجمل خاں طبیہ کالج اے ایم یو، علی گڑھ نے عقیدہ اور ایمان کے مثبت اور سائنس کے منفی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تباہ کاریوں اور روحانی اقدار کی بے توقیری کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا۔

صدر جلسہ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے باہمی گفت وشنید اور بین المذاہب مکالموں کو عصر جدید کی ضرورت قرار دیا اور مغربی مصنفین کے ان افکار وخیالات کے اعداد وشمار پیش کیے جن کے مطابق ہر سیکنڈ میں لاکھوں انسان مغرب زدہ ہو رہے ہیں۔ جب کہ مغربی تہذیب خود مغربی نوجوانوں کی دلچسپی کا مرکز نہیں رہ گئی ہے۔

دوسرا علمی اجلاس (۳:۳۰-۵:۰۰) پروفیسر علی محمد نقوی، چیرمین شیعہ تھیالوجی، اے ایم یو، علی گڑھ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی نے اپنا مقالہ ''تہذیب وسیاست کی فکری وعملی تعبیر- مولانا علی میاںؒ کی تحریروں کا تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے پیش کیا۔ مقالہ نگار نے واضح کیا کہ مولانا کے نزدیک تہذیب کی معنوی وسعت عقائد سے اخلاق واعمال تک، سیاست وقانون اور بین الاقوامی معاملات تک، فن تعمیر، شعر وادب اور ذوق لطیف تک محیط ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا موصوف مسلمانوں کو ہندوستانی سیاست میں حصہ لینے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ انھوں نے پیام انسانیت کے ذریعہ اسلامی تہذیب وسیاست کا تعارف کرایا۔ البتہ دنیا کو اس کا عملی نمونہ دکھانے کی عملی مشقوں کی واضح اسکیم مولانا کے یہاں نظر نہیں آتی۔

دوسرے مقالہ نگار پروفیسر کنور محمد یوسف امین نے اپنا مقالہ ''مادہ پرست مغرب کا جاری سقوط اور امت مسلمہ پر نیا عالمی خاکہ پیش کرنے کی ذمہ داری'' کے عنوان سے پیش کیا۔ انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ کسی پالیسی کو جانچنے کا معیار تقرب الٰہی اور نجات ہے۔ لہٰذا ہر پالیسی کو اس معیار پر جانچنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ روایتی تہذیب کو بدلنا کسی صورت میں ممکن نہیں کیونکہ نئے نبی اور وحی کے بغیر تبدیلی محال ہے۔ انھوں

نے اپنے مقالہ کا اختتام علامہ اقبال کے اس شعر پر کیا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس اجلاس کے تیسرے مقالہ نگار مولانا محمد اسماعیل فلاحی، شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ نے ''بھارت جیسے کثیر طبقاتی ملک میں تہذیب و سیاست کے کچھ قرآنی اصول'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا جیل سے رہائی پانے والے ساتھی سے ''واذکر عند ربک'' کہنا غیر اسلامی حکومت سے تعاون لینے کے جواز کو بتلاتا ہے۔ خود آپؑ نے ایک غیر اسلامی حکومت میں شامل ہوکر اہم خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر محمد ارشد، اسسٹنٹ پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے اپنے مقالہ میں کتاب "Clash of civilization" میں پیش کردہ نظریہ تصادم کا تنقیدی جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ ہننگٹن نے تہذیبوں کے تصادم میں عقیدہ و کلچر کے تصور کو نظر انداز کردیا ہے۔ انھوں نے مغرب کے خود تراشیدہ فلسفہ اور دعاوی کی کمزوریوں کو طشت از بام کیا۔

ڈاکٹر عمیر انس فلاحی، ریسرچ اسکالر جے این یو، دہلی نے ''تحریک اسلامی: معاصر عہد کا مطالعہ'' کے زیر عنوان مسلم دنیا کے متعدد تجربات کا ذکر کرتے ہوئے راشد غنوشی اور علامہ آیت اللہ خمینیؒ کے افکار سے فائدہ اٹھانے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا مابعد مودودی عہد کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے Text based مطالعہ کے مقابلہ میں زمینی حقائق پر مبنی Empirical study کی جانب سامعین کی توجہ مبذول کرائی۔

صدر جلسہ پروفیسر محمد علی نقوی نے کہا کہ تہذیب دراصل اسلام سے زائدہ ہے، ڈاکٹر طٰہ حسین پر کڑی تنقید کرتے ہوئے انھوں نے واضح کیا کہ ایرانی اور عربی تہذیب کے مقابلہ میں اسلام نے جو تہذیبی عناصر پیش کیے وہ لازوال ہیں۔ انھوں نے

کہا کہ تہذیبوں کے مطالعہ کے درمیان ہمیں کسی تہذیب کو بالکلیہ رد نہیں کرنا چاہیے۔

مولانا اشہد رفیق ندوی نے اس اجلاس کی نظامت کی۔

تیسرا علمی اجلاس بعد نماز عصر تا مغرب ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی کے آڈیٹوریم میں پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

پہلے مقالہ نگار ڈاکٹر محمد راشد اصلاحی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ سنی تھیالوجی، اے ایم یو، علی گڑھ نے ''اسلامی حکومت: قرآن مجید کی روشنی میں'' کے زیر عنوان مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ قانون سازی کا اصل مقصود انسانوں کی فلاح و بہبود ہے۔

ڈاکٹر نسیم مرزا کا مقالہ انگریزی زبان میں تھا۔ انھوں نے مریم جمیلہ کے حوالے سے اسلامی تہذیب پر ان کی خدمات کا جائزہ لیا اور مریم جمیلہ کی دینی خدمات کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک باہمت و حمیت خاتون تھیں۔ انھوں نے مغربی تہذیب کو ختم کرنے اور اسلامی تہذیب کو عام کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اپنے مقصد میں کامیاب رہیں۔

اس سیشن کا آخری مقالہ مولانا محمد جرجیس کریمی نے پیش کیا۔ ''اسلام کا سیاسی نظام: محدثین کا نقطۂ نظر'' کے عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے بالخصوص اصحاب ستہ کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کتب کی تدوین فقہی ابواب کے مطابق ہوئی ہے جن میں کتاب الایمان سے لے کر کتاب الآداب تک کے مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں جو خود اس بات کی دلیل ہیں کہ دین جملہ امور کو محیط ہے۔ ان میں سیاست بھی ہے۔ ان کتب احادیث میں کتاب الامارہ و کتاب الاحکام کے تحت خلافت و امارت کی بحث لائی گئی ہے۔ مقالہ نگار نے زکوٰۃ کی تنظیم، تحصیل و تقسیم، حدود کا اجراء، جہاد اور بین الاقوامی معاہدوں وغیرہ کے بارے میں محدثین کرام کی سیاسی بصیرت اور ان کے نقطۂ نظر کو پیش کیا۔

صدر اجلاس پروفیسر سعود عالم قاسمی نے تمام مقالات کی تحسین کرتے ہوئے محدثین کے سیاسی نقطہ نظر کی بابت کہا کہ تراجم بخاری اس ضمن میں چشم کشا ہیں۔ امام بخاری نے انتہائی عالمانہ نقطہ نظر اختیار کرتے ہوئے سیاست کے اصول و مبادی پر بھی

روشنی ڈالی ہے۔ڈاکٹر محمد احمد، منیجر ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی نے اس اجلاس کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

ادارۂ تحقیق کی مسجد کا افتتاح

دوروزہ قومی سمینار کے موقعہ پر ایک سال سے زیر تعمیر ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی نبی نگر دھرہ کمپلکس میں مسجد کا افتتاح مولانا سید جلال الدین عمری مدظلہ العالی کے ذریعہ ہوا۔ جماعت اسلامی کی مرکزی قیادت کے متعدد اکابرین کی موجودگی میں مولانا عمری نے مغرب کی نماز کی امامت فرمائی۔اس کے بعد ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی نے بعض اصحاب خیر کے مالی تعاون کا ذکر کیا اور جماعت اسلامی کے دیرینہ علمی ودعوتی خواب کی تعبیر اس مسجد کو قرار دیا۔صدر ادارہ نے احادیث کی روشنی میں مسجد کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر مالی تعاون کرنے والوں کو جنت میں خوبصورت محل کے اعلیٰ وارفع انعام کا مستحق قرار دیا اور اس کی مبارک باد پیش کی۔انھوں نے کہا کہ عہد نبویؐ میں مسجد میں دارالقضاء قائم تھا۔نزاعات واختلافات کے فیصلے مسجد میں ہوتے تھے۔مولانا نے مسجد کی حقیقی روح کو باقی رکھنے اور اس کے ذریعہ دعوت کے کام کو فروغ دینے کی طرف ذمہ داروں کی توجہ مبذول کرائی۔آپ نے کہا کہ مومن کا قلب مسجد سے اٹکا ہوتا ہے۔مولانا علی میاںؒ کے حوالہ سے فرمایا جو کہا کرتے تھے کہ جس دن تہجد کی نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوتا ہے اس دن کے اوقات اور کاموں میں بڑی برکت ہوتی ہے۔اس موقع پر جناب نصرت علی، سکریٹری جنرل جماعت اسلامی ہند، جناب محمد جعفر نائب امیر جماعت اسلامی، جناب اعجاز اسلم، مدیر ہفت روزہ ریڈیینس دہلی، جناب محمد احمد، سکریٹری برائے ملکی وملی امور جماعت اسلامی، جناب پرواز رحمانی، مدیر دعوت، جناب سید حامد عبدالرحمٰن الکاف اصلاحی (صنعاء) اور جناب سید شکیل انور، حیدرآباد، نیز شرکاء سمینار اور مقامی آبادی کی قابل لحاظ تعداد موجود تھی۔

دوروزہ قومی سمینار کا چوتھا علمی اجلاس (۷ تا ۹ بجے رات) جناب اعجاز احمد

اسلم، رکن مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند اور ایڈیٹر ریڈینس دہلی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں جناب محمد احمد، سکریٹری ملکی وملی امور جماعت اسلامی، بطور مہمان خصوصی مدعو تھے۔

اس میں سب سے پہلے جناب مولانا عمر اسلم اصلاحی، شیخ التفسیر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر نے ''اسلامی نظام حکومت قرآن مجید کی روشنی میں'' کے عنوان سے اپنے مقالے کی خواندگی کی۔ آپ نے کہا اسلام کا نظام عالمی ہے۔ اس نظام کی دو اہم خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے اور خالق کائنات کا وضع کردہ ہے۔ اس نظام کی بحالی سارے انسانوں کی ذمہ داری ہے۔

دوسرے مقالہ نگار جناب اشہد رفیق ندوی نے ''مصر میں اخوان کا ایک سالہ دور حکومت'' کے زیر عنوان مقالہ پیش کیا۔ اس میں انھوں نے ڈاکٹر محمد مرسی کی داخلی اور خارجی اصلاحات کا تذکرہ کیا اور ڈاکٹر محمد مرسی کے ایک سالہ دور حکومت کے متعدد مثبت اقدامات کا حوالہ دیا۔ مثلاً انھوں نے مسئلہ فلسطین اور شام کی خانہ جنگی کو حل کرنے اور ختم کرانے کی عمدہ کوشش کی۔ انھوں نے معصوم سیاسی قیدیوں کو رہا کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ افریقی یونین، چین اور ایران سے تہذیبی اور معاشی رشتے استوار کیے۔ انھوں نے تعلیم، ذرائع ابلاغ اور دستور سازی کو اسلامیانے کا عمل شروع کیا۔

تیسرے مقالہ نگار جناب سبحان بیگ نے ''اسلامی نظام حکومت قرآن کریم کی روشنی میں'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے حاکمیت الٰہ، خلافت انسان اور قانون خداوندی کی روشنی میں اولوالامر کے مطلوبہ اوصاف بیان کیے۔

چوتھے مقالہ نگار جناب شکیل انور حیدرآباد نے ''اقدار پر مبنی سیاست اور قومی متبادل سیاسی جماعت کی ضرورت'' کے عنوان سے اپنے افکار کو سامعین کے سامنے رکھا۔ انھوں نے اس موقف کی تائید کی کہ ملک ہندوستان میں اقدار پر مبنی حکومت سازی کے مواقع موجود ہیں اور اس سے امت مسلمہ کے افراد کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ سنی تھیالوجی، اے ایم یو نے

''مختلف المذاہب معاشرہ اور فریضہ دعوت'' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ تکثیری معاشرے میں دعوت کی اہمیت کو قرآن وسنت سے ثابت کیا۔ انھوں نے کہا اخلاقی محاسن سے آراستہ ہوئے بغیر دعوت میں تاثیر نہیں پیدا ہوسکتی۔ اہم بات یہ ہے کہ داعی کو تمام مفادات سے اوپر اٹھ کر انسانیت کی خیر خواہی کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالمجید خان، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، اے ایم یو نے ''امت مسلمہ کے مستقبل کا خاکہ'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور معاصر عہد کی تحریکی سرگرمیوں کا تجزیہ پیش کیا۔ مستقبل میں کامیابی کے لیے انھوں نے منصوبہ بندی پر زور دیا۔

پروفیسر وسیم احمد استاد الیکٹرانکس انجینئرنگ، اے ایم یو، نے ''عصر حاضر کی جمہوریت اور قرآنی تعلیمات'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں عوام اور جمہور کی آراء کو حق اور عدل وانصاف کی کسوٹی پر تولنے پر زور دیا اور یہ کہا کہ قرآن نے عوام کے اکثر مزعومات کی تردید کی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ جمہوریت کے خوشنما دعووں کی قلعی ان ممالک میں کھل چکی ہے جہاں یہ نظام رائج ہے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، اے ایم یو، نے ''سیاست وحکومت کے مسائل اور عہد وسطیٰ کے علماء'' کے عنوان سے اپنا عالمانہ مقالہ پیش کیا۔ فاضل محقق نے عہد اموی وعباسی میں ہندوستان میں موجود مسلم معاشروں اور عہد سلطنت ومغلیہ کے حوالے سے متعدد تہذیبی وسیاسی مسائل کا ذکر کیا جن میں شریعت کی رہنمائی میں مسائل کے تصفیے کا رجحان نظر آتا ہے۔ حکومت میں عورت کی سربراہی کے تعلق سے رضیہ سلطانہ کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ انہیں دستیاب تاریخی مواد میں اس پر علماء کی ناپسندیدگی یا اظہار نکیر کا علم نہیں ہوسکا۔ تین سو سال بعد تاریخ حقی کے مصنف نے بھی علماء کے اِس سکوت پر تعجب اور حیرت کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلم عہد کے متعدد معاصر مسائل میں بھی سلاطین اور مغل بادشاہوں نے علماء وفقہاء سے رجوع کیا ہے جس کا ریکارڈ تاریخی دستاویزات میں موجود ہے۔

ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی، معاون مدیر افکار ملی، دہلی، نے ''دنیا کی مسلم اقلیتیں: مسائل اور حل'' کو اپنے مقالے کا عنوان بنایا۔ انھوں نے کہا کہ آج پوری امت مسلمہ دنیا کے مختلف خطوں میں ریاستی جبر و تشدد کا شکار ہے۔ یورپ کی ''لبرل ازم'' کی پالیسی پر تیکھا طنز کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار نے کہا کہ یورپ کے دہرے رویے کا شکار مسلمان خود یورپ کے ممالک میں ہیں۔ عالمی سطح کی مسلم اقلیتوں کے مسائل و مشکلات کے علاوہ خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی و تہذیبی، اخلاقی و روحانی، تعلیمی، معاشی، صحافتی صورت حال کا تقابلی مطالعہ پیش کیا۔

مہمان خصوصی جناب محمد احمد نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اسلامی حکومت کی ناگزیریت پر زور دیا۔ آپ نے کہا کہ اسلام بغیر مضبوط سیاسی حکومت کے قائم نہیں رہ سکتا کیوں کہ اس کے بہت سے احکام کی بجا آوری حکومت کے زیر سایہ ہی ممکن ہے۔

صدر اجلاس جناب اعجاز احمد اسلم نے کہا کہ تہذیب کو اخلاق و اقدار کا پابند بنانا اسلام کا بنیادی فریضہ ہے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کو مختلف محاذوں پر دشواریوں کا سامنا ہے اور جماعت اسلامی ہند ان تمام محاذوں پر ڈٹ کر مقابلہ کر رہی ہے۔ انھوں نے سامعین کو بلا توقف اس قافلے میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض مولانا ضمیر الحسن فلاحی نے انجام دیے۔

۲۴ر فروری، دوسرا دن، پانچواں علمی اجلاس، ۸:۳۰ تا ۱۰:۰۰

صباحی اجلاس ڈاکٹر اقبال مسعود ندوی مقیم حال: کناڈا کی زیر صدارت شروع ہوا۔ اس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جامعۃ الفلاح شعبہ نسواں کے سابق شیخ التفسیر جناب مولانا نظام الدین اصلاحی موجود تھے۔ وقفہ سوالات میں صدر ادارہ جناب مولانا سید جلال الدین عمری نے مختصراً اظہار خیال کر کے اس اجلاس کی اہمیت کو دو چند کر دیا۔ اس اجلاس کی نظامت کی ذمہ داری جواں سال اسکالر عمیر انس فلاحی نے سنبھالی۔ اس اجلاس میں خواتین و حضرات اور طلبہ و طالبات کی بھرپور شرکت دیدنی تھی۔ علم و دانش کی

اس محفل میں پہلا مقالہ ڈاکٹر محمد احمد، منیجر ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ نے ''اسلامی تہذیب و سیاست اور ہندوستانی مسلمان'' کے زیر عنوان پیش کیا۔ موصوف نے اسلامی تہذیب و سیاست میں بے جا دخل اندازیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن و سنت اور اسوہ صحابہ کی طرف مراجعت کو لازم قرار دیا۔

دوسرے مقالہ نگار مولانا محمد ناصر قاسمی، ریسرچ اسکالر شعبہ تھیالوجی، اے ایم یو، نے ''اسلام میں خواتین کے حقوق'' کے زیر عنوان مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ تنہا مذہب اسلام کا امتیازی کردار ہے کہ اس نے طبقہ نسواں کو اس کا مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور معاشی حق عطا کیا ہے۔ اسلام سے پہلے اور اسلام کی آمد کے بعد عطا و بخشش کے خود ساختہ ایوانوں میں عورت مظلوم نظر آتی ہے۔

جناب مولانا سلطان احمد اصلاحی، سابق رکن ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی و مدیر سہ ماہی علم و ادب، علی گڑھ نے ''تکثیری سماج میں امت کی سیاسی حکمت عملی'' کے عنوان سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو الگ سیاسی پلیٹ فارم تیار کرنا چاہیے۔ ملی جلی سیاست ان کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ ہندوستان کے مخصوص حالات میں انھوں نے فرمایا کہ مقنّنہ اور عدلیہ میں مسلمانوں کو اپنی شرکت درج کرانی چاہیے۔

تیسرا مقالہ: ''اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیت کے معاشی حقوق'' سے متعلق پیش کیا گیا۔ مولانا ظفر دارک قاسمی نے قرآن و سنت اور اقوال سلف کی روشنی میں اسلام کے عطا کردہ معاشی حقوق کا تذکرہ کرکے اسلامی تمدن کے عادلانہ کردار اور غیر مسلموں کے تئیں حقوق انسانی کی پاسبانی کی اس ناقابل تردید حقیقت کو اجاگر کیا جس کو تسلیم کرنے کا حوصلہ مغربی محققین کے اندر نہیں پایا جاتا۔

ڈاکٹر محمد شہاب الدین قاسمی، پروجیکٹ فیلو شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، نے ''علی عزت بیگووچ کے سیاسی و تہذیبی افکار'' کا مطالعہ پیش کیا۔ صاحب مقالہ کا احساس ہے کہ تمدن و تہذیب، تعلیم و تدبر، اخلاقیات و مذہب کے تعلق سے عصر حاضر کے ممتاز دانشور اور مفکر بیگووچ نے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے مادیت پر مبنی مغربی

جدید سائنس کی برق رفتار ترقی کے جدید انسانی تمدن اور معاشرت پر گہرے منفی اثرات کو اپنی تحقیقات میں واضح اور مبرہن کیا ہے۔

اس موقع پر مولانا سید جلال الدین عمری نے مقالہ نگار حضرات کو علم و تحقیق میں غیر جانب داری، شفافیت اور دیانت داری جیسی اقدار کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی اور اس میں حوالوں کی نشان دہی میں بخل کو اعلیٰ علمی و تحقیقی ذوق کے منافی قرار دیا۔

صدر جلسہ ڈاکٹر اقبال مسعود ندوی نے اپنے تبصروں اور احساسات کی نمائندگی کرنے والے صدر ادارہ کے خصوصی خطاب کو کافی وشافی قرار دیا۔

چھٹا علمی اجلاس (۱۰:۰۰-۱۱:۳۰ بجے دن) پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، مدیر ششماہی مجلّہ علوم القرآن و سابق صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز اے ایم یو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت میں معروف ادیب و نقاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی، سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس اے ایم یو، علی گڑھ، نے شرکت کی۔

پہلے مقالہ میں ادارہ کے سابق اسکالر و اے ایم یو کے طالب علم مولانا مزمل کریم قاسمی نے ''الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ لابن القیم'' کا معروضی مطالعہ پیش کیا۔ اس کتاب کے ذریعہ مقالہ نگار نے تفصیل کے ساتھ اسلامی حکومت کو درپیش متوقع مقدمات و مسائل اور ان کے حل کے اسالیب و مناہج سے بحث کی۔

جناب پرواز رحمانی، مدیر 'سہ روزہ دعوت' نے ''تکثیری معاشرے کے مسائل اور اسلام'' کے عنوان سے بحث کرتے ہوئے ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کے سیاسی، معاشی اور تہذیبی حقوق اور ان پر شب خون مارنے کی متواتر کوششوں کا ذکر مومنانہ فراست کے ساتھ کیا۔ آپ نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا کہ اس ملک میں عقیدہ توحید اور اسلامی نظام حیات کے مقابلہ میں نظریاتی اور فکری طور پر کوئی مضبوط مزاحمتی قوت موجود نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد عرفان قاسمی نے ''الیکشن کی شرعی حیثیت اور ہندوستانی معاشرہ'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اب تک اس مسئلہ پر مسلمانوں کے درمیان

جاری مباحثہ کا خلاصہ پیش کیا اور مسلمانوں کو سیاست کے میدان میں متحدہ طور پر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کا مشورہ دیا۔

جناب عبدالوہاب التویتی، ریسرچ اسکالر شعبہ عربی، اے ایم یو نے ''مشروعیۃ الانتخابات وطریقتہا فی الاسلام'' کے عنوان سے بہ زبان عربی اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے حضور اکرم ﷺ کے انتقال کے بعد خلفاء راشدین کے انتخاب کے طریقوں اور ان کی حکمتوں کو بیان کیا۔ انھوں نے علامہ شوکانی، ابن تیمیہ اور عبدالرحمٰن بن ناصر اسعدی کے حوالہ سے اجتماعی مصالح اور مفاد عامہ کی حفاظت اور اس کی نگرانی کو فرض و واجب قرار دیا۔

عبدالسلام حمود غالب، ریسرچ اسکالر شعبہ سنی تھیالوجی، اے ایم یو نے ''وقفات مع ابن رشد-فکرہ وآراءہ السیاسیۃ'' پر مقالہ عربی زبان میں پیش کیا۔ آپ نے ابن رشد کی مختلف میدانوں میں خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی سیاسی فکر و بصیرت کو بطور خاص اپنی گفتگو کا عنوان بنایا۔ حاکم کے خصائص میں ابن رشد کے حوالے سے کہا کہ ان کا نظری علوم میں متبحر ہونا، حق پسندی، شجاعت، خطابت کی خصوصیات سے آراستہ ہونا اور جاہ طلبی اور عیش پسندی وغیرہ سے دوری لازمی اوصاف ہیں۔ ابن رشد سیاست کو سیاست فاضلہ اور سیاست ضالہ کے عنوان سے دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں اور اول الذکر کا بہترین نمونہ خلفاء راشدین کو قرار دیتے ہیں۔

مہمان خصوصی پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے سمینار کے موضوع کو پرکشش اور عصر جدید کی اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے ہندوستان میں سیکولرازم اور جمہوریت کے ذریعہ حاصل شدہ مراعات کے حصول میں پیش قدمی کرنے اور ہندوستانی سیاست میں Bargaining کو مسلم جہاں بینی کے وصف گرانمایاں سے تعبیر کیا اور حقوق کے حصول میں چابک دستی کا مظاہرہ کرنے کی تشویق دلائی۔

صدر اجلاس پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی نے اس علمی اجلاس کے پانچ مقالہ نگاران کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ: ہمیں یہ تجزیہ کرنا ہے کہ قدیم مسلم سیاسی

مفکرین کی آراء سے آج ہم کس طرح استفادہ کر سکتے ہیں۔ آپ نے کہا ہندوستان کا مسلم معاشرہ ہمیشہ اقلیت میں رہا ہے جس کا سلسلہ محمد بن قاسم سے لے کر ۱۸۵۷ء تک دراز ہے۔ اس تکثیری معاشرے میں ہم خدمت خلق کے ذریعہ نفوذ حاصل کر سکتے ہیں۔

اس اجلاس کی نظامت ادارہ کے رکن مولانا کمال اختر قاسمی نے کی۔

سمینار کا ساتواں علمی اجلاس (۱۱:۳۰- ۱:۴۵ بجے دوپہر) مولانا سید حامد عبدالرحمان الکاف اصلاحی (صنعاء، یمن) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی پروفیسر سید مسعود احمد، سابق ڈین فیکلٹی آف لائف سائنسز اے ایم یو تھے۔ پانچ مقالات کی خواندگی ہوئی، نظامت کے فرائض برادر الف شکور، ریسرچ اسکالر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، اے ایم یو نے انجام دیے۔

مقالہ خواندگی کا آغاز پروفیسر اثمر بیگ، شعبہ سیاسیات، اے ایم یو علی گڑھ کے ذریعہ ہوا۔ آپ نے ''مغربی لبرل ازم'' کی کوکھ سے جنم لینے والے افکار و نظریات کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا۔ آپ نے کہا مغرب نے اپنے نظریات کو Debate سے بالاتر کر رکھا ہے۔ مثلاً سموئیل نے End of Hostiory کے ذریعہ باقی دنیا کو یہ باور کرایا کہ اب دنیا میں خیالات اور تہذیب کا خاتمہ ہو چکا ہے اور امریکی تہذیب ہی آخری اور فائنل ہے۔ دوسری طرف زمینی حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے متعدد چوٹی کے محققین جمہوریت کے کھوکھلے پن کا اعتراف کر رہے ہیں اور لبرل ازم سے سیراب ہونے والے افکار خود مغرب ہی سوالیہ نشان بن چکے ہیں۔

دوسرے مقالہ نگار ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، نائب مدیر سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ و سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، دہلی نے اپنا مقالہ ''اسلامی نظام حکومت پر اعتراضات کا جائزہ- علی عبدالرزاق کی کتاب کا مطالعہ'' کے عنوان سے پیش کیا۔ مقالہ نگار نے کہا کہ اس کتاب میں مصنف نے اسلام کے نظام سیاست کا بالکلیہ رد کیا ہے۔ اس کتاب نے مسلم دنیا میں بے چینی پیدا کی جس کا رد ''ھیئۃ کبار العلماء'' کی ۲۴ رکنی کمیٹی نے کیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اسلامیت اور مغرب کی کشمکش نامی کتاب میں

اس تحریر کا مفصل تعاقب کیا ہے۔ مصری علماء میں ڈاکٹر محمد عمارہ اور محمود ابن عاشور نے اس کا تنقیدی جواب تحریر کیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ مستشرقین و ملحدین کے افکار کا مسلمانوں میں تعارف ہوا اور بعض لوگوں نے ان سے اتفاق بھی ظاہر کیا۔

کنوینر سمینار و سکریٹری ادارہ تحقیق ڈاکٹر صفد سلطان اصلاحی نے ''قرآن مجید کے اصول سیاست وحکومت'' کے موضوع پر مقالہ کی خواندگی کی۔ اسلامی سیاست کے بنیادی اجزاء کی قرآنی آیات کی روشنی میں وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے انسان کی خلافت کا معنی ومفہوم اور اصول وشرائط بیان کیا۔ پوری کائنات انسان کے لیے مسخر کی گئی ہے۔ انسانوں کو احکام الٰہی کے مطابق اس کائنات میں تصرف کرنا چاہیے اور جو لوگ ان اصولوں سے انحراف کریں گے وہی ظالم کہلائیں گے۔

چوتھا مقالہ ڈاکٹر شائستہ پروین، گیسٹ فیکلٹی شعبہ تھیالوجی، اے ایم یو نے ''خواتین کے سیاسی حقوق'' کے عنوان سے پیش کیا۔ انھوں نے علامہ ابن حزم، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، شیخ محمد ابوشقہ اور شیخ محمد الغزالی کے افکار پیش کیے، جنھوں نے عورتوں کے حقوق پر معتدل آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان کے مقالے کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت مسلمانوں کی حکمراں نہیں بن سکتی، البتہ قانون سازی، مشاورت، عوامی معاملات میں اس کی شمولیت ہوسکتی ہے۔ انھوں نے قرآن وحدیث سے ان پر دلائل بھی پیش کیے۔

پانچواں مقالہ محترمہ سلمٰی فردوس، ریسرچ اسکالر شعبہ تھیالوجی، اے ایم یو نے ''سید قطب شہیدؒ کے سیاسی افکار'' کے عنوان سے پیش کیا۔ مقالہ نگار نے سید قطب کے سیاسی افکار وخیالات اور مغرب کے تعاقب اور اسلامی نظام کے رحمت ہونے پر اِن کے نتائج بحث وتحقیق سے سامعین کو واقف کرایا۔

اجلاس کے مہمان خصوصی پروفیسر سید مسعود احمد نے کہا عصر جدید کا سب سے گھناؤنا مکر یہ ہے کہ اس نے پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا ہے اور عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کے تمام علمی وفنی کارناموں کو عیب دار بنا کر پیش کیا ہے۔ اور بے بنیاد الزامات اور اتہامات سے مسلم محققین اور ائمہ کے دامن کو داغدار کیا ہے۔ آپ نے کہا سائنس و

ٹیکنالوجی کے میدان میں زوال پزیری کا بہت بڑا سبب خود مسلمانوں کے اندر اجتہاد سے دوری ہے۔

سید حامد عبدالرحمان الکاف اصلاحی نے صدارتی خطاب میں واضح کیا کہ:
مغربی دنیا فکری طور پر اس منزل کو پہنچ چکی ہے جہاں اسے اپنے تضادات کا احساس ہو چلا ہے۔ دوسری طرف معاشی، تہذیبی اور سیاسی طور پر اس کی مدت پوری ہو چکی ہے۔ کیونکہ سموئیل کی کتاب "End of History" نے مغرب کے اوپر اجتہاد کے دروازے بند کردیے ہیں۔ موصوف گرامی نے مسلمانوں کو عقائد، اعمال، سائنس و ٹیکنالوجی اور ایڈمنسٹریشن میں خیر امت بننے کی تلقین فرمائی۔

آٹھواں علمی اجلاس (۱:۴۵- ۲:۳۰ بجے دوپہر) جناب پرواز رحمانی مدیر سہ روزہ ''دعوت'' کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی نظامت مولانا نذیر الحسن فلاحی، صدر حلقہ ایس آئی او مغرب نے انجام دی۔ پہلے مقالہ نگار مولانا اختر امام عادل قاسمی نے ''اسلامی نظریہ حکومت اور طریقہ انتخاب'' پر فاضلانہ بحث کی۔ انھوں نے کہا کہ بعثت نبوی کے بعد حبشہ، مکہ اور مدینہ تین مقامات پر آپؐ نے تین سیاسی نمونے امت کے لیے چھوڑے اور ان میں کسی کے نسخ کا فیصلہ نہیں فرمایا۔ مدنی سیاست بالکل آخری مرحلہ ہے۔ انھوں نے امت کے اس رویے پر استعجاب کا اظہار کیا کہ وہ حبشہ اور مکہ کی سیاسی زندگی کو اپنے لیے نمونہ نہ بنا کر صرف مدنی سیاسی زندگی پر بحث کرنے اور اسی سے حاصل شدہ دروس اور نتائج پر غور کرنے پر اکتفا کیے ہوئے ہے۔ فاضل محقق نے جمہوریت و شورائیت میں فرق، اسلام میں حکمراں کی حیثیت، اسلامی نظریہ حکومت کا امتیاز، شوریٰ، اسلامی طریقہ انتخاب وغیرہ کے زیر عنوان علماء امت کی آراء کا احاطہ کیا۔

مولانا کمال اختر قاسمی رکن ادارہ تحقیق نے ''موجودہ پارلیمانی نظام اور شورائیت'' کے زیر عنوان اپنا مقالہ پیش کیا۔ پارلیمانی نظام میں قانون سازی کا سارا حق و اختیار انسانوں کو تفویض کردیا جاتا ہے۔ یہ اس کا سب سے بڑا نقص ہے۔ انھوں نے کہا مذہب کے بغیر انسانوں کی بے بسی اور نارسائی اظہر من الشمس ہے۔

جناب پرواز رحمانی نے صدارتی گفتگو میں کہا: پارلیمانی نظام اور شورائی نظام میں بہت تضاد ہے۔ پارلیمنٹ میں عوام کی نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے جب کہ اسلامی شوریٰ میں عوام بااختیار ہوتے ہیں اور پائیدار حکومت وہی ہوسکتی ہے جس میں اختیار عوام کو حاصل ہو۔

اختتامی وتاثراتی اجلاس، ۲۴ فروری ۳۰:۳-۰۰:۵ بجے شام

اختتامی اجلاس کے موقع پر تین نئی کتابوں کا اجرا عمل میں آیا۔ پہلی کتاب مولانا سید جلال الدین عمری کی 'اسلام کا عائلی نظام' کا ہندی ترجمہ ''......'' بدست مولانا عمر اسلم اصلاحی اجرا عمل میں آیا اور دوسری کتاب ڈاکٹر پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی کی کتاب ''قرآنی مطالعات سماجی، معاشی وسیاسی مسائل کے حوالہ سے'' بدست ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی اجرا عمل میں آیا۔ تیسری کتاب ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی کی ''ہم جنسیت کا فتنہ'' بدست پروفیسر سید مسعود احمد اجرا عمل میں آیا۔

مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ وطلبہ، ملک کے مختلف گوشوں کے مندوبین، مقالہ نگاران، تحریک اسلامی کے وابستگان اور خواتین وحضرات کی موجودگی میں دو روزہ قومی سمینار کا اختتامی اجلاس مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی شیخ التفسیر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر مولانا اختر امام عادل قاسمی موجود تھے۔ اس اجلاس کی نظامت مولانا حامد علی ساغر فلاحی سکریٹری جماعت اسلامی اتر پردیش (مغرب) نے کی۔

محترمہ امامہ سلمیٰ نے خواتین کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ یہ سمینار وقت کے سلگتے موضوع پر تھا۔ ایس آئی او مسلم یونیورسٹی کی نمائندگی برادر عبداللہ عزام نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اس سمینار کے ذریعہ ایک فوری فائدہ یہ ہوا کہ اس کے ذریعہ ملک گیر سطح پر یہ پیغام گیا کہ تحریک اسلامی مسائل سے لاتعلق اور کنارہ کش نہیں ہے، بلکہ ملک گیر سطح پر تبدیلی چاہتی ہے، وہ تہذیب وسیاست میں اسلام کے کردار کو مطابق حال اور بامعنیٰ بنانا چاہتی ہے۔

مسلم یونیورسٹی اساتذہ کی نمائندگی کرتے ہوئے پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی نے سمینار کے کامیاب اختتام پر ذمہ داران کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس امر پر اطمینان ظاہر کیا کہ اس سمینار میں مختلف حلقوں کی نمائندگی ہوئی ہے۔ اس میں بیرون علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ وطلبہ کے علاوہ طالبات اور خواتین نے بھی شرکت کی۔ آپ نے کہا کہ یہ نقش اول ہے خدا کرے نقش ثانی اس سے بھی اچھا ہو۔

مہمان خصوصی مولانا اختر امام عادل قاسمی (سمستی پور بہار) نے کہا، سیاست و تہذیب کے تعلق سے ہمیں عہد نبوی کے مختلف ادوار سے سبق لینا چاہیے۔ آپ نے کہا اس سمینار نے تمام جماعتوں کو سیاست اور تہذیب کے میدانوں میں اسلام کے حقیقی کردار پر سوچنے کی دعوت دی ہے۔ اس نے غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کے متوقع اور مطلوبہ کردار کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے سمینار کے اجلاسوں میں اوقات کی تنظیم کو جماعت اسلامی کی تربیت کا نتیجہ قرار دیا۔

امیر جماعت اسلامی ہند وصدر ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری نے کہا کہ اس سمینار نے وقت کے ایک انتہائی حساس موضوع کو عصر حاضر کی زبان میں تفہیم کرانے کی پہل کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ افکار و خیالات کو اذہان تک منتقل کرنے کے لیے خود مصنف/ مقالہ نگار/ داعی کا ذہن صاف ہونا چاہیے۔ جبھی صاف تحریریں تخلیق کی جاسکتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ''خطبات/ اور رسالہ دینیات'' نے لاکھوں لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کر دیا اور اس کی بنیادی وجہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا مسائل پر صاف و دو ٹوک نقطہ نظر ہے۔ ہندوستان کی مخصوص صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے ارشاد فرمایا کہ دستور ہند کی رو سے ہمیں جو آزادیاں میسر ہیں ان کا بھرپور استعمال دعوت وتبلیغ کے لیے کرنا ہماری اولین ذمہ داری ہے۔ حالات کو پرامن بنانے اور خیر سگالی کے جذبات کو فروغ دینے میں ہمیں دیگر باشندگان ملک کا تعاون کرنا چاہیے۔

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ڈائرکٹر شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ اور صدر ادارہ علوم القرآن علی گڑھ نے اس بات پر زور دیا کہ اسلامی موضوعات و افکار کو معاصر زبان

واسلوب میں پیش کرنے کی شدید ضرورت ہے۔تاکہ معاصر عہد کو اپنے مسائل اور مشکلات کا حل فراہم ہو سکے۔ انھوں نے کہا کہ اسلامی نظریہ حکومت کی نمائندہ کتاب الماوردی نے تحریر کی ہے، جو اگر چہ عہد عباسیہ میں تصنیف کی گئی ہے لیکن آج بھی اس کے موضوعات اس طرح قیمتی ہیں جیسے تصنیف کے وقت تھے۔اس سے ہمیں استفادہ کرنا چاہیے۔

مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی نے صدارتی گفتگو میں اختصار کے ساتھ یہ بات کہی کہ سیاست کو آج تک برصغیر کی دیگر جماعتیں اپنا موضوع نہیں بنا سکیں۔ اس لحاظ سے جماعت اسلامی کا یہ تحقیقی ادارہ مبارک باد کا مستحق ہے۔آپ نے علماء و دانشوران کو اپنے افکار واعمال کے لیے قرآن مجید واحادیث کو اسوہ اور ماخذ بنانے پر زور دیا۔

کنوینر سمینار اور سکریٹری ادارہ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی نے رقت آمیز لہجے اور نمناک آنکھوں سے تمام بزرگوں، اہل علم مقالہ نگاران، مہمانان گرامی، علمائے کرام اور دانش وران قوم، حضرات وخواتین کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔جن کی شرکت سے یہ سمینار کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا۔ان میں اے ایم یو کے اساتذہ اور طلبہ وطالبات کی کثیر تعداد کے علاوہ کشمیر یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، مختلف دینی مدارس، علمی مراکز، مجلّات ورسائل، ہندوستان کے مختلف شہروں کے نمائندے اور اہل علم شامل ہیں۔ بیرون ملک مقیم چند ہندوستانی اہل علم کی شرکت نے سمینار کو اور زیادہ بارونق بنا دیا تھا۔انھوں نے سمینار کے موضوع کے انتخاب اور تعین کا پس منظر بیان کرتے ہوئے عالم اسلام کے بعض ممالک کی موجودہ صورت حال کا بطور خاص حوالہ دیا جس کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر اسلامی نظام زندگی اور نظام حیات پر پورے زور وشور سے بحث جاری ہو گئی ہے جو مثبت اور منفی، اسی طرح موافق اور مخالف دونوں نوعیتوں کی ہے۔اس موضوع کے انتخاب کی ایک وجہ انھوں نے تحریک اسلامی ہند کے ذریعہ گزشتہ دس پندرہ سالوں میں کیے گئے بعض فیصلوں اور ان اقدامات اور ان کی وجہ سے تحریک میں جاری متعلقہ بحث و گفتگو اور غور وفکر کو بھی قرار دیا۔انھوں نے اس موضوع کی نزاکتوں اور باریکیوں کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریک اسلامی ہند کے ارباب حل وعقد اور فکری قائدین سے انتہائی احتیاط، توقف اور تدبر و تفکر کے ساتھ قدم اٹھانے اور فیصلہ کرنے کی التماس کی۔ اس سلسلے میں قرآن وسنت اور ائمہ وعلماء کی تحقیقات پر براہ راست غور وفکر اور ان سے اخذ و استفادہ کے ساتھ دور حاضر کے افکار و نظریات اور عصر حاضر کی اسلامی تحریکات کے تجربات، ان کے قائدین کے خیالات اور اس وقت کی ان کی پیش رفت کو خاص طور سے سامنے رکھنا ہوگا۔ انھوں نے سیاست اور سیاسی امور میں دلچسپی کو دین کے نفاذ کا منصوبہ رکھنے والوں کے لیے ضروری قرار دیا لیکن ہندوستان جیسے سیکولر ملک (جس کا دستور الٰہی تعلیمات سے محروم اور انسانی سوچ اور فکر کا آئینہ دار ہے) میں سیاست میں عملاً سرگرم ہونے اور حصہ لینے سے پہلے بہت سے اہم اور بنیادی سوالات کا جواب تلاش کرنا اور بہت سے متوقع خطرات اور اندیشوں کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔

انھوں نے اخیر میں سمینار کے منتظمین اور معاونین کا خصوصی طور سے شکریہ ادا کیا۔ ان میں SIO آف انڈیا یوپی زون او راے ایم یو زون، ادارہ علوم القرآن، جماعت اسلامی ہند کا مرکز، اس کا دفتر حلقہ اور مقامی یونٹ وغیرہ کے وابستگان اور متوسلین کا تعاون بہت قابل قدر اور نمایاں تھا۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر عطا کریں۔

امیر جماعت اسلامی ہند وصدر ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری حفظہ اللہ کی دعا پر سمینار کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔

☆☆☆



Tahzeeb-wa-Siyasat Ki Tameer Mein Islam Ka Kirdar

Compiled by

Dr. Safdar Sultan Islahi

&

Maulana Mohammad Jarjees Karimi

Idarah Tahqeeq Wa Tasneef-e-Islami,
Nabi Nagar, Jamalpur, Aligarh (INDIA)

ISBN : 978-93-84354-60-2

